خطاب سے بھی سرفراز کیا۔

اس ماہ کا رسالہ ملاحظات کے لئے وقف ہے یعنی سنہ ۲۶ء سے لیکر سنہ ۳۱ء تک کے ملاحظات کا اقتباس یکجائی
ورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ انتخاب و اقتباس میں دلکشی و افادیت دونوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور اسی لئے سیاسی
سائل یا وقتی نقد و تبصرہ کی حیثیت رکھنے والے مباحث کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ادبی پہلو رکھنے والے ٹکڑے اکثر و بیشتر
، لئے گئے ہیں اور تنقیدات مذہبی کا بھی بڑی حد تک احاطہ کر لیا گیا ہے۔

اس میں دو مصلحتیں پیش نظر تھیں ایک تو یہ کہ وہ ناظرین نگار جو سنہ ۲۶ء کے بعد نگار کے خریدار ہوئے ہیں!
ن کے پاس مسلسل فائل موجود نہیں ہیں۔ ملاحظات کو یکجا طور پر دیکھ سکیں اور دوسری یہ کہ مذہب کے متعلق (علاوہ
ب الاستفسار اور دیگر مستقل مضامین کے) جو اظہار رائے میں نے ملاحظات کے سلسلہ میں کیا ہے وہ ایک شیرازہ سے
البستہ ہو جائے اور لوگوں کو آسانی کے ساتھ نہ صرف اُن تمام تغیرات کا علم ہو سکے جو تدریجاً میرے مذہبی معتقدات میں
یدا ہوئے ہیں بلکہ ایک صحیح رائے قائم کرنے کا بھی موقع ملے کہ میرا حقیقی مقصود ان سب مباحث سے کیا ہے اور میں اسلام
تعلیمات اسلام کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔

شہوانیات یا تاریخ الفحشا کی کتابت شروع ہو گئی ہے لیکن چونکہ کتاب کافی ضخیم ہے اس لئے اخیر فروری یا شروع
ارچ سے قبل اس کی اشاعت دشوار نظر آتی ہے۔ جن حضرات کے خطوط اس کی طلبی میں آگئے ہیں وہ محفوظ ہیں اور بروقت
شاعت یہ کتاب ان کے پاس روانہ کر دی جائے گی۔

میں ایک بار پھر عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ان تمام بازاری مطبوعات سے بالکل علحدہ ہے جو زن و
تعلقات جنسی پر عامیانہ و فاحشانہ طریقہ سے روشنی ڈالتے ہیں بلکہ یہ ایک مبسوط تاریخ ہے انسان کے جذبۂ حیوانی کی جس نے
یم سے لیکر اسوقت تک کے تمام مدارج جنسیاتی پر مورخانہ و عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس سلسلہ میں نظام تمدن و
ومت نے کیا کیا تدابیر انسداد فحاشی کے لئے اختیار کیں اور ان کا کیا نتیجہ ہوا۔

دسمبر کے نگار میں چند نمونے اس کتاب کے دیدئے گئے ہیں اور ان کے دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے
یہ کتاب اپنی موضوع کے لحاظ سے کس قدر بسیط و کس درجہ متنوع المباحث اور کتنی دلچسپ ہوگی۔ اردو
ں اس موضوع پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے اور نوادر تحقیق کا عجیب و غریب مجموعہ ہے۔

سنہ ۲۹ء کے ملاحظات غلطی سے اپنی اصلی جگہ درج نہیں ہو سکے اس لئے سنہ ۳۱ء کے ملاحظات کے بعد درج کر دیئے
ئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

Checked 1965

جلد ۲۳	جنوری ۱۹۳۳ء	شمارہ ۱

جنوری ۱۹۲۶ء | جرائد و رسائل کا دستور ہے کہ آغاز سال میں جب ایک سنہ ختم اور دوسرا شروع ہوتا ہے خیر مقدم و وداع کے مخلوط جذبات کو کسی نہ کسی پیرایہ سے ضرور ظاہر کرتے ہیں۔ ایک حد تک یہ رسم بری نہیں ہے اور یوں بھی سالگرہ کی تقریب میں کچھ نہ کچھ چہل پہل کے اسباب پیدا کرنا متمدن دنیا کا دستور ہے۔ لیکن میں کہ میرے لئے ہر دن قطع منزل ہے اگر کوئی کام کر سکوں اور ہر روز رجعت قہقری اگر بیکار صرف ہو جائے، اس رسم کے ادا کرنے کے لئے طیار نہیں، کیونکہ میرے لئے گزر جانے والے سال کی ناکامی یا آنے والے سال کی کامیابی کا خیال نتیجہ کے لحاظ سے ایک ہی حکم رکھتا ہے، للہ در ما قال:-

بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا
ناہید بغمزہ کشت و مریخ بہ قہر

میں دیکھتا ہوں کہ جو دن گزرتا ہے میرے اندر بجائے تفاؤل کے تشاؤم (Pessimism) کی کیفیت بڑھتی جاتی ہے اور دنیا کی کسی کامیابی کا خیال میرے اندر کوئی ولولۂ مسرت پیدا نہیں کرتا، پھر یہ بات بھی نہیں ہے کہ میں جس کام کو اختیار کرتا ہوں اس میں کامیابی نہ ہوتی ہو، بلکہ خدا کا احسان ہے کہ میں اپنے ارادوں کو بہت کم ناکام دیکھتا ہوں، لیکن یہ ضرور ہے کہ کامیابی و ناکامی کے متعلق میرا معیار ضرور بدلتا ہے، صبح جس نقطہ کو میں منزل سمجھکر آگے بڑھتا ہوں، شام کو وہاں پہونچکر محسوس کرتا ہوں کہ منزل

ں کہاں، اور آج جو حد کامیابی کی متعین کر رہا ہوں کل اُس حد تک پہونچنے کے بعد حقیقت کو اور دور دیکھنے
ا ہوں۔

نگار کے دور کو اب پانچواں سال شروع ہوتا ہے اور گزشتہ چار سال کے اندر اس نے اس قدر
میابی حاصل کر لی ہے کہ ہندوستان کا ایک رسالہ اس پر فخر کر سکتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تک
ں نے حدود حقیقت کی طرف ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا اور جو معیار میری نگاہوں کے سامنے ہے، وہ ہنوز
ں کی دسترس سے بھی بہت دور معلوم ہوتا ہے۔

میں بار بار اسباب کی داستانِ پارینہ کو دہرانا نہیں چاہتا اور بغیر کسی امید و توقع کے بلا کسی خیال
میابی یا اندیشۂ ناکامی کے ایک راستہ پر چلا جا رہا ہوں اور کوئی چیز سوائے اس خیال کے میری ہمت
زائی کرنے والی نہیں کہ

متاعِ جمع کن شاید کہ غارتگر شود پیدا

ں ۱۹۲۶ء | انسانی زندگی کے سب سے زیادہ تکلیف دہ، لیکن اسی کے ساتھ نہایت دلچسپ لمحات وہ ہوا کرتے ہیں جب
ادث روزگار اس کو اپنا نشانہ بنا ٹھہرا لیں، یہی وہ چیز ہے جسے مذہب و تصوف کی زبان میں آزمائش و ابتلا کہتے ہیں
ادبی ذوق رکھنے والے "فطرت کی شوخیوں" سے تعبیر کرتے ہیں لیکن کاروباری دنیا اور مادی عالم میں جہاں خدا
سلۂ علت معلول" کے سوا اور کچھ نہیں "طبیعیات" کی یہ ستم آرائیاں اس قدر حوصلہ فرسا اور دل شکن ثابت
تی ہیں کہ نہ مذہب کی تاویل اس کا مداوا کر سکتی ہے اور نہ شاعرانہ تعبیر اس کے نتائج کی تلخیوں [illegible]

ہر شخص اپنی اپنی جگہ امن و سکون کی جستجو میں سرگرداں ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ قدرت کا محبوب ترین
غلہ ہی یہ ہے کہ وہ تدابیر کے اضمحلال کو برابر ہم پر ثابت کرتی رہے، عمارتوں کو ڈھائے اور نقوش کو مٹائے
ر اکثر و بیشتر اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی "تعمیری" جد و جہد کو چھوڑ بیٹھتا ہے اور اپنے آپ کو "سیل فنا"
ے حوالہ کر دیتا ہے، لیکن کچھ سخت جان ایسے بھی ہوتے ہیں جو آخیر وقت تک ہاتھ پاؤں چلاتے رہتے ہیں، اور یہ میری
زدیک صرف بر سبیل عادت ہوتا ہے۔ اگر کامیابی ہو گئی تو خیر پند و اصلاح کے لئے ایک مثال و نمونہ بن گئے ورنہ
ہادت تو قسمت میں لکھی ہی ہے۔

قدرت کی یہ عنایتیں مجھ پر اگست ۱۹۲۳ء سے شروع ہوتی ہیں اور اُس وقت سے لیکر تا ایں دم [illegible]
ارغ "از فکر و فشار" بسر نہیں ہوا، مسرت و نشاط کا کیا ذکر ہے لیکن میں نے ان تمام روحانی کلفتوں

نہیں ہونے دیا کہ بیکار سی بات ہے اور نہ اس وقت میں ان کی تفصیل آپ کو سنانا چاہتا ہوں کیونکہ اول تو کسی کو میرے ہمدردی کیوں ہونے لگی اور اگر ہو بھی تو کیا نتیجہ جبکہ غم والم کی تقسیم ممکن نہیں۔

ماہ اپریل کے رسالہ تجلی میں اس کے فاضل اڈیٹر نے اصغر گونڈوی کے متعلق اظہار رائے کیا ہے کہ :-

"وہ بہت معمولی علمی لیاقت رکھنے کے باوجود اکثر ایسا اچھا شعر کہتے ہیں کہ روح وجد کرتی ہے لیکن ذہانت سے اچھا شعر کہنا ممکن ہے، بے عیب شعر کہنا ناممکن ہے۔ حال میں اصغر صاحب کی غزل جو بلی علی گڈھ کے مشاعرے میں سب سے بہتر قرار دی گئی اور انھیں ایک طلائی تمغہ پیش کیا گیا اس میں شک نہیں کہ غزل میں چند اشعار قابل داد ہیں، لیکن مقطع میں ایک ایسی فاش اور ناقابل تاویل غلطی موجود ہے جس کی بنا پر اہل نظر انھیں تمغہ تو کجا قابل شعرا کی صف میں جگہ دیئے جانے کو بھی پسند نہ کریں گے۔ وہ مقطع یہ ہے ؎

نہیں دیوانہ ہوں **اصغر** نہ مجھ میں ذوق عریانی کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

اصغر صاحب اور ان کے تمغہ دہندوں کو یہ خبر نہیں کہ جیب و گریباں ایک ہی مسمی کے دو نام ہیں جیب عربی ہے گریبان فارسی ہے"

معلوم نہیں حضرت وحشی شاہجہاں پوری کا اصل مقصود اس تحریر سے اصغر صاحب کی کم علمی کو ثابت کرنا ہے یا صرف "جیب و گریبان" کی غلطی کو نمایاں کرنا۔ اگر مدعا صرف اس شعر کی اصلاح تھا تو ان کی کم علمی کا ذکر غیر ضروری تھا اور وہ بغیر اس دل آزاری کے بھی پورا ہو سکتا تھا اور اگر مقصود حقیقتاً یہی تھا کہ ان کی کم علمی کو ظاہر کیا جائے تو افسوس ہے کہ اس کے ثبوت میں جس شعر کو پیش کیا گیا ہے وہ کافی دلیل نہیں ہو سکتا۔

یہ درست ہے کہ لفظ "جیب" کا مفہوم عربی میں وہی ہے جو گریبان کا فارسی میں ہے، لیکن فاضل نکتہ چین کو شاید اس حقیقت سے بھی انکار نہ ہوگا کہ مجازاً لفظ جیب، کیسہ کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے جو پاکٹ کا ہے۔ اگر اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اردو میں کسی لفظ کے غلط مفہوم کا رائج ہو جانا سند آویز نہیں ہو سکتا، تو میں کہونگا کہ لفظ جیب نہ صرف اردو بلکہ خود عربی زبان میں بھی پاکٹ کے معنی میں کثرت سے رائج ہے۔

حال ہی میں مصر کے ایک مشہور فاضل نے عربی زبان کا ایک پاکٹ سائز لغت مرتب کیا ہے اور اس کا نام "قاموس الجیب" رکھا ہے اسی طرح قاموس العصری میں لفظ جیب کے معنی پاکٹ کے بھی لکھے ہیں اور مثالاً "نقود فی الجیب" کا فقرہ درج کیا ہے۔ پھر جب اصل زبان میں اس لفظ کے معنی مجازاً یہ لئے جاتے ہیں تو اردو میں عموماً لفظ جیب کے معنی صرف کیسہ کے لئے جاتے ہیں۔ کیوں ناجائز و ممنوع قرار دیا جا سکتا ہے اصغر صاحب نے کبھی اپنے علم و فضل کا دعویٰ نہیں کیا کہ مولانا وحشی کو اس کی تردید ضروری ہوتی، وہ

ت ایک شاعر کی حیثیت سے رونما ہوئے ہیں اور اس لحاظ سے اُن کے کلام پر تنقید کرنی چاہئے پھر اگر اُن کے اکثر
ارسے وحشی صاحب کی روح وجد کرنے لگتی ہے تو یہ کافی ثبوت اصغر کے شاعر ہونے کا نہیں ہے۔ رہی قابل و
ابل شعرا کی تفریق وصف بندی سو یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر ایک شاعر کا کلام کلیتہً اغلاط
پاک ہوسکتا ہے اور محض زبان یا فن کی بعض غلطیوں کی وجہ سے کس طرح ایک حقیقی شاعر کو قابل شعرا کی صف
نکال کرنا قابل شعرا کی صف میں جگہ ملنی چاہئے۔ اگر ایک شخص اچھا شاعر پیدا ہوا ہے تو وہ اپنی شعر گوئی
لحاظ سے قابل ہی شاعر شمار ہوگا خواہ وہ جاہل ہی کیوں نہ ہو اور اگر کوئی شخص نظرتاً شاعر نہیں ہے تو
شش سے بھی اُس کو قابل شعرا کی صف میں جگہ نہیں مل سکتی خواہ کتنی ہی زبردست سند فضیلت اس کے
س موجود ہو۔

مجھے افسوس ہوا کہ وحشی صاحب نے اصغر کی کم علمی کا ذکر کر کے ایک ایسے جذبہ کا اظہار کیا جو اُن جیسے
یدہ و متین انسان کے لئے کبھی موزوں نہیں ہوسکتا کم از کم وحشی صاحب کے متعلق میں کبھی یہ خیال نہیں کرسکتا کہ انکا
ربھی ان لوگوں میں ہے جن کے متعلق ایک شاعر لکھ گیا ہے کہ:۔

خانۂ شرع خراب است کہ ارباب صلاح
در عمارت گری گنبد دستار خوند

اس دوران میں جو کتابیں ریویو کے لئے موصول ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم "نظریہ اضافیت" ہے،
منہاج الدین صاحب ایم، ایس، سی، پروفیسر طبیعیات اسلامیہ کالج پشاور نے مرتب کیا ہے۔
نظریۂ اضافیت (Relativity) زمانہ حال کا جدید ترین نظریہ ہے جسے جرمنی کے ایک
طبیعیات آئن اسٹین نے پیش کیا ہے یہ نظریہ کیا ہے، اس سے طبیعیات کے اصول میں کیا انقلاب پیدا ہوتا
اور ہم اس کی مدد سے کائنات کا کس قدر علم حاصل کرسکتے ہیں یہ وہ مسائل ہیں جنھیں فاضل پروفیسر نے
ایت سہل و آسان زبان میں پیش کیا ہے۔ چونکہ نظریۂ اضافیت کے سمجھنے کے لئے طبیعیات کے بعض
دائی مسائل علی الخصوص علم الحرکت کا سمجھ لینا ضروری ہے اس لئے اس کتاب میں سب سے پہلے
بیعیات کے بعض ایسے ضروری مسائل کو سمجھا دیا گیا ہے تاکہ اصل مدعا کے ذہن نشین ہونے میں آسانی ہوجا
علاوہ دیباچہ اور مقدمہ کے یہ کتاب چار مقالوں میں تقسیم کی گئی ہے پہلے مقالہ میں مابعد الطبیعیا
ضیات" "علم الحرکت" "مادہ" "فضائے مطلق" "نظام عالم" "نیوٹن کا کلیۂ تجاذب" "نور و اثیر" اور نظریۂ
نیہ" سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے اور تیسرے مقالہ میں نظریۂ "اضافیت" کی تشریح ہے اور مختلف ابواب

قائم کرکے اس کو سمجھایا گیا ہے چوتھے مقالہ میں ماہیت عالم سے بحث کرکے ایک تتمہ کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں "نظریۂ اضافیت" پر جو اعتراض کئے گئے ہیں اُن کا جواب دیا ہے۔ اس کے بعد اصطلاحات کا ترجمہ ہے اور پھر جدید اصول کے مطابق ایک مفصل انڈکس یا فہرست ہے۔

"نظریۂ اضافیت" چونکہ نیوٹن کے "قانون تجاذب" کو شکست دینا چاہتا ہے اس لئے اب ساری علمی دنیا اس طرف متوجہ ہے اور یورپ میں کثرت سے اس موضوع پر کتابیں لکھی جا چکی ہیں اردو میں اس وقت تک کوئی مفصل مضمون بھی اس مبحث پر شائع نہیں ہوا تھا، چہ جائیکہ کوئی تصنیف، اس لئے ملک کو پروفیسر منہاج الدین صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ انھوں نے اس معرکۃ الآرا نظریہ پر بے مثل تصنیف کرکے اردو داں طبقہ کے لئے اس موضوع کو قابل فہم بنا دیا۔

فاضل مولف کی محنت و کاوش کی داد حقیقتاً وہی شخص دے سکتا ہے جس نے کبھی اس نوع کی علمی مضامین کا ترجمہ کیا ہے۔ چونکہ میں نے گزشتہ سال نگار میں ایک مضمون اس موضوع پر لکھا تھا اس لئے میں اس کتاب کی اہمیت اور مولف کی غیر معمولی عرق ریزی و جانفشانی کا اندازہ کر سکتا ہوں۔

اصطلاحات کے ترجمہ میں بیشک مجھے کہیں کہیں اختلاف ہے ذیل میں چند الفاظ کی فہرست ملاحظہ ہو۔

۱۔ Aberration of light — اس کا ترجمہ شعاع کیا گیا ہے میری رائے میں "انحراف نور" زیادہ فصیح ہو
۲۔ Axiom — امر بدیہی ... میرے نزدیک بدیہیہ ہی مختصر بھی ہے اور اصطلاحی شان بھی رکھتا ہے
۳۔ Convergence — استدقاق بہت ثقیل لفظ ہے اتجاہ یا تقارب زیادہ مناسب ہے
۴۔ Co-ordinates — خطوط مرتبہ صحیح نہیں ہم مراتب ہونا چاہیئے۔
۵۔ Common Sense — عقل عام، عقل عامہ یا حس مشترک کے بجائے ذوق سلیم یا ذوق فطری بہتر ہے
۶۔ Electron — برقیہ درست ہے لیکن عربی میں اس کے لئے اصطلاحی لفظ کہربائیہ ہے جو ہی اس لفظ کے استعمال میں فائدہ ہے کہ نسبت کی صورت میں اس کو کہربائی کر سکتے ہیں اور برقیہ محدود ہے
۷۔ Ellipse — اہلیجی لکھا ہے غالباً کتابت کی غلطی ہے اس کو اہلیلجی ہونا چاہیئے
۸۔ Energy — توانائی بالکل غیر علمی لفظ ہے میری رائے میں قوت بہتر ہے۔
۹۔ Focus — ماسکہ کے بجائے اگر نقطۂ احتراق ہو تو زیادہ مناسب ہے۔
۱۰۔ Inertia — اس کا ترجمہ جمود میری سمجھ میں نہیں آیا استمرار ہونا چاہیئے
۱۱۔ Latent energy — مخفی توانائی۔ اچھا ترجمہ نہیں ہے قوت کامنہ ہونا چاہیئے یہی اصطلاحی لفظ ہے
۱۲۔ Natural — قدرتی سے زیادہ مناسب فطری ہے

کروں گا کہ اس باب میں اس کی کوشش قانون ہیئت اجتماعی کے لحاظ سے فرض عین ہے۔

اس وقت ہندوستان جس دور سے گزر رہا ہے وہ اگر اس موج کا سا خفیف نہیں ہے جو آنے والی بلندی موج کا پتہ دیتی ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد جو درجہ آنے والا ہے وہ صرف منزل فنا کا ہے۔ اس وقت سارے کرۂ ارض پر شائد ہی کوئی بدنصیب قطعۂ زمین ایسا ہوگا جو اپنے وقار و خودداری کے لئے اور اپنے وزن کی تعیین کے لئے ہر ممکن ایثار و قربانی سے کام نہ لے رہا ہو، لیکن ہندوستان کی حالت اس قدر شرمناک ہے کہ دنیائے احساس کی کوئی بے غیرتی ایسی نہیں جس کی نمائش اس نے نہ کی ہو اور غفلت و جمود کا کوئی منظر ایسا نہیں جو اس کے اندر بسنے والوں کی طرف سے ظاہر نہ ہو رہا ہو۔

ہندوستان کی سیاسیات پر دو مختلف نقطۂ نظر سے بحث ہو سکتی ہے ایک متحدہ ہندوستان (United India) جس میں یہاں کی تمام اقوام کو ایک چیز سمجھ کر گفتگو کی جائے اور دوسرے "ہندوستانی قومیات" کہ یہ مختلف قوموں کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی مستحق ہے اس وقت ان دونوں میں سے کسی پر کوئی بسیط سیاسی مقالہ پیش نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ نہ ملاحظات کے محدود صفحات میں اس کی گنجائش ہے اور نہ اس نوع کی بحث مقاصد نگار میں شامل۔ لیکن اس حیثیت سے کہ اسی سلسلۂ گفتگو میں تعلیمی بحث بھی آجاتی ہے میں مختصراً اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں جس کا تعلق صرف مسلمانوں کی جماعت سے ہے

یہ حقیقت مسلم ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی حالت بہ نسبت ہندوؤں کے بہت زیادہ گری ہوئی ہے اور اس کا بڑا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی مالی حالت کمزور ہے، لیکن میرے نزدیک یہ توجیہ بالکل غلط ہے بلکہ اس کا سبب مسلمانوں کی ذہنی گمراہی ہے، یا بیجا تفاخر جس کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے نہیں ہے، ہندوؤں کی جماعت ایک ایسی جماعت ہے جس کی تمام تمناؤں کا مرکز صرف سرزمین ہند ہے اور انھیں سیاست خارجیہ سے کوئی تعلق نہیں، اسی لئے ان کی جتنی کوششیں ہوتی ہیں وہ اپنے ہی ملک، اپنے ہی افراد سے وابستہ ہوتی ہیں۔ برخلاف مسلمانوں کے کہ اُن کو سب سے پہلے ترکی افغانستان، ایران، مصر، نجد و حجاز کی طرف توجہ ہوتی ہے اور پھر جو وقت بچتا ہے، اس میں ہندوستان کا بھی خیال آجاتا ہے۔

جس وقت اس خیال کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سوائے بیجا جذبۂ افتخار کے، اور کوئی چیز شامل نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ بعض افراد کو اخوت اسلامی کا خیال اس پر مجبور کر دیتا ہو لیکن قبل اس کے کہ ہم اس نوع کی برادرانہ ہمدردی پر آمادہ ہوں ہمیں غور کر لینا چاہیے کہ کہیں یہ ہمدردی اس شخص کی سی ہمدردی تو نہیں ہے، جو اپنے مطلوب تک تو نہیں پہنچ سکتا، لیکن خودکشی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تمام مسلمان خواہ وہ کرۂ ارض کے کسی حصہ میں آباد ہوں ایک ہی جماعت میں داخل ہیں اور مذہب کا اتحاد انہیں ایک ہی رشتہ سے منسلک کئے ہوئے ہے اور یہ بھی فطری مجبوری ہے کہ جب ان میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہونچے تو تمام افراد بے چین ہو جائیں اور ہر ممکن امداد کے لئے آمادہ' لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ہم فی الحقیقت اس قابل ہیں بھی یا نہیں کہ بیرون ہند کے اسلامی و سیاسی مسائل کو سلجھا سکیں اور کوئی قابل قدر مدد دوسری جگہ کے مسلمانوں کی کر سکیں' ہم نے اس وقت تک جو کچھ کیا وہ صرف یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً کچھ روپیہ بھیجتے رہے' لیکن جو مصیبت ہمارے عام اخلاقی انحطاط سے پیدا ہو چکی ہے وہ روپیہ سے دور نہیں ہو سکتی اور نہ سیاسیات مغرب کی مشرق کش پالیسی کا رخ بدل سکتے ہیں جب تک ہم میں خود کوئی اجتماعی و قومی وزن پیدا نہ ہو جائے۔ پھر ہم اس کے لئے تو بیتاب ہو جاتے ہیں کہ دوڑ کر منزل تک پہنچ جائیں لیکن اس کی پرواہ نہیں کہ پاؤں میں طاقت رفتار کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اندرونی و مقامی اصلاح ہے' اور جب تک اس میں کامیابی نہ ہو جائے ہم دوسروں کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔

اس وقت بظاہر عالم اسلامی افتراق و انتشار کی حالت میں نظر آتا ہے' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ انتشار ہی آئندہ اجتماع کا پتہ دیتا ہے' اگر کوئی جماعت اتنی بڑی اور منتشر الدیار ہے کہ من حیث الکل وہ کسی امر پر متفق نہیں ہو سکتی تو پھر بہترین تدبیر یہی ہے کہ اس کو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنی اصلاح کرنی چاہئے کیونکہ آسانی اسی میں ہے' اگر ٹرکی خلافت کے بارے آزاد ہو کر ایک ترکی قوم ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو ابھارنا چاہتا ہے اگر مصر کے افراد اپنی قومیت علحدہ قائم کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں اسی طرح اگر نجد وحجاز' ایران و افغانستان وغیرہ جدا جدا ہو کر اپنی اصلاح کے خواہشمند ہیں تو ہمیں مسرور ہونا چاہئے کہ حقیقتاً یہی صحیح طریق کار ہے' اور اسی کی تقلید ہمیں بھی کرنی چاہئے' لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا اور شروع سے اس کلیہ کو فراموش کر دیا کہ "اصلاح ہمیشہ گھر سے شروع ہوتی ہے"۔

مسلمانوں نے "انجمن خدام کعبہ" قائم کی "خلافت کمیٹی" کو برپا کیا لیکن آج تک اُنھوں نے کسی ایسی انجمن قائم کرنے کی کوشش نہیں کی جس کا تعلق خود اُن کی اصطلاح سے ہوتا۔ جس میں خود اپنے بچوں کی تعلیمی حالت مد نظر ہوتی' موجودہ سیاسی اضطرابات کے سلسلے میں سب سے بڑا کارنامہ مسلمانوں کا جس کا تعلق اصلاح تعلیمی سے تھا جامعہ ملیہ کا قیام ہے' لیکن جو حالت اُس کی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اگر یہ بدعت کی تھی تو چاہئے تھا کہ اُسے تکمیل تک پہنچاتے اور وسیع کرتے یہاں تک کہ تمام اسلامی بستیوں اور قصبوں میں اس کی شاخیں قائم ہو جاتیں اور اس طرح ایک عام بیداری پیدا ہو جاتی۔

میں نے جامعہ کو دیکھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جن اصول کے ماتحت اس کو قائم کیا گیا ہے وہ یقیناً قابل

تحسین ہیں، لیکن وہی عیب جو مسلمانوں کے تمام کاموں میں پایا جاتا ہے یعنی "عدم تنظیم" یہاں بھی موجود ہے اور اس لئے اس نے کوئی ترقی نہیں کی، یہ صحیح ہے کہ گزشتہ چند سال کا زمانہ خاص سیاسی اضطراب کا تھا، اور مسئلہ سوراج عدم تعاون اور کھدر پوشی نے سب کی افکار کو اپنی طرف جذب کر لیا تھا۔ لیکن میں کہوں گا کہ یہ تمام مسائل خود از قبل وقت چھیڑ دئے گئے تھے اور اسی لئے وہ ایک ضعیف و ناقص تخم سے پیدا ہونے والے پودے کی طرح خفیف سی گرم ہوا کی بھی تاب نہ لاسکے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر ۳۲ کروڑ کی آبادی میں سے صرف چند ہزار انسان تعلیم کی برکات سے اس قدر بہرہ یاب ہو گئے ہیں کہ وہ آزادی کے برکات سے مستفید ہو سکتے ہیں، تو ناممکن ہے کہ وہ ملک کو آزاد کرا سکیں ملک نام ان چند افراد کا نہیں ہے جو کالجوں میں تعلیم پا رہے ہیں، ملک عبارت ان چند نفوس سے نہیں ہے جو لیڈری کر سکتے ہیں، اور نہ ملک سے مراد وہ ایک درجن لوگ ہیں جو کسی جلسہ میں اچھی تقریریں کر سکتے ہیں، بلکہ ملک بنتا ہے عوام سے قصبات و دیہات کی آبادی سے، سو اس کے احساس کا یہ عالم ہے کہ بمشکل حیوانات سے کوئی بلند درجہ اس کے لئے متعین ہو سکتا ہے۔ پھر جب تک آپ ان کے خیال میں وسعت نہ پیدا کریں تا وقتیکہ عام تعلیم کے ذریعہ سے ان کے دماغ کو روشن نہ بنائیں آپ کو "آزادی" کے نام لینے کا کیا حق حاصل اور آپ کس اعتماد پر غیروں سے اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمان کانگرس میں حصہ نہ لیں مسئلہ حجاز سے بے تعلق ہو جائیں، لیکن اس کے کیا معنی کہ آپ اپنے ان فرائض سے غافل ہو جائیں جو یقیناً کانگرس اور حجاز سے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں جب ترکوں نے خلافت کا جوا اپنی گردن سے نکال پھینکا تو آپ نے وہ سب کچھ کر لیا جو آپ کے اختیار میں تھا لیکن نتیجہ کوئی نہ نکلا کیونکہ ترک بیوقوف نہ تھے کہ آپ کی غیر دانشمندانہ رائے تسلیم کر کے اپنا نقصان کرتے، اسی طرح اب حجاز کے معاملہ میں آپ کے وفد پر وفد چلے جا رہے ہیں، آپ جہازوں سے اپنے پیغامات لوگوں کو سنا رہے ہیں، گویا اس سے زیادہ سخت مہم آپ کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتی اور شاید آپ ہی کی ذات پر سارے نظم عالم کا انحصار ہے لیکن ہمیں معلوم ہے جو نتیجہ اس کا ہونے والا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب وہاں سے آپ واپس آئیں گے اس حال میں کہ آپ کے مشورے ٹھکرا دئے گئے ہوں گے اور آپ کے پاس خفت مٹانے کے لئے کوئی ذریعہ نہ رہ جائے گا سوائے اس کے کہ ہندوستان کی بیوقوف پبلک کو آپ کسی اور وفد کی روانگی کا منتظر بنا کر چھوڑ دیں۔ اگر حجاز میں ابن سعود ملوکیت قایم کر رہا ہے تو آپ کو کیا اور ترک خلافت کو مٹا رہے ہیں تو آپ کیوں بیتاب ہوئے جاتے ہیں، پہلے اپنے "کار زمیں" کی طرف تو توجہ کیجئے اس کے بعد "آسمان پردازی" کا سودا پکائیے گا، گھر کی حالت تو آپ کی یہ ہے کہ سر چھپانے کا ٹھکانا نہیں، دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ مشیر و حکم بننے کے لئے

دوڑے جارہے ہیں۔

خلافت کمیٹی کے تازہ ترین اجلاس کی کارروائی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے مقصود سے دور ہونے میں ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور "تبلیغ و تنظیم" کی طرف توجہ کرکے اس خلیج کو اور زیادہ وسیع کرنا چاہا ہے جو اب بھی ہندو مسلمانوں کے مابین کم وسیع نہ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ بعض ہندوؤں کا طرز عمل قابل اعتراض ہے اور شدہی و سنگھٹن کی تحریک مسلمانوں کے اندر مذہبی ہیجان پیدا کررہی ہے لیکن اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ اس کے مقابلہ میں "تبلیغ" و "تنظیم" کا علم بلند کیا جائے بلکہ اقتضائے وقت یہ تھا کہ بالکل سکوت اختیار کیا جاتا اور نہایت سکون کے ساتھ اس وقت کا انتظار کیا جاتا، جب شدہی اور سنگھٹن کے محرک ہندو خود اپنی مضرت رساں تحریک سے واقف ہوکر اسے ترک کردیتے۔ یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ مسلمان کسی ایسی تدبیر سے جو ہندوؤں کے سنگھٹنی جذبات میں اور زیادہ ہیجان پیدا کرنے والی ہو، کسی اچھے نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے اور نہ انھیں اس سے باز رکھ سکتے ہیں پھر جبکہ اصل مقصود اس فضا کا پیدا کرنا ہے جسے متحدہ ہندوستان کہتے ہیں اور جب یہ یقینی طور پر معلوم ہو کہ تنہا مسلمان کچھ نہیں کرسکتے تو پھر ہمارا فرض تھا کہ موجودہ کشاکش میں اور اضافہ کرنے کے بجائے معاملہ کو اسی کے حال پر چھوڑ دیتے۔ یہاں تک کہ ہندو اس کو محسوس کرنے لگتے کہ وہ بھی مسلمانوں سے علحدہ ہوکر تنہا اپنا مدعا حاصل نہیں کرسکتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس وقت جو خونریزیاں ہندو مسلمانوں کے درمیان ہورہی ہیں وہ نتیجہ ہیں صرف بعض فتنہ پرداز ہستیوں کی کوشش کا، اور یقیناً ہندوؤں کی ساری قوم کبھی اس کو پسند نہیں کرتی اور نہ یہ ہمیشہ قائم رہنے والی ہیں، اس لئے اگر اس وقت ملک کی ضروریات شدہی و سنگھٹن سے زیادہ بلند کسی اور چیز کی طالب ہیں تو ہم کو اسی پر نگاہ رکھنی چاہئے اور ان عارضی مناقشوں کو بالکل اس طرح طے کرنا چاہئے گویا کہ وہ بالکل غیر اہم چیزیں ہیں اور ان کی وجہ سے ہم کو وہ شاہراہ نہیں چھوڑنی چاہئے جسے ایک مرتبہ ہندو مسلمان دونوں باہم مل کر قائم کرچکے ہیں

بہرحال مسلمانوں کا موجودہ طریق کار یکسر قابل اصلاح ہے اور ضرورت ہے کہ جو حدود انھوں نے اپنی تدابیر کے مقرر کئے ہیں ان کو بالکل بدل دیا جائے چنانچہ سب سے پہلے تو خلافت کمیٹی کو ختم ہوجانا چاہئے کیونکہ جب خلافت کا وجود باقی نہیں رہا تو پھر خلافت کمیٹی کیسی؟

دوسرے یہ کہ "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" پر پبلک کو قابض ہونا چاہئے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کوئی اور انجمن قائم کرنا چاہئے جس کا تنہا مقصود مسلمانوں میں عام طور پر تعلیم کی اشاعت کرنا ہو اور اگر ہندو بھی اس مسئلہ میں ہمنوا ہوں تو میرے نزدیک فی الحال کانگرس ہی کا تنہا مقصود یہ قرار دینا چاہئے کہ ہندوستان کے ایک ایک بچہ کو تعلیم سے آشنا کیا جائے اور اس وقت تک کہ اس میں کامیابی نہ ہو اور تمام مسائل کو پس پشت ڈال دیا جائے جتنا روپیہ کانگرس کی تنظیم پر

ہندوستان کا صرف ہورہا ہے، یا جتنا روپیہ خلافت کمیٹی کے ذریعہ سے مسلمانوں کا تباہ کیا جارہا ہے یہ سب تعلیم پر صرف کیا جائے تو ایک ربع صدی کے اندر وہ انقلاب پیدا ہوجاتا ہے جو اس طرح بے اصولی کے ساتھ صدیوں میں بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اگست ۱۹۲۶ء | میرا ایک مضمون "نقاب اُٹھ جانے کے بعد" جون کے رسالہ میں شایع ہوا ہے اس کے متعلق بعض تحریریں میرے پاس اس قسم کی آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جس ہستی کا ذکر میں نے اس میں کیا ہے اس کو واقعی کوئی "موجود فی الخارج" شخصیت سمجھا گیا ہے، حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے، میں نے اس میں صرف ایک خیالی شخص کو پیش کیا ہے اور اس کا نام "وارث علی" بغیر کسی غور و فکر کے میرے قلم سے نکل گیا ہے، لیکن دنیا کا کوئی فرضی نام ایسا نہیں ہے جس کا مسمیٰ موجود نہ ہو اس لئے بعض اصحاب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے۔

اس فسانہ سے میرا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہمارے یہاں کے طبقۂ متصوفین و علماء میں بعض ایسے "نفوس مقدسہ" بھی پائے جاتے ہیں جن کے ظاہر و باطن میں بالکل سفید و سیاہ کی نسبت ہوتی ہے اور اس لئے صرف ظاہر کو دیکھکر باطن پر حکم لگانا قرین مصلحت نہیں کیونکہ بسا اوقات نتیجہ میں جو منظر ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ

چوں باز کنی مادر مادر باشد

عام طور پر صوبۂ یوپی میں اس امر کی شکایت کی جاتی ہے کہ پنجاب اپنی "جریدہ خیز" سرزمین سے اردو میں ناقص لٹریچر کا اضافہ کررہا ہے اور وہاں کا ممتاز سے ممتاز رسالہ بھی زبان کی فاحش اغلاط سے پاک نہیں ہوتا یہاں تک کہ یوپی کے اہل قلم بھی وہاں پہنچکر "طوطی در پس آئینہ" ہوجاتے ہیں لیکن اس حقیقت کا اعتراف کبھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کس "زندہ دلانہ" طریقہ پر خدمت زبان کے لئے مستعد نظر آتے ہیں اور جس ولولۂ نشاط کے ساتھ وہ کام کررہے ہیں، اس سے کس درجہ ان کے تقدم ادبی پر روشنی پڑتی ہے۔

اگر وہاں بہت سے ناکارہ رسائل شایع ہوتے رہتے ہیں تو وہ بند بھی ہوجاتے ہیں، لیکن یہ "اجراء و انقطاع" وہاں کی فضا میں کوئی پژمردگی پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ جس طرح ایک شاخ قلم ہونے کے بعد زیادہ قوت کے ساتھ نشو و نما پاتی ہے اسی طرح وہاں بھی اگر ایک رسالہ بند ہوتا ہے تو دس اُسکی جگہ لے لیتے ہیں، جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ تنقید صحیح کے ماتحت ہر جدید رسالہ کا معیار بلند ہوتا جائیگا اور ایک وقت آئیگا جب پنجاب اپنے رسائل کی "کمیت و کیفیت" دونوں حیثیتوں سے ترقی یافتہ نظر آئے گا۔

اس سے قبل جون کے نگار میں بہ سلسلۂ ملاحظات، پنجاب کے ڈرامیٹک کلب کے قیام کا ذکر آچکا ہے جس نے بہترین ڈراما کے لئے ایک ہزار روپیہ انعام کا اعلان کیا ہے اب لاہور کی انجمن اربابِ علم نے ادبی مقابلہ کے لئے ۱۲۵۰ روپیہ کا انعام تجویز کیا ہے جس کے شرایط کی تفصیل آپ کو ملک کے مختلف اخباروں سے معلوم ہوگئی ہوگی اور نگار کی آئندہ اشاعت میں ہم بھی اُسے درج کریں گے۔

اب اس کے مقابلہ میں یو۔پی کی گراں خوابی کو ملاحظہ کیجئے کہ اہل علم وقلم کی ترغیب وتشویق کے لئے مادی اعانت تو خیر بڑی چیز ہے، اس گہوارۂ زبان اور مہدِ ادب میں جو چند رسائل نظر آتے ہیں انکا بھی یہ حال ہے کہ ہر مہینہ کا رسالہ اس طرح نکلتا ہے جیسے آخری سانس۔ تلخ نوائی معاف، کیا اسی کارگاہ عمل پر یہ "طنطنۂ افتخار" ہے اور اسی حقیقت پر دعوائے "انا ولاغیری" زیب دیتا ہے، اے

طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ!

اپریل ومئی کے نگار میں ایک مضمون بہ عنوان "ہندو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں" مسلسل شایع ہوا ہے اس پر کسی ہندو فاضل کا ایک ناقدانہ مضمون اخبار شعاع بریلی میں نکل رہا ہے اس میں شک نہیں کہ قابل مضمون نگار نے پوری سعی نامشکور سے معاندانہ انداز تحریر کو چھپاتے ہوئے حق تنقید ادا کیا ہے، لیکن کیا یہ مناسب نہ تھا کہ وہ اس کو نگار ہی میں اشاعت کے لئے بھیجتے، تاکہ ہمیں بھی تحسین کا موقع ملتا جس قوت کے ساتھ وہ مسلمان بادشاہوں کی ستمرانیوں کا ثبوت پیش کر رہے ہیں ہر چند وہ کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ

صد بار خواندہ دگر از سر گرفتہ ایم

کی قبیل سے ہے، لیکن پھر بھی ہم اس "زور بازو ناآزمودہ" کی داد دینے میں اپنے آپ کو کم حوصلہ ثابت کرتے، اگر اُن کا محل نمائش نگار کے صفحات کو قرار دیا جاتا۔

ماہ جون کی ڈاک میں سب سے زیادہ پُرلطف تحریر بمبئی کے کسی اہل کلیسہ، جے مارٹن کی تھی جس میں صاحب موصوف نے مجھے مخاطب کرکے تحریر فرمایا تھا کہ:-

"سنا ہے آپ دین مسیحی کی طرف رجوع ہونا چاہتے ہیں، اگر یہ سچ ہے تو میں خوش ہوں کہ آپ نے دین حق کی طرف توجہ کی اور آپ جیسے قابل کی ضرورت بھی تھی سو خدا اور اس کا بیٹا بہت جلد پوری کرے گا"

لیکن اس تحریر میں قیامت کے فقرے تو یہ تھے:-

"دین اسلام ایک تنگ واوہام پرست مذہب ہے، اس میں رہکر آپ روحانی ترقی نہیں کرسکتے"

مجھے حیرت ہے کہ میرے عزیز دوست کو کیونکر یہ اطلاع بہم پہنچی کہ میں "دین مسیحی کی طرف رجوع" ہونا چاہتا ہوں حالانکہ اس سے قبل کبھی مجھے دین مسیحی قبول کرنے کا شرف حاصل نہیں ہوا کہ مسلمان ہونے کے بعد پھر اس طرف "رجوع" کرتا، لیکن اگر اس رجوع کے فقرے سے اُن کا مقصد مجھے دین مسیحی کی طرف دعوت دینا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر جے مارٹن جو مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور جو عین شباب کے عالم میں ان کے مصلوب ہونے اور زندہ آسمان پر اُٹھائے جانے کے قائل ہیں وہ ایسے مرتد شخص کو اپنے مسلک میں داخل کر کے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو خود انجیل مقدس کی اسناد سے مسیح کو ایک انسان کا بیٹا سمجھتا ہے، جو اعتقاد رکھتا ہے کہ مسیح عمر طبیعی کو پہنچکر عام انسانوں کی طرح اپنی موت سے مرے اور جو یقین رکھتا ہے کہ

دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

البتہ اگر مسٹر جے مارٹن یا اور کوئی عیسائی فاضل کسی صحیفۂ مقدس سے یہ ثابت کردے کہ میرا اعتقاد غلط ہے، تو میں مسیحی کیا معنی یہ دعا کرنے کے لئے طیار رہوں کہ -

خدایا جھود میرانم

رہا ان کا وہ فقرہ جس میں اُنھوں نے اسلام کو تنگ و اوہام پرست مذہب بتا کر روحانی ترقی کا دشمن ظاہر کیا ہے، سو اس کے متعلق میں صرف یہ عرض کرونگا کہ ؎

زخار خار محبت دل ترا چہ خبر
کہ گل بہ جیب نہ گنجد قبائے تنگ ترا

آپ اور اسلام پر اوہام پرستی کا الزام! جے مارٹن صاحب اور دین محمدؐ پر روحانیت کی دشمنی کا بہتان!!

ایں بہ بیداریست یارب یا بہ خواب

وہ شخص جس کے مذہب کی روحانیت کو مادہ پرستی ہمیشہ کے لئے محو کر چکی ہو، وہ اسلام کو روحانیت کا منافی خیال کرے وہ اسلام جس کے مقلدین میں بعض مادہ پرست لوگ بھی روحانیت کا واسطہ قائم کئے بغیر کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکتے ہوں، افسوس ہے کہ میرے معزز ناصح نے کافی غور نہیں کیا، ورنہ اس فقرے کو وہ اپنے ہی مسلک کے لئے زیادہ موزوں پاتے -

ہر چند اسلام کے لئے یہ دور سخت انحطاط و زوال کا دور ہے، لیکن بایں ہمہ جو "محرم باد صبا" ہے وہ جانتا ہے کہ اسلام میں اب بھی

باوجود خزاں بوئے یاسمن باقیست

اس نوع کی دعوت دیکھ اُس وقت سے ہوئے کہ مبادا کوئی "رند ژولیدہ مو" سن لے اور اپنی ادنیٰ توجہ سے

کام لے کر آپ ہی سے کہلوا لے کہ

"نکلا اک جام کی قیمت بھی نہ ایماں اپنا"

ستمبر ۱۹۲۶ء نگار اور ناظرین نگار کے مابین جو ادبی رشتہ قائم ہے، اس کا تقاضہ تو یہی ہے کہ "شکوہ و شکایت" کی راہ و رسم مسدود نہ کی جائے۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ اگر اسے جاری رکھا جائے تو بھی کیا فائدہ، جبکہ نتیجہ کے لحاظ سے اپنی ناکامی کی بہتر سے بہتر تاویل اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ:۔

این راہ و رسم تازہ ز حرمان عہد ماست
عنقا بروزگار کسے نامہ بر نبود

پھر نہ میں ایسا شاعر ہوں جو صرف اس خیال سے کسب لذت کرتا رہوں کہ "یاد آں جور و جفا می کنم دمی گرم" اور نہ کوئی صوفی ہوں کہ صبر و شکر کی ویران وادی کو کسی نہ کسی طرح "آبلہ پیمائی" کی صعوبتیں برداشت کر کے بغیر کسی شکایت کے گزر جاؤں، پس اگر اپنے دل کا خون کرونگا تو آپ سے بھی یہ مطالبہ ضرور رہیگا کہ "از مژہ و آستیں شناس" اور اگر آپ توجہ نہ کرینگے تو یقیناً یہ تلخ شکایت بھی ہوگی کہ

گوش سخن شنو کجا، دیدۂ اعتبار کو؟

پھر اگر فرصت ہو تو کسی وقت اس حقیقت پر بھی غور کیجئے کہ آپ نے اس وقت تک نگار کی کیا خدمت کی ہے، اور اس حال میں کہ آپ اس سے خدا جانے کیا کیا توقع رکھتے ہیں، ان توقعات کی تکمیل کے لئے آپ نے کیا اسباب فراہم کئے ہیں میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں کہنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ

اسرار عشق آنچہ تواں گفت، گفتہ ایم

اور نہ کوئی سائلانہ لب و لہجہ اختیار کرونگا، کیونکہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ مطالبہ ہے، نہ کہ کوئی گدایانہ التجا، اگر آپ چاہیں تو ادنیٰ توجہ سے توسیع اشاعت کے فرض کو بخوبی ادا کر سکتے ہیں ورنہ یوں تو

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

جدید رسائل کا اجرا یقیناً قابل مسرت امر ہے، لیکن نہ یوں کہ ان کا وجود صرف کشکول گدائی پر منحصر ہو اگر کوئی صاحب تجارتی نقطۂ نظر سے یہ مشغلہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تو میں انھیں مشورہ دونگا کہ

این جرعہ راز ساغر دیگر فرد برند

اور اگر مقصود صرف نمود و نمائش ہے تو پہلے اپنی اہلیت کا اندازہ کریں کہ وہ بغیر وقار خودداری کو صدمہ پہنچائے،

اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں یا نہیں، اب رہی تیسری صورت، جس کا نام "خدمت ملک و زبان" رکھا جاتا ہے سو اب اس کا حال یہ ہے کہ

در کشور بتاں گنہش نام کردہ اند

مجھے روزانہ دو ایک خط ایسے ملتے ہیں جن میں مضامین کا تقاضہ ہوتا ہے، اور پھر ہفتہ نہیں گزرتا کہ یاد دہانی بھی آجاتی ہے، میں ان احباب کا ممنون ہوں جو مجھے اس قابل سمجھتے ہیں، لیکن شاید انھیں علم نہیں کہ میں کس قدر مصروف و منہمک، اور اسی کے ساتھ کس درجہ حزیں و ملول زندگی بسر کر رہا ہوں، نگار کا معاملہ تو ایسا ہے جیسے غالب کے لئے مقطع کی "سخن گسترانہ بات"۔ بات کی پیچ، طبیعت کی ضد، کئے کی شرم، جگ ہنسائی کا اندیشہ ان سب نے مجھے پابزنجیر کر دیا ہے، ورنہ حقیقتاً زمانہ نے تو میرے دل و دماغ کو بیکار رہنانے اور میری ہمت کو پارہ پارہ کر دینے میں اپنے ترکش کا کوئی تیر ایسا نہیں ہے جو صرف نہ کر دیا ہو۔

پھر جب حالات یہ ہوں تو میں کیا اور کیونکر دیگر رسائل کی قلمی اعانت کر سکتا ہوں۔

وہ حضرات جو جناب خضر کے متعلق میری گفتگو سے برہم ہوئے ہیں وہ اشاعت حاضرہ میں اور زیادہ سامان دلچسپی پائیں گے، حضرت عیسیٰ کی نسبت گزشتہ اشاعت میں، میں نے بہ سلسلۂ ملاحظات ضمناً اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، اس کو ایک کرم فرمانے دیکھا اور سنجیدہ برہمی کے ساتھ مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں اپنی "نامسلمانی" کو (ظاہر بین و کوتاہ اندیش حضرات کے نقطۂ نظر سے) اس کے آخری حدود تک پہنچا دوں اگر اب بھی مجھے کوئی کافر نہ سمجھے تو میں اس کے ایمان کا ذمہ دار نہیں ہوں، بہرحال میری طرف سے کوتاہی نہیں ہوئی۔

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگِ رہ ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

گزشتہ تیرہ سو سال سے مسلمانوں کی ذہنیت میں جو انحطاط رفتہ رفتہ پیدا ہوا ہے اس کی روشن مثال اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ جس مذہب کے متعلق ان کو فطری ہونے کا دعویٰ ہے اسی کے متعلق وہ کوئی بات ایسی نہیں سن سکتے جو واقعی "فطرت آہنگ" اور قانونِ قدرت کے مطابق ہو۔ پھر اگر مذہب نام ہے صرف اعجوبہ پرستی اور دشمنیٔ عقل و ہوش کا، اگر اسلام کوئی ایسی چیز ہے جو صرف متقدمین ہی کے عہد میں پایا جاتا تھا اور اب اس کا وجود بالکل ایک (Fossil) کا سا وجود ہے اور اگر ہمارے مذہبی رہنما، داعیوں میں اتنی روشنی بھی پیدا نہیں کر سکتے کہ ہم اسلام کو ہر قوم و زمانہ کا مذہب سمجھنے کی اہلیت رکھیں تو میں کہونگا کہ

یارب زسیل حادثہ طوفاں رسیدہ باد　　بت خانۂ کہ خانقش نام کردہ اند

اکتوبر ۱۹۲۶ء اپریل و مئی کے نگار میں بر سبیل تذکرہ میں نے اپنی بعض ذاتی پریشانیوں کا اظہار کیا تھا جس کو دیکھکر اکثر احباب نے میرے پاس ہمدردی کی تحریریں روانہ کیں، اور بعض نے حد درجہ اصرار کے ساتھ مجھ سے ان پریشانیوں کی تفصیل بھی دریافت کی۔

ہر چند میں نے فرداً فرداً سب کو جواب لکھدیا ہے لیکن اس خیال سے کہ شائد بعض حضرات کی تحریریں نظرانداز ہوگئی ہوں میں نگار کے ذریعہ سے بھی اُن کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، لیکن اپنے حالات کی تفصیل نہ میں نے خط میں کسی کو لکھی، اور نہ اس جگہ اس کا اظہار کرونگا، کیونکہ درد و غم ناقابل تجزیہ چیزیں ہیں اور اس کو میں کسی طرح تقسیم کرکے اپنے بوجھ کو ہلکا نہیں کر سکتا، اور نہ غیرت اس کی متقاضی ہے۔

میری موجودہ زندگی بدستور "انتشار و فشار" میں گزر رہی ہے، اور شائد قدرت کا فیصلہ یہی ہے کہ میں دمِ واپسیں تک اُس کی اس امانت کا حامل رہوں اس لئے میری حالت دریافت کرنا اور اس کے جواب میں کسی اچھی خبر کی توقع رکھنا غالباً فطرت کے منشار کے خلاف ہے۔

ما خانہ رمیدگانِ ظلیم
پیغام خوش از دیار مانیست

شیخ شوکت علی صاحب بی، اے، ال، ال، بی، ساکن محلہ رکاب گنج لکھنؤ کی طرف سے ایک خط مجھے موصول ہوا ہے، جس میں شائد ایک وکیل کی حیثیت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ میں ان حالات کو ثابت کروں جو شاہ وارث علی کاظمی قادری کے متعلق جون کے نگار میں بہ عنوان "نقاب اُٹھ جانے کے بعد" میں نے تحریر کئے ہیں۔ اس خط میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو اس کا نتیجہ میرے حق میں "جیل خانہ جانا ہوگا" (یہ انھیں کے الفاظ ہیں) اول تو میں اس تحریر کو شیخ شوکت علی صاحب کی تحریر یقین نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کے الفاظ نہایت ناشائستہ اور طرز عبارت بالکل عامیانہ ہے، لیکن اگر ہو بھی تو قابل اعتنا نہیں سمجھتا، کیونکہ جبتک کوئی شخص "شاہ وارث علی کاظمی قادری" کی حیثیت سے میرے سامنے پیش نہ ہو، میں اپنے افسانہ کے ہیرو کو کبھی اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ خواہ مخواہ کسی معمولی "شاہ وارث علی" کا مسمی بننے کے لئے سامنے آجائے جس طرح وکیل صاحب موصوف اپنے فرضی موکل کی طرف سے یہ نوٹس دینے کے مجاز ہیں میں بھی اپنے اس ہیرو کی پوزیشن محفوظ رکھنے کا ذمہ دار ہوں، جو اس وقت خدا جانے کن کن ناموں سے ہندوستان کے اندر یاد کیا جاتا ہے۔

لیکن اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ "خرقہ پوشان سالوس" کے متعلق نگار میں کچھ نہ لکھا جائے تو میں اس تحریر کے

کاتب سے خواہ وہ شیخ شوکت علی صاحب وکیل ہوں، یا کوئی اور بزرگ، ماہ نومبر کا نگار دیکھنے کی درخواست کرونگا جس میں ایک ورایسی ہی ہستی کو "برافگندہ نقاب" پیش کیا گیا ہے۔

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

نومبر سنہ ۱۹۲۶ء | شاہ صفی کا شعر ہے اور بہت پرلطف شعر ہے :۔

ہر چہ بادا باد حرفے چند می گویم بدوست
کار خود در عاشقی ایں بار یکسو می کنم

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی شاعر نے اس پر عمل کیا، کیا حقیقتاً وہ کوئی اخیری فیصلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہ مجھے یقین نہیں نہ اس خیال سے کہ شاعر کی بات کا اعتبار کیا، بلکہ محض اس بنا پر کہ کمبخت انسان مایوس ہونے کے بعد بھی امید کا رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا چہ جائیکہ ایک عاشق جس کی زندگی کا ایک اک لمحہ اسی تفاول پر قائم ہے۔ مرزا نوشہ لکھتے ہیں :۔

نازم فریب صلح کہ غالب ز کوئے دوست
ناکام رفت و خاطرِ امیدوار بود

یعنی "فریب صلح" نے دل میں امید پیدا کر دی، حالانکہ یہ بھی "فریب امید" ہے پہلے ہی اگر دل اس جذبہ سے خالی ہوتا تو "فریب صلح" کی نوبت ہی نہ آتی۔

اس تمہید سے مدعا یہ ہے کہ میں بھی کبھی کبھی شاہ صفی کی طرح "کار خود ایں بار یکسو کنم" کے لئے بالکل آمادہ ہو جاتا ہوں اور اپنے حالات میں وہ تغیر پیدا کر لینا چاہتا ہوں جو مجھے موجودہ طلسم "بیم و رجا" سے نکال دے، لیکن بُرا ہو اس خاطرِ "اُمیدوار" کا کہ کبھی اس ارادہ میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اور باوجود اس کے کہ تکمیل عزم کے اکثر اسباب مہیا ہیں، لیکن جب سرے سے عزم ہی کا فقدان ہو تو پھر تکمیل کس کی۔

ہزار رخنہ بدام و مرا ز سادہ دلی
تمام عمر در اندیشۂ رہائی رفت

خدا کرے نگار کا نیا سال اس حال میں طلوع ہو کہ میں سارے افکار سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو اسی کے لئے وقف کر چکا ہوں۔

نگار میں ایک مضمون "غالب کی ذہنیت" کے عنوان سے شایع ہوا ہے، میرے ایک عزیز دوست کو جنھیں عربی کی پوری استعداد حاصل ہے اور جو ماشاء اللہ ادیب بھی ہیں لفظ "ذہنیت" پر اعتراض ہے اُنھوں نے اپنی ایک تحریر میں مجھ پر طعن کیا ہے کہ "ذہانت یا ذکاوت کے فرق کو اگر محسوس کر لیا جاتا تو ذہنیت کا لفظ استعمال نہ کیا جاتا" ان کا مدعا یہ ہے کہ لفظ ذہانت، ذہنیت کے مفہوم کو ادا کرتا ہے یا یہ کہ اُن کے نزدیک ذہنیت غلط ہے۔

میں نے اس کے جواب میں اُن سے دریافت کیا کہ براہ کرم (Mentality) اور (Intellect) کے فرق سے آگاہ کیجئے اور اسی کے ساتھ ان کا ترجمہ بھی لکھ دیجئے، لیکن اس کا جواب انھوں نے نہیں دیا چونکہ میرے دوست غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں، اس لئے میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ انگریزی میں قریب قریب اسی مفہوم کے تین لفظ ہیں:- (۱) Mentality (۲) Intelligence (۳) Intellect

اور اُن کا ترجمہ اردو میں بالترتیب ان الفاظ سے کیا جاتا ہے "ذہنیت" "ذکاوت" "ذہانت" اگر اُن کے نزدیک لفظ ذہانت، ذہنیت کے مفہوم کو ادا کرتا ہے تو پھر انھیں (Mentality) اور (Intellect) کے ترجمہ میں کوئی تفریق اس کے علاوہ کرنی چاہئے۔

میں اپنے فاضل دوست کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ (Mentality) کا ترجمہ اہل مصر بھی ذہنیت ہی کرتے ہیں اور اب اردو کے تمام اہل قلم اسی ترجمہ پر متفق ہیں اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنی ذہنیت میں تھوڑا سا تغیر پیدا کر کے طوعاً یا کرہاً اس کو تسلیم کریں اور زیادہ ذہانت سے کام نہ لیں۔

اپریل ۱۹۲۷ء اکاڈیمی کے شعبۂ اردو کے ممبروں میں سے علاوہ مسٹر رشید احمد صدیقی ایم، اے کے سر عبد الرؤف صاحب الہ آبادی بھی شریک نہ ہو سکے، لیکن ان کی عدم شرکت نہ غیر متوقع تھی نہ باعث افسوس وہ اس لئے کہ کچھ عرصہ سے وہ دائم المرض ہیں، اور یہ اس لئے کہ اُنھوں نے کبھی اردو ادبیات سے دلچسپی لینے کا دعویٰ اس سے قبل کبھی نہ کیا تھا، لیکن اس میں کلام نہیں کہ مولوی عبد الماجد دریابادی کا اس میں شرکت اختیار کرنا اور نہ صرف یہ بلکہ گورنر کے استقبال کے لئے دوسرے صف بستہ ممبروں کے ساتھ ملکر کھڑا ہونا، کم از کم میرے لئے ضرور حیرتناک تھا، کیونکہ وہ اس جماعت کی ممبری کو (باوجود اس کے کہ خود ہی اُنھوں نے اس کو قبول کیا تھا) اپنی پیشانی کے لئے بدنما داغ سے تعبیر کر چکے تھے۔

جون ۱۹۲۷ء گزشتہ ماہ کے رسالہ میں، جناب آرگس کے مضمون نے، جس میں ابن یمین اور حافظ شیرازی کی

شاعری کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، بعض حلقوں میں برہمی پیدا کردی ہے، ایسا اختلاف جس کی بنیاد صرف تحقیق حق پر ہو، یقیناً نہایت مفید چیز ہے، لیکن کم ہیں جن کا اختلاف تنقید صحیح ہوتا ہے اور زیادہ ہیں وہ جو صرف اپنے معتقدات کے نقطۂ نظر سے ہر چیز کو دیکھنا پسند کرتے ہیں چنانچہ اس مسئلہ میں بھی اکثر حضرات کی "جبین پیشانی" کا باعث محض وہ جذبۂ صنم پرستی ہے جو حافظ نہیں، بلکہ حافظ کے "بت" "سے قائم ہے، اور "بت" بھی کونسا؟ دنیائے تصوف کا، عالم "ہمہ اوست" کا اور اُس کارگاہ ظن وتاویل کا، جہاں مے و بادہ، کے معنے آب کوثر وسلسبیل، اور "ساقی" کے معنی مرشد کامل کے لئے جاتے ہیں، حالانکہ غریب بے خبر ہیں اس حقیقت سے کہ اگر حافظ کی رندانہ زبان، بادہ پرستارانہ غزل خوانی اس کی رامشگرانہ شاعری اور مذہب سے یکسر بے نیاز ذوق سخن کو اس کے حقیقی اور صحیح رنگ میں دیکھا جائے تو وہ "بت" سے زیادہ ایک غیر فانی "خدا" ہے عالم کیف وسرور اور دنیائے نغمہ ورباب کا ۔۔ کہ بت کو تو ادنی سی ضرب تیشہ کی توڑ سکتی ہے، لیکن خدا کی خدائی چھننے کا خیال بھی کسی کے دل میں پیدا نہیں ہوسکتا۔

میں خود آرگس کے دلائل کو ان کے دعوے کے ثبوت کے لئے ناکافی سمجھتا ہوں، جیسا کہ میں نے اس مہینے کے باب الاستفسارات میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ظاہر کیا ہے لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہوسکتے کہ کوئی صرف فلسفۂ دشنام کو پیش نظر رکھکر جواب دینے کی کوشش کرے درانحالیکہ اس تلخی کے ساتھ "لعل شکرخا" کا ادنی تصور بھی شامل نہ کرسکوں!

• جولائی سنہ ۱۹۲۷ء — جن لوگوں کو گرمی اور بارش کا زمانہ بھوپال میں بسر کرنے کا موقع ملا ہے وہ واقف ہیں کہ یہ دونوں موسم وہاں کے کس قدر ہلکے اور پُرلطف ہوتے ہیں۔ اس لئے اب جو میں بارہ سال تک ان دونوں کا لطف اٹھانے کے بعد یہاں آیا ہوں، تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ گرمی شاید خدا کا کوئی عذاب ہے جو ہر سال ہندوں پر نازل ہوتا ہے اور جس سے نجات پانے کی کوئی تدبیر انسان کے پاس نہیں ہے باوجودیکہ تمام وہ ذرائع جو تمدن کی اس عہد ترقی میں تمازت آفتاب اور برہمی موسم سے بچنے کے لئے مہیا ہوسکتے ہیں مجھے حاصل ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ گرمی خود اپنے اندر سے ابلتی ہوئی نظر آتی ہے اور حد درجہ ناکام دل کی نفس سرد بھی آہ زباں سوز ہوکر نکلتی ہے۔ پھر جس وقت یہ خیال کرتا ہوں کہ موت وحیات کے درمیان یہ کشمکش یہاں تقریباً اکتوبر تک اسی طرح رہیگی تو دل بیٹھنے لگتا ہے اور بے اختیار دل چاہتا ہے کہ بہار آنے سے پہلے ہی دامن وگریبان کے فاصلہ کو کم کردیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس ملک میں سال کا نصف حصہ اس طرح بسر ہو جہاں سال میں چار مرتبہ "تداخل فصلین" آدمی کو مہینوں صاحب فراش رکھے، وہ ملک کیا خاک

ترقی کرسکتا ہے اور وہاں کے بدنصیب افراد کیا دماغی و ذہنی امتیاز حاصل کر سکتے ہیں۔ آخری کاپی لکھی جارہی تھی اور میں گرمی کے خلاف ستیا گرہ کئے ہوئے بیکار پڑا ہوا تھا کہ مولوی نور الرحمٰن بی اے (بچھرایونی) کو جو حسن اتفاق سے آج کل میرے مہمان ہیں، مجھ پر رحم آیا اور اُنھوں نے معلومات کا حصہ مرتب کر دیا۔ جب سے نگار جاری ہوا ہے، غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ احول سے متاثر ہو کر نگار کی ترتیب کی طرف میں نے اپنے آپ مشوش پایا ہو، یہی سبب ہے کہ میں اس مہینے باب الاستفسار کی طرف بہت کم توجہ کرسکا۔

اکتوبر ۱۹۳۲ء لکھنؤ کا موسم ابھی تک ناخوشگوار ہے گرمی ہر چند مذبوحی حالت میں ہے لیکن رقص بسمل کی طرح ناپائدار نہیں۔ آفتاب کا طلوع و غروب ابھی تک خط استوا سے ہٹ کر جنوب کی طرف نہیں ڈھلا اس لئے زمانہ بدستور عرقناک ہے سنتے ہیں کہ ۱۵ر اکتوبر کے بعد سے یہاں نمایاں تغیر پیدا ہو جائے گا۔ لیکن ایفاء عہد کے خیال کے ساتھ جینے کی تمنا بالکل غیر شاعرانہ بات ہے اس لئے میں کوشش کر رہا ہوں کہ عالم نامرادی ہی میں زندہ رہنا سیکھ جاؤں۔

نومبر ۱۹۳۲ء معاصر خیابان نے اگست (اکتوبر؟) کی اشاعت میں نقطۂ نظر کے استعمال کے متعلق ایک دلچسپ تحقیقی نوٹ لکھا ہے خیابان کے فاضل مدیر کو نقطۂ نظر کی صحت میں شک تھا، اس لئے اُنھوں نے جناب طباطبائی کو حکم بنا کر اس کا فیصلہ چاہا اور صاحب موصوف نے پورے یقین کے ساتھ یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ :-

> "نظر، انگریزی کے محاورہ میں لفظ ہو تو ہو اردو کے محاورہ میں تار نظر اور مد نظر کی ترکیب اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ہماری زبان میں نظر نقطہ نہیں ہے، خط ہے یہ خیال زبان میں فلاسفۂ قدماء کے ایک مذہب کی رو سے پیدا ہوا کہ وہ لوگ اس کے قائل تھے کہ رویت کی حقیقت یہ ہے کہ آنکھ سے تار نظر نکل کر مرئیات پر پڑتا ہے، گو بعد میں یہ مذہب غلط ثابت ہوا مگر زبان پر جو اثر پڑ چکا تھا وہ زائل نہیں ہو سکتا............ غرض نقطۂ نظر کہنے کی کوئی صورت ہمارے محاورہ میں نہیں ہے، ہاں نظر کی صفت نکتہ دان، نکتہ بیں، نکتہ سنج آتی ہے اس اعتبار سے نکتۂ نظر کہنا درست ہے۔"

مجھے اس باب میں جناب طباطبائی سے سخت اختلاف ہے۔ نقطۂ نظر انگریزی کے "پوائنٹ آف ویو" (Point of View) کا ترجمہ ہے اور اس کا مفہوم وہی ہے جو حد نظر یا منتہائے نگاہ

کا ہو سکتا ہے - اس میں حقیقتِ رویت سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ اس کا اثر اُس پر پڑ سکتا ہے -
جب ہم کسی طرف دیکھتے ہیں تو ہماری نگاہ کسی مخصوص و متعین چیز پر پڑتی ہے - اسی طرح جب ہم غور و فکر یا کوئی تمنا کرتے ہیں تو کوئی مخصوص امر سامنے ہوتا ہے جس کے سمجھنے یا حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور اسی مخصوص و متعین چیز یا امر کو "نقطۂ نظر و خیال" یا ہدف نظر و خیال کہتے ہیں -

جناب طبا طبائی نے شاید اس پر غور نہیں کیا کہ "نقطۂ نظر" میں نظر سے مراد نگاہ نہیں بلکہ خیال یا تمنا ہے اور اس صورت میں نظر کے نقطہ یا خط ہونے سے بحث کرنا یا خواہ مخواہ مناظر و مرایا کے ان مسائل کو اس کی تحقیق میں داخل کرنا جن کی حقیقت کی طرف سے شاید جناب طبا طبائی خود بھی مطمئن نہ ہوئے ہوں گے بالکل دراز کار بات ہے - اسی کے ساتھ "نکتۂ نظر" کے استعمال کو درست ظاہر کرتے ہوئے جو استدلال پیش کیا گیا ہے وہ بھی محل نظر ہے - ارشاد ہوتا ہے کہ نظر کی صفت چونکہ نکتہ داں یا نکتہ سنج ہوتی ہے اس لئے نکتۂ نظر کہنا چاہئے -
نکتہ جس زبان کا لفظ ہے اس میں اس کا مفہوم یہ ہے :-

(۱) النقطۃ السوداء فی الابیض او البیضاء فی الاسود (۲) الاثر الحاصل من نکت الارض (۳) المسئلۃ الدقیقۃ اخرجت بدقۃ نظر و امعان فکر - ظاہر ہے کہ جناب طبا طبائی نے تیسرے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا ہے کیونکہ نکتہ سنجی وغیرہ اسی مفہوم سے پیدا ہے - لیکن فاضل حکم کی نگاہ اس طرف نہیں گئی کہ لفظ نکتہ اسم ہے اور جب تک کوئی لفظ مصدری معنے کا نظر کے ساتھ مضاف نہ ہو نکتہ سنجی وغیرہ کا مفہوم پیدا ہو ہی نہیں سکتا - اگر بجائے نکتۂ نظر کے نکتہ سنجی نظر، دقتِ نظر کہیں تو بیشک درست ہو سکتا ہے -

اب لفظ نقطہ کے مختلف محل استعمال پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ عربی میں اس کو انگریزی کے لفظ (Point) کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے - چنانچہ (Point of difference) کا ترجمہ نقطۂ اختلاف اور (Weak point) کا نقطۃ الضعف زبان عربی میں رائج و مستعمل ہے - حالانکہ جناب طبا طبائی کی تحقیق کے مطابق اس کو بھی غلط ہونا چاہئے کیونکہ ضعف یا اختلاف میں حقیقتاً نہ کہیں نقطہ کا وجود پایا جاتا ہے نہ خط کا
میں نے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر اس لئے کیا کہ مبادا نگار کے حلقہ میں غلطی یا غلط فہمی سے نکتۂ نظر کا رواج ہو جائے -

---

دسمبر سنہ ۱۹۲۷ء | اس اشاعت کے ساتھ نگار اپنی عمر کا چھٹا سال ختم کرتا ہے اور جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کا پرچہ گویا اس کی ساتویں سالگرہ ہے -
گزشتہ رسالوں کے تقریباً سات ہزار صفحات میں نگار کی طرف سے جو علمی و ادبی تاریخی و تنقیدی لٹریچر،

پیش کیا جا چکا ہے اور استفسارات کے سلسلہ میں جس قدر متنوع مباحث آ گئے ہیں وہ اگر ایک رسالہ کے لئے مایۂ ناز نہیں ہو سکتے، تو کم از کم اس کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ ایسا ناقابل افتخار سرمایہ بھی بازار کی جنس عام نہ تھا۔

ہندوستان کے رسائل "بیوفائی حیات" اور "زندگی مستعار" کے آئینہ دار ہونے میں بہت مشہور ہیں، اور اگر یہ قصور انھیں کا قرار پائے تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس سے ابنائے جنس کی عام سرد مہری کا جواز کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔ نگار کو ہر چند منظر اول کے مطالعہ کا فخر ابھی تک حاصل نہیں ہوا لیکن دوسرے منظر کے تلخ نقوش سے وہ بھی ناواقف نہیں ہے۔

رسم شکوہ و شکایت اس قدر فرسودہ ہو گئی ہے کہ مجھے شک ہے۔ ان الفاظ کا کوئی مفہوم کبھی تھا بھی یا نہیں اس لئے اس باب میں سکوت ہی زیبا ہے، گزشتہ دس سال کے اندر جو ذہنی انقلاب ملک میں ہوا ہے وہ اس قدر عجیب و غریب و اس درجہ امید افزا ہے کہ مشکل سے کوئی توقع اس سے زیادہ قائم کی جا سکتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی کم متحیر کرنے والی نہیں ہے کہ مطالبات دماغ کے ساتھ ساتھ دل میں بہت کم گنجائش نظر آتی ہے، اور وہ جو ایک مذموم عادت "گدائی کے ذریعہ سے تکمیل آرزو" کی پڑ چکی ہے، اس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا۔

میں اس کے مقابلہ میں فریق مقابل کی کامیابیوں کا ذکر نہ کروں گا کہ اس مرثیہ کا یہی بند سب سے زیادہ غیر فصیح ہے، بہر حال گزشتہ چھ سال کی تجربات جو کچھ بھی ہوں، کم از کم یہ ضرور کہوں گا کہ نگار کی قدردانی نہ صرف اس کو زندہ رہنے کی حد تک کی گئی، بلکہ اگر میں چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ یہ زندگی "نامردانہ زیست" نہ تھی اس لئے ہر نئے سال کا طلوع میرے لئے ایک دنیائے امید ساتھ لاتا ہے اور میں ایک ایک جدید کارگاہ قائم کرکے اسیر کار بند ہونا چاہتا ہوں، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس باب میں بقدر شوق و ولولہ، کامیابی بہت کم ہوتی ہے، یہاں تک کہ اسی الجھن میں وہ سال گزر جاتا ہے اور میں منزل کے پہلے ہی حصہ میں اپنے آپ کو پاتا ہوں۔

خدا کرے سنہ ۲۶ء زیادہ مبارک ثابت ہو اور میں بھی نگار کو ان تمام آرزوں کی تکمیل کی تصویر بنا کر پیش کر سکوں جو اجرائے نگار کی ابتداء سے میرے دل و دماغ میں موجزن ہیں۔

وافوض امری الی اللہ

پارچ سنہ ۱۹۲۸ء | ایک ترکی شاعر اپنی محبوبہ کے پاس اپنی تصویر بھیجتا ہے اور اس پر ایک شعر لکھتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ تو مجھے دیکھے بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میری چشم حیراں تجھے دیکھا کرے"

غالب کا شعر ہے :۔

تا چہا آئینہ حسرت دیدار تو ام
جلوہ برخود کن و مارا بہ نگاہی دریاب

بہر حال میں اپنی تصویر پیش کرتے وقت نہ یہ دیکھ سکتا ہوں نہ وہ بلکہ دنیائے شاعری سے بالکل علحدہ ہو کر مجھے نہایت سادگی کے ساتھ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس تصویر کی اشاعت سے اگر ایک طرف بعض احباب کے حکم کی تعمیل مقصود ہے تو دوسری طرف یہ خیال بھی ہے کہ آپ جس شخص کی سیرت کا مطالعہ بہ وساطت اسکے آرا و افکار کے سات سال سے کرتے چلے آرہے ہیں اگر آپ اس کی صورت کو بھی ایک مرتبہ دیکھ لیں تو کیا حرج ہے۔

ممکن ہے بعض حضرات اُس ذہنی تصویر کے لحاظ سے جو انھوں نے قائم کی ہوگی مجھے بہت مختلف پائیں، لیکن اب میں کہ میں خود آپ کے مواجہہ میں حاضر ہوں، سابق تصور و قیاس کے نتائج کو محو کر ڈالئے اور اب پھر غور کرکے فیصلہ کیجئے کہ آپ کسی ایسے شخص سے تو معاملہ نہیں کررہے ہیں جس کے ظاہر و باطن دونوں بالکل یکساں ہیں ——— آپ اپنی جگہ جو چاہئے فیصلہ کریں، لیکن اگر میرے سامنے یہ تصویر پیش کی جاتی تو میں صاحب تصویر کی سیرت کے متعلق اول نگاہ میں فیصلہ کر دیتا کہ

"گوزشت روست اما طبع جمیل دارد"

اس سے قبل متعدد رسائل میں میری تصویریں شایع ہو چکی ہیں، لیکن وہ سب فن کے لحاظ سے اس قدر ناقص ہیں کہ ان کے دیکھنے کے بعد میرے متعلق کوئی صحیح حکم نہیں لگایا جا سکتا، کہیں موقف مجل نے میری صحیح فطرت پر پردہ ڈال دیا ہے اور کسی میں نور و ظل کی عدم مناسبت نے وہ بات پیدا کر دی ہے۔ جو حقیقتاً مجھ میں نہیں ہے۔ بہر حال اس وقت جو تصویر پیش کی جارہی ہے وہ میری تازہ ترین شبیہ ہے جس میں بُطون کے چھپانے کی مطلق کوشش نہیں کی گئی۔ اس لئے میں ذمہ دار نہ ہوں گا۔ اگر آپ میرے متعلق یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے کہ

"ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا"

اپریل ۱۹۲۸ء ترقیاں دو قسم کی ہیں، ظاہری و معنوی، جنھیں زیادہ اصطلاحی صورت میں مادی و روحانی کہہ سکتے ہیں۔ ظاہری ترقی کا معیار یہ ہے کہ دولت وافر ہو اسباب راحت فراواں ہوں، اور سامان عیش و تنعم کثیر معنوی ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ قلب پُر سکون ہو دماغ مطمئن ہو اور روح بے نیاز و مستغنی۔ ہر چند دونوں کا اجتماع محال

نہیں، لیکن کمیاب ضرور ہے۔ اس لئے جو لوگ زیادہ سنجیدہ اور متین ہیں، وہ ہمیشہ روح کو جسم پر ترجیح دیتے ہیں اور دیبا و حریر کی نرمی سے زیادہ خشونت گلیم کو پسند کرتے ہیں۔ یہ ہے فلسفہ اخلاقیین کا اور غالباً بڑی حد تک درست ہے۔ اڈیسن اور فورڈ کا مسلک اس سے بالکل جدا ہے ان کے ہاں مادی ترقی بھی روحانی ترقی کی طرح لامحدود شے ہے اور ان کا قول ہے کہ دولت کی فراوانی، ہئیت اجتماعی کا استحکام ہے اور یہی وہ مقصد اصلی فطرت کا ہے جسے نہ مسیح کا درس رہبانیت پورا کر سکا، نہ چنگیز و سکندر کی خون آشام تلوار ——— یہ نظریہ بھی بہت خوشنما اور قرین عقل معلوم ہوتا ہے مگر دنیا میں ایک جماعت اور بھی ہے جو نہ اُس فلسفہ کی لذت آشنا ہے، نہ اِس نظریہ کی یعنی نہ اس غریب کے پاس دولت ہے نہ روحانیت، نہ اسباب راحت روح ہیں نہ سامان عشرت جسم پھر لطف یہ ہے کہ وہ زندہ بھی رہنا چاہتی ہے اور لطف و آسائش کے ساتھ!!

مارا ہنوز عربدہ با خویشتن بسے ست

. . . .

مئی ۱۹۲۸ء | وقت و موسم کی قوت مسلم ہے اور تمام عالم خلق کا تغیر بڑی حد تک اسی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، انسان کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح اس کے مضر و مکلف اثرات کا مقابلہ کرے، اور چونکہ فطرت کے ساتھ اس کی یہ جنگ ابتداء کائنات سے چلی آرہی ہے اس لئے اس قدر کہنہ مشقی کا فائدہ صرف یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وہ بقدر جبر حیات کامیاب بھی ہو جاتا ہے، لیکن اکثر نہیں۔ مدعا یہ ہے کہ لکھنؤ کا آتشبار موسم شروع ہو گیا ہے اور اب "دل راحت طلب" کو اکثر استاد وزیر کا یہ مصرع یاد آتا رہتا ہے کہ:۔

زمیں کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہوکر

جون ۱۹۲۸ء | گزشتہ ماہ کے رسالہ میں مدیر سچ (جناب عبدالماجد صاحب دریابادی) کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا[1] اس پر آخرکار اخبار سچ مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۲۸ء میں ۲½ کالم کا ایک نوٹ شایع ہو ہی گیا۔ ہر چند کہ اُدھر جناب

---

[1] وہ مضمون حسب ذیل ہے:۔

نصر اللہ بلڈانوی، عبدالماجد دریابادی اور نیاز فتحپوری

جناب نصر اللہ صاحب بی اے، بلڈانہ (صوبہ برار) کے کوئی بزرگ ہیں، جنھوں نے ہمارے محترم و فاضل دوست مولوی عبدالماجد دریابادی مدیر سچ) کے نام ایک تحریر روانہ کی جو ۲۰ اپریل ۱۹۲۸ء (ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹ میں)

یوسف کے غیر معمولی حسن وجمال سے انکار کرتا ہوں، مگر کوئی میرزا منش کوئی خواجہ زادہ اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ میں بہشت ودوزخ کی مادی حیثیات کو نہیں مانتا، میں حشر اجساد کا قائل نہیں میں تمام مسائل شریعت کو وقت کے لحاظ سے قابل اصلاح وترمیم کہتا ہوں، لیکن کوئی اسلام پرست اور محب اسلاف مومن ان باتوں کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، لیکن محمد حسین آزاد کے خلاف، یعنی ایک ایسے شخص کے خلاف جو کسی طرح اکابر امت میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ مختصر الفاظ میں اظہار رائے کرتا ہوں، تو یہاں سے لیکر وہاں تک آگ لگجاتی ہے، درسگاہوں کے حجروں سے لیکر صحافت گاہوں کے ایوانوں تک ماتم بپا ہوجاتا ہے۔

گویا کہ تازہ خوں زکفن برچکیدن ست

یہ کیا تماشہ ہے! یہ کیا عجیب وغریب منظر ہے۔!!

کیا بت پرستی کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے، کیا شرک وبدعت کی تعبیر میں اس سے زیادہ کسی اور روشن مظاہرہ کی ضرورت ہے؟

کس قدر حسرتناک ہے اس قوم کی تہی مایگی جو اپنے کسی فرد کے خلاف کوئی بات نہ سن سکے، صرف اسلئے کہ اس کو ناکارہ مان لینے کے بعد کوئی دوسرا اس جگہ پیش کرنے کے لئے موجود نہیں ہے۔

آزاد کی آبحیات کے متعلق جو مضمون شایع ہوا ہے اس کا جواب دینے میں جس وسعت ظرف ونظر سے کام لیا گیا ہے وہ یقیناً داد سے مستغنی ہے۔ کہنے والا کہتا ہے اور تذکرہ وتاریخ، روایت ودرایت سے ثابت کرتا ہے کہ آزاد نے فلاں فلاں جگہ تحریف واقعات کی صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح لکھنے میں اسپنے پورے قصد وارادہ کو صرف کیا، لیکن جواب دینے والا ان باتوں کا ذکر ہی نہیں کرتا کیونکہ دلائل بالکل قطعی وداغانی ہیں، بلکہ وہ اپنا دل صرف مجھے گالیاں دیکر ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے، حالانکہ اگر مجھے جاہل کہنے سے آزاد کے سر سے یہ تمام الزامات اٹھ جاتے تو اس کی نوبت ہی نہ آتی، جب کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو یکسر معائب ونقائص پایا اور ظاہر کیا ہے۔ کیا ایک کو گالیاں دیکر دوسرے کی برتری ثابت کرنا ایسا زبردست کلیہ ہے کہ اس میں کوئی استثنا ہو ہی نہیں سکتا، یعنی میرے اور آزاد کے باب میں بھی نہیں!

برتمناہائے عرفی خندہ می آید مرا

اگست ۱۹۲۸ء آج مسئلہ نسائیات کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ "مدرسہ وخانقاہ" کے گوشوں سے بھی اس پر رائے زنی کی جارہی ہے اور موج کا رُخ یہ ہے کہ وہی کتب مذہبی جن سے پہلے عورتوں کیلئے "زنجیر وسلاسل" قید وبند کے احکام کا استخراج ہوتا تھا، اب انھیں سے یہ ثابت کیا جارہا ہے کہ موجودہ پردہ کا

استبداد ایک لعنت ہے اور یکسر تعلیمات اسلام کے منافی۔ اس سے قبل نگار میں بہ سلسلۂ استفسار میں نے عرض کیا تھا کہ کلام مجید سے پردہ کے متعلق جو احکام مستنبط ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:۔

(۱) عورتیں چار دیواری کے اندر بند نہ کی جائیں۔

(۲) مناسب و ضروری پردہ کے ساتھ وہ باہر نکل سکتی ہیں۔

(۳) پردہ ایسا ہونا چاہئے جس سے آرائش ظاہر نہ ہو۔ اس لئے ہمارے یہاں کا موجودہ برقع عین اسی حکم کے مطابق ہے۔

(۴) اگر کوئی ایسا حصۂ جسم کھل جائے جس کا چلنے میں کھل جانا اور اس طرح اس کی زینت کا ظاہر ہو جانا ناگزیر ہو (جیسے ہاتھ پاؤں) تو کوئی حرج نہیں۔

لیکن میری اسی معتدل تحریر پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ آج جناب عبد الماجد صاحب دریابادی پردہ کے متعلق ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ عورت کا چہرہ چھپانے کی چیز نہیں اور اسلام نے اجازت دی ہے کہ وہ برافگندہ نقاب جہاں چاہے پھرے۔ لیجئے "قصہ ہی طے ہوا من و تو کی نزاع کا" اس کے آگے اب مطالبۂ "ہل من مزید" کے لئے صرف ایک ہی چیز رہ جاتی ہے اور کیا عجب ہے کہ اگر کل کو ثریا بیگم (ملکۂ افغانستان) عریاں لباس رقص میں نمودار ہو جائیں، تو عبد الماجد صاحب یہ فتویٰ بھی صادر کر دیں کہ جب چہرہ ہی کھل گیا، جب کوئی بے نقاب سامنے آ ہی گیا، جب کسی نے ہم کو اور ہم نے کسی کو یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ ہی لیا اور جسم انسانی کا وہی حصہ جو "سر فتنۂ عشق" کہلاتا ہے بے حجاب ہو گیا تو پھر کرتے چڑھائے ہوئے پائینچے اٹھائے ہوئے سر بازار آ جانے میں کیا مضائقہ ہے ——— وائے گر در پس امروز بود فردائے

اللہ نے تو رسول کو سورۂ احزاب میں یہی ہدایت فرمائی تھی کہ:۔

یا ایہا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیہن من جلابیبہن ۰

(اے رسول اپنی بیویوں بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کر دو کہ وہ اپنے اوپر نقاب ڈال لیا کریں) لیکن یہ معمہ آج عبد الماجد صاحب کے قلم حق رقم سے حل ہوتا ہے کہ یدنین علیہن من جلابیبہن کے معنے بے نقاب ہو جانے اور چہرہ کھول کر بازار میں بے نقاب آ جانے کے ہیں۔ فریاد از تطاول مشکیں کمند تو!

مجھ پر وکیل ہو کر پیشۂ طبابت اختیار کرنے کا الزام تھا، آج دنیا اس طبیب حاذق کی حذاقت کا بھی مشاہدہ کرے دنیا کے اس قائد اعظم، کائنات کے اس مصلح کبیر اور عالم اسلامی کے اس ماہر قرآن و حدیث کے فتاوائے دینی کو بھی دیکھ لے۔ تاکہ آئندہ وکیل و طبیب کے امتیاز میں کسی کو التباس نہ واقع ہو، اور خیر و برکت کا وہ دروازہ جو عورت کے چہرہ کو داخل ستر نہ کرنے سے عبد الماجد صاحب نے کھول دیا ہے اس کا طرۂ امتیاز کسی ملحد و دہریہ کو نہ حاصل

ہو جائے۔

حال ہی میں جناب عبدالماجد صاحب کا ایک افتتاحیہ "اخبار ہمدم" میں شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ انگریزی ذہنیت کسی طرح ہندوستانی ذہنیت سے بالا و برتر نہیں ہے اور اس کے ثبوت میں انھوں نے استدلال پیش کیا ہے کہ اس وقت تک ایک انگریز بھی ہندوستانی زبان میں وہ مہارت پیدا نہیں کر سکا جو ہندوستانیوں نے انگریزی زبان میں حاصل کی ہے اسی طرح علم و فضل کے سلسلہ میں انھوں نے چند نام اہل ہندوستان کے شمار کرائے ہیں، لیکن کیا اچھا ہوتا کہ اگر فاضل افتتاحیہ نگار اسی سلسلہ میں یہ بھی بتا دیتے کہ جب ایک قوم نہ اپنے ذہنی اکتسابات کے لحاظ سے قابل لحاظ ہے اور نہ اخلاقی حیثیت سے لائق ذکر تو پھر اس کی ترقی کا راز کیا ہے اور دوسری قوم جو علم و فضل میں بھی تفوق رکھتی ہے اور اخلاق و عادات میں بھی بلند مرتبہ والی ہے اس کے انحطاط و زوال کا کیا سبب ہے۔

کلام مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم

(یعنی جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں دنیا میں قیام عطا فرمائے گا جس طرح اس سے قبل کے لوگوں کو قیام عطا ہوا)

پھر اگر استخلاف فی الارض سے مراد وہی "چہ خورد بامداد فرزندم" والی حالت ہو تو یقیناً ہندوستانیوں سے زیادہ کوئی مستحق اس کا نہیں ہے اور یقیناً تمکن فی الارض انھیں کو حاصل ہے لیکن اگر استخلاف سے مراد حکومت و ثروت، جاہ و دولت فراغدستی و خوشحالی اور ہر وہ چیز ہے جس کو "جنت عدن" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے تو پھر یہ معمہ کیونکر حل ہو سکتا ہے کہ استخلاف اور عمل صالح میں باہم کیا نسبت ہے۔ اگر استخلاف بغیر عمل نیک کے بھی ممکن ہے تو عدۂ الٰہی بیکار ہو جاتا ہے اور اگر یہ ناممکن ہے تو پھر دو ہی صورتیں ہیں یا تو استخلاف کا مفہوم دنیاوی نکبت و ذلت قرار دیا جائے یا انگریزی قوم کو تمکن فی الارض کے لئے اصلح تسلیم کیا جائے؟ تاریخ اجراء سے لیکر اس وقت تک پیج کے جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں اگر ان کو دیکھا جائے تو سوائے اس کے کچھ نہ نظر آئے گا کہ یورپ کے فلاں ملک میں اتنے جرائم ہوئے فلاں مقام پر سال میں اتنی طلاقیں ہوئیں، فلاں لاء ڈ کی لڑکی عریاں رقص کرتی ہوئی پائی گئی وہاں شراب کا اتنا صرف ہے، قمار بازی میں اتنا روپیہ ضائع ہوتا ہے، وہ ہم پر یہ ظلم توڑ رہے ہیں، لیکن اس کی توفیق نہ ہوئی کہ کبھی یہ بات بتاتے کہ فلاں عالم نے یہ ایجاد کی، فلاں ڈاکٹر نے یہ اختراع پیش کی، وہاں علم و فضل کی کیا خدمت ہو رہی ہے، فلاح قومی کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں، ہمارے مظلوم ہونے کے کیا اسباب ہیں ہم میں

کیا نقائص ہیں اور ہم ان کو کس طرح دور کر سکتے ہیں -
کیا کلام مجید میں "استخلاف فی الارض" کے لئے جس عمل صالح کی شرط قرار دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ دوسروں کی عیب چینی کی جائے اور اپنے معائب کو بھی محاسن کی صورت میں پیش کیا جائے کاش کہ عبدالماجد صاحب بجائے اس سطحی مقالہ کے اصل مسئلہ کی طرف توجہ فرماتے اور غور کرتے کہ کیا ہندوستانی دماغ کی برتری ان حالات کے ماتحت سراہے جانے کے قابل ہے، اور کیا سورۂ احقاف میں خدا نے یہ کلیہ قائم کر کے کہ :-

فہل یہلک الا القوم الفاسقون

ہم کو یہ نہیں بتا دیا کہ ایک قوم کی دماغی و ذہنی بلندی کا ثبوت اگر ہو سکتا ہے تو وہ صرف اس کی ترقی ہے اور جو قوم ہلاک ہو رہی ہے وہ یقیناً فاسق ہے، ناقابل ہے اور اس کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ کو بہتر کہہ سکے - جناب عبدالماجد کی صحافت و انشا کا انحصار صرف اسی پر ہے کہ اہل یورپ کے معائب کو نمایاں کیا جائے اور اس غلو کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کا لٹریچر ہی حاسدانہ نکتہ چینی ہو کر رہ گیا حالانکہ یہ حقیقت واضح ہے کہ دنیائے عمل میں اس طرز تحریر کو صرف "کوسنا" کہتے ہیں اور اسی لئے اس کو صرف اُس منبر کے لئے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے جس کے لبوں کی جنبش اس زہر کو بھی شیریں بنا کے پیش کرتی ہے - عبدالماجد صاحب سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ باوجود سعی بسیار کے بھی کبھی اس نوع کی جاذبیت اپنی جنبش لب میں پیدا کر سکیں گے -

---

اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء | جناب عبدالماجد صاحب دریابادی نے نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر رائے زنی فرماتے ہوئے اس قدر عجیب و غریب بات لکھی ہے کہ شاید ہی اس کی نظیر "تاریخ تنقید" میں کہیں مل سکے - آپ فرماتے ہیں کہ :-

"نہرو کمیٹی رپورٹ میں کیا کچھ نہیں، رعایا کے حقوق، حکومت کے اختیارات، برطانیہ سے تعلق، قانون ساز مجلسوں کی ترکیب، ان مجلسوں میں مختلف قوموں کا تناسب، طریق انتخاب .... اور اسی قسم کے دوسرے مسائل پر تفصیلی تبصرہ اور تحقیقی فیصلہ"

یعنی یہاں تک تو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ نہرو کمیٹی رپورٹ ایک بہترین سیاسی دستاویز ہے جس پر ہندو مسلمان طمینان سے اپنے دستخط ثبت کر سکتے ہیں، لیکن اسی کے بعد ہی جس طرح کوئی بھولا ہوا خواب یاد آجائے، چونک کر فرماتے ہیں کہ :-

"لیکن اس ۱۵۰ صفحہ کی کتاب میں شروع سے اخیر تک خدا کا نام نہیں آنے پایا ہے، مادیت کی اس نقارخانہ میں قوم کی روحانی و اخلاقی زندگی کی کہیں بھنک تک نہیں پڑنے پائی ہے، حکومت کا اصلی اور اعلیٰ مقصد تمام تر حکومت ہی کو رکھا گیا ہے، نہ کہ زمین پر خلافت الٰہیہ یا خدمت اللہ کو وغیرہ وغیرہ"

اگر عبدالماجد صاحب ایک سیاسی رپورٹ میں، خدا کا نام روحانی و اخلاقی زندگی خلافت الٰہیہ وغیرہ کی جستجو کرتے ہیں اور یہ باتیں اس میں نہ پاکر چیں بجبیں ہوتے ہیں تو نہرو کمیٹی رپورٹ والوں کو بھی اسی قسم کی تنقید کا حق حاصل ہے اور وہ بھی ہدایہ، شامی، جلالین، بخاری بلکہ خود قرآن میں یہ جستجو کرسکتے ہیں کہ اُن میں کہیں ہندوستان کے متعلق سوراج، کھدر، چرخا، کونسل اسمبلی، اور نہرو کمیٹی کا ذکر ہے یا نہیں اور پھر آخیر میں مایوس ہوکر ان کتابوں کے مفید ہونے سے انکار کرسکتے ہیں۔ کاشکے عبدالماجد صاحب خود ہی کوئی الہامی رپورٹ مرتب کرتے تاکہ دنیا کا ہر شخص اُسے "آیت من آیات اللہ" سمجھ کر تسلیم کرلیتا اور جس کی رو سے سیاسی اور سنیاسی میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔

اسی کے ساتھ قیصر باغ، بٹلر پیلس یعنی ملک کے صاحب ثروت لوگوں کا ذکر اُنھوں نے جس جلن کے ساتھ کیا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ وہ تو اُن کے نزدیک ہمیشہ سے "طالبہا کلاب" میں داخل ہیں، اور ایک دولت مند کے مقابلہ میں غریب آدمی تسکین رشک و حسد اسی طرح کیا کرتا ہے، سچ ہے -

ہر بوالہوسے کہ نہ داند جلم دسنداں باختن

نومبر ۱۹۲۸ء جناب عبدالماجد صاحب دریابادی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ نہرو کمیٹی رپورٹ میں مجرموں کو جسمانی سزا دینے سے اختلاف کیا گیا ہے اور اس طرح گویا "مسلمان چوری کرے گا، لیکن اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا، مسلمان زنا کریگا اور سنگسار نہ ہوسکے گا، مسلمان شراب پیئے گا اور اس کے درّے نہ لگائے جاسکیں گے، یعنی سات کروڑ مسلمان اپنی شریعت کی بیچارگی ہر منٹ محسوس کرکے رہجائیں گے"

غالباً یہاں یہ بحث بیکار ہے کہ ہاتھ کا کاٹا جانا، سنگسار کیا جانا اور درّے لگانا کس حد تک سرقہ، زنا اور میخواری کا انسداد کرسکتا ہے اور اس وقت تک شدید یا خفیف جسمانی سزاؤں نے دنیا کے جرائم میں کتنی کمی پیدا کی ہے، لیکن جناب عبدالماجد صاحب سے یہ دریافت کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ اگر مسلمانوں کے لئے قانون میں ان کے تمام مطالب کی رعائت کردی جائے تو پھر وہ اس میں کسی استثنائی دفعہ کا مطالبہ تو نہ کریں گے جس سے علماء اور رہبران قوم اس قسم کے تعزیروں سے محفوظ رہیں یا یہ کہ مفتیان اسلام کو تو کسی ایسے حیلۂ شرعی پیدا کرنیکی اجازت نہ ہوگی جو ایک ہی ناجائز بات ان کے لئے قابل معافی اور دوسروں کے لئے لائق تعزیر ہو؟ کیونکہ خود شریعت کوئی چیز نہیں ہے اگر اس کے نافذ کرنے والے فاروق جیسے انسان نہ ہوں خیر یہ تو سیاسی لطائف ہیں جنپر کوئی شخص توجہ نہیں کرتا، لیکن واقعی سنجیدگی کے ساتھ جو اختلاف کیا گیا ہے وہ بھی میرے نزدیک بالکل لایعنی ہے یہاں تک کہ بہت سے اختلاف کرنے والے خود بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ کیوں مخالف ہوگئے ہیں۔

ہم اس سے قبل ظاہر کرچکے ہیں، اور اب پھر اس کا اعادہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ انجمنوں کی کثرت کوئی

محمود طریق کار نہیں ہے اور مسلمانوں کی ان دو جمعیتوں کو جن کا نام تبلیغ و خلافت ہے یقیناً مٹا دینا چاہئے اول الذکر جماعت کا وجود سیاسیات ہند کے لئے بے انتہا مضرت رساں اور خود مسلمانوں کے لئے بھی مذہبی نقطۂ نظر سے غیر مفید ہے۔

اول تو میں اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں کہ تبلیغ کانفرنس نے جماعت اسلامی میں کوئی قابل ذکر اضافہ کیا ہے اور اگر اسے تسلیم کر بھی لیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ اس وقت دنیا میں حصول ترقی کا ذریعہ کمیت نہیں بلکہ کیفیت ہے اور اس کا فقدان پہلے ہی سے کم نہیں ہے، رہی خلافت کمیٹی سو بہ حالت موجودہ جبکہ خلافت کا وجود باقی نہیں رہا، اس کی ایک ناکارہ یادگار قائم رکھنا قرین عقل و انصاف نہیں جس طرح دوران قیام خلافت میں اس کمیٹی کا روپیہ نامناسب محل و موقعہ پر استعمال کیا گیا، اسی طرح اب بھی ہو رہا ہے چنانچہ سنا گیا ہے کہ کلکتہ میں نہرو کمیٹی رپورٹ کے خلاف پروپگنڈا کرنے کے لئے خلافت کمیٹی نے کافی مالی امداد دی ہے، جو یقیناً اس کے مقاصد و فرائض سے بالکل علیحدہ چیز ہے۔

مسلمانوں کو اگر اپنی کوئی مخصوص انجمن قائم کرنا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلم لیگ کو از سر نو زندہ نہ کیا جائے اور تمام قوتیں اسی کے اصلاح میں نہ صرف ہوں۔

دسمبر ۱۹۲۰ء میں دیکھتا ہوں کہ مشاعرہ کی بدعت طبقۂ شعراء سے گزر کر اسکولوں، کالجوں، ہوسٹلوں اور یونیورسٹیوں میں بھی پہونچ گئی ہے اور شاید ہی کوئی سالانہ تقریب ایسی ہوتی ہو جس میں بزم مشاعرہ کا انعقاد ضروری نہ خیال کیا جاتا ہو، میں نے جہاں تک غور کیا یہ نتیجہ ہے اس ادنیٰ قسم کی ذہنیت کا جو موجودہ نصاب تعلیم اور اصول تربیت کے ماتحت اس وقت ہندوستان کی بڑی سی بڑی درس گاہ میں پائی جاتی ہے، اگر کسی سالانہ احتفال کے موقعہ پر کسی سنجیدہ و مفید مشغلہ میں مصروف ہونا ممکن نہیں اور صرف سطحی تفریح مقصود ہے، تو میرے نزدیک مشاعرہ سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ "رقص و سرود" کا جلسہ منعقد کیا جائے یعنی شعر گوئی شعر فہمی سے پہلے وہ سامان پیدا کیا جائے جو شعر کہنے اور سننے کا اہل بناتا ہے۔

اس مرتبہ جب الٰہ آباد یونیورسٹی کے بعض طلبہ نے کانوکیشن کے موقعہ پر مشاعرہ میں شرکت کی دعوت مجھے دی تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ وہ کیوں نہیں کوئی اس سے زیادہ مفید صورت سالانہ اجتماع کی قرار دیتے انھوں نے جواب دیا کہ "مشاعرہ سے ان کا مقصود اردو زبان کی ترقی اور ہندو طلبہ میں اس کا ذوق پیدا کرنا ہے" مجھے ان کے اس طفلانہ جواب پر بے اختیار ہنسی آگئی اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان کے جواب کے دوسرے فقرہ کی سیاسی اہمیت کو زائل نہ کرنے کے لئے خاموش ہی رہوں تو بہتر ہے۔ لیکن میں یہ کہنے سے بہرحال باز نہ رہ سکا "جب آپ خود ہندی بھاشا کے

کہ اول تو وہ منزل ملے

"مرا کردہ اند آشکارا ہمن"

کہتے ہیں جنون کوئی ایسی بلند منزل نہیں جسکو ہر شخص بادنیٰ تامل نہ پاسکتا ہو چہ جائیکہ اسمیں بھی ناصبوری سے کام لیا جائے۔ اس لئے میں بے نیازانہ انداز سے آگے بڑھا اور میں نے اپنی فطری ودیعتوں میں سے ایک نہایت ہی ابتدائی منزل کی ودیعت کو بے نقاب کرنا چاہا لیکن حیرت ہے کہ دنیا اسکے بھی سمجھنے کے لیے تیار نہیں اور حسبِ وقت میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ۔

"لکے ز آبگینہ و ساغر آورم"

تو وہ مجھ سے منہ پھیر لیتی ہے، مجھے کافر کہتی ہے۔ دہریہ اور ملحد کے لقب سے یاد کرتی ہے اور اپنے جہل سے میرے علم کو مغلوب کرنا چاہتی ہے حالانکہ یہاں یہ عالم ہے کہ "گرانی محمل" کا احساس حسبِ قدر قوی ہوتا جاتا ہے، اسی اعتبار سے

"ہر پردہ را ولولہ سنجم ہزار بار"

اسلئے میں اپنے تمام احباب سے خواہ کسی مذہب و مسلک کے متبع ہوں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے نشانہ مقصود کے سامنے یہ تمام نسبتیں، یہ جملہ اضافات وہی حقیقت رکھتی ہیں جو "پارہ کتاں" چاند کے سامنے اور بحمد اللہ میں اس سے بہت بلند ہوں کہ اس "نا استواری تسبیح" کا تماشہ دیکھنے کیلئے ایک لمحہ کو بھی اپنی نگاہ پستی کیطرف مائل کردوں ——— دنیا اگر اپنی صحرا نوردیوں میں خضر کو راہبر بنانا چاہتی ہے تو بنائے اور جبتک جی چاہے سکندر کی ناکامی کا انتقام اس سے لیتی رہے لیکن مجھے اس جستجو میں دعوت شرکت نہ دے کہ۔

سیلاب را بہ بادیہ رہبر گرفتہ ام

اگر ایکطرف یہ عزم استوار ہے کہ تنقید خواہ وہ معاشرت اخلاق سے متعلق ہو یا مذہب و سیاست سے، ہمیشہ بلند نقطۂ نظر سے ہونا چاہیئے، تو دوسری طرف میں اپنی فطرت کی اس کمزوری سے بھی واقف ہوں کہ وہ کسی کا دل دکھانا گوارا نہیں کرتی، اور اسلئے جب مجھے اس کا علم ہو جاتا ہے کہ میری تحریر یا نگار کے کسی مضمون سے کسیکو صدمہ پہونچ گیا ہے، تو میں بہت ملول ہو جاتا ہوں، بنا بریں اگر گذشتہ ماہ کے نگار سے کسی خاص شخص یا کسی مخصوص جماعت کو کوئی تکلیف پہونچی ہے تو میں اسکی معذرت میں صرف یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جاتی ہے تو صرف اسلئے کہ

مستم چناں کہ گل نشناسم ز نوک خار

اس سلسلہ میں مجھ کو برا کہنے والے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جو انتقام لینے کیلئے صرف اپنے اہرمن سے چارہ سازی چاہتے ہیں، اور گالیوں کی آزار رسانی کے سوا ان کے پاس کوئی آلۂ حرب نہیں ہوتا۔ اور دوسرے وہ جو میری تحریر میں بے حجابی، عریانی، فحاشی وغیرہ کے نقائص نکال کر اپنے یزدان میں مجھے ذلیل و خفیف کرنا چاہتے ہیں۔ سو اول الذکر جماعت سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جس طرح انکا اہرمن ان کے ساتھ ہے اسی طرح میرا یزدان میرے ساتھ ہے، اور اسلئے مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں، اور موخر الذکر جماعت کے حضور میں اپنے ذوق ادب و انشا کی طرف سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں عرض کرسکتا کہ

نظارۂ خوبان و مے و نغمہ حرام است
دیدیم و شنیدیم و سمعنا و اطعنا

میرے پاس وہ مطبوعہ اعلان آیا ہے جسے کلکتہ میں قائم ہونیوالی "لیگ اگینسٹ ملا ازم" نے اپنے مقصد کی تبلیغ کیلئے شائع کیا ہے، اس لیگ کے روح رواں اور صدر مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی ہیں اور سید محمد عثمان فاضل نائب صدر۔ اس لیگ کے قیام کا مدعا اس ذہنیت کی مخالفت ہے جو تنگ نظری، تنگ دلی، تقلید و جمود، تعصب و عدم رواداری کو مذہب کے رنگ میں پیش کرتی ہے اس ذہنیت کا اصطلاحی نام اس انجمن نے ملّا ازم اور اس ذہنیت والوں کا ملّا رکھا ہے۔ اس اعلان کے آخری صفحہ میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ انجمن الحاد و دہریت کی حامی نہیں ہے۔ اور نہ ہر عالم دین کی مخالف ہے بلکہ وہ صرف ان نام نہاد مذہبی پیشواؤں کے خلاف ہے جن میں یہ ذہنیت پائی جاتی ہے۔

جس حد تک الفاظ اعلان کا تعلق ہے، اس انجمن کے مقاصد نہایت ہی پاکیزہ اور قابل قبول معلوم ہوتے ہیں لیکن عملی حیثیت سے مجھے اسکے اندر چند در چند مگر دشواریاں محسوس ہوتی ہیں جس وقت پبلک کے سامنے یہ دعوی پیش کیا جائیگا کہ ملاؤں کی جماعت تنگ نظر ہے متعصب ہے تقلید کی پابند ہے تو لامحالہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ ان کی تنگ نظری، تعصب اور تقلید مذہب کے اندر ہے یا اس سے باہر ظاہر ہے کہ اس سے باہر نہیں ہو سکتی اور ہو تو بھی کون مانتا ہے۔ اسلئے وہ مذہب ہی سے متعلق ہوگی اور جس وقت آپ مذہبی مناظرہ کرینگے تو اک غیر متناہی سلسلۂ "قال اقول" کا پیدا ہو جائے گا اور آخرکار وہ مقصد حاصل نہ ہو سکے گا جسکے لیئے یہ لیگ قائم کی گئی ہے۔

اگر یہ لیگ مذہب کے ساتھ ساتھ ملاؤں کی مخالفت کرنا چاہتی ہے۔ تو کوئی توقع کامیابی کی نہیں ہو سکتی اور نہ مذہب کی موجودہ مراسم کی حمایت کرتے ہوئے ملاؤں کے خلاف کوئی کامیاب

پروپگنڈا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ یہ دعوے کریں کہ جو اسلام اس جماعت نے پیش کیا ہے۔ وہی شروع سے غلط ہے اور ان میں سے ایک بھی بلا استثنا مذہب اسلام کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھا تو بیشک یہ لیگ کچھ اہمیت اختیار کر سکتی ہے اور اصلاح کی بھی اس سے توقع ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل خلاف اصول ہے کہ اس جماعت میں سے بعض کو علٰحدہ کر دیا جائے اور بعض کو لے لیا جائے، بلکہ ایک سرے سے ان سب کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہیئے۔ اور لوگوں کو اسلام کی حقیقت ذہن نشین کر کے بتانا چاہیئے کہ اسلام نام ہے صرف ترک مذہب کا، نسخ ادیان کا، تفریق قومی کے مٹانے کا اور جامعۂ انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا جسکا نام اخلاق اور صرف اخلاق ہے، اسلام مسجد اور مندر کی تفریق سے بے نیاز ہے، زنار و تسبیح کے امتیاز سے بالاتر ہے، نہ ناقوس و اذان کی تمیز اس کا نصب العین ہے نہ پرکاش اور طواف کا فرق اس کا مطمح نظر وہ تمام عالم کو، ساری کائنات کو، جملۂ نوع بشری کو ایک رشتہ سے وابستہ کر کے صرف ایک نقطہ پر لانا چاہتا ہے، اور وہ اس مساوات کا مبلغ ہے جس سے زیادہ وسیع مساوات دنیا میں کسی ہادی و رہنما کسی نبی و رسول نے اس سے قبل پیش نہیں کی۔

وہ نہ کسی کے نام کو دیکھتا ہے، نہ وضع و صورت کو، نہ وہ نسب کو وجہ امتیاز قرار دیتا ہے، نہ حسب کو نہ دولت اسکے نزدیک کوئی اہمیت رکھتی ہے نہ جاہ و ثروت۔ وہ دیکھتا ہے صرف رواداری کو۔ جذبۂ ایثار و فدویت کو، اور محض اس اضطراب کو جو بنی نوع انسانی کے ہر فرد میں دوسرے فرد کی اعانت کے لیئے پیدا ہونا چاہیئے۔

پھر آج اسلام کا صحیح مفہوم بتانے کے لیئے سب سے پہلے ضرورت ہے اس عنصر کو محو کر دینے کی، جو اسلام کو اصطلاحی لفظ قرار دے کر اس کو اخوت عامہ کے مقصد سے علٰحدہ کر رہا ہے۔ اور موجودہ ضروریات تمدن و زمانہ کے لحاظ سے تمام ان اصول معاشرت و حیات پر نظر ثانی کرنے کی جو آج اسلام کے چہرہ کو نہایت بدنما صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ اگر زمانہ کے ساتھ لوگوں کے امیال و عواطف اور عقول و افکار میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ تو پھر یقیناً وہی مذہب حقیقی معنی میں خدائی مذہب کہلائے گا جو عہد و زمانہ کے لحاظ سے تمام عقول و اذہان کی رہبری کر سکے۔ اور اپنے اندر اس تغیر کو روا رکھے جسکے بغیر "اخوت عامہ" کا مقصد عظیم حاصل نہیں ہو سکتا۔

پھر آج اگر منزل تک پہونچنے کا صحیح راستہ ہو سکتا ہے تو وہ نہ وہ ہے جسے تمام علماء دین زمانہ سے صدیوں پیچھے ہٹ کر متعین کر رہے ہیں اور نہ اس کی وہ تدبیر ہے جو کلکتہ کی اس لیگ نے بتائی ہے۔

اسلیئے جس ایثار و قربانی، جس رسوخ و استواری کی ضرورت ہے، وہ ہم میں سے ہر مدعی و منصور کی طلبگار ہے سقراط جیسی تجسس ہے، اور ان مردانِ خدا کی منتظر ہے جو ممبر پر نہیں بلکہ دار پر اس راز کا اعلان کرنیکی جرات اپنے اندر رکھتے ہوں

پھر اگر آج بعض نفوس مقدسہ اس قربانی کیلئے آمادہ ہو جائیں خدمت اسلام کیلئے اپنے تمام مصالح ذاتی کو پس پشت ڈالنے کیلئے تیار ہو جائیں، تو بغیر کسی لیگ کے قائم کیئے ہوئے حقیقی مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور دنیا از خود ان مولویوں، ان ملاؤں، ان عالمان دین، ان پیران طریقت، ان تصوف پیشگان حرم مرتبت کے بتوں کو ٹھکرا دینے کیلئے آمادہ ہو سکتی ہے۔

میں اس لیگ کے ارباب کار کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں جس منزل میں ہوں اس وہ انکی لیگ کے مقاصد سے بہت بلند ہے اور میرے نزدیک اس نوع کی جماعتوں یا انجمنوں کا قیام ایک طفلانہ نمائش تو ضرور ہے لیکن سنجیدہ و موثر تدابیر سے اسکو کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا۔

اگر اس لیگ کو کچھ کرنا ہے تو میں مشورہ دونگا۔ کہ

"بفشاں دامن و آزاد برخیز"

ورنہ اسے فنا ہو جانا چاہیئے کیونکہ جو "باب نبرد" نہ ہو اس کو "عشق نبرد پیشہ" کی دعوت پر لبیک کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے

داس کا حکومت کے طرز عمل کیخلاف احتجاجاً فاقہ کی تڑپا تڑپا کر ہلاک کرنیوالی صعوبتوں کو برداشت کرکے اس دنیا سے گزر جانا گو بظاہر نہایت معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھینگے تو معلوم ہوگا کہ زمانہ ایسے "مردان خدا" چند سے زیادہ نہیں پیدا کر سکا۔

اس وقت یقیناً یہ سوال نہ صرف ایک شخص، ایک معمولی انسان کے جان دیدینے کا لیکن عاقبت بیں نگاہیں دیکھ سکتی ہیں کہ یہ موت احیاء ہے ایک قوم کا، نجات ہے ایک ملک کی۔

داس نہیں مرا، بلکہ زندگی کا راز ہمکو بتا گیا، اس کے جنازے پر پھول نہیں برسائے گئے، بلکہ آزادی کی دیوی کے لیے تخت و تاج کو آراستہ کیا گیا اور اگر فطرت نے اپنے اصول نہیں بدلے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ داس نے انتظار کی مدت کو بقدر نصف صدی کم کر دیا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ارتھی پر سوگ کے پھول چڑھانیوالے ہاتھ "ملکہ حریت" کے جلوس میں مسرت کی گلبازیاں کرتے ہوئے نظر آئیں گے

موت نام ہے دنیا سے محو ہو جانے کا، پھر کون ہے جو داس کو مردہ کہہ سکتا ہے۔ الا ان اولیاء اللہ لا یموتون۔ یقیناً داس اللہ کے اولیا میں سے ایک ولی تھا اور اگر مسلمان مجھے اس اظہار خیال پر اسلام سے خارج کرنا چاہیں تو کر دیں مجھے پرواہ نہیں

"منت کش چشم کہ حقیقت نگر آمد"

اور اگر وہ ولایت خداوندی کو صرف اپنے ہی لیے مخصوص جانتے ہیں تو کم از کم مجھے یقین نہ دلائیں کہ میرے اوپر تو اس کے خیال سے بھی موت کا سا جمود طاری ہو سکتا ہے اور نہ اپنی قربانیوں کا ذکر کریں کہ

"دارو تفاوت آب شدن تا گریستن"

یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ ہندوستان کا سیاسی تگ و دو میں اس وقت تک کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکنا ہندو مسلم تفریق کی وجہ سے ہے۔ اور یہ بھی غلط نہیں کہ اس تفریق کے قیام میں ہندوؤں کی تنگ نظری اور عصبیت بہت معاون ہو رہی ہے لیکن کیا مسلمان اس باب میں بالکل معصوم ہیں کیا وہ ہندوستان کی مسئلہ آزادی کو واقعی بہت اہم سمجھتے ہیں اور کیا وہ بھی پوری توجہ اس طرف صرف

کر رہے ہین، ممکن ہے بعض نفوس یہ دعوی کر سکیں لیکن عام طور پر مسلمانون کی ذہنیت اس درجہ انتشار و پراگندگی رکھتی ہے کہ اس وقت تک یہی نہین معلوم ہو سکا کہ ان کا مقصود کیا ہے۔ کبھی وہ مسئلہ تبلیغ کی کامیابی کو اپنے مرض کا علاج سمجھکر اس طرف متوجہ ہو جاتے ہین، کبھی "خادمیت کعبہ" کو وہ اساس تہذیب و اخلاق جانکر اپنے آپ کو "خدام کعبہ" کہنے اور کہلوانے پر اصرار کرتے ہین کبھی "زوال خلافت" پر مجلس عزا مرتب کرکے اس کا نام "خلافت کمیٹی" رکھتے ہین اور اب خیر سے فلسطین کے معاملہ نے ایک اور نئی چیز "فلسطین کمیٹی" کی بنیاد کا مواد فراہم کر دیا ہے۔ گویا ہندوستان کے مسلمان ساری دنیا کے ذمہ دار ہین اور جب تک یہ ہندوستان مین بیٹھکر کوئی رزولیوشن پاس نہ کرینگے اس وقت تک عالم اسلامی کی کوئی مشکل حل ہو ہی نہین سکتی لیکن اس "خاک بسر" قوم سے کوئی پوچھے کہ۔ اس وقت تک ان تمام مذہبی، سیاسی اور اخلاقی انجمنون نے کیا کارہائے نمایاں انجام دئے اور ان تحریکات مین حصہ لینے کے بعد دوسرون کو کیا فائدہ پہونچا یا اور خود کیا فائدہ حاصل کیا۔ خلافت ختم ہو نیکے بعد خلافت کمیٹی قائم ہوئی اور دولت بے اندازہ ہندوستان کے غریب مسلمانون سے جمع کی گئی، لیکن کیا حکومت حجاز نے ارض مقدسہ سے یہود و نصاری کے اثرات محو کرنے مین کوئی مدد ان کی، کیا وہ اس سلسلہ مین اپنی کسی حقیر سے حقیر آرزو کو بھی پورا دیکھنے مین کامیاب ہو سکے۔ اسیطرح خدام کعبہ کی حیثیت سے وہ مسئول ہو سکتے ہین کہ اس باب مین انکے خدمات کیا ہین۔ کیا حاجیون کی جماعت کو بمبئی مین ٹکٹ خرید کرکے لا دینا، سرائے خانون مین لاکر انکو ٹھیرا دینا اور جہاز پر سوار کرا دینا۔ اتنا بڑا کام ہے۔ کہ اس سے زیادہ کوئی اور ذریعہ نجات ہو ہی نہین سکتا۔ جمعیۃ العلما اور انکی تبلیغ کا ذکر فضول ہے کیونکہ اب اس جماعت اور اس کے اس مقصد کی لغویت روز روشن کی طرح عیاں ہے،

اب اس ذہنیت کے ماتحت فلسطین کے مسئلہ مین ہنگامہ گدایانہ برپا کیا جا رہا ہے، اور کیا عجب ہے کہ اسکے لیے بھی کوئی فہرست فراہمی چندہ کی کھولدیجائے۔ لیکن اسکا نتیجہ بھی جو کچھ ہو نیوالا ہے، کسی سے مخفی نہین۔ یہانکے مسلمان یہ نہین سمجھتے کہ جب تک وہ خود اپنی ملکی و مقامی حیثیت کو مستحکم و بلند نکرینگے ان کے "وطنین پرشہ" کو کون سنیگا اور انکے شور و شغب سے دنیا کے یہ اصول کیونکر بدل سکتے ہین۔ پہاڑ سے سر ٹکرانا خود اپنے سر کو مجروح کرنا ہے۔ اگر مسلمان چاہتے ہین کہ واقعی انکی آواز کو کوئی اہمیت دیجائے تو انکا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ پہلے اندرونی ملکی سیاسیات مین اپنے اندر ایک جماعت مصالح کی سی اہمیت پیدا کرین اور جب خود اپنے گھر کو محفوظ بنالین تو دوسرون کے گھرون کی آگ بجھانیکی کوشش کرین۔ کیا ہندوستان کے مسلمانون کے باب مین ترکی، ایران، افغانستان، مصر، فلسطین، حجاز کسی جگہ سے کوئی آواز بلند کیجاتی ہے، کیا کبھی سنا گیا ہے کہ وہان کی کسی انجمن نے کوئی تجویز اپنی حکومت کے ذریعہ سے حکومت برطانیہ کے پاس بھیجی ہو، پھر جب اس وقت حالت یہ ہے کہ ہر قوم و جماعت اپنے ہی تحفظ کی منزل سے نہین گزری، تو ہندوستان کے مسلمانون کی یہ "انجمن آرائیاں" اور "رزولیوشن فرمائیان" کیا اہمیت رکھ سکتی ہین۔

مین دیکھتا ہون کہ مسلمانون کی ایک جماعت اور غالباً بڑی جماعت سارڈا ایکٹ کی منظوری سے چین بر جبین نظر آتی ہے۔ یہان تک کہ اسمبلی کے بعض مسلمان ممبر احتجاجاً ہال سے اٹھکر باہر چلے گئے۔ ہم نے مانا کہ صغرسنی کی شادیاں ہندوؤن مین زیادہ ہوتی ہین اور یہ قانون

انھون نے اپنی ہی معاشرت کی اصلاح کے لیے نافذ کرایا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب اصولاً مسلمان بھی اسکے مفاد کے منکر نہین ہین تو وہ کیون مخالفت کرتے ہین، رہا شریعت اسلامی کا سوال، سو مین پوچھتا ہون کہ کیا ہندوستان مین زنا کے جرم مین کسیکو سنگسار کیا جاتا ہے۔ کیا سرقہ کے ارتکاب پر کسیکے ہاتھ قطع کیے جاتے ہین۔ کیا تہمت پر یہان حد قذف جاری ہوتی ہے، کیا شراب خوار ہی پر کوڑے لگائے جاتے ہین، پھر جب مسلمان ان تعزیرات کو جو شریعت اسلامی کیخلاف ہین گوارا کیے ہوے ہین۔ تو کوئی وجہ نہین کہ وہ سارد ابل پر چراغ پا ہون علی الخصوص اس وقت جبکہ مسلمانون مین بھی ہندوؤن کیساتھ میل جول رکھنے کی وجہ سے صغر سنی کی شادی کا رواج کچھ کم نہین ہے۔

صغر سنی کی شادی کو روکنے والا قانون، باوجود اس کے کہ مسلمانون کی ایک جماعت نے مخالفت کی منظور ہو گیا اور سنہ ۳۰ء سے اس کا نفاذ بھی ہو جائے گا۔ جہانتک عورتون کی صحت کا تعلق ہے یہ قانون بہت مفید ہے اور معاشری حالت کی درستی مین بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایک قانون اس سے بہت زیادہ اہم تھا جسکی طرف کسی نے توجہ نہین کی اور جس کا نفاذ بقاء عقل و حواس اور تحفظ انسانیت و اخلاق کے لیے ازبس ضروری ہے۔

اس وقت تمام اکناف ہند مین ایک کثیر جماعت ان لوگون کی دیکھی جاتی ہے جو اپنے آپ کو عالم دین کہتے ہین، صوفی و اہل طریقت بتاتے ہین، مجالس وعظ مین سخت تباہ کن اور دشمن عقل و انصاف روایات بیان کرتے ہین صرف اسلیے کہ روپیہ کمائین، جاہلون اور احمقون کو اپنے کاذب کشف و مراقبہ سے دھوکہ دے کر اپنا گرویدہ بناتے ہین تاکہ زندگی کے تمام نعائم و لذائذ اپنے لیے مخصوص کرلین درانحالیکہ انھون نے کوئی محنت نہین کی، کسی جفاکشی اور عرقریزی سے کام نہین لیا!

اگر قانون تعزیرات ہند دغا مین ان کو گرفتار نہین کر سکتا، اگر ضابطہ فوجداری آوارہ گردی کے سلسلہ مین ان کو نیک چلنی کا پابند نہین بنا سکتا، اگر امتناع گداگری کا قانون ان پر نافذ نہین ہو سکتا تو کوئی وجہ نہین کہ ان کی تباہ کاریون سے بچانے کے لیے، ایک علیحدہ قانون نہ مرتب کیا جائے، اور ان معزز گداگرون، ان پڑھے لکھے بھکاریون کو جو "لا یسئلون الناس الحافا" کی ایک مخفی مگر نہایت ہی سخت لعنت مین مبتلا ہین وعظ بیچنے اور پیری مریدی سے نہ باز رکھا جائے۔ نہ ان کے پاس کوئی جائداد ہے نہ ریاست نہ یہ کہین ملازمت کرتے ہین، نہ تجارت، لیکن دولت ہے کہ ان کے قدمون پر نثار کیجا رہی ہے اور عیش و نشاط کی دیوی ہے کہ ہر وقت ان کے پہلو سے وابستہ نظر آتی ہے۔ مین نہین سمجھ سکتا کہ غریب اہل ہند کی وہ کمائی جو پسینہ مین ڈوب کر حاصل ہوتی ہے۔ کیون بلا کسی محنت و استحقاق مزد کے ان مولویون، پیرون، سیدون، پنڈتون، جوتشیون اور برہمنون کو دیدیجائے جو ایک متعدی مرض کے جراثیم کی طرح صرف وبا اور ہلاکت پھیلانے کے لیے رونما ہوے ہین۔

کیا اسمبلی کے کسی ہندو یا مسلمان ممبر مین یہ جرأت ہے کہ وہ اس مسئلہ کو پیش کر کے تکمیل کی حد تک پہونچائے؟

نقطۂ نظر سے، اے آبروئے خلوت و اے فخر انجمن، میرے پاس تو کافی الفاظ بھی نہیں کہ آپ کے اس خلوص نیت، اس استاذانہ شفقت و کرم، اس مصلحانہ انداز و شمائل اور اس بزرگانہ حزم و نگہداشت کی داد دے سکوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کی جزائے خیر آپ کو داور حشر کی طرف سے نہ ملی تو سب سے پہلا وہ شخص جو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا، استناداً دبراناً آپ کے اس گلدستہ کو پیش کریگا، وہ میں ہونگا، خواہ وہ کالائے بد کہکر بجائے آپ کے میرے ہی منھ پر کیوں نہ پھینک دیا جائے

سچ ہے اگر کالج کے طلبہ کو شروع ہی سے یہ درس نہ دیا جائیگا کہ محبت کے رموز کیا ہیں، معشوق سے کیونکر باتیں کیجاتی ہیں، ہجر و وصل کے شداید و لذاید کیا ہیں، تو پھر قیس و فرہاد کی نسل کیونکر قایم رہیگی اور احسن صاحب اپنے عشق بیمارانہ سری "کے جوش میں کس پر یہ غمزہ محبت صرف کرینگے کہ:-

قسم اپنی، ستم اپنا، مری خواہش، مرا نام　　یہی دو چار ہیں باتیں جو انھیں یاد نہیں

مجھے نہیں معلوم کہ وہاں جناب احسن کے سپرد کونسی خدمت ہے، لیکن میں ان سے درخواست کرونگا کہ اگر کبھی اس کا موقعہ آجائے تو اپنے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے طلبہ کو کم از کم یہ ضرور بتا دیں کہ آپ کے محبوب نے کیا قسم کھائی تھی جو یاد نہیں رہی اور آپکی وہ کونسی خواہش تھی جو پوری نہیں کی گئی۔

یہ ہے وہ شاعری جس کو الشعراء تلامیذ الرحمان اور ان من الشعر لحکمۃ و ان من البیان لسحرا کی آڑ پکڑ کر جناب احسن کالج میں رواج دینا چاہتے ہیں۔ ملا غنیمت کا

بمکتب می رود طفل پریزاد　　مبارکباد مرگ نو باستاد

کہنا آجتک بدنام ہے لیکن کس کے منھ میں زبان ہے جو جناب احسن مارہروی سے یہ بازپرس کرے کہ کالج کے حدود میں کمسن طلبہ کے سامنے اپنے محبوب کی قسم اور اپنی خواہش کی داستان دُہرانے کا اُن کو کیا حق حاصل ہے۔ کیا لوگ اپنے بچوں کو اسی یقین کے ساتھ وہاں بھیجتے ہیں کہ وہاں کا مہتمم مشاعرہ سال میں دو چار مرتبہ ایسے پست و دنی مشاغل ایسے ذلیل و ردی جذبات ضرور ان میں رائج کریگا

میں نے اسی دسمبر ۳۲ء کے رسالہ میں یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ "غریب بسم اللہ کے گنبد میں زندگی بسر کرنے والے نوجوان (طلبہ) کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستان کا شاعر کسقدر عجیب و غریب چیز ہے اور اس کا اخلاق، نفسیات کے کتنے ناحل شدہ مسایل اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے"۔ ہمارے احسن صاحب بانی محفل مشاعرۂ علیگڈھ کو یہ فقرہ بھی بہت ناگوار ہوا اور وہ سمجھے کہ شاید میں نے اسی سلسلہ میں ان کے اخلاق پر بھی حملہ کیا ہے۔ حالانکہ جو شخص شوق سندیلوی کی کتاب اصلاح سخن کا مطالعہ کر چکا ہے، وہ جانتا ہے کہ جناب احسن مارہروی کے خطوط (جو اس میں درج ہیں) ایسی معمولی دستاویزی شہادتیں نہیں ہیں، جن کے ہوتے ہوئے مجھے ان کے اخلاق پر روشنی ڈالنے کی یا اُن کو اپنے اخلاق سے روشنی ہٹانے کی جرأت ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب احسن مارہروی کی یہ عبارت اس شخص کو بھی تھوڑی دیر کے لئے حیرت میں ڈالدینے والی ہے جو "بکف چراغ دارد" کے نام سے بدنام ہے

رہا مجھے آیندہ مشاعرہ کے لئے "معہ ساز و سامان" کے شرکت کی دعوت دینا سو میں ان کے اس نوید کا ہر ممکن احترام ملحوظ رکھتے

ہوئے نہایت افسوس کے ساتھ اس حقیقت کے اظہار پر مجبور ہوں کہ اگر علیگڈھ کا ہجوم مشاعرہ، فردوس ہو تو بھی میرا وہاں کیا کام جب آپ ایسے رضوان نے پہلے ہی سے وہاں کی فضا کو داغدار و آلودہ بنا رکھا ہے

معاف فرمائیے میں آپ کی لغزش مستانہ سے اپنے ارتعاش لب ناکام کا تبادلہ کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا

تو و طوبیٰ و ما و قامت دوست   فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

جناب احسن مارہروی نے یہ مشورہ مغانہ بھی دیا ہے کہ جب کبھی میں علیگڈھ آؤں تو خسرو کے یہ دو شعر ضرور سن لوں کہ

نظم را علیے تصور کن بذات خود تمام   کان نہ محتاج اصول و صوت خنیاگر بود

در کنار مطرب سست ار نہائی ہذر (؟) ار بارہ   چوں سخن بنود ہمہ بانگی و ابتر بود

ہر چند میں شاعر نہیں لیکن چونکہ مشورہ صائب ہے اسلئے میں نگار کے ذریعہ سے تمام دنیا گر قسم کے شاعروں کو یہ پونچائے دیتا ہوں لیکن اسی کے ساتھ میرا بھی ایک مشورہ احسن صاحب کے حضور میں ہے اور اگر برا نہ مانیں تو عرض کر دوں کہ جب وہ طلبہ کو درس شاعری دینے کے بعد فارغ ہو جایا کریں تو سعدی کے یہ دو شعر وہ خود بھی ضرور پڑھ لیا کریں

کریما بہ بخشائے بر حال ما   کہ ہستم اسیر کمند ہوا

نداریم غیر از تو فریاد رس   توئی شاعران الخطا بخش و بس

افسوس ہے کہ اس مہینہ میں زیادہ تفصیل کا موقعہ نہیں لیکن ماہ آئندہ میں اس گلدستہ کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد بتاؤنگا کہ آپ صرود کالج میں تلامیذ الرحمان قسم کے شاعر پیدا کر رہے ہیں یا تفہیم الغاؤن نوعیت کے اور پھر آپ کے "آبگینہ حصار" میں آپ کی "ابھانہ گریز" کا تماشہ دیکھوں گا میں جانتا ہوں کہ یونیورسٹی کے ہر ملازم کو ارباب یونیورسٹی کی نگاہ میں اپنے تئیں فرد مفید ثابت کرنے کے لئے بہت سی تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں اور جناب احسن حقیقتاً اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتے کہ ہر سال مشاعرہ کا ایک الغو و بے معنی ہنگامہ پیدا کرکے اپنے خداوندان رزق کے سامنے اپنے وجود کی اہمیت کو ثابت کرتے رہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اُن کی اس "دکارگاہ معاش فریب" کو دنیا کیوں برداشت کرے اور اُن کے مصالح ذاتی پر فرزندان ملک کے اخلاق کی قربانی کیوں چڑھائی جائے۔ اگر جناب احسن سوائے مشاعرہ سازی کے کسی اور خدمت کے اہل نہیں ہیں، تو اس کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ نوخیز طلبہ میں احسن صاحب کی اہلیت کے لحاظ سے مخصوص ذہنیت پیدا کیجائے۔ اور اس طرح نسل کی نسل کو تباہ و برباد کیا جائے

دیر کے لیے سلب کرلیتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ سر چکرانے لگتا ہے۔ اور میں ایک بت کی طرح خاموش ہو جاتا ہوں۔

یقیناً مسلمانان ہند اس وقت اسی منزل سے گزر رہے ہیں جب ترقی و انحطاط کا نہیں بلکہ صرف مادی عناصر حیات کے بقا و فنا کا سوال سامنے آتا ہے۔ اس لیے مجھے حیرت نہیں کہ وہ کیوں یہ سوال کرتے ہیں۔ بلکہ عبرت آتی ہے اس منظر پر کہ وہی قوم جس نے دنیا کو جینے کی نہیں بلکہ جلانے کی زندہ رہنے کی نہیں بلکہ زندہ کر دینے کی راہیں بتائیں۔ آج اسی کے افراد اس خوف سے کانپ رہے ہیں کہ کوئی انہیں ہلاک نہ کر دے اگر کوئی کہے کہ مسیح کا معجزہ جاں بخشی صرف شاعرانہ مبالغہ تھا، تو اسے باور کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی دعوے کرے کہ موسیٰ کے ید بیضا کی روشنی صرف ایک افسانہ تھی، تو اس کا بھی یقین ہو سکتا ہے۔ اور اگر کوئی بتائے کہ سلیمان کی سطوت شاہانہ محض ایک داستان پارینہ ہے، تو اس کے باور کرنے میں بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن خدا را کوئی بتائے کہ اس کا یقین کیونکر آ سکتا ہے۔ کہ وہ قوم جس کا ایک ایک فرد مسیح کی جاں بخشیوں، موسیٰ کی نور افروزیوں اور سلیمانی سطوتوں سے بہت بلند دنیا کی حقیقتوں کو بروئے کار لا کر محض انسانی عظمت و جلال پر مہر دوام ثبت کرنے کا دعوے رکھتا تھا، وہ آج انحطاط کی اس منزل پر پہونچ گئی ہے کہ اس دنیا میں غلامانہ سانس لیتے ہوئے بھی اس کا کلیجہ ایک مجرم کی طرح کانپ رہا ہے! حقیقت یہ ہے کہ۔

کم ہوتے ہیں زمانہ میں ایسے بھی انقلاب

آج اگر بودھ اور زردشت کے ماننے والے رام و کرشن کی پوجا کرنے والے موسیٰ و مسیح کے متبعین صفحۂ عالم سے محو ہو گئے ہوتے تو جائے حیرت نہ تھی کیونکہ وہ تعلیم مذہب و اخلاق جو اب سے کئی ہزار سال قبل دنیا کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ اس درجہ مکمل نہ تھی کہ وہ زیادہ عرصہ تک ارتقاء انسانی کا ساتھ دے سکتی اور اس لیے اس کو یقیناً بے روح ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن پیروان اسلام کا زوال جسے ابھی صرف ۱۳۵۰ سال کا زمانہ گزرا ہے۔ اور جس کی تعلیم کو تکمیل دین اور اتمام نعمت سے تعبیر کیا جاتا ہے یقیناً سخت حیرتناک واقعہ ہے اور ایک شخص کے لیے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے اسباب کا سراغ کہاں اور کیونکر لگائے۔

اسلام کے علاوہ جتنے مذاہب عالم میں گزرے ہیں، ان سب کی تعلیمات۔ دنیا کی طرف سے بالکل خالی الذہن ہو کر پیش کی گئی تھیں، یعنی وہ یہ تو چاہتے تھے کہ انسان حسن اخلاق سے اپنی اہلی و تنہائی زندگی کو خوشگوار بسر کرے، لیکن نہ ان کے سامنے انسان کا وہ مستقبل تھا جسے سیاست و تجارت یا دولت و ثروت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور نہ وہ اس اصول ارتقاء کو جانتے تھے جو دماغ انسانی کو ایک جگہ قائم کر رکھنے والی چیز نہیں ہے۔ اس راز کو صرف اسلام نے سمجھا۔ اور دنیا کو سمجھایا کہ انسان نام گوشت و پوست کا نہیں ہے جو فنا ہو جائے

والی چیزیں ہیں - بلکہ انسان نام ہے اس کی فراست و بصارت کا، اقدام عمل کا، نہضت و ارتقاء کا، اور تمام کائنات پر فرمانروایانہ انداز سے چھا جانے کا - اور یہی وہ حقیقت تھی جسے مذہبی زبان میں تشبیہاً و استعارتاً جنت و فردوس، خلود و مسرت، جنات نعیم، اور کوثر و سلسبیل سے تعبیر کیا گیا - آخرت و دنیا سے ہمیشہ ایک قوم کا انجام و نتیجہ مراد لیا گیا - اور موت کے بعد بقاء کا مفہوم بھی انھیں روایات عروج کو بتایا گیا جو انسان کی حقیقی داستان حیات ہے - لیکن چونکہ ترقی و عروج حکومت و ثروت انسان میں ہمیشہ تمرد و سرکشی اور انحطاط اخلاق کا باعث ہوا کرتی ہے - اس لیے اسی کے ساتھ اسلام نے وہ تعلیم بھی پیش کی جو مادی ترقی کے ساتھ اخلاقی صحت کو بھی قائم رکھنے والی تھی - اور وہ تعلیم عدل و مساوات تھی عہد رسالت سے قبل اس نوع کی عملی تعلیم کا وجود کسی زمانہ میں نہیں پایا گیا اور عہد حاضر کی تمام ترقیاں اسی اصول پر استوار ہوئی ہیں -

پس قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دنیا کی تمام ترقیاں اسلام ہی کے وضع کردہ اصول پر محکم ہوئی ہیں تو خود مسلمان کیوں اس سے محروم رہے اور ہیں - ممکن ہے کوئی شخص اس کے جواب میں تاریخ ماضی کو پیش کر کے مسلمانوں کی گذشتہ ترقی کو بطور ثبوت سامنے لائے، لیکن مجھے اس میں کلام ہے کہ وہ ترقی جو مسلمانوں نے کوئی ترقی ایسی کی تھی جو ہم اسلامی اصول کی پابندی کا نتیجہ بتا سکیں، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کا دور ترقی دو تین سو سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا حالانکہ اگر اصول ترقی وہی ہوتے جو اسلام نے بتائے تھے تو جو ترقی ہوئی تھی وہ نہ صرف یہ کہ علی حالہٖ قائم رہتی بلکہ آج ساری دنیا پر چھائی ہوئی نظر آتی -

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اس بے بہا تعلیم پر کسی نہ کسی حد تک صرف ۳۰ سال تک عمل رہا اور امیر معاویہ کے تخت نشین ہوتے ہی عدل و مساوات کا قانون بالکل اٹھ گیا اور اس کی جگہ استبداد و قہرمانیت نے لے لی - پھر اس کے بعد مسلمانوں نے جو ترقی کی وہ صحیح اسلامی ترقی نہ تھی بلکہ ملوکانہ تسلط تھا - جو دنیا کے مختلف اصول پر قائم ہوا اور چند دن میں اپنی عمر طبیعی کو پہونچ کر فنا ہو گیا - ظاہر ہے کہ جس تعلیم کو پورے تیس سال بھی پختہ ہونے کے لیے نصیب نہ ہوں، وہ کیونکر دنیا میں استوار ہو سکتی تھی! اور کس طرح اس کا اثر قوم کے تمام افراد پر پڑ سکتا تھا، علی الخصوص اس وقت جب کہ دنیا میں وقت اور شاہان عصر کی تمام ستم آرائیوں اور بے اعتدالیوں کا ساتھ دینے کے لیے ہمارے علماء کرام کی ساری جماعت موجود تھی اور جو جھوٹی حدیثیں وضع کر کر کے، لغو و مہمل فقہی مسائل گڑھ گڑھ کر اسے بڑا دلیر اور قوی بنا رہے تھے - ظاہر ہے کہ جب عہد نبوی سے قریب تر زمانہ میں ہمارے

رہبروں کا یہ حال رہا ہو تو زمانہ اب دین اس کی دنیات کس حد تک نہ پہونچ گئی ہوگی۔ چنانچہ آپ ہندوستان، ایران، مصر، ترکی، اسپین کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہاں حکمرانی کا انداز کیا تھا اور کیا حقیقتاً ان میں اصول عدل و مساوات پر قانون جہانبانی کی بنیاد قائم کی گئی تھی جو اسلام نے بتائے تھے؟ نہ انھوں نے اسلام کی صحیح تعلیم کو سمجھا، نہ انھوں نے قانون و شریعت کے اصول پر نگاہ کی نہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ فطرت اور تمدن کا باہمی رشتہ کیا ہے اور نہ انھوں نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا کہ زمانہ کا ساتھ دینے کیلئے خود اپنے آپ میں کس قدر تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس کا جو قدرتی نتیجہ پیدا ہونا چاہیئے تھا، وہی ظاہر ہوا، یعنی اسلام نام ہو گیا، صرف مخصوص لباس و وضع کا مقررہ رسم و رواج کا اور علماء کرام نے اس سادہ فطری مذہب کو، اس دور وحشت کا مذہب بنا دیا جب انسان مذہب کے نام سے صرف علم الاصنام پیدا کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ آج اگر کوئی غیر مذہب والا۔ اسلام کی ان کتابوں کو دیکھے جو ہمارے اِن کے علماء، فقہا، اور محدثین نے تصنیف فرمائی ہیں تو وہ حیران رہ جائے گا کہ کیا انھیں روایات و مسائل کی بناء پر اسلام کو فطری مذہب اور محمد کو خاتم النبیین ثابت کیا جاتا ہے۔ بہرحال اس دور نامرادی میں یہ شکوہ و شکایت بیکار ہے۔ کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

اب تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیندہ کے لیے ہمارا "لائحہ عمل" کیا ہونا چاہیئے۔ سو اس کا جواب تم مولویوں سے نہ چاہو جو تبلیغ کے نام سے نہایت ہی غیر مصلحانہ فضا پیدا کر رہے ہیں۔ نہ ان مدعیانِ ترقی و اصلاح سے جو تنظیم کانفرنس وغیرہ کی مضرت رساں تحریک سے حکومت کی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کو تقویت پہونچا رہے ہیں۔ اس کا جواب خود اپنے آپ سے چاہو اس جذبہ انسانیت سے طلب کرو جو سب سے پہلے انسان کو رشتۂ وطنیت سے وابستہ کرتا ہے۔

مذہب اور مذہبیت کا دور ختم ہو گیا اب صرف زمانہ وطن پرستی کا ہے۔ اس لیے اگر مسلمان اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں سب سے پہلے اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھ کر اس کی دوسری قوموں سے مل جانا چاہیئے اور ہر اس تحریک میں پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا چاہیئے جو ملک کی ترقی و آزادی کی ضامن ہے۔ مذہب بالکل ذاتی و انفرادی اطمینان کا نام ہے، اس لئے اس کو ہیئت اجتماعی کی بنیاد نہ بناؤ، اور اس کو استخوانِ جنگ قرار نہ دو کہ مذہب کی گذشتہ تاریخ پہلے ہی بہت کافی خون سے رنگین نظر آتی ہے اور اس میں اب کسی اور خونیں اضافہ کی ضرورت نہیں۔

جون سنہ ۱۹۳۱ء | جس زمانہ میں کانپور کا خونیں ہنگامہ رونما ہوا، میں حیدرآباد میں تھا۔ اور اخبار وہاں

کے بیانات دیکھ کر سخت متردد تھا کہ دیکھئے یہ فرقہ وارانہ آویزش اس وقت جب کہ ہندوستان کو حصول آزادی کے لیئے ایک متحد محاذ پیش کرنیکی ضرورت ہے. کیا نتائج پیدا کرتی ہے۔ لیکن جب سب سے آخر میں ٹائمس آف انڈیا نے ایک انگریز کے چشم دید واقعات شائع کیئے اور ہندوؤں کے ہاتھ سے مسلمان بچوں اور عورتوں کے سفاکانہ وبہیمانہ ذبح وقتل کے حالات معلوم ہوئے، تو میں رات بھر بے چین رہا۔ اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے ایک شدید جذبۂ نفرت وانتقام میرے اندر پیدا ہونے لگا۔ اور تھوڑی دیر کے لیئے میں، اس حقیقی مقصود کو بھی بھول گیا جو یقیناً اس نوع کے جذبات سے زیادہ بلند ہے۔

اس کے چند دن بعد جب میں لکھنؤ واپس آیا تو مختلف ذرائع سے واقعی حالات معلوم کرنیکی سعی کرتا رہا اور آخر کار خود میں نے کانپور پہونچ کر ان مقامات ومکانات کو دیکھا جن کی تباہیاں وبربادیاں ناصیۂ انسانیت کا بدترین داغ کہی جا سکتی ہیں۔ میں وہاں مزدوری پیشہ جماعت سے لے کر حکمراں طبقہ کے افراد تک سب سے ملا۔ اور آخر کار اس نتیجہ پر پہونچا کہ کانپور کی داستان خونین مشکل ہی سے کبھی پوری بیان کی جا سکتی ہے۔ اور اس واقعہ نے ملک کی فضا کو جس قدر خراب کر دیا ہے اس کا مداوا آسان نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمانوں نے قتل وذبح میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یقیناً انھوں نے بھی کافی وحشت ودرندگی کا ثبوت دیا، مکانوں کو جلایا، مندروں کو توڑا، انسانوں کو ہلاک کیا، لیکن معصوم بچوں اور بے دست وپا عورتوں کو انتہائی بیدردی کے ساتھ پارہ پارہ کرنے کا فخر صرف ہندوؤں ہی نے حاصل کیا۔ اور اگر اس ساری داستان میں کوئی ٹکڑا میرے لیئے قابل مسرت ہے تو صرف اتنا ہی کہ مسلمانوں نے باوجود انتہائی غیظ وغضب کے کسی ایسی بہمیت کا ثبوت پیش نہیں کیا جو ان کی قدیم روایات اخلاق کے خلاف ہو۔ جس طرح بے شمار شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ اگر کسی ہندو نے الحاح وزاری سے کام لے کر جاں بری چاہی تو مسلمانوں نے اسے چھوڑ دیا یا کچھ روپیہ لے کر اس کو جانے دیا، اسی طرح متعدد شہادتیں اس تلخ حقیقت کے بھی مل سکتے ہیں کہ ہندوؤں نے عورتوں کو پناہ دینے کے بہانہ سے اپنے گھر دیگر بلا بلا کر، بچوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے ان کے سروں پر دست شفقت پھیر پھیر کر، ایسی بیدردی کے ساتھ انھیں ہلاک کیا کہ سخت سے سخت قلب انسانی بھی اس کو سننے کے بعد کانپ اٹھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ پھر یہ درندگی صرف شہر ہی تک محدود نہیں رہی، بلکہ بعض دیہات تک پہونچ گئی۔ جہاں عموماً مسلمانوں کی آبادی چند گھروں سے زیادہ نہیں ہوتی، اور یہاں بھی ہندوؤں نے اسی بیرحمی کے ساتھ اپنی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے بعض مسلمان خاندانوں کو بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کو ذبح کر کے ہمیشہ کے لیئے محو کر دیا۔ یقیناً یہ جنگ تعلیم یافتہ افراد کی نہ تھی، یہ بھی سچ ہے کہ دونوں جماعتوں کے

ذب و شائستہ لوگ اس میں شریک نہیں ہوئے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے بہت برہمنوں
پجاریوں نے بھی اس میں پورے جوش کے ساتھ حصہ لیا۔ اور مسلمانوں میں کوئی ایک شخص
ایسا نہ تھا جو کسی طرح کی شرافت حسب و نسب کا مدعی ہو۔ پھر کیا یہ امر قابل غور نہیں کہ ایک طرف
شریف ترین افراد بھی ضعیفوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے میں دریغ نہیں کرتے اور دوسری
ف غیر شریف افراد بھی ایک پناہ چاہنے والے دشمن پر ہاتھ نہیں اٹھاتے، خواہ وہ ان کے کسی عزیز
کا خون بہا کر کیوں نہ آیا ہو۔ دنیا اس کو جس نگاہ سے چاہے دیکھے، لیکن میں اس میں مسلمانوں
ستقبل کے لیے ایک عجیب و غریب جھلک امید کی پاتا ہوں اور مسرور ہوں کہ ہنوز ان کی وہ
وصیت لطف و رافت جو ایک شجاع قوم میں پائی جانا چاہیے بدستور باقی ہے۔ پھر اگر آئندہ
ی ہندوستان میں خانہ جنگی کی نوبت آئی (جس کا مجھے قوی اندیشہ ہے) اور اگر واقعی کسی جنگ
یقی کامیابی اسی فریق کو حاصل ہو سکتی ہے جو اپنی اخلاقی فتحمندی کو دنیا سے تسلیم کرا سکے، تو میں
انوں کی قسمت کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں اور یقین کامل رکھتا ہوں کہ ان کے مقابلہ میں کبھی وہ قوم
ب نہیں ہو سکتی، جسکی بہادری کا انتہائی کارنامہ عورتوں، بچوں، اور ضعیفوں کو ذبح
نا ہو۔

کانپور کے اس دردناک ہنگامہ کی تفصیل فراموش کی جا سکتی ہے۔ مندروں، اور مسجدوں
واقعات انہدام بھلائے جا سکتے ہیں، آتش زنی اور غارتگری کے واقعات بھی دلوں سے محو ہو سکتے
لیکن ہندو قوم کی اس داستان شجاعت کو کبھی صفحۂ تاریخ سے نہیں مٹایا جا سکے گا کہ اس نے مسلمان
وں کو پناہ دینے کے بہانہ سے اپنے گھروں میں بلایا، اور پھر مکان کے اندر بند کر کے ان کے بچوں
ین کے سامنے ذبح کر کے انکو بھی انتہائی بیدردی و شقاوت کے ساتھ تڑپا تڑپا کر ہلاک کر
، حیران ہوں کہ اگر ایک انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والی جماعت اس نوع کی ذہنیت
الت، اس قسم کا ذلیل کمینہ پن اور اسی طرح کی وحشت و درندگی کا اظہار کر سکتی ہے تو ایک
ے کی نسل سے پیدا ہونیوالے بچے اور کن خصوصیات کو لے کر پیدا ہوں گے اور دنیا ان دونوں
رمیان کیونکر خط امتیاز کھینچ سکے گی۔

کانپور میں اس خونریزی کو حکومت نے کیوں جاری رہنے دیا۔ اس پر بحث کرنا بیکار ہے
دنیا اس کی حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہو چکی ہے۔ اسی طرح یہ جستجو کہ ہندو مسلمانوں میں زیادہ اتلاف
س فریق کا ہوا، اب کوئی معنی نہیں رکھتی، لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں ضرور توجہ کی مستحق ہیں ایک یہ کہ

ہندوستان کی تمام ہندو جماعت نے اس واقعہ کو کس نگاہ سے دیکھا اور دوسرے یہ کہ اس ہنگامہ کے صحیح اسباب کیا تھے۔ امر اول کے متعلق مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوؤں نے ق ذبح و قتل میں بے دردی سے کام لیا ہی تھا۔ لیکن ہندوستان کے اور ہندوؤں نے بھی اپنی خاموشی اور سکوت سے کام لے کر کچھ کم شقاوت کا ثبوت نہیں دیا۔ میں نے کسی ہندو اخبار یا قائد رہنما کو اس درندگی پر اظہار ملامت کرتے نہیں دیکھا بلکہ برخلاف اس کے جو بیانات ادھر سے دیئے گئے ہیں اور جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں، ان میں حقیقت کو چھپانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ ٹھیک جس وقت کانپور میں یہ ہنگامہ برپا ہو رہا تھا، کانگریس میں تمام قائدین کا اجتماع ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں مصروف تھا لیکن ان میں سے کسی نے اس واقعہ کی اہمیت پر اظہار خیال نہیں کیا۔ اور ان ہندو افراد کو کوئی سرزنش نہیں کی گئی جنھوں نے اس کمینہ فطرت کا ثبوت دیا۔

اب رہا دوسرا امر جو اس فساد کے اسباب سے متعلق ہے، وہ کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے اور اس کا اصل سراغ معلوم کرنے کے لیے ہم کو اب سے ۲۲ سال قبل پہونچنا پڑے گا جب ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کے وفد کو جداگانہ انتخاب کی لعنت کا طوق مرحمت ہوا تھا۔ یہ حکومت کی اتنی زبردست چال تھی کہ نہ اس وقت تک مسلمانوں نے اس کو سمجھا اور نہ اب سمجھنے کے لیے طیار ہیں۔ یوں تو بظاہر مسلمانوں کے لیے نہایت امید افزا بات معلوم ہوتی ہے کہ کونسلوں کی نیابت میں ان کا انتخاب بالکل جداگانہ کر دیا گیا اور ان کی آبادی کو اس طرح گویا مخصوص اہمیت دی گئی لیکن یہ نہ دیکھا گیا کہ یہ رعایت حقیقتاً اسی قسم کی رعایت تھی جو ایک مریض کے لیے اس کو ایک مضر غذا کھانے کی اجازت دے کر روا رکھی جائے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم جماعتوں میں آہستہ آہستہ باہم اختلاف پیدا ہونے لگا عصبیت و فرقہ داری مستحکم ہونے لگی۔ پھر چونکہ ہندوؤں کی جماعت یہاں زیادہ ہے اس لیے انکو زیادہ موقع ستانے کا ملا اور چند دنوں میں عام طور پر مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے عدم رواداری اور عصبیت و تشدد کی شکایت پیدا ہونے لگی۔ ۱۹۰۶ء سے قبل جب جداگانہ انتخاب کا وجود نہ تھا، نہ کبھی ناقوس و اذان پر جھگڑا ہوتا تھا۔ نہ باجہ اور قربانی پر کہیں نزاع ہوتی تھی۔ کیونکہ ایک کے مفاد دوسرے سے متعلق تھے اور ہر فریق مجبور تھا کہ دوسرے فریق کے ساتھ صلح و آشتی سے کام لے۔

پھر چونکہ کانپور میں ہندوؤں کی جماعت تعداد و اقتصاد کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے

ں لیے یہاں کے مسلمانوں کو زیادہ تکلیفیں پہونچیں اور برابر ۲۳ سال تک وہ ان کو برداشت
نے رہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ ابھی اور کتنے عرصہ تک ضبط سے کام لیتے رہتے، اور اگر اسی
دوران میں تنظیم کانفرنس کی ملعون تحریک نے ان کے جذبات کو مشتعل نہ کر دیا ہوتا۔ فساد سے
چند دن قبل کانپور کے گلی کوچوں میں اس کانفرنس کے جلوس مسلمانوں کی طرف سے نکالے جاتے
تھے اور علانیہ "ہم کفر کی ہستی کو دنیا سے مٹا دینگے" کے نعرے بلند کیے جاتے تھے۔ پھر اس بات
کی تاویل خواہ کوئی کچھ ہی کیوں نہ کرے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں لفظ کفر کے
اصطلاحی معنے صرف "ہندویت" کے ہیں اور وہ جماعت جو اس نعرہ کو بلند کرتی تھی وہ یقیناً اس
سے ہندوؤں کی جماعت کو مراد لیتی تھی۔ پھر چونکہ کلکتہ، بمبئی کے بعد کانپور ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں
کارخانوں کے مزدور کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ہندو مسلمانوں کے درمیان یہاں زبردست
اور صورت اختلاف کی پیدا ہوگئی تھی اور وہی غیر ذمہ دارانہ جوش جو مزدوروں کی جماعت میں پیدا
ہو سکتا ہے، یہاں دونوں جماعتوں میں کافی خطرناک حد تک پہونچ گیا تھا۔ ایک طرف یہ تمام
مواد آتش گیر یہاں جمع ہو چکا تھا کہ سوء اتفاق سے بھگت سنگھ کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور ہندوؤں میں
ایک غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ جس وقت ہندوؤں نے بھگت سنگھ کی پھانسی کے خلاف
مظاہرہ اور ہڑتال کرنے کا ارادہ کیا، اُن کا ارادہ براہ راست مسلمانوں پر حملہ کرنے کا نہیں تھا اور
وہ صرف اس حد تک تشدد برتنا چاہتے تھے کہ ہڑتال ہر طرح سے کامیاب ثابت ہو۔ چنانچہ وہ لوگوں
کو بائیسکل سے اتار دیتے تھے، موٹروں کو روک دیتے تھے۔ ٹراموے کو چلنے سے باز رکھتے تھے لیکن
جب یہ خیال عوام میں زیادہ وسعت کے ساتھ پھیلا تو فرط جوش میں آکر وہ ڈپو انگریزی مال
فروخت کرنے والوں کی دوکانوں پر پتھر پھینکے گئے۔ اور بعض فرنگیوں پر حملے بھی کیے گئے۔ یہ ایک
وقت تھا کہ اگر مقامی حکومت عسکری حکومت سے کام لے کر اس گروہ کو منتشر کر دیتی یا گرفتار کر لیتی
تو فساد یہیں کا یہیں ختم ہو جاتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ
اس کا ایسا نہ کرنا محض اضطراب و بزدلی کا نتیجہ تھا یا کسی اور مصلحت کا، بہر حال سبب جو کچھ
ہو عوام کے اس جوش کو بڑھنے دیا گیا، اور جب عین اسی عالم غیظ و غضب میں کسی طرف
سے یہ آواز بلند ہوئی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملہ کر دیا ہے تو ہندوؤں کا رخ مال اور
فرنگی آبادی کی طرف سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور آخر کار وہ آگ جو گذشتہ
سال سے دبی ہوئی چلی آ رہی تھی دفعتاً بھڑک اٹھی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جدا کانہ انتخاب

ہندوستان کے لیے کیا برکتیں اپنے ساتھ لایا ہے اور وہ ایک انسان کو درندگی کی کسی حد تک پہونچا سکتا
اس کے بعد کانپور میں کیا ہوا اس کی تفصیل نہایت دردناک ہے مختصراً یوں سمجھنا
چاہیے کہ تین دن تک مسلسل وہاں سوائے وحشت و بربریت کے کسی کی حکومت نہ تھی اور ایک انسان
دوسرے انسان کو اس طرح پھاڑ کر کھاتا رہا گویا جنگل سے بھیڑیوں کی جماعت شہر میں گھس آئی ہے
اور سوائے خون پینے کے انھیں اور کوئی شغل ہی نہیں ہے۔

پھر کسقدر حیرتناک امر ہے کہ بنارس میں ہندو مسلم فساد رونما ہوتا ہے، مرزاپور میں باہم
آویزش نظر آتی ہے، اور پھر کانپور میں یہ محشر قائم ہوتا ہے، لیکن اب بھی ملک میں بعض ایسے صاحب فہم
و تدبیر انسان موجود ہیں جو جداگانہ انتخاب کی حمایت میں آواز بلند کر رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ ہمارے دوست
ہیں تو خدا ایسے دوستوں سے بچائے اور اگر دشمن ہیں تو خدا ہم پر رحم کرے کہ ہم یہ سب کچھ جان بوجھ کر
اپنی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔

جولائی ۱۹۳۱ء اگر آپ نے کبھی سمندر کے ساحل پر کھڑے ہو کر طوفانی حالت میں پانی کے تموج کو
دیکھا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تلاطم نام ہے سطح آب کے اس ارتفاع کا جو انتہائی حضیض کے بعد دفعۃً
رونما ہوتا ہے اور لہروں کا سلسلہ عبارت ہے اسی نشیب و فراز سے، اسی صعود و ہبوط سے اور
ابھر کر گرنے اور گر کر ابھرنے سے ——— بالکل یہی حالت ملکوں اور قوموں کے عروج و زوال
کی ہے۔ اگر آج کوئی قوم انتہائی زوال کی حالت میں ہے تو سمجھ لو کہ اس کے مستقبل میں بلندی
پنہاں ہے۔ اور اگر کسی کو بلند ترین نقطۂ عروج پر دیکھو تو جان لو کہ اس کا زوال دور نہیں ———
——— فرق اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ موجوں کا نشیب و فراز ہم کو جلد جلد نظر آجاتا ہے اور قوموں کے عروج
و زوال کے لیے قرنوں اور صدیوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے ——— ملکوں کے جغرافیے اسی طرح
بدلے ہیں اور بدلتے رہینگے۔ قوموں کی تاریخیں اسی طرح بنی ہیں اور بنتی رہیں گی اور آج دنیا
کے تمام آثار حقیقۃً زندہ شہادتیں ہیں فطرت کے اسی انقلاب پسند ذوق کی جو ذرے سے
کر آفتاب تک ہر جگہ ہر چیز میں اور ہر وقت یکساں طور پر موثر نظر آتا ہے ——— اہل
غائر نگاہیں آنے والے انقلاب کو بہت پہلے سے دیکھ لیتی ہیں اور جن کی نظر بالغ و دور رس نہیں
ہے وہ سب سے آخری پردے کے اٹھنے کی منتظر رہتی ہیں ——— روس کی اشتراکیت
کی رجعت، اطالیہ کا انقلاب اور بالکل تازہ چیز ہسپانیہ کے دور ملوکیت کا خاتمہ یہ سب

آثار و مناظر ہیں جن کا علم ہمیں اس وقت ہوا جب یہ رونما ہو کر واقعہ و حقیقت میں تبدیل ہو گئے، لیکن جاننے والے پہلے ہی سے جان چکے تھے کہ زار روس کے دور قہرمانیت کو فطرت اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکتی تھی، قیصر جرمنی کے پیمانۂ کبر و غرور کا چھلک پڑنا ناگزیر تھا، اٹلی کی دشمنِ انسانیت سیادت مذہبی کا ختم ہو جانا ضروری اور اسپین کے دور امارت کا مٹ جانا بالکل اٹل اور یقینی تھا۔

پھر جو کچھ گزر چکا اس کو گزر جانے دو۔ آؤ دیکھو کہ موجودہ فضا میں بھی تمھیں کوئی آثار اضطراب نظر آتے ہیں، کیا آج کی ساعتوں میں آنے والے کل کے نشانات کا کچھ پتہ چلتا ہے

مغرب کی علمی و اقتصادی، سیاسی و تجارتی تفوق کی داستانوں میں مشرق نے اپنی اہلیت اپنی استعداد ترقی اور اپنی اخلاقی برتری کی خصوصیات کو ہمیشہ نظر انداز کیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نگاہوں کی خیرگی کے اسباب اب بھی اسی طرح قائم ہیں، کیا ظاہری نقش و نگار کی خوبیوں سے گزر کر بطون کی حقیقت کو ہماری نظروں نے اب بھی نہیں پہچانا؟ ——— وہ چیز جو ہمیں مغرب میں جاہ و ثروت نظر آتی تھی آج اس کے استعماری خط و خال بے نقاب ہیں و دل یورپ کے اقبال و دولت کے ترانے جن سازوں کے ذریعے ہم تک پہونچائے جاتے تھے ان کی بے آہنگی آج کسی سے مخفی نہیں اور اس سرزمین ایجاد و اختراع کے مصانع و معامل جن کا نصب العین صرف رہزنی و قزاقی تھا، آج ویران و برباد نظر آتے ہیں ——— وہ ایوانہائے تجارت جن کا گوشہ گوشہ ہر وقت روپے کی جھنکار سے گونجتا رہتا تھا اب سنسان ہیں ——— وہ کارخانے جہاں عفریت پیکر مشینیں ہر وقت رعد آسا آوازیں بلند کرتی رہتی تھیں ویران و برباد ہیں ——— اور وہ ٹکسالیں وہ بنک جہاں دولت ہر وقت پانی کی طرح بہتی نظر آتی تھی خاموش و غیر آباد ہیں ——— وہی یورپ جس کے تمول کے افسانوں نے ہم کو مرعوب بنا رکھا تھا آج اسی کے دولت مند فرزندوں کا یہ حال ہے کہ افلاس سے پریشان ہیں، خود کشی کے لیے آمادہ ہیں، بے روزگاری نے انھیں دیوانہ بنا رکھا ہے اور اس وقت وہاں کا بڑے سے بڑا حکیم و فیلسوف چارہ کار کی جستجو میں ناکام نظر آتا ہے۔

اگر ایشیا تباہ و ویران ہے تو جائے شکایت نہیں کیونکہ وہ جاہل ہے ناتراشیدہ ہے اگر مشرق ادبار تنزل میں مبتلا ہے تو کس کو مجال گفتگو ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ سیاہ فام ہے، غیر مہذب ہے، دیوانۂ مذہب ہے۔

لیکن خدا را کوئی بتائے کہ آج یورپ جو اپنے آپ کو مخزن علم جانتا ہے جو تہذیب و شائستگی

کا موجد و مخترع ہے جو مذہبیات کی لعنت سے آزاد ہو چکا ہے، جو سفید رنگ رکھتا ہے، جو حسین ہے
قوی ہے محنتی ہے، اور وہ سب کچھ رکھتا ہے جو ایک خدا کے بیٹے کی نسل سے چلنے والی مخلوق میں پایا
جانا چاہئے ——— ہاں کوئی بتائے کہ آج وہ کیوں سوگوار ہے۔ اس کا آرام کس نے کھویا،
اس کی نیند کس نے اچاٹ کی اور اس کے بنائے ہوئے "بروج مشیدہ" کہاں گئے؟ —— واقعہ
یہ ہے کہ انسان صرف اعتبارات و مفروضات پر زندہ رہنا جانتا ہے اور جب حقیقتوں سے پردہ اٹھتا
ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ کتنے زمانہ تک اس نے اپنے آپ کو مکر و فریب میں مبتلا رکھا ———
—— قدرت مسکرا کر پھر دوسرا پردہ ڈالتی ہے اور پھر وہ اسی تار و پود میں الجھ جاتا ہے جو اس
سے قبل اس نے قائم کیا تھا ——— پھر اگر غور کیجئے تو یہ زمانہ وہی ہے جب حقیقتیں یکے بعد
دیگرے بے نقاب ہوتی جا رہی ہیں اور نہایت واضح طور پر سرکش انسان کو بتایا جا رہا ہے کہ اگر وہ
وہ امن و سکون کا خواہاں ہے تو اس کو استعمار میں نہ ڈھونڈھنا چاہیے بلکہ استہلاک میں تلاش کرنے کی ضرورت
ہے۔ تجارت و دولت کی ترقی اس حصول کی ضامن نہیں بلکہ یہ جنس نایاب صرف اخوت انسانی
و ایثار و رواداری سے مل سکتی ہے جو نہ کرپ کے کارخانہ کی چیز ہے نہ مانچسٹر اور لنکاشائر
کے صنعت گاہوں کی۔

آج ایشیا اگر بیدار ہو رہا ہے تو اس کو پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر لینا چاہئے کہ کیا
وہ مغرب کے انھیں نقوش قدم پر چلے گا جو انسان کو دولت مند تو بنا سکتے ہیں لیکن اسی کے
ساتھ انسانیت بھی چھین لیتے ہیں یا وہ اپنی انھیں دیرینہ خصوصیات کو قائم رکھے گا جو زمانہ نامعلوم
سے لے کر اس وقت تک برابر انبیاء و رسل اولیاء و اکابر کے ذریعہ سے ان کے دردمند
دلوں میں ودیعت کی گئی ہیں ——

اگست ۱۹۳۱ء اصحاب علم و فضل ہمیشہ دو قسموں میں منقسم رہے ہیں اور رہیں گے ایک وہ جو
کسی علم کی بنیاد ڈالتے ہیں جدید اصول بناتے ہیں اور اپنے اختراعات سے تربیت ذہن و دماغ
کے لئے نئی راہیں نکالتے ہیں دوسری جماعت وہ ہے جو صرف اسلاف کے چراغ سے اپنا
چراغ روشن کرتی ہے مقررہ تصانیف معینہ اصول کے مطالعہ ہی کو انتہائی کارنامہ اکتساب علم
کا جانتی ہے۔ اور جو سمجھتی ہے کہ تحقیق و تنقید اجتہاد و ابداع کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے
اور علم کی تکمیل جو ہونا تھی ہو چکی ——— اول الذکر جماعت کی حالت یہ ہے کہ اگر اس

کے نتائج تحقیق پر تنقید کی جاتی ہے تو وہ سکونِ دل کے ساتھ اسے سنتی ہے غور کرتی ہے اور پھر از سرِ نو سعی و عمل، جد و جہد میں مصروف ہو جاتی ہے یہاں تک کہ دنیا کو اس کی صحت و تکمیل پر ایمان لے آنا پڑتا ہے لیکن برخلاف اس کے دوسری جماعت کی حالت یہ ہے کہ جب اس کے مفروضات پر گفتگو کی جاتی ہے تو وہ برہم ہو جاتی ہے اور اساطیر الاولین کی تمام حکایتیں، منطق و فلسفہ کے تمام مغالطے، خرافیاتِ تاریخی کے جملہ واقعات سامنے رکھکر جواب دیتی ہے کہ کیا ان کے مقابلہ میں کسی کو دم مارنے کی مجال ہو سکتی ہے کیا کوئی انسان اس ذہن و دماغ کا پیدا ہو سکتا ہے جو تحقیقاتِ ماضیہ کے سامنے سابقون الاولون کے علی الرغم لب کھول سکے؟ کیونکہ نہ اب روح القدس باقی ہے نہ اس کا فیض، اور اس لیئے کس کو یہ کہنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ

دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

اس وقت اگر ان دونوں جماعتوں کا صریح و واضح مطالعہ کرنا ہے تو مغرب و مشرق کے علماء کا مطالعہ کیجیئے اور اپنی بے بصری و بیچارگی پر جتنا ماتم بھی ہو سکتا ہو کر لیجیئے کیونکہ اب اس کے بعد کوئی درجہ منزلِ فنا تک پہونچنے کے لیئے ہم کو طے کرنا نہیں ہے۔

اب سے چند سال قبل تک اہلِ مغرب کا ایمان تھا کہ ایتھر تمام فضا میں پایا جاتا ہے اور زمین کی کشش ہر وقت کارفرما ہے۔ لیکن ایک شخص آئنسٹین نامی اٹھتا ہے اور تمام گذشتہ تحقیقات کو باطل کر کے ایتھر کے وجود کو مہمل اور زمین کی کشش کو لغو قرار دیتا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ اعوجاجِ زماں (Curvature of Time) کا عجیب و غریب نظریہ پیش کرتا ہے لیکن نہ کوئی شخص اسے مردود و ملعون قرار دیتا ہے نہ اس پر مضحکہ اوڑاتا ہے بلکہ ہر شخص غور کرتا ہے، سمجھتا ہے حتی کہ اس کا جدید نظریۂ اضافیت (Relativity) مسلمات میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں ہمارے یہاں کے علماء کو دیکھیئے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ "ھدیۂ سعیدیہ" میں جو دلائل گردشِ زمین کے ابطال میں پیش کیئے جاتے ہیں وہ لغو ہیں "شرح چغمینی" میں جو مسائل ہیئت کے بتائے جاتے ہیں وہ تقویمِ پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تو آستینیں چڑھا لیتے ہیں اور اس کو کفر و الحاد قرار دے کر مذہبی سوسائٹی سے علیحدہ کر دینے کے لیئے تیار ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک اب انسان سے غور و فکر، اختراع و ابداع، تحقیق و اجتہاد کی قوت چھین لی گئی ہے اور وہ مجبور ہے کہ اس سے قبل جو کچھ قدما لکھ گئے ہیں ان پر بے چون و چرا ایمان لے آئے۔

حال ہی میں اس ذہنیت کا نہایت پر لطف منظر دیکھنا ہو تو اس بحث کو دیکھیے جو جناب ابو ہریرہؓ کی موافقت قتلِ مرتد کی حمایت اور نگار کے سلسلِ مضمون "مطالعۂ حدیث" کی مخالفت میں معارف اور سچ کے صفحات میں نظر آ رہی ہے۔

صفحے کے صفحے اس تحقیق میں صرف کر دیئے گئے ہیں کہ جناب ابو ہریرہؓ نہایت ذی فہم و ذی ہوش تھے عہد نبوی میں نہ عاقل و بالغ کی حیثیت رکھتے تھے، رجال میں بڑے پائے کے ثقہ راوی مانے جاتے تھے، قدما نے ان کے اقوال کو ہمیشہ صحیح باور کیا وغیرہ وغیرہ لیکن کسی ایک جگہ بھی مضمون کی اصل روح سے بحث نہیں کی گئی جو ابو ہریرہ پر جرح کی باعث ہے اور کوئی ضعیف سی کوشش بھی ان الزامات کے دور کرنے کی نہیں کی گئی جو ابو ہریرہ پر اصولاً و درایۃً روایات و احادیث کی نوعیت کو دیکھ کر دار د ہوتے ہیں گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ وہ رسول اللہ کو صرف ابو ہریرہ کے ذریعے سے سمجھنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں اگر رسول اللہ کے اخلاق پر کوئی حرف آئے ان کی تعلیمات پر اعتراض وارد ہو تو اس کے تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ انتہائی حد ہے اس کورانہ تقلید و اسلاف پرستی کی جس میں آج کل خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کا مولوی مبتلا نظر آتا ہے وہ یہ گوارا کر سکتا ہے کہ رسول کی تنقیص ہو جائے، اسے یہ تسلیم ہے کہ تعلیمات اسلامی مسخ نظر آئیں، وہ یہ منظور کر سکتا ہے، کہ مذہب کا تعلق عقل و فہم سے بالکل نہ رہے لیکن ابو ہریرہ کو کوئی کہے تو یہ اس کی برداشت سے باہر ہے، کیونکہ اس کے نزدیک

یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

مولویوں کی وہ جماعت جو تصنیف و تالیف سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اور صرف تقریر و مواعظ سے جاہل مسلمانوں کو تباہ و برباد کر رہی ہے یقیناً بڑی خطرناک چیز ہے لیکن میرے نزدیک اس سے زیادہ مہلک وہ جماعت ہے جو بدقسمتی سے تصنیف و تالیف کا بھی کچھ ذوق رکھتی ہے اور جو خدا معلوم کب سے غیر صالح ذخیرہ اپنی تحقیقات باطلہ کا فراہم کرتی چلی آ رہی ہے۔ ہر چند اس کے اثرات عوام پر تو زیادہ نہیں ہیں لیکن متوسط طبقہ جو کچھ لکھنا پڑھنا جانتا ہے ان کے تصانیف سے بری طرح اثر پذیر ہوتا ہے اور خود چونکہ اس طبقے میں کوئی اہلیت تنقید و تفتیش کی نہیں ہوتی اس لیے وہ ان موٹی موٹی کتابوں سے جس میں ہر چار سطر کے بعد ایک سطر عربی کی ضرور نظر آتی ہے اور جس کے نٹ نوٹ میں بیسیوں حوالے خدا معلوم کن کن قدیم و عجیب و غریب کتابوں کے درج ہوتے ہیں، مرعوب ہو جاتا ہے، حالانکہ مذہب کو کتابوں سے کیا واسطہ، اطمینان نفس کے لیے اس دفتر بے معنی کی کیا حاجت؟ مولوی

آج سے کئی صدی قبل جب مذہب نام نفس و ضمیر کے سکون کا تھا، جب قرآن کا مفہوم ایک مولوی کے مواعظ و ارشادات سے بلند تھا، جب دین حنیف میں جبر و اکراہ کا ذرا سا بھی شائبہ گوارا نہ کیا جاتا تھا، اور جب عہد بنی عباس میں آزادی کے ساتھ ہر شخص کو اسلام کا صحیح مفہوم جاننے کیلئے جرح و تنقید کی اجازت تھی۔ اسوقت کفر و ارتداد کا مفہوم صرف یہ تھا کہ اصول اخلاق کو پس پشت ڈال کر انسانیت کی ترقی کو روک دیا جائے لیکن اب یہ معیار بہت بلند ہو گیا ہے، اس قدر بلند کہ میں تو خیر کیا چیز ہوں، اگر آج غزالی اور رازی زندہ ہوتے تو ان کا دامن بھی مولوی کے ہاتھ میں ہوتا اگر مولوی کی عبا اُن کے ہاتھ۔۔۔ نہ آسکتی۔ غضب خدا کا، میں صد بار کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت و جبروت، اور اسکی قوت و قدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ہزار بار لکھ چکا کہ رسول کی صداقت و بلندی فطرت پر جسطرح میں ایمان لایا ہوں شاید ہی کوئی اور ایمان لایا ہو لیکن باوجود اس اقرار کے بھی میں کافر ہوں، ملحد ہوں، مرتد ہوں! پھر اگر اسی قرار و عقیدہ کا نام کفر و الحاد ہے تو "نازم بہ کافری کہ بہ ایماں برابر است"

اور ساری دنیا کی بیدینی مجھے دیدو، تمام عالم کا ارتداد میرے حوالہ کر دو۔ اور کائنات کے ہر ہر گوشہ کا الحاد میرے قلب میں بھر دو کہ اس دولت کے ساتھ تو مجھے جہنم بھی اس فردوس سے زیادہ عزیز ہے جہاں ایک مولوی مسلمان کو کافر بنائے بغیر نہیں جا سکتا ——— آہ

ایں چہ شور یست کہ در دور قمر می بینم!!

اس دوران میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے زیادہ منظم طور پر میری بیدینیوں کے خلاف تبلیغ و اشاعت کی گئی، یہاں تک کہ بعض انجمنوں نے جو مقامی "مولوی جماعت" کے زیر اثر تھیں میرے اور نگار کے الحاد کو ناقابل برداشت قرار دے کر نگار کی خریداری سے لوگوں کو باز رکھنے کی کوشش کی، صوبۂ بہار کے کوئی بزرگ مولوی عبد الحکیم یا حکیم الدین صاحب ہیں انھوں نے اپنے صوبہ کے اخبار "اتحاد" میں ایک خطیبانہ مقالہ کے ذریعہ سے ابناء وطن کو نگار کے فتنہ سے آگاہ کر کے اسکے مطالعہ کو حرام و ناجائز قرار دیا۔ یہانتک کہ یہیں لکھنؤ میں بعض اکابر قوم و مذہب نے جلسہ کر کے یہ بھی ارادہ کیا کہ میری اس عارضی زندگی ہی کو ختم کر دیا جائے۔ بعض حضرات نے متعدد خطوط اس نوع کی تخویف و ترہیب کے بھی میرے پاس روانہ کئے۔ مقامی اخباروں میں روزنامہ ہمت اور ہفتہ وار سچ نے اس کار ثواب میں زیادہ اہتمام و توجہ سے کام لیا، الغرض اس دوران میں وہ سب کچھ ہوا جو صحافت و پروپاگنڈہ کی مدد سے ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے ان تمام حملوں کے جواب میں صرف سکوت سے کام لیا، کیونکہ ان تمام حضرات میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کی ہو۔ اور مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے۔ یہ سب ظن و قیاس اور عوام کی افواہ کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ بے معنی ہوا کرتی ہے یا پھر دیدہ و دانستہ کتمان حقیقت ہے اور۔۔۔ میرے خلاف میری ہی تحریر کی غلط تعبیر جو ممکن ہے اصول جنگ کے لحاظ سے ان کی شرع متین میں جائز قرار دیدی گئی ہو جنھوں نے بمصداق "اس کا ثواب نذر کروں گا حضور کی" شاید میرے خلاف تبلیغ و اشاعت ہی کے ذریعہ سے امسال فردوس میں ایک قصر تازہ کی تعمیر کا عزم راسخ کر لیا ہے

ہمارے مسٹر عبد الماجد صاحب دریابادی (زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا!) نگار کی الحاد پروری کا ذکر تو اکثر کرتے رہتے ہیں لیکن کیا کبھی کوئی ضعیف سی کوشش انھوں نے اس امر کی بھی کی ہے کہ وہ عصبیت سے علیحدہ ہو کر میرے خیالات پر غور فرماتے اور پھر فیصلہ

کرتے کہ میرا حقیقی مقصود، اسلام کی خدمت ہے یا اس کی تخریب و توہین۔ مجھے حیرت ہے کہ باوجود اینہمہ دعوائے ادبیت و تفلسف وہ تعصب یا ہٹ دھرمی کے زیر اثر یہ بھی نہ غور کر سکے کہ جن مضامین کے اقتباسات وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انہیں سے انکی تردید ہوتی ہو۔ میر نگائی کے فکاہی مضمون میں خدا کے متعلق جو خیالات پریشان ظاہر کئے گئے ہیں وہ ایک دیوانہ یا مخبوط الحواس کیطرف سے ہیں جیسا کہ مضمون کی ابتدا میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور مضمون سے جو نتیجہ پیدا کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان خدا کو جو چاہے کہے جس اصول کے ماتحت چاہے مطالعہ کرے لیکن آخر کار وہ خدا ہے اور وہی کرتا ہے جو اسے منظور ہوتا ہے ——— میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس "وانتم سکاریٰ" کو علحدہ کر کے صرف "لاتقربوا الصلوٰۃ" پیش کرنیوالی ذہنیت جناب عبدالماجد صاحب دریابادی کو کس مدرسہ میں زانوئے ادب تہ کرنے سے حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح انھوں نے دوزخ و جنت کے متعلق میرے خیالات کے سمجھنے میں غلطی سے کام لیا ہے (گو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غلطی قصد و ارادہ کے ماتحت تھی یا تعصب و ناانصافی کی بناء پر)۔ میرا مقصود ان مضامین سے یہ تھا کہ جن غلط روایات کی بناء پر دوزخ و جنت کا مفہوم عام طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ کس قدر مضحک اور اسلام کی شان کے منافی ہے۔ پھر جب تک کہ جناب دریابادی یا انھیں کیطرح کوئی اور حامی دین یہ نہ ثابت کر دے کہ واقعی دوزخ و جنت کا تعلق مادی لذات سے ہے، اسوقت تک میرے اُن مضامین کو توہین مذہب یا مخالفت اسلام کی صورت میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ کہنا بھی سخت غلط بیانی ہے کہ میں امام بخاری کا مخالف ہوں۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ نہ صرف بخاری بلکہ تمام کتب احادیث بحالت موجودہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر کلیتہً اعتماد کر کے کسی مذہب کے اصول کو پیش کیا جا سکے علی الخصوص مذہب اسلام جو دنیا کا تنہا فطری مذہب ظاہر کیا جاتا ہے۔ کیا جناب دریابادی کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت ہے کہ صحاح ستہ میں جتنی احادیث درج ہیں وہ واقعی وہی ہیں جو انکے جامعین نے فراہم کی تھیں اور ان میں بعد کو تدلیس و تحریف، حذف و اضافہ کچھ نہیں ہوا۔ یقیناً اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا ہے اس لئے میری مخالفت نہ امام بخاری سے ہے نہ انکے مجموعہ احادیث سے بلکہ صرف اس خیال سے کہ کیوں بغیر تنقید کے ہر قول کو رسول اللہ سے منسوب کر کے مذہب اور رسول کی توہین کیجائے اور کیوں ایک ایسے شخص کو جو بغیر سمجھے ہوئے احادیث کو احادیث ماننے کیلئے تیار نہیں، مذہب کا مخالف قرار دیا جائے۔ بخاری کے درس سے ترک مذہب کا درس اسی لحاظ سے کہا گیا کہ بحالت موجودہ اگر شروع سے لیکر آخیر تک تمام احادیث کو صحیح تسلیم کرنے پر انسان کو مجبور کیا جائے تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ مذہب کا خیال ترک کر دے گا۔ اور اگر ایسا نہ کرے گا تو پھر وہ جس مذہب کا پیرو ہوگا اُسے اسلام تو کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور جو نام چاہے اس کا قرار دے لیجئے

اسی طرح جناب عبدالماجد صاحب نے ۲۵ ستمبر کے سچ میں میرے خلاف اور جو الزامات قائم کئے ہیں وہ سب تحریف مفہوم کا نتیجہ ہیں۔ اور میرے مقصود سے بالکل علحدہ۔ میں نے جن اکابر ملت کی طہارت و عصمت کی داستانوں کا ذکر کیا ہے۔ اُن سے مراد صرف آجکل کے بعض ایسے نام نہاد علماء کرام ہیں جو صداقت کو محو کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اور جن کا باطن انکے ظاہر سے بالکل مختلف ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سلسلہ میں انھوں نے ابوحنیفہ وغیرہ کو کیوں شامل کر لیا، کیا عبارت کے سیاق و سباق سے وہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ میری مراد اکابر ملت سے کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگست سنہ ۳۲ء کے ملاحظات میں اپنا ذکر دیکھکر وہ بیتاب ہو گئے۔ اور فرط غضب میں

محض انتقام لینے کے لئے اُنھوں نے میرے فقرہ کا محل بدل کر خواہ مخواہ ایسے معنی پیدا کئے جو لوگوں کو مشتعل کر دینے والے ہوں۔

. . . .

. . . .

. . . .

پھر یہ سب کچھ جانے دیجئے میں مانتا ہوں کہ جو کچھ میں لکھتا ہوں یا جو مضامین "نگار" میں شائع ہوتے ہیں وہ یکسر الحاد و شرک ہیں۔ لیکن خدا را کبھی ان کا جواب دینے کی بھی تو سعی فرمائیے۔ میرے اضطراب کو تو دور کیجئے۔ بفرض محال یہ بھی مان لیجئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ غیر مسلم ہونیکی حیثیت سے کہتا ہوں، تو کیا آپ کا فرض بہ حیثیت ایک مسلم ہونے کے یہ نہیں ہے کہ میرے شبہات کو دور کریں مجھے راہ راست پر لائیں۔ یا یہ فرض صرف اس طرح پورا ہو جاتا ہے کہ مجھے ملحد و مرتد بنا کر خدا کے حوالہ کر دیا جائے۔ اور نگار کے مطالعہ کو حرام قرار دیکر میری تاریک ذہنیت میں اور اضافہ کیا جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ یہ کس نوع کی خدمت اسلام ہے یہ کس انداز کی تبلیغ ہے

تمام رسائل میں صرف معارف ہی ایک رسالہ ایسا ہے جو کبھی کبھی جواب دینے کی زحمت گوارا کرتا ہے۔ اور محض "کفر گری" کو ذریعۂ حرب و دفاع قرار نہیں دیتا، لیکن افسوس ہے کہ نگار میں جس نقطۂ نظر سے گفتگو ہوتی ہے۔ اس سے وہاں بھی اعتنا نہیں کیا جاتا اور اس لئے میری تشنہ کامیاں بدستور باقی رہتی ہیں

میرا دعویٰ یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم میں، اسلام ہی صرف ایک مذہب ایسا ہے جو وقت و زمانہ کا ساتھ دینے والا ہے۔ اور یہی ایک تنہا مسلک ہے جس نے اخوت عامہ اور انسانیت کبریٰ کو منزلِ حقیقی قرار دے کر ساری دنیا کو اشتراک عمل کی دعوت دی، اور اسی اعتقاد و یقین کے ساتھ میں تمام اصول و شعائر پر نگاہ ڈالتا ہوں ـــــ یوں تو ایک مولوی بھی بظاہر یہی کہتا ہے کیونکہ جب تک وہ یہ دعویٰ نہ کرے مذہب اسلام کا امتیاز، اس کی ہمہ گیری کیونکر ثابت ہو سکتی ہے، لیکن جسوقت اصول و عقائد، شعائر و عمل کا سوال آتا ہے تو پھر اس کا چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ جو یقیناً کسی پیرو اسلام کا نہیں ہو سکتا

اسلئے اسوقت جو برہمی علماء کرام کی میرے خلاف ہے، اس کا سبب حقیقتاً یہ نہیں ہے کہ میں اسلام کا مخالف ہوں۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں کیوں انکے سامنے سر بسجود نہیں ہوتا، اور میں کیوں اسلام کو ان کے عقول کا پابند نہیں سمجھتا۔ جن حضرات نے نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں اگر اسلام نام صرف یزداں پرستی کا ہے تو اس کے متعدد شواہد اس میں نظر آسکتے ہیں، لیکن اگر اسلام کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اب پھر کہتا ہوں اور بفاش و برملا کہتا ہوں میں ہرگز مسلمان نہیں ہوں اور نہ دنیا میں کوئی انسان مسلمان ہو سکتا ہے

آج زمانہ جس دور اضطراب سے گزر رہا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ پھر کوئی بت شکن نبی پیدا ہو، بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کوئی مذہب شکن رسول آئے اور اس دنیا سے اس مذہبیت کی گرانباری کو دور کر دے جس نے دنیا کا امن و سکون غارت کر رکھا ہے۔ پھر اگر آپ

ایسے نازک وقت میں اسلام کی کوئی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں اور اپنے اس دعوے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کا نصب العین دنیا میں امن و سکون قائم کرنا ہے تو اس کی صورت وہ نہیں ہے جو آپ لوگ اختیار کئے ہوئے ہیں بلکہ اس کی تدبیر یہی ہے کہ

یک دو نفس تا لہ شو از دل دیوانہ برآ

اسلام کے چہرہ کو ان تمام داغوں سے پاک کیجئے جنھوں نے اس کے اصلی خط و خال کو پوشیدہ کر رکھا ہے اور وہ حقیقی سادگی وہ بلند نظری، وہ فراخ دلی اور علوئے نگاہ پھر پیدا کیجئے جو اسلام کے عناصر ترکیبی تھے۔

اس وقت تک کہ آپ ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے مثلاً صرف "برآواز دولاب مستی کنند" کو اپنا ایمان قرار دیے ہوئے ہیں۔ اور کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ آپ کے ان حرکات مذبوحی پر جرح و تنقید کرے، اور آپ میں آکر شامل ہو، یقیناً آپ بالکل محفوظ ہیں اور کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ لیکن اگر آپ نے کبھی یہ دعواے کیا کہ آپ اپنے اصول کی تبلیغ بھی چاہتے ہیں تو پھر معاف کیجئے اسوقت آپ کا مجھے کافر و ملحد کہدینا، نگار کے خلاف لغو و غلط پروپاگنڈا قائم کرکے عوام میں ہیجان پیدا کر دینا، مفید مطلب نہیں ہو سکتا کیونکہ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس وقت دماغ انسانی جس اضطراب میں مبتلا ہے، اُس کی تشفی آپکے پروپاگنڈا سے نہیں۔ بلکہ نگار ہی کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے ——— پھر ممکن ہے کہ آج کا .... ماحول اس کی قدر نہ کرے۔ لیکن ایک وقت آئے گا۔ جب نگار کے صفحات ہی میں آپ کو پناہ لینا پڑے گی۔ اور آپ کے پاس کوئی ذریعہ دفاع نہ ہوگا۔ گر وہ جسے نگار اور صاحب نگار قائم کر چکا ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کلام اللہ کے بعد جس مذہبی لٹریچر (یعنی مجموعہ احادیث) کو اپنا مقصود بنائے ہوئے ہیں۔ اس نے اسلام کی جڑوں کو کس قدر متزلزل کر دیا ہے۔ عیسائیوں کے اعتراضات، آریوں کے حملے، اور تمام غیر مسلم اقوام کی نکتہ چینیاں کلام مجید پر اتنی منحصر نہیں ہیں جتنی احادیث پر اور حقیقت یہ ہے کہ آجتک ڈاکٹر ٹسڈل کی مشہور کتاب ینابیع الاسلام کا جواب تمام کسی بڑے سے بڑے عالم سے بن نہیں پڑا کیونکہ اس کے تمام اعتراضات کا بڑا ماخذ مجموعہ احادیث ہے اور آپ اس پر مجبور ہیں کہ جو دالقہ یا لفظ رسول اللہ سے منسوب کر دیا گیا ہے اُسے غلط نہ قرار دیں خواہ وہ کتنا ہی لغو و مہمل کیوں نہ ہو ——— یعنی یہ تو آپ گوارہ کر سکتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد ڈھوکھلی ہو جائے، رسول اللہ کی توہین ہو جائے لیکن مجموعہ احادیث پر آپ کبھی تنقید نہ ہوگی۔ اور اگر کوئی دوسرا اس کی جرأت کریگا تو اسے ملحد، بیدین، فتنہ نگار، اور خدا جانے کیا کیا کہیں گے۔ درانحالیکہ ان تمام الفاظ کا بہترین مصرف تو واضعین احادیث ہی کی ذات بابرکات ہو سکتی ہے۔

بہر حال میں ان تمام معذرت نگاریوں کے بعد بھی ہر وقت اپنے آپ کو ایک مبتدی طالب علم سے زیادہ نہیں جانتا اور اس کے لئے تیار ہوں کہ ہندوستان کا کوئی ایک مولوی یا مولویوں کی کوئی بڑی سے بڑی جماعت مجھے سمجھا دے اگر میں غلطی پر ہوں، لیکن اس کا طریقہ شاید یہ نہیں ہے جو آپ لوگ اختیار کر رہے ہیں۔

باب الاستفسار

(بہ سلسلۂ ماسبق)

جوش ملیح آبادی اور ان کی بعض حرکات مذبوحی

گزشتہ ماہ کے باب الاستفسار میں علی اختر اور جوش کی شاعری پر جو اظہار خیال کیا گیا تھا وہ حقیقتاً صرف تمہیدی
تھا اس تفصیل و تشریح کا جس کے بیان کو میں فی الحال ملتوی رکھتا اگر تنقید مذکور کی اشاعت پر جناب جوش کی بعض حرکات
مجھے اس سلسلہ کو برابر جاری رکھنے پر مجبور نہ کر دیتیں۔

قبل اس کے کہ میں اصل مدعا کی طرف آؤں بطور مقدمہ چند ایسے واقعات کا اظہار ضروری ہے جن سے معلوم ہو سکے کہ
تنقید جناب جوش کے لئے کیوں اس درجہ تلخ و ناگوار ثابت ہوئی۔

یہ حقیقت شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ جوش اُس بلند سطح کے شاعر نہیں ہیں جو ستائش و صلہ یا "داد تحسین"
سے گریز کر صرف اپنے مذاحساس شاعرانہ پر مست و بیخود رہا کرتے ہیں، بلکہ ان کا شمار اُن ادنیٰ سطح کے شاعروں میں ہے
جو شاعری کو ذریعۂ "عزت و شہرت" سمجھکر ہمیشہ ایک خاص پروپاگنڈا میں مصروف رہتے ہیں اور اگر کوئی چیز ان کی ان
لائحۂ عمل میں کبھی حائل ہو جاتی ہے تو اُن کے کرب و تکلیف کا وہی عالم ہوتا ہے جو ایک سود خوار مہاجن کا جب وہ
رقم کو ڈوبتا ہوا محسوس کرے۔ — حیدر آباد پہونچنے سے قبل جن جن ذرائع سے انھوں نے اپنی شاعری کی نمائش
کی اس کا اظہار اس وقت ضروری نہیں، لیکن حیدر آباد جا کر انھوں نے جو طریق کار اپنی نمود و شہرت کے قیام و بقا کیلئے
اختیار کیا اس کا مختصر بیان یقیناً ضروری ہے کیونکہ وہ اس داستان کی ایک ضروری کڑی ہے۔

اب سے تقریباً ۹، ۱۰ سال قبل جب جوش صاحب عماد الملک مرحوم کے نام ڈاکٹر اقبال کی تحریر سفارش لیکر
حیدر آباد پہونچے تو ایک شاعر ہی کی حیثیت سے وہ روشناس ہوئے اور چونکہ شاعر ہونا فی الجملہ ادبی حیثیت کو مستلزم ہے
اس لئے ان کے لئے کسی ایسی ہی خدمت کی جستجو ہوئی جو "ادب و انشا" سے تعلق رکھتی ہو اور اس طرح آخر کار وہ وہاں کے
دار الترجمہ میں ادبیات انگریزی کی مترجم کی حیثیت سے نوکر ہو گئے۔ جوش لاکھ پر خود غلط انسان ہوں لیکن یہ ممکن نہیں
کہ خدمت مفوضہ کی اہمیت و دشواری کے مقابلہ میں اپنی نااہلیت کا علم نہ رہا ہو، کیونکہ وہ شخص جس نے انگریزی زبان
کا مطالعہ اسکول کی چند ابتدائی کتابوں سے زیادہ نہ کیا ہو، جو عربی فارسی کا کوئی علم نہ رکھتا ہو اور جو اردو میں ایک
سطر بھی سنجیدہ و شایستہ نثر کا نہ لکھ سکتا ہو، ظاہر ہے کہ وہ انگریزی ادبیات کو اُردو میں کیونکر منتقل کر سکتا ہے۔ اس لئے
انھوں نے اس کمی کو صرف اپنی شاعری کے پروپاگنڈا سے پورا کرنا چاہا اور یہ کوشش کی کہ ان کی شاعری کا اثر وہاں کے

لوگوں پر اس درجہ قائم ہو جائے کہ ان کی اہلیت ملازمت کا سوال اگر کبھی اُٹھے بھی تو بے نتیجہ رہے، چنانچہ انھوں نے وہاں کی ہر ادنیٰ و اعلیٰ صحبت و مشاعرہ میں جا جا کر، لوگوں کے گھروں پر پہونچ پہونچ کر راستہ چلتے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اور محبوب کی مہندی سے لیکر مہندی کے آستانۂ محبوب تک ہر جگہ اپنی شاعری کی نمایش شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ چونٹی میں رسی بھی پتھر پر اپنا نشان چھوڑ جاتی ہے چہ جائیکہ انسانی کوشش، کوئی وجہ نہ تھی کہ اس تبلیغ و اہتمام کا کوئی اثر نہ ہو اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتے۔ پھر چونکہ تحفظ شہرت میں ہمیشہ مسابقت کا کھٹکا انسان کو لگا رہتا ہے اسی لئے جوش صاحب نے اپنی کارگاہ عمل کو صرف بیجا نمود و نمایش ہی کی حد تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسی کے ساتھ انھوں نے وہ بھی کیا جو ہر ناقص و نا اہل کا شعار رہا ہے یعنی انھوں نے دوسروں کی برائیاں بھی شروع کر دیں اور اپنے تفاخر کو وہ اس حد تک کھینچ لے گئے کہ ایک طرف خود اپنے استاد جناب عزیز لکھنوی پر نکتہ چینیاں شروع کر دیں تو دوسری جانب اپنے محسن ڈاکٹر اقبال کو ایک جھک مارنے والے "شاعر" سے زیادہ حیثیت دینا انھوں نے گوارا نہ کیا حالانکہ فن شعر میں جو علم و مرتبہ عزیز و اقبال کو حاصل ہے وہ جوش کو سو بار مر مر کر جینے کے بعد بھی میسر نہیں آسکتا۔

اتفاق سے ان کے حیدرآبادی حلقۂ احباب میں جس سے وہ اپنی شاعری کی داد حاصل کیا کرتے تھے ایک شاعر علی اختر بھی تھے، جو بہ اعتبار زمانہ ہر چند جوش سے متقدم تھے، لیکن دنیا ان سے واقف نہ تھی کیونکہ وہ نہ پروپاگنڈا کے فن سے آگاہ تھے، اور نہ وہ اپنی شاعری کو ذریعۂ شہرت قرار دینا پسند کرتے تھے۔ مخصوص صحبتوں میں یہ بھی جوش صاحب کو اپنی نظمیں سنایا کرتے تھے اور جوش صاحب کی ظاہری "واہ واہ" کو انتہائی خلوص پر محمول کر کے خوش ہو لیا کرتے۔ اسی حال میں ایک زمانہ گذر گیا اور جوش صاحب سرزمین دکن میں "انا و لاغیری" کا دم بھرتے رہے۔ لیکن چونکہ قدرت دنیا میں کسی استعداد کو زیادہ عرصہ تک گوارا نہیں کر سکتی اس لئے وہ وقت آیا کہ فطرت نے کبر و غرور کا سر نیچا کرنے کے لئے اسباب فراہم کرنا شروع کر دیے اور غالباً ۱۹۳۰ء میں مولانا ہوش بلگرامی نے اول اول مجھے ذریعۂ تحریر جناب علی اختر کی شاعری کی طرف متوجہ کیا اور ان کی ایک نظم بھی روانہ کی۔ یہ واقعہ ہے کہ مشکل ہی سے کوئی نظم میری توجہ اپنی طرف مایل کر سکتی ہے لیکن علی اختر صاحب کی اس نظم میں، میں نے ایک خاص سنجیدگی و متانت پائی، اور میں نے مختصر الفاظ میں اس کی داد دیتے ہوئے نگار میں شایع کر دیا اور علی اختر صاحب کو متوجہ کیا کہ قدرت کی اس ودیعت کو وہ رایگاں نہ جانے دیں اور ملک میں اپنے خیالات کی اشاعت کریں کہ اس وقت ضرورت اسی نوع کی شاعری کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے نگار میں مسلسل نظمیں لکھنا شروع کر دیں اور پھر گذشتہ چار سال کے اندر ملک کے اکثر جرائد و رسایل میں ان کے افکار شعری شایع ہونے لگے۔

اول اول تو جوش صاحب نے علی اختر کے ظہور کو معمولی بات سمجھا، لیکن جب رفتہ رفتہ لوگوں کے دل و دماغ اس طرف زیادہ متوجہ ہوتے نظر آئے تو ان کا نشہ اُترا، اور انھیں اندیشہ پیدا ہوا کہ یہ زبردست ٹکر کہیں

سی جگہ سے انھیں متنزلزل نہ کردے۔ درانحالیکہ علی اختر کی شاعری کوئی کاسۂ گدائی نہ تھی کہ بھیک کی تقسیم کا اندیشہ
ں صاحب کو اس کے توڑ دینے پر مجبور کر دیتا لیکن وہ آتش رشک و حسد جو ہمیشہ ایک غیر کامل الفن شخص میں بہت جلد
رک اوٹھتی ہے، جوش صاحب میں مشتعل ہوکر رہی اور تمام تعلقات مودت و خلوص کو بالائے طاق رکھکر انھوں نے
اختر کے خلاف لوگوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ "ان کی شاعری کی بنیاد تو صرف میری نظموں کا سرقہ و اخذ ہے"
ں کے ساتھ انھوں نے یہ کوشش بھی کی کہ ایک پمفلٹ کے ذریعہ سے یہ پروپاگنڈا کیا جائے، چنانچہ جوش صاحب خود
جگہ سے نگار کی گزشتہ جلدیں اسی غرض سے لیگئے، لیکن بعض احباب کے مشورہ سے یہ خیال ترک کر دیا گیا۔ علی اختر
اسب کو مختلف ذرایع سے یہ خبریں پہونچتی رہتی تھیں، لیکن وہ کبھی اس کا یقین نہ کرتے تھے کہ جوش سے ایسی منافقانہ
ت سرزد ہو سکتی ہے۔ الغرض جوش صاحب کے اس پروپاگنڈا کو بھی کافی زمانہ گذر گیا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ جب
ں گذشتہ ماہ ستمبر میں حیدرآباد پہونچا تو متعدد حضرات نے مجھ سے زبانی و تحریری استفسارات اس باب میں کئے اور
ں نے نومبر ۳۲ء کے نگار میں مختصراً ان استفسارات کا ذکر کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ دسمبر میں اپنے خیالات علی اختر
ر جوش کی شاعری کے متعلق ظاہر کروں گا۔ اس خبر کا شایع ہونا تھا کہ جوش صاحب کے ایوان شاعری میں ایک زلزلہ
محسوس ہوا اور منجملہ اور بہت سے وسایل دفاع کے ایک ذریعہ انھوں نے یہ بھی اختیار کیا کہ میری تنقید شایع ہونے
قبل ہی وہاں کے ایک مقامی اخبار (صبح دکن) میں جس کے اڈیٹر کو جناب جوش کے "ہم پیالہ" ہونے کا فخر حاصل ہے،
ں وقال کے عنوان سے ایک غیر متین نوٹ شایع کرا دیا جس میں مجھ پر بہت سے حملے کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا تھا کہ
اس وقت تک حیدرآباد میں کوئی سوال علی اختر و جوش کی شاعری کے تقابل کا پیدا نہیں ہوا اس لئے اڈیٹر نگار
کا اس مسئلہ کو چھیڑنا صرف اس لئے ہے کہ دو دوستوں کے درمیان مخالفت پیدا کی جائے۔
اور اگر کوئی شخص اس تقابل کا خیال بھی کرے تو حماقت ہے کیونکہ علی اختر کا جوش کے مقابلہ میں نام لینا ہی درست نہیں
نے اس نوٹ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، کیونکہ مجھے تو اعتماد تھا اپنی تنقید پر جو دسمبر کے نگار میں آنے والی تھی اور
تا تھا کہ اس نوع کے "قیل وقال" سے کیا وہ پتھر ہٹایا جا سکتا ہے جس کے اندیشہ نے جوش صاحب کو اس قدر
اسیمہ کر رکھا ہے۔

آخر کار دسمبر کا نگار شایع ہوا اور اس کے دیکھنے کے بعد جو جو مذبوحی حرکات جوش صاحب سے سرزد ہوئیں وہ
مستقل بیان کی محتاج ہیں۔ سب سے پہلے تو انھوں نے میری ہجو میں ایک نظم لکھی جس میں مجھے "بدشعار"، "بدخصال"
"پولیس کانسٹیبل" وغیرہ کے مہذب الفاظ سے یاد کیا گیا تھا (لیکن افسوس ہے کہ اس نظم کی اشاعت کی جرأت اُن کو
ں ہوئی) اور پھر اس خیال سے کہ کہیں یہ مسئلہ تنقید ان کی شاعری کو اور زیادہ بے نقاب نہ کردے، انھوں نے علی اختر
احب کو ایک تحریر بھیجی جس میں اپنے انتہائی خلوص کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے احتراز کرنے کی ہدایت کی تھی۔ مدعا یہ تھا کہ

علی اختر صاحب خود مجھے اس سلسلہ کے ختم کر دینے پر مجبور کریں لیکن چونکہ جوش صاحب کے صحیح خط و خال علی اختر صاحب پر بالکل ظاہر ہو چکے تھے اس لئے یہ آخری حربہ ان پر کارگر نہ ہوا اور علی اختر صاحب نے وہ تحریر میرے پاس بھیج دی بجنسہٖ ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

میاں لڑکے تم کن ہاتھوں میں کھیل رہے ہو، ان ہاتھوں کو تمھیں مس کرنے کا کوئی حق نہیں، یہ ہات ناپاک ہیں، اچھے بچے، تم اس گود سے اُتر آؤ، یہ کھلائی بڑی علامہ ہے، تمھیں بُری بُری باتیں سکھا دیگی، ---- سنتا ہوں تم اس مضمون سے بہت خوش ہو، پھولوں نہیں سماتے، اس مضمون کے کھلونے کو تم لئے لئے پھرتے ہو، یہ دیکھو ہمارا اچھا اچھا کھلونا، ابا نے دیا ہے، اور کھیلتے کھیلتے اکثر منہ میں بھی رکھ لیتے ہو۔ استغفر اللہ۔ تم جانتے ہو یہ ساری اچھل کود کس بات کی ہے؟ میاں آنکھیں کھولو، یہ تمھاری محبت نہیں، میری عداوت ہے، جسے حُبِ علی سمجھے ہوئے ہو، وہ بغض معاویہ ہے، سمجھے؟ میری ننھی سی جان! سمجھے؟

ارے یہ مضمون۔ یہ مضمون، توبہ توبہ، لکھنے والے نے اتنا بھی انتظار نہیں کیا کہ جوش پر آیا ہوا غصہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو لکھوں، ورنہ مضمون کی غایت ہی مفقود و معدوم ہو جائیگی، کیا اہل دُنیا اتنے الو کے پٹھے ہیں کہ اس مضمون کی روح تک آن کی آن میں نہ پہونچ جائیں گے، اور بکان کھڑے کر کے یہ سوال نہ کر بیٹھیں گے کہ یہ دیوانے کو کس نے چھیڑ دیا ہے کہ غصے میں چیخیں مار رہا ہے،

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس مضمون میں عناد کی آگ بھڑکی ہوئی ہے، سطریں غصے سے اکڑی نظر آ رہی ہیں، الفاظ کا مُنہ تمتمایا ہوا ہے، دائرے کف در دہاں ہیں، اور کششیں، بار غیظ سے دُہری ہوئی چلی جاتی ہیں۔

اس مضمون کی علت یہ ہے کہ (۱) اس خطا پر کہ میں صاحب مضمون کو حقیر و فرومایہ سمجھتا ہوں، مجھ کو نظروں سے گرا دیا جائے (۲) میری اور تمھاری جدائی ہو جائے، یہ دوسری مد شاید تمھاری سمجھ میں نہ آئے، اسلئے کہ تم اس بے پایاں خباثت کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ بعض لوگوں کو دو دوستوں میں نفاق ڈالدینے سے مزا آتا ہے،

میاں اختر، تم جانتے ہو میں تمھارا ہمیشہ سے مداح رہا ہوں، میں تمھارے شاعرانہ جوہروں کا دل سے قدر داں ہوں، اور ہمیشہ ہونگا میں تمھارا ہوں، تم میرے ہو، ---- اچھے بچے! یہ تحریر جا کر صاحب مضمون کے منہ پر مارو، جوش کی یہ تحریر ہے، وہ مجھ سے جدا نہیں ہو سکتا، ہم اتنے لونڈے نہیں کہ ایک کو ایک پر ترجیح دینے سے ہم قلابازیاں مارنے لگیں، ہپ ہپ ہرا کرنے لگیں۔ شاعری ان اصل مضمون بازیوں سے بہت بلند ہے، اگر شاعری کسی کی لیکر اُڑ رہی ہے تو کوئی قوت اُسے گرا نہیں سکتی، چاند چمکتا رہتا ہے، کتے بھونکتے رہتے ہیں، البتہ اگر کسی کی شاعری ہی کمزور ہے تو تمام دنیا کی ٹھوکریں اسکے لئے بیکار ہیں، اسے گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ صاحبزادے، تمھیں مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا، میں کبھی تمھارا مقابلہ نہیں کرونگا، خاک کھاؤں، دھول کھاؤں، کیا بھانجے کو کھا جاؤں، کیا میں کوئی ایسا ہی گیا گزرا ہوں،

نیاز مند جوش «نابغہ دوم»

ارے ہنسی کے مارے دم نکلا جاتا ہے، "نابغہ" "نابغہ" اُف کوئی گدگدائے ڈالتا ہے، ارے مرا مرا مرا، یہ غیبی آواز کہاں سے آ رہی ہے، دیکھو کوئی ایفونی توجیہ ابھی تسلیم نہیں ہو رہا ہے،

آپ نے دیکھا یہ ہے تحریر اُس شاعرِ اعظم کی جو اپنی ادبیت و انشاء کا اتنا زبردست پروپاگنڈا دنیا میں کر رہا ہے۔ یہ ہے عبارت اس شخص کی جو حیدرآباد ایسی عظیم المرتبت و مردم شناس ریاست کی ایک علمی اکاڈیمی میں تصحیحِ عبارت و درستیِ انشاء کے لئے "ناظرِ ادب" کی حیثیت سے مامور ہے، یہ ہے اندازِ بیان اس فاضلِ بے بدل کا جو دقیق ترین علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ درست کرنے کے لئے متعین ہے، اور یہ ہے شاہکار اُس ادیبِ جلیل کا جس کی فصاحت و بلاغت سے متمتع ہونا جامعۂ عثمانیہ ایسی مہتم بالشان درسگاہ کے "شعبۂ تصنیف و تالیف" کے لئے ازل سے مقسوم ہو چکا تھا

اس تحریر کی سنجیدگی و متانت کا مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ اس پر اظہارِ رائے کیا جائے اور نہ جوش صاحب کی طرح۔ بغیر حد درجہ مجبوری کے ذاتیات میں پڑنا میرا شعار ہے۔ البتہ اگر انھوں نے اسی قسم کے خیالات ظاہر کرنے کی جرأت پھر کبھی کی تو پھر بیشک میں آزاد ہوں گا اور جوش صاحب کو اس وقت سے ڈرنا چاہئے جب میں اپنی تمام معلومات ان کی حیدرآبادی زندگی کے متعلق ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاؤں کیونکہ مجھے ان کے اخلاقِ بلند کے وہ تمام حالات بھی معلوم ہیں جنھوں نے ان کے احباب کے دلوں میں ناسور ڈال دیے ہیں اور اُنکے وہ خیالات بھی میرے علم سے باہر نہیں جن کا اظہار وہ حیدرآباد کے بعض نہایت ہی اونچے گھرانوں اور عظیم ترین شخصیتوں کے متعلق "مسافرخانوں" اور عام جلسوں میں بیٹھ کر کیا کرتے ہیں۔ یقیناً میں اُن کی نگاہ میں حقیر و فرومایہ ہوں لیکن اس کے اظہار سے ان کو ڈرنا چاہئے تھا کیونکہ اگر ان کے اخلاقی کارنامے کسی وقت دنیا کے سامنے آگئے تو پھر خود جناب جوش کے لئے "حقیر و فرومایہ" کے علاوہ وہ کون سے مناسب الفاظ ہوں گے جن سے دنیا اُن کو یاد کرے گی

اس قدر لکھنے کے بعد اب میں ان کی شاعری کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ کس کس قسم کی غلطیاں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

دسمبر کے نگار میں ایک عمومی تبصرہ جوش کی شاعری پر کرتے ہوئے ظاہر کر چکا ہوں کہ ان کے کلام میں عمق کم ہے اور سطح زیادہ، یعنی وہ الفاظ تو یقیناً نہایت پاکیزہ جمع کر دیتے ہیں لیکن ان سے کوئی مفہوم ایسا پیدا نہیں ہوتا جو دماغِ انسانی کو جا کر مس کرے۔ رندانہ جوش و سرمستی کی ان کے یہاں کمی نہیں، خیال کی دلشکنی و دلآویزی بھی کافی پائی جاتی ہے، لیکن سنجیدگی و متانت، تصوری عمق اور معنوی وزن کی بہت کمی ہے: اس لئے ان کے اشعار میں اکثر و بیشتر وہی غلطیاں نظر آتی ہیں جو اچھے الفاظ یکجا جمع کر دینے والے شاعروں کے کلام میں عموماً پائی جاتی ہیں۔ وہ تو ایک خاص جوش کے عالم میں اپنی جگہ یہی سمجھتے ہیں کہ مفہوم ادا ہو گیا لیکن چونکہ سننے والا صرف الفاظ کی مدد سے مفہوم تک پہونچنا چاہتا ہے اور الفاظ اس مقصد میں اس کے مساعد نہیں ہوتے۔ جوش صاحب کے یہاں اس قسم کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ان کا ایک شعر:-

مے ناز کی نزدیک سے چھلکا کے دمِ رقص   پھر دور سے مہکی ہوئی زلفوں کی ہوا دی

پہلا مصرعہ بالکل لکھنوی وضع کا ہے کہ پہلے تو ناز و ادا کو مے قرار دیا اور پھر اس کو چھلکتا ہوا دکھایا[1]۔ اس لئے اگر اس مصرعہ کا تصنع و تکلف علیحدہ کر کے پورے شعر کو صاف الفاظ میں سمجھایا جائے تو یوں کہیں گے کہ:

"نزدیک سے اس نے رقص کر کے　　بو دور سے مہکی ہوئی زلفوں کی سنگھا دی"

اور اس طرح اس شعر کا اہمال ظاہر ہے۔ علاوہ اس کے بو قریب سے سنگھائی جاتی ہے نہ کہ دور سے اور ناز رقص دور سے زیادہ لطف دیتا ہے نہ کہ قریب سے۔ اگر یوں کہا جاتا کہ "دور سے عشوۂ رقاصانہ دکھایا اور قریب آ کر زلفوں کی بو سنگھا دی" تو بیشک درست ہو سکتا تھا۔ چھلکا گئے کے بجائے اگر چھلکا دی کہا ہوتا تو اتنا نقص نہ پیدا ہوتا۔

اسی نظم کا دوسرا شعر یہ ہے:۔

سر نشہ میں تھوڑا سا جھکا اور اٹھی آنکھ
گویا درِ میخانہ کی زنجیر ہلا دی

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ "نشہ کی حالت میں سر جھکا کر کسی کا نگاہ اٹھا دینا گویا درِ میخانہ وا کر دینا ہے" لیکن دوسرے مصرعہ سے یہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ درِ میخانہ کی زنجیر ہلانے اور درِ میخانہ وا کرنے میں جو فرق ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔

اس نظم کا آخری شعر ملاحظہ ہو۔　پیمانہ ترا گرم رہے جوش کہ تو نے
رندوں کو شبِ قدر کی تصویر دکھا دی

"پیمانہ کا گرم رہنا" بالکل خلاف محاورہ ہے۔ محفل و بزم کے لئے لفظ گرم استعمال ہوتا ہے نہ کہ پیمانہ کے لئے۔ پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا

ساغر ترا گردش میں رہے جوش کہ تو نے

ایک نظم انھوں نے صلح کی رات پر لکھی ہے۔ اس کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

حریم صلح میں قایم تھا ایک مرکز پر
مزاج عشق و تقاضائے حسن عربدہ جو

اس شعر میں بھی الفاظ تو نہایت پاکیزہ جمع کر دیے گئے ہیں لیکن مفہوم کا کہیں پتہ نہیں۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ حسن و عشق دونوں آشتی پسند حالت میں تھے، لیکن شعر سے اگر کوئی مفہوم بڑی کوشش و کاوش کے بعد پیدا ہوتا ہے تو اس کے بالکل مخالف۔ ایک طرف تو حسن عربدہ جو (یعنی جنگجو) ہے جس کا تقاضا سوائے جنگ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

[1] ایک معیاری شعر اسی خصوصیت لکھنوی کا ملاحظہ ہو:۔
انگور میں یہ مے تھی پانی کی چار بوندیں　　پر جب سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے　　(امیر مینائی)

دوسری طرف مزاج عشق ہے جس کی صفت خوئے تسلیم و وفا کے اور کچھ نہ ہونا چاہئے۔ پھر جب یہ دونوں ایک مرکز پر جمع ہو جائیں گے تو ظاہر ہے کہ دونوں سے اپنی اپنی صفت کا اظہار پوری قوت سے ہوگا اور اس عالم میں صلح و آشتی کا کیا ذکر۔ اسی طرح کا مہمل ایک شعر اور اسی نظم کا یہ ہے

وفا کی انجمن ناز میں تھی شیر و شکر
جراحت دل صد چاک و تیغ صاعقہ خو

اول تو انجمن ناز کے ساتھ وفا کی نسبت بالکل لغو و مہمل ہے۔ علاوہ اس کے جراحت دل اور تلوار کا شیر و شکر ہو جانا مفہوم صلح کا حامل کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے خلاف یہ مفہوم پیدا کرتا ہے کہ تلوار پوری طرح کاٹ کر رہی تھی اور جراحت دل انتہائی تحمل سے اسے برداشت کر رہی تھی۔ دوسرے مصرعہ میں ایک اور معنوی نقص یہ بھی ہے کہ پہلے ٹکڑے میں "جراحتِ دل صد چاک" کہکر صرف ایک کیفیت کا اظہار کیا گیا ہے اور دوسرے ٹکڑے میں تیغ کا لفظ ہے جو ایک مادی و مرئی چیز ہے۔ بالکل اسی طرح کی غلطی غالب نے بھی ایک شعر میں کی ہے۔ لکھتا ہے

کہیں نظر نہ لگے ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

دوسرے مصرعہ میں۔ زخم جگر سے واقعی وہ زخم مراد نہیں ہیں جو کھال کو کاٹ کر خون جاری کر دیتا ہے بلکہ ایک کیفیت مراد ہے لیکن پہلے مصرعہ میں دست و بازو کا ذکر کر دیا گیا جس کا اس کیفیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسی نظم کا ایک اور شعر جناب جوش کا ملاحظہ ہو

ہوا کی جیب میں تھا تیر از کماں رفتہ
کشش کے دام میں تھی کاوش رم آہو

کماں سے چھوٹے ہوئے تیر کا ہوا کی جیب میں ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ کاوش رم آہو کا کشش کے دام میں جانا کوئی مفہوم پیدا کرتا ہے۔ اگر مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ کماں سے جدا ہو کر تیر ہوا میں ایک جگہ تھم کر رہ گیا تھا اور آہو نے دشت در میدگی کی کیفیت چھوڑ دی تھی تو اول لذکر ٹکڑے کا اہمال ظاہر ہے اور موخر الذکر مفہوم شعر سے متبادر نہیں۔

ایک اور شعر اسی نظم کا:۔

بساط عیش پہ خوابیدہ تھا غم دوراں
شراب ناب کی موجوں میں غرق تھے آنسو

دوسرے مصرعہ سے شاعر یہ مفہوم ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ آنسوؤں کا کہیں پتہ نہ تھا یعنی اُس وقت رونا دھونا موقوف تھا حالانکہ مصرعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر رو تو رہا تھا لیکن اس کے آنسو شراب ناب میں ڈوبتے جاتے تھے۔

مقطع سے پہلے ایک شعر اسی نظم کا اور قابل ملاحظہ ہے:۔

اُدھر اُڑا ہوا طول شب فراق کا رنگ
ادھر شباب پر آرائش خم گیسو

اول تو پہلے مصرعہ میں لفظ طول بالکل زاید و بیکار ہے۔ شب فراق کا رنگ اُڑنا تو خیر ایک بات ہے لیکن طول شب کا رنگ اُڑنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ علاوہ اس کے بسبب ذکر صبح کی رات کا ہو رہا ہے اور دوسرے مصرعہ میں یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ آرائش خم گیسو کے ساتھ محبوب شاعر کے پاس موجود تھا تو شب فراق کا وجود ہی کہاں باقی رہا یہ اجتماع اضداد کیسا؟

ایک نظم کا عنوان ہے راز دنیاز کی رات۔ اس کا تیسرا شعر یہ ہے:۔

ترانہ ریز تھی نبض حیات کی جنبش ضمیر شب میں وہ پنہاں خروش و ولولہ تھا

دیکھئے الفاظ کتنے خوبصورت و دلکش ہیں لیکن مفہوم کا کہیں پتہ نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ضمیر شب کس چیز کا نام ہے اور ضمیر شب سے اُس نبض حیات کی جنبش کو کیا لگاؤ جس کا تعلق شاعر کی ذات سے ہے۔ مقصود صرف یہ کہنا ہے کہ رات کا سماں ایسا ولولہ خیز تھا کہ نبض حیات میں جنبش سی محسوس ہو رہی تھی" لیکن خواہ مخواہ غیر ضروری الفاظ استعمال کرکے شعر کو اصل مفہوم سے بیگانہ کر دیا۔

اس کے بعد کے دو شعر تو اس سے بھی زیادہ مہمل ہیں۔ ملاحظہ ہوں:۔

تپاں تھا دائرہ چرخ و عالم ارواح نیاز و ناز میں کیا جانئے کیا معاملہ تھا
کبھی ہلال چمکتا تھا اور کبھی خنجر میان حسن و محبت عجیب مرحلہ تھا

اول تو علمی نقطۂ نظر سے دائرہ چرخ بالکل مہمل سی بات ہے اور اگر یہ مان لیا جائے کہ جوش صاحب کی شاعری کو علم و عقل سے کوئی لگاؤ نہیں تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ نیاز و ناز کے درمیان کیوں ایسا معلوم ہو سکتا ہے جیسے دائرۂ چرخ اور عالم ارواح تڑپنے لگیں۔ اسی طرح دوسرے شعر میں "ہلال و خنجر کا چمکنا" بالکل لایعنی سی بات ہے دوسرے مصرعہ میں مرحلہ، معاملہ، کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ علاوہ اس کے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ معاملہ حسن و محبت میں ہلال و خنجر کا چمکنا کیا معنی رکھتا ہے اور اس سے شاعر کا کیا مقصود ہے۔ اگر یہ کوئی اشارہ ہے تو کس چیز سے اور اگر حقیقت کا اظہار ہے تو کیونکر؟

(باقی)

(نوٹ۔ یہ سلسلہ برابر ایک سال تک جاری رہے گا اور اس ضمن میں اکابر ہند کے وہ تمام خطوط بھی شایع کئے جائیں گے جو جوش کی شاعری کے متعلق میری ہم آہنگی میں وصول ہو رہے ہیں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ ۔ ششماہی تین روپیہ

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۲	فہرست مضامین فروری ۱۹۳۳ء	شمارہ ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۳	فروری سنہ ۱۹۴۳ء	شمارہ ۲

ملاحظات

آپ ایک سو دس سال قبل کے انسان کو زندہ کرکے دریافت کیجئے کہ کبھی تم نے اپنی جوانی میں

۱ـــ بحری تار کا نام سنا تھا؟

۲ـــ ہوائی جہاز کو آسمان میں اُڑتے دیکھا تھا؟

۳ـــ ٹیلی فون کے ذریعہ سے گفتگو کی تھی؟

۴ـــ نبرز بن گیس کا حال معلوم تھا؟

۵ـــ جراثیم کا کچھ علم حاصل تھا؟

۶ـــ نظریۂ نشو و ارتقاء کا چرچا ہوتے کہیں دیکھا تھا؟

۷ـــ کبھی یہ بات ذہن میں بھی آئی تھی کہ کسی جنگ میں ۶ کروڑ مسلح آدمی شریک ہو سکتے ہیں؟

۸ — کیا تصور میں بھی یہ بات کبھی آسکتی تھی کہ سیاسیات کی اہمیت اقتصادیات کی اہمیت پر منحصر ہوگی؟

تو وہ یہ سوالات سنکر یا تو تمھیں احمق سمجھ کر ہنسنے لگے گا یا فرط حیرت سے پھر فوراً اسی کا دم نکل جائے گا — لیکن آپ گزشتہ ۸۰ سال (۱۸۵۱ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک) علمی، سیاسی، اقتصادی و صنعتی انقلابات پر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب کچھ اسی مختصر زمانہ میں ہوا اور شاید ہی تاریخ عالم پر کوئی ایسا دور آیا ہو جس نے عقول انسانی میں بالکل کایا پلٹ دی ہو۔

اب آئیے ساتھ ہی ساتھ اس عہد کے سیاسیات، اقتصادیات و اجتماعیات پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں۔ تاکہ اس اجمال کی ضروری تفصیل ہاتھ سے نہ جائے۔

(۱) کامل ۸۰ سال سے وطنیت یا قومیت یوروپ کے اندر ایک دبی ہوئی چنگاری کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی مگر اس کو مشتعل ہونے کا موقع نہ ملتا تھا۔

اطالیہ عبارت تھا ان ممالک و ولایات کے مجموعہ سے جہاں آسٹریا کی فوجیں حکومت کر رہی تھیں۔ اور آسٹریا ہی کی سیاست برسر اقتدار تھی — جرمنی کا مفہوم اس سے زائد نہ تھا کہ مستقل صوبوں میں مستقل فرمانروا داد حکمرانی دے رہے تھے — ترکی دول بلقان کے بڑے حصہ پر قابض چلا آرہا تھا۔ اور پولینڈ کی سلطنت کا تو جغرافیہ میں کہیں وجود ہی نہ تھا — لیکن گزشتہ ۸۰ سال کے اندر یوروپ کی سرزمین نے استقلال قومی کے کیا کیا مناظر دیکھے ہیں — تاریخ عالم ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

۱۸۵۱ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیان جو سلسلہ جنگوں کا شروع ہوا تو اس وقت تک ختم نہ ہوا۔ جب تک جرمنی اور اطالیہ کے تمام متفرق صوبے ایک دوسرے سے متحد ہو کر مستقل سلطنتوں میں تبدیل نہ ہوگئے، اسی طرح دول بلقان نے اس وقت تک ہتھیار نہ رکھے۔ جب تک ان کی مستقل قومی حیثیت علیحدہ تسلیم نہ کرلی گئی، پھر جنگ عظیم میں جو کچھ ہوا وہ بھی کسی سے مخفی نہیں کہ پولینڈ ایسے مختصر حصۂ زمین نے بھی ایک مستقل حکومت کی حیثیت اختیار کرلی۔ اور آسٹریا ہنگری کی ملوکیت مختلف اجزاء قومی میں منتشر ہوگئی جن سے اس کی تشکیل ہوئی تھی — اسی طرح جاپان نے کمانڈر پری کے متعینہ اصول پر عمل کر کے مغرب کی قومی تحریک کو اپنا دلیل راہ بنایا۔ چین نے سن یت سن کی زعامت میں، ہندوستان نے گاندھی کی قیادت میں، ترکی نے مصطفےٰ کمال کی سیادت میں، ایران نے رضا شاہ کی حکومت میں اور مصر و سوریا وغیرہ تمام ممالک شرق اوسط نے مختلف مصلحین کے زیر اثر اسی استقلال قومی کی بنیاد مستحکم کی جس کی روح وسط مغرب سے پھیل کر آہستہ آہستہ روئے زمین کے ہر ہر قطعۂ آبادی کو بیدار کرتی چلی آرہی تھی، یہاں تک کہ اس وقت آئرلینڈ سے لے کر ایران تک اور ایران سے لے کر انام تک کوئی ایک حصۂ زمین بھی ایسا نہیں جہاں گزشتہ ۸۰ سال کے اندر قومیت کی روح بیدار نہ ہوگئی ہو — لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی کم حیرت ناک نہیں کہ اس روح قومیت کے ساتھ ساتھ ملوکیت

جذبہ بھی قوی ہوتا گیا اور ایک قوم نے دوسری قوم کو مغلوب و محکوم بنانے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا۔

انیسویں صدی کے اوّل نصف حصہ میں استعماری توسیع کی رُوح بالکل ابتدائی حالت میں تھی، اور بہت کم قومیں مغرب کی ایسی تھیں جنھوں نے ایشیا کی طرف قدم بڑھایا ہو۔ افریقہ کا اکثر حصہ سوائے مصر اور بعض مغربی و مشرقی مستعمرات ساحل کے مجہول و غیر معلوم حالت میں تھا۔ برطانیہ نے تو بیشک ہندوستان، زیلینڈ، سنگاپور اور ہانگ کانگ کو بھی اپنی مستعمرات ایشیا میں شامل کر لیا۔ لیکن دوسری مغربی حکومتیں البتہ برطانیہ کی طرح خوش قسمت نہ ثابت ہوئیں کیونکہ فرانس، اسپین، اور پورتگال کے قدیم مستعمرات بھی جو شمالی و جنوبی امریکہ میں تھے ہاتھ سے نکل گئے۔ لیکن ۱۸۷۰ء کے بعد سے ایک جدید استعماری دَور کی ابتدا ہوئی۔ اور دنیا کا جغرافیہ بدلنا شروع ہوا یعنے روس نے ایشیا میں شرقاً و جنوباً منچوریا، منگولیا اور ایران تک اپنا تصرف وسیع کیا، جرمنی نے افریقہ اور مشرقی جزائر ہند میں ایک لاکھ مربع میل زمین اپنے لئے مخصوص کر لی۔ فرانس ۱۸۸۱ء میں ٹیونس سے برسرپیکار ہوا اور ۱۸۸۳ء میں ٹونکین سے لڑا، پھر ۹۰ ہزار مربع میل زمین ایشیا میں اور ۲۶ لاکھ مربع میل افریقہ میں حاصل کر لی —— اسی دَوران میں برطانیہ نے ۴۰ لاکھ مربع میل زمین کا اپنی سلطنت میں اضافہ کر لیا —— جاپان نے بھی اقوام یوروپ کی تقلید میں جزیرۂ فارموسا اور منچوریا و کوریا کا ایک حصہ اپنے قبضہ میں کر لیا ——

اس استعماری توسیع کے سلسلہ میں اگر ایک طرف تھوڑا سا فائدہ یہ ہوا کہ بعض نامعلوم و مجہول حصے زمین کے علم انسانی میں آگئے تو دوسری طرف نقصان عظیم یہ بھی ہوا کہ باہم سلطنتوں میں جنگ و نفاق کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور اسی طرح ۱۸۵۱ء و ۱۸۸۰ء کے درمیان ایک سلسلہ بین الاقوامی جنگوں کا شروع ہو گیا۔ چنانچہ فرانس و آسٹریا کی جنگ ۱۸۵۱ء میں۔ امریکہ کی خانہ جنگیاں ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک —— فرانس اور پروشیا کی جنگ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۱ء تک —— پھر اس کے بعد چین و جاپان کی لڑائی ۱۸۹۴ء سے ۹۵ء تک —— اسپین و امریکہ کی جنگ ۹۸ء میں، جنگ بوئر ۹۹ء میں روس و جاپان کی لڑائی ۱۹۰۴ء میں اور پھر گذشتہ جنگ عظیم یہ سب اس استعماری حرص و طمع کا نتیجہ تھیں۔

پھر جب استعماری حرص و آز نے یہ صورت اختیار کر لی اور ہر ملک و قوم امن و سکون کی اس خرابی سے اپنی تجارتی و اقتصادی حالت کو خطرہ میں دیکھنے لگی۔ تو ۱۸۵۶ء میں تمام دول کبریٰ (سوائے امریکہ اور اسپین کے) نے آپس میں ایک ایسا معاہدہ کیا جس کی رُو سے دَوران جنگ میں تجارت کو محفوظ کر دیا گیا —— اس کے بعد ۱۸۶۴ء میں جب امریکہ خانہ جنگیوں میں مبتلا تھا دول یوروپ نے معاہدۂ جنیوا کی رُو سے جمعیۃ صلیب احمر کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۷۸ء میں موتمر برلن کا اجتماع ہوا تاکہ روس، برطانیہ، اور آسٹریا ہنگری کے درمیان عہد نامۂ مصالحت ہو جائے۔ پھر ۱۸۸۲ء میں امریکہ بھی عہد نامۂ جنیوا میں شریک ہو گیا اس کے بعد ۹۹ء میں زار روس نقولا ثانی نے ایک موتمر لاہائی میں طلب کی، ۱۹۰۷ء میں رئیس روز ولٹ نے پھر اجتماع کیا جس میں ۴۴ حکومتوں کے نمایندے شریک ہوئے اور ہر چند اسلحہ کے مسئلہ میں کسی متفقہ نتیجہ پر نہ پہونچ سکے تاہم بین الاقوامی

قانون میں کچھ ضروری ترمیمیں کردی گئیں۔

اسی اثنا میں دول کبریٰ نے دیکھا کہ مصلحت عامہ کا اقتضا یہ ہے کہ تجارت و مواصلات کے باہمی طریقوں کو منظم کیا جائے اس لئے ۱۸۶۵ء اور ۱۸۸۳ء کے درمیان ڈاک رسانی کے متعلق اتحادی صورت پیدا کی گئی جس میں ۶۰ قوموں نے حصہ لیا اور بارہ حکومتوں نے معاہدۂ برن کے ذریعہ سے حقوق طبع کی حفاظت کو تسلیم کیا۔ اسی کے ساتھ مخترعین کے حقوق اور اتحاد تلغرافی کے متعلق معاہدے مرتب کئے گئے۔

جنگ عظیم کے بعد جمعیت الاقوام قائم کی گئی اور اس میں ۵۴ حکومتوں نے شرکت کرکے پوری کوشش کی کہ جو مسئلہ موقر ترین لاہای سے طے نہ ہو سکا تھا اسے طے کیا جائے اور ملکوں کے مسلح ہونے کی ایک خاص حد مقرر کی جائے ——— الغرض حکومتیں ہر ممکن خطروں کو مٹا کر اپنی اپنی جگہ ملوکیت و استبداد کے لئے راہیں صاف کر رہی تھیں، مگر اسی کے ساتھ ذہن کا انقلاب آہستہ آہستہ دیمقراطی طرز حکومت کے طرف بھی مائل ہو رہا تھا اور یہی وہ میلان تھا جس نے ۱۸۱۵ء سے اپنی قوت کا مظاہرہ شروع کیا اور بعض حکومتیں قطعی جمہوری ہوگئیں ۔۔ خود انگلستان میں بھی پارلیمنٹ کو یہ قانون نافذ کرنا پڑا کہ مجلس نواب میں داخل ہونے کے لئے امارت کی شرط غیر ضروری ہے، اور ۱۸۶۷ء میں انتخابات عامہ میں رائے دہندگان کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور رفتہ رفتہ اس میں اسقدر اضافہ ہوتا گیا کہ آخر کار ہر مرد و عورت کو جس کی عمر ۲۱ سال سے زاید ہو رائے دینے کا حق حاصل ہو گیا ——— جاپان جہاں قرون وسطیٰ کی سی اقطاعی حکومت پائی جاتی تھی وہ بھی ۱۸۸۹ء میں دستوری حکومت میں آگیا۔ اسی طرح فرانس، جرمنی، روس، پیمین، برازیل، آسٹریا ہنگری، ترکی اور اسپین بھی دستوری حکومتوں میں تبدیل ہوگئیں۔

(۲) اب اقتصادیات کی تاریخ پر بھی نظر ڈال کر دیکھئے کہ گزشتہ ۸۰ سال میں کیا کیا انقلابات رونما ہوئے ۔۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مہتم بالشان انقلاب ترقی علوم کے وجہ سے ہوا۔ اور گزشتہ نصف صدی کے اندر حیرت انگیز تغیرات رونما ہوئے ——— اسٹیم انجن ۱۷۶۹ء میں ایجاد ہوا تھا لیکن اس پر ایک صدی کا زمانہ بھی نہ گزرا تھا کہ ۱۸۵۱ء تک اکثر و بیشتر کارخانے اسٹیم انجن ہی سے چلنے لگے۔ اسی دوران میں تار کی ایجاد ہوئی، سینے کی مشین بنائی گئی۔ دخانی جہاز اور ریلوے انجن وغیرہ کثرت سے چل پڑے۔

۱۸۵۶ء کے قریب بسمر نے ایک خاص طریقہ فولاد بنانے کا ایجاد کیا جس سے فولادی صنعتوں میں بڑا انقلاب پیدا ہوا۔ ۱۸۶۰ء کے قریب قوسی نور کہربائی ایجاد ہوا اور کھیت کاٹنے کی ایسی مشین بن گئی جو خود ہی گٹھے بھی باندھتی تھی۔ چھینٹ چھاپنے کا طریقہ معلوم کیا گیا اور یوروپ و امریکہ کے درمیان تار برقی کا سلسلہ قائم ہو گیا۔

۱۸۷۰ء کے قریب آلات گیس، ٹیلی فون، کہربائی لمپ وغیرہ ایجاد ہوئے، ۱۸۸۰ء کے قریب بجلی کا موٹر استعمال ہونے لگا، چھاپنے کی لینوٹائپ مشین بنائی گئی۔ الومینیم کہربائی طریقہ پر اپنی معدن کے اندر سے نکالا گیا، موٹر کار طیار

ہوئی اور پھر اس کے بعد جو سلسلہ اختراع و ایجاد کا شروع ہوا تو لاسلکی ٹیلی فون، مکبر الصوت، ٹیلی ویژن وغیرہ سیکڑوں جدید چیزیں وجود میں آگئیں جنھوں نے صنعت و تجارت دونوں کے اصول بدل کر ان کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا ——— لیکن اسی کے ساتھ جو سب سے زیادہ اہم انقلاب ہوا وہ یہ تھا کہ تجارت و صنعت افراد سے متعلق ہونے کے بجائے جماعتوں سے وابستہ ہوگئی اور مشترکہ سرمایہ سے کمپنیاں قائم ہونے لگیں۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ عوام میں بھی اس کا شوق پیدا ہوا، دوسرے بنکوں کا اثر وسیع و قوی ہو چلا اور تیسرے یہ کہ دنیا کا ہر ایک دوسرے ملک سے وابستہ ہوگیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج جب تاوان جنگ کی ادائی کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو ٹوکیو، نیویارک، لندن اور پیرس کے سرمایہ دار اس کے حل کرنے کے لئے طلب کئے جاتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں جو بہت اہم انقلاب ہوا وہ تنظیم عمال تھا یعنی مزدوروں اور کام کرنے والوں میں بیداری پیدا ہوئی ——— اس تنظیم کی ابتدا ابھی ۱۸۵۱ء میں ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک لاکھ مزدور برطانیہ کی اس تحریک میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں امریکہ کے مزدوروں نے بھی اپنے آپ کو منظم کیا اور رفتہ رفتہ یہ تحریک اسقدر وسیع ہوئی کہ اسوقت ایک کرور ۳۰ لاکھ مزدور اس تنظیم سے وابستہ ہیں۔ اس تعداد میں امریکہ شامل نہیں جہاں ۳۰ لاکھ کی تعداد اس کے علاوہ ہے اور نہ روس و جنوبی امریکہ شامل ہیں۔

(۳) اب اجتماعات کی طرف توجہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں ترقی تعلیم نے کی۔ ۱۸۵۱ء میں برطانیہ ۱۱ لاکھ گنی سے بھی کم ملک کی تمام پبلک مدارس پر صرف کرتا تھا، لیکن اب صرف لندن کے مدارس پر جو کچھ صرف ہوتا ہے وہ بھی اس سے بدرجہا زائد ہے۔ یہی حال امریکہ کا تھا کہ ۳۰ ملین آبادی کے لئے صرف ۱۰۰ مدرسے قائم تھے، لیکن اب ان کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی ہے ——— پھر یہی نہیں ہوا کہ ثانوی تعلیم کا صیغہ رائج ہوا بلکہ کالج قائم کئے گئے، یونیورسٹیوں کی بنیاد پڑی، کتب خانے بڑھائے گئے، تالیفات و تصنیفات کی کثرت ہوئی، اخبارات و رسائل میں اضافہ ہوا اور یورپ و ایشیا ہر جگہ اس کو محسوس کیا جانے لگا کہ عام تعلیم ہی بنیاد ہے ایک قوم کے استقلال و ترقی کی۔

اسی سلسلہ میں عورت کی ترقی پر بھی نگاہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ گزشتہ ۸۰ سال میں وہ بھی خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہے ——— امریکہ میں اول اول عورتیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل نہ ہو سکتی تھیں۔ لیکن ۱۸۷۵ء میں ان کی ایک بڑی جماعت مردوں کے دوش بدوش علمی تجربات میں حصہ لینے لگی اور ۲۰ فی صدی وظائف ان کو دیئے جانے لگے ——— پھر رفتہ رفتہ انھوں نے جتنی ترقی کی وہ کسی سے مخفی نہیں اور وہ کونسا علم و فن، کونسی صنعت و حرفت ایسی ہے جس میں وہ پیش پیش نہیں ہیں۔ یورپ کی عورت نے بھی امریکہ ہی کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا اور اب وہاں بھی وہی عالم ہے جو امریکہ میں نظر آتا ہے ——— خیر مغرب میں اگر یہ انقلاب رونما ہوا تھا تو جائے حیرت نہ تھی، لیکن تعجب

تو یہ ہے کہ مشرق کی عورت بھی نچلی نہ بیٹھ سکی اور چین و جاپان، ترکی، مصر، اور بلاد عرب میں بھی وہ سیاسی و اجتماعی، علمی و صناعی، اقتصادی و تجارتی تحریکوں میں برابر کا حصہ لینے لگیں۔

اسی کے ساتھ علم طب کی ترقی کو دیکھئے کہ مختلف امراض کے جراثیم کی تحقیق شروع ہوئی، بہت سے لاعلاج امراض قابل علاج قرار پا گئے اور تعداد اموات ۱۹ فی ہزار کی نسبت سے کم ہوگئی۔ دیگر علوم عقلیہ کو دیکھئے کہ علم الکیمیا، طبقات الارض، فلکیات وغیرہ میں کیسے کیسے اضافے ہوئے، ڈاروِن کی کتاب "اصل انواع" اسی زمانہ میں شایع ہوئی، اسپنسر کا "فلسفۂ ترکیبیہ" اسی عہد کی چیز ہے، "رانتجن شعاع" اسی دور میں دریافت ہوئی، ریڈیم انھیں ۸۰ سال کے اندر دریافت ہوا اور انیشٹین کا نظریۂ نسبیت بھی اسی زمانہ کی چیز ہے۔

الغرض گزشتہ ۸۰ سال کا زمانہ اپنی علمی، سیاسی، اجتماعی و اقتصادی ترقیوں کے لحاظ سے ایک ایسا عجیب و غریب زمانہ تھا کہ اس کی نظیر تاریخ گزشتہ میں نہیں ملتی اور اگر کوئی قوم دنیا میں ایسی ہے جو ہنوز محو خواب ہے تو ہم کو نہایت آسانی سے اس کے فنا ہو جانے کا حکم لگا دینا چاہئے کیونکہ علم کی اس تیز روشنی میں یہ گرانخوابی، نیند کی گراں خوابی نہیں ہے بلکہ موت کا جمود ہے، موت کی غفلت ہے، جو نہ کبھی دور ہوئی نہ ہو سکتی ہے۔

حال ہی میں کسی اخبار (غالباً انصاف امرتسر) نے مولویوں کی ایک جماعت کی طرف سے یہ صدائے احتجاج ہمارے کانوں تک پہونچائی تھی کہ ترکی کے متعلق جو خبریں شایع کی جاتی ہیں وہ اکثر و بیشتر غلط ہوتی ہیں یعنی نہ وہاں اذان ترکی زبان میں ہوتی ہے نہ خطبہ وغیرہ غیر عربی زبان میں سُنایا جاتا ہے ـــــــ ہر چند یہ طفلانہ باتیں اس قابل نہیں ہیں کہ کوئی سنجیدہ شخص ان کی طرف توجہ کرے (اور اس جماعت کی جتنی باتیں ہوتی ہیں وہ سب ایسی ہی لغو و مہمل ہوتی ہیں) لیکن اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس جماعت کی ذہنیت کیا ہے۔ چونکہ یہ لوگ فروع مذہب میں بھی کسی قسم کی تبدیلی کو خواہ وہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو کفر کا مترادف سمجھتے ہیں اور اسی کے ساتھ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی ایسی مسلم جماعت جس پر ان کی "کفر گری" کا حربہ اثر نہیں کر سکتا، اُن کے مزعومات کے خلاف اصلاح مذہب کی حامی ہے، تو انتہائی بیکسی و بیچارگی کے ساتھ صرف یہی مدافعت کیا کرتے ہیں۔ کہ "اس طرح کی خبریں غلط ہیں، دشمنوں کا پروپگنڈا ہیں اور ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے"

اگر یہ "بر خود غلط" جماعت مصر و عرب اور خود ترکی کے اخبارات کا مطالعہ کرتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ وہاں نہ صرف اذان و خطبہ ہی ترکی زبان میں ہوتا ہے بلکہ نماز میں قرات قرآن بھی عربی میں نہیں ہوتی، چنانچہ حال ہی میں استنبول کا ہنگامہ صرف اسی وجہ سے ہوا تھا اور اسی ہنگامہ کی وجہ سے بہت سے علماء و مشایخ کو پکڑ کر مصطفےٰ کمال نے قید و بند میں ڈال دیا ـــــــ میرے پاس جو عربی اخبارات آتے ہیں اُن میں اس وقت کی تصاویر موجود ہیں جب

ل اوّل ترکی زبان میں نماز ادا کی گئی تھی، پھر اس کو غیروں کا پروپاگنڈا کیونکر کہہ سکتے ہیں ——— غالباً
ندوستان کے علماء کرام یہ سُن کر اور زیادہ مایوس ہوں گے کہ حکومت ترکی نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ سلطنت کے تمام
رض وطول میں سخت احکامات نافذ کر دیئے گئے ہیں کہ عربی زبان کا ایک لفظ بھی استعمال نہ کیا جائے۔ اور اس کے لئے
ہنیں قائم ہوئی ہیں۔ تاکہ وہ موجودہ ترکی لٹریچر کو عربی سے پاک کر کے خالص ترکی الفاظ اس کی جگہ تلاش کر کے لغات
کی کتابیں مرتب کریں۔

پھر اگر مصطفیٰ کمال اور ترک قوم اپنی ان تمام آزادیوں کی وجہ سے واقعی دائرہ اسلام سے خارج ہو چکی ہے تو ہمارے
علماء کو نہایت صفائی سے اس کا اظہار کر دینا چاہئے۔ اس دناءت وکم ہمتی کی کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ حقیقتوں کو الزامات
بجا قرار دے کر ان کی صفائی کی جائے ——— اگر اسلام کی قوت وعزت کا انحصار کسی مخصوص قوم یا ملک کے مسلمان
رہنے ہی پر ہے تو اسلام کی حقیقت معلوم اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیوں ہندوستان کے مسلمان علماء ترکوں
کا فرد مشرک قرار دے کر اُن سے تبرّا و بیزاری کا اعلان نہیں کر دیتے۔ مگر چونکہ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں۔
لہ ان کی اس مزخرفات کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نہ اب ان کا جذبہ ایمانی جوش میں آتا ہے اور نہ خدا کی راہ
میں وہ اپنی "بلٹن" لے کر نکلنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں ——— اِن کی کارگاہِ عمل تو ہندوستان ہی کی جہل پرور
و واہمہ پرست سرزمین میں قائم ہو سکتی ہے۔ جہاں اب بھی "فرمودۂ مولوی" "فرمودۂ خدا" کی
حیثیت رکھتا ہے

جنوری کا نگار نہ صرف یہ کہ غیر معمولی تعویق سے شائع ہوا بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ حد سے زیادہ غلطیاں اس
میں پائی جاتی ہیں ——— اُس کا سبب تو یہ ہوا کہ کاتب دھوکا دے کر دفعۃً غائب ہو گئے اور عرصہ تک مسودات وغیرہ
بھی ان سے نہ مل سکے، اِس کا سبب مینجر کی عدیم الفرصتی ——— کہ کاپیوں کی صحت کا انتظام نہ کر سکے۔ میں حیدرآباد
میں تھا۔ اس لئے خود کوئی انتظام نہ کر سکتا تھا ——— فروری کا پرچہ بھی ۸ - ۱۰ .... دن کی تعویق سے شائع
ہو رہا ہے۔ اور اس کا سلسلہ غالباً دو چار ماہ اور رہیگا کیونکہ ہر مہینے اسی طرح دو دو چار دن کی تاخیر کو دور کیا جائیگا۔
تاریخ الفحشاء کی طباعت شروع ہو گئی ہے، لیکن چونکہ کتاب کا حجم زیادہ ہے اس لئے مارچ کے اخیر ہفتہ تک
اس کی اشاعت کا انتظار کیجئے

جن حضرات نے اس کتاب کے سلسلہ میں کچھ رقم پیشگی بھیجدی ہے وہ وی پی کی روانگی کے وقت وضع کر دیجائیگی۔ ابھی تک
قیمت کا تعین نہیں ہو سکا غالباً ماہ آیندہ میں اس کا اعلان ہو سکے گا

واقعۂ معراج کے متعلق اسلامی عقاید کی تحلیل

اور
ایک انگریز مستشرق ڈاکٹر لسٹڈل کی ہرزہ سرائیاں

اسلامی ادبیات کے ہر شعبہ میں اسریٰ و معراج کا کچھ نہ کچھ واقعہ ضرور ملتا ہے، قرآن و حدیث تفسیر و تصوف، تاریخ و شاعری یہانتک کہ آرٹ اور فنون لطیفہ میں بھی اس کے بعض نقوش نظر آتے ہیں اس موضوع پر دوستوں نے بھی نیاز کیشیوں کا ہدیہ پیش کیا اور مخالفوں نے بھی معاندانہ تنقیدیں کیں عقول انسانی کے مختلف مراتب اور فکر و نظر کے مختلف زاویوں کے اعتبار سے اس پر بہت سی حاشیہ آرائیاں کی گئیں اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ مصوروں نے اس کو نقوش میں ظاہر کیا، عہد صفویہ کی مصوری کا یہ ایک دلچسپ موضوع تھا چنانچہ اس کا ثبوت آج خمسہ نظامی کے ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۴۳-۱۵۳۹ء سے ملتا ہے، جو برٹش میوزیم میں ہے، اس میں عہد صفوی کے بہت سے نامی گرامی مصوروں کے شاہکار ہیں اس نایاب نسخہ کی تمام تصویروں میں سب سے بہتر وہ مرقع ہے جس میں آں حضرتؐ کا واقعہ معراج پیش کیا گیا ہے، آں حضرت براق پر سوار ہو کر نیلگوں آسمان پر تشریف لیجا رہے ہیں آپ کے چاروں طرف ایک شہابی رنگ کے نور کا ہالہ ہے آپ جس وقت زمین سے عالم بالا کا رُخ کرتے ہیں تو ملائکہ پراں کی جماعت سطح سحاب کے نیچے آپکو گھیرے ہوے ہے، لورنس بنیین لکھتا ہے، کہ واقعہ معراج تو اس عہد کی مصوری کا عام موضوع ہے لیکن اس نقش میں جو اثیری شکوہ نمایاں ہے، کسی دوسری جگہ نہیں پایا جاتا[1]

قرآن و حدیث کے سیدھے سادے واقعہ پر اسی طرح مورخوں اور مفسروں نے خیال آرائیاں کیں صوفیہ نے کچھ اضافہ کیا، اور تفسیر و تاریخ کی مشکل سے کوئی ایسی کتاب ملیگی جس میں اس پر بحث و تمحیص نہ کی گئی ہو یہاں تک کہ خاص اس موضوع پر علامہ نجم الدین مغیطی نے "حاشیۃ الدردیر علی قصۃ المعراج" لکھی اسی طرح الکردی نے "ضوء السراج فی فضل رجب و قصۃ معراج" لکھی یہ کتابیں مصر میں چھپ گئی ہیں اور عام طور پر ملتی ہیں،

محدثین کے جزوی مباحث، مورخین کے اضافی حاشیوں، اجنبی اقوام سے ربط و اختلاط اور مذاہب فلسفہ کی سینہ زوریوں کی بدولت خود مسلمانوں میں اس کے متعلق اختلاف عقاید شروع ہوا اور آج مختلف افکار کی تحلیل کرنے کے بعد اسکے متعلق تین عقاید پائے جاتے ہیں۔

---

[1] (Persian Art) مرتبہ ای ڈینین راس (رایل اکاڈمی لندن)

پہلی جماعت تو اُن حضرات کی ہے جن کا عقیدہ ہے کہ آں حضرت آسمان پر جسم اطہر کے ساتھ تشریف لے گئے چنانچہ جمہور محدثین وفقہا کا یہی مذہب ہے، حضرت ابن عباس اس کے سرگروہ ہیں،

دوسری جماعت ان لوگوں کی ہے، جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف روحانی عتبار سے معراج ہوا، آپ جسم کے ساتھ آسمان پر تشریف نہیں لے گئے چنانچہ بی بی عائشہؓ اور امیر معاویہؓ کا یہی عقیدہ تھا حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے، ابن اسحٰق کہتے ہیں

عن عائشۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم	آں حضرتؐ کی بی بی حضرت عائشہؓ کہتی تھیں کہ آپ کا
کانت تقول ما فقد جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	جسم غایب نہیں ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو معراج
ولکن اللہ اسری بروحہ	عطا فرمایا

امیر معاویہؓ سے معراج کے متعلق سوال ہوا آپ نے فرمایا کانت رؤیا من اللہ تعالیٰ صادقۃ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو رویاے صادقہ ہوا)

تیسری جماعت صوفیہ کی ہے، حضرت محی الدین ابن عربیؒ کا خیال تھا کہ قرآن میں جس اسری یا معراج کا تذکرہ ہے وہ روحانی تزکیہ کے متعلق مجازی اور استعاری طرز بیان ہے،

پہلے عقیدہ کے متعلق سوائے ابن عباسؓ کے قیاس (رؤیا عین) کے علاوہ کوئی ایسی مستند حدیث نہیں پائی جاتی جس سے معراج کو جسمانی مانا جائے، قرآن مجید میں محض اس قدر ہے،

سبحان الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام	پاک ہے وہ ذات جو رات کے وقت اپنے بندہ کو مسجد
الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حولہ لنریہ من	حرام سے مسجد اقصی میں لے گئی جس کے گرد اگرد ہم نے برکتیں
آیاتنا	رکھی ہیں تاکہ ہم اسکو اپنے عجائبات قدرت دکھائیں،

اس میں کہیں نہ تو اس معراج جسمانی کا تذکرہ ہے جس کے متعلق بخاری اور دوسری حدیثوں میں روایتیں ملتی ہیں اور نہ یہ تذکرہ ہے کہ آپ جسم کے ساتھ آسمان پر تشریف لے گئے، قرآن مجید سے صرف "اسری" ثابت ہے، احادیث سے معراج کا حال معلوم ہوتا ہے، معراج اور اسری کی حدیث کے راویوں میں عبد اللہ ابن مسعودؓ ابو سعید خدریؓ، عائشہ صدیقہؓ، امیر معاویہؓ، ام ہانی بنت ابی طالبؓ، حسن بن ابی الحسن، ابن شہاب زہری اور قتادہ وغیرہم کے اسمائے گرامی پائے جاتے ہیں

معراج جسمانی ماننے والی جماعت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ "عبد" مجموعہ ہوتا ہے، جسم اور روح کا اس لئے قرآن مجید میں "اسری بعبدہ" سے جسمانی سیر مراد ہے، نہ کہ محض رویائے صادقہ، اگر آپ کو معراج محض خواب میں ہوئی، تو پھر معجزہ کیا ہوا خواب میں تو عام لوگ بھی مناظر و مرایا کے عجائبات کا مشاہدہ کرتے ہیں پھر آں حضرتؐ کی خصوصیت کیا ہوئی،

دوسری جماعت کہتی ہے کہ معراج جسمانی کا عقیدہ تجارب و مشاہدات کے خلاف ہے، اور وہ بی بی عائشہؓ کی پرزور حدیث

اور بی بی ام ہانی کی اہم روایت سے استدلال کرتے ہیں ابن اسحق کہتے ہیں

عن ام هانی بنت ابی طالب رضی الله عنها واسمها هند فی مسری رسول الله صلی الله علیه وسلم کانت تقول ما اسری برسول الله صلی الله علیه وسلم الا هو فی بیتی نائم تلک اللیلة فصلی العشاء الآخرة ثم نام ونمنا فلما کان قبیل الفجر اهبنا رسول الله صلی الله علیه وسلم فلما صلی الصبح وصلینا معه قال یا ام هانی لقد صلیت معکم العشاء الآخرة کما رأیت بهذا الوادی ثم جئت بیت المقدس فصلیت فیه ثم قد صلیت صلاة الغداة معکم الآن کما ترین[1]

اور ام ہانی بنت ابی طالب سے جن کا نام ہند تھا معراج نبوی کے متعلق روایت ہے کہ جس رات کو معراج ہوا آپ میرے گھر پر میرے نزدیک سوئے تھے آپنے آخری عشا کی نماز پڑھی اور سو گئے اور ہم لوگ بھی سو رہے صبح کے قبل آپ نے ہم لوگوں کو اُٹھایا جب آپ صبح کی نماز پڑھ چکے اور ہم لوگوں نے آپکے ساتھ نماز پڑھ لی، تو آپ نے فرمایا کہ اے ام ہانی! میں نے عشا کی نماز تمھارے ساتھ اس میدان میں پڑھی جیسا کہ تم نے دیکھا پھر بیت المقدس میں آیا اور اس میں نماز پڑھی اور اب تمھارے ساتھ صبح کی نماز ادا کی جیسا کہ تم دیکھتی ہو،

آپ گھر سے روانہ ہوئے تاکہ لوگوں سے اس کا تذکرہ کریں حضرت بی بی ام ہانی نے بربنائے محبت آپ کی چادر پکڑ لی اور عرض کیا، اس کا تذکرہ نہ فرمائیے لوگ آپ کی تکذیب کریں گے، آپ نے نہیں مانا بی بی ام ہانی نے ایک حبشیہ لونڈی کو آپکے پیچھے روانہ کیا اور کہدیا کہ دیکھ آپ لوگوں کے سامنے یہ واقعہ بیان کرتے ہیں تو وہ کیا کہتے ہیں آپ نے یہ واقعہ بیان کیا لوگوں کو تعجب ہوا اور انھوں نے کہا،

ما آیة ذلک یا محمد فانا لم نسمع بمثل هذا قط[2]

محمد! یہ کونسی نشانی ہے، ہمنے تو کبھی اس قسم کا واقعہ سنا نہیں

آپ نے بیت المقدس کے ماحول، مختلف مناظر، وہاں کے قبایل کے حالات اور ان کے اعمال شبانہ کے واقعات بیان کرنا شروع کئے،

عن جابر بن عبد الله قال سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول لما کذبنی قریش قمت فی الحجر فجلی الله لی بیت المقدس فطفقت اخبرهم عن آیاته وانا انظر الیه[3]

جابر بن عبداللہ سے روایت ہے، اُنھوں نے کہا میں نے رسول سے سنا آپ فرماتے تھے جب قریش نے میری تکذیب کی تو میں حجر کے نزدیک کھڑا ہوا، اللہ نے بیت المقدس کو میرے پیش نظر کر دیا، میں نے اس کی نشانیاں بیان کرنا شروع کیں گویا کہ میں اس کو دیکھ رہا ہوں،

---

[1] سیرت ابن ہشام

[2] سیرت ابن ہشام [3] بخاری

بی بی عائشہؓ اور ام ہانیؓ کی احادیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ آپ پر خواب کی سی کیفیت طاری ہوئی اسی عالم میں آپ بیت المقدس تشریف لے گئے اسی کو قرآن مجید نے "اسری"، بیان کیا ہے، ابن اسحق کی روایت کے مطابق ابو سعید حذریؓ اسی "اسری" کے ساتھ معراج کا واقع ہونا بتاتے ہیں

انہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آپ نے کہا میں نے رسول اللہ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ
یقول لما فرغت مما کان فی البیت المقدس	جب میں بیت المقدس کی چیزوں کو دیکھکر فارغ ہوا تو
اتی با المعراج	معراج میں گیا،

اسی طرح مالک ابن صعصعہ کی روایت سے معراج کی جو طویل حدیث مذکور ہے، اس میں ہے آنحضرت نے فرمایا

انا عند البیت بین النایم والیقظان[1]	میں گھر میں بیداری اور خواب کے درمیانی حالت میں تھا

روایات بالا کے مقابلہ میں صرف حضرت ابن عباس کا قیاس ہے، قرآن مجید نے اس کو "رویا" سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے، وماجعلنا الرویا التی ارینٰک الافتنۃ للناس بخاری کی منقولہ بالا حدیث کے مطابق حضرت ابن عباسؓ تو رویا سے "اسری و معراج"، مراد لیتے ہیں لیکن ھی رویا عین (یہ مشاہدہ بیداری کا تھا) کا اضافہ کرتے ہیں، جو بی بی ام ہانی اور حضرت عائشہ کی روایات کے مقابلہ میں زیادہ زوردار نہیں قرآن مجید میں "رویا" کا استعمال دوسرے مقام میں "خواب"، ہی کے معنی میں ہوا ہے، لقد صدق اللہ رسولہ الرویا بالحق (فتح) خیر یہانتک تو تنقید روایات کی بحث تھی، آئے اب ذرا معراج جسمانی اور روحانی پر عقلی حیثیت سے غور کریں آج علوم جدیدہ سے روشناس ہوجانیکے بعد ایک شخص کہہ سکتا ہے، کہ معراج جسمانی کا عقیدہ محض اساطیری درخرافی پہلو رکھتا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ اس نے آں حضرت کو آسمان پر جسم اطہر کے ساتھ بلایا ہو، تو پھر قوموں کی خرافیات اور ملتوں کے افسانوں کو ماننے میں کیا مضایقہ رہجاتا ہے، مصر کے گلگیش اور خرافیات ہند کے ہنومان کے عجیب کارناموں پر ایمان لانے میں کیا عذر ہے؟ لیکن سوال یہ ہے کہ سائنس اور فلسفہ کے اکتشافات جدیدہ آج سے کئی صدیاں قبل "خوارق عادات" نہیں سمجھے جاتے تھے، لاسلکی خبریں، اور لاسلکی نغمے آج ہماری روزانہ زندگی کے مشاہدات ہوگئے ہیں، ہم ان پر تعجب نہیں کرتے، آج طیاروں کی سرعت روانگی کا معائنہ کرتے ہیں تو ہم انکار نہیں کرتے، سائنس کا ایک عالم سیاروں کی بے انتہا تیز حرکتیں، اور ایک قطرۂ خون میں ہزار دس جراثیم کے وجود کو ہم سے تسلیم کرالیتا ہے، لیکن ایک صادق اور امین کی زبانی جسمانی سیر کا غیر معمولی واقعہ ہم سنتے ہیں تو نہیں مانتے، سائنس اور اکتشافات جدیدہ نے آج دنیا والوں سے بہت سی ایسی باتیں منوالی ہیں جن کا قدیم انسانوں کو مطلق علم نہ تھا یہی باتیں جو آج روزانہ زندگی کا مشاہدہ سمجھی جاتی ہیں قدما کے لئے "خوارق عادات"، نہیں تھیں؟ آج ہم اپنے مکان میں بیٹھکر ممالک یورپ و امریکہ کے

---

[1] مسلم کتاب الایمان

محافل رقص و سرود اور مجامع علمی و سیاسی کی آوازیں سنا کرتے ہیں اور قدرت کی اس چھپی ہوئی طاقت کے یکایک دریافت کر لینے کے بعد ایک معمولی درجہ کا آدمی بھی آن واحد میں دور دراز آبادی کے رہنے والے انسانوں کی آوازیں سن لیتا ہے، زمانہ آئے گا جب سائنس کی اختراع فایقہ یہ پردہ بھی ہٹا دیگی اور مشرق و مغرب کے درمیان آواز کی طرح جسم کا بھی اتصال ہوا کرے گا، سائنس ہم سے ایسی عجیب عجیب باتیں منوا رہا ہے، جن کو ہم پہلے خرافیات سمجھتے تھے، پھر کیا وجہ ہے کہ نوامیس فطرت کا مکمل علم حاصل کئے بغیر ہم کسی ایسی روایت کی تکذیب کر دیں جو ایک صادق انسان کی طرف منسوب ہو، حالانکہ نوامیس فطرت کے مقابلہ میں نہ تو ہمارا دیدۂ بینا ہی مکمل ہے، نہ ہمارا گوش شنوا ہی[۵]

اسی کے ساتھ اگر معراج کو روحانی مانا جاے تو بھی آپ کا معجزہ برقرار رہتا ہے، انبیا پر خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں وحی نازل ہوئی ہے، خود قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ اور آں حضرتؐ کے ان خوابوں کا تذکرہ ہے جن کو وحی بتایا جاتا ہے، (انبیا، حجرات) روحانیات اور نفسیات کے ماہرین آج "غیب بینی" (Clairvoyancy) اور "رویاے الہامی" (Prophetic dream) پر زور دے رہے ہیں آں حضرتؐ کو خواب میں اگر یہ معراج ہوئی تو بھی آپ کا یہ معجزہ تھا کیونکہ آپ کی زکاوت و بصیرت سے آپ کے اس ارتقائے روحانی کا ثبوت ملتا ہے، جس کی نظیر انبیا و رسل کے علاوہ عوام کی زندگی میں میسر ہونے والی چیز نہیں،

قرآن مجید نے جس سادہ پیرایہ میں واقعہ معراج پر روشنی ڈالی ہے، اس پر تو کسی کو اعتراض کا موقعہ نہ تھا لیکن احادیث و تاریخ کی روایات کو پیش نظر رکھکر ایک بہت بڑے معاند اسلام ڈاکٹر ٹسڈل نے جو ہرزہ سرائیاں کی ہیں وہ قابل غور ہیں، وہ لکھتا ہے،

> "ابن اسحٰق سند حدیث کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ محمدؐ کی پیاری بیوی حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ پیغمبر کا جسم (اطہر) غایب نہیں ہوا بلکہ خدا نے آپ کی روح کو معراج عطا فرمایا، دوسری حدیث میں ہے کہ محمدؐ خود فرماتے تھے "میری آنکھیں سو رہی تھیں اور میری روح بیدار تھی"، مشہور صوفی مفسر حضرت محی الدین ابن عربی نے پورے واقعہ کو مجازی حیثیت سے تسلیم کیا ہے، یہ یقین ہے کہ جمہور مفسرین و محدثین کا عقیدہ ہے، کہ محمدؐ حقیقۃً مکہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے، اور آسمانوں کی سیر بھی کی اور جو کچھ آپ نے کیا اور دیکھا اس کے متعلق وہ طویل واقعات پیش کرتے ہیں جو مسلمانوں کے لئے حد درجہ دلچسپ ہے، یہی حدیث ہے جس کے متعلق ہم بحث کرنا چاہتے ہیں اور ہم بتائیں گے کہ اس کی مخصوص باتیں قدیم روایات خرافی بالخصوص مذہب زردشت سے لی گئی ہیں، ہم پہلے ابن اسحٰق کی روایت نقل کرتے ہیں کیونکہ یہ تمام روایتوں سے جو ہم تک پہونچی ہیں قدیم ہے، اس کا مرتب ابن ہشام لکھتا ہے "محمد کا دعوی

۵ نوٹ از اڈیٹر:- اگر آپ اس کے قایل ہیں کہ معراج جسمانی بھی انہیں اسباب و ذرایع کے ماتحت عمل میں آئی جو آج کل لاسلکی وغیرہ کے کمال کا باعث ہوتے ہیں تو پھر کوئی جھگڑا باقی نہیں رہتا۔

تھا کہ معراج کے لئے دو مرتبہ جبرئیل میرے پاس تشریف لائے اور دو نو مرتبہ مجھے نیند آگئی، اسی طرح تیسری بار وہ میرے پاس آئے تب انھوں نے مجھکو اپنے پیر سے مس کیا اور میں اوٹھ بیٹھا، تب وہ مسجد کے دروازہ تک لے گئے اور وہاں ایک سفید جانور تھا جو صورت میں خچر اور گدھے کے درمیان تھا اس کے بازو میں دو پر تھے جس سے وہ اپنے اگلے پیروں پر قبضہ رکھتا ہے، اپنا اگلا پیر وہ منتہائے نظر تک قایم رکھتا ہے، انھوں نے مجھکو اس پر سوار کیا تب وہ میرے ساتھ چلے اس طور سے کہ نہ تو وہ مجھ سے آگے نکلے اور نہ میں ان سے آگے نکلا جب میں اس کے پاس پہونچا تو وہ چیخا جبرئیلؑ نے اپنا ہات اس کے ایال پر رکھا تب انھوں نے کہا اے براق! کیا تو جو کر رہا ہے، اس سے شرمندہ نہیں ہے اے براق خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ محمدؐ کے قبل کوئی ایسا بندہ تجھ پر سوار نہیں ہوا جو خدا کے نزدیک زیادہ معزز ہو اس پر براق ایسا شرمندہ ہوا کہ اس کو پسینہ آگیا تب وہ چپ چاپ کھڑا ہو گیا اور میں اس پر سوار ہوا، حسن نے حدیث روایت کی ہے، کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور آپ کے ساتھ جبرئیلؑ بھی گئے یہاں تک کہ آپ ان کے ساتھ بیت المقدس میں پہونچے یہاں آپ نے انبیا کی ایک جماعت کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ کو بھی دیکھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت کی اور ان کے ساتھ نماز ادا کی، اس کے بعد جبرئیلؑ دو برتن لائے، ایک میں شراب تھی اور دوسرے میں دودھ تھا آپ نے دودھ کا ظرف اُٹھالیا اور پی گئے، اور شراب کا برتن چھوڑ دیا اس پر جبرئیل نے کہا اے محمدؐ! آپ فطرت پر ہیں اور لوگ فطرت ہی پر واقع ہوتے ہیں شراب آپ پر حرام کی گئی ہے، تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم جدا ہو گئے، اور صبح کے وقت آپ قریش کے پاس گئے اور ان کو اس کی اطلاع کی، بہت لوگوں نے کہا کہ واللہ یہ معاملہ تو صاف ہے، بخدا ایک قافلہ ایک ماہ میں مکہ سے شام میں پہونچتا ہے، اور ایک ماہ میں مراجعت کرتا ہے، اور یہ صاحب (محمدؐ) مکہ سے ایک رات میں جاتے ہیں، اور واپس آجاتے ہیں،،

،،اس روایت کے مطابق ایک رات میں محمدؐ مکہ سے صرف بیت المقدس گئے اور واپس ہوئے اس کے بعد کی حدیثیں اس سفر کو زیادہ بتاتی ہیں، یہ تمام حدیثیں خود محمدؐ نے بیان کیں مشکوۃ المصابیح،، میں مفصلہ ذیل روایت پائی جاتی ہے[1]

،،پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب میں سو رہا تھا ایک آنے والا آیا تب اس نے اس کے اور اس کے درمیان کھولا اور میرا دل نکالا، اس نے میرا دل دھو کر پھر جگہ پر رکھدیا میں اپنے میں آگیا تب میرے لئے ایک سفید جانور آیا جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے لانبا تھا اس کا نام براق ہے، اور وہ اپنا اگلا پیر اپنی حد نظر کے آخر تک

---

[1] مشکوۃ المصابیح کی پوری حدیث جس کا تسڈل نے حوالہ دیا ہے، بخاری (کتاب الصلوہ) اور مسلم (کتاب الایمان) میں مذکور ہے، دودھ شراب کے برتنوں کے متعلق کتاب التفسیر بخاری (سورۂ بنی اسرائیل) میں بھی حدیث پائی جاتی ہے،

رکھتا ہے، میں اس پر سوار ہوا، اور جبرئیل مجھکو لے چلے، یہاں تک کہ میں آسمان کے سب سے نیچے طبقہ تک پہونچا جبرئیلؑ نے داخل ہونا چاہا سوال ہوا کون ہے؟ انھوں نے کہا "جبرئیل" سوال ہوا تمھارے ساتھ کون ہے، انھوں نے کہا "محمدؐ" پوچھا گیا کیا آپ کو بلایا گیا ہے، کہا "ہاں" کہا گیا ان کو مرحبا ہو، آپ کی تشریف آوری بہت خوب ہے، ایکسنے دروازہ کھولدیا جب میں داخل ہوا تو حضرت آدم وہاں تشریف رکھتے تھے، میں نے آپ کو سلام کیا آپ نے جواب سلام دیا، "مرحبا اچھے بیٹے اور اچھے نبی" اس کے بعد اسی قسم کے واقعہ کا اعادہ ہے، ہر طبقہ آسمان پر اسی قسم کا سوال وجواب ہوا اور آپ داخل ہوئے دوسرے طبقہ پر آپ نے یوحنا اور عیسیٰؑ کو دیکھا، تیسرے پر یوسفؑ کو چوتھے پر ادریس کو پانچویں پر ہارون کو اور چھٹے پر حضرت موسیٰ کو دیکھا، موسیٰؑ روئے آپ سے سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ محمد کی اُمت میری اُمت کی بہ نسبت زیادہ تعداد میں جنت میں داخل ہوگی، ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات ہوئی، اور انھوں نے دعا مبارکباد دی)، اس کے بعد میں "سدرۃ المنتہیٰ" تک گیا اس کے پھل کمہار کے برتن کی طرح تھے، اور اس کی پتیاں ہاتھی کے کان کی طرح تھیں جبرئیل نے کہا یہ "سدرۃ المنتہیٰ" ہے اس کے بعد چار دریا تھے، دو داخلی اور دو خارجی میں نے کہا اے جبرئیل یہ کیا ہیں، انھوں نے کہا یہ دونو داخلی جنت کے دریا ہیں، اور دونوں خارجی دریاؤں میں نیل و فرات ہیں"،

اب ہم کو پتہ لگانا ہے، کہ وہ کون سے ماخذ ہیں جن سے محمدؐ کے اس معراج کا خیال لیا گیا ہے یہ بہت ممکن ہے، کہ یہ قصہ جس کو پہلے پہل خود محمدؐ نے روایت کیا ایک خواب پر مبنی ہو، اور جس میں معراج کا کوئی ذکر نہ ہو اگر سورۃ بنی اسرائیل کو آخری زمانہ سے متعلق سمجھیں، لیکن ہم لوگ اس روایت سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو احادیث میں مذکور ہے، اور ان حدیثوں میں واقعہ معراج کی جزئیات پائی جاتی ہیں یہ یقین کرنے کے لئے جیسا کہ آیندہ پتہ چلے گا کافی سبب موجود ہے کہ یہ قصہ اسلئے گڑھا گیا، کہ محمدؐ کو تمام انبیا سے زیادہ سرفراز ثابت کیا جائے، ممکن ہے اس کے اجزا مختلف اطراف سے لئے گئے ہوں لیکن معراج کا خاص خاص واقعہ "ارتا دراف" کے واقعہ معراج پر مبنی ہے، یہ کتاب پہلوی زبان میں ہے، اور اس کا نام "ارتاد راف نامک" ہے آردشیر بابکان[۵] (شاہ فارس کے دور میں یہ کتاب لکھی گئی، اگر مذہب زردشت کے پیروؤں کی روایت یقین کرلی جائے تو اسکی تصنیف کا زمانہ محمدؐ کی ہجرت سے چار سو برس قبل گذرا ہے،

اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ جب گبروں کے پیشواؤں نے دیکھا کہ حکومت ایران میں لوگوں کے دماغ سے زردشت کے مذہب کا اثر زائل ہورہا ہے، تو انھوں نے تازہ شہادتوں سے اپنے دین کے فروغ کے لئے کوشش کی جسے آردشیر کے جوش نے اور تقویت پہونچائی، اس لئے انھوں نے ایک نوجوان عالم کا انتخاب کیا جو ایک بزرگ کی طرح زندگی گزارتا تھا،

آردشیر خاندان ساسانیہ کا بانی گذرا ہے، اس خاندان نے ایران پر چار سو پندرہ برس تک حکومت کی، آخری فرمانروا یزدجرد کے زمانہ میں ابن وقاصؓ نے فتح کیا (ہسٹری آف پرشیا مسرجے میلکم)

اور اس کو بہتیرے تقریبات پاکیزگی سے معراج آسمان کے لئے تیار کیا تاکہ وہ دیکھے کہ وہاں کیا ہے اور وہاں سے پتہ لگائے کہ آیا یہ واقعات ان کی مذہبی کتابوں سے ملتے ہیں یا نہیں روایت کی جاتی ہے، کہ جب اس ارتا دراف پر بیخودی کی کیفیت طاری ہوئی، اس کی روح نے قدیم فرشتہ "سروش" کی رہنمائی میں آسمان کی طرف صعود کی، اور ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ تک گزری تو اسکی روح بلند بتدریج ہوتے ہوئے "ارمزد" کے حضور میں پہونچی، جب ارتا دراف نے اس طرح سے آسمان پر ہر چیز دیکھ لی، اور وہاں کے باشندوں کی خوش باشانہ زندگی کا معائنہ کیا تو ارمزد" نے اس کو اپنا پیغمبر بنا کر زمین پر واپس جانے کا حکم دیا، تاکہ جو کچھ اس نے دیکھا تھا، پیروان زردشت سے بیان کرے، اس کے تمام مشاہدات پوری طرح اس کتاب میں مذکور ہیں جو اسی کے نام پر ہے، تمام و کمال اسکو نقل کرنا غیر ضروری ہے[ل] لیکن چند اقتباسات سے پتہ چلے گا، کہ کس طرح صاف طریقہ سے یہ مسلمانوں کے یہاں محمدؐ کے قصہ معراج کے لئے نمونہ قرار دیا گیا،

"ارتا دراف نامک" میں لکھا ہے[ل]

اور میں پہلا قدم طبقۂ انجم یا "ہومت" پر بڑھاتا ہوں، اور ان مقدس حضرات کی روحوں کو دیکھتا ہوں جن سے روشن ستارہ کے مثل روشنی پھیلتی ہے، اور وہاں بہت روشن، بلند اور پر شکوہ تخت اور نشستگاہ ہے، میں نے مقدس "سروش" اور فرشتہ "آذر" سے دریافت کیا "یہ کون سا مقام ہے اور یہ کون لوگ ہیں؟"

عبارت بالا کی تشریح میں یہ بات قابل ذکر ہے، کہ طبقۂ انجم مذہب زردشت کے عقیدہ کے مطابق جنت کا اولین اور بہترین دربار ہے، "آذر" اس فرشتہ کا نام ہے جو آگ پر متصرف ہے، "سروش" فرشتۂ اطاعت ہے، اور مقدس ارباب ابدی یا دین زردشت کے قدیم ملائکہ میں سے ہے، اور وہ مختلف آسمانوں پر ارتا دراف کا بدرقہ رہتا ہے، جیسا کہ جبرئیلؑ محمدؐ کے بدرقہ ہوتے ہیں

اس روایت سے پتہ چلتا ہے، کہ کیونکر ارتا دراف طبقۂ قمر یا دوسرے طبقہ، اور طبقۂ شمس یا محلات آسمانی کے تیسرے طبقہ میں پہونچتا ہے، اسی طرح وہ طبقاً عن طبقٍ گزرتے ہوئے ارمزد کے حضور میں پہونچتا ہے، اس ملاقات کا حال مفصلہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

"آخر کار قدیم فرشتہ بہمن اپنے جڑاؤ تخت سے اٹھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے "ہومت" اور "ہوخت" اور "ہورست" میں لایا، اسی طرح ارمزد، ملائکہ قدیم، دوسرے مقدس لوگوں، اور پاک خیال زردشت کی روح اور اسی طرح کے دوسرے دیندار آدمیوں، اور خاصان دین سے ملاقات ہوئی ان لوگوں سے زیادہ منور اور بہتر ہستیاں میں نے نہیں دیکھیں، بہمن نے کہا کہ "یہ ارمزد ہے" اور میں نے اس کو سلام کرنا چاہا اور اس نے

ل پوری بحث ڈاکٹر ٹسڈل کی کتاب "ماخذ قرآن" سے لی گئی ہے،

کہا اے ارتا دراف تم پر سلام، مرحبا، تم عالم فانی سے اس مطہر اور منور مقام پر آئے ہو، اور اس نے مقدس "سروش" اور فرشتہ آذر کو حکم دیا کہ ارتا دراف کو لیجاؤ، اور نکوکاروں کا تخت اور انعام اور بدکرداروں کی عقوبت دکھاؤ آخرکار مقدس سروش اور آذر فرشتہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور وہ لوگ مجھے ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے گئے اور میں نے ان قدیم ملائک اور دوسرے فرشتوں کو دیکھا ہے"

اس کے بعد مفصلاً ارتا دراف کی زیارت بہشت اور معائنہ دوزخ کا حال، اور جو کچھ اس نے ان کے اندر دیکھا ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کی سیر دوزخ کے بعد قصہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے،

"آخرکار مقدس سروش اور آذر فرشتہ میرا ہاتھ پکڑ کر اس تاریک، خطرناک اور مہیب مقام سے باہر لائے اور ارمزد اور ملائکہ قدیم کے زمرہ میں پہونچایا، اس جگہ نور برس رہا تھا میں نے ارمزد کو سلام کرنا چاہا، اور وہ مہربان تھا، اس نے کہا اے وفادار بندہ! ارتا دراف! ارمزد کے پرستاروں کے پیغمبر! مادی دنیا میں جا، مخلوقات سے حق و صداقت کے ساتھ بیان کر، جیسا کہ تو نے دیکھا اور جانا ہے، کیونکہ میں ارمزد یہاں ہوں، جو کوئی صداقت کے ساتھ بولتا ہے، میں سنتا ہوں، تو عقلمندوں سے جاکر گفتگو کر" اور جب ارمزد اس طرح سے بول رہا تھا، میں متعجب کھڑا رہا، چونکہ میں نے ایک روشنی دیکھی، اور جسم نہیں دیکھا میں نے ایک آواز سنی اور جانا کہ یہی ارمزد ہے"

محمدؐ کے قصہ معراج سے ان واقعات کو کیسی مماثلت ہے، اس کے بتانے کی ضرورت نہیں

"زردشت نامہ" میں جس کی تصنیف کا زمانہ غالبًا تیرھویں صدی مسیحی ہے، ایک قصہ مذکور ہے، کہ خود زردشت ارتا دراف سے صدیوں قبل آسمان پر گیا اور اس کے بعد اس کو دوزخ کا معائنہ کرنے کی اجازت بھی ملی وہاں اس نے اہرمن کو دیکھا جو قرآن کے ابلیس کے ساتھ بہت قرین ہے،

یہ قصص آریہ دنیا کے صرف ایرانی حصہ تک محدود نہ تھے، سنسکرت میں بھی اسی قسم کے قصے پائے جاتے ہیں جن میں ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو "اندرا لو کا گمینم" یا "اندر کی دنیا کا سفر" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بطل (ہیرو) ارجن نے آسمانوں کا سفر کیا جہاں اس نے اندر کی آسمانی مقام "دیونتی" کا معائنہ کیا جو "نندانم" نامی گلستان میں واقع ہے، ہندوؤں کی کتاب سے پتہ چلتا ہے، کہ یہاں ہمیشہ جاری رہنے والے چشمے ان تازہ اور سرسبز نباتات کی آبیاری کرتے رہتے ہیں جو اس خطۂ جمیل میں اگتے ہیں اشجار و نباتات کے درمیان ایک درخت ہے، جس کا نام "کلپا جاتی" ہے اور جس کے پھل کو "امرت" (بقا) کہتے ہیں اس کو جو شخص کھالیتا ہے مرتا نہیں ہے، اور جو کوئی اس کے نیچے آرام کرتا ہے، اس کے دل کی جو آرزو ہوتی ہے، پوری ہو جاتی ہے،

پیروان زردشت بھی ایک عجیب درخت کے وجود کا تذکرہ کرتے ہیں جس کو "اوستا" میں "ہواپا" اور

پہلوی میں "ہمایا" کہا جاتا ہے، دو نو حیثیت سے اس کے معنی "اچھے پانی پر قبضہ رکھنے والے" یا "اچھی طرح سے سیراب ہونے کے ہیں" "ونندیداد" میں اس کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے،

پاک شفاف پانی "پوتیسکا" سمندر سے "داوُرد کاشا" سمندر میں بہتا ہے، اور یہیں سے یہ پانی "ہوایا" میں پہونچتا ہے یہاں ہر قسم کے نباتات اگتے ہیں "ہوایا" اور "یکشا جاتی"، مسلمانوں کی بہشت کے "طوبیٰ" یا "شجر نیلی" سے مشابہ ہیں۔

یہ امر قابل لحاظ ہے، کہ اسی قسم کے قصص بعض یہی کتابوں بالخصوص "وسیپو پالی" اور "عہد نامہ ابراہیم" میں بھی پائے جاتے ہیں "دسیپو پالی" میں بتایا گیا ہے، کہ کس طرح پولوس آسمان پر گئے اور بہشت کی چار دریاؤں کو دیکھا اسیطرح "عہد نامہ ابراہیم" میں بھی ابراہیم کی سیر سماوی کا حال بتایا گیا ہے، دونوں کے بارہ میں مذکور ہے کہ انھوں نے جو کچھ وہاں دیکھا ارتا دراف اور محمد کی طرح واپس آکر اہل زبان سے بیان کردیا، حضرت ابراہیم کے متعلق کہا گیا ہے کہ "اور قدیم فرشتہ میکائیل آپ کو ایک گاڑی پر سوار کرکے اوپر لے گئے اور ان کو آسمان کی فضا میں بلند کیا اور ابر میں انکو اور فرشتوں کے ساتھ لائے ابراہیم نے سواری پر ساری سرزمین آباد میں سیر کی"

مسلمانوں کے قصہ میں یہ سواری دوسری صورت اختیار کرتی ہے، چونکہ محمد "براق" نامی ایک جانور پر سوار ہوتے ہیں کیونکہ عربوں میں سوار ہونا گاڑی چلانے سے زیادہ متداول ہے، لفظ "براق" غالبًا عبرانی لفظ "باراق" (بجلی) سے مشتق ہے جو عربی زبان میں برق ہوگیا گو یہ بھی ممکن ہے، کہ یہ پہلوی زبان سے مشتق ہو،

اب دوسرے امور پر بحث کرنے سے پہلے یہ بات قابل غور ہے، کہ "کتاب یوحنا" میں زمین، جہنم، اور آسمان کے عجائبات کی ایک مبسوط فہرست ہے، جنھیں یوحنا نے اپنے خواب میں دیکھا، اس غیر مستند کتاب نے بلاشبہ "وسیپو پالی" اور "عہد نامہ ابراہیم" پر اثر ڈالا ہے، اور اس طور سے مسلمانوں کی کہانی پر بھی، لیکن یہ قیاس نہیں کر سکتے کہ "ارتا دراف نامک" کو بھی ان کتابوں نے اثر پذیر کیا،

باغ عدن کے شجر حیات ... کے متعلق یہود عجیب و غریب افسانے رکھتے ہیں یہ افسانے اکادین قصوں سے لئے گئے ہیں جن سے "مقدس شجر اریدو" کی روایت کا پتہ چلتا ہے، ڈاکٹر ہلپرکٹ نے "نیپور" کے نزدیک بعض قدیم ترین کتبے پائے ہیں جن میں اس درخت کا تذکرہ پایا جاتا ہے، تفصیل کے ساتھ میں ان واقعات پر بحث کرنا نہیں چاہتا یہودی قصص نے مسلمانوں کی جنت سماوی کی روایت کو اثر پذیر کیا مسلمانوں کا عقیدہ ہے، کہ جنت عدن آسمان پر ہے، اس لئے وہ جنت سماوی کو اسی صورت میں منتقل کرتے ہیں جس صورت میں یہود نے جنت ارضی کو پیش کیا ہے، اس طور سے ان کو یہی مذہب کی غیر مستند کتابوں سے بھی غلط فہمی ہوگئی ہوگی، کیونکہ چار دریاؤں کا بیان جو "وسیپو پالی" میں ہے، بظاہر اسی عجیب و غریب وہم کی پیدا وار ہے، یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ان غیر مستند کتابوں کو یہی مذہب کے کسی فرقہ نے مستند اور دقیع تسلیم نہیں کیا گو ان میں بعض نے کسی زمانہ میں جہلا کی جماعت میں

بہت زیادہ مقبولیت حاصل کرلی تھی، بعض عرصہ سے مشہور ہیں بعض صدیوں گم ہوکر حال میں دستیاب ہوئی ہیں اس کی تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کے درخت طوبیٰ کا واقعہ مذہب زردشت سے ماخوذ ہے، یا یہودیوں سے لیا گیا ہے، یا دونوں سے، کیونکہ مذہب زردشت اور یہود دونوں کے قصص شجر ایک ہی ماخذ کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں لیکن یہودی افسانہ کا اثر اس قصہ پر نہیں پڑا ہے، چار دریا جو محمدؐ نے دیکھے "ولیسیو پالی" سے لئے گئے ہیں ولیسیو پالی کے چار دریاؤں کا تخیل عدن کے چار دریاؤں کے مشابہ ہے، اور یہ اس غلط فہمی کی بنا پر جس کا سطور بالا میں تبصرہ ہو چکا،

یہ سوال ہو سکتا ہے، کہ بائبل میں یوحنا، ایلیا اور ہمارے آقا (مسیح) کے معراج کا جو واقعہ مذکور ہے وہ تمام ان قصوں کا جن کا تذکرہ ہوا ہے، ماخذ تو نہیں؟ جن ایرانی اور ہندوستانی قصص کا بیان ہو چکا ہے، ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسیحی عقیدۂ معراج کے متعلق یہ قیاس کرنا مشکل اور غیر ضروری ہے، گو یہ ممکن ہے، کہ بعض ایسے دوسرے افکار و عقاید مسیحیت سے ماخوذ ہیں لیکن اگر یہ ہو بھی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ محمد کے معراج کا قصہ، ان کے متعلق بعض دوسرے قصص کی طرح دوسرے واقعات کے نمونہ پر جیسا کہ "ارتا دراف نامک" میں مذکور ہے گڑھ لیا گیا ہے، تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے، کہ وہ بعض حیثیت سے حضرت مسیح اور دوسرے انبیا سے جو ان سے قبل گزرے ہیں ملتے ہوئے ہیں۔ گو بہ ہیئت مجموعی مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق آپ تمام انبیا سے افضل ہیں"

ڈاکٹر ٹسڈل کے ان سارے ہفوات کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) حضرت عیسیٰ اور انبیائے سلف کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے کے لئے معراج کا واقعہ مسلمانوں نے محمدؐ کی وفات کے بعد گھڑ لیا ہے،

(۲) معراج کا واقعہ زردشتی مذہب کی ایک کتاب ارتا دراف نامک سے ماخوذ ہے، اور اس کے بعض عناصر یہودی اور مسیحی مذہب کی نامعتبر کتابوں "ولیسیو پالی" اور "عہد نامہ ابراہیم" سے لئے گئے ہیں

(۳) حضرت عیسیٰ، ایلیا وغیرہ کے واقعہ معراج کو جن کا انجیل مقدس میں تذکرہ ہے، محمدؐ کے معراج سے نسبت نہیں،

انسان مجموعہ ہے، متضاد عناصر کا وہ اپنے سارے پندار فضل اپنے تمام دعاوی علم و نظر کے باوجود ایک گہری تاریکی ہے، اور اُس وقت جبکہ تقلید اور عصبیت کے مرض میں وہ مبتلا ہوتا ہے، تو اس کی بصیرت اور بھی ناکارہ ہو جاتی ہے، ہمارے ڈاکٹر صاحب مسیحیت کی کورانہ تقلید، اور اسلام کے ساتھ جبلی تعصب میں یہ بھی خیال نہیں فرماتے کہ آیا جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں ان کی عالمانہ خودداری اور فاضلانہ دعوی تحقیق کے منافی تو نہیں؟ یہ کیا ظلم ہے کہ کسی بات کا مضحکہ اڑانے کے لئے تو ایک راوی سے استناد کیا جائے، اور پھر اسی کو نہ قصہ پڑا معتبر اور غیر ثقہ کہہ دیا جائے، وہ معراج کا واقعہ قرآن کے علاوہ حدیث اور تاریخ سے نقل کر دیتے ہیں اور اس پر اچھی طرح زہر فشانیاں کر جاتے ہیں لیکن پھر بھی

یہ کہتے ہیں کہ واقعہ معراج متاخرین نے گھڑ لیا ہے، حالانکہ جس سیرت ابن ہشام اور مشکوۃ المصابیح سے وہ واقعہ معراج کی جزئیات پیش کرتے ہیں انہیں کتابوں میں یہ روایت آں حضرتؐ سے مرسلاً بیان کی گئی ہے، معراج کی حدیثیں ان بزرگان دین اور صالحات عابدات سے مروی ہے جنھوں نے خود آں حضرت کو دیکھا تھا معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے تمام زبانیں تو سیکھیں لیکن حدیث کے اقسام انہیں معلوم نہوے، معراج کا واقعہ خود آں حضرتؐ نے بیان فرمایا اور اصول حدیث کے مطابق اس کے ماننے میں کوئی عذر کی وجہ نہیں اگر آپ محض خیال کی بنا پر حضرت ابو سعید حذریؓ حضرت عائشہؓ ابن عباسؓ، بی بی ام ہانیؓ کی شہادتوں کو نہیں مانتے تو پھر میں آپ کی اس تمام کاوکاوش خامہ فرسائی کو کیوں تسلیم کرنے لگا، حدیث اور تاریخ کی روایات کو چھوڑئے صرف قرآن کے بیان کردہ واقعہ پر تبصرہ کیجئے، لیکن ایک ہی راوی سے بہ یک وقت آپ کا استناد کرنا اور دوسرے وقت اس کو نامعتبر بتانا علم وادب سے کس قدر کھلا ہوا تمسخر ہے، اگر ڈاکٹر صاحب قرآن کے علاوہ معراج کی جزئیات واحادیث وتاریخ سے پیش کرتے ہیں تو ان کو ماننا پڑے گا کہ معراج کا واقعہ خود آن حضرت نے بیان فرمایا تھا اور متاخرین نے اس کو گھڑا نہیں ہے،

۲۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال بھی عصبیت کا نتیجہ ہے، اور وہ جوش عناد میں روایات کی تطبیق سے کسی صحیح نتیجہ نہیں پہونچے، آپ نے بلند بانگ دعوی کے ساتھ یہ تو سپرد قلم فرما دیا کہ واقعہ معراج "ارتاد راف نامک" سے ماخوذ ہے اور اس کے بعض عناصر ویسیو پالی اور عہد نامہ ابراہیمؑ سے لئے گئے ہیں لیکن یہاں غور طلب بات یہ ہے، کہ اسلامی معراج کا واقعہ زردشت مذہب کی اس کتاب سے کیونکر لیا گیا اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی تھیں، یا تو "ارتاد راف نامک" (جس کی تصنیف کا زمانہ ڈاکٹر صاحب آں حضرت کی ولادت سے چار سو برس قبل بتاتے ہیں) کی روایت عربوں میں قدیم زمانہ سے مشہور ہو، یا پھر آں حضرت پہلوی زبان کے ماہر ہوں، اور آپ نے بطور خود اس کا مطالعہ کیا ہو، چونکہ اگلے سطور میں یہ ثابت کر دیا گیا ہے، کہ واقعہ معراج خود آں حضرت نے بیان فرمایا تھا، یہ متاخرین کی افسانہ تراشی نہیں ہے تاریخ ودرایت کے لحاظ سے دونوں صورتیں مستبعد ہیں اگر ارتادراف نامک کے واقعہ سے عرب واقف ہوتے تو آں حضرت کے بیان کی تکذیب اور اس سے استہزا کیوں کرتے، حضرت بی بی ام ہانی کی حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے عربوں کے سامنے معراج کا واقعہ پیش کیا تو ان کو تعجب آیا وہ کہنے لگے ہم نے ایسا قصہ تو کبھی سنا ہی نہیں پھر آپ حضرت صدیق کے پاس گئے اور ان کو اپنا دمساز بنانے کے لئے تعجب کے ساتھ سارا قصہ بیان کیا جناب صدیق اکبر نے آں حضرت کی تصدیق کی اور اسی دن سے آپ کا لقب "صدیق" ہو گیا، قریش اور کفار کے بڑے بڑے لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا چنانچہ ان میں بعض لوگوں کے نام ابن ہشام نے درج کئے ہیں،

(۱) اسود بن مطلب بن اسد ابو زمعہ (۲) اسود بن عبد یغوث بن وہب بن عبد مناف بن زہرہ (۳) ولید بن مغیرہ بن عبد اللہ بن عمر بن مخزوم (۴) عاص بن وایل بن ہاشم بن سعید بن سہم، (۵) حرث بن طلاطلہ بن عمرو بن الحرث

بن عبد عمرو بن ملکان؏

ان لوگوں کی استہزا اور شر انگیزیوں پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی

فاصدع بما تومر واعرض عن المشرکین انا کفیناك المستہزئین الذین یجعلون مع اللہ الٰہا آخر فسوف یعلمون

آپ کو جو کچھ حکم ہوا ہے، کر گذریئے، اور مشرکوں سے پہلوتہی کیجئے، ہم آپ کے لئے کافی ہیں، ہنسی اُڑانے والے جو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں، پس قریب ہے کہ جان لیں

اگر "ارتا دراف نامک" کی روایت عربوں میں مشہور ہوتی تو کفار تعجب کا اظہار کیوں کرتے، ایسے موقعہ پر تو صرف "اساطیر الاولین" کہکر ٹالدیتے، کفار کے تعجب اور استہزا سے صاف معلوم ہو رہا ہے، کہ وہ زردشت مذہب کی اس روایت سے بالکل نابلد تھے،

دوسری صورت یہ رہجاتی ہے، کہ آں حضرتؐ پہلوی زبان کے ماہر ہوں گے اس پر بجز ہنسنے کے ڈاکٹر صاحب سے کیا کہا جائے، آپ نے کبھی فارس کا سفر بھی نہیں کیا جہاں زردشت مذہب کی یہ مشہور روایت سنتے، الغرض ڈاکٹر صاحب کا یہ لکھنا کہ واقعہ معراج "ارتادراف نامک" سے ماخوذ ہے، روایت و درایت دونوں لحاظ سے مستبعد ہے، رہگیا ویسیو پائی اور عہدنامہ ابراہیم سے استفادہ، تو ڈاکٹر صاحب نے محض چار دریاؤں اور درخت طوبی کی حدیث کو ان کتب سے ماخوذ بتایا ہے معراج کے پورے واقعہ کو وہ "ارتا دراف نامک" ہی سے مستفاد بتاتے ہیں

(۳) مسیحیت کے اس پرستار نے اپنے اس دعویٰ میں کچھ ایسی ہٹ دھرمی اور مغالطہ سے کام لیا ہے کہ ایک غیر جانبدار قاری حیران رہجاتا ہے، کہ اتنا بڑا نکتہ چین اور نقاد مذاہب اپنے پرستارانہ شغف میں اس قدر گم کردہ راہ کیونکر ہو گیا ڈاکٹر صاحب نے بہت بڑا ظلم تو یہ کیا کہ یہ بحث انھوں نے اس مضمون کے فٹ نوٹ میں درج کی ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے، وہ انجیل مقدس کے بیان کردہ واقعات معراج (عیسی، الیا وغیرہ) کو منصۂ شہود پر لانا نہیں چاہتے تھے، شاید بعض عاقبت اندیش پادریوں کے مشورہ اور اعتراض سے انھوں نے ضمناً یہ قصہ بھی چھیڑ دیا حالانکہ ضرورت اس کی تھی کہ انجیل مقدس سے پورے واقعہ معراج کو پیش کیا جاتا اور اس کے بعد آں حضرت کے واقعہ معراج سے اس کا فرق وامتیاز دکھایا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور نہ ایسا کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں ڈاکٹر صاحب کی تمام خردہ بینوں کی داستان صرف قرآن کے ایک جملہ "ان ھذا لفی الصحف الاولی" سے بالکل بے معنی بن کر رہجاتی

عبد المالک آروی

(نگار) ڈاکٹر ٹسڈل نے واقعہ اسریٰ یا معراج پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کا جواب دینا اس قدر آسان نہ تھا جتنا ہمارے دوست مولوی عبد المالک نے سمجھا۔ سب سے پہلی اصولی غلطی جو جواب دینے میں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ

جواب کی شان وہی مذہبی و روایتی ہے جسے ایک مسلمان تو مان لیگا لیکن دوسرا ماننے پر طیار نہیں ہوسکتا۔

اصل اعتراض یہ ہے کہ معراج نبوی کے جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں بالکل اسی طرح کے واقعات قبل اسلام کے دیگر مذاہب میں بھی نظر آتے ہیں اور اس لئے قوی گمان یہی ہے کہ پیروان رسول نے بعد رحلت نبوی اپنے پیغمبر کی اہمیت قائم کرنے کے لئے ویسی ہی روایات گھڑلی ہوں۔ اس لئے جواب کی دو ہی صورتیں ہوسکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ سرے سے اس بات کا انکار ہی کردیا جائے کہ دیگر مذاہب میں اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں لیکن چونکہ یہ ممکن نہیں اس لئے اب دوسری صورت صرف یہی رہجاتی ہے کہ دیگر مذاہب کی روایات کو بھی صحیح مان کر یہ جواب دیا جائے کہ جس طرح دیگر انبیا کو معراج ہوئی رسول اللہ کو بھی ہوئی۔ مولوی عبدالمالک صاحب نے جو صورت جواب کی اختیار کی ہے وہ نہایت کمزور و غیر تشفی بخش ہے کیونکہ ان کے جواب کی اصل روح صرف یہ ہے کہ واقعۂ معراج کو رسول اللہ کے بعد لوگوں نے نہیں گھڑا بلکہ خود رسول اللہؐ نے بیان کیا اور میرے نزدیک جواب کی یہ صورت بہت زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس سے تو خود رسول اللہ پر الزام قائم ہوتا ہے اور کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اگر تم یہ کہتے ہو تو پھر اس کے معنے یہ ہوئے کہ (معاذ اللہ) خود تمھارے رسول نے غلط بیانی سے کام لیا۔

رہا یہ جواب کہ رسول اللہ کو دیگر مذاہب کی یہ روایتیں کیونکر معلوم ہوسکتی تھیں جب کہ اُمی تھے اور جبکہ اُسوقت عرب میں بھی ان روایتوں کا کہیں چرچا موجود نہ تھا۔ الزام کو دفع نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں یہ صرف آپ ہی کا بیان ہے اور دوسرا اس کا ماننے کے لئے طیار نہیں، علاوہ اس کے معترض کو اس بحث میں پڑنے کی ضرورت بھی کیا ہے جبکہ اسنے واقعۂ معراج کے اصل ماخذ کو سامنے لاکر رکھدیا ہے جس سے انکار کرنے کی آپ کو بھی جرأت نہیں ہوسکتی۔

اس قسم کے اعتراضات کا جواب اگر روایات سے بالکل ہٹ کر محض اصول درایت سے نہیں دیا جاسکتا اور ایک غیر مسلم کو اس سے تشفی نہیں ہوسکتی تو ان میں الجھنا ہی بیکار ہے۔

نیاز

شہوانیات

یا

تاریخ الفحشاء

زیر طباعت ہے اور مارچ ۱۹۳۳ء کے اول ہفتہ میں شایع ہوسکے گی قیمت کا اندازہ معہ محصول عہ کیا جاتا ہے خریداران نگار کو معہ محصول صرف عہ میں ملے گی۔

مینجر نگار

سیزر و کلیوپیٹرا

(ڈرامہ برنارڈ شا)

تیسرا ایکٹ

(مسلسل)

شاہی محل کے سامنے، گھاٹ کا ایک کنارہ، جہاں سے مغربی سمت میں، اسکندریہ کی مشرقی بندرگاہ کے آگے، جزیرہ فاروس نظر آتا ہے۔ اس جزیرہ کے اختتام پر وہ مشہور منارۂ روشنی ہے۔ جسے ایک تنگ فصیل جزیرہ سے ملاتی ہے۔ یہ سفید سنگ مرمر کا ایک عظیم الشان مستطیل منارہ ہے۔ جو اوپر کی طرف، منزل بہ منزل چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ اس کی آخری منزل پر ایک دھات کا بنا ہوا چراغ ہے۔

گھاٹ کے وسط میں، ایک رومن سنتری، پہرا دے رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں بلّم ہے۔ وہ منارہ کی جانب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے اور اپنے بائیں ہاتھ سے آنکھوں پر جھجلکے ہوئے ہے، بلّم ساڑھے چار فٹ کی ایک مضبوط لکڑی ہے جس پر تین فٹ لانبی لوہے کی ایک نوکدار سلاخ لگی ہوئی ہے۔ سنتری اسقدر منہمک ہے کہ وہ اُن چار مصری حمالوں کی آمد کو بھی محسوس نہیں کرتا۔ جو گھاٹ کے شمالی حصّہ سے نزدیک آتے جا رہے ہیں۔ وہ لپٹے ہوئے قالین لا رہے ہیں۔ اور اُن کے آگے آگے فتاتا، اپالوڈورس چلے آ رہے ہیں۔ اپالوڈورس، چوبیس سال کا ایک خوشرو نوجوان ہے۔ حمال، فتاتتا کے جلو میں، سنتری کے پیچھے ہو کر، گھاٹ پر سے گذر جاتے ہیں اور محل تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں پہنچکر وہ اپنی گٹھریوں کو نیچے رکھ دیتے ہیں۔ اور پالتھی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اپالوڈورس ان کے ہمراہ زینہ تک، نہیں جاتا بلکہ ٹھیر جاتا ہے اور سنتری کے انہماک سے تفریح حاصل کرتا ہے۔

اپالوڈورس:۔ (سنتری کو مخاطب کر کے) **کون جاتا ہے؟"**

سنتری:۔ (بیتابی سے چونک کر، حملہ کرنے کے لئے اپنا بلّم اٹھاتا ہے وہ ایک پستہ قد، منحنی نوجوان ہے۔ اسکے بال ٹیالے رنگ کے ہیں۔ اور چہرے سے عمر رسیدگی اور احساس فرضی نمایاں ہے)

"یہ کیا حرکت ہے۔ کھڑے رہو۔ تم کون ہو"

اپالوڈورس:۔ "میں سسلی کا اپالوڈورس ہوں۔ ارے میاں، تم لوگ کیا خواب دیکھا کرتے ہو۔ جب سے میں تمھاری بارک میں، اس گول کمرے کے پاس سے داخل ہوا ہوں، اسوقت سے، میں اور میرے ہمراہی، تین سنتریوں کے پاس سے گذر چکے ہیں۔ لیکن سب کے سب، منارہ

کی روشنی کے دیکھنے میں اسقدر منہمک ہیں کہ ان میں سے کسی نے بھی مجھے نہ روکا۔ کیا ر دمیوں کا انتظام ایسا ہی ہے"۔

سنتری:۔ "ہم یہاں سمندر کے دیکھنے پر متعین ہیں، خشکی کے دیکھنے پر نہیں۔ سیزر ابھی فاروس میں اترا ہے (فتا تیا کی طرف دیکھ کر) ارے یہ کون ہے۔ اس حبشی کی گڑیا کا کیا نام ہے"

فتا تیا:۔ "اپالوڈورس، اس رومی کتے کو دھمکاؤ۔ اور اُسے حکم دو کہ اپنی زبان کو، ملکہ کے محل کی مالکہ، فتا تیا کے سامنے لگام دے کر رکھے"

اپالوڈورس:۔ میرے دوست۔ یہ ایک جلیل القدر خاتون ہے جسکی سیزر بھی عزت کرتا ہے۔

سنتری:۔ (غیر متاثر انداز سے قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اور یہ کیا چیز ہے۔؟

اپالوڈورس:۔ ملکہ کا محل آراستہ کرنے کے لئے قالین ہیں۔ میں نے ان کو دنیا کے بہترین قالینوں میں سے انتخاب کیا ہے۔ اور ملکہ ان قالینوں میں سے اپنی پسند کے مطابق خود منتخب کریگی۔

سنتری:۔ تو تم قالین کے سوداگر ہو۔؟

اپالوڈورس:۔ میرے دوست میں ایک شریف آدمی ہوں۔

سنتری:۔ ایک شریف۔ ایک شریف جو قالین کی دُکان رکھتا ہے۔

اپالوڈورس:۔ میں دوکاندار نہیں ہوں۔ میں پرستار حسن ہوں اور میرا یہ فرض ہے کہ خوبصورت اشیا کا خوبصورت شہزادیوں کے لئے انتخاب کیا کروں۔ میرا مطمح نظر یہ ہے کہ فن کو فن کے لئے اختیار کرنا چاہیے

سنتری:۔ تمہارا یہ بیان تو کلمۂ اجازت نہیں ہے۔

اپالوڈورس:۔ یہ ایک عام اجازت نامہ ہے۔

سنتری:۔ مجھے عام اجازت کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ یا تو مجھے آج کا کلمۂ اجازت بتاؤ۔ یا پھر اپنی دوکان پر واپس جاؤ۔ (فتا تیا اس کے کرخت لہجے سے غضبناک ہوکر چیتے کی سی تیز رفتاری سے دوڑ کر گھاٹ کے سرے پر سے گذر کر اس کے پیچھے پہونچ جاتی ہے)

اپالوڈورس:۔ اگر میں دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہ کروں تو کیا ہو؟

سنتری:۔ تو میں یہ نیزہ تمہارے بدن میں بھونک دونگا۔

اپالوڈورس:۔ تمہاری مرضی۔ (وہ اپنی تلوار سونت لیتا ہے۔ اور اپنی حفاظت پر تیار ہوجاتا ہے)

فتا تا:۔ (اچانک پیچھے سے سنتری کے ہاتھ پکڑ کر) اپالوڈورس اپنا چاقو اس کتے کے حلق میں اُتار دو (بہادر اپالوڈورس ہنستے ہوئے اپنے سر کو جنبش دیتا ہے۔ اور سنتری کے پاس سے اُچک کر محل کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اور اس کے نیزہ کی نوک جھکا دیتا ہے)

سنتری:۔ (بے سود کشمکش کرتے ہوئے) تم پر خدا کی مار۔ مجھے جانے دو۔ اوہ۔ مدد۔ مدد۔

فتا تا:۔ (اسے زمین سے اٹھا کر) اس رومی سانپ کو مار ڈالو۔ اس کو اپنی تلوار کی نوک پر اُٹھالو۔ (دو رومی سپاہی ایک صوبیدار کے ساتھ شمالی گھاٹ کے کنارے سے دوڑتے ہوئے آتے ہیں وہ اپنے ساتھی کو چھڑاتے ہیں۔ اور فتا تا کو دھکیل دیتے ہیں۔ جو چکراتی ہوئی سنتری کی بائیں جانب گر پڑتی ہے۔)

صوبیدار :- (ایک پنجاہ سالہ - سخت زبان اور بدتہذیب آدمی ہے - جو ہاتھ میں ایک انگور کی لکڑی کا ڈنڈا لئے ہوئے ہے) کیا ہوا؟ یہ کیا گڑبڑ ہے؟

فتاتا :- (اپالوڈورس سے) تم نے اس پر کیوں حملہ نہیں کیا۔ اور وقت ہاتھ سے جانے دیا۔

اپالوڈورس :- صوبیدار - میں ملکہ کے حکم سے یہاں .....

صوبیدار :- (بات کاٹ کر) ملکہ - ہاں - ہاں - (سنتری سے) اس کو اندر جانے دو - بازاری آدمیوں کو ان کے تمام سامان کے ساتھ ملکہ کے پاس اندر جانے دو - لیکن یہ خیال رہے - کہ کوئی ایسا شخص باہر نہ جانے پائے جسے تم نے اندر نہیں جانے دیا - حتی کہ ملکہ تک نہ نکلنے پائے۔

سنتری :- یہ بوڑھی عورت بہت خطرناک ہے - اور تین آدمیوں کے برابر طاقتور ہے - وہ سوداگر سے کہہ رہی تھی کہ مجھ پر چاقو سے حملہ کرے۔

اپالوڈورس :- صوبیدار - میں سوداگر نہیں ہوں - میں ایک شریف آدمی ہوں - اور مختلف آرٹ کا ماہر

صوبیدار :- کیا یہ عورت تمہاری بیوی ہے؟

اپالوڈورس :- (خوفزدہ ہوکر) نہیں - نہیں - (اپنے لہجہ کو نرم کرتے ہوئے) وہ میری بیوی نہیں ہے - ایک عالی وقار خاتون ہے۔

فتاتا :- (صوبیدار سے) رومی - میں ملکہ کے گھر کی مہتمم ہوں

صوبیدار :- محترمہ ہمارے سپاہیوں سے ذرا علیحدہ رہو ورنہ مجبوراً مجھے تم کو یہیں ساحل پر دفن کر دینا پڑے گا - خواہ تم دس آدمیوں کے برابر طاقتور کیوں نہ ہو - (اپنے آدمیوں سے) اپنی اپنی جگہ پر جاؤ (وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ جدھر سے آیا تھا اسی طرف چلا جاتا ہے)

فتاتا :- (نفرت آلود نگاہوں سے دیکھ کر) مجھے دیکھنا ہے - کہ آئی سس دیوتا سب سے زیادہ کس سے محبت کرتا ہے اپنی خادمہ فتاتا سے یا روم کے ایک کتے سے -

سنتری :- (اپالوڈورس سے، اپنے ڈنڈے کا سرا محل کی طرف اٹھا کر) ادھر جاؤ - (فتاتا سے مخاطب ہوکر) میرے پاس آ - او گھڑیال کی خالہ، میں یہ ڈنڈا تیرے حلق میں ڈالوں گا۔

کلیوپیٹرا :- (محل سے پکار کر) فتاتا - فتاتا -

فتاتا :- (گھبرائے ہوئے لہجے میں) کھڑکی سے ہٹو - کھڑکی سے ہٹ جاؤ - یہاں آدمی ہیں -

کلیوپیٹرا :- میں نیچے آرہی ہوں -

فتاتا :- (مضطرب ہوکر) نہیں، یہ تم کیا خواب دیکھ رہی ہو - اپالوڈورس اپنے آدمیوں سے کہو کہ سامان اٹھا کر جلدی جلدی میرے ساتھ چلیں -

اپالوڈورس :- ملکہ کے منتظرہ حکم کی تعمیل کرو -

فتاتا :- (مزدوروں سے) جلدی کرو - جلدی (کلیوپیٹرا محل سے باہر نکل کر گھاٹ پر آجاتی ہے) اوہ - کاش میں پیدا نہ ہوتی -

کلیوپیٹرا :- (آرزومند نگاہوں سے) فتاتا میں نے کچھ سوچا ہے مجھے فوراً ایک کشتی کی ضرورت ہے -

فتاتا :- ایک کشتی - نہیں نہیں - تمہیں نہیں مل سکتی - اپالوڈورس، ملکہ سے ملو -

اپالوڈورس :- (خاص انداز سے) حسین ملکہ - میں سسلی کا باشندہ ہوں - اور آپ کے لئے دنیا کے بہترین قالین لایا ہوں - آپ اس میں سے خود انتخاب

فرالیس -

کلیوپیٹرا :- آج قالین کے انتخاب کی مجھے فرصت نہیں، مجھے ایک کشتی کی ضرورت ہے -

فتاتا :- یہ کیا جنون ہے تم شاہی جہاز کے سوا اور کسی چیز پر سمندر میں نہیں جاسکتیں -

اپالوڈورس :- بادشاہت جہاز میں نہیں رہتی - بلکہ خود ملکہ میں موجود ہے (کلیوپیٹرا سے) آپ کے قدموں کے چھو جانے سے بدترین کشتی بھی شاہانہ جہاز بن سکتی ہے - (وہ ساحل کی طرف پلٹ کر پکارتا ہے) او ملاحو، ادھر آؤ -

کلیوپیٹرا :- اپالوڈورس آج سے تم میرے سردار ہو - اور میں اپنے قالین ہمیشہ تمھارے ہی ذریعہ سے خرید اکروں گی (اپالوڈورس سر تسلیم خم کرتا ہے - گھاٹ کے پاس ایک پتوار اور ایک ملاح نظر آتا ہے جس کا چہرہ دھوپ کی تپش سے سیاہ پڑ گیا ہے، وہ پانی سے نکل کر پتوار ہاتھ میں لئے ہوئے سنتری کی داہنی جانب ... اس کا انتظار کرتا ہے) اپالوڈورس کیا تم کشتی ... سکتے ہو!

اپالوڈورس :- میرے بازو ہر ضرورت کے لئے حاضر ہیں - کس طرف چلنے کا قصد ہے؟

کلیوپیٹرا :- روشنی کے مینار کی طرف (وہ ... ہے)

سنتری :- (اپنے بھالے سے روک کر) کھڑی رہو - تم نہیں جاسکتیں -

کلیوپیٹرا :- (...) تجھے یہ جرأت کیونکر ہوئی - کیا تو نہیں جانتا کہ میں ملکہ ہوں؟

سنتری :- مجھے یہی حکم ملا ہے کہ تم نہیں جاسکتیں -

کلیوپیٹرا :- اگر تم نے نہ جانے دیا تو میں سیزر سے کہہ کر تم کو قتل کرادوں گی -

سنتری :- اگر میں اپنے حاکم کا حکم ٹال دوں تو وہ میرے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کرے گا -

کلیوپیٹرا :- فتاتا! اس کو پکڑ لو -

سنتری :- (مبہوت ہو جاتا ہے - اور نہایت غصے سے فتاتا کو گھورتے ہوئے اپنا نیزہ اٹھا کر) بس وہیں کھڑی رہ -

کلیوپیٹرا :- (اپالوڈورس کے پاس پہونچ کر) اپالوڈورس، اپنے غلاموں سے کہو کہ میری مدد کریں -

اپالوڈورس :- ملکہ مجھے ان کی امداد کی ضرورت نہیں - (تلوار میان سے کھینچ لیتا ہے) اے سپاہی بتا کہ تلوار کا مقابلہ تلوار سے کرے گا یا بھالے سے؟

سنتری :- رومی، ایک سسلی کے مقابلے میں! تجھ پر قہر نازل ہو - سنبھل جا - (وہ اپنے بھالے سے اپالوڈورس پر وار کرتا ہے - جو تیزی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے - بھالا اس کے سر پر سے سنسناتا ہوا زمین پر گر پڑتا ہے - اپالوڈورس فتح کا ایک نعرہ لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے - اور سنتری پر حملہ کرتا ہے - سنتری بھی تلوار کھینچ کر مقابلہ کرتا ہے - اور چلاتا ہے) او محافظ - مدد - مدد -

کلیوپیٹرا :- بھاگ کر محل میں اس مقام پر تھاہ لیتی ہے جہاں مزدور سامان کے پاس کھڑے ہوئے ہیں - اور ملاح خوفزدہ سیڑھیوں کی طرف دوڑتا ہے - لیکن لڑائی دیکھنے کی غرض سے آخری سیڑھی پر کھڑا ہو جاتا ہے - اور سنتری فتاتا کے حملہ کے خوف سے گھبرایا ہوا - اور وہ اپنی تلوار سے اچھی طرح کام نہیں لے سکا

کیونکہ اُسے بار بار پیچھے بھی مڑنا پڑتا ہے۔ تاکہ فتاتا کو اپنے پاس نہ آنے دے۔ صوبیدار کئی سپاہیوں کے ساتھ واپس آتا ہے۔ اپالوڈورس کلیوپیٹرا کی طرف ہٹ جاتا ہے۔ کیونکہ نئے سپاہیوں کی آمد سے وہ خوفزدہ ہے۔

صوبیدار:- (سنتری کے داہنے جانب آکر) یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہوا ہے؟

سنتری:- (ہانپتے ہوئے) اگر یہ عورت نہ ہوتی تو میں تنہا اس کا جواب دیتا۔ اس کو مجھ سے دُور رکھو۔ بس مجھے اتنی ہی مدد کی ضرورت ہے۔

صوبیدار:- سپاہی تم بیان کرو کہ کیا ہوا؟

فتاتا:- صوبیدار اس نے ملکہ کو قتل کر ڈالا ہوتا۔

سنتری:- غلط ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ ملکہ یہاں سے نہ جانے پائے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ کشتی لے کر مینار جانا چاہتی ہے۔ چونکہ مجھے حکم دیا گیا تھا۔ اس لئے میں نے اسکو روک لیا۔ اس پر اُس نے اس آدمی کو میرے پیچھے لگا دیا۔

رسالدار:- (کلیوپیٹرا سے) کلیوپیٹرا میں تم کو بچانے کا ذمہ دار ہوں۔ لیکن سیزر کی اجازت کے بغیر تم باہر نہیں جاسکتیں۔

اپالوڈورس:- یہ بتاؤ کہ جہاں سیزر مقیم ہے وہ رومی حدود میں ہے یا نہیں۔

کلیوپیٹرا:- ہاں، ہاں، اب بن پڑے تو اس کا جواب دو۔

رسالدار:- (اپالوڈورس سے) جہاں تک تمہارا تعلق ہے اپالوڈورس، تم کو دیوتاؤں کا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ تم اس ڈنڈے کی مار سے محل کے دروازے میں کیل کی طرح جڑ نہیں دیئے گئے۔

اپالوڈورس:- (متانت سے) میرے فوجی دوست میں ایک ایسے بھدے ہتھیار سے قتل کئے جانے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہوں۔ اگر میں شکست بھی کھاؤں گا تو اس (تلوار میان سے کھینچکر) سفید ہتھیاروں کی ملکہ سے۔ اور یہی ایک ہتھیار ایک آرٹسٹ کے لئے موزوں بھی ہے مگر اس وقت جبکہ تم کو یقین ہو گیا ہے۔ کہ ہم رومی حدود سے باہر نہیں جانا چاہتے۔ تو مجھے اجازت دو۔ کہ میں تمہارے سنتری کا خاتمہ کردوں۔ اور ملکہ کو لے کر چلا جاؤں۔

رسالدار:- (سنتری غصہ سے منہ بنانے لگتا ہے) خاموش رہو کلیوپیٹرا مجھے شاہی احکام کی تکمیل کرنا ہے۔ اس لئے اب تم محل میں جاؤ۔ اور قالینوں کا انتخاب کرو۔

کلیوپیٹرا:- (سر ہلاکر) میں نہ جاؤں گی۔ میں ملکہ ہوں۔ سیزر مجھ سے اس طرح گفتگو نہیں کرتا۔ جیسے تم کرتے ہو۔ کیا سیزر کے رسالدار نے اپنی تہذیب کھو دی ہے؟"

رسالدار:- (نرمی سے) ملکہ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔ اور یہی میرے لئے اطمینان کا باعث ہے۔

اپالوڈورس:- ملکہ جب کوئی بُزدل انسان ایسا کام کرتا ہے جس پر اسے منفعل ہونا چاہیئے۔ تو ہمیشہ یہی کہہ دیتا ہے کہ یہ میرا فرض ہے۔

رسالدار:- (غصہ سے) اپالوڈورس ــــ

اپالوڈورس:- (بات کاٹ کر نہایت خوبی سے) میں اس توہین کا انتقام کسی وقت ضرور اپنی تلوار سے لوں گا۔ (کلیوپیٹرا سے) سنئے۔ جب تک سیزر کا فرمان ان لوگوں کے پاس

نہ آجائے، آپ ان کی قیدی ہیں۔

اپالوڈورس:۔ آپ مجھے اپنے پیغام اور تحفے کے ساتھ سیزر کے پاس جانے کی اجازت دیجئے۔ اور قبل اس کے کہ آفتاب سطح بحر کے نصف حصے تک پہونچے گا۔ میں آپ کی رہائی کا فرمان سیزر کے پاس سے لیکر آجاؤنگا

رسالدار:۔ (اس کو نفرت سے دیکھ کر) اور اس میں شک نہیں کہ وہ تحفہ تم خود ملکہ کے ہاتھ فروخت کردگے۔

اپالوڈورس:۔ رسالدار، وہ تحفہ میں بلا معاوضہ ملکہ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ جو مصری حُسن کی بارگاہ میں ایک پُرخلوص دل کا نذرانہ ہوگا۔ اور وہ تحفہ قالین کا ہوگا۔ جو ان تمام قالینوں میں سب سے عمدہ قالین ہے۔

کلیوپیٹرا:۔ (تعریف کرتے ہوئے رسالدار سے) اب تم کو معلوم ہوا کہ تم کیسے جاہل آدمی ہو؟

رسالدار:۔ (برہم ہوکر) ہاں ایک بیوقوف اور اس کا سامان دونوں ایک دوسرے سے بہت جلد جدا ہوجاتے ہیں (اپنے سپاہیوں کی طرف پھر کر) دیکھو دو آدمی یہاں مقرر کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اس آدمی اور اس کے سامان کے سوا یہاں سے اور کوئی نہ جانے پائے۔ اگر وہ پھر یہاں آکر اپنی تلوار سے دھمکائے تو اس کو قتل کرڈالنا۔ جاؤ، اپنی اپنی جگہ جاکر پہرہ دو۔

(وہ دو اور مددگاروں کو مقرر کرکے چلا جاتا ہے)

اپالوڈورس:۔ (دوستانہ لہجے میں) میرے دوستو کیا تم محل میں آکر ان جھگڑوں کو شراب کے پیالوں میں دفن نہ کردوگے؟ (وہ اپنی تھیلی نکالتا ہے جس میں روپیوں کی جھنکار آتی ہے) یہ دیکھو ملکہ نے تم سب کے لئے انعامات بھیجے ہیں۔

سنتری:۔ (بہت رکھائی سے) تم نے رسالدار کے احکام سُن لئے۔ بس جاؤ۔ اپنا کام کرو۔

پہلا مددگار:۔ ہاں تم کو جلد چلا جانا چاہیے۔ جاؤ چلے جاؤ

دوسرا مددگار:۔ (تھیلی کو للچائی نظروں سے دیکھ کر) ایک غریب آدمی کو لالچ نہ دلاؤ۔

اپالوڈورس:۔ (کلیوپیٹرا سے) شہزادیوں کی سرتاج۔ رسالدار قریب ہے۔ اور جب رومی سپاہی کا افسر قریب ہو تو وہ بے ایمانی نہیں کرسکتا۔ مجھے تمھارا پیغام سیزر کے پاس لے جانا چاہئے۔

کلیوپیٹرا:۔ (جو قالینوں کے درمیان بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی) کیا یہ قالین بہت بھاری ہیں؟

اپالوڈورس:۔ بھاری ہونے سے کیا حرج ہے۔ یہاں بہت سے مزدور ہیں۔

کلیوپیٹرا:۔ قالین کشتیوں میں کس طرح رکھتے ہیں؟ کیا ان کو کشتی کے نیچے ڈال دیتے ہیں؟

اپالوڈورس:۔ نہیں ملکہ چھوٹی کشتی میں نیچے رکھنے سے کشتی ڈوب جائے گی۔

کلیوپیٹرا:۔ تاہم اگر میں سیزر کو صرف ایک قالین بھیجوں تو تم اس میں لیجا سکتے ہو؟

اپالوڈورس:۔ یقیناً۔

کلیوپیٹرا:۔ تم اس کو آہستہ آہستہ لے جانا اور راستے میں اس کی پوری حفاظت کرنا۔

اپالوڈورس:۔ آپ مجھ پر اعتماد رکھئے۔

کلیوپیٹرا:۔ بہت حفاظت سے!

اپالوڈورس:۔ اپنی جان سے زیادہ، ملکہ،

کلیوپیٹرا:۔ بہت خوب۔ فتاتا، ادھر آؤ۔ (فتاتا اس کے پاس آتی ہے اپالوڈورس اُسے قالین محل میں لے جانے کو کہتا ہے) نہیں اپالوڈورس تم کو نہ آنا چاہئے۔ میں خود ہی قالین کا انتخاب کرلوں گی۔ تم کو یہیں ٹھیرنا چاہئے۔ (وہ محل میں چلی جاتی ہے)

اپالوڈورس:۔ (مزدوروں سے) اس خاتون کے حکم کی تعمیل کرو۔ (مزدور اٹھ کر کام میں لگ جاتے ہیں)

فتاتا:۔ (مزدوروں کو مخاطب کرکے) اس طرف مگر سیڑھی پر پاؤں رکھنے سے پہلے جوتے اُتار ڈالو۔ (وہ قالین لئے ہوئے مزدوروں کے ساتھ اندر جاتی ہے۔ اس اثنا میں اپالوڈورس پل کے کنارے جاتا ہے اور ساحل کی طرف دیکھتا ہے۔ سنتری اس کو نفرت سے دیکھتے ہیں)

اپالوڈورس:۔ (سنتری کو مخاطب کرکے) میرے دوست۔

سنتری:۔ خاموش رہو۔

پہلا مددگار:۔ اپنی زبان بند کرو۔

دوسرا مددگار:۔ (پل کے شمالی کنارے کی طرف دیکھ کر) کیا تم ایک لمحہ کے لئے ٹھیر سکتے ہو۔؟

اپالوڈورس:۔ صبر سے کام لے تین سر والے گدھے (وہ آپس میں چہ می گوئیاں کرنے لگتے ہیں لیکن اپالوڈروس اس سے خوفزدہ نہیں ہوتا) سنو۔ یہ بتاؤ کہ تم یہاں میری نگرانی کے لئے مقرر کئے گئے ہو یا مصریوں کی؟

سنتری:۔ ہم اپنے فرائض بخوبی جانتے ہیں۔

اپالوڈورس:۔ تو پھر ان کو انجام کیوں نہیں دیتے؟ وہ دیکھو وہاں کیا ہو رہا ہے (جنوب کی طرف اشارہ کرتا ہے)

سنتری:۔ مجھے تم ایسوں کی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔

اپالوڈورس:۔ (شور کرتا ہے) رسالدار۔ دوڑو۔ دوڑو۔

سنتری:۔ اپنی مجذوبانہ بڑ کو ختم کر (شور مچا کر) ہوہو۔ خطرہ۔ خطرہ۔

پہلا اور دوسرا مددگار:۔ خطرہ خطرہ۔ دوڑو۔ دوڑو۔ (رسالدار اپنے محافظوں کو لے کر آتا ہے)

رسالدار:۔ کیا گڑبڑ ہے۔؟ کیا بوڑھی عورت نے پھر تم پر حملہ کیا۔ (اپالوڈورس سے) کیا تم ابھی یہیں ہو؟

اپالوڈورس:۔ (اشارہ کرکے) ادھر دیکھو مصری حرکت کر رہے ہیں۔ اور خشکی اور تری دونوں طرف سے حملے کریں گے۔ خشکی پر تو بڑے پل کی طرف سے۔ اور تری میں مغربی ساحل کی طرف سے۔ میرے دوستو جاؤ شکار نکل گیا۔ (متعدد بگلوں کی آوازیں مختلف سمتوں سے آتی ہیں)

رسالدار:۔ (تیزی سے) دونوں زائد آدمی جنوبی مقامات پر جاکر اس خطرہ کی اطلاع دیں، ایک آدمی یہاں پہرہ دے۔ اور باقی سب میرے ساتھ جلد چلو۔ (دونوں مددگار سنتری جنوب کی طرف دوڑتے ہیں۔ رسالدار اور اس کے ہمراہی شمالی جانب جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی بگل کی آواز آتی ہے۔ چاروں مزدور قالین لئے ہوئے۔ فتاتا کے ہمراہ محل سے برآمد ہوتے ہیں)

سنتری:۔ (اپنا ڈنڈا سنبھال کر) تم پھر نکلے (مزدور ٹھیر جاتے ہیں)

فتاتا :- رومی جوان صبر کر۔ اب تو تنہا ہی اپالوڈورس!
یہ قالین کلیوپیٹرا نے سیزر کو بطور تحفہ بھیجا ہے اس
کے اندر دس بہت نفیس بلوریں جام ہیں۔ اور
مقدس نیلے کبوتر کے ایک ہزار انڈے ہیں۔ میں انہیں
تمہارے حوالے کرتی ہوں۔ اس میں سے ایک بھی
ٹوٹنے نہ پائے۔

اپالوڈورس :- میں ذمہ دار ہوں۔ (مزدوروں سے)
چلو اس کو حفاظت سے لے کر کشتی میں رکھو۔
(مزدور سیڑھی پر سے قالین لے کر اترتے ہیں)

پہلا مزدور :- (کشتی کو دیکھ کر) ان انڈوں میں سے تقریباً
ہر ایک، ایک پونڈ سے زیادہ وزنی ہے۔ یہ کشتی
اتنے بھاری بوجھ کو نہیں اُٹھا سکتی۔

ملاح :- (تعجب سے سیڑھیوں پر دوڑ کر) او احمق مزدور۔
او اونٹنی کے بچے (اپالوڈورس سے) جناب میری
کشتی ایک دفعہ میں پانچ آدمیوں سے زیادہ لے
جاتی ہے۔ کیا یہ آپ کو اور کبوتر کے انڈوں کو
نہیں لے جا سکتی۔ (مزدور سے) او شریر اونٹنی کے
بچے۔ دیوتا تجھے اس حاسدانہ شرارت کی سزا
دیں گے۔

پہلا مزدور :- اس وقت میں تجھے ٹھیک کرنے کے لئے
اپنا کام نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن ٹھیر جا۔ کل تجھے
اس کا مزہ چکھاؤں گا۔

اپالوڈورس :- (بیچ بچاؤ کرکے) ٹھیر جاؤ۔ گڑبڑ نہ کرو۔
اگر کشتی ایک ہی تختے کی ہوتی تو بھی میں اس پر سیزر
کے پاس پہونچتا۔"

فتاتا :- (بے چینی سے) خدا کے لئے اپالوڈورس اس گٹھڑی
کی خاطر، خطرہ میں نہ پڑو۔

اپالوڈورس :- محترم خاتون، ڈرو نہیں۔ (مزدوروں سے)
چلو اس کو اٹھا کر نیچے لے چلو۔ آہستہ آہستہ ورنہ
دس دن تک خاک پھانکنا پڑے گی۔ (ملاح گٹھری
لئے ہوئے مزدوروں کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اترتا ہے
فتاتا اور اپالوڈورس اوپر سے دیکھتے رہتے ہیں)

اپالوڈورس :- آہستہ آہستہ میرے لڑکو۔ میرے بچو۔
(یکایک خوفزدہ ہوکر) آہستہ اٹھاؤ۔ اس کو نیچے رکھ دو۔
اس طرح۔ ہاں اب ٹھیک ہے۔

فتاتا :- (ایک مزدور پر غصہ ہوکر) اس پر پاؤں مت رکھ۔
اس پر پاؤں مت رکھ۔ او جانور۔

پہلا مزدور :- (گٹھری پر چڑھتے ہوئے) بی صاحبہ غصہ
نہ ہو سب ٹھیک ہے۔

فتاتا :- (ہانپ کر) سب ٹھیک ہے، تو نے تو میرا
کلیجہ ہلا ڈالا۔ (وہ قریب کی دیوار پکڑ لیتی ہے۔ چاروں
مزدور اب ادھر آجاتے ہیں۔ اور اجرت دیئے جانے کا
انتظار کرتے ہیں)

اپالوڈورس :- ادھر آؤ۔ بھوکو۔ (وہ پہلے مزدور کو کچھ دیتا
ہے۔ جو ہاتھ میں لے کر دوسرے مزدوروں کو دکھاتا ہے۔ سب
حریصانہ دوڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کی
دریادلی سے مسرور ہوجاتے ہیں۔)

پہلا مزدور :- او سخی شہزادے۔

دوسرا مزدور :- او بازار کے مالک۔

تیسرا مزدور :- او دیوتاؤں کے منظور نظر۔

چوتھا مزدور :- او مزدوروں کے مربی -

سنتری :- (حاسدانہ اپنے گرز سے ان کو دھمکا کر) بھاگ جاؤ کتو - یہاں سے منہ کالا کرو - (وہ شمال کی جانب پُل کی طرف بھاگنے لگتے ہیں -)

اپالوڈورس :- خدا حافظ فتاتا - میں مینار پر مصریوں سے قبل ہی پہنچ جاؤں گا - (سیڑھیوں سے اترتا ہے -)

فتاتا :- جا، دیوتا تجھے جلد پہونچائیں - اور میری بچی کو محفوظ رکھیں - (سنتری جو مزدوروں کا تعاقب کر رہا تھا واپس آتا ہے اور کشتی کی طرف نظر دوڑاتا ہے جو سیڑھی سے ملی ہوئی کھڑی ہے - تاکہ فتاتا بھاگ نہ جائے)

اپالوڈورس :- (کشتی چلتے وقت نیچے سے) خدا حافظ - اے گرزبردار بہادر،

سنتری :- خدا حافظ سوداگر، اے دوکاندار -

اپالوڈورس :- ہاں، ہاں، جلدی کر، اے دلیر ملاح جلدی کر - (وہ پتوار کی آواز کے ساتھ ساتھ گانے لگتا ہے)

سنتری :- (فتاتا کو دھمکا کر) اب بی صاحبہ اپنے مرغی خانے کو تشریف لے جائیے -

فتاتا :- (گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلاتے ہوئے) اے سمندر کے دیوتاؤ - اس کو حفاظت سے ساحل تک پہونچا دو -

سنتری :- (تعجب سے) کسے حفاظت سے پہنچا دو - تم کس کی بابت کہہ رہی ہو -

فتاتا :- (نفرت سے دیکھ کر) جاؤ اب تم اس رومی احمق کو ایک سکتے کی طرح نگل لو - کیونکہ اس نے میری بچی کو سمندر میں جانے سے نہیں روکا -

سنتری :- کمبخت - کیا وہ کشتی میں ہے ؟ (وہ سمندر کی طرف منہ کر کے شور کرتا ہے) او ملاح - او ملاح -

(اس اثناء میں روفیو - صبح کی جنگ کے اختتام کے بعد، مینار کے دروازے کے باہر ایک بڑے لٹھے پر بیٹھا ہوا کھجور کھا رہا ہے - اس کا کھجور سے بھرا ہوا خود اس کے دونوں گھٹنوں کے بیچ میں دبا ہوا ہے - اور ایک چمڑے کی شراب کی صراحی قریب رکھی ہوئی ہے - اس کے پیچھے مینار کا چبوترہ چاروں طرف پانی سے بھرا ہوا ہے - جس کے اطراف میں ایک فصیل ہے - اور بیچ میں دو سیڑھیاں ہیں - ایک بوجھل زنجیر روشن مینار سے اس کے سر پر لٹکی ہوئی ہے - سیزر باہر کی طرف مضطربانہ انداز سے دیکھتا ہوا چبوترے کی سیڑھی پر کھڑا ہوا ہے - اور بظاہر بہت بے چین معلوم ہوتا ہے - برٹینس مینار کے دروازے سے برآمد ہوتا ہے)

روفیو :- میرے برطانوی دوست، کیا تم مینار کی چوٹی تک گئے تھے ؟

برٹینس :- ہاں میرا خیال ہے کہ دو سو فیٹ بلند ہے -

روفیو :- وہاں اور کوئی بھی ہے ؟

برٹینس :- صرف ایک جر ثقیل کو چلانے والا بڈھا اور اس کا بیٹا - جس کی عمر تقریباً ۱۴ سال کی ہے -

روفیو :- کیا کہا - ایک بڈھا - اور اس کا بیٹا یہ کام کرتا ہے - کیا تمہارا مطلب بیس آدمیوں سے ہے -

برٹینس :- صرف دو - میں آپ کو یقین دلاتا ہوں - ان کے پاس ایک مشین ہے - جس میں اُبلتا ہوا پانی

بھرا رہتا ہے۔ یہ مشین میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ کیسے کام کرتی ہے۔ یہ برطانوی طرز کی نہیں ہے۔ وہ اس مشین سے تیل کے پیپے اور لکڑی کے لٹھے ادھر اٹھاتی ہیں ——

روفیو:۔ لیکن ——

بری ٹینس:۔ مجھے معاف کیجئے۔ جزیرے سے بعض پیغامبر ہمارے پاس آرہے ہیں۔ مجھے دیکھنا ہے کہ وہ کیا پیغام لاتے ہیں (وہ تیزی سے مینار کے باہر جاتا ہے۔)

سیزر:۔ (تھرتھراتے ہوئے چبوترے سے اتر کر آتے ہوئے) روفیو، یہ ایک دیوانوں کا سا سفر رہا۔ ہم کو شکست اٹھانی پڑے گی۔ کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ میرے آدمی جو ٹیلے کے اس پار ہیں، کس طرح کام انجام دے رہے ہیں۔

روفیو:۔ (غصہ سے) کیا میں کھانا چھوڑ دوں۔ اور بھوک کا شکار بنکر تمہارے لئے اطلاع بہم پہونچانے جاؤں۔

سیزر:۔ (تسکین دیتے ہوئے) نہیں روفیو نہیں۔ کھاؤ۔ میرے بچے کھاؤ۔ (وہ دوسری طرف پلٹتا ہے۔ روفیو بدستور کھجور کھانے لگتا ہے) مصری اتنے بیوقوف نہیں ہو سکتے۔ کہ ہماری جائے پناہ کو تہ و بالا کر کے ہم کو نہ آدبوچیں۔ یہ سب سے پہلا موقع ہے کہ میں ایک خطرہ میں گھر گیا ہوں۔ مجھے مصر نہ آنا چاہئے تھا۔

روفیو:۔ ایک گھنٹہ قبل آپ صرف فتحمندی کا اظہار کر رہے تھے۔

سیزر:۔ (معذرت خواہی کے انداز سے) ہاں۔ میں ایک بیوقوف تھا۔ یہ حماقت تھی روفیو۔ لڑکپن تھا۔

روفیو:۔ لڑکپن! ذرا نہیں۔ یہ لو۔ (وہ مٹھی بھر کر کھجور سیزر کو دیتا ہے)

سیزر:۔ یہ کس لئے ہیں؟

روفیو:۔ کھانے کے لئے۔ تم کو اس کی ضرورت ہے جب ایک رومی تمہاری عمر کو پہونچتا ہے تو وہ اپنے دو پہر کے کھانے کو بھول جاتا ہے۔ کھاؤ۔ پیو اور پھر دوسرے موقع کی تلاش کرو۔

سیزر:۔ (کھجور لیکر) میری عمر۔ (وہ سر ہلاتا ہے اور ایک کھجور کو دانت سے کاٹتا ہے۔) ہاں روفیو۔ میں ایک بڈھا آدمی ہوں۔ اور بالکل شکستہ حال۔ (اس کے دماغ پر مغموم خیالات کے بادل چھا جاتے ہیں۔ (وہ کھجور کھانے لگتا ہے) اچیلس ابھی جوان ہے۔ ٹالمی ایک بچہ ہے (وہ دوسری کھجور کھاتا ہے) ہاں ہر شخص کا ایک وقت ہوا کرتا ہے۔ اور مجھے بھی اپنا وقت نصیب ہو چکا ہے۔ میں اس کے لیے شکوہ نہیں کر سکتا۔ (بری ٹینس بے حد خوف زدہ ایک صندوق لے کر آتا ہے۔ سیزر اپنے ہوش و حواس پر قابو پا لیتا ہے۔) کیا خبر لائے؟

بری ٹینس:۔ ہمارے دلیر رہوڈیائی ملاح نے ایک خزانے پر قبضہ کر لیا ہے یہ دیکھو۔ (وہ چمڑے کا صندوق سیزر کے پیر کے قریب پھینک دیتا ہے) ہمارے دشمن ہمارے قبضہ میں آگئے ہیں

سیزر:۔ اس تھیلے میں؟

بری ٹینس:۔ جبتک آپ پوری بات نہ سن لیں صبر سے کام لیں اس تھیلے میں وہ تمام مراسلت بند ہے جو پمپی کے فریق اور یہاں کی مقامی فوج کے مابین ہوئی تھی۔"

سیزر:۔ اچھا!

بری ٹینس:۔ (سیزر کی اس سستی سے بےچین ہو کر اس نے اصل واقعہ کو نہیں تاڑا) ہاں تو ہمکو اب یہ معلوم ہو جائیگا کہ ہمارے دشمن کون ہیں

ہراس شخص کا نام جس نے آپ کے خلاف سازش کی۔ ممکن ہو ان کاغذات میں ملے۔

سیزر:۔ ان کو آگ میں جھونک دو۔

بری ٹینس:۔ ان کو آگ میں ۔۔۔ ؟ (وہ ہانپنے لگتا ہے)

سیزر:۔ ہاں آگ میں! کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی زندگی کے تین سال اُن آدمیوں کی تحقیق اور چھان بین میں صرف کردوں، جو اس وقت میرے دوست بن جائیں گے جب میں یہ ثابت کردوں گا۔ کہ یہ دوستی پمپئی کی دوستی سے زیادہ قیمتی ہے یا کیٹو کی دوستی سے زیادہ اہم ہے۔ او جاہل برطانوی کیا میں بُل ڈاگ بہ کتا ہوں۔ کہ محض اس غرض سے جنگ کی تلاش کروں۔ کہ میرے جبڑے بہت سخت ہیں؟

بری ٹینس:۔ لیکن سرکار آپ کی عزت میں روم کی عزت ہے۔

سیزر:۔ میں اپنی عزت پر انسانی قربانیاں نہیں کرتا۔ اگر تم ان کو نہیں جلاتے تو میں پانی میں غرق کرسکتا ہوں۔ (وہ کاغذات کا تھیلا اٹھالیتا ہے۔ اور چبوترے پر سے نیچے سمندر میں پھینک دیتا ہے)

بری ٹینس:۔ سیزر، آپ بہت ضبط سے کام لیتے ہیں کیا باغیوں کو بالکل آزادی اس لئے دے دی جائے۔ کہ ان کا ظاہر اور باطن مختلف ہے۔

روفیو:۔ (کھڑے ہوتے ہوئے) جب جزیرہ کا باشندہ اپنا وعظ ختم کردے تو مجھے بلانا۔ میں اس وقت ابلتے پانی کی مشین دیکھنے جارہا ہوں۔ (وہ مینار پہ چلا جاتا ہے)

بری ٹینس:۔ او سیزر، میرے بڑے آقا۔ کاش میں آپ کو صرف اس امر پر راغب کرسکتا کہ آپ زندگی پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اسی طرح جس طرح میرے ملک میں لوگ کرتے ہیں۔

سیزر:۔ بری ٹینس، کیا وہ حقیقت میں ایسا ہی کرتے ہیں۔

بری ٹینس:۔ کیا آپ وہاں نہیں رہے؟ کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا؟ ایک برطانوی کیسی گفتگو کرتا ہے۔ جیسی آپ اپنے لمحات فرصت میں کرتے ہیں۔ کون برطانوی مقدس عبادتوں میں شریک ہونے سے بے اعتنائی کرتا ہے، کون برطانوی بجائے نیلے رنگ کے آپ کی طرح مختلف رنگ کے کپڑے پہنتا ہے۔ یہ ہمارے لئے اخلاقی سوالات ہیں۔

سیزر:۔ اچھا اچھا۔ میرے دوست، جب میں کبھی چین سے بیٹھوں گا۔ تو شاید ایک چغہ بنواؤں گا۔ اس وقت تک مجھے اپنی رومی ہی وضع قطع میں رہنے دو۔

(اپالوڈورس مینار کے پاس آتا ہے) کہو کیسے آئے؟

بری ٹینس:۔ (تیزی سے پلٹ کر افسرانہ تمکنت سے اجنبی سے استفسار کرتے ہوئے) یہ کیا ہے، تم کون ہو؟

اپالوڈورس:۔ گھبراؤ نہیں میرے دوست۔ میں تم کو کھا نہ جاؤں گا۔ میں اسکندریہ سے سیزر کے لئے بیش قیمت قالین کا تحفہ لایا ہوں۔

سیزر:۔ اسکندریہ سے!

بری ٹینس:۔ یہ سیزر ہیں۔

روفیو:۔ (مینار کے دروازے پر آتے ہوئے) کیا قصہ ہے۔؟

اپالوڈورس:۔ مبارک۔ سیزر اعظم۔ میں سسلی کا ماہر

فنون لطیفہ، اپالوڈورس ہوں۔

بری ٹینس:۔ ماہر فنون۔! انھوں نے اس مکار کو آنے کیوں دیا۔؟

سیزر:۔ ٹھیرو۔ بھلے آدمی آپالوڈورس مشہور ماہر فنون لطیفہ ہے

بری ٹینس:۔ (دُکھائی سے) میں جناب سے معافی مانگتا ہوں (سیزر سے)، میں نے سمجھا کہ وہ خود کو ایک پیشہ ور بتا رہا ہے۔ (کسی قدر منہ بگاڑ کر وہ اپالوڈورس کو سیزر کے پاس آنے کی اجازت دیتا ہے۔ اور خود ہٹ جاتا ہے۔ روفیو، اپالوڈورس کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر دوسری طرف جاکر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

سیزر:۔ اپالوڈورس! میں تم کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ تم کس لئے یہاں آئے ہو؟

اپالوڈورس:۔ آپ کی خدمت میں ملکہ کی طرف سے تحفے پیش کرنے کے لئے!

سیزر:۔ وہ کون ملکہ ہے؟

اپالوڈورس:۔ ملکۂ مصر۔ کلیوپیٹرا۔

سیزر:۔ (انتہائی معتمدانہ انداز سے) اپالوڈورس یہ تحفہ تحائف پیش کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ملکہ کے پاس جاؤ۔ اور اس سے کہو کہ یہاں کے حالات اطمینان بخش رہے تو شام تک محل واپس آؤں گا۔

اپالوڈورس:۔ سیزر۔ میں واپس نہیں جا سکتا۔ جونہی کہ میں اس روشن مینار کے پاس پہونچا۔ کسی بیوقوف نے ایک چمڑے کا تھیلا سمندر میں پھینک دیا۔ جس سے میری کشتی کا ایک سرا ٹوٹ گیا۔ اور مجھے ذرا بھی موقع نہ ملا کہ میں کنارے پہونچ کر اس کو ڈوبنے سے بچاؤں۔

سیزر:۔ اپالوڈورس۔ مجھے افسوس ہے۔ اس نالائق کو سزا دی جائے گی۔ خیر۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم میرے لئے کیا تحفے لائے ہو؟ اگر میں ان کو نہ دیکھوں گا تو ملکہ کو صدمہ ہوگا۔

روفیو:۔ کیا ہمارے پاس اتنا فضول وقت ہے۔ کہ اس کھیل میں ضائع کریں۔ ملکہ تو بالکل بچہ ہے۔

سیزر:۔ ہاں ایسا ہی ہے۔ اسی لئے تو ہم کو اس کی دل شکنی نہ کرنی چاہئے۔ اپالوڈورس۔ کیا تحفہ ہے؟

اپالوڈورس:۔ سیزر! یہ ایک ایرانی قالین ہے۔ اور اس کے اندر، جیسا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے۔ کبوتر کے انڈے، شراب کے بلوری جام اور بہت سی قیمتی چیزیں ہیں۔ مجھے اس کو اس سیڑھی پر سے لیجانے کی ہمت نہیں پڑتی۔

روفیو:۔ تو اسے جرثقیل کے ذریعہ اٹھاؤ۔ انڈے ہم باورچی کے پاس بھیجدیں گے۔ شراب ان پیالوں میں نوشش کریں گے۔ اور قالین پر سیزر لیٹا کرے گا۔

اپالوڈورس:۔ کیا کہا۔؟ جرثقیل۔ سیزر۔ مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں اس قالین کو اپنی جان کے برابر سمجھ کر آپ کے حوالے کروں۔

سیزر:۔ (مسرت سے) تو بہتر ہے تم بھی اس کے ساتھ لٹک جاؤ۔ تاکہ اگر زنجیر ٹوٹ جائے تو کبوتر کے انڈوں کے ساتھ تم بھی فنا ہو جاؤ، (وہ زنجیر کے پاس جاتا ہے اور اسکو غور سے دیکھنے لگتا ہے۔)

اپالوڈورس :۔ (بری ٹینس سے) کیا سیزر نہ سنجیدگی سے کہہ رہا ہے ؟

بری ٹینس :۔ اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ کیونکہ وہ اطالوی ہے۔ لیکن جو کچھ وہ کہتا ہے بے معنی نہیں ہوتا۔

اپالوڈورس :۔ سنجیدہ ہو یا نہیں۔ اس نے ٹھیک کہا ہے اب مجھے ایک فوجی دستہ دو۔ تاکہ جر ثقیل سے کام لیا جائے۔

بری ٹینس :۔ جر ثقیل کو مجھ پر چھوڑ دو۔ جاؤ۔ اور زنجیر کو نیچے آتا ہوا دیکھو۔

اپالوڈورس :۔ بہت خوب۔ تم مجھے وہاں لمحہ بھر میں ایک سورج کی طرح اپنا خزانہ لئے ہوئے طلوع ہوتا ہوا پاؤ گے (وہ جس طرف سے آیا تھا اسی طرف واپس جاتا ہے۔ اور بری ٹینس مینار میں داخل ہوتا ہے)

روفیو :۔ (بے پروائی سے) سیزر، کیا تم ان احمقانہ باتوں کے لئے یہاں ٹھیرے رہو گے ؟

سیزر :۔ (جر ثقیل کے متحرک ہوتے وقت پیچھے ہٹ کر) کیوں نہیں ؟

روفیو :۔ یہ مصری آپ کو "کیوں نہیں" کا مزہ چکھائیں گے، اگر ان کی سمجھ میں آگیا کہ قبل اس کے کہ ہم اپنی مورچہ بندی ختم کر چکیں۔ وہ ہم پر حملہ کر دیں تو پھر کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑے گا۔ ہم کس قدر بے وقوف ہیں کہ یہاں ایک کبوتر کے انڈوں سے بھرے ہوئے قالین کو دیکھنے کے لئے بچوں کی طرح ٹھیرے ہوئے ہیں۔ (زنجیر بہت بلند ہو جاتی ہے۔ تاکہ فصیل ہیں نہ رک سکے۔ پھر وہ مینار کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔)

سیزر :۔ میرے بچے روفیو ڈرو نہیں۔ جب پہلا مصری اپنا پہلا قدم پل پر رکھے گا تو طبل آگاہی بجے گا۔ اور ہم دونوں اپنے اپنے کونے سے نکل کر، قبل اس کے کہ مصری اپنے گھروں سے نکلکر وہاں پہونچیں مورچے کے پاس پہنچ جائینگے، ہم دونوں، میں جو کہ ایک بڈھا آدمی ہوں اور تم جو اس کے سب سے بڑے بیٹے ہو۔ اس لئے چپ رہو۔ اور لاؤ مجھے چند کھجوریں اور دو۔

اپالوڈورس :۔ (نیچے سے) ہاں۔ اوپر کھینچو۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔ (زنجیر ادھر کھینچتی ہے۔ اور پھر مینار کے پیچھے سے سامنے آجاتی ہے۔ اپالوڈورس قالین کے ایک کنارے سے چمٹا ہوا۔ ہوا میں لٹکتا رہتا ہے۔ اور جیسے جیسے وہ فصیل سے ادھر جاتا ہے گانا شروع کرتا ہے۔) ہاں اب ٹھیک ہے۔ ٹھیر جاؤ ایک چکر اور۔ (چلاکر) اب نیچے جھکاؤ۔ (زنجیر نیچے اترنے لگتی ہے۔)

اپالوڈورس :۔ (زور سے) آہستہ آہستہ، انڈوں کا خیال رہے۔

روفیو :۔ (زور سے) بس ٹھیک ہے۔ آہستہ آہستہ۔ (اپالوڈورس مع قالین کے بلیٹ فارم پر آہستہ سے اتار دیا جاتا ہے۔ روفیو اور سیزر، اپالوڈورس کو زنجیر سے علیحدہ ہونے میں مدد دیتے ہیں۔)

روفیو :۔ ادھر کھینچ لو۔

(زنجیر ایک کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ان کے سر پر اٹھتی ہے بری ٹینس مینار سے باہر آکر قالین کی رسیاں کھولنے میں مدد دیتا ہے۔

اپالوڈورس :۔ (رسیاں کھلنے کے بعد) اب ذرا دور کھڑے

ہو جاؤ۔ میرے دوستو۔ اور سیزر کو دیکھنے دو۔
(وہ قالین کھول دیتا ہے)

روفیو:۔ بس صرف شال کا ایک گٹھر اور انڈے ؟

اپالوڈورس:۔ سیزر قریب آؤ۔ اور ان دوشالوں میں ان کو تلاش کرو۔

روفیو:۔ (تلوار کھینچکر) ہوں۔ دغا بازی۔ سیزر پیچھے کھڑے رہو۔ میں نے ان دوشالوں میں ایک حرکت سی محسوس کی ہے۔ اس کے اندر ضرور کوئی زندہ چیز ہے۔

بری ٹینس:۔ (تلوار کھینچ کر) اس کے اندر سانپ ہے۔

اپالوڈورس:۔ کیا سیزر میں اتنی جرأت ہے کہ جہاں سانپ حرکت کرتا ہو۔ وہاں اپنا ہاتھ ڈال دے ؟

روفیو:۔ (اس سے مخاطب ہو کر) دغا باز کتے۔

سیزر:۔ خاموش رہو۔ اپنی اپنی تلواریں میان میں رکھ لو۔ تمہارے سانپ کا تنفس باقاعدہ معلوم ہوتا ہے (وہ اپنا ہاتھ دوشالوں میں ڈال دیتا ہے۔ اور ایک عریاں ہاتھ باہر نکالتا ہے۔) یہ ایک چھوٹا حسین سانپ ہے۔

روفیو:۔ (دوسرا ہاتھ نکال کر) ہم کو دوسرا ہاتھ بھی نکالنے دو۔
(دونوں کلیوپیٹرا کی دونوں کلائیاں پکڑ کر کھینچتے ہیں۔ اور اسے بیٹھا ہوا پاتے ہیں۔ بری ٹینس خوفزدہ ہو کر اپنی تلوار میان میں رکھ لیتا ہے۔)

کلیوپیٹرا:۔ (ہانپتے ہوئے) اوہ۔ میں بالکل گرد میں دفن ہو گئی۔ اوہ سیزر۔ ایک آدمی کشتی میں مجھ پر کھڑا ہوا۔ اور ایک بڑا بھاری تھیلا آسمان سے میرے اوپر گرا اور کشتی ڈوب گئی۔ اور پھر میں ادھر لڑھکائی گئی اور نیچے اتاری گئی۔

سیزر:۔ (پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر جب وہ اٹھ کر سیزر کے گلے سے لگ جاتی ہے۔) خیر اس کا خیال نہ کرو۔ تم اب یہاں بالکل محفوظ ہو۔ ہر طرح مطمئن رہو۔

روفیو:۔ اچھا اب یہ یہاں پہنچ گئی تو ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کریں ؟

بری ٹینس:۔ سیزر وہ بغیر کسی خادمہ کے یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔

کلیوپیٹرا:۔ (سیزر سے جو بے حد متحیر ہو جاتا ہے) کیا تم مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔ ؟

سیزر:۔ نہیں۔ نہیں۔ میں بہت خوش ہوا ہوں۔ مگر روفیو بہت غصہ ہو رہا ہے اور بری ٹینس متحیر ہے۔

کلیوپیٹرا:۔ (نفرت سے) تم ان کے سر قلم کر سکتے ہو۔ کیا نہیں۔ ؟

سیزر:۔ میری سمندری چڑیا۔ یہ سر کٹنے کے بعد اتنے مفید ثابت ہوں گے، جتنے اب ہیں۔

روفیو:۔ (کلیوپیٹرا سے) اب ہم کو فوراً جا کر تمہارے بعض مصریوں کے سر قلم کرنا پڑیں گے۔ اگر ہم شکست کھا کر تم کو تنہا چھوڑ دیں اور تمہارے چھوٹے بھائی کو یہ موقع دیں کہ وہ تم کو گرفتار کرلے تو تم اس امر کو کن نظروں سے دیکھو گی۔ ؟

کلیوپیٹرا:۔ لیکن تمھیں مجکو اکیلا نہ چھوڑنا چاہئے۔ سیزر تم مجھے اکیلا نہ چھوڑ دوگے۔ کیا چھوڑ دوگے ؟

روفیو:۔ کیوں نہیں ! جب بگل بجے گا۔ اور ہماری جانیں سیزر پر منحصر ہوں گی کہ وہ مورچہ پر مصریوں کے پہنچنے سے قبل پہونچ جائے۔ اوہ ؟

کلیوپیٹرا:- انھیں مرجانے دو۔ وہ صرف سپاہی ہیں

سیزر:- (سنجیدگی سے) کلیوپیٹرا۔ جب بگل بجتا ہے
تو ہم میں سے ہر ایک کو اپنا سر ہتھیلی پر رکھنا پڑتا
ہے۔ اور اسے موت کے منہ میں ڈال دینا پڑتا ہے
اور اپنے سپاہیوں میں سے جنھوں نے مجھ پر کامل
اعتماد کیا۔ ایک بھی ایسا نہیں ہے۔ جس کا ہاتھ
میں تمھارے سر سے زیادہ مقدس سمجھ کر نہ پکڑ دوں۔
(کلیوپیٹرا گھبرا جاتی ہے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں)
اپالوڈورس تم کو چاہئے۔ کہ ان کو واپس محل لے جاؤ۔

اپالوڈورس:- کیا میں کوئی مچھلی ہوں کہ اپنی پیٹھ پر
جوان عورتوں کو بٹھا کر لے جاؤں؟ میری کشتی
تو ڈوب گئی۔ اور آپ کی کشتیاں یا تو مورچہ پر
ہیں یا شہر واپس جا چکی ہیں۔

کلیوپیٹرا:- (آنسو بہاتے ہوئے) میں واپس نہ جاؤں
گی۔ کسی کو میری پروا نہیں ہے۔

سیزر:- کلیوپیٹرا۔

کلیوپیٹرا:- تم چاہتے ہو کہ میں مار ڈالی جاؤں؟

سیزر:- میری بھولی لڑکی۔ (زیادہ سنجیدگی سے) اس
وقت یہاں تمھاری جان کی وقعت تمھارے
سوا۔ اور کسی کو نہیں ہے (اس امر سے شکستہ دل
ہو کر وہ نیچے گر پڑتی ہے۔ اور رونے لگتی ہے۔ یکایک بہت
دور بگل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور ایک شور بلند ہوتا
ہے۔) روفیو ادھر آؤ۔

کلیوپیٹرا:- (گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس سے چمٹتے ہوئے) سیزر
مجھے تنہا نہ چھوڑو (وہ اس کا دامن مضبوط پکڑ لیتی ہے۔)

بری ٹینس:- (فصیل کے اوپر سے) سیزر، ہم بری طرح
پھنس گئے، مصری مغربی ساحل کی طرف سے
ہمارے اور مورچے کے درمیان اتر آئے ہیں۔

روفیو:- (دیکھنے کو دوڑتا ہے) سچ ہے ہم ایک چوہے کی
طرح پھنس گئے ہیں۔

سیزر:- (نرمی سے) روفیو۔ روفیو۔ افسوس ہے۔ کہ
میں نے اپنے مورچہ کے آدمیوں کو مار ڈالا۔

روفیو:- (فصیل سے اتر کر سیزر کی دائیں جانب آکر) ہاں اور
یہ نتیجہ ہے؛ اس لڑکی کے ساتھ کھیلنے کا۔

اپالوڈورس:- فصیل کی طرف دیکھو سیزر۔

سیزر:- ہم نے دیکھ لیا۔ میرے دوست اب ہم کو یہاں
حفاظت کرنی چاہئے۔

اپالوڈورس:- میں نے سیڑھیوں کو سمندر میں پھینک
دیا ہے۔ وہ بغیر اس کے یہاں نہیں آسکتے۔

روفیو:- ہاں اور ہم باہر نہیں جا سکتے۔ کیا تم نے یہ بھی
سوچا تھا۔؟

اپالوڈورس:- کیوں نہیں جا سکتے؟ مشرقی بندر پر
جہاز موجود ہیں۔

بری ٹینس:- (امید افزا انداز سے) رہوڈیا کے جہاز
ہمارے لئے تیار کھڑے ہیں (سیزر فوراً بری ٹینس
کے پاس جا پہنچتا ہے)

روفیو:- (اپالوڈورس سے) اور یہ تو بتا کہ ہم ان جہازوں
تک کس راستے سے جائیں؟

اپالوڈورس:- اس سڑک سے جو ہر طرف جاتی ہے
(وہ اپنا کوٹ اور ٹوپی پھینک دیتا ہے اور تلوار کمر سے باندھ لیتا ہے)

روفیو:۔ تم کس کا ذکر کر رہے ہو؟

اپالوڈورس:۔ میں تم کو دکھاتا ہوں (بری ٹینس کو پکار کر) سب سے قریب جہاز یہاں سے کتنی دور ہے؟

بری ٹینس:۔ پچاس گز۔

سیزر:۔ نہیں۔ نہیں وہ بہت دور ہیں۔ کم سے کم ربع میل اپالوڈورس۔

اپالوڈورس:۔ خوب۔ تو جب تک میں تم کو اس جہاز سے ایک کشتی روانہ کردوں تم یہیں اپنی حفاظت کرتے ہو۔

روفیو:۔ تمھارے پر دار بازو ہیں شاید؟

اپالوڈورس:۔ ہاں، ہیں دیکھو! (سیزر اور بری ٹینس کے درمیان کی سیڑھیوں پر چڑھ کر فصیل کے کنارے پہنچ جاتا ہے۔ اور سر نیچا کر کے سمندر میں کود پڑتا ہے)

سیزر:۔ (ایک مدرسہ کے طالب علم کی طرح متعجب ہوکر) اوہو اوہو۔ (کوٹ اتار کر) زہرہ کی قسم میں بھی ایسا ہی کروں گا۔

روفیو:۔ (اسے پکڑ کر) تم دیوانے ہو۔ تم نہیں کر سکتے۔

سیزر:۔ کیوں نہیں کر سکتا۔ کیا میں اس کی طرح نہیں تیر سکتا؟

روفیو:۔ کیا ایک بڈھا ایک جوان کی طرح ہاتھ پاؤں مار کر تیر سکتا ہے؟ اس کی عمر صرف پچیس سال کی ہے۔ اور تمھاری پچاس برس کی۔

سیزر:۔ (بھڑکتے ہوئے) بڈھا۔!

بری ٹینس:۔ (حیرت زدہ ہوکر) روفیو۔ تم اپنے آپ کو بھول گئے ہو۔

سیزر:۔ روفیو۔ آؤ میں ایک ہفتہ کی تنخواہ کی شرط بدکر تمھارے ساتھ جہاز تک دوڑوں گا۔

کلیوپیٹرا:۔ لیکن میں۔ میرا کیا انجام ہوگا؟

سیزر:۔ میں تم کو ڈالفن مچھلی کی طرح اپنی پیٹھ پر لیجاؤں گا۔

روفیو:۔ جب تم مجھے سطح پر ابھرتے دیکھو تو اسے اندر ڈالنا پھر میں بتاؤں گا۔ تم دونوں۔

کلیوپیٹرا:۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں میں ڈوب جاؤں گی۔

بری ٹینس:۔ سیزر میں ایک آدمی ہوں، ایک برطانوی ہوں، مچھلی نہیں۔ مجھے کشتی کی ضرورت ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں تیر سکتا۔

کلیوپیٹرا:۔ اور نہ مجھے تیرنا آتا ہے۔

سیزر:۔ (بری ٹینس سے) تو پھر یہاں اکیلے ٹھیرو۔ جب تک کہ میں مینار پر دوبارہ قبضہ نہ کرلوں۔ تمکو فراموش نہ کروں گا۔ اچھا روفیو۔

روفیو:۔ کیا تم نے اس حماقت کی تکمیل کا ارادہ کرلیا ہے؟

سیزر:۔ ہاں اس کے سوا یہاں اور کیا کرنا ہے۔

(وہ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر کنارے پہونچ جاتا ہے)

بری ٹینس:۔ (بے صبری سے) سیزر صرف ایک آخری لفظ۔ جب تک تم اپنے کپڑے نہ تبدیل کرلو۔ اسکندریہ کے کسی حصہ میں سے نہ گذرنا۔

سیزر:۔ (سمندر کی طرف زور سے) اپالوڈورس (وہ آسمان پر سفیدی کی طرف اشارہ کرتا ہے)

اپالوڈورس:۔ کیا نیچے سبزہ برار غوانی رنگ ہے؟

سیزر:۔ (تعریف کرتے ہوئے) آہا۔ (وہ کود پڑتا ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (سیڑھیوں پر خوفزدہ ہوکر دوڑتے ہوئے) اوہ

جراثیم کی دنیا کا مطالعہ کیجئے تو عقل انسانی اور زیادہ حیرت زدہ رہ جاتی ہے کیونکہ بعض جراثیم ایسے ہیں جنکی عمر صرف بیس منٹ کی ہوتی ہے، لیکن اس کے بعد وہ پھر زیادہ تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر فنا ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک برابر جاری رہتا ہے۔ جب تک ایک معتدل درجہ حرارت کا ان کی پیدائش کے لئے باقی رہتا ہے۔ پھر کیا آپ اندازہ کرسکتے ہیں۔ کہ اگر ایک پیالی خراب دودھ کی پانچ دن تک رہنے دی جائے تو اس میں کتنے جراثیم پیدا ہوجاتے ہیں کہ اگر اُن سے ایک غلاف طیار کیا جائے تو کرۂ زمین سے زیادہ بڑے کرّے کو ڈھکنے کے بعد بھی بچ رہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب آپ اس خراب دودھ کو زمین پر پھینک دیتے ہیں تو جراثیم فنا ہوجاتے ہیں اور دس ارب جراثیم میں سے کوئی ایک جرثومہ باقی رہ جاتا ہے جو پھر رفتہ رفتہ اپنی نسل کو اسی طرح بڑھا لیتا ہے اور پھر قدرت اسے فنا کردیتی ہے۔
لیکن اسی کے ساتھ یہ منظر بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ جوں جوں، نباتات وحیوانات میں ترقی ہوتی جاتی ہے ان کی پیداوار بھی گھٹتی جاتی ہے۔ تاریخ انسانی کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک وہ وحشی وغیر متمدن رہا۔ اولاد کثرت سے ہوتی اور مرتی رہی، لیکن رفتہ رفتہ تہذیب وتمدن کے ساتھ ولادت ووفات، دونوں میں کمی پیدا ہونے لگی۔

ترقی یافتہ حیوانات میں آپ ہاتھی کو دیکھئے کہ عمر بھر میں اس کے چند ہی بچے ہوتے ہیں۔ لیکن ماں باپ دونوں ان کی اتنی حفاظت کرتے ہیں کہ مرنے نہیں دیتے۔ بعض نیچے درجہ کے حیوانات میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ پانی کا ایک کیڑا ہے جسے نیرتیس کہتے ہیں۔ یہ سال میں صرف چند انڈے دیتا ہے لیکن اپنی اور انڈوں کی حفاظت کے لئے ایک نلکی سی طیار کرلیتا ہے۔ اور ہر وقت اپنی دُم کو حرکت دیتا رہتا ہے تاکہ پانی کی کافی مقدار اندر آتی رہے۔ اور انڈے خراب نہ ہونے پائیں۔ کھٹمل کو دیکھئے کہ کیسے محفوظ مقامات میں انڈے دیتا ہے اور چھپنے میں کیسی مہارت رکھتا ہے۔
اسی طرح بعض نباتات کی حفاظت کا بھی انتظام قدرت نے کیا ہے۔ چنانچہ کوکو ا درخت کے بیج کو دیکھئے۔ کہ اس کے اوپری خول کے نیچے ہوا بھری ہوتی ہے اور وہ اس کو عرصہ تک خراب نہیں ہونے دیتی۔ یہ درخت اکثر ساحلوں پر ہوتا ہے اس لئے جب اس کے تخم گر گر کر سمندر یا دریا میں پہونچ جاتے ہیں تو یہی خول حفاظت کرتا ہے۔ اور تخم کو سڑنے نہیں دیتا۔ پھر جب پانی کی موجیں اسے کسی اور ساحل پر پہونچا دیتی ہیں تو یہ ہفتوں بلکہ مہینوں تک اسی طرح پڑا رہتا ہے۔ اور خول کی سختی کی وجہ سے اسے کوئی جانور کھاتا نہیں، پھر رفتہ رفتہ زمین کے اندر پہونچ کر اس کا خول پھٹتا ہے اور درخت نمودار ہوتا ہے۔
ایک اور درخت ورباسکم ہے جو سال میں سات لاکھ بیج پیدا کرتا ہے اور جن میں سے ۲ لاکھ بیج نشوونما کی صلاحیت رکھتے ہیں جنھیں ہوا اطراف عالم میں اُڑا کرلے جاتی ہے، لیکن ان میں سے صرف سو تو اُگتے ہیں باقی فنا ہوجاتے ہیں۔ پھر جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے یہ نسبت اور کم ہوتی جاتی ہے حتّٰی کہ چند سال کے بعد صرف ایک یا دو تخم ایسے

پائے جاتے ہیں جو بار آور ہوتے ہیں ورنہ سب فنا ہو جاتے ہیں۔

تاریخ حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بہت سے درخت یوں ہی رفتہ رفتہ فنا ہو جاتے ہیں، اسی طرح بہت سے جانور بھی صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ چنانچہ دنیاسور جانور جو کسی وقت لاکھوں کی تعداد میں پایا جاتا تھا۔ اب اس کا کہیں وجود نہیں ہے۔ اور کسی کسی مقام پر اس کے صرف ڈھانچے یا برف کے نیچے دبے ہوئے انڈے نظر آجاتے ہیں۔ اس وقت کے جانوروں میں چیتا کی نسل بھی کم ہوتی جارہی ہے۔ اور بہت جلد یہ بھی صفحۂ ہستی سے محو ہو جائے گا۔

قدرت کے اسی اصول پر نگاہ کرکے بعض علماء نے یہ نظریہ بھی قائم کیا ہے کہ جس طرح نباتات وحیوانات کی بہت سی نسلیں فنا ہو گئیں اور ہوتی جارہی ہیں۔ اسی طرح موجودہ انسان کی نسل بھی محو ہو جائے گی۔ اور ایک وقت آئیگا۔ جب مستقبل کی فضائی مخلوق انسان کے ڈھانچوں کو بھی زیر زمیں دیکھ کر کہا کرے گی کہ یہ بھی کیسا بھیانک جانور تھا۔ اور غالب کے اس مصرعہ کا دُھرانے والا کوئی نہ ہوگا کہ

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا کے امن وسکون کا راستہ معلوم کریں تو اسکو ملاحظہ فرمائیے۔

مادئین کا مذہب

وجود باری کے ثبوت میں بے مثل مضمون

حرکت کے کرشمے

اگر آپ قدرت کے کرشموں کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے ملاحظہ فرمائیں تینوں ایک ہی جلد میں قیمت معہ محصول ۸

مینیجر نگار لکھنؤ

یوروپ کا فطری انسان

اور

حوا کی بیٹیوں کی خلد فروش عریانیاں

"نوجوان لڑکیوں کے گورے گورے سڈول بدن کو بالکل عریاں دیکھنا،

ایک ایسی لذت ہے، جس میں دماغ و نگاہ دونوں برابر کے شریک ہیں"

اقتصادی دشواریاں کتنی ہی بڑھ جائیں، جنسی آزادیاں خواہ کسی حد تک وسیع ہو جائیں، لیکن یہ بات ذہن انسانی کبھی نہیں آسکتی تھی کہ یوروپ کا انسان جو تصنعات کا پتلا اور یوروپ کی عورت جو اسباب آرایش و زیبایش کی پرستار ہی، ی وقت تکلفات زندگی سے اس درجہ بیزار ہو جائے گی۔ کہ جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی اسے گوارہ نہ ہوگا۔ یقیناً یہ نتیجہ طِرزاکت کا نہیں ہے بلکہ کرشمہ ہے اس نظام قدرت کا جو ایک بار ماضی کو بھی گردش میں لاکر حال بنائے بغیر نہیں چھوڑتا۔

انسان کے عریاں پھرنے کا زمانہ وہ ہے جسے ہم "عہد قبل تاریخ" سے تعبیر کرتے ہیں، جب وہ کچا گوشت کھاتا تھا، جنگلوں میں آزاد پھرتا تھا، چوپایوں کی طرح دوڑتا پھرتا تھا ——— لیکن آج دنیا کے روشن ترین عہد کو بھی آخر کار اسی عہد تاریک کا سہارا لینا پڑا۔ اور انسان کی فطری خواہشوں نے اُسے نہ صرف ملبوس سے بے نیاز کر دیا بلکہ مختلف اروں سے یہ آوازیں بھی آنے لگیں کہ انسان کو غلہ و گوشت خام حالت ہی میں کھانا چاہیئے۔ اور قیام صحت کے لئے جانور کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں ٹیک کر روزانہ کچھ دیر چلنا ازبس ضروری ہے۔

اس سے قبل نگار میں بعض مقالات مغرب فلسفۂ "عریانیات" پر شایع ہو چکے ہیں۔ اس لئے آج کی صحبت میں یہ ناغالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ یوروپ میں یہ ذوق اس درجہ عام ہوتا جا رہا ہے کہ گزشتہ دو سال کے اندر لاکھوں ہیوں نے اپنے کپڑے اتار پھینکے اور اسی حمام میں داخل ہو گئے جہاں سے "آدم و حوا" ابتداء آفرینش کے زمانہ میں اہوئے تھے۔

خیال کیجئے کہ اگر کسی جگہ لاکھوں سیمیں تن، نازک کمر۔ اور بقول غالب۔ "قیامت قامتاں، مژگاں درازاں" کا

ہجوم ہو، اس حال میں کہ نہ ان کا چہرہ رہینِ غازہ ہے، نہ گیسو منت کشِ شانہ، نہ کوئی ہیکل زیبِ گلو ہے نہ کوئی چوڑی رنجۂ ساعد ہیں۔ جسم پر کپڑے کا ایک تار نہیں، سرکشِ شباب کے سامنے کوئی حجاب نہیں ——— واقعی خیال کیجئے کہ اگر ایسا ہو تو کوئی کیا کرے، دل و دماغ کی کیا کیفیت ہو، نگاہ کی گستاخیوں کا کیا عالم ہو ——— یہ ہم اس وقت یہاں سرزمین مشرق پر سوچ رہے ہیں۔ جہاں عورتوں کو عام طور سے "مستورات" ہی کہتے ہیں اور حجاب و نقاب نے عورت کو "جلوۂ کوہِ طور" بنا رکھا ہے، لیکن مغرب کی دنیا میں جہاں کی ہر خلوتِ راز ایک "انجمن برملا" کا حکم رکھتی ہے، یہ خیال کوئی معنی رکھتا ہی نہیں اور یہی سبب ہے کہ وہاں مرد و عورت کا لباس اتار کر پھینک دینا گویا ایک لحاظ سے صرف پردۂ مجاز کو ہٹا دینا ہے۔

غالباً آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ جرمنی میں اس وقت ۳ لاکھ مہذب و شائستہ پڑھے لکھے انسان بالکل ننگے رہتے ہیں اور اگر ان کے تمام اعوان و انصار کو جو تمام قرب و جوار کے ممالک یوروپ میں پائے جاتے ہیں ان میں شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد ایک کرور سے کم نہیں ہوتی۔ الغرض یہ تحریک یوروپ میں رفتہ رفتہ نہایت قوی ہوتی جا رہی ہے۔ اور اگر کہیں ایک جنگ اور ہو جائے تو پھر دفعتہً تمام یوروپ کا ننگا ہو جانا بالکل یقینی ہے۔ جرمنی میں سب سے پہلے اس تحریک کا سبب یہی ہوا کہ گزشتہ جنگ میں سب سے زیادہ وہی متاثر ہوا تھا اور اقتصادی دشواریوں نے منجملہ دیگر تغیرات معیشت و معاشرت کے اس تغیر کو بھی پیشِ نظر کر دیا۔ پھر چونکہ اس میں خیال حفظانِ صحت کا بھی شامل تھا۔ اور مختلف ماہرین فن نے کھلی ہوئی فضا کی کھلی ہوئی شعاعوں سے مختلف امراض کا علاج بھی شروع کر دیا تھا۔ اس لئے ایک اور قوی محرک شامل ہو گیا، یہاں تک کہ جرمنی میں اب ایک مستقل کالونی انھیں ننگوں کی قائم ہو گئی اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو عہدِ وحشت کی یاد نہ دلاتا ہو۔

لطہ میں یہی گفتگو کر رہا تھا کہ میرے ایک دوست نے جو بے موقع اشعار پڑھ دینے میں یدطولےٰ رکھتے ہیں: یہ سنکر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور فرمایا کہ "یہ نہ پوچھو کہ کیا ہو۔ آہ

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے۔

یار شہ بخیر بے محل اشعار پڑھنے میں نواب محمد اسحاق خاں مرحوم بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے ایک واقعہ سنئے:۔ علیگڈھ میں آپ سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور ہر ہر شعبہ پر آپ کی نگاہ ہے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مطبخ کا انتظام غیر معمولی طور پر خراب ہو گیا اور لڑکوں نے جا کر شکایت کی کہ کسی دن ڈائننگ ہال میں تو آ کر ملاحظہ فرمائے کہ چپاتیاں کسقدر حسین پک کر آتی ہیں۔ نواب صاحب یہ سن کر دوسرے دن عین کھانے کے وقت پہونچ گئے۔ دیکھا تو واقعی چپاتیاں نہایت خراب تھیں۔ آپنے فوراً داروغۂ مطبخ کو طلب کیا اور پوچھا کہ اسکا کیا سبب ہے۔ اسنے مختلف عذرات پیش کرنے شروع کئے۔ نواب صاحب نے روک کر کہا کہ "داروغہ صاحب، فضول باتیں نہ بنائیے، مجھے سارا حال معلوم ہے۔ رات کا خواب الٰہی توبہ آپ سنیگا تو شرمائیے گا" (دنیاز)

ہمبرگ میں ایک باغ انھیں کے لئے مخصوص ہے جہاں مدارس کے طلبہ بالکل ننگے کھیل کود میں معروف نظر آتے ہیں برلن میں ایک ورزش گاہ ایسی ہے جہاں لوگوں کو ریاضت جسمانی کے تماشے مفت دکھائے جاتے ہیں۔ یہیں دو حوض ایسے ہیں جو انھیں ننگوں کے لئے مخصوص ہیں۔ اسی طرح بحر شمالی جزیرۂ سلیٹ میں عام اجازت ہے کہ جس کا جی چاہے ننگا پھرے۔

حال ہی میں امریکہ کے دو سیاحوں نے ایک کتاب شایع کی ہے جس کا نام ہے "ننگوں کے درمیان" اس کتاب میں انھوں نے جرمنی کے تمام شمالی حصہ کا دورہ کرکے بعض بہت دلچسپ حالات قلمبند کئے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"جس وقت ہملوگ بھی اپنے کپڑے اتار کر آگے بڑھے تو ہمیں شرم سی تو ضرور معلوم ہوتی تھی لیکن دھوپ میں ننگے بدن پر جو ہوا لگتی تھی وہ نہایت خوشگوار تھی۔ ان لوگوں نے ہماری حد درجہ محبت کے ساتھ پذیرائی کی اور یہ دیکھ کر کہ ان میں سے کسی کی نگاہ ہمارے عریاں جسم پر تجسس نہ پڑتی تھی، یک گونہ سکون سا ہم کو حاصل ہوا، لیکن ہم مشکل سے اپنی نگاہوں کی جستجو کو چھپا سکے جو سیکڑوں نوجوان لڑکیوں کی عریانی کو اپنا ہدف بنائے ہوئے تھی"

ان سیاحوں نے بیان کیا ہے کہ " اس عریاں کالونی کے رہنے والے نہایت صحیح و توانا اور اچھے دل و دماغ کے ہیں۔ انکی بیویاں، لڑکیاں، بچے اور بوڑھے سب نہایت ہی مسرور زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور آپس میں شادی بیاہ بھی اسی عریاں سادگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہمارے دوران قیام میں ایک دن ہمبرگ کا ایک دولتمند شخص مع اپنی بیوی کے یہاں آیا جو نہایت قیمتی لباس اور زیور سے آراستہ تھی، وہ یہاں آکر ایک ہوٹل میں ٹھیرے، تھوڑی دیر کے بعد جب وہاں سے نکلے تو پہچاننا دشوار ہوگیا کیونکہ دونوں ننگے تھے۔ اور حد درجہ مسرور نظر آتے تھے

اس میں شک نہیں کہ سوائے جرمنی کے یوروپ کے دیگر ممالک میں ابھی تک عملاً اس آزادی کا رواج نہیں ہوا۔ لیکن فکر و احساس کے لحاظ سے یہ لہر ہر جگہ دوڑ گئی ہے۔ اور وہ وقت یقیناً آنے والا ہے۔ جب سرزمین مغرب میں ہر عورت کا جسم عریاں طلوع آفتاب کا منظر ہو کر رہ جائے گا۔ خود جرمنی میں بھی اوّل اوّل جب ایک عریاں عورت ہوٹل میں داخل ہوئی تو پولیس نے اس کی مزاحمت کی تھی، لیکن آج خود حکومت کی طرف سے اسی حوا کی بیٹی کے لئے وہ تمام انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ جو اس کے ذوق عریانی کو تسکین پہونچانے والے ہوں۔

مشرقی ممالک میں بھی مغربی تہذیب بڑی وسعت و قوت کے ساتھ پھیل رہی ہے، یہاں تک کہ سرزمین عرب میں بھی جو انبیا، ورسل کا مہبط رہا ہے۔ بہت سی لڑکیوں کے گیسو "تا بناگوش" سے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔

ہندوستان کی عورت میں جو ذہنی انقلاب پیدا ہوا ہے وہ بھی اپنے اندر سخت اضطراب انگیز مستقبل چھپائے ہوئے ہے۔ اور کسے خبر ہے کہ حکومت مغرب کے برکات دو تین نسلوں کے بعد یہاں کی عورت کو کیا سے کیا بنا دینے والے ہیں اس لئے اس وقت ہندوستان میں کسی کا یہ سوال کرنا کہ پردہ و تعلیم عورت کے لئے ضروری ہے یا نہیں بالکل ایسا ہی سوال ہے۔ جیسے کمان سے تیر جدا ہونے کے بعد یہ پوچھا جائے کہ تیر چلایا جائے یا نہیں۔ بلکہ اب تو اس سوال کا وقت ہے کہ مرد کو

پنی وفاداری کا امتحان دینے کے لئے بچوں کو دودھ پلانے اور چولھے پر جا کر روٹیاں پکانے کی خدمت کس طرح انجام دینا پڑے گی۔

تاریخ سلطنۃ انسانی کے لحاظ سے دنیا پر مختلف دَور گزر چکے ہیں، سب سے پہلا دَور نظام امتالی کا تھا۔ جب عورت مرد پر حکومت کرتی تھی، اس کے بعد نظام بطریق پھیلا۔ جب مرد برسر اقتدار ہوا، اور دنیا کا کوئی ظلم ایسا نہ تھا۔ جو اس نے عورت پر نہ توڑا ہو۔ اب خدا جانے کتنی صدیوں کے بعد پھر وہی اوّلین دور آ رہا ہے۔ اور عورت کا اقتدار بڑھتا جا رہا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ایک طرف علمی دور کے لحاظ سے تو یہ زمانہ "برق و نور" کا سمجھا جائے۔ اور جنسی حیثیت سے عورت کی حکومت کو قبول نہ کیا جائے۔ جو اگر برق و نور نہیں تو "زائیدۂ برق و نور" ضرور ہے۔

کاجل۔ سرمہ۔ چورن۔ منجن

(اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کرکے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے) دوسری تازہ سند ملاحظہ:۔ سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا۔ ایک شیشی اور بھیجدیجئے۔ (سید رضا، نزیر سو بنتھ۔ یوت محل)

کاجل ۔ آشوب، سرخی، ضعف بصارت کے لئے از بس مفید ہے ایک ڈبیہ کی قیمت ایک روپیہ عہ (علاوہ محصول)

سرمہ ۔ یہ بیش بہا سرمہ ۴۰ دن میں جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے۔ جالا۔ دھند۔ موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ اور بارہا آزمایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیا (عہ) علاوہ محصول

چورن۔ یہ وہ اکسیری چیز ہے جسکا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد۔ قبض۔ نفخ و ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم دستوں کا آنا۔ یک لخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبیہ ۸ تولہ (عہ) علاوہ محصول

منجن۔ اس کی ادنےٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبیہ ۸ تولہ (عہ) علاوہ محصول

نوٹ:۔ سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف۔

م بیگم۔ ذریعہ دفتر نگار لکھنؤ

ایک نہلسٹ کی زندگی کے کچھ واقعات

شہاب نے اُسترا میز پر رکھ کر اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا " واقعہ یہ ہے کہ داڑھی مونڈنا بھی عجیب لذت ہے " اس کی آنکھوں سے اطمینان برس رہا تھا، چہرہ پر عجیب قسم کی شگفتگی تھی اور آنکھوں میں ہلکا سا تبسم ــــ اس نے یہ کہہ کر ایک وقفہ کی خاموشی کے بعد میز سے اُسترا وغیرہ بکس میں رکھا۔ اور سامنے کی کرسی پر نسیم کی طرف مستفسرانہ انداز سے دیکھ کر غالبؔ کا یہ شعر گنگناتے ہوئے۔

برلب یا علی سرے بادہ روانہ کردہ ایم
مشرب حق گزیدہ ایم عیش مغنانہ کردہ ایم

کہا۔ " فرمائیے نسیم صاحب کیسا مزاج ہے " ــــــــ

شہاب کی عمر ۴۰ سے متجاوز ہو چکی تھی اور ہر چند زمانہ نے اُسے کبھی " لطف فراغ " سے آشنا نہ کیا تھا، لیکن اس کے چہرہ کے اعصاب سے کسی کو یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ " تنازع للبقا " میں اس کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ابھی تک اس کے خدو خال میں کافی نرمی پائی جاتی تھی۔ اور یبوست، جو ایک زمانہ کی شکایت کرنے والے کے چہرہ پر بالعموم پیدا ہو جاتی ہے، اس میں بہت کم پیدا ہوئی تھی۔ دنیا اس کی صحت پر تعجب کرتی تھی۔ اور سمجھتی تھی کہ وہ یقیناً کافی مالدار ہے۔ لیکن اس کا اصل راز تھا۔ جسے وہ بارہا ان الفاظ میں ظاہر کر چکا تھا۔ کہ " افلاس نام مادی مجبوری کا نہیں بلکہ قلب وضمیر کی مجبوری کا ہے۔ وہ بے انتہا آزاد خیال، حد درجہ آزاد مشرب تھا اور ایک چیز کا مطالعہ، فطرت کے اس نقطۂ نظر سے کیا کرتا تھا۔ جب وہ طلوع آفتاب میں محو ہو " غروب " کے باب میں وہ اس کا ہم آہنگ کبھی نہ ہوتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ فطرت سے زیادہ بے حس اور سنگدل کوئی چیز نہیں، اس لئے اس کا مقابلہ بھی اسی بے حسی سے کرنا چاہئے۔ قدرت کا بڑا حربہ افلاس میں مبتلا کرنا ہے یا پھر بیماریوں میں مبتلا کر کے مار ڈالنا، پھر اگر یہ اس کا انتقام ہے تو برارت کرنا ناگزیر۔ اور اگر کوئی درس ہے تو اس بیداد کے خلاف احتجاج کی صورت یہی ہے کہ اس درس کو رد کر دیا جائے اور گدایانہ گریہ وزاری سے انسانی خودداری کو صدمہ نہ پہونچایا جائے۔ ایک امیر کے سامنے کمر بستہ جھکنے والے وہی ہیں جن کے پیٹ نہیں بلکہ دل بھوکے ہیں جس کو " آن " کی فکر نہیں وہ " آنداتا " کا محتاج کیوں ہو ــــ الغرض شہاب عجیب وغریب اصول کا انسان تھا۔ اور اپنے اعتقاد کے لحاظ سے وہ عرف عام میں ایسے سخت " کفر والحاد " کا مبلغ تھا کہ مشکل ہی سے دنیا میں ایسی مثالیں ملتی ہیں۔

نسیم نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ " مزاج کا حال نہ پوچھئے، کاروبار کی خرابی سے اب تو آبرو سنبھالنا بھی مشکل ہے۔"

نسیم، شہاب کے دوستوں میں سب سے زیادہ نوجوان دوست تھا۔ اور شہاب کے اصول و عقاید سے ہر چند اس کو بالکل اتفاق تو نہ تھا۔ لیکن ایک حد تک اس سے مرعوب ضرور تھا۔ وہ کبھی کبھی اس کے پاس ضرور آتا۔ کیونکہ اوّل تو اس کے بعض مشورے بہت صائب ہوا کرتے تھے۔ اور جو امداد اس کے امکان میں ہوتی اس سے کبھی دریغ نہ کرتا۔ دوسرے یہ کہ نسیم ایک حد تک "نہلسٹ" خیال کا انسان تھا۔ اور شہاب کی گفتگو سے اسے بہت کچھ مواد اپنے اس عقیدہ کی پختگی کے لئے مل جایا کرتا تھا۔

شہاب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ " آبرو؟ یعنی زندگی و معاشرت کے ایک خاص معیار کو قائم رکھنا۔"

نسیم۔ " ہاں، اور کیا؟"

شہاب۔" لیکن یہ معیار تو آپ نے خود ہی قائم کیا ہے، اس لئے آپ اسے بدل بھی سکتے ہیں "

نسیم۔ " یہ صحیح ہے، مگر جس چیز کا انسان عادی ہو جائے اس کا ترک کسقدر دشوار ہوتا ہے، پھر شماتت ہمسایہ الگ!"

شہاب۔ " ہاں، یہی حال مذہب والوں کا بھی ہے کہ " شماتت ہمسایہ " کا خیال بہت سی نہ سمجھ میں آنے والی باتوں پر ان کو قایم کئے ہوئے ہے۔ مگر تم تو شاید نہلسٹ اعتقاد کے انسان ہو؟"

نسیم۔ " ہاں، ہوں تو، مگر اس سے اس کو کیا تعلق؟"

شہاب۔ " خوب، سچا نہلسٹ تو وہی ہے جو سب سے پہلے اپنے خیال و اعتقاد کے خلاف بغاوت کرے۔ نہلسٹ ہونا بُت شکن ہونا ہے، پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ اپنے دل و دماغ میں بسنے والے بتوں کو تو برقرار رکھیں اور دوسروں کے بتوں کے سامنے " تیشۂ ابراہیمی " لے کر کھڑے ہو جائیں۔"

نسیم۔ " اچھا تو بتائیے اس سوسائٹی کے بُت کو کیسے توڑا جائے، جس کے اصول کی پابندی نے اس قدر پریشان کر رکھا ہے۔"

شہاب۔ " معاف کیجئے ابھی ہندوستان نے اتنی ترقی نہیں کی کہ سوسائٹی کا کوئی بت قائم ہوگیا ہو۔ یہاں جس چیز کا نام سوسائٹی رکھا گیا ہے، میں اسے حماقت و بزدلی کہتا ہوں۔"

نسیم۔ " یعنی؟"

شہاب۔ " میں یعنی وعنی کچھ نہیں جانتا۔ مجھے تو صرف اس قدر معلوم ہے کہ جب تک جسم میں ایک لنگوٹی باندھے۔ اور دو دو دن کا فاقہ کرنے کے بعد بھی زندہ رہنے کا مقدور باقی ہے، جیئے جائیے اور چلتے پھرتے رہیے۔"

نسیم۔ " مگر دنیا ہنسے گی نہیں "

شہاب۔ " آپ اس سے زیادہ ہنسئے۔ آپ کو کس نے باز رکھا ہے۔"

نسیم۔ "اور اگر اس طرح زندہ رہنے کا بھی مقدور نہ ہو تو ؟"

شہاب۔ "یہ کون سی بڑی بات ہے مر جائیے۔ آپ کے مرنے سے دنیا کو کونسا ایسا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ کہ وہ آپ کے لئے ہائے وائے کرتی پھرے گی۔"

نسیم۔ "شہاب صاحب، انسان تنہا ہو تو سب کچھ کر سکتا ہے، علائق سے کس طرح جُدا ہو، بیوی بچوں کو کیا کرے"

شہاب۔ "اچھا کوئی اور ذکر کیجئے۔ اب آپ وہی تیسرے درجہ کے آدمیوں کی باتیں کرنے لگے۔"

نسیم۔ "میں ہوں ہی تیسرے درجہ کا آدمی، پھر باتیں کیوں نہ ویسی کروں۔"

شہاب۔ "ہوش میں آؤ، جب تم مر گئے تو پھر تمھیں کیا فکر کہ تمھارے پسماندگاں کس طرح زندگی بسر کریں گے، زندگی نام ہے اس فصل کا جو ایک عدم کے کنارے سے لے کر دوسرے عدم کے کنارے تک پایا جاتا ہے۔ قطرہ اسی وقت تک قطرہ ہے جب تک دریا سے نہیں ملا۔ علائق کے خیال سے مرنے میں ضرور تھوڑی سی تکلیف ہو سکتی ہے، سو یہ چند لمحوں کی بات ہے، اس کے لئے ساری زندگی خراب کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ تم تو ایک حد تک مذہبی انسان بھی ہو اس لئے تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ

"روئے کشادہ باید وپیشانی فراخ ہا آنجا کہ لطمۂ زید اللہ می زنند"

یہ کہہ کر اس نے سامنے کی الماری سے ایک شیشہ نکالا اور ایک گلاس میں تھوڑی سی شراب ڈال کر سوڈے کی بوتل کھولی اور گلاس لبریز کر کے اسے غور سے دیکھنے لگا ——— "نسیم، دیکھتے ہو ان چھوٹے چھوٹے بلبلوں کو جو شہاب ثاقب کی طرح نیچے سے اوپر کی طرف بیتابانہ دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک معمولی انسانی زندگی کا بھی بالکل یہی فلسفہ ہے۔ ایک بے اختیارانہ صعود، ایک مضطربانہ اقدام، ایک والہانہ استعلاء اور ایک مجنونانہ تگ ودو ——— یہ ایک لمحہ کا بقا بلبلوں کی ساری عمر پر حاوی ہے۔ درانحالیکہ ہماری ایک نگاہ بھی پوری طرح اس سے آسودہ نہیں ہوتی۔ اگر خدا اتنا ہی اہم ہے، اتنا ہی ذوالجلال ہے جتنا تم کہتے ہو، تو اس کے نزدیک نہ صرف انسان کی عارضی زندگی، بلکہ ساری کائنات کی ابدیت (اگر واقعی اس لفظ کا کوئی مفہوم ہے) کو ان بلبلوں سے بھی زیادہ غیر اہم و ناقابل لحاظ ہونا چاہیئے۔ غالب کا یہ شعر تم نے سنا ہے :-

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

حیرت ہے کہ شاعر ہو کر تم غالب کے اس طعن سے بے خبر ہو۔ درانحالیکہ مذہب و شعر دونوں کی جان یہی عقائد و اعتراف ہے، اور یہی وہ کشش ہے جو مایوسی سے ڈرنے والوں کو معاد و آخرت کے یقین کی طرف متوجہ کر دیتی ہے ——— سچ ہے ملحد و بے دین ہونا بھی بڑے کلیجہ والوں کا کام ہے۔ (اب اس کی کیفیت

بڑھتی جاتی تھی) ——— حور و قصور کی طمع میں ہلاک ہو جانا اور بغیر کسی خیال مزد و اجرت کے جان سے گزر جانا
کیا ان دونوں کے فرق کو تم محسوس نہیں کر سکتے ہو'

نسیم۔ "میں کر سکتا ہوں اگر کسی حد تک انسانیت سے گزر جاؤں"

شہاب۔ "(دوسرا جرعہ لیتے ہوئے) کیا انسانیت سے گزر جانا انسانی زندگی کی کوئی بڑی بدبختی ہے جس سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ انسان جب تک انسان ہے یعنی جب تک سوسائٹی میں وہ صرف انسان رہ کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ ہنوز گہوارہ میں ہے۔ اس کا عنفوان شباب اس وقت شروع ہوتا ہے جب اس قید و بند سے آزاد ہونے کی خواہش اس میں پیدا ہوتی ہے۔ اور سن و قوت تک پہونچتے پہونچتے تو وہ اس جگہ ہوتا ہے جسے شاعرانہ زبان میں" ماوراء سرحد ادراک" کہتے ہیں۔ انسان، انسان ہی اس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ انسانیت سے گزر جائے، مذہبیت و اخلاق سے گزر جائے۔ تمدن و تہذیب سے گزر جائے بلکہ حدود الوہیت سے بھی گزر کر وہاں پہونچ جائے۔ جہاں ازل و ابد نام ہے صرف ایک" نگاہ غلط انداز"

(باقی)

ایک ارزاں سودا

خواب و خیال	۱۲ر	ان سب کتابوں کی مجموعی قیمت علاوہ محصول		فراست الید	۱۰ر
عرب اور اسکا مستقبل	۱۲ر	۱۹ روپے ۵ آنے ہے۔ لیکن یہ سب کتابیں ایک ساتھ		انتخاب گلابی اردو	۸ر
زہر عشق	۱۲ر			مذاکرات نیاز	۱۲ر
شاعر کا انجام	۱۱ر	طلب کرنے میں آپ کو علاوہ محصول ۱۰ روپے میں		فلاسفۂ قدیم	۱۲ر
تحویہار	۱۲ر			جذبات بھاشا	۱۲ر
بحر تبسم	۱۲ر	مل سکتی ہیں۔ ہر آرڈر کے ساتھ چوتھائی قیمت آنا		نقاب اٹھ جانے کے بعد	۵ر
فلسفۂ مذہب	۱۰ر			لالہ رخ	۱۰ر
موج تبسم	۱۲ر	ضروری ہے۔		فراست التحریر مکمل	۱۰ر
تذکرۂ تند گل	۱۲ر	منیجر نگار لکھنؤ			

میری طرح

کس کی تخلیق میں ہے رنگِ فنا میری طرح کون ہے بسملِ پیکانِ قضا میری طرح

کون ہے میری طرح پیکرِ اندوہِ طلب کس کی تصویر میں ہے رنگِ دعا میری طرح

کون اتنا ہے ترے حُسنِ کرم پر نازاں کون ہے سرخوشِ صہبائے غنا میری طرح

کون ہے میری طرح خستۂ اندوہِ وفا جرمِ الفت کی ملی کس کو سزا میری طرح

خاک، ناکامیٔ پیہم نے بنایا کس کو کون بربادِ رہِ عشق ہوا میری طرح

عرصۂ دہر میں ہے کون اسیرِ ہستی خستۂ کشمکشِ بیم و رجا میری طرح

موت کس کو نظر آتی ہے حیاتِ جاوید کون بیمار ہے بیزارِ شفا میری طرح

کیوں زمانہ مری حیرت پہ ہے انگشت نما کوئی دیکھے تو سہی اس کو ذرا میری طرح

کم نہیں حسنِ ستم لطفِ کرم سے کوکبؔ
کوئی پیدا تو کرے ذوقِ وفا میری طرح

کوکبؔ شاہجہانپوری

امید کی کشتی

نا اُمیدی کے تند دھارے پر   اپنی تقدیر کے سہارے پر
تیز موجوں میں ڈگمگاتی ہوئی   خوفِ طوفاں سے تھرتھراتی ہوئی

بہہ رہی ہے امید کی کشتی

یاس وحرماں کے چھائے ہیں بادل   غرق کرنے کو آئے ہیں بادل
کوئی تدبیر چل نہیں سکتی   یعنی تقدیر ٹل نہیں سکتی
ڈوب مرنے کا کچھ ملال نہیں   پار اترنے کا بھی خیال نہیں
کاش! ساحل تو دیکھ لیتا مَیں   اپنی منزل تو دیکھ لیتا مَیں

تند موجوں نے گھیر کر آخر   سامنے دریا میں پھیر کر آخر
دامِ گرداب میں پھنسا ہی دیا   موت کا راستہ دکھا ہی دیا
آہ! دریا میں غرق ہوتی ہے   یاس اُمید کو ڈبوتی ہے

میرے اللہ مجھے بچا لینا
پنجۂ موت سے چھڑا لینا

باقی صدیقی (سہام)
راولپنڈی

معلومات

تاریخ عالم میں سب سے بڑا جھوٹا انسان یوں تو جھوٹے ہر زمانہ اور ہر ملک میں پائے گئے ہیں اور دنیا کے بہت سے مشہور لوگوں نے جھوٹ ہی کی بدولت شہرت و عظمت حاصل کی ہے، لیکن ان لوگوں کے جھوٹ محدود تھے اور آخر کار کھل کر رہے لیکن تاریخ کے صفحات میں ایک ایسا کذاب اعظم بھی نظر آتا ہے جسکا مثل نہ اس سے قبل کبھی پیدا ہوا۔ اور نہ آئندہ توقع ہے۔ اسکا جھوٹ ایک ایسا جھوٹ تھا جو اپنے بعد نہ مٹنے والے نقوش و آثار چھوڑ گیا ہے۔ اور اسی کے بدولت وہ زبردست مشہور مورخین میں شمار ہونے لگا۔

اس کا اصل نام تو کسی کو معلوم نہیں لیکن وہ نام جس سے وہ مشہور ہوا۔ جارج بسالما نازار تھا۔ یہ نام جو آشوریہ کے بادشاہوں کی وضع کا ہے خود اسنے اپنے لئے گھڑا تھا۔ اور اسی نام سے وہ ہمیشہ پہچانا گیا ——— ۱۶۷۹ء میں فرانس کے ایک قصبہ میں یہ شخص پیدا ہوا۔ اس قصبہ کا نام لانجدوک ہے جو یوروپ بھر میں کذب کی وجہ سے مشہور ہے اور یہاں کے لوگ اسپر فخر کرتے ہیں کہ دنیا میں انسے بہتر جھوٹ کوئی نہیں بول سکتا۔

ہمارے ہیرو کی عمر چھ سال کی تھی جب وہ مدرسہ میں داخل ہوا۔ اس کا باپ بیوی بچوں کو چھوڑ کر جرمنی چلا گیا تھا اور اسکی ماں حد درجہ عسرت میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ چند سال کے بعد ماں نے اس کو مرسلیا بھیجدیا تاکہ وہاں مذہبی تعلیم حاصل کرکے راہبانہ زندگی اختیار کرے۔ مگر چونکہ یہ شہرت کا طالب تھا اسلئے وہ یہاں سے چلا گیا اور شہر افینون کے ایک امیر گھرانے میں پڑھانے پر ملازم ہو گیا۔ اسوقت اسکی عمر سولہ سال کی تھی۔ گھر کی مالکہ اس سے محبت کرنے لگی لیکن جب اسکی طرف سے خاطر خواہ پزیرائی محبت کی نہ کیگئی تو اسکو علیحدہ کر دیا۔ یہ زمانہ اس کیلئے نہایت افلاس و تنگدستی کا تھا۔ یہ فرانس کے مختلف مقامات میں چکر لگا رہا تھا۔ اور کہتا پھرتا تھا کہ میں آرلینڈ کا رہنے والا ہوں اور حکومت انگلستان نے مجھے میرے مذہبی معتقدات کیوجہ سے نکال دیا ہے۔ اس بنا پر یہ "شہید آئرلینڈ" کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ پھر یہ اپنے باپ کی جستجو میں جرمنی گیا۔ اور اسکو ڈھونڈھ نکالا لیکن اسکی حالت اس سے بھی زیادہ ابتر و سقیم تھی۔ اسلئے اسنے فیصلہ کیا کہ کذب و نفاق کے علاوہ اب کوئی اور صورت حصول شہرت و زر کی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اسنے مشہور کیا کہ میں جاپانی ہوں لیکن دین مسیحی اختیار کرنے کیوجہ سے بھاگ آیا ہوں کیونکہ اہل جاپان مسیحیوں کو ذبح کر ڈالتے ہیں۔ اسیوقت اسنے اپنا نام بسالما نازار رکھا۔ اور مشہور کیا کہ میں جاپانی زبان کا ماہر ہوں، درانحالیکہ وہ کبھی جاپان نہیں گیا تھا۔ اور اس زبان کا حرف شناس بھی نہ تھا ——— بعض انگریزی و ہالینڈی افسران فوج نے یہ حالات معلوم کرکے اس سے خواہش ظاہر کی کہ جاپانی زبان کی ایک کتاب تحریر کرے۔ چنانچہ یہ فوراً آمادہ ہو گیا۔ اور اسی تاریخ سے اسکا وہ کذب شروع ہوتا ہے جسکی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ یعنی اسنے جزیرۂ فارموسا کی تاریخ لکھی اور وہاں کے لوگوں کے حالات و مراسم درج کئے۔ اسنے محض اس کتاب کے لکھنے کیلئے ایک زبان گھڑی، ایک خاص خط ایجاد کیا اور خدا معلوم کس کس قسم کے جھوٹ وضع کرکے جزیرۂ فارموسا کے حالات لکھے اور نقشے و تصاویر بھی بنائے یہ کتاب دوبارہ طبع ہوئی۔ اور کثرت سے فروخت ہوئی درانحالیکہ اس زبان کا جاننے والا دنیا میں کوئی نہ تھا بعد کو لندن کی ایک علمی انجمن نے اسکو دعوت دی کہ وہ جزیرۂ فارموسا کی حالات پر لکچر دے۔ چنانچہ اسنے بسیط لکچر دیئے جو یکسر کذب و دروغ کا مجموعہ تھے اور اسطرح وہ تمام یوروپ میں مشہور ہو گیا اسنے انجمن علمی کی خواہش پر فارموسا کی زبان پر ایک کتاب گرامر و بامدانی کی بھی لکھی اور کسی پر یہ راز نہ کھلا کہ جس زبان کی اسنے ایجاد کی ہے اسکا وجود کہیں پایا ہی نہیں جاتا۔

زمین کا وزن | ڈاکٹر بول ہیل ایک زمانہ سے اس فکر میں لگے ہوئے تھے کہ زمین کا وزن معلوم کیا جائے۔ چنانچہ اب انھوں نے اعلان کیا ہے کہ زمین کا وزن ان کے نزدیک ۶۵۹۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ٹن ہے اور اگر تمام انسان وحیوان جو اس پر چل پھر رہے ہیں فنا ہو جائیں تو لاکھواں حصہ بھی اس کے وزن کا کم نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر موصوف نے اس وزن کی تحقیق میں کن آلات ریاضی سے کام لیا ہے اس کا علم ہمیں نہیں، لیکن ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور وہ یہ کہ وزن جس چیز کا نام ہے وہ صرف قوت کشش ہے یعنی مرکز زمین سے جو چیز جسقدر زیادہ قریب ہوگی اتنی ہی وزنی محسوس ہوگی۔ چنانچہ اس کا تجربہ یوں ہو سکتا ہے کہ آپ کسی چیز کو سطح زمین پر وزن کیجئے۔ اور پھر کسی نہایت بلند پہاڑ کی چوٹی پر لیجا کر تولیے تو وزن میں ضرور فرق ہو جائیگا پھر غور طلب امر یہ ہے کہ اس اصول کے ماتحت زمین کے وزن کے کیا معنے ہوں گے۔ غالباً اس سے مراد آفتاب کی وہ قوت کشش ہوگی۔ جو زمین کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ زمین و آفتاب کا فاصلہ روزانہ کم ہوتا جاتا ہے۔ تو پھر زمین کا کوئی وزن معین کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

آفتاب کے ساتھ گھومنے والا شفاخانہ | آجکل مغرب میں آفتاب کی شعاعوں سے علاج کرنے کا دستور اسقدر عام ہو گیا ہے کہ ہر جگہ اس کے شفاخانے قائم ہو رہے ہیں اور مدارس وغیرہ میں بھی نہ صرف ریاضت جسمانی بلکہ تعلیم ذہنی بھی کھلی ہوئی ہوا اور دھوپ میں ہوتی ہے۔

اسپتالوں میں بعض مریض ایسے ہوتے ہیں جو نقل وحرکت نہیں کر سکتے، ان کے لئے ایسے پلنگوں کا انتظام ہے۔ جو حسب ضرورت سایہ سے دھوپ میں منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن فرانس میں ایک اسپتال ابھی ایسا طیار ہوا ہے۔ جس میں مریضوں کے منتقل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ایک بہت بلند پہاڑ کی چوٹی پر بنایا گیا ہے۔ اور ہوا اور دھوپ کے لئے کثرت سے اس میں دروازے اور کھڑکیاں بنائی گئی ہیں۔ یہ اسپتال آفتاب کے ساتھ ساتھ گردش کرتا رہتا ہے تاکہ ہر وقت کھڑکیوں سے دھوپ اندر آتی رہے۔ یہ ایک بڑے پہئے پر بنایا گیا ہے جسے ایک مشین آہستہ آہستہ گھماتی رہتی ہے

کچھوؤں کی دوڑ | گھوڑوں کی دوڑ، کتوں اور کبوتروں کی دوڑ تو آپ نے سنی ہوگی، لیکن اب امریکہ نے ایسے جانوروں کی دوڑ بھی شروع کی ہے جو اپنی سست رفتاری کے لئے مشہور ہیں۔

پھر چونکہ سست رفتار جانوروں میں کچھوا خاص شہرت رکھتا ہے اس۔ لئے سب سے پہلے بمقام بونکا سیتی (امریکہ) اس کی دوڑ کا انتظام کیا گیا۔ جس میں تقریباً دس ہزار تماشائی جمع ہوئے تھے۔ اور جیتنے والے کچھوے کے مالک نے علاوہ بازی کی جیت کے چار ہزار ڈالر بطور انعام حاصل کیا۔ اس کے بعد سے امریکہ میں کچھوے کی دوڑ کی تقریباً وہی کثرت ہوگئی ہے جو انگلستان میں گھوڑ دوڑ کی ہے۔

گلیم عمر وعیار | فری یزن کے قصہ میں درج ہے کہ کسی حکیم نے اس کے لئے ایک معدنی گھوڑا ایسا طیار کیا تھا۔ جو اس کو لے کر اڑ جاتا تھا۔ سلیمانؑ کے متعلق بھی یہی مشہور رہے کہ آپ کے پاس ایک قالین ایسا تھا جو فضا میں بلند ہو کر اڑتا تھا۔ اور

عمر و عیار کی گلیم کا حال تو معلوم ہی ہے کہ جس وقت وہ سر پر ڈال لی جاتی تھی تو آدمی لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتا تھا۔ بہرحال یہ تمام باتیں سنتے تھے مگر اعتبار نہ آتا تھا کہ ایسا ہونا کیوں کر ممکن ہے۔ لیکن غباروں اور ہوائی جہازوں نے اوّل الذکر دو چیزوں کا یقین دلایا تھا، گلیم عمر و عیار البتہ ابھی تک طیار نہ ہوئی تھی۔ مگر اسپین کے ایک مہندس نے آخرکار اسے بھی پیش کر ہی دیا، یعنی اس نے ایک خاص قسم کا کپڑا ایسا طیار کیا ہے کہ اس کے پہننے کے بعد انسان نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے۔

طاؤسوں کی حکومت | کالیفورنیا کے جنوب میں ایک شہر ہے جس کا نام ارکاڈیا ہے، یہاں طاؤسوں کی اسقدر رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ شکار کرنا تو کجا، ان کو کوئی چھو بھی نہیں سکتا، ٹوک بھی نہیں سکتا۔ وہ ہر جگہ باغوں میں، جنگلوں میں، سڑکوں پر آزادی سے رقص کرتے پھرتے ہیں۔ اور مطمئن ہیں کہ ان کے حسن و جمال کی ہیبت کسی کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

حکومت بلدیہ نے ان کے فراغ و اطمینان کا اس حد تک انتظام کر دیا ہے کہ جس طرح سڑکوں پر راہگیروں اور موٹر چلانے والوں کے لئے جابجا تختیاں تنبیہ و خطرہ کی نصب کر دی جاتی ہیں، اسی طرح ان مقامات اور راہوں پر جہاں طاؤسوں کی کثرت ہے۔ جابجا یہ تختیاں نصب کر دی گئی ہیں کہ۔ "خبردار، طاؤس اس راہ سے گزرتے ہیں"

آدمِ ثانی | کمبرلینڈ (امریکہ) میں ایک خاندان ہے جس کا نام وِب ہے۔ اس کی کثرت اولاد کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کے مورث اعلےٰ کو آدم ثانی کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ اس خاندان کا سردار اس وقت جو سولی وب ہے۔ جس کی عمر ۸۴ سال کی ہے۔ اس کے ۱۹ لڑکے پیدا ہوئے۔ اور ۱۷۵ پوتے، ان پوتوں کی اولاد ۱۵۰ ہوئی۔ اور ان کی ۱۰۰۔ گویا ایک آدمی کی نسل سے ۴۴۴ آدمی وجود میں آئے،

اس کا ایک بھائی ہے جس کا نام ملز وب ہے جس کی عمر ۸۰ سال کی ہے اور اس کے ذریات کی تعداد ۴۰۰ نفوس تک پہونچتی ہے، ان کی ایک بہن (پولی وب) کا خاندان ۲۳۰ نفوس پر مشتمل ہے۔ اور دوسری بہن (سالی وب) سے جس کی عمر ۷۵ سال کی ہے ۱۳ بیٹے، ۸۰ پوتے، ۶۵ پڑپوتے۔ اور ۵۰ سگڑ پوتے پیدا ہوئے۔ تیسری بہن (لیسی وب) کے ذریات ۲۱۱ ہیں۔ اس طرح گویا صرف دو بھائی اور تین بہنوں سے ایک ہزار چار سو ترانوے (۱۴۹۳)، بیٹے پوتے وغیرہ اس وقت تک پیدا ہو چکے ہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان بچہ پیدا کرنے والی مشینوں سے آیندہ مردم شماری تک ایک پورا نیویارک نہ طیار ہو جائے گا۔

کتے کی روح | مغرب میں عموماً اور امریکہ میں خصوصاً روحوں کے بلانے کے لئے حاضرات کا عمل کرنا بہت کثرت سے رائج ہے۔ یہاں تک کہ کپتن ڈائل اور آلیور لاج ایسے انسان بھی اس عمل کی صحت کے قایل تھے اور ان کو یقین تھا

کہ جو روحیں معمول یا وسیط کے ذریعہ سے آتی ہیں۔ وہ واقعی متوفی کی ارواح ہوتی ہیں۔ اور اپنے پیغامات اہل دنیا تک پہونچاتی ہیں ——— لیکن ناظرین نگار غالباً یہ سن کر متحیر ہوں گے کہ حاضرات کا عمل صرف انسانوں ہی کی ارواح تک محدود نہیں رہا بلکہ اب جانوروں کی روحوں کو بھی طلب کرکے ان سے شرف کلام حاصل کیا جاتا ہے۔

انگلستان میں ایک صاحب پروفیسر لٹل جون ہیں جو عمل حاضرات کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں رن ٹن ٹن کتے کی روح کو بلانا چاہا۔ واضح ہو کہ رن ٹن ٹن کتا دنیائے سینما کا نہایت مشہور کتا تھا جو حال ہی میں مرا ہے ——— اس خبر کے سنتے ہی اخباروں کے نمایندے پہونچ گئے۔ تاکہ کتے کے پیغامات جو عالم ارواح سے بھیجنے والا ہے، معلوم کریں۔

پروفیسر موصوف نے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ ——" کیا مرنے کے بعد کتوں کو کافی ہڈیاں ملتی ہیں"

جواب ملا کہ ——" میں اب ایک اور رنگ کی صورت میں آگیا ہوں۔ اور غذا بہت کافی ملتی ہے"

پھر سوال کیا گیا کہ " کیا اس نئی دنیا میں تم خوش ہو"

جواب ملا ——" کہ اُن تمام لوگوں سے جو مجھ سے محبت کرتے ہوں کہدو کہ میری جگہ اب دوسرا کتا پیدا ہو گیا ہے اور میں اب ایسی جگہ رہتا ہوں جہاں سایہ دار درخت ہیں۔ اور غذا بہت وافر ہے"

اس کے بعد سوال کیا گیا کہ " تمھاری جگہ کس کتے نے لی ہے" جواب ملا کہ " جہاں میں مرا تھا وہیں قریب ہی وہ کتا رہتا ہے"

اس خبر کے سننے کے بعد کون ہے جو عالم ارواح و یوم آخرت پر ایمان نہ لانے لگا۔ اور وہ خدا جو ایک کتے کی روح کو بھی فنا نہیں ہونے دیتا۔ وہ انسان ایسے مہتم بالشان حیوان کی روح کو کیوں فنا کرنے لگا۔

جرمنی کا مشہور فلسفی شاعر

گوئٹے

کا مشہور ناول " ورتھر کی داستان غم " مارچ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائے گا۔ اس میں شاعر نے شباب کی رومانی کیفیت کی جو نفیس تصویر کھینچی ہے وہ فلسفہ شباب کا ایک اہم ورق ہے۔ پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔

حجم قریب ۲۰۰ صفحہ قیمت ؏ ترجمہ مع مقدمہ و ضروری حواشی ریاض الحسن۔ ایم۔ اے

ملنے کا پتہ۔ لٹریری سنڈیکیٹ۔ بیلی روڈ نمبر ۱ الہ آباد۔

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

- گودڑ کا لال — للعہ
- شوکت آرا بیگم حصہ اول و دوم — عہ
- 〃 حصہ سوم — سے
- سعیدہ کے خطوط — عمر
- پیاری سہیلی — ۱۰ر
- نئی نویلی پیاری سہیلی — عہ
- عورتوں کی انشا — عمر
- [illegible] نسواں — ۸ر
- [illegible] انگریزی — عہ
- [illegible] زندگی — عمہ
- [illegible] تیموریہ — عمہ
- [illegible] النبی — ۱۲ر
- [illegible] الانبیا — عہ
- سیرۃ عائشہ صدیقہ — عا
- [illegible] الصالحات — عہ
- [illegible] الجنان — عا
- بچوں کی پرورش — عہ
- [illegible] اطفال — عمر
- [illegible] نسواں — عا
- بچوں کی تعلیم — عہ
- بچوں کی تربیت — عمر
- تربیت اطفال — ۱۲ر
- فرائض مادری — ۱۲ر
- افسانۂ نور جہاں — عہ
- اقبال دلہن — عہ
- حسن معاشرت — عہ
- دیا می — عہ
- سولہ کہانیاں — ۱۲ر
- سترہ کہانیاں — ۱۲ر
- سولہ قصے — ۸ر
- مرآۃ العروس — ۸ر
- بنات النعش — ۸ر
- توبۃ النصوح — ۱۲ر
- کنیز فاطمہ — ۸ر
- [illegible] — ۸ر
- [illegible] — ۸ر
- [illegible] سلطانی — ۸ر
- ابن الوقت — عہ
- [illegible] — ۳ر
- منتخب الحکایات — ۳ر
- تندرستی — عہ
- حفظ صحت — عہ
- طبیب نسواں — عہ
- رہبر صحت — ۸ر

ناول، ڈرامے اور افسانے

- قطرات اشک — عہ
- جتندر ناتھ — عمر
- بس کا روگ — عہ
- فسانۂ سعید — ۸ر
- خوفناک ڈکیتی — عہ
- سیلاب اشک باتصویر — عہ
- بے زبان دوست — عہ
- جمال ہم نشین — عمر
- تقصیر عصمت — عمر
- جوہر قدامت — عہ
- تائید غیبی — ۸ر
- پر اسرار قتل — عا
- اعلان آزادی — ۵ر
- سرگذشت ہاجرہ — ۱۰ر
- [illegible] زندگی — ۷ر
- قلب حزیں — ۸ر
- عروس کربلا — عہ
- شہید مغرب — عہ
- ماہ عجم — عہ
- تیغ کمال — عہ
- سراب مغرب — ۸ر
- منازل السائرہ مکمل — عا
- موہنی — ۱۲ر
- وداع ظفر — عہ
- یاسمین شام — عہ
- طوفان اشک — عہ
- شاہین و دراج — ۸ر
- درس عشق — عہ
- [illegible] چور — عہ
- تین بندوق باز — عہ
- کرشمۂ رقابت — ۸ر
- انقلاب قسطنطنیہ — ۸ر
- شاہد رعنا — عہ
- ریڈیا کی سرگذشت — ۴ر
- شگوفۂ محبت — ۴ر
- نسوانی زندگی — ۸ر
- ولایتی [illegible] — ۸ر
- شمع خاموش — ۸ر
- شب زندگی مکمل — عا
- مودودہ — ۸ر
- چندر کلا — ۸ر
- گلستان خاتون — عہ
- صبح زندگی — عہ
- شام زندگی — عمر

تاریخ و سوانح عمریاں

- تاریخ مغرب — عا
- مختصر تاریخ اسلامی — ۸ر
- 〃 〃 حصہ ۲ — ۹ر
- 〃 〃 حصہ ۳ — ۱۰ر
- 〃 〃 حصہ ۴ — عہ
- الصالحات — عہ
- امت کی مائیں — عہ
- الزہرا — ۱۲ر
- اسوۂ حسنہ — ۸ر
- ہند کے شعراء — عہ
- شوہر بہار — عہ
- سوانح اکبر الہ آبادی — عمر
- سفرنامہ عراق — عمر
- تاریخ افاغنہ — عہ
- اسلام اور غیر مسلم — ۸ر
- سیر المصنفین حصہ ۱ — عا
- 〃 حصہ ۲ — ہے
- تاریخ اسلام ۵ جلد — عہ
- اخبار الاندلس ۳ جلد
- خلافت موحدین
- خلافت مورابطین — عا
- عرب اور اس کا مستقبل — عہ

لغات و ادب

- بازاری زبان — ۸ر
- لغات سعیدی — للعہ
- لغات کشوری — سے
- گنجینۂ تحقیق مجلد — عہ
- غیاث اللغات فارسی — عا
- محاورات نسواں — ۸ر
- جواہر اللغات — ۱۲ر
- گوہر اللغات — ۱۲ر
- چراغ سخن — عمر
- دکھنی لغت — ۸ر
- جواہرات کلیات نظیر — عہ
- عزیز اللغات — عا
- تذکرۂ ریختی — عمر
- تاریخ ادب اردو قدیم — عہ
- دکن میں اردو — عا
- منتخب کلام ہندی — عا
- رباعیات عمر خیام — عا
- منتخب کلام مہدی — عا
- اردو کے اسالیب بیان — عہ
- تصحیح الاغلاط — ۴ر
- فیض اردو — ۵ر
- نور اللغات ۴ جلد — للعہ

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز — عہ
- کلیات عراقی — ۱۲ر
- دیوان حافظ — عہ
- دیوان بیدل — ۱۲ر
- دیوان عرفی — ۱۲ر
- کلیات جامی — عا
- کلیات غالب — عہ
- کلیات صائب — عہ
- دیوان ناصر علی — ۶ر
- کلیات سعدی — عہ
- کلیات حزیں — عہ
- دیوان عنصری — ۱۲ر
- دیوان غنی کشمیری — ۶ر
- دیوان ہلالی — ۶ر
- اسرار خودی و رموز بے خودی — سے
- زبور عجم — ہے
- پیام مشرق — ہے
- قصائد عرفی مجلد — ہے

دواوین اردو

- کلیات ظفر — عا
- کلیات مومن — عہ
- دیوان ناسخ — عہ
- کلیات میر — عہ
- کلیات سودا — عہ
- کلیات انشا — عہ
- کلیات نظیر اکبرآبادی — عمر
- گلزار داغ — عہ
- دیوان رند — ۱۲ر
- دیوان ذوق — ۱۲ر
- گلکدہ عزیز مصر — عہ
- مرآۃ الغیب — عمر
- صنمخانۂ عشق — عا
- فریاد داغ — ۴ر
- عالم خیال باتصویر — عہ
- دیوان شہیدی — ۴ر
- کلیات اکبر الہ آبادی — للعہ
- نغمۂ دل شاہجہانپوری — عہ

تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

نگارستان
حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت عہ

گہوارۂ تمدن
مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور علم سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا کی تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اس کی تخییل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچی ہے قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید
مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر ہر شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت حیات صحت و بیماری غربت و امیری وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جز میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ مل نہیں سکتی۔ قیمت علاوہ محصول ۱۰ر

جذبات بھاشا
جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بے چین ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے مثل نمونے ایسے نظر آئے ہیں قیمت علاوہ محصول

صحابیات
جس میں عہد سعادت کی ۸۰ صحابیوں کے مستند حالات یکجا کر دیئے گئے ہیں اس کا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے اس کتاب میں سیر الصحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں طباعت و کتابت نہایت نفیس ہے قیمت علاوہ محصول عہ

نقاب اٹھ جانے کے بعد
تین افسانوں کا مجموعہ جن میں بتایا گیا ہے کہ "ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں"۔ زبان و پلاٹ انشاء و تخییل کے لحاظ سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے قیمت ۵ر علاوہ محصول۔

مذاکرات نیاز
یعنی حضرت نیاز کی آزادی جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم
اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں
۱۔ چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ
۲۔ مادیین کا مذہب
۳۔ حرکت کے کرشمے
نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول۔

تاریخ الدولتین
جرجی زیدان کے تاریخ تمدن الاسلامی کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے جرجی زیدان کی یہ کتاب یورپ تک میں شہرت حاصل کر چکی ہے قیمت عہ علاوہ محصول

المسئلۃ الشرقیہ
مصطفی کامل پاشا کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ یہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ و ایشیا کے سیاسیات میں ہلچل ڈال دی تھی اور جس نے سب سے پہلے ترکی و مصر، عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونکی قیمت عہ علاوہ محصول

تذکرۂ خندۂ گل
مولفہ عبد الباری آسی جس میں ۳۰۰ صفحات سے زائد اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت مع محصول عہ

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں

مثنوی لالہ رخ
خاص مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کتاب بے مثل نمونہ قیمت مع محصول عہ

مثنوی زہر عشق
مرتبہ مجنوں گورکھپوری جس میں ملک کے بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں ایک تصویر نگین بھی ہے ۸ر

فراست التحریر مکمل
یعنی اردو اور انگریزی رسم خط اور طرز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت ۸ر علاوہ محصول۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ

بیروں ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارہ ۳	فہرست مضامین مارچ سنہ ۳۳ء	جلد ۲۳

(نوٹ) جب تک پرچہ کی اشاعت اپنے وقت پر نہ آئے گی تذکرۂ معرکۂ سخن ملتوی رہیگا - غالباً مئی کا پرچہ اپنے وقت پر اول ہفتہ میں شائع ہو جائے گا -

مینیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

شمارہ ۳	مارچ سنہ ۱۹۳۳ء	جلد ۲۳

ملاحظات

ہماری علمی درسگاہوں کی تنگ ذہنیت
دارالعلوم ندوہ کے موجودہ ناظم کا جاہلانہ تقشف

آپ دنیا کی کسی قوم سے سوال کیجئے کہ علم و مذہب میں کوئی فرق ہے یا نہیں تو وہ بلا تردد، بغیر ایک لمحہ کا پس و پیش کئے ہوئے جواب دے گی کہ علم و مذہب میں وہی فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ کیونکہ ایک کا تعلق صرف اخلاقیات سے ہے اور دوسرے کا ذہنیات سے۔ اس کا دائرۂ عمل اگر اصلاح تمدن ہے تو اس کا ترقی تمدن یا زیادہ علمی زبان میں یوں سمجھئے کہ اگر ایک مابعد الطبعیات سے تعلق رکھتا ہے تو دوسرا طبیعیات سے یعنی اگر یہ عملی زندگی کی کشمکش ہے تو وہ خیالی دنیا کی داستان ہے، اگر یہ ذہن انسانی میں اضطرار عمل پیدا کرنے والا ہے تو وہ روح

کو سکونِ خواب میں محو کرنے والا ـــــ الغرض ان دونوں میں حال و مستقبل کا فرق ہے، ہاں اور نہیں کا فرق ہے ـــــ لیکن دنیا میں ایک قوم ایسی بھی ہے جو اس فرق و امتیاز کی قائل نہیں، جو حیات انسانی کے تمام اعمال کو صرف مذہب ہی سے متعلق کرنا چاہتی ہے اور جو اس کارگاہ عمل اور کشاکش زندگی کے ہر پہلو کو اسی خواب آلود نگاہ سے دیکھنا چاہتی ہے جو مذہب کی غلط تعبیر سے اس نے حاصل کی ہے ـــــ وہ دنیا کے تمام علوم و فنون کا مرکز و ماخذ مذہب ہی کو سمجھتی ہے، وہ واقعات تاریخی کو بھی مذہب ہی کا جزو جانتی ہے، وہ وقتی احکام کو بھی دوام و استمرار دینا چاہتی ہے اور اس کے نزدیک دنیا میں نہ ماحول کوئی چیز ہے اور نہ اس کی تبدیلی سے انسانی ذہنیت پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے ـــــ اس کے سامنے صرف مذہب ہے اور اس کی دار و گیر، دین ہے اور اس کا تقشف، عبادت ہے اور اس کا پندار اور وہ اس دنیا کی زندگی کو اس مسافر کی طرح بسر کر دینا چاہتی ہے جو صرف ایک لوٹا اور کمل لے کر شام کو سرائے میں آتا ہے اور صبح کو چلا جاتا ہے ـــــ آپ کو معلوم ہے وہ قوم کون سی ہے؟ وہ قوم ہمارے علماء کرام کی ہے، جو اپنے آپ کو اسلام کا سب سے بڑا حامی و علمبردار سمجھتے ہیں درانحالیکہ ان سے زیادہ دشمن اسلام اس وقت دنیا میں کوئی نہیں، جو اپنے کو مذہبی روایات کا سب سے بڑا محقق و دانشمند باور کرتے ہیں درانحالیکہ

نہ محقق بود نہ دانشمند
چار پائے بر و کتابے چند

آئیے ہم آپ کو اس قوم کے ایک فرد کی عجیب و غریب ذہنیت کا ایک واقعہ سنائیں اور ہم آپ دونوں مل کر غور کریں کہ اس واقعہ کے اندر ہمارے اور ہماری قوم کے لئے کیا کیا درس عبرت و بصیرت پنہاں ہیں۔

اس وقت ہندوستان میں شاید ہی کوئی پڑھا لکھا مسلمان ایسا ہوگا جو دار العلوم ندوہ سے واقف نہ ہو اور وہ حضرات جو تعلیمی معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ دار العلوم ندوہ اور مسلمانوں کی دوسری درسگاہوں میں کیا فرق ہے ـــــ مشرقی ہند میں سب سے بڑی درسگاہیں علوم عربیہ کی چار تھیں یا ہیں۔ ایک مدرسۃ العلوم دیوبند، دوسری مدرسۂ عالیہ رام پور، تیسری مدرسۂ فرنگی محل اور چوتھی دار العلوم ندوہ ـــــ ان میں دو درسگاہیں (دیوبند اور فرنگی محل کی) تو مخصوص تھیں۔ علوم مذہبیہ کے لئے اور اب تک ان کی یہ خصوصیت کم و بیش قائم ہے۔ باقی دو درسگاہیں علوم و فنون کے لئے مخصوص تھیں اور ایک طالب علم کو مذہبی انسان بنا کر نکالنا ان کا مقصود نہ تھا بلکہ ایک عالمانہ و محققانہ ذوق پیدا کرنا ان کا مدعا تھا ـــــ خیر مدرسۂ عالیہ رامپور تو موجودہ نواب رام پور کے جدید نظم و نسق اور تعصب پر قربان ہو گیا اور اس کا وجود ہی باقی نہیں رہا لیکن دار العلوم ندوہ ہنوز موجود ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ اگر ہم اس کے گزشتہ دور کو موجودہ دور کے ساتھ مقابلہ

کرکے دیکھیں تو وجوباً اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ

وشتان مابین خل وخمر

اس کے دَورِ اوّلین میں جب مولانا فاروق چریاکوٹی اس کے پرنسپل تھے، اس کی فضا باوجود ایک نئی درسگاہ ہونے کے بڑی حد تک خالص علم و فضل کی فضا معلوم ہوتی تھی اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی تھی کہ شاید ایک وقت ایسا آئے گا جب مسلمان بچوں کو ان کی ذہنی وعقلی آزادی کو مجروح کئے بغیر علوم مذہبیہ و حکمیہ کی تعلیم دی جائے گی اور اس میں شک نہیں کہ اس کے دورِ ثانی میں جب مولانا شبلی مرحوم نے عنانِ سیادت اپنے ہاتھ میں لی اس درسگاہ کی یہ خصوصیت بہت زیادہ نمایاں ہوگئی، لیکن ان کے بعد کا دور جو فی الحقیقت "کبرنا موت الکبریٰ" کا دور تھا ایسا ناکام ثابت ہوا اور مقاصد و نصاب کا انحطاط اُس منزل تک پہنچ آیا کہ "ڈاکٹر سید عبدالعلی" سے بہتر کوئی ناظم اسے لکھنؤ بھر میں نہ مل سکا ــــــ

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر عبدالعلی ندوہ کے تعلیم یافتہ ہیں، سائنس کے گریجویٹ اور لکھنؤ میڈیکل کالج کے "ام بی ۔ بی اس" ہیں، لیکن ان اسناد کو نظم ونسق کی قابلیت سے کیا واسطہ، جبکہ اس کے لئے صرف ایک قائدانہ دماغ، ایک معلمانہ ذہنیت، اور کارفرمایانہ قابلیت کی ضرورت ہے سید عبدالعلی، ممکن ہے اچھے طبیب و ڈاکٹر ہوں، یہ بھی ناممکن نہیں کہ وہ کچھ لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، لیکن کیا دنیا کا ہر طبیب و ڈاکٹر، ہر لکھا پڑھا انسان ایک درسگاہ کا کامیاب ناظم بن سکتا ہے ــــــ پھر اگر یہ عہدہ انھیں صرف اس لئے تفویض نہیں کیا گیا کہ ان کے والد بزرگوار بطور وراثت ان کے لئے چھوڑ گئے تھے، تو یقیناً ان کی دوسری اہلیت سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوسکتی تھی کہ وہ نہایت ہی متقشف قسم کے مسلمان ہیں اور کارکنان ندوہ کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس درسگاہ کو نہایت ہی سخت متعصب مذہبی درسگاہ بنادیا جائے ۔ جس کا ثبوت ذیل کے ایک واقعہ سے ملے گا ۔

سنہ ۲۹ء میں پونا سے علوم عربیہ کا ایک شایق طالب علم (عنایت علی) ہزاروں میل سفر کرکے لکھنؤ آیا اور دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوگیا ۔ چونکہ موسیقی کا بھی اسے فطری ذوق تھا اس لئے وہ رات کو خارج اوقات میں میوزک کالج جاکر اس شوق کو بھی پورا کرتا تھا ۔ برابر تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا ۔ لیکن جب ناظم ندوہ (ڈاکٹر عبدالعلی) کو اس کا علم ہوا تو اپریل سنہ ۳۲ء میں انھوں نے اس غریب کو مدرسے سے علحدہ کردیا اور کوئی عذر ان کی بارگاہ میں پزیرا نہ ہوا ــــــ بظاہر یہ معاملہ نہایت معمولی نظر آتا ہے، لیکن حقیقتاً یہ سوال صرف کسی مخصوص طالب علم اور مخصوص ناظم کا نہیں، بلکہ ایک ایسی درسگاہ کا ہے جس کا تعلق پبلک کے مفاد سے ہے ۔ اور اُس اصول کا ہے جس کے ماتحت اس کا موجودہ نظم ونسق جاری ہے ۔

پھر کیا میں ڈاکٹر عبدالعلی (موجودہ ناظم ندوہ) سے یہ سوال کرسکتا ہوں کہ کیوں انھوں نے اس طالب علم کو

درسگاہ سے خارج کیا اور وہ کون سی حجت شرعی ہے جو اس اخراج کو واجب ٹھیرانے والی تھی —— فرض کیجئے
کہ کوئی عیسائی یا ہندو طالب علم محض علوم عربیہ پڑھنے کے لئے ندوہ میں آکر داخل ہو تو کیا اس کو صرف اس حجت پر باہر
نکال دیا جائے گا کہ وہ صلیب کی پرستش کرتا ہے یا شام کو مندر میں جا کر ناقوس بجاتا ہے —— یقیناً نہیں۔ تو پھر
کیا اس سے زیادہ حیرت انگیز مثال کسی اسلامی درسگاہ کے مستبدانہ نظم و اہتمام کی کوئی اور ہو سکتی ہے کہ ایک طالبعلم
باوجود مسلمان ہونے کے صرف اس بنیاد پر تعلیم سے محروم کر دیا جاتا ہے کہ اسے موسیقی سے رغبت ہے اور وہ درسگاہ
کے اوقات کے علاوہ اس کے سیکھنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ کیا موسیقی کا فن کی حیثیت سے سیکھنا ناجائز ہے؟
کیا رسول اللہ اور صحابہ نے گانا نہیں سُنا اور کیا تاریخ سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ بہت سے اکابر اسلام کو موسیقی
کے ساتھ حد درجہ شغف حاصل تھا اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو مان لیا جائے کہ فرط تقوے کا اقتضا یہی تھا کہ
اس طالب علم کو اس شوق سے باز رکھا جاتا تو کیا ڈاکٹر عبدالعلی بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے اس احتیاط کو خود اپنی
ذات کے لئے بھی کبھی صرف کیا ہے یا نہیں اور وہ کون سی حجت شرعی ہے جس کی بنا پر وہ روزانہ متعدد غیر
محرم عورتوں کے جسم میں ہاتھ لگانے سے احتراز نہیں کرتے۔ اور وہ تقوے کیسا ہے جو انھیں بہت سی ایسی
دوائیں تجویز کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جن میں شمول الکحل کا ان کو یقین ہے —— اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنے
پیشہ کے لحاظ سے مجبور ہیں تو براہ کرم یہ بتایا جائے کہ ان جیسے متقی شخص کو ایسا پیشہ اختیار کرنے کی ضرورت ہی
کیا تھی اور کیا وہ کسی مسجد میں اذان و امامت کی خدمت انجام دینے پر قانع نہ رہ سکتے تھے۔

پھر یہ کس قدر حیرتناک امر ہے کہ ڈاکٹر عبدالعلی کے لئے تو محض پیشہ کی مجبوری نہیں بلکہ صرف مادی نفع کی غرض
سے عورتوں کو ہاتھ لگانا اور مسلمانوں کو شراب آلود دوائیں پلانا تک حلال و مباح قرار دیا جائے (جو کبھی رسول اللہ
نے جائز نہیں رکھا۔) اور ایک غریب طالب علم کو ایک روحانی ذوق کی تسکین کے لئے موسیقی سیکھنا بھی حرام قطعی قرار
دے کر مدرسہ سے باہر نکال دیا جائے (درانحالیکہ خود رسول اللہ کا گانا سننا اور اس سے لطف اٹھانا تاریخ سے ثابت
ہے)، یہ سچ ہے۔

گر من آلودہ دامنم چہ عجب
ہمہ عالم گواہ عصمت اوست

اسی طالب علم نے قبل موسیقی سیکھنے کے ایک استفتاء بھی "علماء دین و مفتیان شرع متین" کی خدمت
میں بھیجا تھا۔ اور جو فتویٰ اس مسئلہ پر دیا گیا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

۱- ابو العماد محمد شبلی مدرس دار العلوم نے جواب دیا کہ:-

"علم موسیقی علم ریاضی کی ایک قسم ہے اور علم ریاضی کا بجمیع اقسامہ سیکھنا مباح ہے بشرطیکہ ایسے مسائل جو خلاف شرع ہوں اس پر عامل نہ ہو بلکہ صرف علمی حیثیت سے سیکھ لیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بعض علوم ایسے ہوتے ہیں کہ اس کے سیکھنے والے کو معصیت کی طرف پہونچا دیتے ہیں جس کی وجہ سے اعتقاد اور عمل خراب ہو جاتا ہے ۔ ان میں سے موسیقی بھی ہے اس وجہ سے "ممنوع لغیرہ" ہے ۔"

۲۔ محمد شفیع حجت اللہ الانصاری فرنگی محلی کا ارشاد ہے :۔

"فن شعر گوئی اور دیگر فنون لطیفہ کی طرح علم موسیقی کی تحصیل بھی فی نفسہ مباح ہے ۔ البتہ اس قسم کے علوم و فنون کی تحصیل کے بعد ان کی عملی شق کا جواز ضرور مشتبہ ہے ۔"

۳۔ محمد اعظم شاہ مفتی آگرہ فرماتے ہیں :۔

"علوم و فنون سب مباح ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خصوصاً وہ علوم جنمیں جذبات مخفیہ کا اشتعال لازم ہے ان کی تحصیل یقیناً منجر بہ فساد ہے ۔ ۔"

قطع نظر اس امر سے کہ جوابات کس زبان و عبارت میں دئے گئے ہیں صرف اس پر غور کیجئے اُن سے کوئی صاف و صحیح نتیجہ سائل کو مطمئن کرنیوالا پیدا ہوتا ہے یا نہیں ۔ اور اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر جب ہم ان جوابات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مفتی نمبر ۱ پہلے تو موسیقی سیکھنا مباح قرار دیتا ہے لیکن بعد کو اسے "ممنوع لغیرہ" قرار دیتا ہے ۔ اس اصطلاح سے ان کی مراد یہ ہے کہ موسیقی چونکہ انسان کے اخلاق خراب کر دیتی ہے اس لئے اپنے اس نتیجہ کے لحاظ سے ممنوع ہے ۔ یہی مدعا غالباً مفتی نمبر ۳ کا بھی ہے ۔

فاضل مفتی نے اگر یہ نتیجہ صرف اپنے ہی رجحانات فطرت کو پیش نظر رکھ کر نکالا ہے تو کسی کو تردید کا حق حاصل نہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ موسیقی کو مخرب اخلاق کہنا اتنی بڑی نادانی ہے کہ دار العلوم ندوہ کے ایک مدرس کو اس سے شرم کرنا چاہئے ۔ اگر مفتی حقیقتاً ہندوستانی موسیقی کے اصول، اور اس کی تاریخ سے بیخبر نہ ہوتا تو سمجھ سکتا کہ موسیقی حقیقتاً ایک عبادت ہے، ایک نیایش و گرایش ہے جو جوارح ظاہری نہیں بلکہ صرف روح کی طرف سے فطرت کے حضور میں پیش کی جاتی ہے ۔ اور اگر اس کو "ممنوع لغیرہ" قرار دیا جاتا ہے تو نماز و روزہ بھی "ممنوع لغیرہ" ہے اگر اس کا نتیجہ مکر و ریا و شقاوت قلبی نکلے، وہ مفت پلاؤ قورمہ بھی "ممنوع لغیرہ" ہے جسے کھا کھا کر تخمہ و ہیضہ کو دعوت دی جاتی ہے اور ڈاکٹر عبد العلی کا پیشۂ طبابت تو بدرجۂ اولیٰ "ممنوع لغیرہ" ہے جس میں غیر محرم عورتوں کو ہاتھ لگانے کے مواقع روز پیدا ہوتے ہیں اور ایک انسان کی "خیالی معصیت" کے علاوہ "عملی معصیت" کا بھی بہت زیادہ امکان پایا جاتا ہے ۔

مفتی نمبر ۲ نے علم موسیقی کو علمی حیثیت سے سیکھنا تو جائز قرار دیا ہے لیکن اس کی "عملی شق" کے جواز

کو مشتبہ ظاہر کیا ہے معلوم نہیں "عملی شوق" سے ان کی مراد کیا ہے۔ اگر اس سے مقصود "بازاری پیشہ" کی طرح اس کو اختیار کرنا ہے تو مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ خود ماہرین موسیقی بھی اس حرکت کو ناجائز قرار دیتے ہیں، لیکن صرف اس دلیل پر کہ کسی فن کو ایک شخص بُری طرح استعمال کر سکتا ہے اسے ناجائز کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے ۔۔۔ علم الکیمیا حاصل کرنا ناجائز نہیں لیکن اگر کوئی شخص اس سے کام لے کر صرف زہر بنائے اور لوگوں کو زہر دے دے کر ہلاک کیا کرے تو کیا ایک خاص شخص کے اس فعل سے علم الکیمیا کا سیکھنا حرام قرار دیا جا سکتا ہے؟

علم الفقہ سیکھنا ہر مولوی کا فرض ہے لیکن اگر کوئی مفتی یا مولوی اس سے کام لے کر صرف ناجائز نکاح و طلاق کے شرعی بہانے تراشنے کا پیشہ اختیار کرے تو فقہ پر کیا الزام عاید ہو سکتا ہے اور اس کے حصول کو کیونکر ناجائز ٹھیرایا جا سکتا ہے؟ ۔۔۔ متعدد مثالیں ایسے اطبا اور ڈاکٹروں کی ملتی ہیں جنھوں نے محض اپنے فن طبابت کے ذریعہ سے ساری عمر فحاشی و اوباشی میں بسر کردی، لیکن کیا اس سے اس فن کی تحصیل کو حرام قرار دے سکتے ہیں

لیکن اگر مفتی مذکور کا مدعا "عملی شوق" سے یہ ہے کہ موسیقی کا کتابی علم تو جائز ہے اور عملی ناجائز، تو مجھے مولانا کی واقفیت پر ماتم کرنا پڑے گا، کیونکہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ موسیقی ان علوم میں سے ہے جن کا تعلق صرف عمل سے ہے۔ اور محض کتاب پڑھ لینے سے یہ فن حاصل نہیں ہو سکتا ۔۔۔ یہ علم آواز کا ہے اور جب تک منہ سے آواز نہ پیدا کی جائے ۔۔۔ اس کے اصول کیا بتائے جا سکتے ہیں۔ پھر اگر کوئی تدبیر مولانا کے نزدیک ایسی ہے کہ بغیر سامعہ کو متاثر کئے آواز پیدا ہو جائے یا بغیر آواز کے آواز نکل سکے تو اس کا اظہار کرنا چاہئے تھا تاکہ اس عجیب و غریب انکشاف سے دنیا محروم نہ رہتی۔

موسیقی کو کتابی علم قرار دے کر اس پر کفایت کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے مولانا کسی کو وضو و نماز کے طریقے زبانی بتادیں اور کہدیں کہ بس اب تمھارے لئے وضو و نماز کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ محض ان طریقوں کا جان لینا گویا وضو کر کے نماز پڑھ لینا ہے۔

الغرض اس طالب علم کے معاملہ میں اگر ایک طرف "مفتیان شرع متین" نے فتویٰ دینے میں کم فہمی سے کام لیا تو دوسری طرف دار العلوم ندوہ کے ناظم نے ایسے استبداد سے کام لیا جو ایک پبلک درسگاہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا۔

اس کا جواب کارکنان ندوہ کی طرف سے صرف یہ دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی درسگاہ کے لائحۂ عمل میں اس کو ناجائز قرار دیا ہے کہ کوئی طالب علم ایک ہی وقت میں علوم دینیہ بھی حاصل کرے اور موسیقی بھی۔ لیکن اگر اس امتناع کا سبب یہ ہے کہ علوم دینیہ اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں تو اس میں صحت کا کوئی شائبہ نہیں اور اگر محض انتظامی نقطۂ نظر سے اس کو ضروری قرار دیا گیا تو کیا یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ایک پبلک درسگاہ کے نظم و

اہتمام میں اس نوع کے استبداد کو ضروری قرار دینا کن ارباب علم و فضل کی روشن دماغی کا نتیجہ ہے اگر یہ فعل موجودہ ناظم کے شخصی اجتہاد و فیصلہ کا مظاہرہ نہیں

مولوی عبدالقدیر بدایونی اور مولوی عبدالحامد بدایونی
تو گوئی کہ مُرغان شاطر بہ جنگ

۲۱ جنوری کو بعد مغرب جامع شمسی بدایوں میں مسلمانوں کی ایک جماعت طلب کیجاتی ہے تاکہ جامع مسجد کی مرمت کے لئے تدابیر سوچی جائیں۔ جناب عبدالقدیر بدایونی جو "مولانا" قوم کے ایک نہایت ہی سربرآوردہ فرد ہیں صدر قرار پاتے ہیں۔ ایک صاحب مفتی سخاوت حسین کھڑے ہوکر مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ جلسہ ابھی شروع نہ کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ ابھی اکثر محلوں کے لوگ جمع نہیں ہوئے، لیکن مولانائے صدر کا پندار اس کو برداشت نہیں کرتا کہ ان کی صدارت کی کارفرمائیاں ایک لمحہ کے لئے بھی معطل حالت میں پڑی رہیں

باہمی اختلاف کی وجہ سے کچھ ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہمارے مولانا برافروختہ ہوکر ایک صاحب مولوی محمد سلیمان کو نہایت درشت لہجہ میں سخت و سُست کہنے لگتے ہیں اور مولوی عبدالحامد وغیرہ اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ لیکن مخالفت ذاتی کا یہ منظر خدا کی ایک عبادتگاہ میں اسی جگہ پہونچکر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس میں اضافہ مارپیٹ اور عمل "کفش کاری" کا بھی ہوتا ہے۔ بعد کو دوسرے دن کسی کو باہر سے گرا کر زدوکوب بھی کی جاتی ہے اور مدرسہ قادریہ میں جاتو چلنے کا بھی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔

یہ بیان ہے وہیں کے ایک مقامی اخبار العدل کا جس میں اعتبار و بصیرت کے لئے نہ کسی تفسیر و شرح کی ضرورت ہے اور نہ "مولاناؤں" کے اخلاق اسلامی پر کسی مزید روشنی ڈالنے کی۔ اسی کے ساتھ معاصر مذکور نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ ۳ر فروری کو مولوی عبدالقدیر اور مولوی عبدالحامد کو دو فریق مقرر کرکے حکام کی جانب سے مچلکے لئے گئے اور دفعہ ۱۰۷ کی کارروائی کے لئے ۱۱ر فروری عدالت نے مقرر کی —

یہ ہیں کارنامے ہمارے علماء کرام اور مذہبی رہنماؤں کے اور یہ ہیں اخلاق قوم کے ان مشایخ کے جو اپنی دراز عباؤں میں خدا جانے کتنے افسانے اپنی "کوتہ آستینوں" کے پنہاں رکھتے ہیں۔ بہ ظاہر انکی صورت دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انکے اندر "روح القدس" حلول کر گئی ہے، لیکن انکے معاشری اخلاق اور انکا بطون ایک ایسا وادیہ ہے جہاں طمع و خود غرضی کے شعلوں کے سوا کسی اور نور کا پتہ نہیں اور انکے اعمال کی داستان حقیقتاً عصیاں کاری کے ایسے ایسے نادر ٹکڑے اپنے اندر رکھتی ہے کہ ہم رندان بادہ خوار کا خیال بھی اس حد تک نہیں پہونچ سکتا سچ ہے

کیمیائے ست عجب معرفت درگہ یار خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

فراعنۂ مصر کی خوابگاہیں

رودِ نیل کی آغوش میں

(اہرام مصر کو دیکھ کر)

ایک بالکل جدید نظریہ

"اے ازلی وابدی اہرام۔ اے ماضی کے اسرار عظیم۔ اے حال کی چیستاں۔ اور آیندہ آنیوالی نسلوں کیلئے مایۂ حیرت واستعجاب!"

یہ ہیں وہ الفاظ جو ایک ادیب سیاح نے اہرام مصری کے متعلق لکھے ہیں۔

اہرام کا پہلا نظارہ

جب کوئی سیاح عروس البلاد قاہرہ سے رود نیل کے مشرقی کنارہ پر اہرام کا پہلا نظارہ کرتا ہے تو فاصلہ کی وجہ سے وہ زیادہ دلچسپ تو نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس کے دل میں کچھ اور تاثرات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ چار یا پانچ میل کے فاصلہ سے وہ ایسے نظر آتے ہیں گویا قریب ہی ہیں۔ اور جوں جوں سیاح آگے بڑھتا جاتا ہے وہ دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور دیکھنے والے کو ان عجیب عمارتوں کی عظمت وشان پر غور کرنے کا کافی موقعہ ملتا ہے۔ یہ خاص اثر کچھ تو اہرام کی عظمت کی وجہ سے ہوتا ہے اور کچھ ان کی وضع قطع کے سبب سے۔ چونکہ اہرام بہت عظیم الشان اور چار برابر قاعدوں کے بڑے بڑے تودے ہیں۔ اس لئے ان میں ایسے چھوٹے چھوٹے حصے نہیں ہیں جن پر سیاح کی نظر جم سکے۔

صبح صادق کی دھندلی روشنی میں جب ان اہرام پر پہلی نظر ڈالی جاتی ہے تو وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا عجیب ہیئت کے پہاڑ ہیں اور ہرم اعظم ایک ایسا پہاڑ معلوم ہوتا ہے جس کے نیچے کی زمین ایک طرف سے دب گئی ہے۔ اور وہ ایک طرف کو زیادہ جھک گیا ہے۔ جب سیاح ان تین بڑے اور ایک چھوٹے ہرم کے قریب پہونچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین کا یہ حصہ بے اختیارانہ اوپر کی طرف ابھرا چلا جا رہا ہے۔ اور جب وہ تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر رہ جاتے ہیں تو اسقدر قریب معلوم ہوتے گویا آگے بڑھ کر ان کو چھولیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب سیاح اور زیادہ قریب پہونچتا ہے تو ان کی عظمت کا نہایت گہرا اثر اس پر پڑنے لگتا ہے۔ اور جب وہ ان کے ڈھلوان پہلوؤں پر نظر دوڑا کر ان کی چوٹیوں پر نظر ڈالتا ہے تو ٹوپی سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے

بعض مرتبہ ان اہرام کو دیکھنے والوں کے جذبات اسقدر ہیجان میں آتے ہیں اور اسقدر وحشت و ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ کہ لطف کے بجائے تکلیف پیدا ہو جاتی ہے اور غالباً اسی وجہ سے ان کے متعلق لوگ یہ بیان کیا کرتے ہیں۔ کہ ان مکروہ صورت اور بدہیئت تودوں کی تعمیر میں نہ کوئی ذوق سلیم نظر آتا ہے نہ خوبصورتی...... ہرم اعظم کی بائیں میں کھڑا ہو کر اگر کوئی شخص اس پر نگاہ ڈالے تو اس سر بفلک جلیل القدر یادگار کو دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ عرب رہنما جب اس پر چڑھ کر ادھر ادھر پھرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیڑے رینگ رہے ہیں۔ جب کوئی شخص ہرم پر چڑھنا شروع کرتا ہے اور دم لینے کے لئے کھڑا ہو کر نیچے کی طرف دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ نیچے کھڑے ہوئے ہیں وہ حشرات الارض سے زیادہ بڑے نہیں۔ اور پھر جب وہ ہرم کی چوٹی کی طرف نظر اٹھاتا ہے تو اس کی عظمت و شان کی حقیقت کھلتی ہے۔ عرب رہنماؤں کی مدد سے ہرم اعظم پر چڑھنے میں نصف گھنٹہ کے قریب وقت صرف ہوتا ہے

ہرم اعظم

ہرم اعظم ان اہرام میں سے ایک ہے جو شہر قاہرہ سے جانب جنوب تھوڑے سے فاصلہ پر دریائے نیل کے کنارے واقع ہیں۔ تمام اہرام میں بھی ہرم سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ کیونکہ یہ بلحاظ حجم سب سے بڑا بھی ہے۔ اور اس کے متعلق بہت سی دلچسپ روایات بھی بیان کی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اس کے اندر بہت سے پوشیدہ راستے، سُرنگیں اور کمرے بھی ہیں۔ ہرم اعظم کے اندر بڑے بڑے وسیع ایوانات شاہی بنے ہوئے ہیں۔ جن میں طویل راستوں اور غلام گردشوں کے ذریعہ سے پہونچتے ہیں۔ ان راستوں کا داخلہ نہایت ہوشیاری سے پوشیدہ رکھا گیا تھا، حتیٰ کہ ان کے اندر صدیوں تک کوئی شخص داخل نہ ہو سکا۔ مگر اتفاق سے ان راستوں کا راز فاش ہو گیا اب لوگوں کو اندرونی زمین دوز کمروں کا حال معلوم ہوا۔ ان کمروں میں داخل ہونے کے لئے سطح زمین سے اسقدر بلند و طویل راستے کیوں بنائے گئے، یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہرم اعظم کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً بڑی گیلری کا راستہ زمین سے تقریباً ۲۸ فٹ بلند ہے۔ اور ڈھلوان ہوتا ہوا ایوان شاہی کی طرف چلا گیا ہے اگر اس راستہ کا مقصد صرف یہ ہوتا کہ بادشاہ کا تابوت ایوان شاہی میں پہونچا دیا جائے تو آٹھ فٹ اونچا راستہ بھی کام دے سکتا تھا، دروازہ کو اسقدر بلند بنانے کی کیا ضرورت تھی، یہ وہ مسئلہ ہے جو منجملہ دیگر اسرار ہرم اعظم کے ہنوز حل طلب ہے۔ ان اسرار پر ہم آیندہ بحث کریں گے۔ سب سے پہلے ہم اس کے مختصر تاریخی حالات درج کرتے ہیں۔

تاریخی حالات

ہرم اعظم ملک خوفو فرعون مصر نے تعمیر کیا تھا۔ جسے انگریزی زبان میں کیوپس (Cheops) کہتے ہیں۔ اس فرعون کے عہد کی تاریخ کے بارہ میں اگرچہ ابھی تک کسی قدر شبہ باقی ہے لیکن اسقدر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کم از کم ۲۹۰۰ سال قبل مسیح پایا جاتا تھا، اور بعض کے نزدیک اس کا زمانہ اس سے بھی ایک ہزار سال قبل تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خوفو فرعون مصر نے یہ ہرم اپنے مقبرہ کے لئے تعمیر کیا تھا۔ اور اس امر کی بھی کافی شہادتیں موجود ہیں، کہ فرعون مذکور نہایت تزک و اہتمام کے ساتھ ایوان شاہی میں مدفون کیا گیا تھا۔

اس ہرم کی تعمیر میں لکھوکھا غلام لگائے گئے تھے۔ اور سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد تعمیر ہوا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ تمام کاریگروں اور مزدوروں کو ایک ایک لاکھ کی تین جماعتوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر جماعت کو تین ماہ تک کام کرنا پڑتا تھا۔ اور بقیہ دونوں جماعتیں اس جماعت کو سامان رسد پہونچانے کے علاوہ اپنا اپنا کام کرتی تھیں

اس مقبرہ کی تعمیر میں سنگِ سُرخ اور سنگ آہک (چونے کے پتھر) سے کام لیا گیا تھا۔ سنگِ سُرخ مصر سے سات سو میل کے فاصلہ پر بمقام سائینہ کھودا گیا تھا۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ تعمیر ہرم کے لئے اسقدر بعید فاصلہ سے اتنے بڑے بڑے پتھر کے ٹکڑوں کو کیونکر لایا گیا تھا۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ آلات جرثقیل موجود نہ تھے ان بھاری پتھروں کو سطح زمین سے اٹھاکر ان کی جگہ پر نصب کیونکر کیا گیا، جبکہ ہرم اعظم کی بلندی ۴۸۱ فٹ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہرم اعظم کے اندر ۲۳ لاکھ عظیم پتھر کی سلیں نصب ہیں اور ہر سِل اندازاً سَتر من کی ہے

تعمیر کے متعلق مختلف نظرئے

اس بارہ میں مختلف نظرئے قائم کئے گئے ہیں کہ ہرم اعظم کی تعمیر میں جو اتنے بڑے بڑے پتھر کام آئے ہیں انھیں زمین سے اٹھاکر ان کے مقام تک کیونکر پہونچایا گیا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ ان پتھروں کو بلند کرنے کے لئے عظیم الشان منجنیقوں سے کام لیا گیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ موٹے موٹے رسّوں میں باندھ کر مزدوروں نے اٹھایا تھا۔ لیکن صحیح قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریائے نیل کے کنارہ سے ہرم اعظم کی بنیاد تک ایک ڈھلواں راستہ بنایا گیا تھا۔ اور ہزارہا مزدور ایک ساتھ زور لگاکر ان پتھروں کو کشتیوں سے اٹھاکر راستہ پر لڑھکاتے یا کھینچتے ہوئے موقعہ پر پہونچا دیتے تھے۔ اور جب ہرم کی زیرین منزل مکمل ہوجاتی تھی تو اس سڑک کی سلامی اور زیادہ کردی جاتی تھی۔ جب ہرم اعظم مکمل ہوگیا تو یہ سڑک توڑ دی گئی اور اس کا ملبہ کسی دوسرے مقام پر پہونچا دیا گیا۔ اس سڑک کے آثار اب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

ہرم اعظم کے ایوان اور راستے
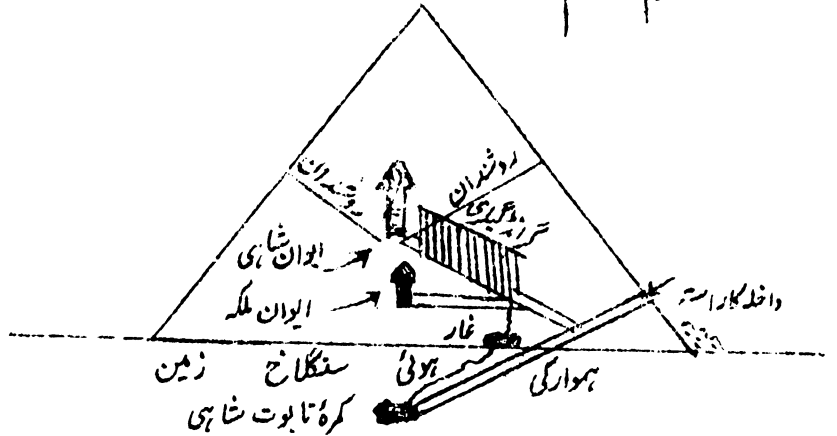
ہرم اعظم کے متعلق دلچسپ معلومات

ہرم اعظم کے جغرافی وقوع کے متعلق بعض بہت سی دلچسپ باتیں

بیان کی جاتی ہیں مثلاً :-

یہ کہ ہرم اعظم سے جو خط طول البلد و عرض البلد گزرتا ہے۔ اس پر دنیا بھر میں سب سے زیادہ خشکی کا حصہ پایا جاتا ہے یا یہ کہ مصر زیریں کے جس علاقہ میں ہرم اعظم واقع ہے وہ تمام دنیا کی آباد زمین کا مرکزی حصہ ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ ہرم اعظم کے مشرق و مغرب کی طرف جسقدر خشکی کا حصہ ہے اگر اس کا حساب مربع میلوں میں لگایا جائے - اور بالائی اور زیریں گوشوں کے مابین خط کھینچے جائیں تو یہ دونوں خط عین اس مقام پر قطع ہوں گے جہاں ہرم اعظم واقع ہے

جس مقام پر ہرم اعظم واقع ہے وہاں سے تقریباً ۳۰ درجہ عرض البلد شمالی کا خط گذرتا ہے - گویا وہ خط استوار اور قطب شمالی کے درمیان ایک ثلث فاصلہ پر واقع ہے - ہرم اعظم کے اطراف یا چاروں پہلو بالکل صحیح شمال، جنوب، مشرق و مغرب کی طرف واقع ہیں اور انھیں اسقدر صحت کے ساتھ تعمیر کیا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے - لہٰذا کرۂ ارض کا خط محور براہ راست اس جگہ کے نیچے سے گزرتا ہے۔ جہاں بادشاہ کا کمرہ ہے - ہرم اعظم ایک صاف اور ہموار شدہ سنگلاخ زمین کی سطح پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جو غالباً ریگ صحرا دور کرنے سے نکالی گئی ہوگی - ہرم اعظم کے اطراف اس کی چوٹی سے ۵۱ درجہ کا زاویہ بناتے ہیں۔ اس کی بلندی ۴۸۱ فٹ ہے - اور ٹھوس پتھروں کا بنا ہوا ہے - جس کے اندر بہت سے پوشیدہ کمرے ہیں - اور ان کمروں تک ڈھلوان راستے جاتے ہیں - ہرم اعظم کے جانب شمال اندر داخل ہونے کا صرف ایک راستہ ہے - جو چار فٹ کے قریب اونچا اور تین فٹ پانچ انچ سے کسی قدر زائد چوڑا ہے - یہ دروازہ سطح زمین سے پتھروں کی ساٹھویں تہ یا منزل پر واقع ہے۔ راستہ نیچے کی طرف کچھ دور تک ڈھلوان چلا گیا ہے - بعد ازاں اس کے دو حصے ہو جاتے ہیں - ایک راستہ اوپر کی طرف چلا جاتا ہے اور دوسرا مسلسل طور پر زمین دوز ایوان میں پہونچتا ہے جو سطح زمین سے بہت نیچا اور بالکل صحیح طور پر ہرم کی چوٹی کے نیچے واقع ہے اوپر جانے والا راستہ کچھ دور کے بعد ایک عظیم الشان چھتہ یا "گرانڈ گیلری" میں پہونچتا ہے - جو اٹھائیس فٹ بلند اور ۱۵۰ فٹ طویل ہے - چھتہ کے سرے پر ایک چھوٹا سا راستہ اور ہے جو گیلری میں سے گذر کر ایک تنگ دروازہ تک پہونچتا ہے۔ یہ دروازہ ایوان شاہی کا ہے - جس میں بادشاہ کا تابوت رکھا گیا تھا - اسی ایوان کے قریب سے دو سوراخ بطور روشندان ہرم کی بیرونی سطح تک گئے ہیں، ایوان شاہی کے اوپر بعض خالی مقامات ہیں - اور ان میں جو سب سے اونچا مقام ہے اوس پر دو بڑے بڑے پتھر رکھے ہیں جن کا مقصد غالباً یہ ہے کہ ایوان شاہی کے اوپر جو پتھروں کا زبردست بوجھ ہے اس کو سہاریں - گرانڈ گیلری کے عین نیچے شمالاً جنوباً ایک افقی سیدھا راستہ اور ہے جو اس کمرہ میں داخل ہوتا ہے جو ملکہ کا ایوان کہلاتا ہے - (نقشہ دیکھنے سے یہ تفصیلات بخوبی سمجھ میں آجائیں گی -) اس سیدھے راستہ کے شروع میں ایک اور ناہموار سرنگ ہے جو اس مقام پر پہونچتی ہے جسے زمین دوز "غار" کہتے ہیں - اس غار سے ایک سرنگ سب سے نیچے والے ایوان میں اترتی ہے - اور اسی ایوان میں راستہ کے دہانہ سے ایک سیدھا سلامی دار راستہ بھی پایا جاتا ہے - اس وقت تک ہرم اعظم کے اندر جو کمرے معلوم ہوئے ہیں وہ یہی ہیں - آگے چل کر ہم ان کمروں اور خود ہرم اعظم کے متعلق جو پیمائشیں اور معلومات درج کریں گے وہ بہت دلچسپ ہوگی

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خفیہ راستے اور ایوان کیونکر معلوم ہوئے اور کس نے معلوم کئے؟ ہم جانتے ہیں کہ ہرم اعظم جب مکمل ہوگیا تھا تو اوس کو بند کرکے تمام راستے چھپا دئے گئے تھے۔ یہ گویا ولادت عیسیٰ سے صدیوں بلکہ ہزاروں برس پیشتر کا واقعہ ہے۔ اور یہ ہرم ہزاروں برس اسی طرح سربمہر رہا۔ اس کا اندرونی راز قدما کو بھی معلوم نہ تھا۔ ابتدا میں ہرا عظم کے اطراف پر ایک قسم کے سیمنٹ کی گچ کاری تھی۔ اور اس کے سب پہلو بالکل صاف اور چکنے تھے۔ مگر بعد میں یہ پلاسٹر دور کردیا گیا اور اسے دیگر تعمیری کاموں میں لگا دیا گیا۔ اسی طرح ہرم کی چوٹی کے پتھر بھی اکھاڑ کر دوسری تعمیروں میں لگا دیے گئے۔ کیونکہ پہلے ہرم کی چوٹی نوکدار تھی۔ مگر اب اس کی سطح ۳۲ فٹ مربع کی ہے۔ جو میز کی طرح معلوم ہوتی ہے

خلیفہ المامون عباسی اور ہرم اعظم

اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ ہرم اعظم کے خفیہ راستے اور کمرے کیونکر معلوم ہوئے۔ خلیفہ المامون بن ہارون الرشید پہلا شخص تھا جو ۸۲۰ء کے اوائل میں راستہ توڑ کر داخل ہوا۔ اس نے اپنے مزدوروں کو حکم دیا کہ وہ شمالی پہلو کے وسط میں توڑ کر راستہ بنائیں مگر چونکہ اس کا راستہ عین وسط میں نہیں بلکہ ۲۴ فٹ بلند جانب مشرق ہٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس لئے مامون کے کاریگروں کو انتہا سے زیادہ محنت کرنا پڑی۔ اور بالآخر وہ چلا اٹھے کہ اس عجیب و غریب ہرم کا کھودنا ان کے قابو سے باہر ہے مگر چونکہ مامون عزم راسخ کرچکا تھا اس لئے مجبوراً کام جاری رہا لیکن اس قدر سست رفتاری کے ساتھ کہ چھ مہینے میں صرف سو فٹ کی سرنگ کھودی جاسکی اور راستہ کا پتہ پھر بھی نہ ملا۔ بعض کاریگروں کو ہرم اعظم کے متعلق یہ پرانی روایات یاد آئیں۔ کہ مصر کے کسی پرانے بادشاہ نے یہ کہا تھا کہ اگر وہ مصر کی تمام دولت بھی اس کام میں لگا دے گا۔ تب بھی وہ کسی ہرم کو توڑ نہیں سکے گا۔ لیکن اسی اثناء میں ان سے چند فٹ ایک طرف کسی خالی جگہ میں کوئی بڑا پتھر گرا۔ بس آواز کا سننا تھا کہ ان کی ہمتیں بندھ گئیں۔ اور انھوں نے نہایت سرگرمی کے ساتھ اپنی سرنگ اسی طرف کو دوڑانا شروع کردی جس طرف سے پتھر گرنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اور آخرکار ایک خالی مقام تک اپنی سرنگ پہونچا ہی دی۔ یہ مقام حد درجہ تاریک اور دشوار گذار تھا۔ یہ ایک سلامی دار راستہ تھا جو انھوں نے معلوم کیا تھا۔ اور اسی کے اندر چھت سے اکھڑ کر پتھر گرا تھا۔ اسی واقعہ سے یہ بات ثابت ہوگئی۔ کہ چھت میں جہاں سے وہ پتھر گرا تھا، ایک دوسرا راستہ شروع ہوکر ہرم اعظم کے اندر گیا ہے

چونکہ ان لوگوں کو یقین تھا کہ ہرم کے اندر بے شمار خزانہ بھرا پڑا ہے اس لئے وہ لوگ بے صبری کے ساتھ آگے بڑھے یہ راستہ صرف ۴۷ انچ اونچا اور ۴۱ انچ چوڑا تھا۔ اسی کے اندر رینگتے ہوئے وہ لوگ چلتے رہے اور بالآخر ایک طویل اور بلند چھتہ کے اندر ہوگئے جہاں شبِ دیجور کی سی تاریکی اور قبر کا سا سکوت طاری تھا۔ یہ راستہ یا چھتہ ان لوگوں کو اس سنگین قید خانہ کے اندر لے گیا۔ جب وہ لوگ اس "گرانڈ گیلری" کے اندر داخل ہوگئے تو انھوں نے اپنے داہنی طرف ایک نہایت عمیق کنوئیں کا منھ دیکھا جو ۱۴۰ فٹ گہرا تھا۔ مگر اس سے آگے اسی چھتہ کا سلسلہ برابر چلا گیا تھا۔ چنانچہ وہ لوگ اس لالچ میں اور آگے بڑھتے چلے گئے کہ شاہان قدیم کا بے شمار خزانہ ان کے ہاتھ آجائے گا۔ یہ راستہ تنگ ضرور تھا کیونکہ صرف ۶ فٹ چوڑا تھا۔

اور زمین پر صرف تین ہی فٹ چوڑا تھا ۔ مگر اس کی بلندی ۲۸ فٹ تھی اور اس کی دیواروں کی سطح سنگ مرمر کی طرح صاف چکنی اور چمکدار تھی ۔

ان لوگوں نے یقین کرلیا کہ واقعی دفینہ کا راستہ یہی ہے ۔ الغرض وہ اس راستہ پر جو ۲۶ درجہ کا زاویہ بناتا ہے ۔ آگے بڑھتے رہے ۔ اور ڈیڑھ سو فٹ اور آگے پہونچ گئے ۔ اس کے بعد سامنے ایک تین فٹ بلند سیڑھی راہ میں حائل ہوئی ۔ اسکے بعد ایک تنگ دروازہ ملا جس کے اندر انھیں گردنیں جھکا کر گھسنا پڑا ۔ پھر ایک اور تنگ راستہ ملا ، بعد ازاں سنگ سرخ کا ایک اور تنگ دروازہ ملا ۔ لیکن اس کے بعد وہ ایوان شاہی کے اندر داخل ہوگئے ۔ اور یہی وہ منزل تھی جس کے لئے یہ تمام سر بفلک اور عجیب و غریب عمارت تعمیر کی گئی تھی ۔

ایوان شاہی میں ان لوگوں نے کیا دیکھا ؟ صرف ایک شاندار کمرہ ۔ ۳۴ فٹ طویل اور ۱۷ فٹ عریض اور ۱۹ فٹ بلند ۔ جو صاف اور چمکدار سنگ سرخ کا بنا ہوا تھا ۔ اس کے تمام پتھر بالکل چوکور اور پالش شدہ تھے ۔ جو حد درجہ خوبصورتی کے ساتھ نصب کئے گئے تھے ۔ مگر اس کے اندر خزانہ کا کہیں وجود نہ تھا ۔

جب یہ خبر خلیفہ مامون الرشید کو ملی تو وہ حیران و ششدر رہ گیا ۔ وہ بھی اپنے کاریگروں اور مزدوروں کی مدد سے ایوان شاہی تک پہونچ گیا تھا ۔ مگر وہاں اس کو ایک تابوت کے سوائے کچھ بھی نہ نظر آیا

فی الحقیقت یہ دنیا کے محیر العقول اسرار میں سے ہے کہ آخر اس فرعون مصر کی لاش کہاں گئی ۔ جس کے لئے یہ تابوت بنایا گیا تھا اور جو اس سنگین مقبرہ میں اسقدر حفاظت کے ساتھ رکھی گئی تھی ۔ یہ باور کرنے کی ہر وجہ موجود ہے کہ فرعون کی حنوط شدہ لاش ضرور اس تابوت کے اندر رکھی گئی تھی ۔ اور بعد ازاں تمام اندرونی و بیرونی راستے پوری طرح احتیاط کے ساتھ سربمہر کردیے گئے تھے ۔ کیونکہ اگر فرعون کی حنوط شدہ لاش تابوت میں نہ رکھی گئی ہوتی تو پھر راستوں کے بند کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ مگر جب مامون کے لوگ کمرہ میں داخل ہوئے تو انھوں نے فرعون کی لاش کو غائب پایا اور اسی کے ساتھ تابوت کا ڈھکنا بھی ۔ یہ چیزیں کیا ہوئیں یا ان کو کون لے گیا ؟ یہ راز آج تک حل نہیں ہوا ۔

مغربی مستشرقین

جب ۸۲۰ء میں خلیفہ المامون باللہ عباسی کے کاریگروں نے ہرم اعظم کا پہلو توڑ کر راستہ بنایا اس وقت سے گذشتہ صدی کے آغاز تک ہرم اعظم کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہا ۔ لیکن ۱۶۳۷ء میں آکسفورڈ کے مشہور ماہر فلکیات پروفیسر جان گریوس نے اس کی سیر کی اور اندرونی و بیرونی حصوں کے بہت سے مقامات کی پیمائشیں لیں ۔ اس کے بعد مسٹر جان ٹیلر (ولادت ۱۷۸۱ء وفات ۱۸۶۴ء) نے آکر دیکھا اور پیمائشیں لے کر بہت سے نظریے قائم کئے جن کی بعد میں پروفیسر پیازی اسمائتھ نے بہت سی تفصیلات بیان کیں ۔ ۱۸۳۷ء میں کرنل ہاورڈ وائس نے بھی اس کی بہت کچھ دیکھ بھال کی اور یہی پہلا شخص تھا جس نے وہ دونوں سوراخ دریافت کئے جنھیں روشندان کہتے ہیں اور جو ایوان شاہی کے اطراف سے نکل کر ہرم کے باہر تک گئے ہیں ۔ اور اسی شخص نے وہ خالی کمرے معلوم کئے جو ایوان شاہی

کی چھت بنتے ہوئے چلے گئے ہیں۔ اور جن کی تعمیر کا مقصد غالباً یہ تھا کہ اوپر کے حصہ کا بوجھ سہار سکیں۔

یقیناً دنیا پروفیسر پیازی اسمائتھ کی ممنون ہے جن کی بدولت ہرم ۔۔۔۔ اعظم سے عوام کو اسقدر دلچسپی پیدا ہوئی۔ کیونکہ یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے نہایت محنت اور احتیاط سے اس تعمیر کے ہر حصہ کی تفصیل دار پیمایش کی۔ مگر افسوس ہے کہ پروفیسر مذہبی خیال کے آدمی تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے بیانات میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ہرم اعظم ایک "الہامی تعمیر" ہے۔ اور یہ عظیم الشان عمارت خداوند تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے کی ایک ابدی آیت ہے جو بذریعہ الہام انسان پر نازل ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے اپنا یہ قول ہرم کی پیمائشوں پر مبنی کیا۔ جن سے ان کے نزدیک یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ "بانیان ہرم اعظم نے اپنے علم سے زیادہ عمارت بنائی"۔ پروفیسر صاحب نے یہ بات بھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کہ ہرم اعظم فرانسیسی پیمانۂ عشری پر نہیں بلکہ انگریزی پیمانۂ فٹ اور انچ کے حساب سے تعمیر کیا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب کی پیمائشیں واقعی حیرت انگیز ہیں۔

بعض دلچسپ اعداد و شمار

دنیا جانتی ہے کہ دائرہ کے قطر اور اس کے محیط میں جو نسبت ہے اسے یونانی حرف "پائی" π سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی صحیح عدد نہیں ہے۔ بلکہ اعشاریہ کی پانچ حد تک جو عموماً تمام کاموں کے لئے ٹھیک سمجھا جاتا ہے۔ اس کی قیمت اعدادی ۳.۱۴۱۵۹ ہے۔ لیکن اس کی قیمت لاانتہا مقامات اعشاریہ تک نکالی جاسکتی ہے۔ ۱۸۷۳ء میں مسٹر شینکس نے اس کی قیمت اعدادی سات سو مقامات اعشاریہ تک نکالی تھی۔ یہی باعث ہے یعنی چونکہ ہم کو "پائی π" کی صحیح عددی قیمت معلوم نہیں اس لئے دائرہ کو مربع نہیں بنایا جاسکتا۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ ہرم اعظم کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس کی اصلی اونچائی کو اس کے قاعدہ کے دوگنے سے وہی نسبت تھی جو دائرہ اور قطر کے درمیان ہوتی ہے۔ یعنی "پائی π" کی بالکل صحیح عددی قیمت۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکالا گیا تھا کہ ہرم اعظم کے تعمیر کرنے والے علم المساحت کے اس مسئلہ سے بخوبی واقف تھے۔ اور گویا انھوں نے "پائی π" کی قیمت عملاً حل کر دی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک سال ۳۶۵ دن سے کسی قدر زیادہ کا ہوتا ہے۔ وقت کو پورا کرنے کے لئے ہر چوتھے سال ایک دن بڑھا دیا جاتا ہے۔ اور وہ سال "سال کبیسہ" کہلاتا ہے میں ہر سال ۳۶۵.۲۴۲۲ دن اور اعشاریہ کے لاانتہا مقامات ہوتے ہیں۔ اور ہر سال کبیسہ میں ۳۶۶ دن ہوتے ہیں۔ اب خیال فرمائیے کہ ہرم اعظم کا جو مربع قاعدہ ہے اس کی ہر طرف کی پیمایش یا لمبائی کو اگر ۳۶۶ حصوں میں تقسیم کیا جائے تو ہر حصہ لمبائی میں کرۂ ارض کے نصف محور کا ۱/ایک لاکھ واں حصہ کے قریب یا ۲۵ انچ انگریزی کے قریب ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہرم اعظم کا جو انجنیر تھا اس نے اس کے قاعدہ کی بنیاد رکھتے ہوئے ایک ایسا پیمانہ استعمال کیا ہوگا جو طول میں ۲۵ انچ لمبا تھا۔ اور اسوقت

اس کے ذہن میں سال کے دن اور اس کی کسر ہوگی۔ اس طرح گویا اس نے اس پیمانہ کے ذریعہ سے ہرم اعظم کے قاعدہ کی ہر سمت سال کے دنوں پر شمار کی تھی۔ اور یہ پیمانہ (یعنی ۲۵ انچ انگریزی) کرۂ ارض کے نصف محور کا ایک لاکھ حصہ ہے، اسلئے اگر اسے ۲۴۲ ، ۳۶۵ (سال شمسی کے دنوں کی تعداد) سے ضرب دیا جائے تو ہرم اعظم کے ربع قاعدہ کی ہر طرف کی صحیح پیمائش نکل آئے گی۔ اسی قسم کے واقعات سے مسٹر ٹیلر اور اسمائتھ نے یہ نتیجہ نکالا کہ تعمیر ہرم اعظم میں فٹ اور انچ کے پیمانہ سے کام لیا گیا تھا۔ پُرانے مصری "ہاتھ" کے پیمانہ سے کام نہیں لیا گیا تھا جو اندازاً ۲۰۶ ، ۱ انچ انگریزی کا ہوتا ہے۔ درحقیقت ہرم اعظم کی تعمیر کا پیمانہ وہ تھا جسے "ہرمی انچ" کہتے ہیں۔ جو انگریزی انچ سے خفیف سا مختلف ہے۔ مگر عملی کاموں کے لئے قریب قریب دونوں برابر ہیں۔ لہٰذا انگریزی انچوں کے تمام مضروب "ہرمی انچوں" کے مضروب ہیں۔ یہ امر مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات واقعی دلچسپ ہے کہ چونکہ ہرم کے قاعدہ میں چار ضلع ہیں۔ اس لئے ان سب کی مجموعی لمبائی ۳۶۵۲۴ ہرمی انچ ہوتی ہے یعنی تقریباً سوا انچ فی یوم۔

مسٹر پیٹری (Flinders Petrie) نے یہ بھی دکھایا ہے کہ اگر ۵۸۱۳ ہرمی انچوں کو انگریزی انچوں کی صورت میں منتقل کیا جائے اور انھیں ۱۰۹ میں ضرب دے کر ان انچوں کے میل بنالئے جائیں تو ہمیں کرۂ ارض اور آفتاب کے درمیان کا صحیح فاصلہ معلوم ہو جاتا ہے۔ یعنی تخمیناً نو کروڑ ۲۰ لاکھ میل۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ہرم اعظم کے تعمیر کرنے والوں کو یہ بھی علم تھا کہ کرۂ ارض اور ہمارے مرکزی منبع نور کے درمیان صحیح طور پر کتنا فاصلہ ہے۔

اسی قسم کے دیگر واقعات سے جو ہرم اعظم کے بیرونی حصص کی پیمائش پر مبنی ہیں یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ہرم اعظم کی تعمیر الہامی طور پر ہوئی تھی۔ اور پھر ہرم کے اندرونی راستوں اور خفیہ ایوانوں کی مختلف پیمائشیں کرکے اس خیال کی مزید توثیق کی گئی۔

مسٹر جوزف اے سیس (Joseph A. Seiss) نے اپنی کتاب "معجزہ سنگین" میں بعض اہم پیمائشیں درج کی ہیں مثلاً :-

اگر ہم ایوان شاہی کی لمبائی ۴۱۲،۱۳۲ انچ لیں اور اسے ایک دائرہ کا قطر سمجھیں اور پھر اس دائرہ کا رقبہ نکال کر اس رقبہ کو مربع کی صورت میں منتقل کریں تو اس طرح ہرم اعظم کا صحیح قاعدہ نکل آئے گا۔ اور قاعدہ کے ہر ضلع میں اتنے ہی "ہرمی ہاتھ" ہوں گے جتنے سال بھر میں دن ہوتے ہیں۔

پھر اسی عدد کو کسی مربع کا ایک ضلع فرض کیجئے۔ اور اس مربع کا رقبہ نکالئے۔ بعد ازاں اس رقبہ کو دائرہ کی صورت میں منتقل کیجئے تو اس دائرہ کا جو نیم قطر ہوگا۔ اس کی لمبائی اتنے ہی "ہرمی ہاتھ" ہوگی جتنی ہرم کی اونچائی ہے۔ علاوہ ازیں اگر ایوان شاہی میں اس کی شمالی یا جنوبی دیوار کے پتھروں کا پورا دَور لیا جائے۔ اور اسے ایوان کی لمبائی سے تقسیم کر دیا جائے تو "پائی π" یعنی $\frac{22}{7}$ حاصل ہوگا۔ اور گرانڈ گیلری اور ایوان شاہی کے درمیان جو ایک اور عقبی کمرہ ہے

اس کے بھی عرض و طول اور دیگر پیمائشوں میں اسی طرح "پائی" $\frac{22}{7}$ کا استعمال پایا جاتا ہے - علاوہ ازیں اگر اس عقبی کمرہ کے فرش کی پوری لمبائی کو اگر $\frac{22}{7}$ سے ضرب دیا جائے تو سال کے پورے دنوں کی تعداد نکل آتی ہے - اس عقبی کمرہ میں جو پتھر کا پردہ ہے اسکو اگر صاف کناروں تک ناپا جائے تو اس کی پیمائش ۳۲۰۰۰۰۱ یعنی $\frac{22}{7}$ × ۱۰۰۰۰۱ نکلتی ہے۔ اسی طرح ملکہ کے ایوان میں جو طاق مشرقی دیوار میں ہے اگر اس کی اونچائی کو $\frac{22}{7}$ × ۱۰ میں ضرب دیا جائے تو ہرم اعظم کے قاعدہ کا ایک ضلع نکل آتا ہے۔ اگر ملکہ کے ایوان کی آخری دیوار کی اونچائی کو دس میں ضرب دیا جائے اور پھر اس کا جذر نکالا جائے اور پھر اسے طاق کی اونچائی سے تقسیم کر دیا جائے تو $\frac{22}{7}$ نکل آتا ہے - پھر اگر پہلے سلامی دار راستہ کی لمبائی لی جائے۔ اور اس میں بڑے حصہ کی لمبائی جمع کر دی جائے۔ یا پورے سلامی دار راستہ کی لمبائی کو $\frac{22}{7}$ سے تقسیم کیا جائے۔ تو داخلہ کے راستہ کی اس قدر لمبائی نکل آتی ہے جو دہانہ سے لگا کر پہلے چڑھنے والے راستہ تک ہے۔

ہرم اعظم کی تعمیر میں ایک اور بات دیکھنے کے قابل ہے یعنی اس میں سنگین چوکوں کی چھتیسویں منزل کی موٹائی اوپر یا نیچے والی منزلوں کی اونچائی سے دوگنی ہے۔ اور اسی چھتیسویں منزل کا قاعدہ عقبی کمرہ کی اونچائی سے دس گنا ہے۔ اس عمارت کے عمودی مرکز کا فاصلہ اس بلندی کے دونوں اطراف کے قریب ترین نقطہ تک اگر دس سے تقسیم کیا جائے تو ایک سال کے دنوں کی تعداد نکل آتی ہے۔ اور اگر اسی فاصلہ کو اس نقطہ کی عمودی بلندی سے تقسیم کیا جائے تو $\frac{22}{7}$ یعنی دائرہ کے محیط اور قطر کی نسبت نکل آتی ہے۔

اسی طرح بڑے صندوق میں بھی وہی $\frac{22}{7}$ موجود ہے۔ صندوق کی اونچائی اور اس کی لمبائی میں وہی نسبت ہے جو ایک اور $\frac{22}{7}$ میں ہے۔ اگر صندوق کی گہرائی کو اس کی ایک لمبی طرف کے رقبہ سے ضرب دیا جائے تو $\frac{22}{7}$ ہوتا ہے۔

یہی حال ہرم اعظم کے بعض بڑے بڑے اندرونی حصص ایوان شاہی اور صندوق کا ہے۔ ہر چیز کی صورت ایک ہی اصول پر قایم کی گئی ہے یعنی اگر دو بڑی طرفوں کی لمبائی جمع کر کے دیکھا جائے تو وہ مجموعہ تیسری طرف کی لمبائی کا $\frac{22}{7}$ گنا ہو گا۔ مثلاً ہرم اعظم کی لمبائی اور چوڑائی اس کی اونچائی اور $\frac{22}{7}$ کا حاصل ضرب ہے۔ ایوان شاہی کی لمبائی اور چوڑائی کا مجموعہ اس کی اونچائی اور $\frac{22}{7}$ کا حاصل ضرب ہے۔ اور صندوق کی لمبائی اور چوڑائی کا مجموعہ اس کی اونچائی اور $\frac{22}{7}$ کا حاصل ضرب ہے

ہرم اعظم کے حجم اور وزن کے متعلق بھی بہت سے حساب لگائے گئے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ہرم کے اندر ۹۵ لاکھ ہاتھ (مکعب) مسالہ پایا جاتا ہے (ہر ہاتھ کی لمبائی ۲۵ انچ ہے) ہرم کی تعمیر میں مختلف قسم کا مسالہ اور سامان صرف ہوا ہے جن کا نسبتی وزن مختلف ہے۔ بہر حال ان جملہ امور کو مدِنظر رکھتے ہوئے اندازاً حساب لگایا گیا ہے کہ ہرم اعظم کا کل وزن ۵۲۷۳۸۵۴ ٹن ہے (ایک ٹن ۲۸ من کے قریب ہوتا ہے)

ہرم کے اندر کا ٹمپریچر کم و بیش یکساں قائم رہتا ہے۔ اور بیرونی ہوا کے ٹمپریچر سے بہت زیادہ کم ہے۔ گرما ہمہ ہم

کے اندر سخت گرمی ہوتی ہے۔ مسٹر ایل۔ ڈاؤ کوینگٹن نے ایک روشندان کی سُرنگ کو جو ایوان شاہی سے نکلی ہے صاف کرایا تھا۔ اس سے ہرم کا ٹمپریچر مستقل طور پر کئی درجہ کم ہو گیا ہے۔ اس کے متعلق مصر کے عربوں میں یہ روایت ہے کہ اگر دوسرا روشندان بھی اسی طرح صاف کر دیا جائے تو ہوا کی آمد و رفت سے رباب جیسا نغمہ پیدا ہونے لگے گا۔ اور اندرونی ٹمپریچر اور بھی زیادہ سرد ہو جائے گا۔ لیکن تا وقتیکہ روشندان کی سُرنگ صاف نہ ہو اس قول کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔

تعمیرِ ہرم کی وجہ یا غرض

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہرمِ اعظم کیوں تعمیر کیا گیا تھا؟ کیا یہ عظیم الشان تعمیر محض ایک مقبرہ تھی؟ اگر یہی مقصد تھا تو پھر اس کے اندر یہ گرانڈ گیلری اور دیگر راستے اور ایوان کیوں بنائے گئے؟ کیا ان کا کوئی اور مقصد تھا؟ اگر تھا تو وہ کیا تھا؟ ان سوالات کے لوگوں نے مختلف جوابات دیے ہیں۔ جن کا مختصر خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اہرام اعظم کی تعمیر کے بارہ میں جو مختلف نظریے پُرانے زمانہ میں قایم کیے گئے تھے۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:—

(۱) اہرام مصر کی تعمیر کا مقصد یہ ہے کہ ریگستان کی طرف سے جو ریت اُڑ کر آئے اس کو روکا جائے۔ تاکہ قاہرہ اور رود نیل کی دوسری بستیاں محفوظ رہیں

(۲) ان کی تعمیر اس غرض سے ہوئی تھی کہ اس زمانہ کے علماء دین کی جو پُر اسرار تعلیم تھی وہ محفوظ رہے۔ اور اگر دوسرا طوفان نوح آئے تو غرقاب نہ ہو

(۳) اہرام کی تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ ان کے اندر عمدہ فصلوں کے زمانہ میں غلہ بھر لیا جائے تاکہ خشک سالی میں کام آئے

(۴) اہرام کی تعمیر کا مقصد محض یہ تھا کہ فراعنۂ مصر کی شوکت و عظمت اور قدیم مصر کے علم و ہنر کی نمایش کیجائے

(۵) تعمیر اہرام کی غرض و غایت یہ تھی کہ اونھیں مصری اوزان اور پیمانوں کا معیار بنایا جائے

(۶) ان عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر بذریعۂ الہام ہوئی تھی۔ اور ان کی تعمیر سے اہل مصر کی زبردست روحانی قوتوں کا اظہار مقصود تھا

بہر حال ایک مقصد تو اہرام کی تعمیر کا ضرور ظاہر ہے یعنی یہ کہ وہ شاہی مقبرے تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ ایوان شاہی میں ایک تابوت موجود ہے گو اس کے اندر سے لاش اور اوس کے اوپر کا ڈھکنا غائب ہیں۔ ملک و فرعون مصر کا مقصد یہ تھا کہ اس کی لاش ان پتھروں کے عظیم الشان حجرہ میں ہمیشہ تک محفوظ رہے۔ اسی لئے اس نے اپنی عظمت و جلالت کے مطابق یہ عظیم الشان مقبرہ تیار کرایا تھا۔ جس ہوشیاری اور سلیقہ کے ساتھ ہرم میں

داخل ہونے کے مختلف راستے مخفی رکھے گئے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاش اور ان خزائن کو جو اس کے ساتھ رکھے گئے پوری طرح محفوظ رکھنا مقصود تھا۔ حال ہی میں مقبرہ توت انخ آمن فرعون مصر کے مقبرہ سے جسقدر بیش بہا خزائن برآمد ہوئے ہیں۔ ان سے اس امر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ملک خوفو فرعون مصر کی لاش کے ساتھ کس قدر خزائن مقبرہ میں رکھے گئے ہوں گے۔ یہ خزائن یقیناً ایوان شاہی اور عقبی کمرہ میں محفوظ کر کے ہرم میں داخل ہونے کی تمام راستے پوشیدہ اور بھر بھر کئے گئے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ ملکہ کے ایوان میں بھی خزائن ہوں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ بیش بہا خزائن قبطی ڈاکوؤں یا عرب چوروں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہے۔ الغرض یہ تو ثابت ہے کہ تعمیر ہرم کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ مقبرۂ شاہی کا کام دے۔ لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اندر جو اٹھائیس فٹ اونچی عظیم الشان گیلری بنی ہوئی ہے اس کا مقصد کیا تھا؟

اس کے متعلق یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے کہ مقبرہ کے علاوہ ہرم اعظم کی تعمیر کا مقصد یہ بھی تھا کہ اسے ایک عظیم الشان رصدگاہ بنایا جائے۔ اور اس گرانڈ گیلری کا مقصد مشاہدۂ فلکیات تھا۔ یہ گویا ہماری عظیم الجثہ دوربینوں کی طرح ٹھوس پتھروں سے بنائی ہوئی ایک دوربین تھی۔ جس میں شیشے (lenses) نہیں تھے۔ الغرض ایوان شاہی کی حد تک ہرم اعظم کی تعمیر اسی نظریہ پر ہوئی تھی۔ ایوان شاہی گرانڈ گیلری پر واقع ہے۔ اس کے بعد ملک خوفو فرعون مصر کی وفات تک تعمیر کا کام بند کر دیا گیا۔ اور اس کے اوپر کی سطح ایک ہموار میز کی طرح رہ گئی۔ بعدازاں جب فرعون خوفو کا انتقال ہوگیا۔ تو ایوان شاہی میں اس کی لاش رکھ کر ہرم اعظم کے بالائی حصہ کی تکمیل کر دی گئی۔ اس خیال کے اثبات کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں۔

نظریۂ رصدگاہ کے اثبات میں شہادتیں

ہرم اعظم خط عرض البلد شمالی درجہ ۳۰ کے بہت قریب تعمیر کیا گیا ہے۔ یا بالفاظ دیگر اس عرض البلد پر جہاں سے آسمان کا صحیح قطب خطِ افق سے نقطۂ سمت الراس تک کل فاصلہ کے ایک ثلث پر واقع ہے۔ یعنی جہاں ٹھیک فصل بہار یا فصل خزاں کے زمانہ میں آفتاب نصف النہار اس فاصلہ سے دو تہائی دوری پر ہوتا ہے جو خط افق اور نقطۂ سمت الراس کے درمیان ہے۔ ایسے رصد خانہ میں جس کا ٹھیک محل وقوع یہ ہو بعض حسابات اور اقلیدسی اشکال جن کی مسائل فلکیات میں ضرورت پڑتی ہے بہت زیادہ آسان ہو جاتے ہیں۔ نہایت تحقیق و تدقیق کے بعد اس امر کی تصدیق کی جاچکی ہے کہ ہرم اعظم اس مقام سے جو صحیح طور پر منتخب کیا جاتا صرف چند گز ہٹکر تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں کے آلات پیمائش اور طریقہ زیادہ صحیح نہ تھے۔ انھوں نے اپنی رہنمائی کے لئے صرف ایک خاص ستارہ منتخب کیا ہوگا یعنی قطب ستارہ۔ عمارت کا محل وقوع منتخب کرنے کے بعد اس کی وضع قطع کا مسئلہ پیدا ہوا اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہرم اعظم کے چاروں رُخ صحیح شمال صحیح جنوب صحیح مشرق اور صحیح مغرب کی طرف واقع ہیں۔ اسقدر صحت حاصل کرنے کے لئے ٹھوس چٹان میں ایک لمبی اور سلامی دار سرنگ کھود کر قاعدۂ ہرم کا بنیادی خط قائم کیا گیا ہوگا۔ چنانچہ ایسی سرنگ موجود ہے جو زمین دوز کمرہ کے اندر اُترتی ہے۔ جب اس طرح پوری صحت کے ساتھ سمت شمال معلوم کر لی گئی تو عمارت کی

وضع قطع اور تعمیر کا کام شروع کیا گیا۔ اور یہ صحت صرف علم نجوم کے ذریعہ سے حاصل کی گئی ہوگی۔ بعد ازاں سنگین منزلیں نہایت صحت اور خوش اسلوبی کے ساتھ تعمیر ہونا شروع ہوئیں۔ گرانڈ گیلری کا نقشہ تیار ہوکر وہ تعمیر کی گئی۔ اوّل اوّل ہرم اعظم صرف اس قدر تعمیر کیا گیا تھا جہاں تک ایوان شاہی موجود ہے۔ اب آیندہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس گرانڈ گیلری کا کیا راز ہے۔

گرانڈ گیلری کا راز

اس کے متعلق مشہور ماہر فلکیات رچارڈ اے پراکٹر تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ امر یقینی ہے کہ جن لوگوں کو دوربین کا کوئی علم حاصل نہ تھا۔ اور جو ہمارے زمانہ کے ماہرین فلکیات کی طرح صحت کے ساتھ سمتیں معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے یہی طریقہ رکھا ہوگا جو ہرم اعظم کی عمارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی انھوں نے ٹھوس چٹانوں میں طویل راستے نکالے اور جہاں ضرورت ہوئی معمولی انحراف شعاع کے ذریعہ سے خط نظر بدل دیا۔ . . . . . . اس خیال کی اسوقت اور بھی زیادہ وضاحت ہوگی جب ہم گرانڈ گیلری کے معاملہ پر غور کریں گے۔ کیونکہ ایک ماہر فلکیات کے نزدیک اس تعمیر کا سب سے زیادہ ہیئتی (Astronomical) حصہ یہی ہے۔ آپ اس مسئلہ پر کسی قدر غور فرمائیں کہ ہیئت داں جو ایک ہی وقت میں ماہر تعمیرات بھی ہو وہ اس شگاف یا سرنگ سلامی دار کو کیا شکل دیتا جس میں سے وہ اجرام سماوی کی نقل و حرکت دیکھ سکتا۔ ہیئت داں کی حیثیت سے تو وہ ایک بہت بلند مگر تنگ مقام پر بیٹھنا پسند کرتا مگر بحیثیت ایک ماہر تعمیرات کے وہ جانتا کہ وہ مقام بالکل عمودی نہیں ہوسکتا . . . . . . گرانڈ گیلری کے عمودی سکشن یا کٹاؤ کی صورت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ہرم اعظم کے تعمیر کرنے والے ہیں ہیئت دانی اور فن تعمیر سے کمال آگاہی دونوں خوبیاں موجود تھیں۔ دیواروں کا ہر حصہ قطعی عمودی ہے، باہمہ دیواریں بہ ہیئت مجموعی سلامی دار ہیں اگر ہم شروع ہی سے اس ہرم اعظم کا ہیئتی نقشہ نہ دیکھ پاتے اور ہم کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس قسم کے نقشہ کا تعلق علم ہیئت سے ہے، تو بھی ہم کو اس گرانڈ گیلری کی دوہری نوعیت سے صاف معلوم ہوجاتا کہ وہ مشاہدات فلکی کے لئے تعمیر کی گئی ہے۔ اور صرف ایک ہیئت داں کسی ماہر تعمیرات کے سامنے ایسا مسئلہ پیش کرسکتا تھا۔"

اگر یہ نظریہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ گرانڈ گیلری مشاہدات فلکی کے لئے تعمیر کی گئی تھی تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اسقدر سلامی دار گیلری میں جس کا فرش اسقدر چکنا اور جھکا ہوا ہے لوگ کس طرح بیٹھ کر مشاہدات فلکی کرتے ہوں گے؟ اس کا جواب وہ سنگین کنارے دے سکتے ہیں جو گیلری کے دونوں طرف بہت دور تک سلامی دار چلے گئے ہیں۔ یہ کنارے سلامی دار فرش سے مناسب بلندی پر واقع ہیں۔ اور اگر ان پر مضبوط چوبی تختے رکھ دیے جائیں تو ان تختوں پر بہت سے آدمی ایک دوسرے کے پیچھے بیٹھ کر مشاہدات فلکی کرسکتے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کی غلطیاں بھی معلوم کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح ایک ہی وقت بیس آدمی فلکیات کے متعلق آلات سے مسلح ہوکر مشاہدات فلکی کرسکتے ہیں۔

الغرض اس عظیم الشان رصدگاہ میں اجرام سماوی کی نقل وحرکت دیکھی جاسکتی تھی۔ اور علم ہیئت کے متعلق صحیح نتائج اخذ کیے جاسکتے تھے۔ رصدگاہ کا نظریہ ہم اس لئے صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ ہرم اعظم کے تمام خفیہ راستوں اور گرانڈ گیلری کی جملہ تفصیلات کی تطبیق اسی نظریہ سے ہوتی ہے اور اگر یہ نظریہ تسلیم نہ کیا جائے تو بہت سی باتوں کی صحیح توجیہ و تاویل نہیں کی جاسکتی۔ لہذا ہرم اعظم کی تعمیر کا اوّل حصہ تو رصدخانہ تھا۔ مگر بعد کو جب ملک خوفو کا انتقال ہوگیا تو اسی میں اس کا مقبرہ بھی بنادیا گیا۔

علم احکام النجوم کا اثر

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک خوفو فرعون مصر کو مشاہدات فلکی سے ایسی کیا دلچسپی تھی جو یہ رصدخانہ تعمیر کیا گیا ؟ اس کا ایک معقول جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی آج کل کی طرح علم احکام النجوم یا جوتش پر زبردست عقیدہ رکھتے تھے۔ اس زمانہ کے جوتشیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ نہ صرف اجرام سماوی کی نقل وحرکت کا مطلب سمجھتے ہیں بلکہ جو کچھ اثر ستاروں کی گردش کا حیات انسانی پر پڑتا ہے اس سے بھی واقف ہیں۔ ان لوگوں کا یہ دعویٰ نہیں تھا کہ وہ واقعی اجرام سماوی پر حکومت رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ یہ کہتے تھے کہ ستاروں کی چال دیکھ کر وہ یہ بتاسکتے ہیں کہ اس کا حیات انسانی پر کیا نیک و بد اثر پڑے گا۔ اور بد اثر سے کیونکر بچ سکتے ہیں۔ ان کا یہ محض دعوےٰ ہی نہیں تھا بلکہ زمانۂ حال کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی طرح وہ اس عقیدہ پر ایمان بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ ملک خوفو فرعون مصر کا اعتقاد تھا کہ وہ اس رصدخانہ کے ذریعہ سے اجرام سماوی کی نقل وحرکت دیکھ کر مستقبل کے حالات معلوم کرسکتا ہے۔ اور یہ بھی جان سکتا ہے کہ دشمنوں پر کیونکر فتح حاصل ہو۔ اس لئے اس نے یہ عظیم الشان رصدخانہ تعمیر کرایا تاکہ اس کی سلطنت کے معاملات احکام سماوی کے مطابق انجام پذیر ہوں

دیگر اہرام

اس وقت مصر میں کم از کم چھتیس ہرم اور بھی موجود ہیں۔ لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس کے اندر ہرم اعظم کی طرح راستے، خفیہ ایوان اور گیلریاں وغیرہ ہوں اور نہ ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی دلچسپی یا قدیم روایت متعلق ہے۔ انھیں معمولی مگر عظیم الشان مقبرہ سمجھنا چاہیئے۔ ان کے متعلق کوئی ثبوت ایسا نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ ان کی تعمیر کا مقصد مقبرہ کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔

فراستُ التحریر مکمل

یعنی اُردو اور انگریزی رسم خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت، چال چلن، مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنیکا فن اُردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت علاوہ محصول ۸ر

مینجر نگار

سیزر و کلیوپٹرا

(ڈرامہ برنارڈ شا)

(مسلسل)

موسیقار:۔ اونہہ۔ وہ تو صرف ایک کنیز ہے، وہ تو ایک کتے کی طرح سیکھتی ہے۔

کلیوپٹرا:۔ اچھا تو میں بھی ایک کتے کی طرح سیکھوں گی کیونکہ وہ تم سے اچھا بجاتی ہے تم روزانہ ایک عشرہ تک مجھے سبق دیا کرو۔ (موسیقار جلدی سے کھڑا ہو کر آداب شاہانہ بجالاتا ہے) اس کے بعد اگر میں کوئی غلط راگ بجاؤں تو تم کو دُرّے لگائے جائیں گے اور اگر میں اس کثرت سے غلطیاں کروں کہ تازیانے لگانے کا موقع نہ رہے تو تم کو دریائے نیل میں ڈال دیا جائے گا۔ تاکہ گھڑیال نگل لیں۔ اس لڑکی کو ایک اشرفی دے کر ان سب کو رخصت کرو،

موسیقار:۔ (بہت گھبراکر) لیکن ایک سچے ماہر فن پر اس قدر دباؤ نہ ڈالنا چاہیئے۔

فتاتا:۔ (دھکا دیتے ہوئے) یہ کیا ہے ملکہ کو جواب دیتا ہے نکل باہر۔ کمبخت۔

(فتاتا اسے دھکے مار کر باہر کر دیتی ہے لڑکی اس کے پیچھے اپنا ساز لئے ہوئے جاتی ہے اور غلاموں اور عورتوں کا ایک قہقہہ ان کے پیچھے بلند ہوتا ہے)

کلیوپٹرا:۔ کیا تم میں سے کوئی میرا دل بہلا سکتا ہے؟ کیا تم کو کوئی خبر یا کہانی یاد ہے؟

ایراس:۔ فتاتا ——

کلیوپٹرا:۔ اونہہ۔ فتاتا، فتاتا، ہمیشہ فتاتا ہی کا ذکر رہتا ہے، کوئی نئی کہانی سناؤ۔

ایراس:۔ نہیں اس مرتبہ فتاتا بڑی خوش قسمت نکلی۔ . . . .

(سب عورتیں ہنس پڑتی ہیں غلام چپ رہتے ہیں)

کلیوپٹرا:۔ (غصہ ہوکر) مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس بربط نواز لڑکی کو کتنے سونے کے سکے دینے پڑیں گے۔؟

ایراس:۔ یہ ہم آسانی سے معلوم کر کے آپ کو بتا سکتے ہیں۔ (سب عورتیں ہنس پڑتی ہیں)

کلیوپٹرا:۔ (غضبناک انداز سے) تم ہنس رہی ہو۔ لیکن میں کسی وقت بتادوں گی کہ اسی طرح میری اطاعت کی جانی چاہیئے؟ جیسے سیزر کی کی جاتی ہے

چارمیاں:۔ لمبی ناک والی (سب ہنس پڑتی ہیں)

کلیوپٹرا:۔ (غصہ سے) خاموش اے چارمیاں، بیوقوف چھوٹی لڑکی نہ بن۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ میں تم سب

کو کیوں اس قدر گستاخانہ گپ شپ کرنے دیتی ہوں
حالانکہ مجھے تمھارے ساتھ فتاتا کا سلوک کرنا چاہیئے

چارمیاں :- کیونکہ آپ ہر بات میں سیزر کی نقل کرنا چاہتی ہیں۔ اور وہ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے۔ کہ جو چاہے کرے۔

کلیوپیٹرا: نہیں ایک دن اس سے میں نے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے تو اس نے کہا "اپنی عورتوں کو باتیں کرنے دو۔ ان کی گفتگو سے تم کو کوئی خاص بات معلوم ہو جائے گی۔ "مجھے ان سے کیا معلوم ہوگا۔؟ میں نے پوچھا "ان کی حقیقت" اس نے جواب دیا۔ اور ہاں جیسے ہی کہ اس نے یہ کہا تم نے اس کی آنکھیں دیکھی ہوں گی او کم ظرفو۔ (سب ہنسنے لگتی ہیں۔ وہ غصہ سے ایراس سے مخاطب ہوتی ہے) تم کس پر ہنس رہی ہو؟ مجھ پر یا سیزر پر؟

ایراس :- سیزر پر!

کلیوپیٹرا :- اگر تم بیوقوف نہ ہوتیں تو مجھ پر ہنستیں۔ اور اگر تم بزدل نہ ہوتیں تو مجھ سے یہ کہتے ہوئے نہ ڈرتیں (فتاتا واپس آتی ہے) فتاتا یہ سب مجھ سے کہتی ہیں کہ تم نے پوتھینس کو میرے حضور میں پیش کرنے کے لئے رشوت لی ہے۔

فتاتا :- (قسم کھاکر) میں اپنے باپ کے دیوتاؤں کی قسم کھاکر کہتی ہوں ——

کلیوپیٹرا :- (قطع کلام کرتے ہوئے) کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ کسی جھوٹ بات کو چھپایا نہ کرو۔ اگر میں تم کو اجازت دوں تو تم دن بھر اپنے باپ کے دیوتاؤں کو شہادت دینے کے لئے پکارتی رہو گی تاکہ وہ آکر تمھاری خوبیوں پر وعظ کہیں، جاؤ رشوت لو۔ اور پوتھینس کو حاضر کرو (فتاتا جواب دینا چاہتی ہے) جواب نہ دو جاؤ۔

(فتاتا۔ باہر چلی جاتی ہے کلیوپیٹرا اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور کسی سوچ میں دروازہ سے کرسی تک ٹہلنے لگتی ہے۔ سب کھڑے ہو جاتے ہیں)

ایراس :- (اٹھتے ہوئے) ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ سیزر روم واپس چلا جائے۔

کلیوپیٹرا :- (دھمکاکر) جب وہ جائے گا تو وہ دن تمھارے لئے قیامت کے برابر ہوگا۔ تم کیوں یہ چاہتی ہو کہ وہ یہاں سے چلا جائے؟

چارمیاں :- کیونکہ وہ تم کو خوفناک حد تک عقلمند، سنجیدہ، عالم اور فلسفی بنائے دے رہا ہے اور اس عمر میں یہ ہمارے لئے بہت خطرناک ہے۔

(سب عورتیں ہنس پڑتی ہیں)

کلیوپیٹرا :- بس اب زبان بند کرو۔

چارمیاں :- (طنزیہ اعتراف سے) خوب۔ خوب ہم کو سیزر کے ساتھ رہنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(سب ہنستی ہیں کلیوپیٹرا زیادہ برہم ہو جاتی ہے۔ فتاتا پوتھینس کو لے کر واپس آتی ہے)

فتاتا :- (دروازہ پر سے) پوتھینس التجا کرتا ہے کہ۔

کلیوپیٹرا :- وہیں۔ وہیں۔ بس کافی ہے۔ اس کو اندر آنے دو (وہ اپنی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور پوتھینس

سو اسب بیٹھ جاتی ہیں۔ پوتھینس کمرہ کے بیچ میں آتا ہے)

فتاتا:۔ (اپنی پہلی جگہ پر کھڑی ہو جاتی ہے) پوتھینس تمہارے باغی دوستوں کے تازہ واقعات کیا ہیں بیان کرو۔

پوتھینس:۔ (تمکنت سے) میں باغیوں کا دوست نہیں ہوں۔ اور ایک قیدی کو تازہ خبریں نہیں سنائی دیتیں۔

کلیو پیٹرا:۔ تم مجھ سے زیادہ قیدی نہیں ہو۔ اور نہ سیزر سے زیادہ۔ گذشتہ چھ مہینے تک ہم لوگ رعایا کیوجہ سے محل میں محصور رہے۔ اب تم بالکل آزادانہ ساحل پر فوجوں کے ساتھ جا سکتے ہو"

پوتھینس:۔ تم ابھی ایک بچہ ہو کلیو پیٹرا اور واقعات کو نہیں سمجھ سکتیں۔

(عورتیں ہنستی ہیں کلیو پیٹرا اُسے غور سے دیکھتی ہے)

چارمیاں:۔ پوتھینس مجھے معلوم ہوا کہ تم کو تازہ خبریں نہیں معلوم؟

پوتھینس:۔ ہاں تم بتاؤ کیا ہے؟

چارمیاں:۔ یہ کہ کلیو پیٹرا اب بالکل بچہ نہیں ہے کیا میں تم کو بتاؤں کہ بہت زیادہ معمر کس طرح بن سکتے ہیں؟ اور بہت زیادہ عقلمند صرف ایک ہی دن میں کیونکر ہو سکتے ہیں۔

پوتھینس:۔ میں عقلمند بننے کو ترجیح دوں گا۔

چارمیاں:۔ اچھا تو روشن مینار کی چوٹی پر جاؤ۔ اور اپنے ساتھ کسی آدمی کو بھی لیتے جاؤ کہ وہ تمہارے سر کے بال پکڑ کر تم کو سمندر میں پھینک دے۔

(عورتیں قہقہہ مارتی ہیں)

کلیو پیٹرا:۔ وہ سچ کہتی ہے۔ پوتھینس اس کے بعد جب تم ساحل سے آلگو گے تو تمہارے دماغ سے بہت سے خیالات پریشاں رفع ہو جائیں گے۔

(عورتیں ہنستی ہیں کلیو پیٹرا کھڑی ہوتی ہے) جاؤ تم سب یہاں سے چلی جاؤ۔ میں پوتھینس سے خلوت میں گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ ان سب کو باہر نکال دو۔

فتاتا:۔ (وہ سب ہنستی ہوئی بھاگتی ہیں فتاتا ان کے جانیکے بعد دروازہ بند کر دیتی ہے) تم سب کس بات کی منتظر ہو؟

فتاتا:۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ ملکہ اکیلی ——

کلیو پیٹرا:۔ (قطع کلام کرتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے۔ کہ فتاتا اب مجھے تمہاری قربانی تمھارے باپ کے دیوتاؤں پر کرنا پڑے گی تاکہ وہ تم کو بتائیں کہ میں مصر کی ملکہ ہوں۔

(وہ دروازہ بھیڑتی ہوئی چلی جاتی ہے۔)

کلیو پیٹرا:۔ (پھر بیٹھتے ہوئے) ہاں پوتھینس یہ بتاؤ کہ تم نے میرے پاس آنے کے لئے فتاتا کو رشوت کیوں دی؟

پوتھینس:۔ (سنجیدگی سے اس کا مطالعہ کرتے ہوئے۔) کلیو پیٹرا یہ سچ ہے کہ تم بہت بدل گئی ہو۔

کلیو پیٹرا:۔ کیا تم روزانہ چھ مہینہ تک سیزر سے گفتگو کر چکے ہو؟ اگر کرو تو تم بھی تبدیل ہو جاؤ گے۔

پوتھینس:۔ یہ ایک عام بات ہے جو تم اس بے وقوف بڈھے سے کہہ رہی ہو۔

کلیو پیٹرا:۔ بیوقوف بنا ہوا بیوقوف! کاش میں بھی

ایسی ہی ہوتی۔

پوتھینس:۔ تم چاہتی ہو کہ تم بے وقوف بنائی جائیں یہ کیوں ؟

کلیوپیٹرا:۔ جب میں بیوقوف تھی تو میرا جو دل چاہتا تھا کر لیتی تھی۔ سوائے اس وقت کے جب فتا تا بجھے پیٹتی تھی۔ اب جبکہ سیزر نے مجھے عقلمند بنا دیا ہے تو میری پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے کسی کام کا تعلق ہی نہیں رہا کیونکہ اب میں وہی کرتی ہوں جو مجھے کرنا چاہئے۔ یہ عظمت ضرور ہے مگر مسرت نہیں۔ اگر سیزر چلا جائے تو مجھے توقع ہے کہ میں مصریوں پر حکومت کرسکوں گی۔ کیونکہ جو اہمیت سیزر کی میری نظروں میں ہے وہی میرے ارد گرد جمع رہنے والے بیوقوفوں میں میری ہے۔

پوتھینس:۔ (غور سے دیکھ کر) کلیوپیٹرا ممکن ہے کہ یہ جوانی کا غرور ہو۔

کلیوپیٹرا:۔ نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے،

پوتھینس:۔ (ہاں میں ہاں ملا کر) ممکن ہے ایسا ہی ہو۔

کلیوپیٹرا:۔ اچھا تو کہو تم مجھ سے کیا کہنے آئے تھے ؟

پوتھینس:۔ (پریشان ہوکر) میں ! کچھ نہیں۔

کلیوپیٹرا:۔ کچھ نہیں !

پوتھینس:۔ بس صرف اپنی —— آزادی کے لئے التجا کرنے۔ اور کچھ نہیں۔

کلیوپیٹرا:۔ اس کے لئے تم کو سیزر کے حضور میں سر تسلیم خم کرنا تھا —— نہیں پوتھینس تم کسی اور تدبیر سے آئے ہو۔ جس کا انحصار کلیوپیٹرا پر ہے۔ اب کلیوپیٹرا ملکہ ہے اس لئے تمہاری تدبیر اب کارگر نہ ہوگی۔

پوتھینس:۔ (تعظیماً سر جھکا کر) ایسا ہی ہے۔

کلیوپیٹرا:۔ (مسرور ہوکر) بیشک

پوتھینس:۔ (غور سے آنکھیں کلیوپیٹرا پر جماکر) تو کیا درحقیقت کلیوپیٹرا ملکہ ہے۔ اور سیزر کی قیدی اور غلام نہیں ؟

کلیوپیٹرا:۔ پوتھینس ہم سب سیزر کے غلام ہیں —— ہم سب جو مصر میں ہیں —— خواہ ہم اس کو پسند کریں یا نہ کریں۔ اور وہ جو اس کو سمجھنے کی کافی اہلیت رکھتی ہے سیزر کے جانے کے بعد یہاں حکومت کرے گی۔

پوتھینس:۔ تم سیزر کے جانے پر خوش ہوتی ہو۔

کلیوپیٹرا:۔ ہاں اگر میں خوش ہوتی بھی ہوں تو کیا ؟

پوتھینس:۔ کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتا ؟

کلیوپیٹرا:۔ مجھ سے محبت کرتا ہے ! پوتھینس ! سیزر کسی سے محبت نہیں کرتا۔ وہ کون ہیں جن کو ہم چاہتے ہیں۔ ؟ وہی جن سے ہم کو نفرت نہیں ہوتی اس کی فطرت میں نفرت نہیں ہے۔ وہ ہر ایک سے کتے اور بچوں کی طرح گھل مل جاتا ہے اس کی مہربانی دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا ہے۔ ماں باپ، انا، دایا نے کبھی میری اتنی خبرگیری نہیں کی۔ جتنی وہ کرتا ہے۔ یا کسی نے اپنے خیالات اس آزادی سے بیان کئے ہوں۔

پوتھینس:۔ اچھا تو کیا یہ محبت نہیں ؟

کلیوپیٹرا:۔ کیا جب وہ روم جانے لگے گا اور کسی لڑکی

سے ملاقات کرے گا۔ اور اس سے بھی ایسا ہی سلوک کرے گا تو یہ محبت ہوگی؟ اس کے غلام بری ٹینس سے پوچھو۔ وہ اس کو بہت عزیز ہے نہیں خود اس کے گھوڑے سے دریافت کرو۔ اس کی یہ عنایت مجھ پر میری کسی خصوصیت کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کی فطرت ہے۔

پوتھینس:۔ لیکن یہ تم کیونکر یقین سے کہہ سکتی ہو کہ وہ تم سے ایسی محبت نہیں کرتا جیسے اور مرد اور عورتوں سے کرتے ہیں؟

کلیوپیٹرا:۔ کیونکہ میں اُسے حاسد نہیں بنا سکتی میں نے بارہا آزمایا ہے۔

پوتھینس:۔ تو شاید اب مجھ کو یہ سوال کرنا چاہیئے۔ کہ کیا تم کو اس سے محبت ہے؟

کلیوپیٹرا:۔ کیا کوئی ایک دیوتا سے محبت کر سکتا ہے؟ اس کے علاوہ مجھے ایک اور آدمی سے محبت ہے ——— وہ جس کو میں نے سیزر سے بہت پہلے دیکھا تھا ——— دیوتا نہیں بلکہ ایک آدمی ——— وہ جو محبت بھی کر سکتا ہے اور نفرت بھی۔ وہ جس کو میں ضرر پہونچا سکتی ہوں اور جو مجھے بھی صدمہ پہنچا سکتا ہے۔

پوتھینس:۔ کیا سیزر کو یہ بات معلوم ہے؟

کلیوپیٹرا:۔ ہاں۔

پوتھینس:۔ اور یہ سنکر اُسے غصہ نہیں آیا؟

کلیوپیٹرا:۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُسے میری دلبستگی کے لیئے بھیجدے گا۔

پوتھینس:۔ یہ آدمی میری سمجھ میں نہیں آتا۔

کلیوپیٹرا:۔ (نفرت سے) تم سیزر کو سمجھنا چاہتے ہو؟ تم کس طرح سمجھ سکتے ہو (تمکنت سے) میں سمجھتی ہوں۔

پوتھینس:۔ (ایک منٹ سوچنے کے بعد) حضور نے آج مجھے باریابی کا شرف بخشا اب میرے لئے کیا حکم ہے؟

کلیوپیٹرا:۔ تم خیال کرتے ہو کہ میرے بھائی کو بادشاہ بناکر مصر میں حکومت کرو گے، کیونکہ تم اس کے سرپرست ہو۔ اور وہ ایک نادان بچہ ہے۔

پوتھینس:۔ ملکہ کو اختیار ہے جو چاہیں فرمائیں۔

کلیوپیٹرا:۔ ہاں تو ملکہ کو یہ بھی کہنے کا اختیار ہے کہ سیزر تم کو اور اچیلس کو نگل جائے گا۔ اور میرے بھائی کو بھی، جیسے ایک بلی چوہوں کو نگل جاتی ہے۔ اور وہ مصر کو اس طرح اپنے قابو میں کرلے گا۔ جیسے ایک گڈریا اپنی کملی کو بغل میں دبالیتا ہے۔ اور جب وہ سب کچھ کر چکے گا تو روم واپس جائے گا۔ اور کلیوپیٹرا کو اپنا وزیر بناکر یہیں چھوڑ دے گا۔

پوتھینس:۔ (غصہ سے جلاکر) یہ وہ تمام عمر نہ کرے گا اس کے دس کے مقابلے میں ہمارے پاس ہزار موجود ہیں۔ اور ہم اس کو اور اس کی بھکاری فوج کو مار کر سمندر پار اُتار دیں گے۔

کلیوپیٹرا:۔ (انداز نفرت سے جانے کے لئے کھڑی ہوتی ہے) تم نے بالکل ایک کمینہ کی سی باتیں کی ہیں۔ جاؤ اور اپنے ہزاروں کو لڑنے پر آمادہ کرو۔ بہت جلد۔ کیونکہ پرگاماس سیزر کی اعانت کے لئے قریب

آپہنچا ہے۔ سیزر نے تم کو خلیج کے کنارے دو فوجی دستوں سے روک رکھا ہے اب ہم کو دیکھنا ہے کہ وہ بیس فوجی دستوں سے کیا کرتا ہے

پوتھینس:۔ کلیوپیٹرا ——

کلیوپیٹرا:۔ بس بس۔ سیزر نے تمہاری طرح کمزور اور مہمل باتیں کرکے مجھے برباد کر دیا ہے (وہ چلی جاتی ہے۔ پوتھینس غصہ کا سا چہرہ بنائے ہوئے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ مگر فتاتا داخل ہو کر روک لیتی ہے)

پوتھینس:۔ مجھے اس ذلیل مقام سے نکل جانے دو۔

فتاتا:۔ تم غصہ کیوں ہوتے ہو ؟

پوتھینس:۔ خدا کرے مصر کے تمام دیوتاؤں کا قہر اس پر نازل ہو۔ اس نے اپنا ملک رومی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

فتاتا:۔ بے وقوف کیا اس نے تم سے یہ نہیں کہا کہ سیزر یہاں سے چلا جائے تو اچھا ہے ؟

پوتھینس:۔ کیا تم نے سنا ہے ؟

فتاتا:۔ مجھے پہلے ہی سے فکر تھی کہ جب تم اس کے ساتھ تنہا ہو تو کسی ایماندار عورت کا بھی قریب رہنا ضروری ہے۔

پوتھینس:۔ خدا کی قسم ——

فتاتا:۔ بس کرو، اپنے خداؤں کو۔ یہاں سیزر کے خدا سب سے زیادہ طاقتور ہیں۔ کلیوپیٹرا کے پاس آنے سے تم کو کوئی فائدہ نہیں۔ تم صرف ایک مصری ہو وہ اپنے نسل والوں میں سے کسی کی بھی نہ سنے گی وہ ہم سب سے بچوں کا سا برتاؤ کرتی ہے۔

پوتھینس:۔ خدا کرے وہ غارت ہو جائے

فتاتا:۔ (بد دعا دیتے ہوئے) خدا کرے تمہاری زبان اس خواہش کی دعا کرنے میں سڑ جائے۔ جاؤ اور لوسیس پمپئی کے قاتل کو بلواؤ۔ وہ ایک رومی ہے ممکن ہے کہ کلیوپیٹرا اس کی سن لے۔ جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔

پوتھینس:۔ مجھے معلوم ہے کہ اب کس کے پاس جانا چاہیئے۔

فتاتا:۔ (شبہ کرتے ہوئے) کس کے پاس ؟

پوتھینس:۔ لوسیس سے بڑے آدمی کے پاس مگر وہ بات یاد کرو۔ جب تم نے سیزر کے آنے سے قبل سوچا تھا کہ مصر پر تمہاری حکمرانی ہو۔ اذ میں اس کی مخالفت پر آمادہ ہوا تھا ——

فتاتا:۔ (قطع کلام کرکے) تاکہ تم خود اس پر حکومت کرو۔

پوتھینس:۔ خیر ہم ہوں یا تم۔ دونوں ایک ایسی عورت سے ہر لحاظ سے بہتر ہیں جس کا دل رومی ہو۔ جب تک میں زندہ ہوں وہ حکومت نہیں کر سکتی۔ اس لئے تم اپنی رہنمائی آپ کرو۔

(وہ چلا جاتا ہے)

کھانے کا وقت قریب آتا جاتا ہے محل کی چھت پر میز بچھی ہوئی ہے۔ روفیو اوپر چڑھ رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ ایک غلام تپائی لئے ہوئے آرہا ہے۔ متعدد سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ چھت پر پہنچ جاتے ہیں، ہلکے ہلکے پردے شمالی اور مشرقی ستونوں پر دھوپ روکنے کے لئے پڑے ہوئے ہیں۔

افسر، روفیو کو ان میں سے ایک سایہ دار مقام پر لے جاتا ہے۔ پردوں کو الگ الگ کھینچنے کے لئے ایک رسّی ستونوں کے درمیان لٹکی ہوئی ہے۔

افسر:- (جھک کر) رومی سردار کو یہاں سیزر کا انتظار کرنا چاہئے۔

(غلام بالکل جنوبی ستونوں کے قریب تپائی رکھ دیتا ہے۔ اور پردہ کے اندر غائب ہو جاتا ہے)

روفیو:- (بیٹھتے ہوئے) اوہ یہ بڑی چڑھائی تھی۔ ہم کس قدر بلندی پر پہنچ گئے ہیں۔

افسر:- ہم محل کی چھت پر ہیں۔

روفیو:- خوب۔ اب ہم کو اور سیڑھیاں چڑھنا نہیں ہیں۔

(مخالف سمت سے ایک اور افسر داخل ہوتا ہے)

دوسرا افسر:- سیزر آرہا ہے۔

(سیزر غسل کے بعد ایک ارغوانی رنگ کے ریشمی لباس میں داخل ہوتا ہے اس کے پیچھے دو غلام ہیں جو ایک گدے دار کرسی لا رہے ہیں۔ وہ اسے بالکل شمال میں دو ستونوں کے بیچ میں رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پردوں میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ اور دونوں سردار سر جھکا کر چلے جاتے ہیں۔ روفیو سیزر کے استقبال کو کھڑا ہو جاتا ہے۔)

سیزر:- (اس کے قریب آکر) کیوں روفیو؟

(اس کے لباس کو استعجاب سے دیکھ کر) ایک نیا لباس تلوار کے لئے ایک نئی سنہری میان۔ اور تم نے اپنے بال بھی ترشوا لئے ہیں، لیکن داڑھی نہیں؟

(وہ روفیو کی داڑھی سونگھتا ہے) ہاں اولمپس کی قسم۔ معطر ہے۔

روفیو:- ہاں تو کیا۔ یہ میرے خوش کرنے کے لئے ہے؟

سیزر:- (پیار سے) نہیں میرے بچے روفیو۔ بلکہ خود کو خوش کرنے کے لئے۔ اپنی سالگرہ منانے کی خاطر،

روفیو:- (نفرت سے) تمھاری سالگرہ۔ تمھاری سالگرہ تو ہمیشہ اس وقت ہوتی ہے جب کوئی حسین لڑکی مل جاتی ہے۔ یا کسی ایلچی سے دوستی پیدا کرنا مقصود ہو۔ گذشتہ مہینے میں تقریباً سات سالگرہ ہوئیں۔

سیزر:- (اعتراف کرتے ہوئے) یہ سچ ہے روفیو اب میں خود کو کبھی ان فریبوں میں گرفتار نہ کروں گا۔

روفیو:- ہمارے ساتھ کلیوپیٹرا کے سوا اور کون کھانا کھائے گا؟

سیزر:- سسلی کا اپالوڈورس۔

روفیو:- وہ ظریف مسخرا۔ پاپن جے۔

سیزر:- پاپن جے ایک دلچسپ کتا ہے —— کہانی کہتا ہے۔ گانا گاتا ہے اور ملکہ کی خوشامد کرنے سے ہم کو بچاتا ہے اُسے بڈھے سیاست دانوں اور ہم جیسے جنگلی ریچھوں کی کیا پروا ہے۔ نہیں اپالوڈورس ایک اچھا رفیق ہے۔

روفیو:- ہاں۔ لیکن اگر اُسے یہ معلوم ہو جائے کہ زبان کس طرح بند رکھنی چاہئے تو شاید وہ بدترین ثابت ہو۔

سیزر:- خدا کرے اُسے کبھی اس کا علم نہ ہو۔ اُف،

یہ فوجی زندگی - یہ بوجھل بے رحم عملی زندگی، ہم رومیوں کی بڑی شامت یہی ہے - ہم صرف کام کرنے والے مزدور ہیں ——— ایک کھیوں کا گروہ جن کو آدمی بنا دیا گیا ہے کاش مجھے ایک اچھی باتیں کرنے والا مل جائے ——— ایسا جس کی باتوں میں خوش مذاقی اور تخیل آرائی اتنی ہو کہ بغیر کچھ اور کئے ہوئے زندہ رہ سکوں۔

روفیو :- ہاں کھانا ختم ہونے کے بعد اُسے تم سے گفتگو کرنے کا بہت اچھا موقع ملے گا۔ کیا تم نے اس بات پر غور کیا کہ میں وقت سے پہلے آیا ہوں ؟

سیزر :- اہاہا- میں نے سوچا کہ اس کا ضرور کوئی مطلب ہے ؟ کیا ہے بولو ؟

روفیو :- کیا یہاں ہماری باتیں کوئی اور سن سکتا ہے ؟

سیزر :- اس تخلیہ کے لئے پردہ ڈالنے کی ضرورت ہو میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں

(وہ تالی بجاتا ہے - پردے ڈال دیے جاتے ہیں۔ چھت کے بیچ میں ایک میز نظر آتی ہے جو چار آدمیوں کے لئے ہے سیزر اور روفیو کے قریب شراب کے بلوریں جام اور صراحیاں رکھی ہیں - ایک بارعب سردار متعدد غلاموں کے ساتھ انتظام میں مصروف ہے - یہاں سے مغرب کی جانب جو دالان سا چلا گیا ہے اس کے آخر میں کھڑکی سی ہے - جس سے آسمان نظر آتا ہے اس کے بیچ میں را کا مجسمہ ہے) اب ہر شخص ہم کو دیکھ سکتا ہے کوئی ہماری باتیں سننے کا ارادہ نہ کریگا

(وہ غلاموں کے قریب گدّے دار کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

روفیو :- (تپائی پر بیٹھتے ہوئے) پوتھینس تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہے - میں تم کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اس سے ملو- یہاں عورتوں میں سازشیں ہو رہی ہیں ؟

سیزر :- پوتھینس کون ہے ؟

روفیو :- جس کا سر گلہری کی کھال کی طرح ہے - چھوٹے بادشاہ کا سرپرست جس کو تم نے قید کر رکھا تھا۔

سیزر :- (گھبرا کر) اور کیا وہ فرار نہیں ہو گیا ؟

روفیو :- نہیں۔

سیزر :- (اٹھتے ہوئے) کیوں، تم دشمن کی نگرانی کرنے کے بجائے اس شخص کی حفاظت کرتے رہے - کیا میں نے تم سے ہمیشہ نہیں کہا کہ قیدیوں کو بھاگ جانے دو- جب تک اس کے خلاف تم کو کوئی حکم نہ دیا جائے۔ کیا اور بہت سے کھانے والے نہیں ہیں ؟

روفیو :- ہاں - اور اگر تم میں ذرا بھی سمجھ ہے - اور مجھے اس کی گردن الگ کرنے کی اجازت دو تو تم اس کا حصہ بچا سکو گے - بہرکیف وہ بچ کر نہیں جا سکتا - تین سنتریوں نے اس سے کہا کہ اگر وہ پھر دکھائی دیا تو اس کی خیر نہیں - اس کے سوا وہ اور کیا کر سکتے ہیں مگر وہ یہاں ٹھہر کر پوشیدہ طور پر ہمارے حرکات و نقل دیکھنا چاہتا ہے۔

سیزر :- (بیٹھتے ہوئے) تو وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

روفیو :- ہاں میں اس کو اپنے ساتھ لایا ہوں - وہ پردہ میں بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔

سیزر :- اور تم چاہتے ہو کہ میں اس سے ملاقات کروں۔

روفیو :- مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں - میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جو تمہارے دل میں آئے گا وہی

کروگے۔ مجھے شامل نہ کرو۔

سیزر:۔ اچھا۔ اچھا اُسے آنے دو۔

روفیو:۔ (پکار کر) او محافظ۔ اپنے آدمی کو چھوڑ دے اور یہاں آنے دے (اشارہ سے) یہاں آؤ۔

(پوتھینس آکر دونوں کے بیچ میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ایک کو اور کبھی دوسرے کو دیکھنے لگتا ہے۔)

سیزر:۔ (متانت سے) پوتھینس میں تم کو خوش آمدید کہتا ہوں کہو کیا خبر لائے؟

پوتھینس:۔ سیزر! میں تم کو ایک خطرہ سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔ اور ایک نذر پیش کرنے کو حاضر ہوا ہوں۔

سیزر:۔ خطرہ کا خیال نہ کرو۔ نذرانہ پیش کرو۔

روفیو:۔ نذر کا خیال نہ کرو۔ خطرہ سے آگاہ کرو۔

پوتھینس:۔ سیزر تمہارا خیال ہے کہ کلیوپیٹرا تمہاری پرستار ہے۔

سیزر:۔ (متانت سے) میرے دوست میں جو کچھ سوچتا ہوں، جانتا ہوں۔ تم نذر پیش کرو۔

پوتھینس:۔ میں صاف صاف کہتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تم نے کن عجیب دیوتاؤں کی مدد سے محل اور ساحل کو محفوظ رکھا۔ اب ہم کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ہم تمہارے دیوتاؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور ان پر فتح نہیں پا سکتے۔ میں اب تم کو دھمکاتا نہیں ——

روفیو:۔ (طنزاً) یہ آپ کی عنایت ہے

پوتھینس:۔ دیوتاؤں نے شمال مغربی ہواؤں کو اس لئے بھیجا تھا کہ ہم تم کو اپنے قبضہ میں رکھیں لیکن تم ان ہواؤں سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئے۔

سیزر:۔ (نہایت اخلاق سے درخواست کرتے ہوئے۔ کہ وہ اصل موضوع پر آئے) ہاں میرے دوست پھر؟

روفیو:۔ بھلے آدمی جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو۔

پوتھینس:۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ تمہارے خیمہ میں ایک باغی موجود ہے —— کلیوپیٹرا۔

میجر ڈومو:۔ (اطلاع دیتے ہوئے) ملکہ تشریف لا رہی ہیں

(روفیو اور سیزر کھڑے ہو جاتے ہیں)

روفیو:۔ (پوتھینس کے کان میں) تم کو پہلے ہی سب کچھ بک ڈالنا تھا۔ اب وقت گذر گیا۔

(کلیوپیٹرا نہایت قیمتی لباس میں داخل ہوتی ہے۔ اور سیزر کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اس کی سہیلیاں فتاتا کی نگرانی میں میز کے پاس آکر جمع ہو جاتی ہیں۔ سیزر کلیوپیٹرا کی خاطر اپنی نشست خالی کر دیتا ہے جس کو وہ قبول کر لیتی ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (تیزی سے پوتھینس کو دیکھ کر) یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔

سیزر:۔ (اس کے قریب انتہائی مشفقانہ انداز سے بیٹھ کر) تمہارے متعلق مجھ سے کچھ کہنے جا رہا ہے۔ تم ابھی خود سنو گی۔ ہاں تو شروع کرو پوتھینس۔

پوتھینس:۔ (آزردہ خاطر ہو کر) سیزر (اس کی زبان لکنت کرنے لگتی ہے)

سیزر:۔ ہاں کہو۔

پوتھینس:۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں صرف تمہارے کانوں کے لئے ہے۔ ملکہ کے لئے نہیں۔

کلیوپیٹرا:۔ (غصہ کو روکتے ہوئے) یہاں ایسے ذرائع بھی

ہیں جو تم کو بولنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ اس کا خیال رہے۔

پوتھینس:۔ سیزر ان ذریعوں کو عمل میں نہیں لاتا۔

سیزر:۔ میرے دوست۔ جب ایک آدمی کو اس دنیا میں کچھ کہنا ہوتا ہے تو مشکل یہ نہیں ہوتی کہ اس سے کہلایا جائے۔ بلکہ اسے بار بار کہنے سے روکا جائے۔ مجھے اپنی سالگرہ کی تکمیل اس طرح کرنا ہے کہ تم کو رہا کر دوں۔ جاؤ خدا حافظ۔ اب ہم آیندہ پھر نہ ملیں گے۔

کلیوپیٹرا:۔ (غصہ سے) سیزر یہ رحم بیوقوفی کی دلیل ہے۔

پوتھینس:۔ (سیزر سے) کیا آپ تنہائی میں میری دو باتیں سننا پسند نہ کریں گے۔ ممکن ہے کہ آپ کی زندگی کا انحصار اسی پر ہو (سیزر کھڑا ہو جاتا ہے)

روفیو:۔ (آہستہ آہستہ پوتھینس سے) گدھے۔ اب ہم کو کچھ دیری کے منظر دیکھنے پڑیں گے۔

سیزر:۔ پوتھینس ——

روفیو:۔ (قطع کلام کرتے ہوئے) سیزر کھانا برباد ہو جائیگا، اگر تم اپنی زندگی اور موت پر خطبہ پڑھنے کو بیٹھے رہو گے۔

کلیوپیٹرا:۔ خاموش رہو روفیو۔ میں سیزر کی باتیں سننا چاہتی ہوں۔

روفیو:۔ (جیسے اس نے نہیں سنا) ملکہ نے اس کو پہلے بھی سماعت فرمایا ہے۔ آپ نے اپالوڈورس سے گذشتہ ہفتہ ارشاد فرمایا تھا۔ اور اس نے سوچا کہ یہ سب آپ ہی کا تھا (سیزر کی تمکنت کو صدمہ پہونچتا ہے وہ بیٹھ جاتا ہے اور کلیوپیٹرا کو گھورنے لگتا ہے۔ جس کے چہرہ سے غصہ کے آثار ہویدا ہیں۔ روفیو بدستور کہتا ہے) او محافظو اس قیدی کو نکل جانے دو۔ وہ رہا کر دیا گیا ہے (پوتھینس سے) یہاں سے چلے جاؤ تم نے اپنا موقع کھو دیا۔

پوتھینس:۔ (غصہ سے مغلوب ہو کر) میں بولوں گا۔

سیزر:۔ (کلیوپیٹرا سے) تم دیکھ رہی ہو۔ سختی سے وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالتا۔

پوتھینس:۔ سیزر تم نے کلیوپیٹرا کو وہ اصول بتا دئیے ہیں جن سے رومی دنیا پر حکومت کرتے ہیں۔

سیزر:۔ افسوس وہ خود اپنے آپ پر حکومت نہیں کر سکتے۔ پھر اس کا نتیجہ؟

پوتھینس:۔ اس کا نتیجہ! کیا تم اُس کے حسن سے اسقدر متاثر ہو چکے ہو کہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ وہ تن تنہا مصر پر حکمرانی کرنے کے لئے بے چین ہے۔ اور اس کا دل تمہاری واپسی کا متمنی ہے۔

کلیوپیٹرا:۔ (اٹھتے ہوئے)، جھوٹا۔

سیزر:۔ (حیرت زدہ ہو کر) کیسے اعتراضات، کیسے اختلافات، بہتان؟

کلیوپیٹرا:۔ (شرمندہ ہو کر مگر غصہ سے کانپتے ہوئے) نہیں مجھ میں انکار کرنے کی جرأت نہیں اس کو کہنے دو۔

(وہ بیٹھ جاتی ہے)

پوتھینس:۔ میں نے خود اس کی زبان سے سنا ہے۔ کہ اس کے بھائی کے سر سے تاج اتار کر خود اس کے سر پر رکھو گے۔ اور خود اپنے کو بھی اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دو گے

سیزر:۔ (خاموشی سے) اچھا میرے دوست اور کیا یہ بالکل فطرت کے مطابق نہیں ہے؟

پوتھینس:۔ فطری؟ کیا مکاری پر تمھیں غصہ نہیں آتا۔

سیزر:۔ غصہ۔ او بے وقوف مصری۔ مجھے غصہ کرکے کیا کرنا ہے؟ کیا مجھے ہوا پر غصہ آتا ہے جب وہ سارے جسم میں لرزہ پیدا کر دیتی ہے۔ کیا میں رات سے برہم ہوتا ہوں جب اس کی تاریکی میں اکثر ٹھوکریں کھا کھا کر مجھے گرنا پڑتا ہے۔ یا میں جوانی کو قہر کے انداز سے دیکھتا ہوں جب وہ چلی جاتی ہے۔ مجھ سے ایسی باتیں کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ کل سورج طلوع ہوگا۔

کلیوپیٹرا:۔ (برداشت نہ کرتے ہوئے) لیکن یہ غلط ہے یہ جھوٹ ہے۔ میں قسم کھاتی ہوں۔

سیزر:۔ گو تم نے ہزاروں دفعہ قسم کھائی اور جو قسم کھائی اس پر میں نے یقین کیا، تاہم یہ سچ ہے۔

(وہ بے حد مضطرب ہو جاتی ہے۔ اسے پردہ کے اندر چھپانے کی غرض سے وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور پوتھینس کو روفیو کے پاس لے جا کر کہتا ہے) ادھر آؤ روفیو۔ مجھے پوتھینس سے کچھ کہنا ہے (وہ روفیو اور پوتھینس کو ساتھ لے کر باتیں کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔) پوتھینس اپنے دوستوں کو سمجھاؤ کہ میں ایک معقول اور مناسب فیصلہ کی مخالفت نہ کروں گا

(سب لوگ سنتے ہوئے چلے جاتے ہیں)

کلیوپیٹرا:۔ (چپکے سے) فتاتا۔ فتاتا۔

فتاتا:۔ (میز کے قریب سے اٹھ کر اس کے پاس جاتی ہے اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر) میری بچی۔ گھبراؤ نہیں اطمینان کی سانس لو۔

کلیوپیٹرا:۔ (قطع کلام کرتے ہوئے) کیا وہ لوگ ہماری باتیں سن سکتے ہیں۔

فتاتا:۔ نہیں۔ میرے دل کے ٹکڑے۔ نہیں۔

کلیوپیٹرا:۔ تو غور سے سنو۔ اگر وہ محل سے زندہ چلا جائے تو پھر کبھی میری صورت نہ دیکھنا۔

فتاتا:۔ وہ؟ اُف۔

کلیوپیٹرا:۔ (منہ پر مارتے ہوئے) اس کو اس طرح مارو جیسے میں تمھارے منہ پر مار رہی ہوں۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرا دو۔ اس کو پتھروں پر گرا کر ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر دو۔ اس کو مار ڈالو۔ ہلاک کر دو۔

فتاتا:۔ (بتیسی دکھا کر) کتنا مارا جائے گا۔

کلیوپیٹرا:۔ اگر تم اس میں ناکام رہو تو ہمیشہ کے لئے کالا منہ کر لینا۔ مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔

فتاتا:۔ بہتر ہے، جب تک اس کی آنکھیں نہ پھوڑ ڈالی جائیں تم میری صورت نہ دیکھنا۔

(سیزر زرق برق لباس میں، روفیو اور اپالوڈورس کے ساتھ آتا ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (فتاتا سے) جلد آؤ۔ جلد فتاتا ایک لمحہ کے لئے اپنی معنی خیز نگاہیں اس پر ڈالتی ہے۔ پھر دانت پیستی ہوئی۔ ان کے پاس سے گذر جاتی ہے

(کلیوپیٹرا ایک غزال رعنا کی طرح سیزر کے پاس دوڑ جاتی ہے)

سیزر:۔ تم پھر میرے پاس آگئیں۔

(باقی آئندہ)

نانا صاحب کے قصر میں ایک بیس سال کی حسین نوجوان لڑکی تھی جسے نانا صاحب کے باپ نے پرورش کیا تھا۔ نانا صاحب بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس لڑکی نے ہر چند اسی قصر ظلم واستبداد میں پرورش پائی تھی، لیکن قدرت نے اُسے عجیب طرح کا دردمند دل عطا کیا تھا۔ اور وہ رعایا کی دردناک حالت دیکھ کر بہت کُڑھا کرتی تھی — اگر کبھی وہ نانا صاحب سے اس کا ذکر کرتی اور اس کو لوگوں کی تباہ حالت کی طرف توجہ دلاتی تو وہ جواب دیا کرتا کہ

"میں زندگی کی جس راہ سے گزر رہا ہوں اس کا حال تجھے نہیں معلوم، لیکن تو عنقریب دیکھے گی کہ نانا صاحب خائن نہیں ہے جیسا کہ لوگ اسے سمجھتے ہیں اور نہ وہ انگریزوں کا کاسہ لیس بننا چاہتا ہے جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے۔"

نانا صاحب ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوا تھا اور زمانہ کا سرد و گرم کافی دیکھ چکا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ رعایا کا کیا حال ہے، وہ اچھی طرح واقف تھا کہ غریب ہندوستان اپنے سرمایہ دار مالک کے لئے کیونکر اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے۔ اور اس نے عہد کیا تھا کہ اپنی قوم کو اس عذاب سے ضرور نجات دلائے گا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ غدر شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے ہندوستان کے تمام حصّوں میں آگ مشتعل ہو گئی۔ نانا صاحب نے بھی اس فرصت کو غنیمت جان کر اپنے خواب آزادی کی تعبیر ڈھونڈھنا چاہی، لیکن اس نے بجائے اعلان بغاوت کے خود اپنی ہی قوم کے لوگوں کو ستانا شروع کیا اور انگریزوں کی اعانت کی تاکہ وہ اور پامال کریں۔

— اس میں نانا صاحب کا کیا راز مستور تھا؟ اس نے کیا تدبیر سوچی تھی؟ اس کا علم کسی کو نہ تھا۔

شہر کی سڑکوں پر آرائشی جھنڈیاں اڑ رہی ہیں، پھولوں سے دروازے آراستہ کئے جا رہے ہیں۔ اور ایک بڑے میدان میں کسی جلسہ کا اہتمام ہو رہا ہے — کوئی بڑا انگریزی افسر آنے والا ہے، اور نانا صاحب کے حکم سے تمام مخلوق اس کی پزیرائی کے لئے میدان میں جمع ہو رہی ہے۔

وقت معینہ پر انگریز افسر آیا، نہایت تزک و احتشام کے ساتھ نانا صاحب نے اس کا استقبال کیا اور بلند چبوترہ پر اس کو بٹھا دیا — نانا صاحب داہنی طرف بیٹھا ہوا تھا اور وہ لڑکی بائیں جانب — فوج چاروں طرف احاطہ کئے ہوئے تھی

انگریز افسر کھڑا ہوا اور یوں مخاطب ہوا: —

"حاضرین! ہم آج تمہاری سرزمین میں فاتحانہ داخل ہوئے ہیں اور جس جس نے تم دو سرکشی کی ہے اس کو پوری سزا دے چکے ہیں۔ لیکن آج میں یہاں تمہارے سردار نانا صاحب کے بلانے پر آیا ہوں جو ہمارا دوست و حلیف ہے اس لئے بتاؤ کہ تم صلح کے خواہشمند ہو یا جنگ کے تاکہ ہم دوستانہ ہاتھ بڑھائیں اگر تم امن کے طالب ہو یا آگ اور خون برسائیں اگر جنگ چاہتے ہو"

یہ سننے کے بعد مجمع میں ہلچل پیدا ہوگئی اور چاروں طرف سے برہمی کے آثار نمودار ہونے لگے ——— انگریز افسر نے یہ سمجھ کر کہ اس نے لوگوں کو ڈرانے میں غالباً احتیاط سے کام نہیں لیا، اپنی تقریر کا رُخ بدلنا چاہا، لیکن ناناصاحب فوراً کھڑا ہوگیا اور اس نے قوم کو مخاطب کر کے کہا :-

"تم لوگ بزدل ہو، ذلیل ہو، بے غیرت ہو، افسوس ہے کہ غیروں کی حکومت کا جُوا تمھاری گردن میں پڑا ہوا ہے۔ اور تم اس لعنت کے طوق پر مطمئن معلوم ہوتے ہو، اگر کچھ بھی شرم کا احساس ہے تو اپنی آوازیں بلند کرو اور مقابلہ کے لئے طیار ہو جاؤ"

لوگوں نے یہ سنا اور ایک آواز ہو کر جواب دیا کہ ——— "تو خائن ہے، تو نمک حرام ہے اور ہم تیرا ساتھ دینے کے لئے آمادہ نہیں" ———

مجمع کی حالت اب ایسی تھی کہ شاید وہ ناناصاحب پر حملہ کر کے فنا کر دے گی، لیکن عین اسی وقت ایک ضعیف العمر انسان اپنی لاٹھی پر ٹیک لگائے ہوئے دفعۃً کھڑا ہوا ——— یہ ایک نجومی تھا جس کا نام لوگوں کو معلوم تھا نہ وطن سے واقفیت تھی۔ یہ گاؤں گاؤں پھرا کرتا تھا اور عبادت و ریاضت روحانی کی تعلیم لوگوں کو دیا کرتا تھا۔ ناناصاحب کی ربیبہ (لڑکی) اس کی بڑی عزت کرتی تھی اور یہ بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

لڑکی نے انگریز افسر سے کہا کہ ——— "اس بڈھے کو کہنے دو جو کچھ کہنا چاہتا ہے" ——— افسر یہ سُن کر خاموش ہوگیا اور بڈھے نجومی نے یوں خطاب کیا :-

"اے میرے عزیزو، کامل پچاس سال ہوئے کہ میں صحراؤں، پہاڑوں اور جنگلوں میں پھر رہا ہوں، تم دیکھتے ہو کہ میرے ناخن کتنے بڑھے ہوئے ہیں۔ تم یہ بھی دیکھ سکتے ہو کہ میری اُنگلیاں اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہیں جیسے کسی طائر کا سینہ تیروں سے چھلنی ہو جائے ——— ایک زمانہ مجھ پر اس حال میں گزر گیا کہ سیلاب کے سیلاب میرے اوپر سے گزر رہے تھے اور میں اپنی بڑھی ہوئی تشنگی بجھانے کے لئے ایک قطرہ بھی اُن سے حاصل نہ کرتا تھا۔ سالہا سال میں نے اپنی زندگی کے اس طرح بسر کر دئے ہیں کہ تپتے ہوئے صحراؤں میں میرے عریاں جسم پر گرم آفتاب کی شعاعیں پڑ پڑ کر میرے عروق کے اندر خون کو خشک کرتی چلی جا رہی ہیں اور میں نے سایہ کی تلاش میں ایک برگ خشک کی بھی جستجو نہیں کی ——— پھر یہ بھی سن لو کہ کامل دس سال میں نے جنگلوں میں اس طرح صرف کر دئے ہیں کہ جب بہت بھوکا ہوتا تھا تو ان کی چھال چاٹ لیتا تھا اور جب بہت پیاس

لگتی تھی تو رات کے آنسوؤں سے جنھیں تم شبنم کہتے ہو تسکین کر لیتا تھا، درندوں نے مجھ سے وحشت ترک کر دی تھی اور چڑیاں میرے الجھے ہوئے بالوں میں آکر بسیرا لیا کرتی تھیں۔"

نانا صاحب ہاتھ میں کوڑا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ارادہ کیا کہ اسے خاموش کر دے، لیکن انگریز افسر نے کہا کہ نہیں اس کو اپنی تقریر ختم کر لینے دو۔

بڈھے نجومی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:-

"یاد رکھو کہ دنیا کی کوئی سختی مجھے نہیں ڈرا سکتی، کسی ضرب کا مجھ پر اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ میرا جسم تو پتھر ہو گیا ہے اور اس پر چرکوں کا اتنا ہی اثر ہو گا جیسے پتھر کی چٹانوں سے ہوا گزر جائے ——— ہاں، تو ایک طویل زمانہ میں نے ایسی فضا میں بسر کر دیا جس کی تاریکی نہایت شدید اور جس کا سکون حد درجہ خوفناک تھا۔ میں اس تاریکی میں گھرا ہوا تھا، اس سیاہ چادر نے میری بصارت و بصیرت دونوں پر پردہ ڈال رکھا تھا کہ دفعۃً ایک دن یہ پردہ پھٹا اور ایک آسمانی کڑک نے مجھ کو بیدار کر کے کہا کہ اٹھ کھڑا ہو اور چل! معرکہ کا دن آگیا ہے۔ چل اور اپنے راستے میں اُن سُرخ بیجوں کو بکھیرتا جا جو تیری مٹھی میں بند ہیں۔ چل، اپنی کرخت راگنیوں کو فضا میں بلند کر اور پکار پکار کر سب کو بلا اور کہہ کہ "آؤ ان خونیں کھیتیوں کو کاٹیں، اے کاہل و نا عاقبت اندیش کسانو، دن طلوع ہو گیا ہے اور آفتاب اپنے خنجر لے کر بلند ہو چلا ہے، آؤ، چلو، بڑھو اور ان سُرخ کھیتیوں کو کاٹنا شروع کرو۔"

یہ کہہ کر اُس نے انگریز افسر اور اس کی سُرخ پوش فوجوں کی طرف اشارہ کیا ——— نانا صاحب یہ سنتے ہی چیخ اٹھا۔ "اے میرے دوست تو نے بالکل صحیح کہا، کھیتی کاٹنے کا وقت آگیا ہے ——— ایک گھنٹہ نہ گزرا تھا کہ انگریزی افسر مع اپنی فوج کے قید خانہ میں پڑا ہوا تھا۔ اور جوق در جوق جماعتیں جنگ کے لئے آمادہ ہو کر چلی آرہی تھیں

اِس واقعہ سے تو تاریخ کے صفحات خالی ہیں، لیکن اس کے بعد کا حال سب کو معلوم ہے کہ کامل دو سال تک نانا صاحب نے انگریزوں سے جنگ کی اور جب وہ کانپور میں پوری بے رحمی کے ساتھ اس "سُرخ کھیتی" کو کاٹ چکا تو ۱۸۵۹ء میں اپنی اہلیہ اور احباب و اعوان کے ساتھ کسی طرف کو نکل گیا —— انگریزوں نے یہ خبر مشہور کی کہ نانا صاحب مارا گیا اور عنقریب اسکا سر دہلی کے بازاروں میں گشت کرایا جائیگا لیکن اسکی تکمیل کبھی نہیں ہوئی اور آجتک کسیکو نہیں معلوم کہ نانا صاحب کو آسمان کھا گیا یا زمین۔

موسیقی عہد نبوی و خلفاء راشدین میں

قبل عہد اسلام ایام جاہلیت میں موسیقی عربستان کے تمام بڑے بڑے مقامات میں رائج تھی۔ مکہ، یثرب، طائف، خیبر، وادی القریٰ، دومۃ الجندل، مسقط، عدن، حضرموت، حیرہ، انبار، اہواز، دمشق، بعلبک اور بصرہ وغیرہ میں ہر جگہ مختلف لحن و لہجہ کے ساتھ گانے کا رواج پایا جاتا تھا۔ لیکن جب ظہور اسلام ہوا تو لوگوں کا ذوق موسیقی کی طرف سے ہٹکر قرآن مجید کی طرف منتقل ہوگیا اور بجائے شعر و غنا کے اصلاح اجتماعی اور فتوحات ملکی کی طرف مایل ہوگئی۔ رسول اللہ کے سامنے جب شعر و شاعری کا ذکر آتا تھا یا کوئی شاعر اپنا کلام سناتا تھا تو آپ اس کے جواب میں صرف قرآن پاک کی آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ طفیل بن عمرو السدوسی (مشہور شاعر) جب رسول اللہ کے پاس آیا اور اسلام اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا کہ میں مرد شاعر ہوں جو کچھ میں کہتا ہوں پہلے اسے سن لو۔ رسول اللہ نے فرمایا کہو۔ چنانچہ اس نے چند شعر[1] عربی کے پڑھے۔ رسول اللہ نے سنکر سورۂ اخلاص پڑھی اور آخرکار یہ مسلمان ہوگیا۔ اسیطرح جب خلیفۂ ثانی نے کوفہ میں مغیرہ بن شعبہ کیطرف اپنے عامل کو بھیجا اسنے کہا کہ تمھارے شہر کے شعراء نے اسلام کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اسے سناؤ۔ پس مغیرہ نے اصحاب تعلقات میں سے کسی کو لبید العامری کے پاس بھیجا جو اس وقت کوفہ میں موجود تھا ــــ اس سے کہا گیا کہ اسلام کے بارہ میں جو کچھ تم نے لکھا ہے سناؤ۔ یہ سنکر لبید نے سورۂ بقر پیش کردی اور کہا کہ اسلام نے شعر و شاعری کی جگہ ہم کو یہ چیز دی ہے۔ لبید بڑا مشہور شاعر عہد جاہلیت کا تھا لیکن اسلام لانے کے بعد اسنے شاعری ترک کردی تھی۔ اور سوائے ایک شعر[2] کے دوسرا شعر نہیں کہا۔

---

[1] وہ اشعار یہ ہیں:-

لاواله الناس نالمرحر بهم — ولوحاربتنا مسهب وبنوفهم
ولمايكن يوم تزول نجومه — تطيربه الركبان ذو نباء ضخم
اسلما على خسف ولست بخالد — ومالی من ورق اذا جاءنی حتمی
فلا سلم حتی نخفر الناس جيفة — ليصبح طير كالنسان على لحمی

[2] وہ شعر یہ ہے:-

الحمد لله اذ لم ياتنی اجل — حتی اكتسيت من الاسلام سربالا

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ رسول اللہ کو موسیقی سے نفرت تھی یا غناء کو آپ نے حرام کر دیا تھا کیونکہ ولیمہ عرس کے موقعہ پر خود آپ نے عورتوں کو گاتے ہوئے سنا اور منع نہیں فرمایا۔

اسی طرح جب آپ مکہ سے یثرب کی طرف ہجرت کرکے تشریف لے گئے تو انصار کی عورتوں نے آپ کے استقبال میں دف بجا بجا کر گانا گایا اور آپ نے اسے سنا ——— رسول اللہ اچھی آواز کو بہت پسند فرماتے تھے اور بلال حبشی کو اذان کی خدمت پر مامور محض اُن کے حُسن آواز کی وجہ سے تھا۔ آپ بلال سے اکثر قرآن سنا کرتے تھے اور آپ کو بہت لطف آتا تھا۔

خود فن قرأت؛ تجوید کو ملاحظہ کیجئے کہ وہ لحن کے مختلف طریقوں اور تال کے منظم وقفوں سے پیدا ہوا ہے۔ اور اس فن کی اصطلاحیں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً صرف ایک مد کو لیجئے کہ فن تجوید میں اس کی چار قسمیں کردی گئی ہیں طبعی، متصل، منفصل، لازم۔ اور یہ قسمیں حقیقتاً موسیقی کے گھٹاؤ بڑھاؤ ہیں جن کا علیحدہ نام رکھدیا گیا ہے۔ اسی طرح اصطلاحات ادغام، اظہار، اخفا، اقلاب، غنہ، حروف ہمس وجہر، استفالہ و ترقیق تفخیم درخو، شدت و توسط، صفیر و اطباق، انفتاح و اذلاق، قلقلہ و وقف وغیرہ ... کو دیکھئے کہ فی الحقیقت ان سب کا تعلق لحن و موسیقی سے ہے لیکن اس خیال سے کہ یہ فن لہو و لعب میں داخل ہو جائے موسیقی سے علیحدہ اس کی اصطلاحیں مقرر کی گئیں۔

خود قرآن کو بھی ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا حکم ہے۔ اور ترتیل کی تفسیر میں امام نیشاپوری نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مخصوص وقفوں کے خوش الحانی سے الفاظ کو ادا کرنا ہی ترتیل ہے۔ بہر حال جس حد تک نفس خوش الحانی و حُسنِ صوت کا تعلق ہے اسلام نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ بعض حالات میں رسول اللہ نے غناء کی طرف ترغیب بھی دلائی ہے۔ چنانچہ ایک بار انصار میں سے کسی کی لڑکی کی شادی ہوئی تو رسول اللہ نے جناب عائشہ سے دریافت فرمایا کہ کیا تم لوگوں نے اسے رخصت کر دیا جواب دیا ہاں، آپ نے پوچھا کہ تم لوگوں کے ساتھ کوئی گانے والا بھی تھا۔ آپ بولیں نہیں۔ رسول اللہ نے فرمایا کیا تمھیں نہیں معلوم کہ انصار کی قوم گانے کو بہت پسند کرتی ہے۔ کیا تم میں سے کوئی اس کے ساتھ ایسا نہ تھا جو کہتا:- اتیناکم اتیناکم فحیونا نحییکم ولولا الحبة السمراء لم نحلل بوادیکم

---

[1] گیت یہ تھا:-

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع
ایھا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع

ایک بار رسول اللہ ایک کنیز کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ وہ گا رہی تھی

هل علیّ ویحکمون ان لهوت من حرج

تو آپ نے یہ سنکر فرمایا " لا حرج انشاء اللہ "

ایک مرتبہ رسول اللہ نے رات کے وقت بلال کو یہ اشعار گاتے سنا اور پسند فرمایا۔

الا لیت شعری هل ابیتن لیلة | بمکة حولی اذخر وجلیل
وهل اردن یوما میاه مجنة | وهل یبدون لی شامة وطفیل

حضرت عمر بن الخطاب اور عبد اللہ بن رواحۃ رسول اللہ کے ساتھ ساتھ سفر میں ہیں۔ چونکہ منزل طویل تھی اس لئے رسول اللہ نے چاہا کہ اونٹ کو تیز چلایا جائے اور عبد اللہ بن رواحۃ سے کہا کہ اگر اونٹ " حدی خوانی " سے تیز چل سکتا ہو تو شروع کرو۔ وہ فرط حیا سے خاموش رہے، لیکن حضرت عمر نے کہا کہ تم رسول اللہ کا کہنا نہیں مانتے اس پر عبد اللہ نے یہ شعر گانے شروع کئے :-

والله لولا الله ما اهتدینا | ولا تصدقنا ولا صلینا
الکافرون قد بغوا علینا | اذا ارادوا فتنة ابینا
ونحن عن فضلک ما استغنینا | فثبت الاقدام ان لاقینا

وانزلن سکینة علینا

ایک بار کسی اعرابیہ نے نذر مانی کہ اگر رسول اللہ غزوہ سے صحیح و سلامت واپس آجائیں گے تو میں دف پر گانا گاؤں گی، چنانچہ جب آپ واپس تشریف لائے تو آپ نے اس کو حضوری کی اجازت دی اور اس کا گانا سنا،

اسلم حضرت عمر کا غلام تھا اس سے روایت ہے کہ " ایک بار میں اور عاصم دونوں گا رہے تھے کہ حضرت عمر اس طرف سے گزرے اور ٹھہر کر سننے لگے ——— جب گانا ختم ہوا تو فرمایا کہ پھر گاؤ، چنانچہ ہم نے پھر اعادہ کیا۔ اور پوچھا اے امیر المومنین ہم میں سے کون بہتر گاتا ہے ——— جواب دیا کہ تم دونوں گدھے ہو، پوچھا کہ ہم میں کون گدھا برتر ہے۔ آپ نے فرمایا " یہ بھی وہ بھی " ——— میں نے کہا کہ " میں ان گدھوں میں غالباً اول گدھا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں تمہارا درجہ دوسرا ہے " ——— اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ موسیقی کے نقاد بھی تھے اور برا گانے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔

مدینہ منورہ میں سعد بن وقاص صحابی کا ایک غلام " قند " تھا جو نہایت اچھا گانے والا تھا۔ اور جناب عائشہ محض گانے کی وجہ سے اس کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ ایک بار سعد بن وقاص نے اسے مارا تو آپ خفا ہو گئیں۔ اور کہا کہ جب تک سعد بن وقاص، قند کو راضی نہ کر لیں گے میں ان سے بولوں گی نہیں ——— چنانچہ سعد بن وقاص نے

اس کو رضی کیا اور اس کے بعد آپ اُن سے ہمکلام ہوئیں۔

الغرض جس حد تک گانے کا تعلق ہے موسیقی وغناء اسلام میں حرام نہیں ہے بعض نے اس کی حرمت کا فتویٰ دیتے ہوئے اس آیت کو استدلال پیش کیا ہے :-

"ومن الناس من یشتری لهو الحدیث لیضل عن سبیل الله

بغیر علم ویتخذها هزوا اولئك لهم عذاب مهین ــ"

کیونکہ ان کے نزدیک غناء لہو الحدیث میں داخل ہے حالانکہ یہ آیت نضر بن حارث کے حق میں نازل ہوئی تھی جو فارس سے قدیم سیر و تاریخ کی کتابیں لاکر ترجمہ کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ یہ قرآن سے بہتر ہیں۔ گانے سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں ـــــــ لیکن اس میں کلام نہیں کہ ابتداء عہد اسلام میں چونکہ صرف اجتماعی و اخلاقی اصلاح پیش نظر تھی اس لئے اس فن کی ترقی کا کوئی موقعہ نہ تھا۔

فنون لطیفہ از خود ایک قوم کی تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ نشوونما پاجاتے ہیں۔ اس لئے ابتدائی حالت میں کسی ملک یا قوم کا ان کی طرف متوجہ ہونا کبھی فنی لحاظ سے مفید نہیں ہوسکتا خود تاریخ اسلام کو اٹھاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جب رسول اللہ کے بعد فتوحات وسیع ہونے لگیں اور تمدنی ترقی کے آثار پیدا ہونے لگے تو ساتھ ہی ساتھ موسیقی کو بھی ترقی ہوئی۔

عہد بنی امیہ میں عود، طنبور اور دف کے ساتھ قصاید و اشعار گانے کا رواج عام ہوگیا تھا۔ اور عہد بنی عباس میں تو موسیقی نے ایک مستقل علم و فن کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ نئی نئی راگنیاں ایجاد ہو رہی تھیں، گانے کے مختلف طریقے سوچے جارہے تھے اور ماہرین کی ایک جماعت مستقلاً اسی فن کی خدمت کر رہی تھی، چنانچہ یونس، احمد ابن المکی، عمرو بن بانہ، بذل المغنیہ، اسحاق موصلی، اس عہد کے خاص ماہرین موسیقی تھے۔ اور مولفین میں جو شہرت یعقوب بن اسحاق الکندی، ابو نصر فارابی اور بوعلی بن سینا کو حاصل تھی وہ بھی ارباب تاریخ سے مخفی نہیں۔

ضرورت برائے شادی

میرے ایک مرحوم دوست کی دختر کی کتخدائی کے لئے ایک تندرست برسرروزگار ۲۳ تا ۲۷ سالہ لڑکے کی ضرورت ہے۔ لڑکی تندرست تکمیل کارخانہ میں ہوشیار ہے۔ قوم پٹھان صحیح النسب اور نہایت شریف خاندان۔ خط و کتابت مندرجہ ذیل پتہ پر کیجئے۔

ڈاکٹر کانتی پرشاد ورما۔ بی۔ اے۔ سری گاندھی آشرم خیراتی دواخانہ۔ میرٹھ شہر

شعاعوں کے حیرت انگیز استعمالات

انکشاف جرائم کی ایک نئی راہ

حال ہی میں نیویارک (امریکہ) کے ایک جرائم پیشہ گروہ نے نہایت ہی معمولی قسم کا عطر طیار کیا اور فکر یہ کی کہ بازار کے قیمتی سے قیمتی عطر کی طرح فروخت ہو ——— انھوں نے کامل غور کے بعد یہ تدبیر اختیار کی کہ بازار سے عطر کی ایک شیشی جس کی قیمت ۲۰ گنی تھی لے کر، شیشیاں بنانیکے کارخانہ میں گئے اور اس کو آمادہ کیا کہ بالکل اسی قسم کی شیشیاں طیار کردے۔ جب شیشیاں طیار ہو گئیں تو ان میں نہایت ہی معمولی قسم کا عطر بھر دیا اور اُن پر بالکل اسی قسم کا لیبل چھپوا کر چپاں کر دیے جو اس قیمتی عطر کی شیشی پر پایا جاتا تھا ——— جب یہ شیشیاں بازار میں پہونچیں اور لوگوں نے انھیں خریدا تو دکان داروں سے شکایت کی گئی کہ عطر میں میل کیوں کیا جاتا ہے اور عمدہ عطر کے دام لے کر خراب عطر دینے کا کیا سبب ہے۔

دوکان دار غریب حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے اور ان کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آتی تھی کہ بند شیشیوں کے اندر اچھے اور خراب عطر کی تمیز کیونکر کی جائے ——— آخرکار یہ معاملہ مقامی پولیس تک پہونچا اور ڈاکٹر ہرحان سے مشورہ طلب کیا گیا جو شعاعوں کے ذریعہ سے کشف جرائم میں خاص مہارت رکھتا تھا ——— یہ شیشی لے کر اپنی تجربہ گاہ میں گیا اور فوق البنفسجی شعاعیں اس پر ڈالیں اس کے بعد اور متعدد شیشیاں لے کر تجربہ کیا تو معلوم ہوا کہ اچھے عطر کی شیشی سے جو شعاعیں گزرتی ہیں وہ نیلگوں ہوتی ہیں اور خراب عطر کی شیشی سے گزرنے والی شعاعیں زرد ہوتی ہیں ——— اسی طرح اس نے لیبل پر بھی شعاعیں ڈالیں تو معلوم ہوا کہ اصلی شیشی کا لیبل چھاپنے کے لئے جو سیاہی استعمال کی گئی ہے وہ اور ہے اور نقلی شیشی کا لیبل کسی اور سیاہی سے چھاپا گیا ہے ——— آخرکار دکانداروں نے یہ آلہ خرید کر اپنی دکان کی تمام شیشیوں کا امتحان کر لیا اور جتنی خراب عطر کی شیشیاں تھیں اُن کو علحدہ کر دیا۔

چند موٹر ڈرائیور سڑک کے ایک جانب کھڑے ہوئے ٹائر درست کر رہے تھے کہ قریب ہی ایک خندق میں انھیں

لاش نظر آئی جس کے سر سے گولی گزر گئی تھی۔ دیکھ بھال سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص سے اس کا جھگڑا ہوا تھا کیونکہ کشاکش کے نشان وہاں موجود تھے۔ اسی کے ساتھ ایک سُرخ ریشمی رومال بھی گھاس پر پڑا ہوا ملا جو غالباً قاتل کا تھا اور بھاگتے وقت گھبراہٹ میں وہیں چھوٹ گیا تھا ——— مقتول ایک نہایت مشہور رئیس زمیندار تھا جو اپنے کاشتکاروں کو بہت تکلیف پہونچایا کرتا تھا اور کاشتکار اس کے پاس تہدید و تخویف کے خطوط بھی بھیجا کرتے تھے ——— پولیس نے خیال کیا کہ یقیناً انھیں پڑوس کے مزارعین میں سے کسی نے اس کو ہلاک کیا ہوگا اور اسی یقین کی بناء پر تفتیش شروع کردی گئی۔ ——— دورانِ تفتیش میں جب رومال پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں جابجا مٹی کے دھبے بھی موجود ہیں جیسے پسینہ پونچھنے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ رومال ایک ماہرِ فن کے پاس بھیجا گیا ——— اس نے جب رومال پر شعاع ڈالی تو رومال کے دھبے چمکنے لگے ——— اس نے کہا کہ اس مٹی میں کوئی ایسا مادہ ہے جو فاسفورس کی طرح چمکتا ہے ——— پولیس نے تمام مزارعین کے کھیتوں اور مکانوں کی مٹی کو امتحان کے لئے بھیجا تاکہ جس مزارع کے کھیت یا مکان کی مٹی ویسی ہی چمکتی ہوئی نظر آئے گی اسی کو مجرم گردانا جائے گا، لیکن پولیس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کسی مزارع کے کھیت کی مٹی اس طرح کی نہ نکلی ——— جستجو سے معلوم ہوا کہ جائے قتل کے قریب ہی ایک بڑا گڑھا ہے جس کے اندر سے کنکر نکلتے ہیں اور چینی کا برتن بنانے کے لئے مزدور یہاں سے مٹی لے جاکر فروخت کرتے ہیں۔ جس وقت اس خندق کی مٹی کا امتحان لیا گیا تو وہ بالکل اسی طرح چمکنے لگی جس طرح رومال کے دھبے چمکتے تھے۔ آخرکار تمام مزدور طلب کئے گئے اور قاتل گرفتار ہو گیا۔ اس نے بعد کو بیان کیا کہ مقتول مٹی لے جانے سے اسے روکتا تھا اس لئے غصہ میں آکر اس نے پستول کا فیر کر دیا

امریکہ کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہونے لگی کہ فلاں مجرم جس کا نام کابونی ہے سزایاب نہیں ہوا بلکہ اس نے ایک اور شخص کو جو بالکل اسی کا ہم شکل ہے۔ اپنی جگہ قیدخانہ میں بھیجدیا ہے اور خود آزاد پھر رہا ہے ——— کابونی کے چہرہ پر بھی زخم کا سا ایک داغ تھا اور جو شخص اس کی جگہ قیدخانہ گیا تھا وہ بھی ویسا ہی داغ رکھتا تھا، لیکن فرق یہ تھا کہ کابونی کا داغ بہت پُرانا تھا اور دوسرے شخص کا جدید۔ اس لئے ماہرِ فن نے کہا کہ اس شخص کے داغ پر شعاعیں ڈال کر دیکھنا چاہئے۔ اگر داغ پُرانا ہوگا تو چمکدار نیلا نظر آئے گا ورنہ نہیں۔ چنانچہ یہ تجربہ کیا گیا اور اخباروں کی خبر بالکل صحیح نکلی۔ بعد کو اصل مجرم ڈھونڈھ کر گرفتار کیا گیا اور اس کو سزا دی گئی۔

ایک بار سڑک پر ایک لاش ملی جس کے پاس کانچ کے بہت سے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ خیال کیا گیا کہ غالباً کسی موٹر سے ٹکر کھا کر یہ شخص مرا ہے اور کانچ کے ٹکڑے موٹر کے لمپ کے ہیں ——— اتفاق سے تلاش کرنے پر قریب ہی کسی گراج میں ایک موٹر نظر آیا جس کا لمپ آگے کی جانب کا ٹوٹا ہوا تھا اور کانچ کے وہ ٹکڑے جو لاش کے پاس ملے

تھے قریب قریب اس کانچ سے ملتے جلتے تھے۔ جو لمپ میں لگا ہوا رہ گیا تھا۔ علاوہ اس کے یہ بھی تحقیق ہو گیا کہ گزشتہ شب کو موٹر ڈرائیور اسے لے گیا تھا اور راستہ میں شیشہ بھی ٹوٹا تھا ——— الغرض اسقدر تحقیق کے بعد موٹر ڈرائیور گرفتار کیا گیا۔ اس نے کہا کہ " بیشک میں رات کو موٹر لے گیا تھا اور لمپ بھی راستہ میں ٹوٹا لیکن کسی آدمی سے ٹکرا کر نہیں بلکہ ایک اور موٹر سے ٹکرا کر جو نہایت تیزی سے گزر رہی تھی " آخر کار کانچ کے وہ ٹکڑے جو لاش کے پاس پڑے تھے اور وہ ٹکڑے جو لمپ میں لگے ہوئے رہ گئے تھے۔ ماہر فن کے پاس بھیجے گئے اور اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ لاش کے پاس جو کانچ کے ٹکڑے ملے ہیں وہ موٹر کے لمپ نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان سے شعاعیں سبز ہو کر نکلیں اور لمپ کے شیشہ سے کسی اور رنگ کی۔ آخر کار یہ چھوڑ دیا گیا اور بعد کو جستجو سے اصل مرتکب جرم کا گرفتار کیا گیا

چکاگو کے جوار میں ایک چور تھا جو رات گئے آنے جانے والی عورتوں کو ریوالور کا فیر کرکے روک لیتا تھا اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا تھا لوٹ لیتا تھا، اور پھر فوراً ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر منہ چوم لیتا تھا اور چھوڑ دیتا تھا۔ لیکن ہاتھ میں اس کے دستانہ ضرور رہتا تھا تاکہ عورتوں کے چہرہ پر اس کے ہاتھ کا نشان نہ پایا جائے

ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا لیکن کسی طرح گرفتار نہ ہو سکا ——— پولیس نہایت سرگرمی سے اس کی جستجو کر رہی تھی کہ اتفاق سے ایک رات ایک نوجوان جو نہایت اچھے ملبوس میں تھا۔ اسی مقام پر ملا جہاں گزشتہ رات اسی قسم کا ایک واقعہ ہو گیا تھا۔ اس کو گرفتار کیا گیا لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ جس وقت واقعہ ہوا ہے وہ یہاں موجود ہی نہ تھا، پولیس نے اسے تو ضمانت پر چھوڑ دیا لیکن اس کے دستانے امتحان کی غرض سے لے لئے ——— جس وقت ان دستانوں پر شعاعیں ڈالی گئیں تو معلوم ہوا کہ داہنے ہاتھ کے دستانے کے وسط میں ایک مستطیل سا نشان ایسا ہے جس سے شعاعیں عجیب رنگ کی گزرتی ہیں۔ اب مزید جستجو کے سلسلہ میں وہ لڑکی طلب کی گئی جس پر آخری بار حملہ کیا گیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر لگی ہوئی سرخی کا امتحان لیا گیا تو اس سے بھی بالکل وہی رنگ پیدا ہوا جو دستانے کے داغ سے پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ اس سے ثابت ہو گیا کہ دستانہ اسی لڑکی کے ہونٹوں سے مس ہوا تھا اور مجرم کو سزا دی گئی

شہر کوپن ہاگن سے قریب خندق میں ایک عورت کی لاش ملی جس کے دونوں پاؤں پنڈلیوں سے کٹے ہوئے تھے۔ پولیس نے غائب ہو جانے والے لوگوں کی فہرست میں جستجو کی لیکن کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ عورت کون ہے۔ پولیس نے عکس ریز (X-Rays) کے ذریعہ سے اس کے اندرونی اعضاء کی تصویر لی تو معلوم ہوا کہ اس کے پھیپھڑے میں سل کی بیماری کے داغ کثرت سے پائے جاتے ہیں، پولیس نے یہ دیکھ کر ان شفاخانوں کی جستجو کی جہاں اس بیماری کے مریض رکھے جاتے ہیں اور آخر کار ایک شفاخانہ میں ایک پھیپھڑے کی تصویر ملی جو بالکل عورت کے پھیپھڑے کی طرح تھی

اور پتہ چلا کہ اس عورت کا یہ نام تھا یہ پتہ تھا اور دو ہفتے ہوئے کہ وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔ پولیس اس کے مکان پر پہونچی اور مختلف کاغذوں اور کپڑوں کی جستجو کے سلسلہ میں اونگلیوں کے نشان بھی کسی کسی چیز پر نظر آئے اور انھیں نشانوں سے پتہ چلا کہ مقتول واقعی وہی عورت تھی بعد کو قاتل بھی ملا اور اس کو سزا ہوئی

اوپر کی چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ فوق البنفسجی شعاعوں سے تحقیق جرائم میں کتنی زبردست مدد ملتی ہے۔ اور ان شعاعوں کے اثرات و نتائج کس درجہ قابل یقین ہوتے ہیں۔ ماہرین فن کا بیان ہے کہ اس طریق سے ہزاروں قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور دنیا کی کوئی دو چیزیں ایسی نہیں ہیں جن میں ذرا سا بھی کسی قسم کا اختلاف ہو اور اس طریق عمل سے ظاہر نہ ہو جائے۔

ڈاکٹر گوڈمین نے جو اس کے بڑے ماہر ہیں اس وقت تک ۲۰ ہزار نمونے ان شعاعوں کے منضبط کر لئے ہیں اور انکا بیان ہے کہ اگر کسی جرم کی جائے وقوع پر کاغذ یا چمڑے کا کوئی ٹکڑا یا بال کا کوئی حصہ نظر آئے تو وہ بھی اکتشاف جرم کے لئے کافی ہے کیونکہ شعاعی عمل کے ذریعہ سے فوراً معلوم ہو سکتا ہے کہ اس چمڑے کی دباغت کس طرح ہوئی ہے۔ اور مختلف دباغتوں کے مختلف رنگ پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح کاغذ کے ٹکڑے کا امتحان کرنے سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کاغذ کہاں کہاں رہا ہے اور وہ کن کن چیزوں سے مس ہوا ہے۔ بال کا بھی یہی عالم ہے کہ ہر چند بظاہر تمام بال ایک ہی قسم کے معلوم ہوتے ہیں، لیکن شعاعی تجربہ سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف لوگوں اور قوموں کے بال سے کتنے رنگ مختلف پیدا ہوتے ہیں —

اس طریقہ سے اصلی و نقلی سنگ مرمر، اچھے اور برے ریشم کی بھی پہچان ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ آٹا کس قسم کی چکی کا پسا ہوا ہے، چنانچہ ایک چور کے کپڑوں پر آٹے کے ذرّات نظر آئے اور شعاعی تحقیق سے پتہ چل گیا کہ یہ آٹا فلاں چکی کا پسا ہوا ہے۔

شعاعی تجربہ سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک عورت کے بالوں کا حسن قدرتی ہے یا مصنوعی، کیونکہ قدرتی حسن والے بالوں سے تقریباً ۱۲ قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور مصنوعی طور سے جو حسن پیدا کیا جاتا ہے وہ ہمیشہ ایک ہی قسم کی شعاع پیدا کرتا ہے البتہ یہ ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ بالوں میں کس قسم کا مسالہ، تیل، یا عطر استعمال کیا گیا ہے۔

فرض کیجئے کسی کمرہ کے اندر کوئی مقتول نظر آیا اور ماحول کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمیوں میں باہم ضرور کشاکش ہوئی ہے اور بظاہر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے قاتل کا پتہ چل سکے تو آپ سوائے خاموش رہنے کے اور کیا کر سکتے ہیں، لیکن امریکہ کی پولیس مقتول کے ناخنوں کو دیکھے گی کہ آپس کی نوچ کھسوٹ میں قاتل کی کھال کا کوئی حصہ تو پچ کر نہیں آ گیا اور پھر شعاعی تجربہ سے فوراً معلوم کر لے گی کہ قاتل کس قوم و جنس کا تھا۔ چنانچہ امریکہ میں ایک بار

بالکل ایسا ہی اتفاق پیش آیا اور پتہ چلا کہ قاتل زنگی تھا اور چونکہ قتل کا واقعہ جاڑوں میں ہوا تھا۔ اس لئے یہ سمجھ لیا گیا کہ قاتل ضرور جنوب کی طرف سے آیا ہوگا اور آخر کار اس کا پتہ چل گیا۔

پھر یہ تمام نتائج اتفاقی نہیں ہیں بلکہ حقائق علمی کی صورت رکھتے ہیں جو مختلف ممالک یورپ میں متعدد ماہرین فن کے ہزاروں تجربہ کے بعد حاصل ہوئے ہیں۔ چنانچہ اڈمون لوکار جو فرانس کا مشہور ماہر فن ہے اس نے اسی شعاعی عمل سے فرانس کے تمام مصنوعات کا تجربہ کرکے معلوم کر لیا ہے کہ فلاں کارخانہ کے غبار سے کس قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں ——— اسی طرح آگسٹ باسینی نے جو شکاگو میں علمی ذرایع سے کشف جرائم پر مامور ہے، معدنی اشیاء کی تحقیق کرکے بہت سے جرائم کا اکتشاف کیا ہے۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں تمام زہروں کا شعاعی تجربہ کرکے نتائج درج کئے ہیں۔

نیویارک کے ڈاکٹر گوڈمین نے عورتوں کے اسباب زیبائش و آرائش کی تحقیق کی ہے اور معلوم کیا ہے کہ مختلف تیلوں، عطروں، پوڈروں، غازوں سے کتنی مختلف رنگ کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور اس طرح اسنے ۲۰۰ جرائم کا اکتشاف کیا ——— اسی طرح شعاعی عمل سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک ناخن کا ٹکڑا کتنے عرصہ کا کٹا ہوا ہے۔

گزشتہ سال باسینی کے معاون کیمیادی نے اعلان کیا تھا کہ قفازی جنس کے آدمیوں کے دانت اگر گھسے جائیں تو ان سے نیلگوں شعاع پیدا ہوتی ہے، مشرقی لوگوں کے دانتوں سے زرد اور زنگیوں کے دانتوں سے سرخ شعاع نکلتی ہے۔ چنانچہ شکاگو کے کسی گندے نالہ میں ایک لاش پائی گئی، جو بالکل پھول کر خراب ہوگئی تھی اور اوس کی شناخت مشکل تھی۔ سر البتہ ٹوٹا ہوا تھا اس لئے اس کے مقتول ہونے کا یقین ضرور تھا۔ اب جستجو یہ ہوئی کہ آیا اسے چوروں نے ہلاک کیا ہے یا چینی آبادی میں قتل کیا گیا ہے۔ اس کا ایک دانت امتحان کے لئے بھیجا گیا اور اسے گھس کر شعاعی تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مقتول مشرقی جنس کا ہے اور آخر کار اسی تحقیق سے یہ اکتشاف ہوا کہ چینیوں نے اسے مار کر نالہ میں پھینک دیا تھا۔

امریکہ میں ایک ماہر فن نے اسی شعاع کا آلہ بنا کر بازار میں پیش کیا ہے اور ہر شخص اسے خرید سکتا ہے، چنانچہ بنکوں میں عام طور پر اس کا استعمال شروع ہوگیا ہے اور نہایت آسانی سے کھرے کھوٹے سکہ اور اصلی و نقلی نوٹ کا پتہ چل جاتا ہے ——— یورپ کے بھی اکثر بنکوں میں اس قسم کے لمپ رکھے رہتے ہیں تاکہ جعلی نوٹ اور کاغذات مالی کا پتہ ان سے چلایا جائے۔ کیونکہ اصلی نوٹوں سے نیلگوں شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور نقلی نوٹوں سے سبزی مائل ———

مثلثی شیشوں سے جو شعاعیں نکل کر اپنی تموجات منتشر کرتی ہیں۔ وہ بھی فواید سے خالی نہیں ہیں اگر

خورد بین تیرہ و غزالی کے ساتھ ان کا استعمال کیا جائے۔ چنانچہ ایک بار کولی اموکی فلاح اپنے داماد کے ساتھ موٹر پر سوار ہو کر گیا۔ راستہ میں موٹر الٹ گیا اور بڈھا فلاح ایک پتھر سے ٹکرا کر مر گیا۔ تفتیش کی گئی تو داماد نے بیان کیا کہ جس وقت پتھر سے موٹر ٹکرایا تو میں کود کر علیحدہ ہو گیا لیکن بڈھا فلاح نہ نکل سکا اور پتھر کے تصادم سے مر گیا۔ چند دن کے بعد معلوم ہوا کہ اس فلاح کو حال ہی میں کسی بیمہ کمپنی سے بڑی رقم ملی تھی اس لئے کچھ شبہ پیدا ہوا اور شعاعی عمل کیا گیا جس سے یہ پتہ چلا کہ بڈھے سر سے جو ریزے پتھر کے نکلے ہیں وہ اس پتھر کے ریزوں سے بالکل مختلف ہیں جس سے موٹر کا ٹکرا جانا بیان کیا جاتا تھا اور اس طرح آخر میں یہ معلوم ہوا کہ داماد نے خود اپنے خسر کو ہلاک کر کے صورت ایسی پیدا کی تھی کہ کسی کو شبہ نہ پیدا ہو۔

الغرض یہ دور شعاعوں کا ہے اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اہل مغرب اسی سے کام لے رہے ہیں لیکن ہندوستان کی کم علمی و جہل کا یہ عالم ہے کہ یہاں کی آبادی کا بڑا حصہ ابھی تک عہد حجری کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور اُسے بالکل خبر نہیں کہ قدرت کے کتنے عطیات کی طرف سے وہ محروم زندگی بسر کر رہا ہے۔

چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی رُوحوں کے ساتھ

اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا کے امن و سکون کا راستہ معلوم کریں تو اس کو ملاحظہ فرمائیے۔

مادئین کا مذہب

وجود باری کے ثبوت میں بے مثل مضمون

حرکت کے کرشمے

اگر آپ قدرت کے کرشموں کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے ملاحظہ فرمائیں۔ تینوں ایک ہی جلد میں قیمت معہ محصول ایک روپیہ آٹھ آنے

منیجر نگار لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

طلسمِ زندگی مجموعہ ہے اُن مختصر مضامین کا جو گزشتہ پندرہ سال کے اندر میاں بشیر احمد صاحب نے لکھے اور رسالۂ ہمایوں میں شایع ہوئے۔

ان مضامین کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ مناظر کا عنوان رکھتا ہے، دوسرا حصہ صدائے روح کی سُرخی سے شروع ہوتا ہے، تیسرے حصہ کا نام صدائے دل ہے۔ چوتھا جدوجہد سے موسوم کیا گیا ہے، پانچویں حصہ میں سرگوشیاں ہیں اور چھٹا خیالات پریشاں کا مجموعہ ہے۔

یوں تو پنجاب میں اسوقت بہت سے انشاپرداز پائے جاتے ہیں، لیکن میاں صاحب نے اپنی سنجیدہ و متین روش کی بنا پر وہاں کے مخصوص ادیبوں میں بھی ایک خاص درجۂ امتیاز حاصل کر لیا ہے ـــــ میاں صاحب آکسفورڈ کے گریجویٹ ہیں، بیرسٹر ہیں، اپنی معاشرت و معیشت کے لحاظ سے اچھے خاصے مغربی انسان ہیں، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ان کا دل مشرقی ہے، ان کا احساس و تاثر مشرقی ہے اور وہ اپنے ملک کی روایات قدیمہ کا احترام کرنے میں اگر ہندوستانی نہیں تو مسلمان ضرور ہیں ـــــ اور ان کی یہ خصوصیت ان کی تمام تحریروں میں پائی جاتی ہے، چنانچہ یہ کتاب بھی جس کا بہترین نام میری رائے میں صرف "مجموعۂ پریشانی" ہونا چاہئے تھا، باوجود ادائے بیان کی مغربیت کے مشرقی روح سے خالی نہیں۔

اس کے اکثر مضامین اس انداز کے ہیں کہ اُن کو دیکھتے ہی انسان ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ شاید یہ انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں، لیکن جب طرز ادا کی اجنبیت سے کچھ انس پیدا ہو جاتا ہے تو ذہن انسانی الفاظ سے ہٹکر معنی و مفہوم کو اہمیت دینے لگتا ہے جن کی نرمی و لطافت اور نزہت و پاکیزگی میں یکسر مشرقی ذوق کی "بوئے خوشدلی" محسوس ہوتی ہے۔

جو لوگ میاں صاحب کی بلند فطرت، سُلجھی ہوئی طبیعت اور سُتھرے ذوق سے واقف ہے۔ وہ اس مجموعہ کو دیکھنے کے بعد یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ ـــــ

"He has put much of himself into it" ـــــ

اس میں بارہ رنگین وسادہ تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں جو سوائے ایک دو کے سب کی سب نہایت پاکیزہ او فنی نقطۂ[۱] نظر سے قابل داد ہیں۔ اس زیبایش وتجمیل کے علاوہ جابجا رنگین لوحوں سے بھی دعوت نظر کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ اور طباعت وکتابت کی پاکیزگی اور جلد کی خوشنمائی نے تو اور بھی "عروس جمیل ولباس عزیز" کا منظر پیش کردیا اس کی قیمت پانچ روپیہ، مسلمانوں کی اقتصادی پستی کے لحاظ سے ممکن ہے زیادہ ہو، لیکن دلِ پُر شوق "رونمائی" میں اس سے بھی زیادہ قربانیاں کرسکتا ہے۔

نقوشِ مانی

مجموعہ ہے جناب مانی جائسی کی غزلوں اور نظموں کا جسے خود انھوں نے شایع کیا ہے اور اس احتیاط کے ساتھ کہ "جس کتاب پر مصنف کے دستخط نہ ہوں وہ مسروقہ متصور ہوگی" ——— یہ گویا قانونی جواب ہے۔ دیوان ظہیر فاریابی کے اس شعر کا جس میں "در مکہ بدزد گر بیابی" کی ترغیب دی گئی ہے۔

ابتدا میں چند صفحات مانی صاحب نے اپنے حالات زندگی کے لئے وقف کئے ہیں اور پھر "فلسفۂ عشق" کی نظم سے اس مجموعہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ جو دسمبر ۱۹۱۲ء میں جناب مانی نے لکھی تھی ——— سب سے آخری صفحہ پر نومبر ۱۹۳۱ء کی لکھی ہوئی غزل پائی جاتی ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب میں ۱۹ سال کا مجموعۂ افکار "بین الدفتین" کیا گیا ہے۔ یوں تو ۱۹ سال کی عمر عنفوان شباب کی عمر سمجھی جاتی ہے، لیکن ایک شاعر کو اتنا زمانہ بغیر بوڑھے ہوئے میسر نہیں آتا اس لئے باوجود اس کے کہ جناب مانی نے اپنی تاریخ پیدایش کے بیان سے احتراز کیا ہے (شاید اس لئے کہ "عالم امکان" سے ابھی تک ان کی بہت سی توقعات جمیل وابستہ ہیں) یہ راز کھلے بغیر نہیں رہتا کہ اس وقت جناب مانی کا شمار پختہ تر عمر شعراء کے سلسلہ میں ہونا چاہئے۔ اور اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ان کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

مانی صاحب ملک کے ان شعراء میں سے نہیں ہیں جو ہند کے ہر گوشہ میں معروف ومشہور ہیں۔ اور نہ غالباً کبھی انھوں نے اس کی کوشش کی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ بعض مخصوص حلقوں میں ان کی شاعری کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور مشاعروں میں بھی وہ کافی داد حاصل کرلیتے ہیں وہ نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ اور

۱؎ پنجاب میں اب عام طور پر "نکتۂ نظر" لکھتے ہیں۔ اگر یہ خرابی صوتی (Phonetic) قسم کی ہے یعنی اہل پنجاب نقطہ کو چونکہ نکتہ بولتے ہیں۔ اس لئے لکھتے بھی ایسا ہی ہیں تو خیر، ورنہ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ بالکل غلط ترجمہ (Point of view) کا ہے۔ تفصیل کے لئے جنوری ۳۲ء کا نگار ملاحظہ ہو ———

غزلیں بھی، تضمین کا بھی انھیں شوق ہے اور قطعات کا بھی، لیکن سب میں ان کا وہی ایک رنگ ہے جو ایک مایوس عاشق کا ہوا کرتا ہے۔

یقیناً اُن کے کلام جوش و سرمستی نہیں ہے، رندی و بیباکی نہیں پائی جاتی، معنی آفرینی و بلندی خیال مفقود ہے، ندرت ادا و جدت بیان کا پتہ نہیں، جدید تعبیرات شاعرانہ کا نشان نہیں، لیکن ایک قسم کا سوز و گداز ضرور ہے جس میں بجائے فتادگی کے انقباض کی کیفیت زیادہ نمایاں ہے۔ اور غالباً اسی لئے ان کی شاعری دل کو متاثر تو کرتی ہے لیکن بیتاب نہیں بناتی ——— ایک اور خصوصیت ان کی شاعری کی جس میں کمتر شعرا ان کے ہمسر نظر آتے ہیں، اس کا فنی غلطیوں سے پاک ہونا ہے۔ ان کا کلام دیکھنے کے بعد انسان پر کوئی اور اثر ہو یا نہ ہو لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ شاعر جو کچھ کہتا ہے بہت سمجھ بوجھ کر کہتا ... ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کا کلام اغلاط و اسقام سے پاک ہو۔

آپ لکھنؤ اسکول کے شاعر ہیں لیکن صحیح رنگ تغزل کے نمونے بھی آپ کے کلام میں کافی نظر آتے ہیں۔ مثلاً :—

آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کیا کہہ دیا کیا کر دیا   میں نہیں سمجھا خدا کے واسطے سمجھائیے

مگر جی چاہتا ہے یہ کہ تم ہو میرے قابو میں   نہیں فرصت نہ ہوگی کشمکشہائے تمنا سے

بہت اچھا میں آمادہ ہوا ترک محبت پر   اجازت دیجئے رونے کی ابتر دل کی حالت پر

ندامت سے جو اک دن آپ کے روئے حسیں پر تھا   گلہ بیجا بھی کرتا ہوں کہ اُس جلوہ کا شائق ہوں

ظاہر ہے کہ ہر شام کی ہوتی ہے سحر بھی   جانبر نہ ہوا میں یہ جدا بات ہے ورنہ

چین سے جینے نہیں دیتے ہو، مر جانے تو دو   جاؤ بالیں سے اٹھو تو، موت کو آنے تو دو

یہ مجموعہ مجلد شائع ہوا ہے اور دو روپیہ میں دفتر رسالہ تسنیم آگرہ سے مل سکتا ہے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۶۰ صفحات کا ہے اور کتابت و طباعت کافی دلکش ہے۔

جدید اُردو شاعری

یہ ایک تنقیدی تصنیف ہے جناب عبدالقادر سروری ام-اے کی جو حیدرآباد میں مددگار پروفیسر اُردو کے ہیں ——— اس کتاب کے تین حصے ہیں - ایک میں شعر کی ماہیت و تعریف وغیرہ پر بحث کی گئی ہے، دوسرے میں دور حاضر کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے ایک عمومی تبصرہ ان واقعات و حالات پر کیا گیا ہے جن کے ماحولی اثر سے اُردو شاعری کا جدید اسکول ظہور میں آیا — تیسرے حصہ میں اسم وار اُن شعراء کا ذکر ہے جو عہد اسمٰعیل میرٹھی سے لے کر اس وقت تک پائے گئے ہیں۔

حصہ اول میں سب کچھ وہی ہے جو اس سے قبل اس موضوع پر بارہا لکھا جا چکا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ کوئی نئی بات پیدا بھی نہ کر سکتے تھے ——— دوسرے حصہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے - وہ بڑی حد تک غنیمت ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد ایک شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وقت بالکل ضائع ہوا ——— تیسرا حصہ اس کتاب کا جسے بہت زیادہ اہم ہونا چاہئے تھا افسوس ہے کہ اسی قدر غیر ذمہ دارانہ طور پر لکھا گیا ہے، نہ شعراء کی فہرست مرتب کرنے میں کسی استقصاء صحیح سے کام لیا گیا ہے اور نہ ان کی مرتبت قائم کرنے میں کسی اصول کی پیروی کی گئی ہے ——— بہت سے شاعر جنکا نام آنا ضروری تھا ترک ہو گئے اور بہت سے ایسے جن کو کسی طرح شاعر نہیں کہا جا سکتا شامل کر لئے گئے ہیں۔

شعراء کی تصویریں بھی دی گئی ہیں لیکن بالکل اسی انداز کی جیسی کینن ڈائل یا سر آلیور لاج نے اپنے مرے ہوئے احباب کی روحوں کی ——— ممکن ہے یہ سروری صاحب کی جدت ہو، لیکن مجھے امید نہیں کہ جن حضرات کی تصویریں دی گئی ہیں وہ اس مقطوع الراس انداز نقاشی کو پسند کریں گے۔

بہر حال کتاب اسکول کے لڑکوں کے لئے بُری نہیں ہے اور وہ اس کے مطالعہ سے کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں ——— قیمت تین روپیہ ہے ——— ملنے کا پتہ ——— مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن ہے

ترکی جمہوریہ

یہ تصنیف ہے جناب ضمیر احمد صاحب ہاشمی ایم-اے کی جو یو-پی میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر مامور ہیں ——— یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات کو محیط ہے اور پانچ ابواب پر تقسیم کی گئی ہے - پہلے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ مغرب کا مورخ و سیاست دان ترکی کی [illegible] اخلاقی سیاسی و مذہبی زندگی کے متعلق کیسے کیسے عجیب نظرئے قائم کرتا ہے اور کس درجہ غلط [illegible] سے کام لے کر ایک غیر صحیح نقشہ دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے ——— دوسرے باب میں ۱۳۰۲ھ [illegible] سے ۱۹۰۸ء کے زمانہ تک حکومت ترکی کی تاریخ ہے جس میں اس کے نظام حکومت اور دول یورپ کے ساتھ اس کے تعلقات پر ایک بسیط تبصرہ کیا گیا ہے ——— تیسرے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ مغرب کے اثرات کو قبول کر کے انقلاب و بیداری کے آثار کب اور کیونکر پیدا ہوئے ——— چوتھے باب میں انجمن اتحاد و ترقی کے نشوونما و ارتقاء کا ذکر کیا گیا ہے اور آیندہ ابواب میں گزشتہ جنگ عظیم میں ترکوں کی شرکت، انقلاب کے آثار اولین، خاتمۂ خلافت،

قیام جمہوریت اور موجودہ دور ترقی کے حالات وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کی ترتیب میں پوری کاوش سے کام لیا ہے اور ترکوں کی قدیم ذہنیت سے لیکر موجودہ ذہنیت کے عہد تک جو جو انقلابات تاریخی و سیاسی رونما ہوئے ہیں ان کا پوری طرح استقصار کیا گیا ہے۔ اس وقت تمدن و معاشرت میں جو انقلاب پیدا ہوا ہے اس سے بھی بحث کی گئی ہے لیکن زیادہ آزادی کے ساتھ نہیں، غالباً اس لئے کہ مصنف بہ حیثیت ملازم ہونے کے کوئی ایسی بات نہ کہہ سکتے تھے جو عام مسلمانوں کو ان سے بدظن کر سکے۔

بہرحال کتاب مطالعہ کے لائق ہے اور جو حضرات ترکی کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کے لئے اس کتاب میں کافی سامان دلچسپی موجود ہے۔ قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ —— مکتبۂ جامعۂ ملیہ قرول باغ دہلی۔

مُبادی نباتات

یہ کتاب جگموہن لال بی اس سی کی تصنیف ہے جو عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں —— اس کتاب میں بیجوں کی ساخت، ان کے نشوونما، جڑوں کے اقسام وغیرہ تمام اُن مسائل پر گفتگو کی ہے جو مبادی علم نباتات کہلاتے ہیں —— کتاب نہایت دلچسپ انداز بیان میں لکھی گئی ہے اور جابجا نقوش و تصاویر سے مسائل کو بہت زیادہ قریب الفہم بنادیا گیا ہے۔

اصطلاحات کا ترجمہ بھی صاف وسلیس کیا گیا ہے۔ اور عبارت کا تسلسل بھی کافی دلچسپ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کی کتابیں نہ صرف لڑکوں بلکہ لڑکیوں کے نصاب میں بھی داخل کی جائیں تاکہ ان میں شروع ہی سے اصول فطرت کی جستجو کا ذوق پیدا ہو —— اس کی قیمت ۱۰ر ہے اور مصنف سے مکان نمبر [illegible] ریزیڈنسی حیدرآباد کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

مُبادی علم المعیشت

معاشیات کی ابتدائی کتاب ہے جسے آغا محمد اشرف صاحب بی۔اے نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کے چار حصے ہیں اور بارہ ابواب۔ پہلے حصہ میں معاشیات کی تعریف، دولت کے مفہوم اور ضروریات زندگی پر گفتگو کی ہے۔ دوسرے حصہ میں پیداوار دولت اور عاملین پیدائش سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرے حصہ میں زر، تبادلہ اور بنک کا بیان ہے، چوتھے میں تقسیم دولت کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے —— انداز بیان بہت صاف وسلیس ہے اور اصطلاحات کا ترجمہ بھی اچھا کیا گیا ہے۔ ضرورت ہی کہ معاشیات کے ابتدائی مسائل سے طلبہ کو ثانوی تعلیم ہی کے سلسلہ میں آگاہ کیا جائے اور اس مقصد کے لئے یہ کتاب بہت اچھی ہے —— اس کی قیمت ۱۲ر ہے اور شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب

یہ ترجمہ ہے جے۔ سی کمارپا کی اس مشہور کتاب کا جس میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ اقتصادی

حالت پر مالیات عامہ نے کیا اثرات پیدا کئے ہیں۔ ترجمہ قاضی محمد حسین صاحب نے کیا ہے اور بہت آسان ہے۔ اس کتاب میں متعدد نقشے دئے گئے ہیں، جن سے ہندوستان کی تناسب آبادی، زراعتی پیداوار، درآمد برآمد، تجارتی تعلقات اور انتظامات ملکی، وغیرہ کا حال معلوم ہوتا ہے۔ فن معاشیات کا ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ــــ یہ کتاب مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی سے مل سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

نیرنگ مجموعہ ہے اس-آر- خاتون کے تیرہ افسانوں کا جو مقاصد ونتائج کے لحاظ سے سنجیدہ ومتین ہیں اور زبان کے لحاظ سے ناقابل اعتراض ــــ اخیر میں ایک ڈرامہ بھی ہے جس کا تعلق عہد عباسیہ سے ہے۔ کاشکہ ان افسانوں کی زبان میں وہی لوچ اور عبارت میں وہی بیساختہ پن ہوتا جس کی توقع ایک عورت سے کی جاتی ہے۔ کتابت وطباعت بہت پاکیزہ ہے اور ۸عہ میں جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

کیمیاگر اور دوسرے افسانے محمد مجیب صاحب (آکسن) انچارج پریس جامعۂ ملیہ دہلی کے نو افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مجیب صاحب کے افسانے ملک میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک خاص مقصد ونتیجہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان کے افسانہ نویس کی خصوصیت ان کی سیرت نگاری ہے جو معمولی گفتگو اور معمولی واقعات کے ذریعہ سے پیش کی جاتی ہے ــــ ہلکا سا مزاحی رنگ بھی ان کے افسانوں میں پایا جاتا ہے جو دَورِ حاضر کی افسانہ نگاری کی جان ہے۔ یہ مجموعہ جامعۂ ملیہ دہلی سے مل سکتا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

شریر لڑکا مختصر سا ڈرامہ ہے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پروفیسر جامعۂ ملیہ کا جس میں بتایا گیا ہے کہ اگر شریر بچوں کی تربیت شروع سے صحیح اصول پر کی جائے تو ان کی شرارت سے بھی مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ زبان کی سلاست اور پلاٹ کی خوبی کے لحاظ سے کسی تنقید کی ضرورت نہیں کہ فاضل مصنف کا نام اس کی کافی ضمانت ہے ــــ یہ ڈراما جامعۂ ملیہ دہلی سے مل سکتا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

صیدِ زبوں مختصر سا ڈرامہ ہے جناب اشتیاق حسین قریشی کا جس میں مسئلۂ ازدواج پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور بغیر کامل تراضی طرفین کے جو برے نتائج پیدا ہوتے ہیں ان پر روشنی ڈالی ہے۔ فاضل ڈرامہ نگار کا مقصود اس ڈرامہ سے یہ ہے کہ لڑکیوں کو پوری جسارت سے کام لے کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرنا چاہیے اور سوسائٹی کے موجودہ ظالم اصول کو توڑنا چاہیئے۔ اشتیاق صاحب اس وقت کے بہترین ڈرامہ لکھنے والوں میں سے ہیں اور زبان وپلاٹ ہر لحاظ سے وہ نہایت مکمل چیز پیش کرتے ہیں ــــ یہ ڈراما نہایت سخت قسم کی بچّوں کی چیز ہے۔ اور نہ صرف لڑکیوں بلکہ لڑکیوں کے والدین کے لئے بھی اس کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ ان

کے استبداد کے نتائج کس حد تک دردناک بن سکتے ہیں ـــــ ملنے کا پتہ جامعۂ ملیہ دہلی ہے۔ قیمت درج نہیں۔

نبیوں کے قصے خواجہ محمد عبد الحیٔ فاروقی کی تالیف ہے جس میں آدم سے لے کر مسیح تک ۱۵ پیغمبروں کے مختصر حالات درج کئے گئے ہیں ـــــ اس تالیف کا مقصود بچوں کے اخلاق پر اثر ڈالنا ہے مذہبیات کے ذریعہ سے جس میں عقل کو مطلق دخل نہیں ہے ـــــ میرے نزدیک اب دنیا کو اس قسم کی کتابوں کی ضرورت نہیں ہے اور نہ بچوں کی عقلیں کند کرنے کے لئے ان کو مافوق الفطرت باتوں کا یقین دلانا کسی طرح مفید ہو سکتا ہے ـــــ اگر ان قصوں میں صرف اتنے حصوں سے بحث کی جاتی۔ جن کا تعلق محض واقعات یا اخلاقیات سے ہے تو کوئی حرج نہ تھا ـــ قیمت ۶ر ہے اور ملنے کا پتہ جامعۂ ملیہ دہلی

خادمات خلق اس کتاب میں مرحومہ سیدہ خاتون نے یوروپ و امریکہ کی ان چند خواتین کے حالات لکھے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی دوسروں کی خدمات کے لئے وقف کر دی تھی۔ موضوع کے لحاظ سے کتاب نہایت مفید اور عبارت کے لحاظ سے بہت پسندیدہ ہے ـــــ اس مجموعہ میں گیارہ خواتین کے حالات درج ہیں اور ۱۰ر میں جامعۂ ملیہ سے مل سکتا ہے

ورڈسورتھ اور اس کی شاعری میر حسن صاحب مدیر مجلۂ عثمانیہ حیدرآباد نے یہ کتاب تالیف کی ہے ـــــ موضوع نام سے ظاہر ہے اور افادیت اسکی موضوع سے مترشح۔ وہ لوگ جو خالص ادبی ذوق رکھتے ہیں اور مشرق و مغرب دونوں جگہ کی شاعری پر متقابلاً نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے یہ کتاب خصوصیت کے ساتھ قابل قدر ہے ـــــ اس کی متعدد نظموں کا ترجمہ بھی نمونتاً پیش کیا گیا ہے ـــــ اچھا ہوتا اگر فٹ نوٹ میں ساتھ ہی ساتھ انگریزی نظمیں بھی درج کر دی جائیں ـــــ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے ـ اور عہر میں مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی کا چہار مقالہ فارسی کی نہایت مشہور کتاب ہے جو ساتویں صدی کی ابتدا میں لکھی گئی ـــــ یہ کتاب چار مقالوں پر مشتمل ہے جس میں دوسرا مقالہ علم شعر پر ہے۔ یہ کتاب نہایت اہتمام کے ساتھ سیڈن میں بھی چھپ چکی ہے لیکن اب رام نرائن لال کتب فروش الہ آباد نے اسے شائع کیا ہے اور مولوی محمد رفیع صاحب نے مختلف نسخوں سے مقابلہ کر کے اس کو مرتب کیا ہے ـــــ چونکہ یہ کتاب فارسی امتحانات میں داخل نصاب ہے اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی سستا مگر صحیح نسخہ اس کا پیش کیا جاتا۔ امید ہے کہ مولوی صاحب موصوف کی یہ کاوش و محنت بنظر استحسان دیکھی جائے گی۔ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے۔

تاج آفرینش مصر کی ایک خاتون ملک خانم کے چند نسوانی اصلاحی مقالات کا ترجمہ مولوی

ابوالحمید نعمانی نے اس نام سے شایع کیا ہے ـــــ اس میں زیادہ تر مضامین ازدواجی زندگی کے متعلق پائے جاتے ہیں اور مصری خاتون کے جدید دورِ اصلاح و بیداری کے آثار و علائم میں سے ہیں ـــــ ابوالحمید صاحب کو عربی مقالات کے ترجمہ کرنے کا کافی ملکہ حاصل ہے اسی لئے ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے اور مفہوم کو پوری طرح حاوی ہے ـــــ یہ کتاب دائرۂ اجمل بمبئی کے سلسلۂ مطبوعات کی پہلی کتاب ہے اور ۱۰ر میں وہاں سے مل سکتی ہے ۔

آیات بینات سلسلۂ تالیفات تعلیم القرآن کا یہ نواں رسالہ ہے جسے مفتی مولوی محمد الدین صاحب وکیل گجرات نے مرتب کیا ہے ۔ اس رسالہ میں نماز کی حقیقت، اس کا مقصد اور اس کے شرائط و ارکان سے بحث کی گئی ہے ۔ اس زمانہ میں جب کہ ہر چیز علمی نقطۂ نظر سے دیکھی جا رہی ہے اس قسم کی تصانیف کا پیش کیا جانا یقیناً ایک حد تک مفید ہے کیونکہ اسی سلسلہ میں ایک وقت وہ بھی آنے والا ہے جب منقولات سے بالکل علیحدہ ہو کر صرف معقولات پر مذہب و ارکان مذہب کی بنیاد قائم ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ یہی ذوق تالیف و تصنیف ایک دن اس خدمت کو بھی پورا کر سکے قیمت ۸ر ہے اور مفتی نذیر احمد ۔ دائرہ بلوچاں گجرات سے مل سکتی ہے ۔

سرکار دو عالم سیرۃ ہے آنحضرت کی جسے مولوی محمد حسین صاحب ندوی نے مرتب کی اور مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی نے شائع کی ـــــ یہ کتاب ایک مختصر سا رسالہ ہے ۱۰۴ صفحات کا لیکن اس کے دیکھنے سے یہ بات نہیں معلوم ہوتی کہ اس کا مقصود کیا ہے ۔ اور کس خاص نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر اس کو مرتب کیا گیا ہے ـــــ غالباً بچوں کے لئے اس کو مرتب کیا ہے لیکن اس مقصد کے لئے بھی کئی کتابیں اس سے قبل اس موضوع پر شائع ہو چکی ہیں ۔ قیمت ۸ر ہے

خلفاء اربعہ خواجہ محمد عبد الحی صاحب فاروقی نے خلفاء اربعہ کے مختصر حالات اس ۱۴۸ صفحہ کی کتاب میں یکجا کر دئے ہیں ۔ وہ لوگ جو مختصر طور پر خلفاء کے حالات سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب اچھی ہے ۔ قیمت ۱۰ر ملنے کا پتہ جامعۂ ملیہ دہلی

بچوں کا انصاف محمد عبد الغفار مدہولی کا لکھا ہوا ۔ ۴۰ صفحات کا ڈرامہ ہے جو بچوں ہی کے پڑھنے کے لائق ہے ۔ ۴ر میں مکتبہ جامعہ ملیہ سے مل سکتا ہے ۔

حقیقت علمی شاعری یہ ایک مثنوی ہے جس میں جناب مولوی نصیر الدین حسین صاحب بیرسٹر عظیم آبادی نے شاعری کی حقیقت، اس کی تاریخ، مختلف ملکوں کی شاعری کی خصوصیات بیان کر کے آخر میں اُردو شاعری پر تبصرہ کیا ہے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ کسی ایسے علمی موضوع پر نظم میں کوئی کتاب لکھنا آسان نہیں لیکن اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف اپنے فرض سے بہت خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں اور ان کی قدرت شاعری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ـــــ قیمت عمر ہے اور غالباً

معارف پریس اعظم گڈھ سے مل سکتی ہے۔

قاتلان حسین کا مذہب مولوی سید علی نقی صاحب مجتہد کا ایک مضمون اخبار سرفراز میں مسلسل درج ہوا تھا، اسی کو اب امامیہ مشن لکھنؤ نے رسالہ کی صورت میں شائع کیا ہے۔ موضوع نام سے ظاہر ہے اور اس میں شک نہیں کہ طرز استدلال کی خوبی اور انداز بیان کی سلاست و روانگی قابل داد وستائش ہے ـــــ اس رسالہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قاتلان حسین اسلام سے دور کا بھی علاقہ نہ رکھتے تھے اور بڑی حد تک وہ اس کے ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اگر اسلام نام ہے واقعی خدا اور رسول کے علاوہ کسی اور ہستی پر بھی ایمان لانے کا ـــــ ۲ر میں دفتر سرفراز لکھنؤ سے یہ رسالہ مل سکتا ہے۔

وجود حجت یہ رسالہ بھی مولوی سید علی نقی صاحب کے اجتہاد فکر کا نتیجہ ہے ـــــ اس میں مہدی موعود کی پیشین گوئی کو حقیقت ثابتہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور امام غائب کے وجود سے انکار کو ایک لغو و مہمل خیال بتایا گیا ہے۔ مہدی موعود کا ظہور اسلام کے تمام فرقوں نے مانا ہے اور کثرت سے منقولی دلائل اس باب میں پیش کئے جاتے ہیں، لیکن روایات سے ہٹ کر کوئی ایک دلیل بھی اس وقت تک ایسی پیش نہیں کی گئی جو ایک غیر مسلم کو قائل کر سکے ـــــ مذہبیات کے سلسلہ میں اس وقت ایسی کتابوں کی ضرورت نہیں ـــــ جو روایات کو دہرانے والی ہوں بلکہ ضرورت ہے ایسی کتابوں کی جو روایات کو بالکل پس پشت ڈال کر صرف عقل انسانی سے اپیل کرنے والی ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام نہ آسان ہے، نہ ممکن اس لئے مسلمان علماء کا محبوب مشغلہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ ایک ہی راگ کو مختلف سازوں سے بلند کرتے رہیں خواہ سننے والا اس کی یکسانیت سے بیزار ہی کیوں نہ ہو جائے ـــــ اسکی قیمت ۲ر ہے اور دفتر سرفراز لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

ہمارا دین سید نواب علی رضوی ام۔اے پرنسپل بہار الدین کالج جوناگڈھ نے ۲۲ صفحات کے اس رسالہ میں ارکان خمسۂ اسلام کی خوبیاں بیان کی ہیں ـــــ حیرت ہے کہ اتنا اہم موضوع کیونکر چند صفحات میں سما سکا ـــــ میرے خیال میں یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ ہے ـــــ قیمت ۲ر ہے اور غالباً مصنف سے مل سکتا ہے۔

فلسفۂ رمضان اس رسالہ میں کسی صاحب مولانا احمد نے رمضان کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ شکر ہے کہ اب مذہبی معاملات میں فلسفہ کا شمول ہونے والا ہے۔ معلوم نہیں یہ احترام مذہب کا ہے یا فلسفہ کا۔ یہ رسالہ ریاض توحید نواب گنج دہلی سے مفت ملتا ہے۔

جنگِ مستقبل کا دُوربینی مُطالعہ

۱۳ اگست سنہ ۱۹۴۰ء کا ایک تار

(جو میدان جنگ سے ایک اخبار کے نمائندہ نے بھیجا)

کل شہرِ نیویارک اور مضافات کے ۶۰ لاکھ آدمی ہلاک ہوگئے ـــ اس کی مختصر داستان یہ ہے کہ "کل اتحادئین" کے ۶۰۰ طیارے دفعۃً نمودار ہوئے اور انھوں نے ـــ ڈائیونل کلوروارسین اور کاکوڈیل ایسوسیانید گیسوں کی نہایت کثیف چادر تمام فضا میں پھیلا دی ـــ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام عورتیں، مرد اور بچے ہلاک ہوگئے کوئی جانور بھی نہ بچا۔ اور نباتات بھی خشک ہوگئے ـــ اس کے بعد جب ہوا چلی اور زہریلی گیس پھیلی تو دُور دُور کی بستیوں کے بھی ۲۰ لاکھ آدمی فنا ہوگئے ـــ اسی طرح دنیا کے اور مختلف شہروں میں بھی گزشتہ دس گھنٹے کے اندر ۳ کرور ۶۰ لاکھ آدمی زہریلی گیس سے فنا ہوچکے ہیں۔

آج نیویارک، لندن، پارس، بروسیل، برلن، اور وائنا کھنڈر ہوکر رہ گئے ہیں۔ کیوں کہ طیاروں کے ہجوم اور گیس کے حملہ نے وہاں بھی کسی متنفس کو زندہ نہیں چھوڑا ـــ اس جنگ کا سبب یہ ہوا کہ بندرگاہ سایگ کے متعلق دُول ارض میں اختلاف تھا اور کامل پانچ دن سے گفت وشنود ہو رہی تھی۔ امریکہ بالکل غیر جانبدار تھا ـــ کل صبح اس مسئلہ میں دو فریق ہوگئے۔ جن سے ایک کا نام اتحادئین ہے۔ اور دوسرے کا حلفاء اور اتحادئین نے کل ۸ بجے صبح بین الاقوامی مجلسِ فیصلہ کو بمقام لاہائی اطلاع دے دی کہ وہ اس کا فیصلہ ماننے کے لئے طیار نہیں ـــ امریکہ نے بین الاقوامی مجلس کا ساتھ دیتے ہوئے اتحادئین کے خلاف کل ساڑھے چھ بجے صبح اعلان جنگ کردیا اور نتیجہ وہ ہوا جس کا حال میں نے ابھی بیان کیا۔ لوگوں

کے پھیپھڑے زہریلی گیسوں کی وجہ سے پھٹ پھٹ گئے۔ اور جو جہاں تھا وہیں دم توڑنے لگا۔

میں خود کارسن ہوا باز کے ساتھ ایک طیارہ پر چڑھ کر تحقیق حالات کے لئے روانہ ہوا۔ ہم دونوں نے محافظ گیس نقاب اپنے چہروں پر ڈال لی تھی اور فولادی نلکیوں میں اتنی مقدار آکسیجن کی بھر لی تھی کہ ۹ گھنٹے تک کام دے سکے۔ ہم لوگ صبح سات بج کر ۲۸ منٹ پر نیویارک میں اترے اور تمام سڑکوں پر مکانوں کے اندر کامل سات گھنٹے تک جستجو کی لیکن ایک شخص بھی زندہ نہ ملا۔ ہوا میں اب بھی کچھ کچھ گیس کا اثر باقی ہے۔ اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ۶۰ لاکھ آدمی جو کل تک چل پھر رہے تھے، ہنس بول رہے تھے آج جسم بے جان نظر آرہے ہیں — شہر کے کاروباری حصوں میں اور کارخانوں کے اندر لاشیں بچھی ہوئی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہوا۔ بالکل اچانک ہوا۔ اور اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ چند منٹ پیشتر اس حملہ کی اطلاع مل جاتی اس لئے شہر کی تمام آبادی اپنے اپنے کام میں مصروف تھی کہ دفعتہً یہ بلا نازل ہوئی۔ لاشوں کے دیکھنے سے عجیب وغریب منظر سامنے آگئے۔ ایک شخص کی لاش ایسی حالت میں ملی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب گیس اس کی ناک تک پہونچی تو اپنے دونوں بازو سے اسنے منہ چھپانا چاہا۔ اس کے پاس ہی اس کی گھڑی ٹوٹی ہوئی ملی جو ۲ بج کر ۵۹ منٹ پر بند ہوئی تھی۔ اور چونکہ یہ حملہ ۲ بج کر ۵۰ منٹ پر ہوا تھا۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰ منٹ کے اندر ہی اندر دنیا کے کروڑہا آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے — بنکوں میں، کارخانوں میں، دفتروں کے اندر، گھروں میں، سڑکوں پر الغرض جدھر نگاہ جاتی ہے، سوائے لاشوں کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی — ڈاک خانہ میں دیکھا۔ کہ پوسٹ ماسٹر اپنی میز کے پاس ہی مرا ہے لیکن رومال اس کے منہ پر رکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسنے گیس سے بچنے کی پوری کوشش کی۔ بڑے بڑے محل ویران پڑے ہیں، قیمتی فرنیچر، ریشمی پردے، نفیس نفیس برتن سب اپنی اپنی جگہ بدستور موجود ہیں، لیکن ان کا استعمال کرنے والا کوئی نظر نہیں آیا — بنکوں میں نوٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، اشرفیوں کا انبار نظر آتا ہے، مگر نہ کوئی انکا چرانے والا باقی رہا نہ حفاظت کرنے والا۔

مشرقی حصۂ شہر میں آگ لگی ہوئی ہے اور اب تک مختلف رنگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ کیونکہ اس حصۂ شہر میں کارخانے تھے اور جب گیس نے یہاں کے کام کرنے والوں کو ہلاک کر دیا تو بوائلر اور روشن گیس کے نل پھٹے جنھوں نے چاروں طرف آگ پھیلادی۔ اور عمارتوں کے سیمنٹ اور فولاد کے جلنے سے رنگین شعلے بلند ہونے لگے، اب بھی گاہے گاہے مختلف عمارتوں سے دھماکوں کی آوازیں آرہی ہیں —

اس وقت نیو یارک کے مکانوں، سڑکوں اور دفتروں میں ۴۰ لاکھ لاشیں پڑی ہیں اور جب تک ان کو اٹھا کر کہیں پھینکا نہ جائے یہ شہر دوبارہ آبادی کے قابل نہیں ہو سکتا ـــــ مشرقی حصے کی لاشیں تو خیر جل کر خاک سیاہ ہو گئی ہیں ورنہ ۲۰ لاکھ لاشیں یہاں کی بھی ہٹانا پڑتیں۔

اخبار نیو یارک ٹائمس کے دفتر میں جا کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہاں کے لوگ اپنے اپنے کام میں بالکل اخیر وقت تک مصروف رہے، کیونکہ ان کو کچھ دیر قبل اس حملہ کا حال معلوم ہو گیا تھا اور انھوں نے کھڑکیاں بند کر لی تھیں، لیکن جب گیس ان کمروں میں بھی پہونچی تو جو شخص جس جگہ جس حال میں بیٹھا تھا وہیں مر گیا۔ ایک کلرک آلۂ تلغراف کے سامنے بیٹھا بیٹھا مر گیا اس حال میں کہ دو برقی پیغام اس کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کی عبارت یہ ہے :ـــــ

> " امریکن بیڑے کے طیاروں نے جو بحر اٹلانٹک میں متعین ہیں، تین جہاز دیکھے جن پر اتحادئین کے طیارے موجود تھے ـــــ امریکہ کے طیاروں نے ان کو گیارہ ہزار گز کے فاصلہ سے دیکھ لیا تھا ـــــ جب قریب آئے تو وہ پانی میں ڈوب گئے۔ لیکن امریکن امیر البحر کا خیال ہے کہ یہ صرف دھوکا ہے اور ان کا نیو یارک پر حملہ کرنا یقینی ہے "

دوسرے پیغام میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ

> " وزارۂ حربیہ اتحادئین کے طیاروں کا مقابلہ کرنے کے لئے بالکل آمادہ ہے، امریکہ نے اپنے آپ کو طیاروں کے حملہ سے بالکل محفوظ کر لیا ہے اور ان کی بربادی کے لئے خاص توپیں موجود ہیں "

لیکن افسوس ہے کہ امریکہ کی کوئی احتیاط مفید ثابت نہ ہوئی اور اتحادئین اپنا کام کر گئے ـــــ

جس وقت حملہ ہوا تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ دعا کے لئے جوق درجوق کلیساؤں کی طرف دوڑے ہوئے گئے۔ کیونکہ ڈیڑھ ہزار لاشیں تو کلیسائے ٹرنٹی میں بڑی ہوئی ہیں، دو ہزار کلیسائے پارک میں، ۱۴۰۰ کنیسۂ عمانوئیل میں اور ۸۰۰ کنیسۂ ریور سائڈ میں ـــــ ایک کلیسہ کے اسپتال میں پہونچے تو دیکھا کہ ایک ڈاکٹر آلات جراحی کی میز کے سامنے مردہ پڑا ہوا ہے، ایک مریض نے جس پر عمل جراحی ہونے والا تھا، جراحی کی میز پر دم توڑ دیا ـــــ دوسری جگہ ڈاکٹر کسی مریض کا کان دیکھتے دیکھتے رہ گیا اور ایک ڈاکٹر مطالعہ کرتا ہوا مر گیا، ایک کتاب اس کے سامنے کھلی ہوئی رکھی ہے اور وہ صفحات سامنے ہیں جن میں اڈرنیالین کا بیان درج ہے ـــــ

کولمبیا یونیورسٹی کی عمارت میں پہونچے تو دیکھا کہ وہاں کا پرنسپل لائبریری کے دروازہ پر مردہ پڑا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ باہر دیکھنے کے لئے جا رہا تھا کہ اسی وقت گیس کا بم گرا اور سب کو ہلاک کر گیا۔

نیویارک کے اکثر لڑکے مدرسوں ہی میں مرے کیونکہ ابھی تک وہ گھروں کو نہ لوٹے تھے —— ایک مدرسہ میں جہاں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں پڑھتی تھیں دیکھا کہ معلمہ پڑھاتے پڑھاتے مر گئی اور لڑکیاں جو سامنے اپنی اپنی میزوں پر لکھ رہی تھیں اسی حال میں فنا ہو گئیں، اس وقت ۴۱ لڑکیاں لکھنے میں مصروف تھیں اور سب کی سب اپنے سروں کو ہاتھوں پر رکھے ہوئے تھیں۔

زمیں دوز ریلوے لائن دیکھنے کی ہمت ہم نے نہیں کی کیونکہ تمام سرنگیں لاشوں سے پٹی پڑی ہیں یہی حال بالائی ریلوے لائن اور اس کے اسٹیشنوں کا ہے۔

خیال ہوا کہ ممکن ہے نیویارک کی سربفلک عمارتوں کے بالائی منزلوں کے لوگ کچھ بچ گئے ہوں کیونکہ گیس وزنی ہوتی ہے اور اوپر کی طرف نہیں چڑھتی چنانچہ ہم ایک عمارت میں گئے اور وہاں کے لفٹ پر سوار ہوئے مگر معلوم ہوا کہ وہ بیکار ہو چکا ہے اور تار کٹ گیا ہے۔ پھر چونکہ ہماری آکسیجن کی مقدار کم ہوتی جا رہی تھی! اس لئے زینوں کے ذریعہ سے اور زیادہ چڑھ کر اوپر پہونچنے کی ہمت نہ ہوئی۔ تاہم ساتویں منزل تک تو کوئی شخص زندہ ملا نہیں۔

سنٹرل پارک کی تمام گھاس خشک ہو گئی ہے، پودے مرجھا گئے ہیں اور درخت جھلسے ہوئے نظر آتے ہیں ——

ہم نے چار ہزار فٹ کی بلندی تک اپنے چہروں سے محافظ گیس نقاب نہیں اُتاری کہ مبادا اس کا اثر باقی ہو —— لیکن جب اس سے زیادہ بلند ہو گئے تو صاف ہوا ملی اور وہاں پہونچ کر میں نے ایک اخبار نکالا جو مجھے وہاں کسی مکان میں ملا تھا اور اُسے دیکھنے لگا —— اس اخبار میں ایک اڈیٹوریل نوٹ اس مضمون کا بھی نظر آیا کہ " امریکہ دشمنوں کے حملہ سے بالکل محفوظ ہے اور امریکہ کی فوج نہایت کامیابی سے طیاروں کا مقابلہ کر سکتی ہے " —— میں یہ پڑھ کر اپنے جی میں بہت ہنسا۔

اب ہم لوگ فلاڈلفیا کی طرف جا رہے ہیں اور ٹائپ رائٹر میرے سامنے رکھا ہوا ہے جس پر میں یہ پیغام ٹائپ کر رہا ہوں ——

تھا۔ ایک دن شام کو اسنے اپنی بیوی اور مہمانوں سے کہا کہ میں باغ میں ٹہلنے کیلئے جارہا ہوں۔ وہاں پہونچکر اس نے جیب سے پارہ کی ٹکیاں نکال کر کھائیں، پھر استرا نکال کر اپنے ہاتھ کی شرائین کاٹ ڈالیں۔ ہرچند یہی دونوں طریقے جان لینے کے لئے کافی تھے لیکن اسنے اسی پر کفایت نہیں کی بلکہ سرکے کے پیپے میں کود پڑا۔ اور انتہائی تکلیف کے ساتھ اپنی جان دی

(۴) بعض لوگ آسان ذرائع سے خودکشی کرنا چاہتے ہیں اور بعض انتہائی تکلیف کی صورت اختیار کرتے ہیں چنانچہ روس کی ایک امیرہ (پرنس آنا ولبسکی) پیرس کے مشہور بلند برج ایفل سے کودی لیکن بجائے اسکے کہ وہ باہر کی طرف کودتی اندر کی طرف کودی اور لوہے کی سلاخوں سے ٹکرا کر اپنی جان دی

(۵) وینس کا ایک شخص (ماتیولوفات) سخت مذہبی خیال کا آدمی تھا۔ اُسنے مسیح کے تتبع میں اپنے آپکو مصلوب کرکے جان دی یعنی پہلے تو اپنے ہاتھ پاؤں میں کیلیں ٹھونک کر تختہ کے ساتھ جڑ دیں اور پھر اس صلیب کو اپنے کمرے کی کھڑکی کی چھت میں رسّی باندھ کر اس طرح لٹکایا کہ وہ آہستہ آہستہ زمین کی طرف آئے لیکن زمین تک نہ پہونچ سکے۔

(۶) روس کی ایک مشہور رقاصہ بھی اسنے اپنے ایک محبوب کے ساتھ ملکر اسطرح خودکشی کی کہ دونوں ایک ساتھ اوپرا ہاؤس کی بلند ترین چھت سے کود پڑے ——

سانپ کا گوشت

دو سال ہوئے ارکاڈیا (امریکہ) کے ایک آدمی نے صوبہ فلوریڈا میں دو بڑے سانپ مارے اور جب انکی کھال کھینچی تو ان کا گوشت بالکل سالمون مچھلی کا سا نظر آیا اسنے انکا سر کاٹکر گوشت پکا کر کھایا تو اسے بہت لذیذ معلوم ہوا —— اسنے مزید تجربہ کرنے کے لئے اپنے بعض احباب کی دعوت کی اور منجملہ اور کھانوں کے سانپ کا گوشت بھی ان کے سامنے پیش کیا۔ سبھوں نے اسکی بہت تعریف کی اور نہایت شوق کیساتھ اسے کھایا۔

اس کے بعد اس شخص نے سوچا کہ سانپ کا گوشت مچھلی کی طرح ڈبوں میں بند کرکے بازار میں پیش کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس تجربہ میں بھی وہ کامیاب ہوا اور بازار میں اس گوشت کی مانگ بہت بڑھ گئی

سانپ پکڑ کر کارخانہ کے اندر تار کے صندوقوں میں ڈال دیے جاتے ہیں اور بندوق سے ان کے سر اڑا کر دُم کی طرف سے لٹکا دیے جاتے ہیں یہاں تک کہ ان کا خون صاف ہو جائے —— اس کے بعد ان کی کھال کھینچ کر ان کا تیل نکال لیا جاتا ہے اور پھر نرم آنچ میں ان کو دو گھنٹہ تک پکا کر گلا لیتے ہیں —— جب ہڈیاں علیحدہ ہو جاتی ہیں تو نمک اور سیاہ مرچ کا سفوف چھڑک کر پھر آگ پر رکھ دیتے ہیں —— اس کے بعد گوشت کے ٹکڑے ڈبوں میں بند کرکے ہوٹلوں اور بازاروں میں بھیج دیے جاتے ہیں۔ جہاں یہ بحساب ایک گنی فی پونڈ فروخت ہوتے ہیں۔

ادبِ اُردو کا مکمل ذخیرہ

تاریخ اُردوئے قدیم | وہ مکمل جامع تاریخ ہے جسمیں زبان اردو اور اسکی نظم و نثر کی مفصل اور مکمل تاریخ اور عہد بعہد کی ترقیوں کا مکمل تذکرہ ہر زمانہ ابتدائے زبان اُردو سے لیکر بارھویں صدی ہجری کے نصف اول تک کا ذکر اور اسی کے ضمن میں تمام شعراء اور مصنفین کے نہایت صحیح اور بیحد دلچسپ حالات بھی تحریر ہیں جسکو حکیم سید شمس اللہ قادری ماہر علوم آثار قدیمہ نے عربی فارسی اردو انگریزی فرانسیسی جرمنی وغیرہ کی مشہور و مستند کتابوں سے اخذ کرکے مرتب و مدون کیا۔ جو ۱۹۲۶ء سے عثمانیہ یونیورسٹی کے امتحان ایم۔اے میں بھی داخل ہے قیمت عہر

تاریخ ادب اُردو | یعنی ہسٹری آف اُردو لٹریچر کا اردو ترجمہ جسمیں نظم و نثر کی تاریخی نمونوں کو اس حسن و خوبی کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ اس سے بہتر آج تک کسی کتاب میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی یہ ہر ایک دور اوّل سے لیکر زمانہ حال تک کے تمام شعراء اور نثر نگاروں کے واقعات زندگی اور انکے سوانح کو بھی انتہائی شرح و بسط کے ساتھ دکھایا گیا ہے ساتھ ہی ساتھ تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے دو جلدیں ہیں ایک میں نظم دوسری میں نثر کا تذکرہ ہے۔ قریب قریب سو مصنفین کی تصاویر بھی اس میں دی گئی ہیں۔ اور انڈکس بھی شامل کیا گیا ہے اس میں دوسرے تذکروں کی غلطیاں بھی دکھائی گئی ہیں چھپائی اس قدر مرغوب ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے قیمت لعہر

تذکرۃ الخواتین | اردو اور فارسی کی نہایت مشہور و معروف شاعرہ عورتوں کا جامع تذکرہ ہے۔ بہترین کلام کا تذکرہ ہے اور عورتوں کا کوئی تذکرہ اس سے بہتر نہیں دیکھا گیا قیمت عہر

دیوان خواجہ میر درد | خواجہ میر درد کے کلام کو نہایت صحت کے ساتھ نہایت قدیم نسخوں سے ملا کر چھاپا گیا ہے۔ شروع میں خواجہ صاحب کا تذکرہ اور انکے شاگردوں کے جامع حالات مقدمہ میں درج ہیں قیمت ۱۲ر

مذہب الاسلام | ایک خاص قسم کا تذکرہ جس میں مسلمانوں کے تمام فرقوں کے حالات و عقاید کا نہایت تفصیل اور تشریح کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے اور دعوے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے نہایت عجیب کتاب ہے قیمت للعہ ر

سخن شعراء | مولوی عبدالغفور صاحب نساخ کا لکھا ہوا اردو شعراء کا نہایت جامع تذکرہ ہے اور مشکل سے اس میں اس زمانہ کے شعرا چھوٹے ہیں۔ جا بجا کلام کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے نہایت عمدہ اور نایاب تذکرہ ہے قیمت عہر

تذکرۂ حسینی فارسی | اسقدر بہتر اور دلچسپ تذکرہ ہے کہ شاید اسکی نظیر فارسی کے کسی دوسرے تذکرہ میں آپکو نہ ملسکیگی۔ شعراء کے حالات اور کلام کے علاوہ جسقدر لطائف انسے متعلق ہیں وہ بھی لکھدیے گئے ہیں یہ تذکرہ زمانہ عالمگیر بادشاہ میں لکھا گیا تھا قیمت ۱۱ر

تذکرۂ گلشن بیخار | نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کا مشہور اور مقبول اردو شعراء کا زبان فارسی میں تذکرہ ہے قیمت ۱۰ر

انتخاب نادرہ | تمام شعراء کے بدلے اور لطیفے لطائف کو تواریخ کی کتابوں سے [illegible] کرکے لکھا گیا ہے قیمت ۱ہر

المشتہر مینیجر نولکشور پریس چھاپہ خانہ لکھنؤ

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

گوڈر کا لال	للعہ	فرائض مادری	۱۲ر
شوکت آرا بیگم حصہ اور دوم	سے	افسانۂ نادر جہاں	عہ
؍؍ حصہ سوم	سے	اقبال دولھن	عہ
سعیدہ کے خطوط	عہ	حسن معاشرت	عہ
پیاری سہیلی	۱۰ر	ایا می	عہ
نئی نویلی پیاری سہیلی	عہ	سولہ کہانیاں	۱۲ر
عورتوں کی انشا	عہ	سترہ کہانیاں	۱۲ر
انشائے نسواں	۸ر	سولہ قصے	۸ر
سیرۃ النبی	عہ	مراۃ العروس	۸ر
طرز زندگی	عمر	بنات النعش	۸ر
محذرات تیموریہ	عمر	توبۃ النصوح	۱۲ر
ازواج النبی	۱۲ر	کنیز فاطمہ	۸ر
ازواج الانبیا	عہ	بیگمات بالی	۸ر
سیرۃ عائشہ صدیقہ	عا	نصیحت کا کرن پھول	۸ر
عفت المسلمات	عہ	برکات سلطانی	۸ر
سبیل الجنان	عا	ابن الوقت	عہ
بچوں کی پرورش	عہ	چند پند	۱۲ر
حرز اطفال	عہ	منتخب الحکایات	۱۲ر
تہذیب نسواں	عا	تندرستی	عہ
بیوی کی تعلیم	عہ	حفظ صحت	عہ
بیوی کی تربیت	عہ	طبیب نسواں	عہ
تربیت اطفال	۱۲ر	رہبر صحت	۸ر

ناول، ڈرامے اور افسانے

قطرات اشک	عہ	موہنی	۱۲ر
جتندرا ناتھ	عہ	وداع ظفر	عہ
بس کار دکھ	عہ	یاسمین شام	عہ
فسانۂ سعید	۸ر	طوفان اشک	عہ
خوفناک ڈکیتی	عہ	شاہین دوراج	۸ر
سیلاب اشک با تصویر	عہ	درس عشق	عہ
بے زبان دوست	۸ر	کروڑپتی چور	عہ
جمال ہم نشین	عہ	تین بندوق باز	عہ
تغییر عصمت	عہ	کرشمۂ رقابت	۸ر
جوہر قدامت	عہ	انقلاب قسطنطنیہ	۸ر
تائید غیبی	۸ر	شاہد رعنا	عہ
پر اسرار قتل	عا	ڈیڈیا کی سرگذشت	عہ
اعلان آزادی	۵ر	شگوفۂ محبت	۸ر
سرگذشت ہاجرہ	۱۰ر	نسوانی زندگی	۸ر
نوحۂ زندگی	۱۲ر	ولایتی کھنی	۸ر
قلب حزیں	۸ر	شمع خاموش	۸ر
عروس کربلا	عہ	شب زندگی کامل	عا
شہید مغرب	عہ	مودودہ	۸ر
ماہ عجم	عہ	چندر کلا	۸ر
تیغ کمال	عہ	گلستان خاتون	عہ
سراب مغرب	۸ر	صبح زندگی	عہ
مینا بازار اسارڈ کامل	عا	شام زندگی	عہ

تاریخ و سوانح عمریاں

تاریخ مغرب	عا
مختصر تاریخ اسلامی	۸ر
؍؍ ؍؍ حصہ ۲	۹ر
؍؍ ؍؍ حصہ ۳	۱۰ر
؍؍ ؍؍ حصہ ۴	عہ
الصالحات	عہ
امت کی مائیں	عہ
الزہرا	۱۲ر
اسوۂ حسنہ	۸ر
ہند و شعراء	عہ
شتو نہار	عہ
سوانح اکبر الہ آبادی	عہ
سفرنامہ عراق	عہ
تاریخ اشاعت	عہ
اسلام اور غیر مسلم	۸ر
سیر المصنفین حصہ ا	عا
؍؍ حصہ ۲	سے
تاریخ اسلام ۵ جلد	عہ
اخبار اندلس ۳ جلد	عہ
خلافت موحدین	۱۰ر
خلافت مولدین	عا
عرب اور اس کا مستقبل	عہ

لغات و ادب

بازاری زبان	۸ر
لغات سعیدی	للعہ
لغات کشوری	سے
گنجینۂ تحقیق جلد	للعہ
غیاث اللغات فارسی	عا
محاورات نسواں	۸ر
جواہر اللغات	۱۲ر
گوہر اللغات	۱۱ر
چراغ سخن	عہ
دکھنی لغت	۸ر
جواہرات کلیات نظیر	عہ
عزیز اللغات	عا
تذکرۂ ریختی	عہ
تاریخ اردوئے قدیم	عہ
دکن میں اردو	عا
منتخب کلام ہندی	عا
رباعیات عمر خیام	عا
منتخب کلام ہندی	عا
اردو کے اسالیب بیان	عہ
تصریح الاغلاط	عہ
فیض اردو	۵ر
نور اللغات ۴ جلد	للعہ

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز	عہ	کلیات غالب	عہ	دیوان غنی کشمیری	۸ر
کلیات عراقی	۱۲ر	کلیات صائب	عہ	دیوان ہلالی	۶ر
دیوان حافظ	عہ	دیوان ناصر علی	۶ر	اسرار خودی رموز بےخودی	سے
دیوان بیدل	عہ	کلیات سعدی	عہ	زبور عجم	سے
دیوان عرفی	۱۲ر	کلیات عزیز	عہ	پیام مشرق	سے
کلیات جامی	عا	دیوان عنصری	۱۲ر	قصائد عرفی مجلد	سے

دواوین اردو

کلیات ظفر	عہ	کلیات نظیر اکبرآبادی	عہ	صنمخانۂ عشق	عا
کلیات مومن	عہ	گلزار داغ	عہ	فریاد داغ	عہ
دیوان ناسخ	عہ	دیوان رند	۱۲ر	عالم خیال با تصویر	عہ
کلیات میر	عہ	دیوان ذوق	۱۲ر	دیوان شہیدی	عہ
کلیات سودا	عہ	گلکدۂ عزیز مصرا	عہ	کلیات اکبر الہ آبادی	للعہ
کلیات انشا	عہ	مراۃ الغیب	عہ	نغمۂ دل شاہجہانپوری	عہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

تذکرہ و تاریخ

- پیغمبر اعظم
- شب معراج
- سراج منیر
- پیغمبر عالم
- سوانح حضرت رسول
- سید المرسلین
- حیدر کرار
- سیرۃ الصدیق
- عمر ابن خطاب
- ابوبکر صدیق
- ائمہ اسلام
- الحبیب
- عمر بن عبد العزیز
- دولت فاروقیہ
- مکمل سوانح زیب النساء بیگم
- تذکرہ اولیا
- تذکرہ اولیائے ہند
- مراۃ الکونین
- قصص الانبیا مکمل
- سفرنامہ چین
- تلخیص التواریخ
- خاتون جنت
- مختارات الصوفیہ
- خواتین انگورہ
- مشاہیر نسواں
- مشاہیر ہند
- مخدرات تیموریہ
- بیگمات بنگال

جاسوسی کے ناول

- شرلاک ہومز
- محاصرۂ پیرس
- شیخ چلی
- بہرام کی واپسی
- انقلاب فرانس
- بحری قزاق
- فطرتی جاسوس
- ترکی حرم سرا
- جنگ طرابلس
- بہرام چور
- زر پرست
- کنجی کا راز
- عبد الرحمٰن ناصر
- عروس مصر
- سیلاب خون
- سیاحت زمین
- سیاحت [illegible]
- نازنین مراکش
- سمندر کی سیر
- اسرار بالغو نیوم
- روح لیلیٰ
- ایمن بک
- حجاج بن یوسف
- یوسف پاشا
- انقلاب عثمانی
- بہرام کی رہائی
- بہرام کی آزادی
- بہرام کی سرگذشت

مراثی

- مراثی دبیر
- مراثی انیس کامل
- مراثی ضمیر
- مراثی مونس
- مراثی دلگیر

عجائب و غرائب

- عجائب المخلوقات
- تصویر رنگین
- بڑا تصویر سازہ
- مجمع الفنون
- طلسم فرنگ
- کارخانۂ [illegible]

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- الہ دین و لیلیٰ
- فریب حسن
- سوزن عشق
- روز الیمبرٹ
- ناول اسرار
- شام جوانی
- حرم سرا

ناول سجاد حسین

- احمق الذی
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرح دار لونڈی
- طلسمی [illegible]

ناول جوالا پرشاد

- [illegible]
- [illegible] مستقیم
- [illegible]
- معشوق فرنگ
- [illegible]
- [illegible]

ناول سرشار

- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ بطرز ناول
- کامنی
- سوانح عمر و عیار

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب
- بزم خیال
- مشاطۂ سخن
- مکاتیب محسن الملک

تذکرۃ الشعرا

- تذکرۂ عیسیٰ
- گلشن [illegible]
- [illegible] سخن
- سوانح نظیر اکبرآبادی

ناول شرر

- جنید بغدادی
- مخدرات
- جویائے حق
- لعبت چین
- فاتح و مفتوح
- بابک خرمی
- ایام عرب
- قیس و لبنیٰ
- یوسف و نجمہ
- زوال بغداد
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- مینا بازار
- قدرس نازنین
- روما الکبریٰ
- فلپانا
- شوقین ملکہ

مولانا شبلی نعمانی

- سیرۃ النبی جلد اول
- سیرۃ النبی جلد دوم
- سیرۃ النبی جلد سوم
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- رسائل شبلی
- موازنۂ انیس و دبیر
- کلام شبلی اردو
- الکلام
- علم الکلام
- شعر العجم جلد اول
- شعر العجم جلد دوم
- شعر العجم جلد سوم
- شعر العجم جلد چہارم
- شعر العجم جلد پنجم

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس نظر آباد لکھنؤ باہتمام محمد تو سل حسین

قیمت ۸ر

تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

نگارستان
حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے جستہ جستہ مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت عہ

گہوارۂ تمدن
مولانا نیاز کی وہ معرکتہ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور سائنس سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا کی تہذیب شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے جس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء علاوہ ہر مطالب کے دیدہ کے قابل ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید
مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنا اور ہر شخص کا مستقبل سیرت عروج و زوال خوشحالی صحت بیماری غرضکہ ہر بات کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشاط بخش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ نیچے جذبات اور افکار کو لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ مل نہیں سکتی۔ قیمت علاوہ محصول ۱۰ر

جذبات بھاشا
جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں اپنی سبب کی پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بہترین نمونے ہیں۔ قیمت علاوہ محصول

صحابیات
جس میں عہد سعادت کی ۸۰ محابیات کے مستند حالات یکجا کر دیئے گئے ہیں اس کا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے اس کتاب میں سیر الصحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں طباعت و کتابت نہایت نفیس ہے قیمت علاوہ محصول عہ

نقاب اٹھ جانے کے بعد
تین افسانوں کا مجموعہ جن میں بتایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں۔ زبان و پلاٹ انشاء و تخیل کے لحاظ سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے قیمت ۵ر علاوہ محصول۔

مذاکرات نیاز
یعنی حضرت نیاز کی ادبی جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کر دینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

فلسفۂ قدیم
یہ مجموعہ ہے حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل کا
۱۔ چند گمشتہ فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ
۲۔ مادیین کا مذہب
۳۔ حرکت کے کرشمے
نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول۔

تاریخ الدولتین
جرمی زیدان کی تاریخ تمدن الاسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے جرجی زیدان کی یہ کتاب بے حد شہرت حاصل کر چکی ہے قیمت عہ علاوہ محصول

المسئلۃ الشرقیہ
مصطفےٰ کامل پاشا کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ یہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ و ایشیا کے سیاسیات میں ہلچل ڈال دی تھی اور جس نے سب سے پہلے ترکی و مصر و عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونکی قیمت عہ علاوہ محصول

تذکرۂ خندۂ گل
مولفہ عبدالباری آسی جس میں ۳۰۰ صفحات سے زائد اردو و فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات معہ ان کے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت معہ محصول عہ

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں

مثنوی لالہ رخ
طامس مور کی معرکتہ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ قیمت معہ محصول عہ

مثنوی زہر عشق
مرتبہ مجنوں گورکھپوری جس میں ملک کے بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں ایک تصویر رنگین ہے ۸ر

فراست التحریر مکمل
یعنی اردو اور انگریزی رسم خط اور طرز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت ۸ر علاوہ محصول۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شایع ہوتا ہے۔
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ (سے ر)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

جلد ۲۳	فہرست مضامین اپریل ۱۹۳۳ء	شمارہ ۴

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۳	اپریل ۴۳ء	شمارہ ۴

ملاحظات

دار العلوم ندوہ کے متعلق کچھ اور انکشافات

عبد العلی ناظم ندوہ کے استبداد پر ایک اور مہر توثیق

گزشتہ ماہ کے ملاحظات لکھنے کے بعد ہمارا ارادہ نہیں تھا کہ "دار العلوم ندوہ" کی داستان کو جس میں نہ ہمارے لئے کوئی لذتِ ندرت ہے، نہ کیفیت افادیت، بار بار ملک کے سامنے پیش کریں۔ لیکن اس خیال کو پیش نظر رکھکر کہ ممکن ہے ملک کے لئے اس میں کچھ نہ کچھ سامان بصیرت وعبرت موجود ہو، مناسب یہی معلوم ہوا کہ اس درسگاہ کی موجودہ حالت اور اس کے ناظم (عبد العلی) کی ذہنیت کو ایک بار پوری طرح بے نقاب کر دیا جائے، تاکہ ہماری قوم جان لے، کہ اس درسگاہ کی امداد کرنا بنجر زمین میں آبپاشی کرنے سے زیادہ نہیں اور یہاں بچوں کو تعلیم کے لئے بھیجنا ان کے دل و دماغ پر ہمیشہ کے لئے غلامی کی مہر لگا دینا ہے۔

"دارالعلوم ندوۃ العلماء" کے شاندار اور پُرہیبت وجلال نام کو سنکر دنیا غالباً یہ باور کرتی ہوگی کہ علوم عربیہ کی یہ کوئی نہایت ہی مہتم بالشان درسگاہ ہوگی - اس کے ذرہ ذرہ سے علوم و فنون کے دریا ابل رہے ہونگے، اس کے مختلف حجروں میں علامہ تیمیہ اور ابوالعلاء المعری بیٹھے ہوئے درس حکمت دے رہے ہوں گے - اور اسکے ایوانوں میں ہزار ہا تشنگان یقین طلبہ ہر وقت مصروف مطالعہ نظر آتے ہوں گے، لیکن غالباً دنیا یہ معلوم کرکے حیران رہ جائے گی کہ دارالعلوم ندوہ میں طلبہ کی تعداد سیکڑوں تک بھی نہیں پہونچتی اور ان میں تقریباً سب وہی ہیں جو دارالاقامہ میں رہتے ہیں اور جنکو ان کے والدین نے "دارالعلوم" کے لفظ سے مرعوب ہوکر یہاں کسب "علوم و فنون" کے لئے بھیجدیا ہے ——— رہا یہ امر کہ یہاں کن کن علوم کی تعلیم ہوتی ہے، نصاب کس درجہ بلند ہے، کیسے کیسے مشاہیر علم و فضل یہاں کے اساتذہ ہیں، کن قابل ہاتھوں میں یہاں کی عنان حکومت پائی جاتی ہے - اور آئیں نظم و نسق میں پبلک کی نمایندگی کس حد تک پائی جاتی ہے ——— ان تمام باتوں پر میں اس وقت روشنی ڈالوں گا جب تمام اطلاعات مجھے فراہم ہوجائیں ——— میں نے ڈاکٹر عبد العلی ناظم ندوہ کو ایک تحریر بطور استفسار بھیجی ہے - اگر انھوں نے جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائی جسکا مجھے یقین نہیں تو خیر، ورنہ پھر میں دوسرے ذرایع سے تمام ضروری اطلاعات و معلومات اس درسگاہ کے متعلق حاصل کرکے پبلک کو آگاہ کروں گا -

گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں ایک طالب علم عنایت علی (صحیح نام عنایت اللہ ہے) کے اخراج کا حال بیان کیا گیا تھا، لیکن شوق موسیقی کیوجہ سے کسی طالب علم کو محروم تعلیم کردینے کی ایک مثال ناظم ندوہ اور بھی قایم کرچکا ہے جسکا حال مجھے بعد کو معلوم ہوا -

ایک طالب علم علاء الدین احمد حیدرآباد سے بغرض تعلیم یہاں بھیجا گیا تھا جو وہاں کا وظیفہ یاب بھی تھا - جب کامل ۸ سال کا زمانہ یہاں تعلیم پاتے ہوئے اسے گزر گیا تو ذوق موسیقی کی بنا پر اسے بھی نکالا گیا - اور معتمد مالیات حیدرآباد (نواب فخر یار جنگ بہادر) کو ناظم ندوہ نے انتہائی زہد و ورع کی نمایش کرتے ہوئے ایک تحریر بھیجی کہ علاء الدین احمد کا وظیفہ (غالباً تیس روپیہ ماہوار) بند کردیا جائے، کیونکہ وہ خارج اوقات مدرسہ میں، میوزک کالج بھی جاتا ہے ——— نواب فخر یار جنگ نے جو ہندوستان کی کسی معمولی درسگاہ کے ناظم نہیں، بلکہ حیدرآباد ایسی بڑی ریاست کے معتمد مالیات ہیں، جواب دیا کہ محض موسیقی سے ذوق رکھنا کوئی الزام کی بات نہیں - اگر وہ دارالعلوم کی تعلیم کے لحاظ سے ناکارہ ثابت ہو، تو البتہ اطلاع دی جائے ——— لیکن چونکہ طالب علم تیز تھا اور اس نے علاوہ امتحانات دارالعلوم کے، یونیورسٹی کے امتحان عالم میں بھی کامیابی حاصل کرلی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ ناظم اس کی بد شوقی کی شکایت نہ کرسکتا تھا ——— الغرض نتیجہ یہ ہوا کہ مستبد ناظم نے اس طالب علم کو دارالعلوم میں پڑھنے کی اجازت نہ دی اور فخر یار جنگ بہادر نے اس کے وظیفہ میں بیس روپیہ

بہر حال یہ ہیں وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جن پر ناظم کی توجہ صرف ہوتی ہے اور یہ ہیں اُن کی وہ روا داریاں جنھوں نے اس درسگاہ کی حالت کو سقیم بنا رکھا ہے۔ اب اسی کے ساتھ چند کلمے شیخ صاحب (حیدر حسن ٹونکی) کے متعلق بھی سن لیجئے جن کو اس درسگاہ کے مہتمم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ یہ بزرگ کتابی قابلیت کے لحاظ سے جو کچھ بھی ہوں۔ مجھے اس کا علم نہیں لیکن اپنی ذہنیت کے اعتبار سے ان کو ناظم ندوہ کے حریف کامل ہونیکا دعویٰ ہے۔ صرف ایک واقعہ اس کے ثبوت میں پیش کر دینا غالباً کافی ہوگا۔

کلکتہ کے چند فاضل مرد اور وہیں کی چند گریجوئٹ عورتیں لکھنؤ آتی ہیں اور یونیورسٹی ہال میں ان کے لکچروں کا انتظام ہوتا ہے ——— دار العلوم ندوہ کے طلبہ بھی عمارات یونیورسٹی کے قریب رہنے کی وجہ سے واقف ہو جاتے ہیں اور ان کا شوق علم کشاں کشاں لکچر روم تک پہونچا دیتا ہے ——— جب یہ واپس آتے ہیں۔ تو جناب مہتمم ان کو طلب کرتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ " تم لوگوں کو شرم نہیں آتی کہ عورتوں کا لکچر جاکر سنتے ہو اور ندوہ کو بدنام کرتے ہو " ——— اگر ان الفاظ میں طلبہ کو غیرت دلانا اس لئے نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی ان عورتوں کا حریف علم بننے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا، تو پھر اس برہمی کا اندازہ مشکل ہے جو مہتمم صاحب کے غیرت دلانیوالے الفاظ سے ظاہر ہو رہی ہے، کیونکہ طلبہ کا نامحرم عورتوں کو جاکر دیکھنا یا اُن کی آواز کو سننا کوئی ایسی معمولی بات نہ تھی جس کو مہتمم صاحب کی شب زندہ دارانہ خصوصیات آسانی سے برداشت کر سکتیں۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ طلبۂ ندوہ کی ذہنی آزادی کو روکنے کی اور تدابیر بھی اختیار کی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ مہتمم صاحب ان کو ملک کے تمام اخبارات و رسائل دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے، بہت سی ایسی کتابیں لائبریری سے اُن کو نہیں دی جاتیں جن کے مطالعہ سے ان کے تقشف دور ہونے کا اندیشہ ہے اور اس قسم کا سلوک ان سے کیا جاتا ہے جسے خوددار طبیعتیں برداشت نہیں کر سکتیں، چنانچہ سنا گیا ہے کہ ایک بار کسی طالبعلم (غلام محی الدین) نے مہتمم صاحب کو امتحان کے کمرہ میں زدوکوب بھی کی اور جس کے متعلق میں نے ناظم ندوہ سے مفصل کیفیت دریافت کی ہے۔

متعدد طلبہ میرے پاس ایسے آئے اور آتے رہتے ہیں جو ندوہ اور وہاں کے ارباب نظم کے طرف سے لبریز شکایت ہیں اور معلوم ہوا کہ بعض طلبہ کا وہاں سے چلا جانا اور جدید طلبہ کا داخل نہ ہونا۔ اس تنگ ذہنیت اور اس بدنظمی کی وجہ سے ہے ——— انگریزی تعلیم کے لئے بھی وہاں ایک درجہ کھولا گیا ہے لیکن غالباً اس لئے کہ پبلک پر اپنی آزادہ روی اور روشن خیالی کا اثر ڈال کر مالی امداد حاصل کی جائے، ورنہ عملاً اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اخبارات میں ناظم ندوہ کی طرف سے پبلک کے سامنے چندہ و عطیات کے لئے اپیل تو ضرور کبھی کبھی

پیش کردی جاتی ہے، لیکن ارباب ندوہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر کبھی غور نہیں کرتے کہ کیا قوم اپنے بچوں کو وہاں صرف اس لئے بھیجنے کے لئے طیار ہو سکتی ہے کہ جب دس سال کا طویل زمانہ ختم کرنے کے بعد وہ وہاں سے نکلیں تو یکسر داڑھی ہی داڑھی نظر آئیں اور روشن خیالی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا "نقطہ سویدا" ان کے دلوں میں نہ پایا جائے!

حقیقت یہ ہے کہ ذہنی آزادی کے لحاظ سے اس وقت مسلمانوں کی صرف ایک ہی درسگاہ جامعہ ملیہ (دہلی) ایسی ہے جس پر ہماری قوم ناز کرسکتی ہے لیکن افسوس ہے کہ قوم اس کی طرف سے بے پرواہ ہے اور داڑھیوں کے رعب نے اب تک ہم میں "سیاہ و سفید" کی تمیز کی اہلیت پیدا نہیں کی

وہائٹ پیپر اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ گول میز کانفرنس کی داستان کیا ہے، یہ بار بار اکابر ہند کا لندن جاجا کر لوٹ آنا کس مقصود کی تگ و دو ہے فیڈریشن کس نعمت ربانی کا دوسرا نام ہے، صوبوں کی خود مختاری کی حقیقت کیا ہے، لامرکزی طریق حکومت سے ہندوستان کو کیا برکات ملنے والی ہیں، اور یہ کہ ملک کی آزادی کا کب تک انتظار کیا جائے تو میں سورۂ طٰہٰ کی وہ آیتیں سنادوں گا جن میں موسیٰؑ اور فرعون کا مقابلہ دکھایا گیا ہے اور پھر وہائٹ پیپر کی طرف اشارہ کرکے کہہ دوں گا کہ

اذا جاء موسیٰ والقی العصا فقد ابطل السحر والساحر

کیونکہ وہائٹ پیپر واقعی ایک عصائے موسوی ہے جس نے گول میز کانفرنس کے سحر و طلسم کو باطل کرکے رکھدیا اور "وعدہ پر جینے والوں" کی آنکھ سے پردہ ہٹا کر یہ حقیقت پوری طرح واضح کردی کہ

ازیں فزوں نتوانی بمن جفا ورنہ
تو آں نئی کہ جفائے توانی و نکنی

وہائٹ پیپر کیا چیز ہے۔؟ یہ بیان ہے حکومت برطانیہ کا جو مطالبات ہند کے جواب میں شایع کیا گیا ہے، یہ تفسیر ہے اُن الہامات و متشابہات سیاست کی جو گول میز کانفرنس میں خدا کے چند برگزیدہ بندوں پر نازل ہوئی اور یہ تعبیر ہے اس خواب آزادی کی جس نے سالہا سال سے وطن و اہل وطن کو بیقرار و مضطرب بنا رکھا تھا

پھر کیا آپ نے اس صحیفۂ قسمت کا مطالعہ کرلیا۔ اس نوشتۂ مقسوم کا مدعا جان لیا اور اپنی بڑھتی ہوئی تمناؤں کے خون کئے جانے کی داستان سُن لی؟ — ممکن ہے بعض جماعتوں کو نے نوازان برطانیہ کا یہ نغمہ کوئی جدید چیز معلوم ہو، ہو سکتا ہے کہ بعض اُن حضرات کے نزدیک جو "کشود نقاب" کی تاخیر اور "ازدحام تمنا" کے تماشہ میں مصروف تھے یہ کوئی جدید جلوہ طرازی ثابت ہو، لیکن ارباب نظر جانتے تھے کہ برق کی عبادت کرنے والوں کو ہمیشہ اسی طرح "افسوس حاصل" کرنا پڑتا ہے اور اپنی ذات پر اعتماد نہ کرنیوالوں کیلئے دنیا ہمیشہ اسیطرح بے

اعتماد ثابت ہوتی ہے

کہا جاتا تھا کہ گول میز کانفرنس، سائمن کمیشن رپورٹ سے کچھ ترقی کرکے، آیندہ کی اصطلاحات پر غور کررہی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ ملک کی مکمل آزادی تو کجا، اسے ڈومی نین ہوم رول کی رعائتیں بھی نہیں دی جائیں۔ بیان کیا جاتا تھا کہ ہوم گورنمنٹ کے اختیارات اور وائسرائے کی ملوکانہ حیثیت میں بہت کمی پیدا ہوجائے گی، لیکن جب پردہ اٹھا تو معلوم ہوا کہ ان کے چہروں سے جلال و استبداد اور زیادہ ہویدا ہے ——— پھر کیا ہندوستان میں کوئی ایک جماعت بھی ایسی نظر آتی ہے جس نے اس کو نگاہ پسندیدگی سے دیکھا ہو، کوئی ایک شخص بھی ہے جس نے حکومت کے اس فیصلہ کو انصاف پر محمول کیا ہو، اس لئے اب سوال نہ آیندہ کے اعتماد کا ہے نہ ماضی کی حسرت کا بلکہ اتفاق کامل اور اتحاد تام کے ساتھ اس امر پر غور کرنے کا کہ

کابستگی شست غم بجو نفس اے دل
تو گرہ غنچہ نہ گردانی گرہ کشائے تو کیست؟

اردو زبان میں تعلقات جنسی کی تاریخ و نفسیات پر بالکل پہلی کتاب

(حضرت نیاز کے قلم سے)

شہوانیات

ضخامت تقریباً ۴۰۰ صفحات قیمت مجلد عہ غیر مجلد ۴ر علاوہ محصول

اپریل میں شائع ہوجائے گی۔ لیکن خریداران نگار سے ایک روپیہ کم لیا جائے گا۔ جن حضرات نے کچھ رقم پیشگی بھیجدی ہے اس کو منہا کرکے باقی رقم کا وی پی اپریل کے اندر اندر انکو مل جائیگا۔

مینیجر نگار لکھنؤ

راکھی

(۱)

چنار گڑھ کا قلعہ گھرا ہوا تھا - توپوں کی گھن گرج سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی - ہر سمت دھوئیں کی مسموم فضا میں حملہ آور سپاہیوں کے دستے پے در پے ڈھالوں کو سپر کئے ہوئے سمندر کی موجوں کی طرح آگے بڑھتے جاتے تھے - قلعہ کی فصیل پر شیر خاں مستعدی کے ساتھ کمان کر رہا تھا اسکے ایک اشارہ پر ہزاروں تیر، بڑے پتھر، روغن نفط اور گولے بیک وقت برسنے لگتے تھے - نتیجہ یہ تھا کہ حملہ آوروں کا بڑھتا ہوا نہ تھمنے والا سیلاب قلعہ کی آہنی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر لاشوں اور زخمیوں کو چھوڑ کر اُلٹے پاؤں لوٹ جاتا تھا - یہ سلسلہ مسلسل ایک گھنٹہ سے جاری تھا اور اب رفتہ رفتہ حملہ آوروں کے جوش میں کمی ہوتی جا رہی تھی کہ یکایک قلب فوج میں جنبش ہوئی اور ایک خوشرو نوجوان جس کے چہرے سے عجیب قسم کا تقدس برستا تھا، نمودار ہوا - یہ دوسرے افسروں کی طرح فوجی لباس پہنے ہوئے تھا - مگر اس کے عمامہ میں ایک بیش قیمت بڑی سی مرصع کلغی لگی ہوئی تھی - یہ ہندوستان کا نوجوان شہنشاہ ہمایوں تھا - اس نے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور ساری فوج کا جائزہ لینا شروع کیا - وہ ہر دستہ کے سامنے گھوڑے کو چند لمحوں کے لئے روک لیتا اور سپاہیوں کی ہمت بڑھاتا - اس نے دو گھنٹے کے اندر ساری فوج کا جائزہ لے لیا - اور ایک لمبا چکر کاٹ کر پھر قلب فوج میں واپس چلا آیا - شہنشاہ کی ہمت افزائی اور اس کی موجودگی نے سپاہیوں میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کر دیا تھا - گولوں کی زور و شور سے بارش ہونے لگی اور ہر دستہ جان پر کھیل کر کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح قلعہ کی دیوار پر چڑھ جائے - اور شہنشاہ کی نظروں میں سرخروئی حاصل کرے، بارہا ایسا ہوا کہ چند جانباز سیڑھیاں لگا کر سر کو ہتھیلی پر لے کر دیوانہ وار چڑھے مگر سیڑھیاں نیچے گرا دی گئیں اور چڑھنے والوں کو یا تو جان سے ہاتھ دھونا پڑا یا زخموں سے چور ہو کر نیچے گرے -

شام ہو رہی تھی - اور ہمایوں بیتاب تھا کہ جس طرح ہو آج ہی قلعہ فتح ہو جانا چاہئے -

"بیرم خاں قلعہ آج ضرور فتح ہو جانا چاہئیے" شہنشاہ نے کہا -

"جہاں پناہ! اب تو شام ہو چکی مگر کل قلعہ ضرور فتح ہو جائے گا - کیونکہ رسد بند ہو جانے کی وجہ سے قلعہ والے فاقہ کر رہے ہیں - اور ان کے لئے سوائے قلعہ حوالہ کر دینے کے کوئی چارہ نہیں - کل انشاء اللہ تعالےٰ کو کب ہمایونی چنار کے قلعہ پر لہراتا ہوا نظر آئیگا" بیرم خاں نے کہا -

اتنے میں شہنشاہ کی نظر چند جانباز سپاہیوں پر پڑی جو قلعہ کی دیوار پر سیڑھی لگاکر چڑھنے کی کوشش کررہے تھے مگر قلعہ والوں نے سیڑھی نیچے گرادی تھی اور وہ زمین پر تڑپ رہے تھے۔ شہنشاہ اس جانبازی کے نظارہ کی تاب نہ لاسکا اور اُس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ خود سیڑھی لگاکر قلعہ کی فصیل پر چڑھ جائے گا۔ اس نے بیرم خاں کو اپنے اس ارادہ سے مطلع کیا۔

"بالکل بیکار ہے۔ جہاں پناہ! کل قلعہ ضرور فتح ہو جائے گا۔ شام ہو چکی ہے اور رات بھر کی تاخیر کے لئے ایسی عزیز جان کو جس کی قیمت کونین کی سعادت سے بلند تر ہے۔ ہلاکت میں ڈالنا۔ دانشمندی کے خلاف ہے۔" بیرم خاں نے کہا۔

"اچھا جیسی تمھاری رائے۔ رات کی تاریکی پھیل رہی ہے۔ اب طبل بازگشت بجنے کا حکم دو۔ کل میں خود اپنے جانباز سپاہیوں کے ساتھ قلعہ کی دیوار پر چڑھوں گا"، شہنشاہ نے کہا۔

جواب میں بیرم خاں نے مودبانہ سر کو جھکا لیا۔

(۲)

رات تاریک تھی اور ایک تہائی حصہ اس کا گذر چکا تھا۔ ہمایوں کے فوجی کیمپ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دن کے تھکے ماندے سپاہی پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ البتہ کہیں کہیں سے زخمیوں کے کراہنے کی..... آوازیں آرہی تھیں۔ اور پہرہ کے سپاہی چاروں طرف گشت لگا رہے تھے۔ اس سناٹے میں شاہی خیمہ کے اندر کسی خاص معاملہ پر گفتگو ہو رہی ہے۔

"ارکین سریر سلطنت! آپ کو معلوم ہے کہ فردوس مکانی دشمنوں کے ساتھ ہمیشہ انتہائی فیاضی، رحم، اور محبت کے ساتھ پیش آئے۔ پس مابدولت کے لئے بھی مناسب ہے کہ فردوس مکانی کے پاک نقش قدم کی اتباع کرتے ہوئے۔ اسی مقدس فیاضی، رحم، اور محبت کے سرسبز اور شاداب درخت کی ہمیشہ آبیاری کرتے رہیں۔ شیر خاں اب اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے اور معافی کا خواستگار ہے۔ غور کرو، سوچو، سمجھو، اور بتلاؤ کہ اُسکو کیا جواب دیا جائے"، شہنشاہ نے کہا۔

"جہاں پناہ! لیکن شریر، کمینہ، اور احسان فراموش افغانوں کے ساتھ رحم، انصاف کا خون، اور احسان فراموشی کی حمایت ہے۔ شیر خاں کی یہ صرف مکاری ہے۔ فردوس مکانی کے سامنے بھی اس نے اسی طرح سر اطاعت خم کردیا تھا۔ اور فردوس مکانی نے اس کو ہمیشہ کے لئے معاف کردیا تھا مگر اس احسان فراموش نے اس کا جو صلہ دیا وہ جہاں پناہ سے پوشیدہ نہیں"، ایک سردار نے کہا۔

"احسان فراموش! بالکل احسان فراموش!! ان طوطا چشم افغانوں سے وفا کی امید لاحاصل

ہے " دوسرے سردار نے جوش سے کہا۔

" بڑے نمک حرام ہیں کمبخت " تیسرے سردار نے چہرہ پر شکن ڈال کر کہا۔

اتنے میں چوبدار داخل ہوا۔ اور جھک کر مجرا بجالایا اور کہا۔

" عالیجاہا! چتور سے دو راجپوت سوار آئے ہیں۔ اور اُن کی التجا ہے کہ ابھی باریابی کا شرف بخشا جائے کیونکہ وہ شہنشاہ کے نام ایک اہم پیام لائے ہیں "

" چتور۔ . . . . . راجپوت ——— اہم پیام۔ نہ معلوم کیا بات ہے " شہنشاہ نے آہستہ آہستہ کہا۔ پھر بہ آواز بلند کہا کہ " اچھا فوراً حاضر کرو "

(۳)

" تم لوگ کون ہو ؟ کہاں سے آئے ہو ؟ - اور وہ کونسا اہم پیام ہے جس کے لئے بغیر صبح کا انتظار کئے ہوئے تم نے باریابی کی اجازت مانگی " شہنشاہ نے ہمہ تن متوجہ ہو کر پوچھا۔

" مہابلی " ایک راجپوت نے ادب سے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کہا۔ " ہم لوگ راجپوت ہیں اور چتور کے سچے سیوک . . . . . . ہم اسوقت چتور سے آرہے ہیں اور مہابلی کے نام اپنی مہارانی سریمتی کرناوتی کا ایک خط لائے ہیں "

شہنشاہ کی آنکھیں اس دوران گفتگو میں برابر اُن کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور اس کی آنکھوں سے فیاضی، رحم، اور بہادری کا سچا نور برس رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور ہاتھ کو بیتابی کے ساتھ بڑھا کر بولا۔ " وہ خط کہاں ہے ؟ "

اس کے جواب میں اُس راجپوت نے ایک دوسرے راجپوت کے ہاتھ سے جو اُس کے پاس کھڑا تھا ریشمی خریطہ جلدی سے لے کر شہنشاہ کے سامنے پیش کیا۔

شہنشاہ نے وہ خریطہ میر منشی کو دیا اور کہا " مضمون سے ما بدولت کو آگاہ کرو "

میر منشی نے خط کو خریطے سے نکالا۔ خط کے اوپر ایک جہانگیری کے قسم کی کوئی مرصع چیز لپٹی ہوئی تھی۔ یہ قیمتی جواہرات سے مرصع تھی اور اس میں سونے کی زنجیر خوبصورتی کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ میر منشی نے اس کو باحتیاط تمام کھول کر علٰحدہ رکھا اور خط کھول کر مضمون کی طرف متوجہ ہوا۔ خط کا مضمون یہ تھا :-

رام جی[1] اکلنگ جی گنیش جی

[1] رام جی، اکلنگ جی، گنیش جی، - یہ تین محافظ دیوتا تھے جن سے ہر کام میں مدد مانگی جاتی تھی۔

"مہابلی کے کنول جیسے قدموں پر بے شمار سلام عریضۂ نیاز حضور کو ایسے وقت میں لکھ رہی ہوں جبکہ میرے بدن کا ایک ایک قطرۂ خون آنیوالی ہولناک مصیبت کے تصور سے خشک ہوچکا ہے۔ وقت بڑا نازک ہے اور زیادہ تاخیر مجھے ہمیشہ کے لئے تباہی و بربادی، اور ذلت کے عمیق سمندر میں غرق کردے گی۔ میں حضور کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اور میرا پیارا چتور بہادر شاہ والی گجرات کی فوجوں سے گھرا ہوا ہے۔ چتور کے سچے سیوک اپنے سروں کو ہتھیلی پر لئے ہوئے ہیں مگر "بلچھ توپوں" کے سامنے اُن کی بہادری کارگر نہیں ہوتی اور وہ چتور کے ناموس کی قربانگاہ پر بھیڑ بکریوں کی طرح "بلچھ توپوں" کے چھروں سے بیرحمی کے ساتھ ہر روز ذبح ہورہے ہیں۔ ایسے وقت میں یہ "راکھی" آپ کی خدمت میں بھیج رہی ہوں اور امید کیسی کامل یقین ہے کہ آپ اس کو قبول کریں گے۔ کیونکہ بہادری کے قانون کے مطابق میری بھیجی ہوئی "راکھی" کو قبول کرنا اور اس کو باندھ کر میرا راکھی بند بھائی ہوجانا آپ پر فرض ہے .... میں دیکھ رہی ہوں کہ میری بھیجی ہوئی "راکھی" میرے بھائی شہنشاہ ہمایوں کی کلائی پر بندھی ہوئی ہے .... اب اس کی لاج آپ کے ہاتھ ہے .... میرے مقدس بھائی ــــ اب بلا کسی تاخیر کے جلد آئیے اور اپنی بہن کی عزت وحشیوں کے ہاتھ سے بچائیے اور اپنے شیرخوار بھانجے اودے سنگھ کی حفاظت کیجئے ...."

آپ کی بہن
کرناوتی
۲۵ر اَماوس سمبت ۱۵۸۹ [1]

ہمایوں خط کا مضمون بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ خط کا مضمون ختم ہوچکا تھا اور اب اس کو کسی غور و فکر کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اس وقت اپنے فطری جذبہ سے سرشار تھا اور فیصلہ کرچکا تھا کہ اس کو کیا کرنا چاہیئے۔

"راکھی کہاں ہے؟ - میری کلائی پر باندھ دو" شہنشاہ نے نوجوان راجپوتوں سے مخاطب ہوکر کہا ــــ پہلا نوجوان راجپوت جو اپنے ساتھی سے آگے کھڑا ہوا تھا آگے بڑھا، شہنشاہ کے قدموں کو بوسہ دیا، اور اس نے شہنشاہ کے داہنے ہاتھ کی کلائی پر راکھی باندھ دی۔ اور تب اس نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر پرنام کیا اور چند قدم ہٹ کر ادب سے کھڑا ہوگیا۔

اس وقت دونوں نوجوان راجپوتوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"شیر خاں کو جواب دے دو کہ مابدولت نے اس کا جرم معاف کیا اور وہ کل حضور میں آکر مابدولت کی

---

[1] سمبت ۱۵۸۹ مطابق ۳۳-۱۵۳۲ء

اظہار خوشنودی کی سند حاصل کرے،، شہنشاہ نے میر منشی سے کہا۔

میر منشی نے جواب میں سر کو جھکا دیا۔

"میرے بہادر دوستو! میں پرسوں صبح کو یہاں سے اپنی پوری فوج کے ساتھ چتور کی جانب کوچ کرونگا اور اپنی بہن کرناوتی کی حفاظت کا فرض ادا کروں گا۔ اس کے لئے میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اپنے بہادر سپاہیوں کی عزیز جانیں، خود اپنی جان، رنتھمبور کا قلعہ۔ غرضکہ اپنی بہن کرناوتی کی حفاظت کی ہر ممکن قیمت میں ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ تم لوگ بھی سستا لو اور مابدولت کے ہمراہ رکاب روانہ ہو،، شہنشاہ نے نوجوان راجپوتوں کو کہا۔

"مہابلی! حضور کا حکم سر آنکھوں پر ہے.... مگر مناسب ہے کہ ہم لوگ صبح ہی روانہ ہوجائیں اور جلد از جلد چتور پہونچ کر اپنی مہارانی کو حضور کی آمد آمد کی نوید جانفزا سنائیں۔ تاکہ سریمتی مہارانی کو اطمینان ہو، سپاہیوں کے دل بڑھ جائیں، اور دشمن سُنکر کانپ اٹھیں" پہلے نوجوان راجپوت نے جواب دیا۔

"تمہاری رائے انسب ہے — جاؤ — میری اجازت ہے — خداحافظ — میری بہن کو جلد میرا پیام پہونچاؤ۔ میں بھی قریب قریب تمہارے ساتھ ہی پہونچوں گا" شہنشاہ نے جواب دیا۔

(۴)

ابتدائے آفرینش سے چتور کے نام میں ایک تقدیس ہے۔ یہ راجستھان کا کعبہ ہے، بیت المقدس ہے، کاشی ہے اور سب کچھ ہے۔ اس سے سچی بہادری کا نام زندہ ہے۔ اس سے بہادران راجستھان کے سروں میں اولوالعزمی کا سودا، آنکھوں میں بیداری، اور جگر میں تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چتور کی پاک سرزمین پر جب کبھی "وحشیوں" [۵] کا حملہ ہوا تو بہادران راجستھان نے اس کی دفاع کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہادیا۔ اس کی گود میں حیرت انگیز بہادری کے ہزاروں کارنامے کھیل رہے ہیں — ایسے کارنامے جنکی مثال تاریخ کے صفحات پر مشکل سے مل سکتی ہے۔ آج بھی جبکہ والی گجرات سلطان بہادر شاہ اپنے قہار لشکر کے ساتھ منڈو کے راجہ کی معیت میں اپنے باپ مظفر شاہ کی ذلت کا انتقام لینے کے لئے چتور کی پاک سرزمین کو گھیرے ہوئے پڑا ہے تو فدائیوں کی کمی نہیں ہے۔ بوندی کا بہادر فرزند پانچ سو بہادر راجپوتوں کے ساتھ، جھالور کا راجہ سونیگر راؤ، ابو کا راجہ دیو راؤ، اور راجستھان کے بہت سے سورما مقدس چتور کی دفاع کے لئے پہنچ گئے ہیں۔

---

[۵] راجستھان کے لوگ اپنے حملہ آوروں کو اسی نام سے یاد کرتے تھے۔

مگر اس مرتبہ چتور کا حملہ آور عظیم الشان لشکر لے کر آیا تھا ــــــ ایسا عظیم الشان لشکر کہ راجستھان کی ابتدائے تاریخ سے لے کر آج تک کبھی دیکھا یا سنا گیا تھا۔ لشکر عظیم کے علاوہ عجیب عجیب غریب آلات کا مقابلہ تھا جنکے آگے بہادران راجستھان کی بہادری کارگر نہ ہوتی تھی۔ رومی خاں "بلچھ[1] توپوں" کے ذریعہ سے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ وزنی گولے برساتا تھا۔

(۵)

۱۲ جیٹھ ۱۵۸۹ سمبت (مطابق ۱۵۳۲-۳۳ء) کی بھی عجیب ہولناک صبح تھی۔ گولے یمین و یسار سے پھٹ پھٹ کر گر رہے تھے اور چتور کا قلعہ دہوئیں کی مسموم فضا سے چھپا ہوا تھا۔ چند ماہ کی متواتر گولہ باری کی وجہ سے قلعہ کی دیواریں اور فصیلیں چور ہو چکی تھیں اور اب قلعہ میں کوئی دم باقی نہ تھا۔ لیکن مایوسی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی بہادران راجستھان کے ہاتھوں سے ایک لمحہ کے لئے بھی سرفروشانہ جرأت، آہنی استقلال، اور امید کا سر رشتہ نہ چھوٹتا تھا۔ آج جنگ اور گولہ باری کا سارا زور شور درۂ بیکا پر تھا۔ یہاں بوندی کا بہادر راجکمار پانچ سو ہارا راجپوتوں کے دستہ کے ساتھ کمان کر رہا تھا اس دستہ کے اوپر رومی خاں اپنی پوری طاقت کے ساتھ گولے برسا رہا تھا اور بہادر شاہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ جس صورت سے ہو سکے اس درہ پر قبضہ کر لیا جائے کیونکہ قلعہ کی فتح اسی درہ کی فتح پر منحصر تھی۔ ...... مگر درہ کی حفاظت بوندی کا راجکمار کر رہا تھا اور "بلچھ توپوں" کی آتشباری، بیشمار لشکر، اور بہادر شاہ کی ساری دانشمندیاں بیکار ثابت ہو رہی تھیں۔ رومی خاں رات ہی سے سرنگ بچھانے میں مصروف تھا۔ اس نے درہ کے جانباز محافظوں کو توپوں کے گولوں اور گجرات کے بیشمار لشکر کے دماغ کی طرف متوجہ رکھا اور اس طرح سے سرنگ کو نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ مکمل کر لیا ــــــ کامل ایک گھنٹہ گذر چکا ہے کہ فلیتہ میں آگ لگائی جا چکی ہے ــــــ مگر درۂ بیکا کے جانباز محافظ آنے والی ہولناک مصیبت سے بے خبر دفاع کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ گولے یمین و یسار سے پھٹ پھٹ کر گر رہے ہیں۔ تلوار اور نیزے چاروں طرف سے برس رہے ہیں۔ مگر چند سو جانباز راجپوتوں کا وجود ایک مضبوط چٹان ہے ــــــ درۂ بیکا کے چٹانوں سے بھی مضبوط ــــــ بہت زیادہ مضبوط ــــــ جس سے بے شمار فوجوں، گولوں، تلواروں اور نیزوں کا سیلاب ٹکرا ٹکرا کر الٹے پاؤں واپس چلا آتا ہے ــــــ ایک دھماکا ہوا اور درۂ بیکا اڑ گیا ... اور اس کے ساتھ بوندی کا راجکمار مع اپنے چند سو بہادر راجپوتوں کے راہی جنت ہوا۔ دشمنوں کی فوج میں خوشی کا نعرہ بلند ہوا کیونکہ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ بس اب قلعہ فتح ہو گیا لیکن انھیں معلوم نہ تھا کہ یہ چتور کا قلعہ ہے دشمنوں

[1] راجپوتوں کو توپ سے بڑی نفرت تھی چنانچہ اسی بنا پر وہ اس کو "بلچھ" کہا کرتے تھے

کو بہت دیر تک خوشی نصیب نہیں ہوئی کیونکہ جب دھوئیں کا ابر چھٹا تو انھوں نے دیکھا کہ بہادران چتور کا دوسرا دستہ مقابلہ کے لئے کھڑا ہوا ہے۔ یہ راؤ درگا تھا جو چندوت کے بہادر سردار ستو اور دو دو اور دوسرے بہادران راجستھان کے ساتھ، بوندی کے راجکمار کی جگہ لینے کے لئے پہونچ گیا تھا۔ مگر چند راجپوت ایک بیشمار لشکر اور "بلھ" آلات حرب کا کب تک مقابلہ کرتے۔ ہوا وہی جو ہونا تھا سب کے سب چتوڑ کی عزت وحرمت پر فدا ہوگئے۔ مگر اب بھی دشمنوں کی مراد پوری نہ ہوئی کیونکہ رانی جواہر بائی راٹھور نے ان کی جگہ لے لی تھی۔ رانی فوجی لباس پہنے ہوئے تھی اور بہادر راجپوتوں کو للکار للکار کر دشمنوں کی صفوں کو درہم برہم کر رہی تھی مگر اس بہادر راجپوتنی کا بھی وہی حشر ہوا جو ہونا تھا۔

اب دفاع فضول تھا۔ محض جنون تھا اس لئے بہادر راجپوتوں نے آخری فیصلہ کرلیا کہ ہم سب لوگ کٹ مریں گے۔ .... مگر اودے سنگھ کو بچانا ضروری تھا۔ کیونکہ چتوڑ کے دفاعی دستہ کی سرداری وہی کرسکتا ہے جس کی رگوں میں شاہی خون دوڑتا ہو۔ اس لئے دیولا کے راجکمار باگھ جی نے فوراً بڑھ کر میواڑ کا علم اٹھالیا۔ اور اودے سنگھ کو بوندی کے راجکمار سورتاں کے سپرد کردیا گیا۔ ان ضروری انتظامات کے بعد قلعہ کا پھاٹک کھول دیا گیا۔ راجپوتانہ کے موسم گرما کا آفتاب پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ تمازت آفتاب، لوؤں کی لپیٹ، اور ناقابل برداشت گرمی کی حدت کی وجہ سے کسی انسان کا کھڑا ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ لیکن گجرات کا لشکر کثیر تھا، سامان رسد، اور ہر قسم کے سامان وافر تھے اس لئے گجراتی لشکر برابر بڑھ رہا تھا ــــــ مگر چتوڑ کے جانباز سپاہیوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ سامان رسد اور دوسرے ضروری سامان بھی ختم ہوچکے تھے۔ لیکن اس وقت وہ فتح کے لئے نہیں۔ مرنے کے لئے آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گجرات کے عظیم الشان لشکر کو دسیان میں نہیں لارہے تھے کہتے ہیں کہ گھمسان کا معرکہ ہوا۔ شام تک جنگ جاری رہی اور جانبازان چتور ایک ایک کرکے کٹ مرے۔

•

یہاں تو یہ ہو رہا تھا اور قلعہ کے اندر تیرہ ہزار عورتیں زعفرانی ساریاں پہنے، ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ لگائے، گویا کہ وہ دوسری دنیا میں اپنے شوہروں سے ملنے کے لئے جارہی ہیں، رانی کرناوتی کے ساتھ جلتی ہوئی آگ میں کود پڑیں اور اس طرح سے انھوں نے اپنی مقدس آبرو ــــــ جو گنگا کے مقدس پانی کی طرح پاک تھی۔ ـــ جو رات کے چمکیلے ستاروں سے زیادہ چمکیلی تھی ــــــ جو بہار پر آئی شبنمی صبح سے زیادہ دلفریب تھی، گجرات کے "وحشی" سپاہیوں کے ہاتھوں سے بچالی۔

(۶)

چنار گڑھ سے چتور تقریباً ۵۲۵ میل ہے۔ ہمایوں نے شیر شاہ کا اظہار اطاعت قبول کرنے کے بعد

اپنی بہن کرناوتی اور اپنے بھانجے اودے سنگھ کو بہادر شاہ والی گجرات کے حملہ سے بچانے کے لئے چتوڑ کی طرف کوچ کردیا۔ لیکن ایک عظیم الشان لشکر، سامان رسد، سامان حرب، یہ سب اسباب تھے جن کی وجہ سے تیزی کے ساتھ منزل طے نہیں کی جاسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہمایوں سارنگ پور پہونچا تو اس کو چتوڑ کی ہولناک تباہی کی اطلاع ملی۔ اس کے کلیجہ پر ایک چوٹ لگی۔ اس کا دل بے حد حساس، واقع ہوا تھا۔ بہت دیر تک غم وغصہ کے گہرے سمندر میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور فوراً بہادر شاہ کو جواب تک چتوڑ ہی میں تھا ایک خط لکھا۔ خط میں بہادر شاہ کو بہت ملامت کی گئی تھی اور اس کو خبردار کیا گیا تھا کہ جو حشر چتوڑ کا اس کے ہاتھوں ہوا ہے۔ وہی حشر گجرات کا ہونے والا ہے۔

(۷)

بہادر شاہ کا لشکر بہت بڑا تھا، سامان حرب کی بھی کمی نہیں تھی، پھر چتوڑ کی فتح نے گجراتی سپاہیوں کے حوصلے بھی بڑھا دئے تھے۔ گجراتی سرداران فوج کے حوصلے بھی بڑھے ہوئے تھے اور ان کی رائے تھی کہ فوراً حملہ کردیا جائے لیکن رومی خاں کی رائے ہوئی کہ اُردو کے چاروں طرف حصار باندھ کر جنگ کی جائے۔ بہادر شاہ، رومی خاں کی گولہ اندازی کا لوہا مانے ہوئے تھا اور اس کو صائب الرائے بھی سمجھتا تھا اس کے علاوہ اس پر کچھ ایسا رعب چھا گیا تھا کہ اس نے رومی خاں کی رائے پر ہی عمل کرنا مناسب سمجھا۔

مالوہ کے علاقہ میں منڈو کے قریب میدان جنگ قرار پایا۔ گجراتیوں نے اپنے فوجی کیمپ کے چاروں طرف خندقیں کھود دی تھیں اور بڑی بڑی توپیں لگا دی تھیں۔ اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ ہمایوں کا ایک لشکری بھی گجراتی کیمپ کے اندر گھسنے کی جرات نہیں کرسکتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ دقت یہ تھی کہ گجراتی لشکر کا ایک سپاہی بھی اپنے حصار سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ گجرات، مالوہ، اور دوسرے مقامات کے راستوں پر جہاں سے رسد پہونچ سکتی تھی، مغلوں کا قبضہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کو مشکل سے دو مہینے گذرے تھے کہ سامان رسد کی کمی سے سپاہی اور گھوڑے بھوک سے مرنے لگے۔ مجبور ہوکر بہادر شاہ ایک رات چُپ چاپ اپنے پانچ امراء کیساتھ شاہی خیمہ سے نکل کر منڈو بھاگ گیا۔ گجراتی سپاہیوں کو جب اپنے بادشاہ کی غداری کی خبر ملی تو وہ ادھر اُدھر منتشر ہوگئے اور سارا فوجی کیمپ مع مال واسباب اور آلات حرب کے ہمایوں کے لئے چھوڑ گئے۔ لیکن ہمایوں کو تو بہادر شاہ کی گرفتاری کی لو لگی ہوئی تھی۔ وہ فوراً اپنی پوری فوج کے ساتھ بہادر شاہ کے تعاقب میں منڈو کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب ہمایوں منڈو پہونچا تو رات ہوچکی تھی۔ اور اتفاق سے رات بھی اندھیری تھی اور پھر سفر کی تکان سے چور بھی تھا لیکن بہادر شاہ کو گرفتار کرنے کے لئے بے چین تھا ـــــ ایسا بے چین تھا کہ رات کی تاریکی، سفر کی تکان، غرضکہ کسی قسم کی مشکل اس کی بے چینی کی آگ کو بجھا نہیں سکتی تھی۔ اسی وقت

میجر ڈومو:۔ سمندری خارپشت۔ سیاہ اور سفید مچھلیاں کچھوے۔ گھونگے، سیپ۔

سیزر:۔ مچھلی بھی ہے؟

میجر ڈومو:۔ جی ہاں۔

سیزر:۔ برطانوی کستورا مچھلی؟

میجر ڈومو:۔ برطانوی کستورا مچھلی سیزر۔

سیزر:۔ تو پھر وہی منگاؤ (میجر ڈومو غلام کو حکم دیتا ہے اور غلام اس کی تعمیل کو چلا جاتا ہے) میں برطانیہ میں غلام رہ چکا ہوں ——— خشکی کا وہ آخری ٹکڑا جو تمام دنیا کو گھیرنے والے سمندر میں واقع ہے۔ میں وہاں قیمتی موتیوں کی تلاش میں گیا تھا۔ ہم برطانوی موتی کی حکایت سنا کرتے تھے۔ لیکن اس کی تلاش میں ہم نے برطانوی کرم صدف پایا۔

اپالو ڈورس:۔ تمام نسلیں تمکو اس کیلئے دعا دینگی۔ (میجر ڈومو سے) سمندری خارپشت میرے لئے۔

روفیو:۔ کوئی خشک چیز نہیں جس سے شروع کریں۔

کلیوپیٹرا:۔ میجر ڈومو۔ بھنے ہوئے مرغ لاؤ۔ بھنے ہوئے مرغ۔

روفیو:۔ ہاں یہ کافی ہوگا۔

کلیوپیٹرا:۔ (لالچ سے) جنگلی بطخ میرے لئے۔

میجر ڈومو:۔ سیزر اپنی مرضی کے مطابق شراب کا انتخاب خود کریں تو بہتر ہے۔

سیزر:۔ میرے لئے سادہ پانی لاؤ۔

روفیو:۔ (بیحد آزردہ خاطر ہوکر) میرے لئے سسلی کی شراب لاؤ۔

کلیوپیٹرا:۔ (منہ بناکر) سیزر تم کو دعوت دینے میں تضیع اوقات کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ ہمارے کھانے تمکو پسند نہیں آتے۔

سیزر:۔ اچھا۔ اچھا۔ مجھے لیبیا کی شراب دو۔ (میجر ڈومو سیزر کا جام بھر دیتا ہے پھر کلیوپیٹرا اور اپالوڈورس کا) لیکن جب میں روم واپس جاؤں گا۔ تو ان فضول خرچیوں کے متعلق قوانین نافذ کروں گا اور ان قوانین کی سختی سے پابندی کراؤں گا۔

کلیوپیٹرا:۔ اس کی اس وقت کوئی فکر نہ کرو۔ آج تو تم کو اور لوگوں کی طرح عیش پسند بننا ہی پڑے گا۔ (وہ اپنا ہاتھ میز پر آگے کی طرف بڑھا دیتی ہے)

سیزر:۔ اچھا صرف ایک مرتبہ میں اپنے آرام کی قربانی کروں گا ——— (اس کا ہاتھ چوم کر) اب تم کو اطمینان ہوا یا نہیں؟

کلیوپیٹرا:۔ اور اب تم اس بات کا یقین تو نہیں کرتے کہ میں تمہارے روم چلے جانے کی متمنی ہوں۔

سیزر:۔ میں کسی بات پر یقین نہیں کرتا۔ میرا دماغ سو گیا ہے۔ اس کے علاوہ کون جانتا ہے کہ میں روم واپس جاؤں گا یا نہیں؟

روفیو:۔ (خوفزدہ ہوکر) کیا؟

سیزر:۔ روم میں اب میرے لئے اور کیا نئی چیز رہ گئی ہے، وہاں کے تمام سال یکساں ہوتے ہیں اور وہ کوئی نئی بات بجز اس کے پیش نہیں کرتے کہ میں زیادہ بڈھا ہوتا جارہا ہوں۔

اپالوڈورس:۔ مصر کی حالت بھی ویسی ہی ہے۔ بڈھے

آدمی جب زندگی سے عاجز آجاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے دریائے نیل کے منبع کے سوا اور سب کچھ دیکھ لیا ہے۔

سیزر:۔ (ایک خاص تاثر کے ساتھ۔ اور وہ دریائے نیل کا منبع کیوں نہیں دیکھتے؟ کلیوپیٹرا۔ کیا تم میرے ساتھ دیکھنے چلو گی؟ کیا ہم روم کو چھوڑ دیں۔؟ روم جس نے عظمت حاصل کی ہے محض یہ جاننے کے لئے کہ عظمت چھوٹے آدمیوں کی قومیت کو کس طرح فنا کر دیتی ہے؟ کیا میں تمھارے لئے ایک نئی سلطنت کی بنا ڈالوں۔ اور اس غیر معلوم عظمت میں تمھارے لئے ایک مقدس شہر تعمیر کروں؟

کلیوپیٹرا:۔ (مسرت سے) ضرور۔ ضرور۔

روفیو:۔ اب وہ افریقہ کو بھی فتح کرے گا۔

اپالو دورس:۔ واقعی یہ بہت اچھی تحریک ہے۔ اس میں سیزر صرف ایک فاتح سپاہی ہی نہیں ہے۔ بلکہ ایک جدت آفریں شاعر اور ایک آرٹسٹ بھی ہے۔ اور ہم کو اس مقدس شہر کا نام تجویز کرنا چاہئے۔ اور اس کے نام سے لیبیا کی شراب کا جام پینا چاہئے۔

سیزر:۔ اس کا نام خود کلیوپیٹرا رکھے گی!

کلیوپیٹرا:۔ اس کا نام "سیزر کا نذرانہ اپنی محبوبہ کو" ہوگا۔

اپالو دورس:۔ نہیں نہیں۔ اس سے زیادہ وسیع کوئی ایسا نام بتاؤ جو ستاروں والے آسمان کی غیر محدود فضا پیدا کرنے والا ہو۔

سیزر:۔ (غیر دلچسپ انداز سے) صرف "وادیٔ نیل" ہی کیوں نہ ہو؟

کلیوپیٹرا:۔ نہیں نیل میرا جد ہے۔ اور وہ ایک دیوتا ہے۔ اوہ۔ میں نے کچھ اور سوچا ہے خود نیل ہی اس کا نام تجویز کرے گا۔ ہم کو اسی سے کہنا چاہئے۔ (میجرڈومو سے) اس کو بلواؤ۔ (تینوں آدمی ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ مگر میجرڈومو چلا جاتا ہے) (ایک پادری ایک چھوٹا سا مجسمہ ابوالہول کا لئے ہوئے آتا ہے۔ پادری میز کے پاس آکر مجسمے کو بیچ میں رکھ دیتا ہے تینوں آدمی اس سے متاثر نہیں ہوتے۔ تاہم وہ کسی قدر متحیر ضرور ہو جاتے ہیں۔)

سیزر:۔ یہ کیا خرافات ہے؟

کلیوپیٹرا:۔ تم کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ یہ خرافات نہیں ہے۔ اس کو جائز طریقہ سے انجام دینے اور اس کو خوش کرنے کے لئے ہمیں کسی چیز کی قربانی کرنا چاہئے۔ لیکن میرا خیال ہے اگر اُسے صرف تھوڑی سی شراب دے دی جائے تو کافی ہوگی۔

اپالو دورس:۔ (اپنا سر پلٹا کر زا کی طرف دیکھتا ہے۔) ہم اپنے باز نما سر والے دوست سے کیوں نہ پوچھیں!

کلیوپیٹرا:۔ (بے چینی سے) اُف۔ وہ تمھاری باتیں سُنکر غصہ ہو جائے گا۔

روفیو:۔ میرا خیال ہے کہ نیل کا منبع اس کے وطن سے باہر ہے۔

کلیوپیٹرا:۔ نہیں میں اپنے چھوٹے ابوالہول کے سوا اور کسی کو اس کا نام نہ رکھنے دوں گی۔ کیونکہ جب سیزر آکر مجھ سے ملا تو میں اسی جگہ پہ تھی۔ (وہ سیزر کو

دیکھ کر پادری کی طرف پلٹتی ہے) جاؤ میں خود پادری ہوں - اور تمھاری خدمت میں خود انجام دونگی -

(پادری سرِ تعظیم خم کر کے چلا جاتا ہے -)

اب ہم سب کو مل کر نیل سے درخواست کرنی چاہئے شاید وہ میز پر کھٹکھٹائے گا -

سیزر: - کیا - میز کی کھٹ کھٹ؟ کیا اس جمہوریت کی آٹھویں صدی میں بھی واہمہ پرستی جاری ہے؟

کلیوپیٹرا: - واہمہ پرستی نہیں ہے - ہمارے پادری میزوں سے سیکڑوں باتیں دریافت کرتے ہیں - اپالوڈورس کیا یہ سچ نہیں ہے؟

اپالوڈورس: - ہاں - ہاں - میں خود اس کا معتقد ہوں جب کلیوپیٹرا پادری ہے تو اپالوڈورس اسکا شاگرد ہے حلف اٹھانے کی تحریک کرو -

کلیوپیٹرا: - تم کو میرے ساتھ کہنا چاہئے - "باپ نیل - اپنی آواز ہم کو سناؤ -"

چاروں مل کر: - (مجسمہ کے سامنے اپنے اپنے گلاس اٹھا کر) باپ نیل اپنی آواز ہم کو سناؤ - (ایک انسان کی نہائی درد و کرب میں نکلی ہوئی آواز جواب دیتی ہے - سب خوفزدہ ہو کر اپنے اپنے جام رکھ دیتے ہیں - اور سننے لگتے ہیں - سیزر کلیوپیٹرا پر نظر ڈالتا ہے - اور اُسے دیوتا کے سامنے اپنی شراب انتہائی تشکر آمیز نگاہوں سے انڈیلتا ہوا پاتا ہے اپالوڈورس اُچھلتا ہوا چھت کے کنارے آواز سننے کو جاتا ہے)

سیزر: - (کلیوپیٹرا کو گھور کر) یہ کیا تھا؟

کلیوپیٹرا: - کچھ نہیں - شاید کسی غلام کو مار رہے ہیں

روفیو: - میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کے اندر ایک شخص چاقو لئے ہوئے موجود ہے -

سیزر: - (اٹھتے ہوئے) خون!

اپالوڈورس: - (پیچھے اپنا ہاتھ خاموش رہنے کو ہلاتا ہے -) اوہ - خاموش - کیا تم لوگوں نے سنا؟

سیزر: - دوسری آواز؟

اپالوڈورس: - (میز کے پاس واپس آکر) نہیں میں خیال کرتا ہوں کہ ساحل پر کوئی چیز گری ہے -

سیزر: - (بہت خوفزدہ ہو کر) میز سے ہٹ کر ستون کے قریب آتا ہے روفیو اس کی بائیں جانب ہٹتا ہے اور اپالو دوسری جانب)

کلیوپیٹرا: - (اب بھی اپنی پہلی جگہ میز پر بیٹھے ہوئے) سیزر کیا تم مجھے چھوڑ دوگے؟ اپالوڈورس کیا تم جاتے ہو؟

سیزر: - اپالوڈورس صحن میں جا کر دیکھو کیا ہوا؟

(اپالوڈورس سر کو جنبش دے کر چلا جاتا ہے جس سیڑھی سے روفیو ادھر چڑھا تھا)

کلیوپیٹرا: - تمھارے سپاہیوں نے کسی کو مار ڈالا - خیر تو اس میں کیا حرج ہے؟

(ساحل کی طرف سے ایک شور سنائی دیتا ہے -)

(سیزر اپالوڈورس کے ساتھ جانا چاہتا ہے کہ روفیو ایک ہاتھ سے اس کا کندھا پکڑ کر روک لیتا ہے - اس اثناء میں فتاتا چھت کے آخری کنارے سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی آتی ہے - اسکی آنکھوں میں ایک مضمحل آسودگی جھلکتی ہے سیزر سمجھتا ہے کہ شاید وہ شراب زیادہ پی گئی ہے)

روفیو: - (آہستہ سے) ان دونوں نے کوئی سازش کی ہے -

فتاتا:۔ ملکہ پھر اپنے غلام کے چہرہ کو دیکھ رہی ہے۔

(کلیوپیٹرا ایک لمحہ کے لئے تعریف کن انداز اس کے قتل کے ارادے کے اظہار کو محسوس کرتی ہے پھر وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں حائل کر لیتی ہے اسے دیوانہ وار پیار کرتی ہے اور تمام زیور توڑ کر اس کے سر پر لاد دیتی ہے ——— دونوں آدمی اس منظر کی طرف سے پلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں۔ فتاتا آہستہ آہستہ قربانگاہ کے پاس پہنچتی ہے۔ را کے سامنے جھک جاتی ہے اور اسی حالت میں عبادت کرتی ہے سیزر روفیو کو ستون کے پاس چھوڑ کر کلیوپیٹرا کے پاس جاتا ہے)

سیزر:۔ (پرجستجو انداز سے) کلیوپیٹرا کیا ہوا ؟

کلیوپیٹرا:۔ (مبہوت ہوکر) عزیز سیزر کچھ نہیں (وہ اس کے پاس محبت آمیز انداز سے جاتی ہے) پیارے، سیزر کیا تم مجھ سے ناراض ہو ؟ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو ؟ میں نے تمام وقت تمہارے ساتھ گذارا ہے۔ مجھے کیا معلوم کیا ہوا۔ ؟

سیزر:۔ (موثر انداز سے) یہ سچ ہے۔

کلیوپیٹرا:۔ (بعد اطمینان سے اس سے محبت کا اظہار کرتی ہے) درحقیقت یہ سچ ہے۔ (وہ اس کے اظہار محبت کا جواب نہیں دیتا) روفیو تم بھی جانتے ہو کہ یہ سچ ہے۔

(شور یکایک بلند ہو کر غائب ہو جاتا ہے)

روفیو:۔ مجھے اب معلوم ہو جائیگا۔ (وہ بڑے لمبے ڈگ بڑھا کر قربان گاہ کی طرف جاتا ہے اور فتاتا کے شانے پر ہاتھ رکھدیتا ہے۔) خاتون محترم مجھے آپ کی ضرورت ہے۔

فتاتا:۔ (اٹھتے ہوئے) میری جگہ ملکہ کے پاس ہے۔

کلیوپیٹرا:۔ اس نے کوئی نقصان نہیں پہونچایا روفیو۔

سیزر:۔ (روفیو سے) اس کو ٹھہرنے دو۔

روفیو:۔ (قربانگاہ پر بیٹھکر) بہت خوب تو میری جگہ بھی یہیں ہے۔ اور اب تم لوگ خود دیکھ سکتے ہو کہ کیا واقعہ ہے ؟ معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں ایک طوفان بے تمیزی برپا ہے۔

سیزر:۔ (متین اضطراب سے) روفیو۔ اطاعت کے لئے ایک وقت ہوتا ہے۔

روفیو:۔ اور استقلال کا بھی ایک موقع ہوتا ہے

(وہ اپنے دونوں ہاتھ باندھ لیتا ہے۔)

سیزر:۔ (کلیوپیٹرا سے) اس کو باہر جانے کا حکم دو۔

کلیوپیٹرا:۔ ہاں میں حکم دوں گی۔ سیزر میں ہمیشہ تمہارے حکم کی تعمیل کروں گی۔ کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے فتاتا باہر چلی جاؤ۔

فتاتا:۔ ملکہ کا حکم میری مرضی ہے۔ میں ملکہ کے بلانے کے لئے قریب ہی ٹھہرتی ہوں (وہ را کے پاس سے گذر کر جاتی ہے)

روفیو:۔ (ساتھ ساتھ) سیزر یہ یاد رکھو کہ تمہاری جان کا محافظ بھی قریب ٹھہرا ہوا ہے۔

(وہ اس کے ساتھ چلا جاتا ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (سیزر کی اس اطاعت کا احساس کرتے ہوئے جو وہ روفیو کی کرتا ہے اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور ستونوں کے درمیان بنچ پر بیٹھ جاتی ہے)

کلیوپیٹرا:۔ تم روفیو کو کیوں اجازت دیتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ اس طرح پیش آئے۔ تم کو

اُسے بتانا چاہیے کہ اسکا کیا مرتبہ ہے ؟

سیزر: - اس کو میرا دشمن بننا سکھاؤ - تاکہ وہ اپنے خیالات مجھ سے چھپائے جیسا کہ تم اس وقت چھپا رہی ہو -

کلیوپیٹرا: - (اس کا خوف پھر عود کر آتا ہے) سیزر تم یہ کیوں کہتے ہو - درحقیقت میں تم سے کچھ نہیں چھپا رہی ہوں - تم میرے ساتھ اس طرح پیش آنے میں غلطی پر ہو - (وہ رونے لگتی ہے) میں صرف ایک بچہ ہوں - اور تمھارا دل پتھر کا ہوا جاتا ہے محض اس خیال سے کہ کوئی شخص مار ڈالا گیا ہے - میں اس کو برداشت نہیں کرسکتی - (وہ ارادتاً رونے لگتی ہے - وہ اس کو انتہائی غمگین اور بے پروا انداز سے دیکھتا ہے وہ پھر ادھر دیکھتی ہے اور یہ معلوم کر کے کہ اسے ترس نہیں آیا - یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ اپنے جذبات سے کشمکش کر کے ان پر قابو پانا چاہتی ہے اٹھ بیٹھتی ہے) ہاں مجھے معلوم ہے کہ تم آنسوؤں سے نفرت کرتے ہو - اب تم کو ان سے صدمہ نہ پہونچے گا - میں جانتی ہوں کہ تم غصہ میں ہو - صرف رنجیدہ ہو، میں اس قدر بے وقوف ہوں کہ جب تم مجھ سے سرد مہری سے گفتگو کرتے ہو تو میں اس سے پریشان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی - دراصل تم سچائی پر ہو - یہ خیال کرنا کہ کوئی مارا گیا یا کسی کو صدمہ پہونچا - بہت خوفناک اور تکلیف دہ ہے - اور میرا خیال ہے کہ حقیقت میں کوئی خطرناک ——— (اس کی آواز نفرت کا لہجہ اختیار کر کے حلق میں رک جاتی ہے)

سیزر: - تم کو کس نے خوفزدہ کر دیا ؟ تم نے کیا کیا ہے ؟ (ساحل پر ایک بگل کی آواز آتی ہے) اہا یہ آواز جواب کی طرح معلوم ہوتی ہے -

کلیوپیٹرا: - (تھرتھراتی ہوئی پیچ پر گر پڑتی ہے اور ہاتھ سے منہ چھپا لیتی ہے) میں نے تم کو دھوکہ نہیں دیا - سیزر میں قسم کھا کر کہتی ہوں -

سیزر: - مجھے معلوم ہے - میں نے تم پر اعتماد نہیں کیا (وہ اس کی طرف سے پلٹ کر جانے کا ارادہ [illegible] اور بری ٹینس سیٹمیس کو گھسیٹتے ہوئے لاتے ہیں روفیو [illegible] آتا ہے سیزر کانپ اٹھتا ہے) پھر پمپی کا قاتل !

روفیو: - میرا خیال ہے کہ سارا شہر پاگل ہو گیا ہے وہ محل کو مسمار کرنے اور ہم کو بھگا دینے پر تلا ہوا ہے میں نے مجمع کو صحن سے باہر کرتے وقت اس کو پکڑا ہے -

سیزر: - اس کو چھوڑ دو (وہ اس کے بازو چھوڑ دیتے ہیں) سیٹمیں شہریوں کو کس بات پر غصہ ہے ؟

لوسیس: - تم نے کیا سوچا ہے سیزر ؟ پوتھینس انکا بے حد عزیز رہنما تھا -

سیزر: - پوتھینس کو کیا ہوا ؟ میں نے اسے ابھی رہا کر دیا - ادھا گھنٹہ بھی نہ گذرا ہوگا - کیا انھوں نے اسے باہر نہیں جانے دیا ؟

لوسیس: - ہاں زمین سے ساٹھ فیٹ بلند گیلری کی کمان میں وہ مردہ ٹھہرا ہے اور اس کی پسلیوں میں ایک چاقو تین فیٹ لمبا پیوست ہے - وہ بھیڑ کی طرح مردہ ہے -

سیزر: - (بے حد خوفزدہ ہو کر) قتل کر ڈالا گیا - ہمارا قیدی - ہمارا مہمان (وہ برہم انداز سے روفیو کی طرف دیکھتا ہے) روفیو ———

روفیو:- (سوال پر غور کرتے ہوئے موثر انداز سے) جس نے ایسا کیا وہ ایک عقلمند اور تمھارا دوست تھا۔ (کلیوپیٹرا بے حد نڈر ہو جاتی ہے) لیکن ہم میں سے کسی نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ اس لئے مجھ پر غصہ ہونا بیکار ہے (سیزر پلٹ کر کلیوپیٹرا کو دیکھتا ہے)

کلیوپیٹرا:- (اٹھ کر تحکمانہ انداز سے) وہ ملکۂ مصر کے حکم سے مارا گیا۔ میں سیزر کی طرح خواب دیکھنے والی نہیں ہوں۔ جو ہر غلام کو اپنی توہین کرنے کی اجازت دوں۔ روفیو نے ابھی بیان کیا کہ میں نے اچھا کام کیا۔ اب دوسرے حاضرین بھی اس کا فیصلہ کریں گے۔ (وہ دوسروں کی طرف پلٹتی ہے) اس پوتھینس نے مجھ سے اس امر کی خواہش کی کہ میں اس کے ساتھ سازش کر کے سیزر کو ٹالمی اور اچیلس کے حوالے کر دوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے کوسا اور پھر سیزر کے پاس آیا کہ تنہائی میں اس کو سمجھا کر اپنی اس مکاری کو میرے سر تھوپے میں نے اس کو اس دغابازی کو عملی جامہ پہناتے وقت پکڑ لیا۔ اس نے میری توہین کی یعنی ملکۂ مصر کی۔ میرے منہ پر۔ سیزر مجھ سے انتقام نہ لے گا۔ اس نے اس سے گفتگو کی اور پھر اس کو رہا کر دیا۔ کیا میں خود اپنا انتقام لینے میں حق بجانب نہ تھی؟ بولو۔ لوسیس!

لوسیس:- میں اس کو غلط نہیں کہہ سکتا۔ لیکن سیزر اس کے معاوضہ میں تمھارا شکریہ ادا نہ کرے گا۔

کلیوپیٹرا:- بولو۔ اپالوڈورس۔ کیا میں غلطی پر تھی؟

اپالوڈورس:- میں صرف ایک ہی لفظ الزام کا پاتا ہوں اور بے حد خوبصورت۔ تم نے مجھے اپنا ایک سردار کہہ کر مخاطب کیا ہوتا۔ اور میں کشتی میں اس غیبت کرنے والے کو قتل کر ڈالتا۔

کلیوپیٹرا:- (مطمئن انداز سے) اب میں تمھارے غلام سے بھی پوچھنا چاہتی ہوں۔ سیزر! بری ٹینس بول کیا میں غلطی پر تھی؟

بری ٹینس:- اگر مکاری، جھوٹ اور بیوفائی کی کوئی سزا نہ دی جاتی تو سوسائٹی جنگلی درندوں کی ایک تماشہ گاہ بن جاتی۔ جہاں وہ ایک دوسرے کو پھاڑ کھاتے۔ سیزر غلطی پر ہے۔

سیزر:- (اضطراب آفریں خاموشی سے) تو معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ میرے خلاف ہے۔

کلیوپیٹرا:- (بہت نڈر ہو کر) سنو سیزر! اگر اسکندریہ میں ایک بھی ایسا آدمی مل جائے جو یہ کہے کہ میں غلطی پر ہوں تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ محل کے پھاٹک پر اپنے غلاموں کے ہاتھوں سے سولی پر لٹک جاؤنگی۔

سیزر:- اگر ساری دنیا میں ایک آدمی، ابھی یا کبھی یہ جاننے کے لئے مل سکے کہ تم نے غلطی کی تو اس آدمی کو یا تو میری طرح ساری دنیا کو فتح کرنا پڑیگا یا اس کے ذریعہ سولی پر چڑھ جائے گا۔ (سڑکوں کا شور پھر سنائی دیتا ہے) تم سنتی ہو۔ یہ دروازے پر کھٹکھٹانے والے بھی انتقام اور قتل پر یقین کرتے ہیں۔ تم نے ان کے رہنما کو قتل کر ڈالا تو یہ بھی جائز معلوم ہوتا ہے کہ وہ تم کو قتل کریں ـــــ اگر تم کو اس میں شک ہو تو اپنے چار دن مشیروں سے دریافت کرلو

اور اس سچائی کے نام پر۔ (انتہائی نفرت سے زور دیتا ہے) کیا میں ان سب کو اپنی ملکہ کے قتل کرنے پر قتل نہ کروں گا۔ اور اس کے عوض یہاں کے باشندے مجھے اس لئے قتل کر ڈالیں گے کہ میں نے ان کے وطن کو لوٹا اس پر حملہ کیا۔ اور کیا روم ان قاتلوں کو قتل کئے بغیر چین سے بیٹھے گا؟ محض دنیا پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ روم کس طرح اپنی عزت اور فرزندوں کا انتقام لیتا ہے۔ اور اسی لئے تاریخ کی انتہا پر۔ قتل کی نسل، عزت، سچائی اور امن کے نام سے بڑھتی رہے گی۔ یہاں تک کہ دیوتا ان خون آشامیوں سے بیزار ہو جائیں اور ایک ایسی قوم پیدا کریں۔ جو سمجھ سکتی ہے۔

(خوفناک شور۔ کلیوپیٹرا خوف سے زرد پڑ جاتی ہے) وہ لوگ سنیں جن کی توہین نہ ہونی چاہئے۔ ان کے پاس جاؤ۔ تاکہ الفاظ سمجھ میں آسکیں۔ تم ان کو پوتھینس کے الفاظ سے زیادہ دلخراش اور روح فرسا پاؤ گے۔ (آہستہ آہستہ ایک وقار کے ساتھ اٹھتے ہوئے) اب ملکۂ مصر کو انتقام کا حکم سنانے دو۔ اور اپنی محافظت کی طیاری شروع کرنے دو۔ کیونکہ اس نے سیزر کو قبول نہیں کیا۔

(وہ جانے کو پلٹتا ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (خوفزدہ ہو کر اس کے پاس دوڑ کر گھٹنوں پر گرتے ہوئے) سیزر مجھے برباد نہ کرو۔ اور اس محل کو بچاؤ۔

سیزر:۔ تم نے حیات و موت کی طاقتیں خود لے لی ہیں۔ میں صرف ایک خواب دیکھنے والا ہوں۔

کلیوپیٹرا:۔ لیکن وہ مجھے مار ڈالیں گے۔

سیزر:۔ اور کیوں نہ ماریں؟

کلیوپیٹرا:۔ رحم ——

سیزر:۔ رحم۔ کیا یہ اس قدر جلد اس حالت پر پہونچ گیا ہے کہ تم کو سوائے رحم کے اور کچھ نہیں بچا سکتا۔ کیا اس نے پوتھینس کو بچایا؟

(وہ اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے اٹھتی ہے اور پھر نہایت مایوسانہ انداز سے بنچ پر جا بیٹھتی ہے۔ اپالوڈورس اپنی ہمدردی کا اظہار کرنے کے لئے اس کی بنچ کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اب آسمان کا رنگ بدلتا ہے اور وہ بہت جلد نارنجی ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ستون اور مجسمے دھندلے نظر آنے لگتے ہیں)

روفیو:۔ وعظ کافی ہو چکا۔ دشمن پھاٹک پر آگیا ہے۔

سیزر:۔ (اس کی طرف پلٹ کر غصہ سے) ہاں۔ اور اتنے مہینوں تک اس کو کس بات نے دروازہ پر روک رکھا تھا یہ میری بیوقوفی تھی، جیسا تم کہتے ہو۔ یا تمھاری دانائی؟ اس مصری خون کے سمندر میں کس کے ہاتھوں نے تم لوگوں کے سروں کو موجوں سے اوپر رکھا؟ (کلیوپیٹرا سے) اور پھر بھی یہ حالت ہے کہ سیزر ایک شخص کو حکم دیتا ہے۔ "دوست تم آزاد ہو اور آزادانہ جا سکتے ہو" اور تم، جواب میری تلوار پکڑ کر اپنی ننھی سی جان کی حفاظت کے لئے کہہ رہی ہو یہ جرأت کرو۔ کہ چھپ کر نکل جاؤ۔ اور اس کی پیٹھ پر

جا قوسے حملہ کرو۔ ؟ اور تم او سپاہیو، شریفو اور
ایماندار ملازمو۔ اس قتل کی تعریف کرتے ہو اور
اس کی داد دیتے ہو اور کہتے ہو کہ "سیزر غلطی
پر ہے۔" دیوتاؤں کی خواہش ہے کہ میں اپنا
ہاتھ کھول دوں اور تم سب کو طوفان میں ڈوب
جانے دوں۔

کلیوپیٹرا:۔ (ایک مکارانہ ترنم کیساتھ) لیکن سیزر اگر تم ایسا کروگے
تو اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارو گے۔

(سیزر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں)

روفیو:۔ (بعد مبہوت ہوکر) جیوپیٹر کی قسم یہی وہ الفاظ ہیں جو سیزر
کو مجبور کرینگا کہ وہ یہاں سے نکلکر شہر میں چلا جائے اور ہم
لوگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردئے جانے کے لئے یہاں چھوڑدے
(سیزر سے) کیا تم انکو محض اسلئے چھوڑ دوگے کہ ہم بیوقوف
ہیں میں قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ میں فطرتاً
اسکو اسی خوبی سے انجام دیتا ہوں جیسے ایک کتا
بلی کو مارتا ہے۔ ہم سب تمھاری پاپوش کے پاس
پڑے رہنے والے کتے ہیں۔ لیکن ہم ہمیشہ سے آپ
کے وفادار رہے ہیں۔

سیزر:۔ افسوس۔ روفیو۔ میرے لڑکے، میرے لڑکے ہم
سب کتوں کی طرح سڑک پر مرنے والے ہیں۔

اپالوڈورس:۔ (اپنی جگہ سے) سیزر تم جو کچھ کہتے ہو اس کو صحیح
ہونا چاہئے۔ تاہم میں کلیوپیٹرا ہی کا طرفدار ہوں۔ اگر
ہمکو مرنا ہی ہے تو اسے کسی آدمی کی محبت یا کسی آدمی
کے بازؤں کی طاقت کی ضرورت نہ ہوگی۔

کلیوپیٹرا:۔ (روکر) لیکن میں مرنا نہیں چاہتی۔

سیزر:۔ (رنجیدگی سے) اوہ کم ظرف۔ کم ظرف۔

لوسیس:۔ (کلیوپیٹرا اور سیزر کے بیچ میں آکر) سنو سیزر۔
تم حقیر اور ذلیل کہہ سکتے ہو۔ لیکن اس سے میرا مفہوم یہ
بھی ہے کہ جسقدر زیادہ ممکن ہو میں زندہ رہوں۔

سیزر:۔ اچھا۔ میرے دوست تو معلوم ہوتا ہے تم سیزر سے
زیادہ زندہ رہوگے۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ میں نے کوئی
جادو کیا ہے جس نے تمھاری فوج اور سارے شہر کو
اتنے دنوں تک خلیج ہی پر روک رکھا۔ کل ان کو مجھ سے
کیا عداوت تھی کہ وہ میرے خلاف کھڑے ہوکر اپنی جان
خطرہ میں ڈالدیتے۔ لیکن آج ہم نے ان کے رہنما کو
مارکر ان کے سامنے ڈال دیا۔ اور اب ہر شخص اس
خون کے دشمن کو صاف کرنے پر آمادہ ہے۔ کیونکہ ہم
ایسے ہی ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ تو اب ہمت
سے کام لو۔ اور اپنی تلواروں پر باڑھ رکھو یہی
کا سر جدا ہوچکا ہے، اور سیزر کا سر بھی عمر طبعی کو پہنچ
گیا ہے۔ ؟

سیزر:۔ (تمکنت کے انداز سے) وہ جس نے کبھی کوئی توقع
نہیں کی، کبھی ناامید نہیں ہوسکتا۔ سیزر، عیش اور
غم کے وقت صرف اپنی قسمت کی تحریر ہی پر نظر رکھتا ہے

لوسیس:۔ قسمت پر نظر رکھتا ہے۔ اور وہ سیزر پر اسی
طرح مسکرائیگی جیسی ہمیشہ مسکراتی رہی ہے۔

سیزر:۔ (غیرارادی سختی سے) کیا تم میری ہمت افزائی کا ارادہ کرتے ہو

لوسیس:۔ میں آپکے سامنے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔
میری ضرورت ہو تو میں اپنی جگہ بدل سکتا ہوں۔

(سیزر یکایک زمین پر آکر، اس کو غور سے دیکھتا ہے اور یہ نتیجہ نکالتے

ہوئے کہ اس پیتل کے برتن کے پردہ میں کوئی راز ہے) کیا اس جگہ ؟

لوسیس :- ہاں اسی جگہ !

روفیو :- کیا تمہارا خیال ہے کہ سیزر اس قدر پاگل ہے کہ وہ تم پر اعتماد کرے گا۔

لوسیس :- میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ پر اسوقت تک بھروسہ نہ کرے جبتک فتحمند نہ ہو جائے۔ میں صرف اپنی زندگی کے لئے درخواست کرتا ہوں اور سیزر کی فوج کی کمان کرنے کی۔ اور چونکہ سیزر بہت صاف سودا کرتا ہے اس لئے میں بیعانہ بھی ادا کر دوں گا۔

سیزر :- بیعانہ ادا کرے گا۔ کیسے ؟

لوسیس :- ایک خوشخبری سے۔

روفیو :- کیا خوشخبری ؟

سیزر :- کیا خبر۔ کیا خبر۔ کیا میرے لڑکے روفیو تم نے کہا ! کمک آگئی ہے۔ اور کیا خبریں ہم سے متعلق ہیں۔ کیا لوسیس ایسا نہیں ہے۔ میتھری ڈیٹس آرہا ہے۔

لوسیس :- اس نے پلوسیم پر قبضہ کر لیا ہے

سیزر :- (مسرت سے) لوسیس سپٹیمس اس وقت سے تم میرے ایک سردار ہو۔ روفیو۔ مصریوں نے اپنے ہر ایک سپاہی کو میتھری ڈیٹس کو روکنے کے لئے نیل پر بھیجا ہوگا۔ اب سڑکوں پر آدمیوں کے ہجوم کے سوا اور کچھ نہیں ہے

لوسیس :- بالکل درست ہی میتھری ڈیٹس بڑی سڑک سے ممفیس کیطرف جا رہا ہے تاکہ دہانے کے ادھر سے دریا پار کرے۔ اچیلس وہاں اس سے مقابلہ کرے گا۔

سیزر :- اچیلس سیزر سے وہاں لڑیگا۔ دیکھو روفیو۔

(وہ میز کیطرف دوڑ کر میز پوش اٹھا لیتا ہے اور انگلی شراب میں ڈبو کر اسپر ایک نقشہ بناتا ہے لوسیس اور روفیو اس کے پاس آکر دیکھنے لگتے ہیں۔ تقریباً روشنی غائب ہو جاتی ہے) یہاں محل ہے (نقشہ پر انگلی سے دکھا کر) یہاں میدان ہے۔ تم (روفیو) بیس آدمی لو اور اس سڑک (نقشہ پر دکھا کر) سے جانیکا بہانہ کرو۔ اور جب وہ تم پر سنگباری کریں۔ تو اسطرف سے فوج کے پاس چلے جاؤ۔ میرے راستے ٹھیک ہیں۔ کیا ٹھیک ہیں لوسیس ؟

لوسیس :- ہاں یہ انجیر کا بازار ہے۔

سیزر :- (اسکو سننے کے لئے بہت گھبراہٹ سے) ہاں ہم نے ان کو یہاں پہونچ کر دیکھا تھا۔ اچھا (وہ کپڑا میز پر پھینک دیتا ہے اور پھر ستونوں میں آتا ہے) جاؤ بری ٹینس ٹیرڈنس سے کہو کہ نصف ساعت میں مغربی جھیلوں کے لئے ہماری فوجیں جہاز پر قبضہ کر لیں۔ میرے گھوڑے اور زرہ بکتر لاؤ (بری ٹینس جاتا ہے) باقی کے ساتھ میں جھیل کیطرف روانہ ہو جاؤں گا۔ اور میتھری ڈیٹس سے ملنے کیلئے نیل تک پہونچ جاؤں گا۔ جاؤ لیوسیس یہ پیغام پہنچا دو۔ (لیوسیس بری ٹینس کے بعد خود بھی تیزی سے چلا جاتا ہے) ایالوڈورس لاؤ اپنی تلوار مجھے دو اور اس مہم میں میرا دایاں بازو بنکر مجھے مدد دو۔

ایالوڈورس :- بسر و چشم۔

سیزر :- (اس کا ہاتھ پکڑ کر) کیا تم کام کرنیکو تیار ہو ؟

ایالوڈورس :- ہاں فن کے لئے تیار ہوں۔ فن سپہ گری کے لئے (وہ لیوسیس کے پیچھے خود بھی تیزی سے جاتا ہے اور کلیوپیٹرا کو یک لخت بھول جاتا ہے)

روفیو:- آؤ - یہ ایک قسم کا شغل ہے۔

سیزر:- (مسرت سے) کیا یہ نہیں ہے میرے لڑکے؟

(وہ تالی بجاتا ہے - غلام میز کیطرف آتے ہیں) اب ان فضولیات کی ضرورت نہیں - جاؤ یہ تمام چیزیں لیکر یہاں سے چلے جاؤ - میری نظروں سے ان کو جلد دور کرو۔

(غلام میز کو ہٹانے لگتے ہیں اور پردے سے تونوں کو ڈھلکتے ہوئے کھینچ لئے جاتے ہیں) روفیو - تم سڑکوں کے متعلق اچھی طرح سب جانتے ہو؟

روفیو:- جی ہاں - مجھے یقین ہے کہ میں بخوبی واقف ہوں میں ان سڑکوں پر ہر وقت جا سکتا ہوں -

(بگل کی آواز نیچے صحن سے آتی ہے)

سیزر:- تو آؤ - اب ہمکو فوج سے گفتگو کرکے انکا دل بڑھانا چاہئے - تم ساحل پر جاؤ میں صحن کیطرف جاتا ہوں - (وہ سیڑھی کی طرف جاتا ہے)

کلیوپیٹرا:- (اپنی جگہ سے اٹھکر جہاں وہ ابتک بالکل خاموش پڑی تھی اور کسی نے اس کی پروا نہ کی تھی سیزر کی طرف ڈرتے ڈرتے اپنے ہاتھ دراز کرتے ہوئے) سیزر

سیزر:- (پلٹ کر) ایہہ۔

کلیوپیٹرا:- کیا تم مجھے بھول گئے ہو؟

سیزر:- میں اس وقت مشغول ہوں - جب میں واپس آؤں گا تو تمہارے معاملات کا تصفیہ کیا جائیگا - خدا حافظ - اب صبر اور استقلال سے کام لو -

(وہ بالکل بے اعتنائی اور انہماک کے انداز سے جاتا ہے وہ مٹھیاں بند کرکے اٹھتی ہے - اور اس کے چہرہ پر انتہائی غیظ و غضب کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں -)

روفیو:- کھیل کھیلا جاتا ہے اور ہارا جاتا ہے کلیوپیٹرا اور عورت کو ہمیشہ بدترین حصہ ملتا ہے -

کلیوپیٹرا:- (غصہ سے) جاؤ - اپنے آقا کے ساتھ جاؤ -

روفیو:- (اسکے کان میں دوستانہ) پہلے ایک بات سنو - اپنے قاتل سے کہو کہ اگر پوتھنیس مناسب طریقہ سے مارا جاتا یعنی گردن کے ذریعہ سے ——— تو وہ اسقدر ہنگامہ نہ مچاتا - تمہارے آدمی نے اس کے کام کو تقویت دی -

کلیوپیٹرا:- تمکو کیسے معلوم ہوا کہ وہ ایک آدمی تھا؟

روفیو:- (متحیر و پریشان ہوکر) تم نہیں تھیں - جب یہ واقعہ ظہور میں آیا تو تم ہمارے پاس تھیں (وہ انداز نفرت سے اسکی طرف سے اپنی پیٹھ پلٹا لیتی ہے - وہ اپنا سر ہلاتا ہوا اور باہر جانے کیلئے پردہ کھینچ لیتا ہے اب یہ خوشگوار چاندنی کا وقت ہے، میز ہٹا دیگئی ہے - فتاتا تاروں اور چاند کی روشنی میں پھر رع کی قربانگاہ پر مصروف عبادت نظر آتی ہے روفیو چونک پڑتا ہے پھر پردہ دوبارہ آہستہ سے بند کر دیتا ہے - اور آہستہ سے کلیوپیٹرا کو مخاطب کرتا ہے) کیا وہ یہ تھی؟ اپنے ہاتھ سے؟

کلیوپیٹرا:- (دھمکاکر) جو بھی ہو - میرے دشمنوں کو چاہئے کہ اس کی طرف سے خبردار رہیں -

روفیو:- (دانت پیسکر اس کو دیکھتے ہوئے) کلیوپیٹرا میں اسکو دیکھوں گا - (وہ وعدہ کے استحکام کی خاطر اپنا سر ہلاتا ہے اور اپنی تلوار میان میں رکھتا ہوا پردہ سے باہر نکل جاتا ہے)

رومی سپاہی:- (نیچے صحن میں) سیزر زندہ باد - سیزر زندہ باد - (کلیوپیٹرا سنتی ہے پھر بڑا بگل بجتا ہے اور اس کے ساتھ اور بگلوں کی آوازیں آتی ہیں)

کلیو پیٹرا:- (اپنے ہاتھ مل کر پکارتے ہوئے) فتاتا - فتاتا - اندھیرا ہو گیا ہے اور میں تنہا ہوں میرے پاس آؤ (سکوت)

فتاتا (زور سے) فتاتا (سکوت) بے چین ہو کر وہ پردوں کی رسی کھینچ لیتی ہے اور پردے علیحدہ ہو جاتے ہیں فتاتا، مردہ، سرتن سے جدا، رّا کی قربان گاہ پر پڑی ہوئی ہے - خون سفید پتھر پر بہہ رہا ہے -

ایکٹ پنجم

تہوار کا دن -

ٹھیک دوپہر - محل کے سامنے فوج آراستہ کھڑی ہوئی ہے مشرقی ساحل پر سیزر کی فوجیں زرق برق لباس میں نظر آ رہی ہیں اور اس پل کے قریب کھڑی ہیں جہاں سے اپالوڈورس قالین لیکر اترا تھا - ایک رومی محافظ گذرگاہ پر نگرانی کے لئے یہاں متعین ہے - جہاں سے ایک فرش سرک پر بچھا دیا گیا ہے جو محل کے سامنے مرکزی پھاٹک پر شمال کی جانب مڑ جاتا ہے - پھاٹک کی کشادہ سیڑھیاں کلیو پیٹرا کی سہیلیوں سے معمور ہیں جو نہایت چمکدار اور ریشمی اور رنگین لباس میں ملبوس ہیں - اور پھولوں کی ایک باغ معلوم ہوتی ہیں - سامنے کے حصے میں اسکے امرا صف باندھے کھڑے ہیں - شمالی حصے میں رومی سپاہ استادہ ہے ان میں بلزنار، عجمی اور رسالدار، نہایت اچھے لباس پہنے ہوئے موجود ہیں - (اپالوڈورس شہریوں کے درمیان سے راستہ نکالتا ہوا آتا ہے، اور رومی سپاہ کے پیچھے سے افسروں کو پکارتا ہے)

اپالوڈورس:- کیا میں گذر سکتا ہوں ؟

رسالدار:- ہاں، سسلی کے اپالوڈورس -

(سپاہی اُسے جانے کو راستہ دیتے ہیں)

بلزنار:- کیا سیزر قریب ہے ؟

اپالوڈورس:- ابھی نہیں - وہ ابھی بازار ہی میں ہے - میں سپاہیوں کا شور و غل زیادہ نہ سن سکتا تھا - ایک شخص نصف گھنٹہ تک فوجی جوش و خروش کا اظہار کرنیکے بعد سمندر کی ہوا میں سانس لینے کی خواہش کرتا ہے -

عجمی:- کہو کیا خبر لائے ؟ کیا اس نے پادریوں کو قتل کر ڈالا ہے ؟

اپالوڈورس:- نہیں - وہ اس حالت میں اُن سے بازار میں ملے کہ انکے سروں پر راکھ پڑی ہوئی تھی اور وہ اپنے دیوتاؤں کو ہاتھ میں لئے ہوئے تھے - انہوں نے اپنے دیوتا اسکے قدموں پر ڈال دیئے - ان دیوتاؤں میں قابل دید ایپس (Apis) تھا - جو سونے اور ہاتھی دانت کا ایک عجیب و غریب مجسمہ تھا - میری رائے سے اسنے اسکے معاوضہ میں بڑے پادری کو دو ٹیلنٹس دیئے

بلزنار:- (خوفزدہ ہو کر) ایپس - صرف دو ٹیلنٹ میں پھر بڑے پادری نے کیا کہا ؟

اپالوڈورس:- اسنے ایپس سے رحم و کرم کی درخواست کی

بلزنار:- اب اسکی وجہ سے ملک میں قحط اور طوفان آ جائے گا -

عجمی:- اف - ایپس نے کیوں اخیلس سے سیزر کو مروا نہیں ڈالا - اپالوڈورس، جنگ کی کوئی تازہ خبر ؟

اپالوڈورس:- چھوٹا ٹالمی غرق کر دیا گیا -

بلزنار:- غرق کر دیا گیا - کیسے ؟

اپالوڈورس:- اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ - سیزر نے تین طرف سے ایک وقت حملہ کیا - اور سب کو نیل میں بھگا دیا - ٹالمی کا بیڑا ڈوب گیا -

بلزنار:- یہ سیزر ایک عجیب الخلقت آدمی ہے! کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ جلد آئے گا؟

اپالوڈورس:- جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو وہ بھوڈیوں کا قضیہ طے کر رہا تھا۔

(شمال کی جانب سے بگلوں کی آواز آتی ہے اور لوگوں میں ایک ہل چل مچ جاتی ہے۔ سیزر کے آنے کی اطلاع ہوتی ہے)

عجمی:- اس نے ان کا کام ختم کر دیا۔ وہ دیکھو آ رہا ہے۔

(وہ مصری سپاہ کے سامنے اپنی جگہ پر دوڑتا ہے۔)

بلزنار:- (اسکے ساتھ) وہ دیکھو سیزر آ رہا ہے۔

(سپاہی بالکل سیدھے کھڑے ہو کر اپنا لباس درست کرتے ہیں۔ اپالوڈورس مصری سپاہ کی طرف جاتا ہے)

رسالدار:- (گذرگاہ کے محافظ کے پاس دوڑ کر) سیدھے کھڑے رہو۔ سیزر آ رہا ہے۔

(سیزر روفیو کے علاوہ اور اپنے تمام مصاحبوں کے ہمراہ آتا ہے۔ بری ٹینس ساتھ ساتھ ہے۔ سپاہی نعرۂ مسرت کے ساتھ اس کا اقبال کرتے ہیں)

سیزر:- مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرا جہاز میرا منتظر ہے۔ سیزر کا مصر کو خدا حافظ کہنے کا وقت آ گیا ہے۔ اور روفیو اب میرے جانے سے قبل اور کس کام کی تکمیل باقی رہ گئی ہے؟

روفیو:- (اسکی بائیں جانب سے) آپ نے ابھی اس صوبہ کے لئے کوئی رومی گورنر نہیں مقرر کیا۔

سیزر:- (اسکی طرف متحیرانہ انداز سے دیکھ کر نہایت متانت سے) تم میری مدد کرنے والے اور مجھے اس مصیبت سے نجات دلانے والے، اپیٹر کے فرزند اعظم پرگامس کے متھری ڈیٹس کے متعلق کیا کہتے ہو؟

روفیو:- کیوں، اس کی تمکو پھر ضرورت پڑیگی۔ کیا آپ نے یہ فراموش کر دیا کہ وطن واپس جاتے وقت آپکو راستے میں تین یا چار لشکروں سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔؟

سیزر:- بالکل درست۔ خیر مگر اب یہ بتاؤ کہ تم اپنے متعلق کیا کہتے ہو؟

روفیو:- میں! میں ایک گورنر۔ تم کیا خواب دیکھ رہے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میں ایک آزاد منش آدمی کا بیٹا ہوں؟

سیزر:- (شفقت سے) کیا سیزر نے تمکو اپنا فرزند کہکر نہیں مخاطب کیا؟ (تمام حاضرین کو مخاطب کرکے) ایک منٹ کیلئے خاموش رہو اور جو کچھ میں کہتا ہوں غور سے سنو۔

رومی سپاہ:- سیزر کا حکم سنو۔

سیزر:- ایک رومی گورنر کی خدمات، صفات، مرتبہ اور نام سنو۔ خدمات کے لحاظ سے سیزر کی ڈھال، اوصاف کے لحاظ سے سیزر کا دوست۔ مرتبہ کے لحاظ سے ایک رومی سپاہی۔ (رومی سپاہ نعرۂ مسرت بلند کرتی ہے) اور نام نامی روفیو۔ (فوج دوبارہ نعرۂ مسرت بلند کرتی ہے)

روفیو:- (سیزر کے ہاتھ کو بوسہ دیکر) ہاں میں سیزر کی ڈھال ہوں۔ لیکن جب میں سیزر کے شانوں کے ساتھ نہ رہوں تو یہ ڈھال بیکار چیز ہوگی۔ خیر۔ مگر کوئی حرج نہیں (وہ اپنے آپ کو سبھالتا ہے اور چلا جاتا ہے)

سیزر:- میرا برطانوی غلام کہاں ہے؟

بری ٹینس:- (سیزر کے دائیں ہاتھ کی طرف بڑھ کر) سیزر- وہ یہاں موجود ہے۔

سیزر:- مجھ سے یہ بتاؤ کہ تم سے کس نے کہا تھا کہ تم دہانے کی جنگ میں اپنے وطن کے جنگی نعرہ لگاتے ہوئے

کو دیڑو تمنے کسکو ناشائستہ ناموں سے مخاطب کیا ؟

برٹینیس:- سیزر - میں آپ سے یہ التجا کرتا ہوں کہ جو الفاظ جوش وخروش کے عالم میں میری زبان سے نکل گئے ان کو معاف کیجیے۔

سیزر:- اور تمنے کسطرح نہر کو پار کیا جب تم تیر نہیں سکتے۔

برٹینیس:- میں نے آپکے گھوڑے کی دم پکڑ لی تھی۔

سیزر:- برٹینیس، یہ ایک غلام کے کام نہیں ہیں بلکہ ایک آزاد آدمی کے کارنامے ہیں۔

برٹینیس:- سیزر میں آزاد ہی پیدا ہوا تھا۔

سیزر:- لیکن انلوگوں نے تمکو سیزر کا غلام کہکر مخاطب کیا۔

برٹینیس:- صرف سیزر کا غلام ہی بنکر میں نے حقیقی آزادی حاصل کی ہے۔

سیزر:- (متاثر ہوکر) بہت خوب کہا۔ جیسا کہ میں ناشکر گزار ہوں۔ اسی لحاظ سے میں تمکو آزاد کردینا چاہتا تھا۔ لیکن اب ایک لاکھ ٹیلنٹ کے معاوضہ میں بھی تمکو جدا نہ کروں گا۔ (وہ دوستانہ طور پر اسکے شانے پر تھپتھپانے لگتا ہے۔ برٹینیس اس کا ہاتھ پکڑ کر چومتا ہے)

بلزنار:- (عجمی سے) یہ رومی جانتا ہے کہ آدمیوں کو کس طرح اسکی اطاعت کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔

عجمی:- ہاں - ایسے انکسار پسند آدمی جو کبھی اسکے خوفناک دشمن نہیں بن سکتے۔

بلزنار:- او چالاک - او ترشرو۔

سیزر:- (اپالوڈورس کو مصری صف میں دیکھ کر پکارتے ہوئے) اپالوڈورس - میں مصر کا آرٹ تمھاری نگرانی میں دیتا ہوں۔ یاد رکھو۔ روم کو آرٹ سے محبت ہے اور وہ اسکی ترقی کی خاطر بلا چون وچرا مدد دینے کو تیار ہے

اپالوڈورس:- سیزر میں سمجھتا ہوں۔ روم خود آرٹ پیدا نہ کریگا۔ لیکن جو دوسری قومیں پیدا کرینگی وہ ان کو خرید کر اپنے ساتھ لے جائیگا۔

سیزر:- کیا۔ روم آرٹ پیدا نہ کریگا۔ کیا صلح وامن کوئی آرٹ نہیں ہے؟ کیا جنگ ایک آرٹ نہیں ہے؟ کیا گورنمنٹ ایک آرٹ نہیں ہے؟ کیا تہذیب ایک آرٹ نہیں ہے؟ ہم تمکو یہ سب چیزیں صرف چند زیور اور جواہرات کے عوض دے رہے ہیں۔ اور تم اس سودے سے بہت فائدہ میں رہوگے۔ (پلٹ کر روفیو سے) اور اب سوار ہونے سے پہلے کس کام کی تکمیل باقی رہگئی ہے؟ (کوشش کرکے یاد کرتے ہوئے) ہاں مجھے خیال پڑتا ہے کہ کوئی بات مجھے یاد نہیں آرہی ہے۔ وہ کیا ہوسکتی ہے؟ ہاں۔ ہاں، اسکو نامکمل ہی رہنا چاہئے۔ روفیو خدا حافظ۔

روفیو:- سیزر میں تم کو بغیر ڈھال کے روم جانے کی اجازت دینے پر مجبور ہوں۔ وہاں بہت سے دشمن ہیں۔

سیزر:- کوئی حرج نہیں ہے، میں واپس جاتے وقت اپنی زندگی کے فرائض ختم کردونگا۔ اور پھر میں بہت دنوں تک زندہ رہونگا۔ اسکے علاوہ میں نے موت کے خیال کو ہمیشہ ناپسند کیا ہے۔ بہتر ہو تاکہ میں مار ڈالا جاؤں۔ خدا حافظ۔

روفیو:- (ایک آہ بھر کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے) خدا حافظ۔

(وہ دونوں مصافحہ کرتے ہیں)

سیزر:- (اپالوڈورس کی طرف ہاتھ ہلاکر) خدا حافظ اپالوڈورس اور تمام میرے دوست

(سیزر رجہار کیطرف بڑھتا ہے۔ کلیوپیٹرا۔ رنجیدہ اور سیاہ لباس میں ملفوف، بغیر کسی زیور یا جواہرات کے، محل سے اتر کر سیڑھیوں پر آتی ہے۔ سیزر اسکو اسوقت دیکھتا ہے جب وہ بولتی ہے) کیا کلیوپیٹرا کیلئے اس روانگی میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

سیزر:۔ (مسرت سے) آہ۔ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ کرنا باقی ہے (روفیو سے) روفیو تم نے مجھے کس طرح اس بات کو بھول جانے دیا؟ (جلدی سے اسکی طرف دوڑ کر) اگر میں تم کو دیکھے بغیر چلا جاتا تو کبھی اپنی اس غلطی کو معاف نہ کرتا (وہ اس کے ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ اور سب کے بیچ میں لاتا ہے۔ . . . . اور اسکے کہنے کے مطابق کرتی ہے) کیا یہ سوگ میرے لئے ہے؟

کلیوپیٹرا:۔ نہیں۔

سیزر:۔ (افسوس سے) اوہ۔ یہ میری کس قدر کم فہمی تھی! یہ تمھارے بھائی کے لئے ہے!

کلیوپیٹرا:۔ نہیں!

سیزر:۔ پھر کس کے لئے؟

کلیوپیٹرا:۔ اپنے رومی گورنر سے دریافت کرو جسکو تم نے ہمارے لئے چھوڑ دیا ہے۔

سیزر:۔ روفیو؟

کلیوپیٹرا:۔ ہاں۔ روفیو (وہ نفرت سے اس کی طرف اشارہ کرتی ہے) وہ جو اب سیزر کے نام سے یہاں کا حاکم ہے۔ سیزر کی تقلید کرتا ہے۔ اور سیزر کے قوانین پر چلتا ہے۔

سیزر:۔ کلیوپیٹرا وہ اسطرح حکومت کریگا جیسی اس سے ممکن ہے اسنے اب یہ کام اپنے سر لیا ہے۔ اور اپنی منشا کے مطابق کرے گا۔

کلیوپیٹرا:۔ تمھاری منشا کے مطابق نہیں۔

سیزر:۔ (پریشان ہوکر) میری منشا سے کیا مطلب ہے؟

کلیوپیٹرا:۔ بغیر سزا کے۔ بغیر انتقام کے اور بغیر انصاف کے۔

سیزر:۔ (اعتراف کرتے ہوئے) ہاں۔ یہی ٹھیک راستہ ہے۔ سب سے زیادہ ممکن اور مناسب راستہ۔ (روفیو سے) روفیو اگر تم سے ہوسکتا ہے تو اس پر یقین کرو۔

روفیو:۔ کیوں۔ سیزر میں اس پر یقین کرتا ہوں تم نے بہت پہلے مجھے اس پر یقین دلا دیا ہے۔ لیکن دیکھو۔ تم آج نیومیڈیا کے سفر پر روانہ ہو رہے ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ اگر وہاں ایک بھوکے شیر سے سامنا ہو تو تم اس کو اپنے نگل جانے پر سزا نہ دوگے؟

سیزر:۔ (تعجب سے سوچتے ہوئے کہ اس سے اسکا کیا مطلب ہے) نہیں۔

روفیو:۔ نہ اس سے ان لوگوں کے خون کا انتقام لوگے جن کو اس نے شکار کیا۔

سیزر:۔ نہیں۔

روفیو:۔ نہ اسکو اسکے جرم پر تنبیہ کروگے۔

سیزر:۔ نہیں۔

روفیو:۔ تو پھر تم اس سے اپنی جان بچانے کے لئے کون سا طریقہ استعمال کروگے۔؟

سیزر:۔ (تیزی سے) بندۂ خدا مار ڈالوں گا۔ جیسا کہ

وہ خود کرے گا - اس شیر کے استعارہ سے کیا مقصد ہے تمہارا ؟

روفیو :- کیوں ؟ کلیوپیٹرا کے پاس ایک شیرنی تھی جو اس کے حکم سے لوگوں کو قتل کر ڈالتی تھی - میں نے سوچا کہ کہیں وہ کسی روز تمکو قتل کرنیکا حکم نہ دیدے - اگر میں سیزر کا شاگرد نہ ہوتا تو میں نے اس شیرنی کے ساتھ معلوم نہیں کیا کیا مخلصانہ باتیں کی ہوتیں - ! میں نے اس کو سزا دی ہوتی - میں نے اس سے پوتھنیس کا انتقام لیا ہوتا -

سیزر :- (اعادہ کرکے) پوتھنیس !

روفیو :- (جاری رکھتے ہوئے) میں نے اس کا امتحان کیا ہوتا - لیکن ان تمام بیوقوفیوں کو میں نے پس پشت ڈال دیا - اور بغیر کسی افسوس کے اس کی گردن جدا کر دی - اور اسی وجہ سے کلیوپیٹرا تمھارے پاس ماتمی لباس میں آئی ہے

کلیوپیٹرا :- (غصہ سے) اس نے میری کنیز فتاتا کا خون کیا ہے - سیزر اس کا خون تمھاری گردن پر بھی ہے - اگر تم اس کو آزاد چھوڑ دو -

سیزر :- (تیزی سے) بہتر ہے میری گردن پر ہو - کیونکہ یہ بہت اچھا ہوا - روفیو - اگر تم نے اپنے آپ کو منصف کی جگہ بیٹھایا ہوتا - اور اس عورت کو متعدد رسوم کے بعد کسی جلاد کو قتل کرنے کے لئے دیا ہوتا - کہ انصاف کے نام سے لوگوں کے سامنے اس کی گردن ماری جائے تو میں دوبارہ کبھی تمھارے ہاتھوں کو نہ چھوتا - لیکن یہ فطری قتل ہے - میں اس پر خوف زدہ نہیں ہوتا -

(روفیو مطمئن ہوکر کلیوپیٹرا کی طرف دیکھ کر سر ہلاتا ہے کہ وہ اس بات کو ذہن نشین کرلے)

کلیوپیٹرا :- (طفلانہ انداز سے) اب تمام دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ سیزر کس قدر غیر انصاف پسند اور دھوکہ باز ہے -

سیزر :- (اس کا ہاتھ تعریفانہ پکڑ کر) آؤ مجھ سے ناراض نہ ہو - مجھے اس طوطاتیا کے لئے افسوس ہے -

(وہ ہنستی ہے) اوہو - تم ہنس رہی ہو - کیا اس سے مطلب مکرر اتحاد ہے ؟

کلیوپیٹرا :- (ہنسی پر خود سے غصہ ہوکر) نہیں - نہیں نہیں - البتہ صرف تم کو طوطاتیا کہتے سن کر ہنسی آتی ہے -

سیزر :- کیا ! اب بھی بچہ ہی ہو کلیوپیٹرا ؟ کیا میں نے تمکو ایک عورت نہیں بنا دیا -

کلیوپیٹرا :- یہ تم ہو جو ایک بڑے بچے ہو - تم مجھے بیوقوف بنانا چاہتے ہو - کیونکہ تم سنجیدگی سے پیش نہیں آتے لیکن تمنے میرے ساتھ ناروا سلوک کیا ہے - اور میں تم کو معاف نہیں کرتی -

سیزر :- مجھے خدا حافظ کہو -

کلیوپیٹرا :- میں نہ کہوں گی -

سیزر :- (خوشامداً) میں روم سے ایک بہت اچھا تحفہ تم کو بھیجوں گا -

کلیوپیٹرا:۔ (تمکنت سے) روم مجھے کیا دے سکتا ہے جو مصر میں موجود نہیں۔

اپالوڈورس:۔ سیزر یہ سچ ہے۔ اگر تحفہ یقینی خوبصورت ہوگا۔ تو وہ مجھے تمھارے لئے اسکندریہ میں خریدنا پڑیگا۔

سیزر:۔ میرے دوست تم ان خزانوں کو شاید بھول رہے ہو جنکی وجہ سے روم مشہور ہے تم انکو اسکندریہ میں نہیں خرید سکتے

اپالوڈورس:۔ سیزر وہ کیا ہیں۔

سیزر:۔ اسکے فرزند۔ او کلیوپیٹرا۔ مجھے معاف کرو اور خدا حافظ کہو۔ اور میں تمکو ایک آدمی بھیجوں گا جو سر سے پاؤں تک روم کا شریف ترین انسان ہوگا۔ عمر میں کم تر نہ اور دبلا اور سنگدل نہیں۔ اسکا سر گنجا نہ ہوگا۔ نہ اسکے کندھے جھکے ہونگے۔ بلکہ تیز اور چالاک۔ مضبوط اور جوان۔ دن بھر لڑنیوالا۔ اور رات بھر عیش اڑانے والا۔ کیا تم سیزر کے بدلے ایسا آدمی لوگی ؟

کلیوپیٹرا:۔ اس کا نام۔ اس کا نام۔

سیزر:۔ مارک انطونی ؟

روفیو:۔ خاتون تم اس سودے میں گھاٹے میں رہوگی۔ اگر انطونی کو سیزر کے بدلے لوگی۔

سیزر:۔ تو اب تم مطمئن ہو !

کلیوپیٹرا:۔ تم پھر لوگے تو نہیں !

سیزر:۔ میں نہ بھولوں گا۔ خدا حافظ۔ مجھے توقع نہیں کہ اب ہم دونوں کی پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔

(وہ اس کی پیشانی کا بوسہ لیتا ہے۔ وہ بہت متاثر ہوتی ہے سیزر جہاز پر سوار ہوجاتا ہے)

رومی سپاہی:۔ (جب وہ اپنا پاؤں جہاز پر رکھتا ہے۔) زندہ باد سیزر۔ خدا حافظ۔

(وہ جہاز پر پہونچ کر روفیو کو ہاتھ کے اشارہ سے جواب دیتا ہے۔)

اپالوڈورس:۔ (کلیوپیٹرا سے) عزیز ملکہ آنسو نہ بہاؤ۔ انھوں نے تمہارے غلام کا دل توڑ دیا۔ وہ چند روز کے بعد واپس جائے گا۔

کلیوپیٹرا:۔ مجھے امید نہیں ہے۔ لیکن میں رونا ضبط بھی نہیں کرسکتی۔

(وہ اپنا رومال سیزر کی طرف ہلاتی ہے۔ اور جہاز حرکت کرتا ہے)

رومی سپاہی:۔ (اپنی تلواریں ہوا میں بلند کرکے) سیزر زندہ باد

محشر عابدی

جائے گا ورنہ باوجود کوشش اور محنت کے بھٹک جائے گا۔ یہی طور میرے خیال میں قرب الٰہی کا بھی ہونا چاہیئے۔ معاف کیجئے گا میری اس جسارت کو کہ آپ جیسے جید عالم متبحر کے مضامین پر ایک قسم کی رائے زنی کرتا ہوں۔ لیکن یہ الفاظ محض ایک رو میں قلم سے نکل گئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میرے دل کو آپ کی طرف سے نادیدہ کیوں انسیت سی پیدا ہو گئی ہے

(نگار) مجھے یہ معلوم کرکے از بس مسرت حاصل ہوئی کہ آپ نے میرے عقاید اور مقاصد نگار کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ نگار کا مطالعہ کرنے کے بعد قائم کی ہے اور آپ نے عوام کی طرح محض مولویوں کے غلط پروپاگنڈا پر اعتماد کرکے مجھے کافر و ملحد سمجھنے کا ثواب حاصل نہیں کیا۔

آپ اپنی تحریر میں ایک جگہ ظاہر فرماتے ہیں کہ "میرے بعض اصول و عقاید سے آپ کو اتفاق نہیں۔" بہتر ہوتا اگر آپ ان کی صراحت فرما دیتے، کیونکہ تحریر گرامی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کا جو اعتقاد میں نے معلوم کیا ہے بعینہ وہی اعتقاد میرا بھی ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اصولاً آپ کو میرے کس خیال سے اختلاف ہے ——— ممکن ہے کہ آپ نے بعض فروعی مسائل کو اصول میں شامل کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا ہو یا یہ کہ میری بعض تعبیرات کو آپ ناپسند فرماتے ہوں۔ بہر حال آپ ہی کے دو مقررہ اصول کو سامنے رکھ کر اظہار خیال کی اجازت چاہتا ہوں، ممکن ہے یہ پردہ اٹھ جائے اور پھر آپ مجھے بھی اسی جگہ پر پائیں جہاں آپ کا پائے ثبات قائم ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اعمال حسنہ اچھی چیز ہیں لیکن بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کے خیال میں قرب الٰہی بھی ضروری چیز ہے ——— معاف فرمائیے اگر میں سب سے پہلے آپ سے یہ سوال کروں کہ "کسی بارگاہ میں رسائی ہونے" کا کیا مفہوم ہے اور "قرب الٰہی" سے آپ کا کیا مقصود ہے ——— اگر قرب الٰہی اور بارگاہ کی رسائی سے آپ کا مدعا ایک ہی (اور غالباً ایسا ہی ہوگا) تو آئیے سب سے پہلے اسی مسئلہ پر غور کرلیں کہ مذہبی زبان میں یہ الفاظ بول کر کیا مفہوم مراد لیا جاتا ہے اور حقیقت کے لحاظ سے یہ کیا ہیں؟ اتنا تو غالباً آپ بھی تسلیم کرتے ہوں گے کہ "قرب الٰہی" سے وہ نزدیکی یا مواصلت مراد نہیں ہو سکتی جیسی اس دنیا میں دو انسانوں یا دو مادی اشیاء کے درمیان پائی جاتی ہے اور نہ "بارگاہ کی رسائی" سے اس نوع کا قرب مقصود ہو سکتا ہے جیسا ایک غریب کسان کو کبھی کبھی آپ کے حضور میں حاصل ہو جاتا ہے ——— پھر جب حقیقت یہ نہیں ہے تو غور کرنا چاہیئے کہ اہل مذہب کی اس سے کیا مراد ہے اور وہ اس پند و موعظت سے کس نتیجہ پر پہونچنا چاہتے ہیں۔

میں اس وقت ذات باری کی حقیقت سے بحث نہیں کروں گا اور نہ اس الجھن میں پڑوں گا۔ کہ اس کی ذات و صفات میں تفریق ممکن ہے یا نہیں، بلکہ نہایت سادگی کے ساتھ صرف اس تعلق پر غور کروں گا جو خدا یا قدرت کے

ساتھ نوع انسانی کو حاصل ہے ——— یہ امر یقیناً محتاج صراحت نہیں کہ وہ خدا جسکو بے نیاز مطلق کہا جاتا ہے، وہ آفریدگار اعظم جو اپنی ذات سے ایک مستقل کمال ہے اور وہ قدرت جو بلا کسی رعایت کے ہر وقت مصروف کار رہے، کسی فانی مخلوق کی کبھی محتاج نہیں ہو سکتی اور نہ ہمارا کوئی فعل اس کو کسی طرح متاثر کر سکتا ہے ——— پھر جب حالت یہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ہمارے اعمال کا اثر ہماری ہی ذات پر ہونا چاہیئے، ہماری ہی زندگی کو ان سے متاثر ہونا چاہیئے اور ہماری اچھائیوں یا برائیوں کا دائرۂ اثر ہماری معاشری و تمدنی زندگی سے آگے نہ بڑھنا چاہیئے ——— یعنی اگر ہم اچھے کام کریں گے تو اس کا نتیجہ ہمارے ہی لئے بہتر ہوگا۔ اور اگر معاصی و بد اخلاقی میں مبتلا ہوں گے تو ہم خود تباہ و برباد ہوں گے ——— یہی ہے وہ نکتہ جس کو کلام مجید میں کہیں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ

ان اللہ لا یغیر بقوم حتےٰ یغیروا مابانفسہم

کسی جگہ ——— ان اللہ یھدی من یشاء ——— کہہ کر اس کی توثیق کی گئی ہے اور کہیں طرز بیان بدلکر اسی حقیقت کو اس طرح ظاہر فرمایا ہے کہ ——— فھل یھلک الا القوم الفاسقون ——— اور کسی جگہ ——— ان الارض یرثھا عبادی الصالحون ——— سے اس راز کو کھول دیا گیا ہے۔

بہرحال آپ تمام کلام مجید کا مطالعہ کر جائیے کوئی ایک آیت بھی ایسی نہ ملے گی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ہمارے اعمال خدا کو بھی کسی طرح متاثر کر سکتے ہیں اور اس کی برہمی یا خوشنودی کا مفہوم ہماری تباہی یا فلاح کے علاوہ کچھ اور ہے۔ اس لئے قرب الٰہی یا رسائی بارگاہ کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ٹھیرتا کہ اگر ہم اچھے اعمال کے پابند ہوں گے تو فلاح و ترقی کی صورت میں جو نتیجہ پیدا ہوگا۔ اسے مذہبی زبان میں قرب الٰہی سے تعبیر کریں گے اور اس کے برعکس اگر ہمارے اخلاق ذلیل و ردی ہوں گے تو تباہی و بربادی میں مبتلا ہو جائیں گے اور یہی ہے خدا سے دوری یا اس کی برہمی و ناخوشی ——— پھر اگر آپ خیال کو اور زیادہ وسیع کریں اور خدا و انسان کے تعلق پر زیادہ غائر نگاہ ڈالیں تو بہ آسانی یہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ دوزخ و جنت بھی اپنی اسی اہلیت و نااہلیت سے متعلق ہے۔ اور قومی خوشحالی و بربادی کے اظہار کے لئے " جنات نعیم " اور " اسفل السافلین " سے بہتر الفاظ کوئی اور ہو ہی نہ سکتے تھے۔

بہرحال اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں کہ انسان کو عقل و ہوش عطا کئے جانے کا اقتضا یہی ہونا چاہیئے کہ اس سے

---

[۱] عام طور پر اس کے یہ معنے لئے جاتے ہیں کہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، حالانکہ یہدی کا مفعول پورا فقرہ من یشاء واقع ہوا ہے اور یشاء کا فاعل من ہے۔ اس لئے معنے یہ ہوں گے کہ اللہ ہدایت دیتا ہے اس کو جو خود اپنی ہدایت چاہتا ہے۔

نیاز

اچھے کاموں کی توقع کی جائے جو مقصود آفرینش ہے ــــــ پھر جب اصل چیز صرف اعمال حسنہ قرار پائے تو یہ کہنا کہ بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی کیسے ہو سکتی ہے صرف یہی معنی رکھ سکتا ہے کہ ہم کو درستی اخلاق کے لئے کوئی صحیح و موثر طریقہ ضرور اختیار کرنا چاہیئے ــــــ لیکن اس طریقہ یا وسیلہ کو اصل مقصود نہ قرار دینا چاہیئے ــــــ الٰہیات کا مشہور مسئلہ ہے کہ آلہ یا ذریعہ صرف ایک آلہ یا ذریعہ ہونے کی حد تک قابل اختیار ہوتا ہے نہ کہ اصل مقصود کی حیثیت سے ــــــ اور یوں بھی روز کی زندگی میں ہم اس حقیقت کا مطالعہ کرسکتے ہیں کہ وسیلہ و مقصود، جادہ و منزل میں کتنا فرق ہے۔

اگر آپ نے اس حد تک میرے صحیح مدعا کو سمجھ لیا ہے تو بہ آسانی آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ میرے اعتقادات اور ایک مولوی کے اعتقادات میں کیا فرق ہے ــــــ میں کیا کہتا ہوں اور وہ کیا سمجھانا چاہتا ہے ــــــ اصول مذکورۂ بالا کی بنا پر میرا کہنا یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم کا مقصود انسان کے اخلاق کو درست کرنا تھا۔ اور ان میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے ہر نیا دین اپنے پہلے دین کے لحاظ سے زیادہ مربوط و مستحکم آئین لے کر آتا تھا، حتےٰ کہ اسلام کا ظہور ہوا اور اس نے ایک حرف آخر کی صورت سے ہمیشہ کے لئے انسان کو کسی اور مذہب کی استمداد سے بے نیاز کر دیا ــــــ لیکن اسلام کا مذہب کیا تھا، اسلام کی تعلیم کیا تھی؟ ــــــ (یہاں ایک بہت باریک نکتہ ہے جسے گوشگزار کرنا چاہتا ہوں) ــــــ صرف یہی کہ محض اخلاق حسنہ پیدا کرنا ہی اصل مذہب ہے، اور کسی مذہب کی پابندی صرف اس خیال سے کہ محض اس کی پابندی نجات و فلاح کے لئے کافی ہے بالکل بے اصل چیز ہے ــــــ یہی وہ راز تھا جس کو غالبؔ نے یوں بیان کیا ہے کہ

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یعنی اصل ایمان نام ہے مذہب "ترک مذہب"، کا، محض درستی اخلاق کا اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اب اسلام کے ظہور کے بعد کسی مذہب کی ضرورت دنیا میں باقی نہیں رہتی، کیونکہ اس کا مفہوم ہی یہ ہے کہ بغیر کسی پابندی رسم و رواج یا شعائر ظاہری کے صحت اخلاق کو مطمح نظر قرار دیا جائے ــــــ

پھر اگر حقیقت یہ نہیں ہے تو بتایئے کہ اسلام کا فطری مذہب ہونا کیا معنی رکھتا ہے، رسول اللہ کا رحمۃ للعالمین ہونا کیا مفہوم رکھ سکتا ہے اور مسلمان کیونکر اخوت عامہ کے عالمگیر رشتہ سے شرق و غرب کے تمام انسانوں کو باہم گر وابستہ کر سکتے ہیں۔

میں نے کبھی نہیں کہا کہ نماز روزہ بری چیز ہے بلکہ ہمیشہ یہی ظاہر کیا کہ اگر ان سے درستی اخلاق مقصود ہو تو ان کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ لیکن میں اس کا قائل کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہوں کہ محض نماز پڑھ لینا یا ایک مہینے کے روزے رکھ لینا ہی اصل ایمان ہے ــــــ یہ سب ذرائع و وسائل ہیں مقصود حقیقی

تک پہونچنے کے اسلئے اگر یہ منزل تک پہونچانے والے ثابت نہ ہوں تو ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور ہماری تمام عبادات جسد بے روح کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر عبادات اسلام بجائے خود ضروری نہوں اور محض اخلاق حسنہ ہی پہ انحصار ہو نجات کا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ غیر مسلم افراد بھی جو پاکیزہ اخلاق رکھتے ہیں ناجی نہ ہوں اور اس طرح اسلام کی خصوصیت پھر کوئی باقی نہیں رہتی ——— میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ بیشک یہی ہونا چاہئے کیونکہ میں نجات کا مفہوم لیتا ہوں وہ جو اسی دنیا کے فلاح و ترقی سے متعلق ہے اور وہ یوم آخرۃ - یوم میثاق - وغیرہ سے متعلق کرتے ہیں جن کا میں قائل نہیں اور نہ کوئی عقلی دلیل ان کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہے علی الخصوص اس وقت جبکہ خود کلام مجید سے میرے قول کی تائید ہوتی ہے۔

آپ اگر تعلیمات اسلام کی روح پر غور کریں گے (اور یقیناً آپ نے غور کیا ہوگا) تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس سے زیادہ سادہ چیز کسی مذہب نے پیش نہیں کی ——— رہا اس روح کو پیدا کرنا سو اس کے لئے بیشک عوام کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر ایک خاص لٹریچر پیدا کرنا پڑا اور اس طرح، آخرۃ - معاد - عذاب - ثواب - دوزخ - جنت - قرب الٰہی وغیرہ کی سیکڑوں اصطلاحات جاری ہوگئیں ورنہ

عباراتنا شتیٰ وحسنک واحدٌ

اس میں کلام نہیں کہ میں بھی وسعت خیال کے لحاظ سے انتہائی نقطہ پر ہوں اور مولوی بھی اپنی تنگی خیال میں جواب نہیں رکھتا، لیکن یہ " بین بین " کیا چیز ہے۔ اگر مذہب نام اسی چیز کا ہے جو مولوی بتاتا ہے تو اس کو آج نہیں تو کل مٹ جانا ہے اور پھر اس کے بعد اس کی بقا کی صورت صرف وہی ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ پھر اب یہ آپ کی خوشی ہے کہ جو تاریکی کل مٹنے والی ہے اُسے آج ہی ترک کر دیں یا کل پر اٹھا رکھیں

جاں بجاناں دہ وگرنہ از تو بستاند اجل
خود تو منصف باش اے دل این نکو یا آں نکو

فراست التحریر مکمل

یعنی اردو اور انگریزی رسم خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت، چال چلن، مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنیکا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت علاوہ محصول ۸/ منیجر نگار

باب الاستفسار

(متعلق بہ مذہبیات)

(جناب محمد عمر صاحب صدیقی تلہری)

جریدہ " انصاف امرتسر" میں " الہامات اور کرامتوں " کے عنوان کی ماتحت چند نوٹ " Free [illegible] " کے حوالہ سے شائع ہوئے ہیں جو بڑی حد تک میرے خیالات کا آئینہ ہیں یا یوں کہئے کہ ایک عرصہ سے یہی اور اسی قسم کے خیالات میرے دل و دماغ پر مستولی ہیں اور جو باوجود کوشش کے بھی میرے دل سے دور نہ ہوئے ۔ اور معاف کیجئے اگر یہ کہوں کہ " نگار" کو بھی اس باب میں میں نے اپنا ہمنوا نہ پایا ۔ بہرحال میں انکو استفسارات کی شکل میں یہاں پر درج کرتا ہوں اور آپ کی رائے معلوم کرنیکا متمنی ہوں ۔ اگر آپ کچھ حرج نہ سمجھیں تو " نگار" کی کسی قریبی اشاعت میں اسپر (اپنے نقطۂ نظر) روشنی ڈالئے کہ شاید آپ ہی کے ذریعہ سے کچھ تسکین قلب حاصل کرسکوں :-

(۱) اگر قرآن ۔ انجیل ۔ وید ۔ توریت ۔ زبور وغیرہ کتب مقدسہ الہامی ہیں تو ان میں اختلاف کیوں ہے ؟

(۲) کیا کسی الہامی کتاب نے کوئی ایسی بات دنیا کو بتلائی ہو کہ اُس وقت دنیا کو معلوم نہ تھی ؟

(۳) مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق اگر قرآن کے نازل ہونے سے باقی الہامی کتب مقدسہ منسوخ ہوگئی ہیں تو پھر توریت ۔ زبور ۔ انجیل کے ماننے والوں کو ان سے ہٹا کر قرآن کی طرف لگانے کا خدا نے کوئی موثر طریقہ اختیار کیوں نہیں کیا ؟ جس سے کہ وہ بغیر ہچکچاہٹ یا شک و شبہ کے قرآن پر ایمان لے آتے ۔

(۴) اگر محض رسول اللہ پر کلام اللہ نازل ہو کر یہ کہنے سے کہ پہلی کتابیں منسوخ ہوگئیں وہ منسوخ بھی جاتی ہیں تو پھر اللہ

کے بعد بہاء اللہ پر الہامی کتاب نازل ہونے اور اس میں یہ لکھا ہونے سے کہ قرآن منسوخ ہوگیا کیوں اُسے منسوخ نہ سمجھا جائے ؟ جب کہ ایسا دعوے ہر نبی کرسکتا ہے۔ اور کرتا رہیگا۔

(۸) دنیا میں جتنی الہامی کتابیں ہیں سب کو ایک جگہ جمع کرلیا جائے اور اُن کی تعلیم پر غور کیا جائے تو ان میں کوئی ایسی بات نہ ملے گی جسے کہ دنیا پہلے سے نہ جانتی ہو ان کتابوں میں تقریباً ایسی باتیں درج ہیں جو ضروریات زندگی کے نقطۂ نظر سے بہت ہی معمولی سمجھی جانی چاہئیں اور کوئی اہم بات ان میں نہ ملے گی۔ مثلاً انسان طرح طرح کی بیماریوں سے تکالیف اٹھاتا ہے اور قدرت کے پاس امراض کو دور کرنے والی اچھی اچھی ادویات بھی موجود ہیں۔ مگر خدا نے بذریعۂ الہام آج تک کبھی کسی مرض کا شافی علاج نہ بتلایا۔ انسانی دماغ نے اپنے لئے خود توراتِ دن کی محنت اور مشقت سے کئی ایجادیں کی ہیں اور قدرت کے پوشیدہ و نہفتہ راز معلوم کئے ہیں اور آیندہ کرتا رہے گا۔ مگر الہام نے قدرت کے کسی مخفی راز پر آجتک روشنی نہیں ڈالی جس سے کہ انسان کو اتنا حیران و پریشان نہ ہونا پڑتا۔

کیا کسی الہامی کتاب نے دنیا کی اذیت کے احساس کو بند کرنے کے لئے کلوروفارم طیار کرنے کا طریقہ بتلایا ؟ کیا کسی کتاب نے تیرتھ یاترا یا زیارت مقامات مقدسہ کے لئے ریل گاڑی یا موٹر کار بنانے کی ترکیب بتائی ؟ کیا کسی مذہبی کتاب نے مصیبت کے وقت ایک دوسرے کو خبر دینے کے لئے تار یا ٹیلیفون بنانا سکھلایا ؟ ۔ کیا کسی مذہبی رہنما نے اپنی کرامات سے چیچک یا طاعون کو دنیا سے دور کردیا ؟ یا خدا سے ہم کلام ہوکر ریڈیم کے خواص معلوم کئے ؟ آخر وہ کون سی باتیں ہیں جو محض قیاسی اور خیالی باتوں پر لڑنے اور مرنے کے علاوہ الہامی کتابوں نے سکھلائی ہیں۔ اور جن سے کہ دنیا کی ترقی اور راحت میں کسی نئے باب کا اضافہ ہوا ہے ؟

(نگار) جو شکوک آپ نے ظاہر کئے ہیں، وہ آج کل ہر ذی فہم شخص کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں اور اگر مذہب و متعلقات مذہب کو بالکل اسی روشنی (تاریکی؟) میں دیکھا جائے، جو قدیم خیال کے اہل مذہب و ارباب دین کی طرف سے پیش کی جاتی ہے اور اگر اُن تمام بیانات کو جو خدا، نبی، الہام، وحی، اور کتاب اللہ کے متعلق وہ ظاہر کرتے ہیں یقین کرلینا ضروری ہو، تو اس میں کلام نہیں کہ جو اعتراضات آپ نے کئے ہیں یا اہل علم کی طرف سے کئے جاتے ہیں، ان کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دن ساری دنیا کو (اہل مذہب کے نقطۂ نظر سے) ملحد و کافر ہوجانا ہے ——— یہاں ہندوستان میں تو خیر ابھی دو ہی چار جماعتیں ایسی

قائم ہوئی ہیں جو مذہب کے خلاف پروپاگنڈا کر رہی ہیں لیکن مغرب میں تو ایک طوفان برپا ہے اور مذہب نے اپنی شکست کو نمایاں طور پر تسلیم کر لیا ہے ——— منکرین خدا نے اپنے کلب قائم کر رکھے ہیں، اپنی سوسائٹیاں بنالی ہیں، اپنے اخبار و رسائل شایع کرتے ہیں، اپنی کتابیں چھاپ چھاپ کر مفت تقسیم کر رہے ہیں اور علی الاعلان خدا کا انکار کر کے تمام انبیاء کرام کو گالیاں دے رہے ہیں — آپ کو شاید یہ سنکر حیرت ہو گی کہ امریکہ کی ملحد جماعت نے جس میں بڑے بڑے اہل علم شامل ہیں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ کس استدلال پر اور کس اخلاقی قانون کے زیر اثر خدا کے وجود کو کلیساؤں کی صورت میں قائم کئے ہوئے ہے - اور وہ کیوں نہیں تمام عبادتگاہیں مسمار کر کے نوع انسانی کو اس مکر و فریب کے جال سے آزاد کراتی ——— ایک پُر لطف قصہ سنئیے :-

امریکہ میں دستور ہے کہ سال میں ایک دن مقرر ہے جسکا نام "ادائے شکریہ کا دن" (Thanks giving Day) رکھا گیا ہے۔ اس دن عام تعطیل ہوتی ہے اور کلیساؤں میں خدا کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے ——— جب ملحدوں اور منکرین خدا کی یہ سوسائٹی وہاں قائم ہوئی تو اس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ یا تو اس دن کی تعطیل بند کر کے شکریہ کی رسم کو بند کیا جائے ورنہ ایک دن اور بھی تعطیل کا مقرر کیا جائے جس کا نام (Blames giving Day) ہو اور اس دن بجائے شکریہ کے خدا پر الزام رکھنے کے لئے عام جلسے کئے جائیں!

کیونکہ اُن کے نزدیک اوّل تو خدا کو ماننا ہی سرے سے حماقت ہے اور اگر مانا جاتا ہے تو پھر کیوں نہ دنیا کے تمام تکالیف و مصائب کا الزام اس پر رکھا جائے

امریکہ میں الحاد (Atheism) نے اب ایک مستقل علم و فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور کثیر تعداد میں وہاں سے کتابیں شایع ہوتی رہتی ہیں اور مقبول ہو رہی ہیں ——— بہرحال اس میں کلام نہیں کہ موجودہ دَور "لامذہبیت" کا دَور ہے، دنیا رفتہ رفتہ "مذہب" کی طرف سے بیزار ہوتی جا رہی ہے۔ اور اگر واقعی نوع انسانی کو اب بھی مذہب کی ضرورت ہے تو دنیا میں صرف ایک ہی مذہب (اسلام) ایسا ہے جو اس سیلاب کا مقابلہ کر کے لوگوں میں پھر ایک ایقانی و اذعانی کیفیت پیدا کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی صحیح روح کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے ——— آپ باور کیجئے میں یہ دعوے ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک شخص ثالث کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں لوگوں کو مذہب کے خیال سے کیوں نفرت پیدا ہوتی جا رہی ہے اور اسلام کیوں ان تمام الزامات سے بلند ہے جو دوسرے مذاہب پر اہل علم کی طرف سے عاید کئے جاتے ہیں ——— خیر، یہ تو میرے خیالات پریشان تھے جو آپ کے استفسار کو دیکھ کر بے اختیارانہ زبان پر آ گئے اور جن کو غالباً آیندہ کسی صحبت میں

زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کروں گا ــــــ فی الحال آپ اپنے سوالوں کا مختصر جواب سن لیجئے:-

(۱) آپ کا پہلا سوال یہ ہے کہ اگر کتب مقدسہ الہامی ہیں تو ان میں اختلاف کیوں ہے؟ لیکن آپ نے اختلاف کی صراحت نہیں فرمائی ــــــ بہر حال اگر یہ اختلاف متعلق ہے حالات و واقعات سے تو ایسا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ ان کتابوں کے اوقات بھی مختلف تھے اور زمانہ و وقت کے لحاظ سے ہدایت کے طریقوں میں اختلاف ہونا ضروری ہے ــــــ اگر آپ یہ فرمائے کہ ان کتابوں میں باہم تضاد ہے، یعنی اصول اخلاق کے لحاظ سے ان میں تبائین پایا جاتا ہے تو بیشک اعتراض درست ہوسکتا تھا ــــــ علاوہ اس کے جتنی مقدس کتابیں اس وقت پائی جاتی ہیں وہ سب نہ اپنی حقیقی حالت پر ہیں اور نہ اُن اصلی زبانوں میں ہیں۔ جن میں وہ پیش کی گئی تھیں اس لئے کون کہہ سکتا ہے کہ ترجمہ در ترجمہ ہوکر امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں کیا کیا تحریفات شامل نہیں ہوئیں ــــــ صرف ایک قرآن بیشک ایسی کتاب ہے جو ابھی تک اصلی زبان میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے پائی جاتی ہے، سو آپ خود بخود کرسکتے ہیں کہ اس کا اصول تعلیم کتنا صاف ہے اور اس کی آیتوں میں باہمدگر کسی قسم کا تضاد نہیں پایا جاتا۔

(۲) آپ کا دوسرا اعتراض پیدا ہوتا ہے آپ کے اس خیال و یقین کی بنا پر کہ آپ نے الہامی کتابوں کو علمی کتابوں کا مرتبہ دینا چاہا ہے، درانحالیکہ الہامی کتابیں صرف وہ الفاظ و خیالات ہیں جو انتہائی روحانی تاثر کے عالم میں اصلاح ملک و قوم کے لئے بے اختیارانہ انبیاء کے منہ سے نکل گئے ہیں، اس لئے آپ انکی کتابی حیثیت کو کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے کتنے آدمیوں کو راہ راست پر لایا گیا ــــــ پھر اس صورت میں سوال نئی بات بتلانے کا ہو ہی نہیں سکتا ــــــ کیونکہ اصول اخلاق تو بہر حال ہر زمانہ اور ہر ملک میں ایک ہی رہے ہیں۔ اور مختلف انبیاء نے انھیں کو اپنے اپنے زمانہ کے لحاظ سے قایم کیا۔

(۳) کسی کتاب کا دوسری کتاب سے منسوخ ہوجانا افادہ و استفادہ کے لحاظ سے از خود ہوجایا کرتا ہے اس لئے اس کے اظہار میں کوئی خرابی نہیں ــــــ اگر قرآن کی تعلیمات واقعی اتنی مکمل ہیں۔ کہ ان کے ہوتے ہوئے دوسری اخلاقی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو ظاہر ہے کہ وہ منسوخ ہو ہی جائیں گی کیونکہ عملاً اُن سے استفادہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ رہا یہ امر کہ خدا نے کیوں نہ کوئی مؤثر طریقہ ایسا اختیار کیا کہ ساری دنیا بلا پس و پیش قرآن پر ایمان لے آتی۔ سو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ خدا کو اس کی کیا ضرورت تھی اور کسی کے کفر و ایمان کا اثر اس کی ذات پر کیا

ابرِ کرم سے خطاب

کس مقدس میکدہ سے جھوم کر نکلا ہے تو — کونسی گنگا کی چوکھٹ چوم کر نکلا ہے تو
آ رہا ہے کس ادا سے کیف برساتا ہوا — ایک پریم کی طرح بیتاب لہراتا ہوا!
غرق ہے کس کیفِ روحانی میں اے ابرِ کرم — محو ہے کس فکرِ نورانی میں اے ابرِ کرم

ڈھونڈھ کوئی پاک دنیا اپنی الفت کے لئے — منتخب کردہ زمیں بارانِ رحمت کے لئے
جس جگہ بھٹکی ہوئی انسانیت آباد ہو — جس جگہ انسان کا لوٹا ہوا دل شاد ہو

یہ جہنم زار اس الطاف کے قابل نہیں — رحمتوں کی جس پہ بارش ہو یہ وہ محفل نہیں
جس جگہ مذہب فروشی کا لقب ہے رہبری — جس جگہ ہے کار فرما زہد کی جادوگری
پنڈلیوں تک خرقۂ زہد و ورع آیا ہوا — لیکن آنکھوں میں رعونت کا نشہ چھایا ہوا
داڑھیوں میں معصیت کی تیرگی گوندھی ہوئی — راہبانہ شکل و صورت حرص میں ڈوبی ہوئی
معصیت کوشی کے پیکر، نفسِ سرکش کے مرید — خلد کے تاجر، خدا کو بیچنے والے پلید!

آہ یہ دنیا جہاں خوفِ خدا کوئی نہیں — فاقہ کش مزدور کے خوں کی بہا کوئی نہیں
جس جگہ سرمایہ داری کا لقب تہذیب ہے — جس جگہ کتوں کی عف عف خطبۂ تادیب ہے
رات بیخوابی سے کٹتی ہے جہاں انسان کی — گل رہی ہیں ہڈیاں انصاف کی، ایمان کی
بے محابا دیوِ باطل ہے جہاں خنجر بدست — جس جگہ تعزیر کے قابل ہے مردِ حق پرست

اس زمیں پر سانپ اور اژدر برسنے چاہئیں
برق گرنی چاہیے، پتھر برسنے چاہئیں

عدم

کلام مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

دل کی عدو ہوئی ہے باندازِ آشنا
تجھ سے حذر ہے اے نگہ نازِ آشنا

ہمت کہ دور منزلِ مقصود اب نہیں
آنے لگی ہے کانوں میں آوازِ آشنا

بیدل کیطرح مجھ سے بھی پنہاں ہے یا اثر
"انجامِ کار دشمن و آغاز آشنا"

داغِ عشق کی مے سے چھلک رہا ہے
اک پھول ہے جو مہک رہا ہے

آنکھیں کب کی برس چکی ہیں
کوندا ابتک لپک رہا ہے

اب آئے بہار یا نہ آئے
آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے

ہے دور بہت زمانِ وعدہ
اور دل ابھی سے دھڑک رہا ہے

کس نے وحشی اثر کو چھیڑا
دیوار سے سر پٹک رہا ہے

ہشیار کو اک آن میں دیوانہ بنا دے
دیوانہ جسے نرگسِ مستانہ بنا دے

بدمست کو ہشیار کرے ہشیار کو بدمست
جو چاہے جسے گردشِ پیمانہ بنا دے

سن اے دلِ ناشاد وہ کیا پوچھ رہے ہیں
حسرت کی نگاہوں کو اب افسانہ بنا دے

دامن نہ ہو آلودہ اثر گردِ دوئی سے
مقصود کو مطلوب سے بیگانہ بنا دے

کوئی روٹھا ہوا پھر مہرباں ہے
مرے حسرت بھرے دل تو کہاں ہے

خدارا ہمت اے پائے شکستہ
نظر کے سامنے وہ آستاں ہے

نشیمن سے جو اٹھا تھا اسیرو
مری آنکھوں میں اب تک وہ دھواں ہے

قفس میں ہو گیا اکثر یہ دھوکا
ستارا صبح کا یا آشیاں ہے

نگاہیں ملتے جھکنا، دل کا جانا
مری آنکھوں میں اب تک وہ سماں ہے

نم دیدہ، چہرہ زرد، لب خشک
اثر پندارِ خودداری کہاں ہے

کلام دلؔ شاہجہانپوری

رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے دل پر مصیبت ہوتی ہے
میں تارے گنتا رہتا ہوں جب دنیا غافل سوتی ہے

اے حسن ستم پرور تیری ہر چھیڑ قیامت ہوتی ہے
جس راہ میں سر دھنتا ہے کوئی اس راہ میں کانٹے بوتی ہے

قدرت کی چمن آرائی کا گو ایک اثر ہے دونوں پر
غنچے ہیں کہ ہنستے رہتے ہیں شبنم ہے کہ پیہم روتی ہے

ہے جن کے مقدر میں ساحل کیا خوف انھیں طغیانی کا
جو ڈوب رہا ہو اس کو تو ہر موج قیامت ہوتی ہے

گو پیش نظر کوئی بھی نہ تھا گھبرا کے جدھر دیکھا یہ سنا
کیا میرے تغافل کا شکوہ تقدیر ہی تیری سوتی ہے

ناوک ہے کہ پیکاں ناوک کا اے عشق اسے میں کیا سمجھوں
اک ٹیس سی دل میں اٹھتی ہے رہ رہ کے کھٹک سی ہوتی ہے

ہیں اشک رواں اور اشکوں میں شامل ہے عرق پیشانی کا
محشر میں ندامت قاتل کی دامن کا لہو اب دھوتی ہے

کشتی ہے مری محفوظ فنا اس کی ہے بقا گہرائی میں
جس نے بھی کیا رخ ساحل کا وہ نذر تلاطم ہوتی ہے

ہنگامِ غمِ حسنین اے دلؔ ہر اشک کا یہ حاصل سمجھو
رہ جائے تو نوکِ نشتر ہے بہ جائے تو سچا موتی ہے

کلام عبدالمجید حیرت بی۔اے

زباں سے اگر کچھ کہا چاہتا ہوں — تو شائستۂ اعتنا چاہتا ہوں
تصور میں جس کے مزے لے رہا ہوں — اسے آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہوں
جسے دیکھتا ہوں، مجھے دیکھتا ہے — خدا جانے میں کیا کہا چاہتا ہوں
دل خوں شدہ کی حکایت نہ پوچھو — عزیزو، سنبھالو، گرا چاہتا ہوں
خدائی کو معلوم ہے یہ تو حیرت — کہ اسکے سوا اور کیا چاہتا ہوں

نہ دوا ہے نہ کچھ دعا میری — ابتو سن لے مرا خدا میری
کون کرتا ہے مجھ غریب پہ رحم — کون سنتا ہے التجا میری
ڈھونڈتا ہوں سکون دل حیرت — یہ خطا ہے تو ہے خطا میری

اس طرح جس کی سزا دی جائے — وہ خطا بھی تو بتا دی جائے
کام آئے گا کسی کے کوئی ؟ — یہ توقع ہی اٹھا دی جائے
غم الفت ہی وہ شے ہے حیرت — زندگی جس میں گھلا دی جائے

مایوس نہ ہو انساں گزرے جو مصیبت سے — کٹ جاتی ہے ہر مشکل تھوڑی سی عزیمت سے
ناکام وفا رہ کر، پامال جفا ہو کر — واقف تو ہوئے کچھ ہم دنیا کی حقیقت سے
وہ وقت بھی اے حیرت ہر وقت نہیں رہتا — جو وقت کہ کٹتا ہے رو رو کے مصیبت سے

کون کہتا ہے کہ پورا مرا ارماں ہو جائے — کچھ تو تسکین دل زار کا ساماں ہو جائے
آرزو کوئی تو بر آئے دل مضطر کی — کوئی مشکل تو گنہگار کی آساں ہو جائے
کام آئینۂ حیرت کا فقط اتنا ہے — جب کوئی سامنے آجائے تو حیراں ہو جائے

کلام فراق گورکھپوری

شکست رنگ کے آئینہ دار بھی کچھ تھے — چمن میں دیکھ لیا تھا انہوں نے صحرا کو
نثار پرسش غم کے ترے کرم کے نثار — ہیں غیر میں بھی کچھ اے دوست عشق رسوا کو
گداز شیشۂ نازک ہے یا دل لرزاں — بھرا ہے عشق نے صہبائے تاب فرسا کو
بتا کہ دولت کونین کیا کرے وہ دل — کہ تجھ سے بھی نہ جو بدلے تری تمنا کو

کر ترک بھی دنیا کو دنیا کی طلب بھی کر — ملتے ہوئے دنیا سے بچتے ہوئے دنیا سے
ہم سے کیا ہو سکا محبت سے — تو نے تو خیر بے وفائی کی

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

- ...گوڈر کا لال — ۱عہ
- ...شوکت آرا بیگم حصہ اول و دوم — عہ
- ... حصہ سوم — ۳
- ...سعیدہ کے خطوط — عہ
- ...پیاری سہیلی — ۸
- ...نئی پیاری سہیلی — ۴عہ
- ...عورتوں کی انشا — عہ
- ...انشا نسواں — ۴
- ...سیرۃ الکبریٰ — عہ
- ...زندگی — عہ
- ...مستورات تیموریہ — عہ
- ...ازواج النبی — ۱۲
- ...ازواج الانبیا — عہ
- ...سیرۃ عائشہ صدیقہ — ۱۰
- ...المسلمات — عہ
- ...الجنان — عہ
- ...بچوں کی پرورش — عہ
- ...طفلاں — عہ
- ...نسواں — عہ
- ...کی تعلیم — عہ
- ...کی تربیت — عہ
- ...اطفال — ۱۲

- فرائض مادری — ۱۲
- افسانۂ دہجہاں — عہ
- اقبال دولھن — عہ
- حسن معاشرت — عہ
- ایامی — عہ
- سولہ کہانیاں — ۱۲
- سترہ کہانیاں — ۱۲
- سولہ قصے — ۸
- مراۃ العروس — ۸
- بناۃ النعش — ۸
- توبۃ النصوح — ۱۲
- کنیز فاطمہ — ۸
- پھلجھڑیاں — ۸
- نصیحت کا کرنپھول — ۸
- برکات سلطانی — ۸
- ابن الوقت — عہ
- چند پند — ۴
- منتخب الحکایات — ۴
- تندرستی — عہ
- حفظ صحت — عہ
- طبیب نسواں — عہ
- رہبر صحت — ۸

ناول، ڈرامے اور افسانے

- قطرات اشک — عہ
- جتندر ناتھ — عہ
- بس کا روکھ — عہ
- فسانۂ سعید — ۸
- خوفناک کیتی — عہ
- سیلاب اشک مع تصویر — عہ
- بے زبان دوست — ۴
- جال ہم نفین — عہ
- تکفیر عصمت — عہ
- جوہر قدامت — عہ
- تائید غیبی — ۸
- پراسرار قتل — عہ
- اعلان آزادی — ۵
- سرگذشت ہاجرہ — ۱۰
- نوحہ زندگی — ۲
- قلب حزیں — ۸
- عروس کربلا — عہ
- شہید مغرب — عہ
- ماہ عجم — عہ
- تیغ کمال — عہ
- سراب مغرب — ۸
- مشاغل ... مکمل — عہ

- موہنی — ۱۲
- وداع ظفر — عہ
- یاسمین شام — عہ
- طوفان اشک — عہ
- شاہین و دراج — ۸
- درس عشق — عہ
- کرویتی چور — عہ
- تین بندوق باز — عہ
- کرشمۂ رقابت — ۸
- انقلاب قسطنطنیہ — ۸
- شاہد رعنا — عہ
- ریڈیا کی سرگذشت — ۴
- شگوفۂ محبت — ۸
- نسوانی زندگی — ۸
- ولایتی لفنگی — ۸
- شمع خاموش — ۸
- لحب زندگی کامل — عہ
- موودہ — ۴
- چندرکلا — ۸
- گلستان خاتون — عہ
- صبح زندگی — عہ
- شام زندگی — عہ

تاریخ و سوانح عمریاں

- تاریخ مغرب — عہ
- مختصر تاریخ اسلامی — ۸
- " " حصہ ۲ — ۹
- " " حصہ ۳ — ۱۰
- " " حصہ ۴ — عہ
- الصالحات — عہ
- امت کی مائیں — عہ
- الزہرا — ۱۲
- اسوۂ حسنہ — ۸
- ہند و شعراء — عہ
- شوہیمار — عہ
- سوانح اکبر الہ آبادی — عہ
- سفرنامہ عراق — عہ
- تاریخ افاغنہ — عہ
- اسلام اور غیر مسلم — ۸
- سیر المصنفین حصہ ۱ — عہ
- " حصہ ۲ — ۸
- تاریخ اسلام ۵ جلد — عہ
- اخبار الاندلس ۳ جلد — عہ
- خلافت موحدین — عہ
- خلافت موحدین — عہ
- عرب اور اسکا مستقبل — عہ

لغات و ادب

- بازاری زبان — ۸
- لغات سعیدی — عہ
- لغات کشوری — عہ
- گنجینۂ تحقیق مجلد — عہ
- غیر اللغات فارسی — عہ
- محاورات نسواں — ۸
- جواہر اللغات — ۱۲
- گوہر اللغات — ۱۲
- چراغ سخن — عہ
- دکھنی لغت — ۸
- جواہرات کلیات نظیر — عہ
- عزیز اللغات — عہ
- تذکرۂ ریختی — عہ
- تاریخ ادب ... — عہ
- دکن میں اردو — عہ
- منتخب کلام ہندی — عہ
- رباعیات عمر خیام — عہ
- منتخب کلام ہندی — عہ
- اردو کے اسالیب بیان — عہ
- تصریح الاغلاط — ۴
- فیض اردو — ۵
- نور اللغات ۴ جلد — عہ

دواوین فارسی

- ...شمس تبریز — عہ
- ...عراقی — ۱۲
- ...حافظ — عہ
- ...بیدل — عہ
- ...عرفی — ۱۲
- ...جامی — عہ

- کلیات غالب — عہ
- کلیات صائب — عہ
- دیوان ناصر علی — ۲
- کلیات سعدی — عہ
- کلیات حزیں — عہ
- دیوان عنصری — ۱۲

- دیوان غنی کشمیری — عہ
- دیوان ہلالی — ۲
- اسرار خودی و رموز بےخودی — عہ
- زبور عجم — عہ
- پیام مشرق — عہ
- قصائد عرفی مجلد — عہ

دواوین اردو

- کلیات ظفر — عہ
- کلیات مومن — عہ
- دیوان ناسخ — عہ
- کلیات میر — عہ
- کلیات سودا — عہ
- کلیات انشا — عہ

- کلیات نظیر اکبرآبادی — عہ
- گلزار داغ — عہ
- دیوان رند — ۱۲
- دیوان ذوق — ۱۲
- گلکدۂ عزیز — عہ
- مراۃ الغیب — عہ

- صنمخانۂ عشق — عہ
- فریاد داغ — ۴
- عالم خیال باتصویر — عہ
- دیوان شہیدی — ۲
- کلیات اکبر الہ آبادی — عہ
- نغمۂ دل شاہجہانپوری — عہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

تذکرہ و تاریخ

- پیغمبر اعظم
- شب معراج
- سراج منیر
- پیغمبر عالم
- سوانح حضرت رسول
- سید المرسلین
- حیدر کرار
- سیرۃ الصدیق
- عمر ابن خطاب
- ابوبکر صدیق
- ائمہ اسلام
- الحبیب
- عمر بن عبد العزیز
- دولت فاطمیہ
- مکمل سوانح زیب النسا بیگم
- تذکرہ اولیا
- تذکرہ اولیائے ہند
- مراۃ الکونین
- قصص الانبیا مکمل
- سفر نامہ مصر
- تلخیص التواریخ
- خاتون جنت
- مختارات الصوفیہ
- خواتین گجورہ
- مشاہیر نسواں
- مشاہیر ہند
- مخدرات تیموریہ
- بیگمات بنگال

جاسوسی کے ناول

- شرلاک ہومز
- محاصرۂ پیرس
- شیخ چلی
- بہرام کی واپسی
- انقلاب فرانس
- بحری قزاق
- فطرتی جاسوس
- ترکی حرم سرا
- جنگ طرابلس
- بہرام چور
- زر پرست
- کنجی کا راز
- عبد الرحمٰن ناصر
- عروس مصر
- سیلاب خون
- سیاحت زمین
- سیاحت ہوا
- نازنین مراکش
- ممنسک کی سیر
- اسرار بالشویزم
- روح لیلیٰ
- امین بک
- حجاج بن یوسف
- یوسف پاشا
- انقلاب عثمانی
- بہرام کی رہائی
- بہرام کی آزادی
- بہرام کی سرگذشت

مراثی

- مراثی دبیر
- مراثی انیس کامل
- مراثی ضمیر
- مراثی مونس
- مراثی دیگر

عجائب و غرائب

- عجائب مخلوقات (تصویر رنگین)
- بلا تصویر سادہ
- مجمع الفنون
- طلسم فرنگ
- کارخانۂ عالم

رینالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- اللہ دین و لیلیٰ
- فریب حسن
- سوزن عشق
- روز الیمبرٹ
- ناول اسرار
- شام جوانی
- حرم سرا

ناول سجاد حسین

- احمق الذی
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

ناول جوالا پرشاد

- مرنالنی
- مار آستین
- بنگالی دولھن
- معشوقۂ فرنگ
- پرتاب
- روہنی

ناول سرشار

- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ بطرز ناول
- کامنی
- سوانح عمر و عیار

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب
- بزم خیال
- نشاط سخن
- مکاتیب محسن الملک

تذکرۃ الشعراء

- تذکرۂ حسینی
- گلشن بے خار
- سراپا سخن
- [illegible]

ناول شرر

- جنید بغدادی
- مخدرات
- جویائے حق
- لعبت چین
- فاتح و مفتوح
- بابک خرمی
- ایام عرب
- قیس و لبنیٰ
- یوسف و نجمہ
- زوال بغداد
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- مینا بازار
- [illegible]
- رستم الکبری
- [illegible]
- [illegible]

مولانا شبلی نعمانی

- سیرۃ النبی جلد اول
- سیرۃ النبی جلد دوم
- سیرۃ النبی جلد سوم
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- رسائل شبلی
- موازنہ انیس و دبیر
- کلام شبلی اردو
- الکلام
- علم الکلام
- شعر العجم جلد اول
- شعر العجم جلد دوم
- شعر العجم جلد سوم
- شعر العجم جلد چہارم
- شعر العجم جلد پنجم

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

قیمت ۸/

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شایع ہوتا ہے۔
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سہ)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۳	فہرست مضامین مئی سنہ ۳۳ع	شمارہ ۵

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۳	مئی سنہ ۱۹۴۳ء	شمارہ ۵

ملاحظات

دار العلوم ندوہ کے کچھ اور اندرونی حالات

میں نے ۲۲ مارچ کو ایک تحریر ناظم ندوہ کے پاس روانہ کی تھی اور چند باتیں درسگاہ کے آئین نظم ونسق کے متعلق ان سے دریافت کی تھیں۔ لیکن آج تک انھوں نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی وہ سوالات یہ تھے:

(۱) موجودہ تعداد طلبہ کی کیا ہے اور کتنے طلبہ دار الاقامہ میں رہتے ہیں

(۲) نصاب تعلیم درجہ وار کیا ہے۔

(۳) انگریزی کی تعلیم نصاب میں کہاں تک رکھی گئی ہے اور اس پر کس حد تک عملدرآمد ہوتا ہے۔

(۴) کتنے طلبہ کو وظیفہ ملتا ہے۔ اور اس کی مقدار ماہانہ کیا ہے۔

(۵) کشمیر سے کتنے طلبہ بلائے گئے تھے اور ان کی تعلیم اور ان کے وظائف کا کیا انتظام ہوا اور کب ؟
(۶) دار العلوم کے سالانہ مصارف کیا ہیں
(۷) کہاں کہاں سے کتنی امداد سالانہ مقرر ہے۔
(۸) کیا طلبہ کو عام اجازت ہے کہ وہ جس اخبار و کتاب کو چاہیں مطالعہ کر سکتے ہیں اگر عام اجازت نہیں ہے تو کیوں اور کون کون سے اخبار و رسائل یا کتابیں ممنوع المطالعہ ہیں
(۹) گزشتہ ۵ سال میں کتنے طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے ۔ (۱۰) طلبہ ذیل کے اخراج کا کیا سبب تھا۔
عبد السلام - عبد الحیٔ - عنایت اللہ - علاء الدین احمد - غلام حسن الدین - رئیس احمد جعفری -
(۱۱) دفتر نظامت کے سالانہ مصارف کیا ہیں
(۱۲) انتظامیہ کمیٹی کے ممبر کون کون ہیں
(۱۳) انتظامیہ کمیٹی کے ممبر مقرر کرنے کا کیا قاعدہ ہے اور پبلک کا نمایندہ اس کمیٹی میں کون ہے۔
(۱۴) کیا یہ صحیح ہے کہ کسی طالب علم (غلام محی الدین) نے مہتمم دار العلوم کو مارا اور کیوں
(۱۵) کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے انگریزی وضع کے بال رکھنے اور داڑھی منڈانے کی ممانعت کی ہے لیکن زلفیں رکھنے کی اجازت دیدی ہے
(۱۶) آپ کب سے نظامت کے عہدہ پر مامور ہیں اور اس دوران میں آپ نے کوئی قدم کسی خاص اصلاح کی طرف اٹھایا اور کیا ؟
(۱۷) کیا یہ صحیح ہے کہ بنگال کا کوئی طالب علم حال ہی میں بعارضۂ چیچک مبتلا ہو کر فوت ہوا اور آپ نے علاج کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور جب یاد دہانی کی گئی تو آپ نے ہمیشہ بھول جانے کا عذر پیش کیا
(۱۸) کتنے معتمد فی الحال کام کرتے ہیں۔ ان کے نام کیا ہیں اور کیا فرائض ہیں
(۱۹) آپ کتنے سال کے لئے ناظم مقرر کئے گئے ہیں ۔ یا یہ خدمت ہمیشہ کے لئے آپ کو تفویض ہوئی ہے
(۲۰) آیندہ ناظم اور معتمدین کا انتخاب ہوگا یا نہیں اور ہوگا تو کب اور اس کے متعلق کیا قواعد ہیں۔

میں جانتا تھا کہ وہ کبھی ان سوالات کا جواب نہ دیں گے ، کیونکہ جب کسی کی دکھتی ہوئی رگ پکڑلی جائے تو دھوکا دینے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ تکلیف کا اظہار کئے بغیر خاموشی سے اس کو گوارا کر لیا جائے ، لیکن میں نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ناظم کو مخاطب کیا۔ کیونکہ اصول کا اقتضا یہی تھا۔ اور انھوں نے جواب نہیں دیا۔ کیونکہ معاملہ "کشف ساق" کا تھا، بی کر رہ گئے۔

اس دوران میں چند اور اطلاعات بھی مجھے موصول ہوئیں جن کے متعلق ناظم ندوہ سے استفسار ضروری

ہے لیکن خط کے ذریعہ سے جواب حاصل کرنے کی توقع چونکہ بیکار ہے اس لئے میں نگار ہی کے ذریعہ سے ان کو بھی بارگاہ نظامت کبریٰ تک پہونچانا چاہتا ہوں :-

(۱) حال ہی میں ہز اکسلنسی نواب صاحب چھتاری کے ہاتھوں ایک مسجد کا سنگ بنیاد "سرزمین ندوہ" میں قائم کرایا گیا ہے۔ لیکن اس سے قبل غالباً نواب سر مزمل اللہ خاں سے بھی ایک مسجد کا سنگ بنیاد نصب کرایا گیا تھا۔ اور جب اعلیحضرت حضور نظام تشریف لائے ہیں تو اس وقت بھی کسی مسجد کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس لئے دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا واقعی متعدد مسجدیں علیحدہ علیحدہ طیار ہو رہی ہیں جن کا سنگ بنیاد متعدد بار رکھا گیا، یا ایک ہی مسجد کے مختلف حصوں کا سنگ بنیاد مختلف لوگوں سے رکھوایا گیا۔ اگر کسی مسجد کی تعمیر کا یوں تجزیہ کر کے مختلف لوگوں کو سنگ بنیاد نصب کرنیکی سعادت کا موقعہ دینا کوئی دینی یا شرعی تدبیر ہے تو خیر، ورنہ اگر محض حصول زر کیلئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے تو کیا یہ طریق عمل "ولا تشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا" میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) کیا یہ صحیح ہے کہ حال ہی میں مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی نے دار العلوم کے مدرس ادب عربی (ہلالی عرب) کو دیکھ کر ان کی کٹی ہوئی داڑھی پر اعتراض کیا اور جب ہلالی صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے برہم ہو کر اپنا استعفا ناظم کے پاس روانہ کیا،

(۳) کیا یہ درست ہے کہ مولوی حبیب الرحمان شروانی کی طرف سے پندرہ وظائف صرف ان لڑکوں کے لئے مخصوص ہیں جو داڑھی چھوڑنے میں دیگر طلبہ سے سبقت لے جائیں اور کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ "شروانی" وظیفہ کسی طالب علم کا داڑھی منڈوانے یا کتروانے کی وجہ سے بند کر دیا گیا ہو۔ کیا ناظم صاحب تکلیف فرما کر ان مستوفی اللحیۃ طلبہ کے نام بتا سکتے ہیں، جن کو یہ وظائف ملتے ہیں

(۴) کیا یہ صحیح ہے کہ ایک طالب علم "حسن مثنیٰ" سہ ماہی امتحان دیکر اپنے مکان چلا گیا اور جب سالانہ امتحان ختم ہونے کے بعد واپس آیا تو مولوی حیدر حسن صاحب مہتمم نے اس کو اونچے درجہ میں ترقی دیدی۔ لیکن جب دیگر طلبہ نے احتجاج کیا تو پھر اس کو نیچے درجہ میں اُتار دیا گیا — اگر یہ درست ہے تو کیا ناظم صاحب ندوہ مہتمم کے اس طرز عمل کا کوئی سبب بتا سکتے ہیں اور نیز یہ کہ اُن کے کانوں تک یہ معاملہ پہونچا یا نہیں اور پہونچا تو انھوں نے کیا کارروائی کی۔

(۵) کیا یہ درست ہے کہ وظیفہ یاب طالب علموں کے ساتھ مہتمم کا سلوک اچھا نہیں ہے اور ایسے طلبہ کو معمولی سی معمولی غلطی پر "مدرسہ سے روٹی پانے" کا طعنہ دیا جاتا ہے، درانحالیکہ اسی قسم کی غلطی اگر غیر وظیفہ یاب طلبہ سے ہو تو پروا نہیں کی جاتی۔ اگر یہ صحیح ہے تو کیا ناظم ندوہ بتا سکتے ہیں کہ یہ کس قسم

کا اخلاقی مظاہرہ ہے اور ناظم نے اس جانب کوئی توجہ کی ہے یا نہیں

(۶) کیا یہ صحیح ہے کہ مہتمم مدرسہ جس وقت درس حدیث دیتے ہیں تو ان کے درس کا اکثر حصہ مشتمل ہوتا ہے صرف راویوں کی تکذیب و جراحت پر اور ان کے نزدیک ایک راوی کی صحت و ثقاہت کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ "مسلک ابو حنیفہ" کی تائید کرنے والا ہو۔ کیا ناظم نے خود کبھی ان کے درس میں جاکر اس امر کی تحقیق کی ہے ؟

(۷) کیا یہ درست ہے کہ غیر مقلد طلبہ کے ساتھ مہتمم خصوصیت کے ساتھ بہت برا سلوک کرتے ہیں اور عصبیت سے کام لے کر امتحان میں ان کو قصداً فیل کیا جاتا ہے۔

(۸) کیا یہ صحیح ہے کہ مہتمم مدرسہ سوائے علماء حنفی کے دیگر مسالک کے علماء کو درس و تدریس کے وقت برا کہا کرتے ہیں اور ان پر جا و بیجا حملے کرتے رہتے ہیں۔

(۹) کیا یہ صحیح ہے کہ طلبہ کے لئے وظیفہ تو دس روپیہ ماہوار کے حساب سے وصول کیا جاتا ہے اور ان پر مشکل پانچ سات روپیہ صرف کئے جاتے ہیں۔

میں ناظم صاحب کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ تمام اطلاعات مجھے دار العلوم ندوہ ہی کے طلبہ و اساتذہ کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہیں اور اگر ان میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے تو ان کو تفصیل کے ساتھ جواب دینا چاہئے۔ لیکن اگر انھوں نے سکوت اختیار کیا تو میں سمجھوں گا کہ یہ اطلاعات واقعی درست و صحیح ہیں اور پھر میں ان تمام حالات و واقعات پر پوری طرح تنقید کرکے پبلک کو اخبارات و رسائل، جرائد و پمفلٹ کے ذریعہ سے متنبہ کردوں گا کہ "دار العلوم ندوہ" کی انتظامی حالت کس قدر خراب و ردی ہے اور ملک کو اس کی اعانت کی طرف سے دستکش ہو جانا چاہئے۔

ہندوستان کی ایک فلاکت زدہ قوم سے چند اصولی اور سادہ باتیں

یاد رکھو کہ صرف زمین ہی گردش نہیں کرتی بلکہ کائنات کی ہر چیز گردش میں ہے، یہاں تک کہ خود نظام شمسی بلکہ وہ عالم کہکشاں بھی جس کا ایک حقیر حصہ نظام شمسی ہے، ہر وقت گردش کی حالت میں ہے اور ہر ہر ذرہ میں ہر لمحہ کچھ نہ کچھ انقلاب ہوتا رہتا ہے۔ پھر غور کرو کہ جب زندگی کے اصول بدل جائیں لوگوں کی ذہنیت بدل جائے، آسمان و زمین بدل جائے تو ترقی کے اصول کیوں نہ بدلیں گے، قانون و شریعت میں کیوں نہ تغیر کی ضرورت ہوگی۔ پھر اگر کوئی قوم ایسی ہے جو صرف اپنے اسلاف کی ترقی کو سامنے رکھکر اور انھیں کے اصول پر کاربند ہوکر آگے بڑھنا چاہتی ہے تو اسکو سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے اپنا سفر اس حال میں شروع کیا ہے کہ اسکی پشت منزل کی طرف ہے اور منہ ایک عمیق غار کی جانب۔

پھر یوں بھی میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کونسی گری ہوئی قوم ایسی ہے جس کا ماضی کسی وقت درخشاں نہیں رہا اور

جس کے اسلاف نے ترقی نہیں کی۔ اس میں خصوصیت نہ مسلمانوں کی ہے نہ ہندوؤں کی، اس لئے اسلاف کے حالات پر غور کرکے یہ نہ دیکھو کہ انھوں نے کس طرح ترقی کی بلکہ یہ دیکھو کہ ان کو زوال کیوں ہوا۔ اور یہیں سے یہ نکتہ واضح ہوگا کہ ترقی کا اولین اصول زمانہ و اقتضاء زمانہ کا ساتھ دینا ہے۔ اور جب تک اس کا ساتھ کسی قوم نے دیا ترقی کرتی رہی اور جب اس کا لحاظ نہ رکھا تو زوال شروع ہو گیا۔ اگر اسلاف نے کسی خاص اصول کے ماتحت ترقی کی تھی تو وہ اسی وقت کیلئے موزوں بھی تھی، آج ان کے نقش قدم پر چلکر کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ یقیناً اسلاف کے کارنامے ہمکو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے تاکہ ہم اُن سے پیچھے نہ ہٹنے پائیں، لیکن انکے اصول کار کو بالکل بھلا دینا چاہیئے کیونکہ اب وہ بیکار ہیں اور ان کی تقلید تضیع اوقات۔

مسلمانوں کے انحطاط کا بڑا سبب یہی قدامت پرستی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم عہد سعادت و عہد خلفاء کی پالیسی یا طریق کار کو اختیار کرکے ترقی کر سکتے ہیں، درانحالیکہ آج اُن میں سے ایک بات بھی ہمکو کامیاب نہیں بنا سکتی۔ وہ زمانہ اپنے ماحول کے لحاظ سے ایسا تھا کہ جو قوم عزم راسخ کے ساتھ تلوار لیکر اٹھ کھڑی ہوتی کامیاب ہو جاتی، لیکن آج تو کوئی ایسا کرے۔ پہلے اگر صرف قوت بازو سے حکمرانی ہوتی تھی تو آج علم و دماغ سے ہوتی ہے، پہلے اگر ترقی کا مفہوم صرف نان شعیر کی فراوانی تھا تو آج گنج شایگاں کی معموری پر بھی قناعت نہیں کی جاتی۔

اب اس بحث کو ذرا محدود دائرہ میں لاکر سیاسیات ہند پر منطبق کیجئے اور مسلمانوں میں جو عام احساس اپنی گری ہوئی حالت اور ہندوؤں کی ترقی کا پیدا ہو گیا ہے اس پر غور کرکے کسی نتیجہ تک پہونچنے کی کوشش کیجئے۔

جس نے کچھ بھی مطالعہ دور حاضر کا کیا ہے وہ بہ آسانی معلوم کر سکتا ہے کہ موجودہ عہد میں، کامیابی کا راز، صرف پروپگنڈا میں مضمر ہے۔ اور یہ صرف اس لئے کہ وسائل آمد و رفت اور ذرائع خبر رسانی کی ترقی اور دیمقراطی طریق تنظیم سے رائے عامہ کے اقتدار کا اثر نہایت وسیع ہوتا جارہا ہے اور کسی امتیازی حیثیت اختیار کرنے کے لئے یہ بالکل لازم ہو گیا ہے کہ رائے عامہ کو اپنا طرفدار بنایا جائے جس کا واحد طریقہ پروپگنڈا ہے۔ ہندو قوم کی عزت، بین الاقوامی دنیا میں، صرف اس وجہ سے ہوئی کہ اُس کے بعض افراد، دنیا کی رائے عامہ کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے شاعری میں شہرت پیدا کی، بوس اور رامان نے سائنس میں، رادھا کرشنا نے فلسفہ میں اور گاندھی نے ایک ایسا نیا فلسفہ پیش کیا جو یورپ کے لئے بالکل نئی چیز تھا۔ یورپ عجائب پرست ہے۔ نئی چیز کی جستجو میں ہر وقت سرگرداں رہتا ہے۔ اگر کوئی نیا فلسفہ، نیا مذہب، نئی تحریک، یورپ کے سامنے یورپ کے اشتہار اور پروپگنڈا کے طریقوں کو اختیار کرکے پیش کی جائے تو یورپ کی ہمدردی اور طرفداری حاصل کرنا بہت آسان کام ہے۔ مشرقی ممالک کی ایک عرصہ سے یہ غلامانہ ذہنیت ہو گئی ہے کہ جس چیز کی مغرب تعریف کر دیتا ہے وہ انھیں بھی اچھی نظر آنے لگتی ہے۔ ان کو اپنی چیزیں بھی وہی اچھی نظر آتی ہیں جنھیں یورپ ایک دفعہ اچھا کہدیتا ہے۔ اس لئے افراد اور اقوام کی کامیابی کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ایسی تحریکیں شروع کی جائیں جو دنیا کی رائے عامہ کو اپنی طرف جذب کر سکیں۔ ایسی تحریکیں کیا ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی تحریکیں وہی ہو سکتی ہیں جو یورپ کی سمجھ میں آسکیں۔ اور جنکا لائحہ عمل مغربی طریق کار

سے مشابہ ہو۔ آپ فلسفہ تصوف و مذہب کے نہایت باریک نکات پر مغز پاشی کیجئے، شعر و ادب کے جواہر پارے پیش کرتے رہیئے، علمی و اخلاقی و سیاسی و معاشرتی تحریکیں شروع کیجئے۔ لیکن جب تک آپ یورپ کی توجہ اپنی طرف جذب کرنے میں کامیاب نہ ہوں گے، ان سب کا انجام یقینی طور پر ناکامی ہوگا۔ اگر آپ کا انداز بیان و طریق کار مغربی اصول کے مماثل ہے۔ اور اہل مغرب کی سمجھ میں آنے والا ہے تو آپ کی کامیابی ممکن نظر آنے لگتی ہے۔ مشرق کی اس وقت جسقدر بھی کامیاب تحریکیں ہیں، وہی ہیں جو ابتدا میں یا تو مغرب کے اتحادِ عمل سے یا ان کے طریق کار کی تقلید کے ساتھ شروع کی گئی ہیں۔ مغرب جن تحریکوں کو سمجھ سکتا ہے۔ ان میں ممتاز مرتبہ تحریک مساوات، آزادی اور قومیت کو حاصل ہے۔ مذہب کی بنیاد پر جسقدر تحریکیں شروع ہوتی ہیں اُنھیں تعلیمیافتہ اقلیت تو شاید سمجھ سکتی ہے لیکن وہ بھی بہت مشکل سے، مگر رائے عامہ کو اُن سے کبھی کوئی ہمدردی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایک جماعت کا، اپنے مذہبی امتیاز کی وجہ سے، مخصوص مراعات اور حقوق کا مطالبہ کرنا اُن کی فہم سے بالاتر ہے۔ مذہب ایک مدت ہوئی، یورپ کی قومی تحریکوں سے خارج ہو چکا ہے۔ وہاں کی تحریکیں سیاسی اور اقتصادی ہوتی ہیں۔ قومی آزادی، ملکی صنعت کی ترقی، تقسیم دولت کی اصلاح کی تحریکیں ان کے نزدیک سمجھ میں آنے والی تحریکیں ہیں۔ لیکن مذہب کو قائم رکھنے والی تحریکیں ان کے نزدیک عہد وسطےٰ اور عہد تاریک کی خوفناک یادگاریں ہیں۔ اسی لئے جو افراد و اقوام یورپ کی ہمدردی حاصل کر کے کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ابتدائً اس سانچے میں ڈھال لیں۔ شاعر ہیں تو اپنی نظم میں یہی کیفیت پیدا کریں، فلسفی سائنس داں، مدبر غرض جو کچھ بھی ہیں وہ یورپ کی اس مخصوص ذہنیت کو اپنا رہنما بنائیں۔ اور جب وہ ایک دفعہ رائے عامہ کی توجہ جذب کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر اپنی مخصوص تہذیب و معاشرت، اپنی زبان، اپنے مذہب اور اپنی تمام خصوصیات کو کامیاب کر سکتے ہیں۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر برطانوی پارلیمنٹ میں انگریزوں کے نمایندے گاندھی ٹوپی اوڑھ کر جاتے ہیں۔ اور بڑے بڑے لکھ پتی کھدر پہننا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔

مشرق میں ایک ہولناک جنگ کے آثار ترقی پیداوار کے آیندہ پروگرام میں، سوویٹ روس، اپنی عسکری قوت کو ترقی دینے کا تہیہ کر چکا ہے۔ ہوائی طاقت کو وہ خصوصیت کے ساتھ بڑھانا چاہتا ہے۔ اور اپنے ہوائی بیڑے کو دنیا میں سب سے زیادہ مضبوط بنا رہا ہے۔ مختلف قسم کے ہوائی جہاز مثلاً بم پھینکنے والے، تارپیڈو لیجانے والے، ڈریڈناٹ، کروزر، وغیرہ بکثرت بنائے جا رہے ہیں۔ مطمح نظر یہ ہے کہ جو طاقت برطانیہ کو اپنی بحری بیڑے سے حاصل ہے وہی طاقت، روس کو اپنی ہوائی بیڑے سے حاصل ہو جائے۔ اس مطمح نظر کو پورا کرنے کے لئے وہ ایک بے پناہ عزم کے ساتھ سرگرم کار ہے۔ یہ مطمح نظر کوئی پوشیدہ راز نہیں ہے جسکا علم فوج ہی کے صرف چند اعلیٰ افسروں کو حاصل ہے، بلکہ یہ ایک قومی مطمح نظر ہے جس کا اعلان ملک کے گوشہ گوشہ میں کیا جا چکا ہے اور جس کی تکمیل جمہور روس کا ہر ہر فرد اپنا ذاتی فرض خیال کرتا ہے۔

نوجوانوں کو اس اسکیم سے جو دلچسپی ہے اور جس جوش و خروش سے وہ اس کی تکمیل میں حصہ لینا چاہتے ہیں اس سے حکومت پوری طرح فائدہ اٹھا رہی ہے

روسی شعبۂ ہوائی بیڑے کا سردار، ایک شخص مسمی براناف ہے۔ جو نہ خود ہواباز ہے اور نہ کوئی ماہر انجینیر، لیکن اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اُسے تنظیم میں بڑا ملکہ حاصل ہے۔ اور نگرانی کرنے اور ولولۂ عمل پیدا کرانے میں اس کا مقابلہ کوئی دوسرا شخص نہیں کرسکتا۔

روس کا خیال ہے کہ بحری قوت کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور ہوائی قوت کا زمانہ شروع ہو رہا ہے۔ روس اس بات کی پوری کوشش کر رہا ہے کہ ہوائی قوت میں وہ کسی حریف سے پیچھے نہ رہے۔ وقتی طور پر اس مسئلہ کو اس وجہ سے بھی اور زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ روس اور جاپان کے تعلقات، منچوریا کے قضیہ کی وجہ سے کافی کشیدہ ہوگئے ہیں۔ علاوہ اس کے جرمنی اور فرانس کے عسکری معاہدہ سے بھی روس بدظن ہے۔

جرمنی کے کارخانوں کو حال ہی میں، روس نے ایک ہزار ٹن ہوائی جہاز کے سامان کے لئے آرڈر دیا ہے اور آسٹریا کے کارخانوں سے ایک سو ساٹھ دوربین کے شیشے منگوائے گئے ہیں۔ روس میں اس وقت تیئیس بڑے کارخانے ایسے ہیں جو ہوائی جہازوں کے بنانے میں مصروف ہیں۔ یورپ کے ایک بڑے کارخانہ دار کا خیال ہے کہ روس کے ہوائی جہاز کے کارخانوں کی اہلیت پیداوار، امریکہ کے کارخانوں سے بھی زیادہ ہے۔ اور اس کے وہ دو سبب بیان کرتا ہے اولاً یہ کہ روس میں جنگ کے مخالفین کی جماعت مفقود ہے دوسرے وہاں کے متمین سرمایہ داروں کو منافع تقسیم کرنے کے لئے مجبور نہیں ہیں۔ روس کے پاس اس وقت تقریباً سترہ سو ہوائی جہاز ہیں اور عنقریب ان کی تعداد تین ہزار ہو جائے گی۔

روس کے ہوائی بیڑے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں پیراشوٹ (وہ چھتری جس کے ذریعہ سے نیچے اترتے ہیں) کے استعمال کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ اور ہوابازوں کو تاکید ہے کہ وہ کسی حال میں بھی اپنی مشین کو نہ چھوڑیں اور کوشش کرکے اسے زمین پر واپس لائیں۔ اس میں شک نہیں کہ برطانیہ اور امریکہ کے مقابلہ میں روس میں ابھی تک بہت سی خامیاں ہیں۔ لیکن اس کے کام کرنے والوں میں ایسا عجیب و غریب ولولۂ عمل پایا جاتا ہے کہ وہ بہت جلد اپنی خامیوں کو رفع کرکے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے مبازرطلبی کرسکیں گے۔

شہوانیات۔ تاریخ الفحشا یا ترغیبات جنسی

بالکل مفت ـــــ یعنی اس طرح کہ منگا کر پڑھ لیجئے۔ اور واپس کرکے ہم سے قیمت لے لیجئے۔ مینجر نگار

وہ سیتا کی طرح کام کرنا اور اس کی طرح ہر وقت تھکی ہاری نظر آنا پسند نہ کرتی تھی۔ سیتا اس کی سہیلی تھی اور مینا کی سخت گیری اور قدامت پسندی نے، صرف اسی سے ملنے کی اجازت، اسے دے رکھی تھی۔ سیتا ہی کے ذریعہ سے اُسے باہر کی دنیا کی جھلک نظر آتی تھی۔ سیتا کا شوہر، اُسے کبھی اس بات پر مارتا تھا کہ تیرے لڑکا کیوں نہیں ہوتا اور کبھی اس بات پر کہ تو چپاتیاں کیوں جلا دیتی ہے۔ مینا اس کے ان تمام اندیشوں کو یہ کہکر رفع کرنا چاہتی تھی کہ بیٹی، تیری کا باپ، امیر ہے تیری پڑھا لکھا اور سمجھ دار ہے۔ وہ تو تجھے ملکہ بنا کر رکھے گا ـــــ لیکن اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

وہ جواب دیتی "لیکن مجھے یہ معلوم کیسے ہو کہ وہ حسین اور عقلمند ہے۔ میں نے تو اُسے کبھی نہیں دیکھا" اور پھر نہایت لجاجت سے مینا کے گلے میں باہیں ڈال کر کہتی۔ "مینا، میری اچھی مینا۔ صرف ایک دفعہ تو مجھے اُسے دکھا دے"

مینا، ناراض ہو کر جواب دیتی "ہائیں - بیٹی - کیسی باتیں کرتی ہے۔ تو ایک اونچے خاندان کی راجپوت بیٹی ہے۔ تجھے شرم و لحاظ بالکل نہیں آتا۔ تیرے اندر یہ ذلیل جستجو کیسے پیدا ہوئی۔ تیرا باپ سنے گا تو کیا کہیگا۔ (اور پھر لہجہ بدل کر پیار سے) اے میری پیاری فاختہ، اگر ان باتوں کی تیرے باپ کو خبر ہو گئی تو میری اور تیری دونوں کی خیر نہیں ہے ـ اے میری جان۔ ایسی باتیں نہ کیا کر"

لیکن تارا کی اس سے تسکین نہ ہوتی تھی۔ رواج کی پابندی، اس کی بے چین طبیعت کے لئے ایک بارگراں تھی۔ وہ شادی سے پہلے، اپنے منگیتر کو دیکھنا چاہتی تھی۔ آخر کار مینا کچھ تو اپنی عادت سے مجبور ہو کر اور کچھ اس خیال سے کہ معلوم نہیں جب یہ بیاہ کر اپنے شوہر کے یہاں چلی جائے گی تو بے تکلفی اور محبت کی وہ خصوصیت جو مجھے اب حاصل ہے، باقی رہے یا نہ رہے، اس کی ضد پورا کرنے پر راضی ہو ہی گئی۔

شادی کی رسم ادا ہونے میں ابھی چند ہفتے باقی تھے۔ مگر تارا نے، اپنی جستجو پسند طبیعت سے مجبور ہو کر، اپنے منگیتر کو، اپنے مکان کے برابر، سڑک سے گذرتے ہوئے، جھانک کر دیکھ ہی لیا۔ اور خوشی سے اس کا دل اچھلنے لگا۔ اس سڑک سے نیری روز گذرتا تھا۔ اور اب تارا کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ اسے روزانہ دیکھا کرتی تھی اور اس کے دیکھنے کے بعد اس کی نبض کی رفتار میں جو تیزی پیدا ہو جاتی تھی اس سے، اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اس نوجوان سے جو اپنی سرو قامتی اور اعضا کی مضبوطی کے لحاظ سے بالکل دیوتا معلوم ہوتا تھا، محبت کرنے لگی ہے۔ اب اس کے دل کو ایک دوسرا خیال ستانے لگا۔ کیا وہ بھی مجھ سے ایسے ہی محبت کرے گا، وہ اوپر نگاہ اٹھا کر کیوں نہیں دیکھتا کہ میری ایک جھلک دیکھ سکے۔ شاید وہ مجھے

بدصورت اور نحیف و نزار باور کرتا ہے۔ شاید وہ بھی اُس لڑکی سے شادی کرنا پسند نہیں کرتا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُسے کیسا تعجب ہوگا جب شادی کی رات کو، وہ میرے چہرہ سے آنچل اٹھائے گا اور دیکھے گا کہ اس کی دولھن کیسی حسین ہے۔

تارا، اپنے خیالات میں اسی طرح دیر تک محو رہی اور پھر کروٹ لے کر، اس طرح لیٹ گئی گویا وہ سونے والی ہے۔

اُس شام کو، نیری، سوداگر رنجیت کا اکلوتا بیٹا، حسب معمول گھر واپس جا رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کے خیال میں منہمک تھا۔ جس سے یونیورسٹی میں اسے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور جسے اب وہ، اپنی شادی کا زمانہ نزدیک آتا دیکھ کر، بھول جانا چاہتا تھا لیکن نہ بھول سکتا تھا۔ وہ انھیں خیالات کی کشمکش میں منہمک تھا کہ ایک سُرخ پھول، اس کی نگاہ کے سامنے سے گذرتا ہوا، اس کے قدموں کے نزدیک گرا۔ نیری نے متعجب ہو کر اُسے اٹھایا اور اس برآمدہ کی طرف نگاہ ڈالی جہاں سے پھول آسکتا تھا۔ حیرت و استعجاب سے اس کی نگاہ اس تصویر پر جم کر رہ گئی جو اس نے وہاں دیکھی۔

دو سیاہ خوبصورت آنکھیں اس کو دیکھ رہی تھیں۔ بال، رات کی طرح سیاہ۔ گورے چہرہ کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ اور باریک سُرخ لبوں سے، تبسم اُبلا پڑتا تھا۔

ایک گلاب کا پھول اس کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا پیکر انسانی میں اوپر،

آن کی آن میں، یہ تصویر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے حواس درست کر کے وہاں سے روانہ ہوتا۔ چہار دیواری سے ایک دریچہ کھلا۔ ایک ہاتھ باہر نکلا اور اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ نیری بیتابانہ اندر داخل ہوا اور کواڑ اندر سے بند کر لئے۔

اس کا مقابلہ، ایک بار پھر، اسی سے ہوا جسے وہ برآمدہ میں دیکھ چکا تھا۔ یہاں وہ، اُسے اور زیادہ حسین نظر آئی۔ ایک نازک اندام گورے رنگ کی حسین لڑکی جس کا جسم ساری میں لپٹا ہوا تھا اور بال بکھر لہرا رہے تھے۔ نیری، بیتابانہ آگے بڑھا۔ لڑکی نے، محبت کی چنگاری، اس کی آنکھوں میں دیکھی اور خوش ہوکر پیچھے ہٹ گئی۔ پھر مسرت سے ہنستے ہوئے اس نے کہا "نیری، رنجیت کے بیٹے، اگر تجھ میں ہمت ہے تو مجھے پکڑ لے" اور یہ کہکر تیتری کی طرح ادھر ادھر بھاگنا شروع کیا۔

نیری کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک پیدا ہوئی اور وہ اپنی یونیورسٹی کی محبوبہ کو، بھی بھول گیا۔ وہ

اسی سفید تیتری کے تعاقب میں، وارفتگی کے ساتھ دوڑنے لگا۔ مسرور بچوں کی طرح دونوں دوڑتے رہے۔ تارا، اسے کاوے دیتی رہی، درختوں، گلاب کی جھاڑیوں، پھولوں کے کنجوں کے درمیان سے ہو کر وہ گزرتے رہے اور جب نیری اس کے پکڑنے میں کامیاب نہ ہوا تو تارا نے ہنسنا شروع کیا۔ اس کی ہنسی سے نیری نے اپنی کوششوں کو دوچند کر دیا اور آخر کار ——— تارا، نیری کی آغوش میں، سختی کے ساتھ گرفتار ہو گئی اور جب تارا نے جس کا چہرہ، دوڑنے کی وجہ سے تمتما رہا تھا، نیری کو، اپنے لبوں پر، مہر محبت ثبت کرنے کی اجازت دی تو دونوں خوب ہنسے۔ لیکن جب نیری نے اُسے دوبارہ پیار کرنے کی کوشش کی تو اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔ نہیں۔ اب تمھیں میرے باپ کے آنے سے پہلے بھاگ جانا چاہیئے۔" نیری نے جواب دیا۔ لیکن، اے حسینہ، جب تک مجھے تیرا نام نہ معلوم ہو میں تجھے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔" تارا بل کھا کر اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی اور دور کھڑی ہو کر اسے چڑھانے لگی۔ "اے نیری، میں تیری منگیتر تارا ہوں۔ وہی دُبلی، بدصورت دولھن جس کی تجھے تمنا ہے"

اس احساس سے کہ میری منگیتر، یہی حسین دوشیزہ ہے۔ نیری کی رگوں میں خون نہایت تیزی سے دوڑنے لگا۔

تارا نے اسے ستانا شروع کیا اور پوچھا "کیوں۔ نیری، سچ بتا، کیا میں واقعی ایسی بدصورت ہوں کہ تیری بیوی بننے کی اہلیت نہیں رکھتی"

نیری نے پُرمسرت آواز سے کہا "تارا، میرے پاس یہاں آؤ۔" لیکن تارا پھر پر لگا کر اُڑ گئی۔ اور اس غیر متوقع ہنگامہ سے جس نے اس کی پُرسکون زندگی میں ایک شعریت پیدا کر کے، گزشتہ ایام کی بے کیف یکسانیت کی تلافی کر دی تھی، پوری طرح لطف اندوز ہوتی رہی۔ البتہ دروازہ کے قریب، اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دیا۔ اور ایک مختصر بوسہ کے بعد نیری وہاں سے باہر نکل آیا۔

تارا خوش خوش اُس جگہ سے مُڑی اور دوڑ کر مکان کے اندر جانا ہی چاہتی تھی کہ اس کا باپ، سامنے والے پیپل کے پیچھے سے قدم بڑھا کر سامنے آ گیا۔ ایک نگاہ ڈالتے ہی تارا کو معلوم ہو گیا کہ اس کا باپ تمام راز سے واقف ہو گیا ہے۔ اب اس کی نگاہیں نیچی تھیں اور ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور اپنے باپ کے بولنے کی منتظر تھی کیونکہ کوئی راجپوت لڑکی بلا اپنے باپ کے ایما کے لبوں کو جنبش نہیں دے سکتی۔

لیکن تارا اتنی خوفزدہ نہ تھی جتنا اسے ہونا چاہیئے تھا۔ وہ خوف زدہ کیوں ہوتی جب کہ اس کا دل

نغموں سے معمور تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس کے باپ کو اس سے ذرا بھی الفت ہے تو وہ ضرور تمام معاملہ کو سمجھ جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہمدردی کرے گا۔

ایک مختصر آواز نے اسی خاموشی کو توڑا۔ "تارا۔ میری طرف دیکھو" تارا نے نگاہ اٹھائی اور اپنے اُن قہر آلود آنکھوں میں جن سے وہ دوچار تھی ذرا سا شائبہ ہمدردی اور الفت کا نہ پایا۔

"تارا، یہ تو نے کیا کیا؟ کیا مینا، سٹھیا گئی ہے کہ اُس نے تجھے اس طرح ذلیل ہونے کی اجازت دیدی۔" پھر آواز میں غصہ کی سرد مہری پیدا کر کے اس نے جواب طلب انداز میں کہا۔ "لڑکی۔ یہ تیرا عاشق کون تھا۔"

"ابا۔ یہ تو میرا منگیتر نیری تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں اُس سے۔ ابا مجھے معاف کرو ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا"

اُس نے بات کاٹ کر کہا "گناہ نہیں کیا۔ یہ گناہ کم ہے جو تو کر چکی ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی۔ کیا تو نہیں جانتی........"

"لیکن، ابا، وہ تو مجھ سے محبت کرتے ہیں——"

"بس خاموش! محبت۔ محبت کس چیز کا نام ہے؟ ایک شریف لڑکی کو محبت سے واسطہ؟ شریفوں کے دل میں محبت نہیں ہوتی بلکہ ان کا دل احساس فرض اور وفاداری سے معمور ہوتا ہے۔ ماں باپ اور شوہر کی خدمت و اطاعت تیرا شعار ہونا چاہیئے تھا۔ تو نے مجھے ذلیل کر دیا...... تو کہتی ہے نیری کو تجھ سے محبت ہے۔ لیکن کیا تو سمجھتی ہے کہ میں تجھے اس بات کی اجازت دوں گا کہ تو اپنے منگیتر کو بھی میری طرح ذلیل و رسوا کرے۔ یہ ناممکن ہے۔ اپنے کمرے میں جا اور میرے حکم کا انتظار کر جو میں تیری دایہ کی زبانی تجھ تک پہونچا دوں گا"

تارا نے کانپتے ہوئے، لیکن اس بات سے خوش ہو کر کہ اس آفت ناگہاں سے جلد چھٹکارا ملا، نہایت ادب سے سر جھکایا اور اپنے باپ کے سامنے سے چلی گئی۔ اس کے باپ کو اس سے کوئی محبت نہ تھی۔ اس کی نسبت، بچپن میں، نیری کے ساتھ، صرف اس لئے کی گئی تھی کہ نیری کے معزز خاندان سے رشتہ قائم ہو جائے۔ دستور کے مطابق، نیری اپنی منگیتر کو صرف شادی کی رات کو ہی دیکھ سکتا تھا اس سے پہلے ہرگز نہیں۔

تارا کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ اپنی خیالی دنیا کی رنگین فضاؤں سے، اصلی دنیا کی تلخ حقیقتوں کی طرف یک لخت، منتقل ہونا نہیں چاہتی تھی اور مشترک جذبات کے ساتھ، مینا کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ مینا،

بڑے انتظار کے بعد آخر کار آئی۔ لیکن جب اس نے تارا کو اپنی آغوش میں لے کر اس کے باپ کے احکام سنائے
تو اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ تھیں۔ حکم یہ تھا کہ تارا، اسی وقت، اپنی جوانی کے انتہائی نکھار کے
زمانہ میں، مندر کی خدمت پر مامور ہو جائے اور ایک قدیم رواج کی خلاف ورزی کی پاداش میں، اپنی
بقیہ زندگی کے تمام ایام تپشیا میں بسر کر دے۔

تارا کی آنکھیں حیرت و رنج سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "یہ کبھی سچ نہیں ہو سکتا۔ میرا باپ محض ایک
رواج کی پابندی کے لئے مجھ پر ایسا ظلم ہرگز نہیں کر سکتا۔ اپنے منگیتر سے محبت کرنے میں کون سی ذلت
ہے۔ میرا باپ اس بات کو کیوں معیوب خیال کرتا ہے۔ نیری مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں اس کی
محبت کا راز برملا کہہ چکی ہیں۔ نیری ایک بیہودہ رسم کے ٹوٹ جانے کی بنا پر مجھ سے کبھی ناراض نہ ہوگا۔ پھر
میرے باپ کو اس کا کیوں اس قدر خیال ہے۔ میری شادی نیری کے ساتھ ہو رہی ہے۔ ان کے ساتھ
نہیں ہو رہی ہے۔ انھیں کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ میری مسرتیں مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھین لیں۔ اور
مجھے مندر کی سنگین دیواروں میں پابند رہنے کے لئے مجبور کریں۔ میں گھر سے بھاگ جاؤں گی اور.......
...... اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھوں میں اضطراب اور بے چینی سے روشنی پیدا ہو گئی اور مینا کو خوب
جھنجھوڑ کر، اس نے اس کے آنسو خشک کئے اور پھر بھاگ نکلنے کے متعلق سازشیں ہونے لگیں۔ طے یہ پایا
کہ نیری کو تارا کی پوری حالت سے مطلع کیا جائے اور اس کے مشورہ سے بھاگ نکلنے کی تدبیر کی جائے۔

شام کسی نہ کسی طرح گذر گئی۔ لیکن تارا برابر مینا کی آمد اور نیری کے پیغام کا انتظار کرتی رہی۔ کہیں ایسا
تو نہیں ہوا کہ مینا غریب پکڑی گئی ہو۔ اس خیال پر، تارا کو ہنسی آئی اور دل میں سوچنے لگی کہ میرا باپ جب اس
بغاوت کا حال سنے گا تو بے ہوش ہو جائیگا۔ مینا، آخر کار، دبے پاؤں واپس آئی اور تارا نے اطمینان کا سانس
لیا۔ لیکن مینا اسقدر بدحواس تھی کہ اس سے بات کا صحیح پتہ ملنے میں بھی کچھ وقت صرف ہوا۔ تدبیر یہ طے پائی
تھی کہ کل، دن نکلنے سے تین گھڑی پیشتر، نیری، پھلوں کے باغ میں تارا کا انتظار کرے گا اور پھر دونوں
نیری کے چچا کے یہاں بھاگ جائیں گے۔ جہاں ان کی شادی ہو جائے گی۔

تارا نے مینا کو مسرت کے عالم میں، سینے سے لپٹا لیا۔ اور اُسے پیار کر کے کہنے لگی۔ "اے مینا، دیکھ تو
کیسے اچنبھے کی بات ہو گی۔ ایک راجپوت لڑکی کو کسی نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کرتے بھی سنا ہے۔

تین بج چکے ہیں۔ رات خاموش اور سرد ہے۔ چاند کی روشنی زرد اور پھیکی ہو چکی ہے۔ تارا آہستگی سے

اپنے مکان سے نکلتی ہے۔ اس کی سپید ساری پر ایک سیاہ چادر لپٹی ہوئی ہے۔ اس کا دل مسرور ہے اور اس کے قدم ہلکے اٹھ رہے ہیں۔ اسے امید ہے کہ وہ بہت جلد آزاد ہو جائے گی۔ اور محبت و احساس فرض میں اس کے لئے کوئی امتیاز باقی نہ رہے گا۔ اور وہ اپنے شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری رسمی مجبوری اور بے چارگی کے ساتھ نہیں بلکہ قلبی لذت و مسرت کے ساتھ کرے گی۔ اسے اسقدر خوشی تھی کہ وہ گانا اور زور سے ہنسنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے پاؤں کی چاپ اسے محتاط رہنے کے لئے خبردار کر رہی تھی۔ اب وہ پھلوں کے باغ میں، لانبی گھاس کے کنارے سے ہو کر گذر رہی تھی۔ آدھا راستہ طے ہو چکا تھا کہ اسے ایک سایہ سا راستہ سے گذرتا ہوا معلوم ہوا اُس کے ذہن نے کہا کچھ نہیں کوئی ٹہنی ہل رہی ہے۔ لیکن خوف و ہراس سے اسے بھوتوں کی موجودگی کا وہم ہونے لگا۔ اور غیر ارادی طریقہ پر اسکی رفتار میں تیزی پیدا ہو گئی۔ ایک ٹہنی کے ٹوٹنے سے وہ اور بھی خوفزدہ ہوئی اور دوڑنے لگی۔ بدحواسی میں، ایک بیل سے اس کا پاؤں الجھا اور وہ گر گئی۔ کوئی چیز اُسے اپنے نیچے رینگتی معلوم ہوئی اور پھر ایک پھنکار سی سنائی دی اور سانپ کے پھن جیسی کسی چیز نے اس کی کلائی میں ایک ہلکی سی ضرب لگائی اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

تارا نے عین اُسی وقت، اپنے منگیتر کو سامنے کھڑا ہوا دیکھا اور وہ اسی بات کے احساس سے قاصر رہی کہ یہ ہوا کیا۔ اُسے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ وہ اس کی طرف دوڑی اور بہت جلد اس کے بازوؤں کی گرفت میں پہونچ گئی۔ جب نیری نے اس کی کلائی کو پکڑا تو وہ ذرا جھجکی۔ لیکن دونوں کو اس بات کا قطعی احساس نہیں ہوا کیونکہ دن کے واقعات کے اعادہ سے دونوں ہنسی کے مارے بیتاب تھے۔ اس وقت ہنسنا کیا سہل معلوم ہو رہا تھا۔ سخت گیر باپ، احساس فرایض، رسم و رواج کی زنجیریں اور مندروں کی سنگین دیواریں سب لغو اور نگاہ سے اوجھل تھیں۔

تھوڑے عرصہ کے بعد، نیری نے تارا کے چہرے پر اضمحلال کے آثار دیکھنا شروع کئے۔ لیکن تارا نے ہنسکر ان علامات کو مٹانے کی کوشش کی اور گھاس پر گرنے کا واقعہ بیان کیا۔ جب نیری نے اس کی کلائی کو دبایا تو بھی غیر ارادی طور پر وہ جھجکی۔ اس مرتبہ نیری نے دیکھ لیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ مجھے زخم دکھلاؤ۔ لیکن وہاں زخم نہ تھا، ہتیلی کے اوپر صرف دو بدنما نشان بنے ہوئے تھے۔

اُس نے گھبراہٹ سے پوچھا۔ "تارا۔ تجھے گرے ہوئے کتنی دیر ہوئی۔ کیا کسی چیز نے تجھے کاٹا تھا۔"

"کیوں۔ نہیں تو۔" اس نے جواب دینا شروع کیا۔ لیکن پھر پھنکار اور اپنے نیچے کسی چیز کا رینگنا اُسے یاد آ گیا۔ نیری کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جب اس نے پورا قصہ سنا اور ایک سخت خوف اس پر طاری ہو گیا۔

اس کے بیان سے سانپ کا کاٹنا ثابت ہوتا تھا۔ لیکن زہر شرائین میں سرایت کر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ

اُس کے اثرات چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے۔ اس کے پاس اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اس خوفناک حقیقت کو جہاں تک ہو سکے تارا سے پوشیدہ رکھے۔ اسنے اپنے رومال سے اس کی کلائی کو باندہ دیا اور دُکھتے ہوئے اور بے قرار دل کے ساتھ اس نے کوشش کی کہ اپنی نگاہوں سے کسی تکلیف کا اظہار نہ ہونے دے۔ لیکن تارا سب سمجھ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف دہراس سے پھیل گئیں۔ "نیری۔ پھن والی چیز سا ...... سانپ تھی! آہ۔ خدا کے لئے انکار نہ کرو۔ لیکن۔ نیری۔ کیا۔ کیا میں مرجاؤں گی۔"

"نہیں۔ نہیں۔ میری جان" اُس نے چلا کر کہا اور اپنے سینے سے دبا کر لپٹا لیا۔ اس نے سوچا کہ دیوتا ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ اب وہ نہیں مر سکتی۔ میں نے اس کے نازک گلاب جیسے وجود کو اپنے دل پر نقش کر لیا ہے۔ ابھی ایک لمحہ ہوا، مسرور و شاداں، زندگی اور صحت سے معمور؛ وہ میرے بازوؤں کی گرفت میں آ چکی ہے اب۔ موت ....

تارا نے بیتابی اور بے صبری سے لپٹے ہوئے کہا "نیری۔ مجھے اپنے بازوؤں کی گرفت میں مضبوطی سے پکڑے رہو اور میں بہادری سے مقابلہ کی کوشش کروں گی۔ کیونکہ تیری معیت میں یہ تکلیف بھی بے حقیقت ہے۔"

جب ایک چیخ اس کے لبوں سے نکلی اور اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا، تو نیری کو اس کی محبت نے بتایا کہ اسے اس وقت کیا کرنا چاہیے۔ اس نے تارا کو اپنے دل سے لگائے رکھا اور تسکین دیتا رہا۔ کیونکہ اس کی زندگی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔

نیری نے اُسے پیار کیا اور آہستہ آہستہ کہا "اے تارا، تجھے ایک دفعہ پالینے کے بعد، چھوڑ دینا بڑی سخت اذیت ہے ...."

جوں جوں وقت گزرتا گیا، مہلک زہر آہستہ آہستہ دل کی طرف بڑھتا رہا۔ کوشش کے ساتھ تارا نے نگاہ اٹھا کر اس کو دیکھا۔ ایک غیر فانی محبت تارا کی آنکھوں میں ضوفگن تھی اور نیری کی آنکھیں بھی اس محبت کا جواب ویسی ہی پاک اور ابدی محبت سے دے رہی تھیں۔

وہ جھکا اور اس نے اس کے لبوں کو بوسہ دیا۔ اس کے بازوؤں کی گرفت میں اس حسین دوشیزۂ گلاب نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ جس حسن و نزاکت کے ساتھ نیری کی زندگی میں وہ داخل ہوئی تھی اس حسن و نزاکت کے ساتھ اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر کے رخصت ہو گئی۔

(ترجمہ از السٹریٹڈ ویکلی)

محمد عاقل ایم۔ اے (علیگ)

جنم اشٹمی کی تقریب میں

اڈیٹر نگار کی تقریر

جناب صدر و حاضرین جلسہ ——

گزشتہ سات سال قیام لکھنؤ کے زمانہ میں میرے لئے یہ بالکل پہلی فرصت ہے کہ مجھے کسی مجمع میں زبانی اظہار خیال کا موقعہ ملا ہو اور مجمع بھی کافروں کا ——— معاف فرمائیے یہاں میں نے لفظ کافر منکر و ملحد کے معنی میں استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ اس مفہوم میں استعمال کیا ہے جو دنیائے شعر و محبت میں نہایت ہی عزیز و محبوب ہستی کے لئے مستعمل ہوتا ہے اور باور کیجئے کہ ہندو جماعت بعض اعتبارات سے مجھے صد درجہ عزیز و محبوب ہے۔

بہرحال میرے لئے بڑی مسرت کی بات ہے کہ آج میں آپ حضرات کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں اور ایسے تہوار کی تقریب میں جو ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس ایک مقدس رات کی یادگار میں جب ایک برگزیدہ ہستی نے عالم وجود میں آکر حیات انسانی کے بہت سے نئے اوراق پلٹ کر رکھدئے

افسوس ہے کہ صرف کل شام کو مجھے یہاں حاضری کی دعوت دی گئی اور مجھے بالکل موقعہ نہیں ملا کہ میں اس مہتم بالشان تقریب کے لئے کوئی قابل ذکر خدمت انجام دے سکتا، تاہم تعمیل ارشاد میں حاضر ہو گیا ہوں اور اپنی پریشان خیالی پر اظہار معذرت کرتا ہوں۔

حضرات، میں ایک زمانہ سے مذاہب عالم کا مطالعہ کر رہا ہوں اور جنھوں نے نگار کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ اپنی آزاد خیالی کے بدولت مجھ پر کیسے کیسے سخت حملے ہوئے اور ہو رہے ہیں، لیکن میں یہ کہنے سے کبھی باز نہیں رہ سکتا کہ مطالعہ مذاہب کے سلسلہ میں، جس نتیجہ پر میں پہونچا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ یا تو مذاہب سب کے سب لغو و مہمل ہیں یا سب کے سب سچے ہیں۔ وہ اس لحاظ سے کہ دنیا میں کوئی خونریزی و خوں آشامی ایسی نہیں ہوئی جس میں مذہب کا ہاتھ نہ رہا ہو اور یہ اس حیثیت سے کہ جب ہم ان کی تعلیمات کو دیکھتے ہیں

تو ان کی سچائی سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔

دنیا میں مذہب کے ہمیشہ دو پہلو رہے ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق عقائد سے ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو اعمال سے وابستہ ہوتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ ایک کا نام "فلسفۂ مذہب" ہے اور دوسرے کا معاشرت و تمدن۔ پھر یہ تو اکثر ہوا کہ کسی قوم نے ان میں سے کسی ایک پہلو کو لے لیا اور معراج ترقی تک پہونچا دیا، لیکن ایسا کمتر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی جماعت کے دونوں پہلو مکمل رہے ہوں اور غالباً یہ کہنا خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ ہندوؤں کی جماعت میں بہت کچھ اس تکمیل کی صلاحیت پائی جاتی ہے، کیونکہ اگر ایک طرف انکا فلسفہ ویدانت، اپنی جگہ فلسفۂ مذہب پر آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے تو دوسری طرف کاروبار حیات میں ان کی تقسیم عمل کامیابی کا بڑا راز ہے۔

آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ ہندو کوئی مذہب نہیں ہے۔ بلکہ یہ لفظ ایرانی الاصل ہے۔ قدیم اہل ایران دریائے سندھو کو دریائے ہندھو کہا کرتے تھے اور بعد کو ادھر کے رہنے والوں کو بھی اسی لفظ سے پکارنے لگے یہ تو خیر لغوی تحقیق ہوئی مگر میں تو حقیقت کے لحاظ سے بھی یہی کہتا ہوں کہ ہندو اصطلاحی معنے میں کوئی مذہب نہیں ہے۔ بلکہ سوسائٹی کا ایک نظام ہے، دنیاوی کاروبار میں تقسیم عمل کا ایک طریقہ ہے اور آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کا دستور۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مذہب میں نہ کبھی کسی شخص پر کفر و الحاد کا فتوے لگا کر اسے مذہب سے خارج کیا جا سکتا ہے اور نہ اصولاً آپ انکار کر سکتے ہیں اگر کوئی اور شخص آپ کی جماعت میں شامل ہونا چاہے، لیکن معاف فرمائیے اگر میں کہوں کہ جس طرح دنیا کی اور تمام قوموں نے اپنے اصول حیات و معاشرت کو بھلا دیا، اسی طرح آپ نے بھی اسے بھلا دیا۔ اور آج ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی بارہا بھلایا اور جب بھلایا کوئی نہ کوئی شخص آپ میں ضرور ایسا رونما ہوا جس نے اس بھولے ہوئے سبق کی یاد دلائی۔ پھر کیا آپ کو یا کسی اور کو اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ جب بدی آٹھ بھدرا کو کرشن جی مہاراج عالم وجود میں آئے تو یہ زمانہ وہ نہ تھا جب آپ اپنی زندگی کے اصل مقصد کو بھلا چکے تھے۔ اور کیا ضرورت نہ تھی کہ کوئی ریفارمر یا مصلح اس وقت پیدا ہوتا اور آواز حق بلند کرتا ؟

پھر اس وقت ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ وہ رام چندر جی کی طرح چھتری جماعت کے ہیرو بنکر مہابھارت میں پانڈوں کے دست راست تھے، یا بھگوت گیتا کے بیان کے مطابق وشنو کے اوتار، نہ ہم کو اس تحقیق کی حاجت ہے کہ وشنو پران کی روایات کے مطابق متھرا میں رادھا اور گوپیوں کے ساتھ ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ کس ریاضت میں بسر ہوا یا اپنی حیات کے آخری لمحے دوارکا میں کس طرح گزارے، بلکہ دیکھنا صرف یہ ہے کہ جس چیز کا انھوں نے درس دیا، جس بات کی انھوں نے تعلیم دی وہ کیا تھی اور کیسی تھی۔ پھر

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بھکتی سے بہتر تعلیم، فلسفۂ اخلاق و تصوف کی کوئی اور ہو سکتی ہے؟
روحانی صداقت، اخلاقی پاکیزگی، داستان محبت، پیام آزادی، باطل کا مقابلہ، حق کی حمایت، اگر آپ ان تمام باتوں کو دنیا کی کسی شاعری میں یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو بھگوت گیتا پڑھیے اور عالم سے بے نیاز ہو جائیے۔
افسوس ہے کہ میں اس زبان سے واقف نہیں جس میں بھگوت گیتا کا مطالعہ کرنا چاہیے لیکن جس حد تک ترجموں سے استفادہ کا تعلق ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھ پر کم کسی کتاب کا اتنا اثر ہوتا ہے جتنا بھگوت گیتا کا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے کا سینہ جذبات کے طوفان سے لبریز ہے اور انسانی زبان اس کو ظاہر کرنے سے عاجز ہے لیکن وہ لوگ جو صرف الفاظ کے پیرو نہیں ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو سیلاب ان محدود لفظوں میں نہیں آسکا، جو سمندر اس کوزہ میں نہیں سما سکا ہے اس کی حقیقت کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟
آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ جب پندرھویں صدی کے اخیر میں ولبھ نے راجپوتانہ و گجرات میں اور ایک دوسرے مہاتمائے بنگال میں وشنوئی ریفارمر کی حیثیت سے تعلیمات بھگوت گیتا کو از سر نو زندہ کرنا چاہا اور پھر انیسویں صدی میں سوامی نارائن جی مہاراج نے اس تحریک میں اور زیادہ قوت پیدا کرنا چاہی، تو دفعۃً لوگوں کے خیالات میں کیا انقلاب برپا ہوا اور کس طرح لوگ جوق در جوق اسی تحریک کی طرف کھنچکر آنے لگے ——— مگر میں پوچھتا ہوں کہ آج جبکہ شمالی ہند میں بہت بڑی جماعت پرستاران کرشن کی موجود ہے، بھگوت گیتا کی کس تعلیم پر عمل کیا جا رہا ہے اور آپ نے ہندوستان کے اس پیغمبر اعظم کی بتائی ہوئی راہوں پر چلنے کی کس حد تک کوشش کی ہے۔
آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بھگوت گیتا کی اصل روح تمام دنیا کے انسانوں کو بھائی سمجھنا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ شاید اس مجمع میں اس وقت بھی بہت سے ہندو بھائی ایسے ہوں گے جو مسلمان کا تو خیر ذکر ہی کیا، خود اپنی ہی جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہ کھائیں گے۔ افسوس ہے آپ لوگ انسان کو صرف اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس کے سر پر چوٹی ہے یا نہیں، وہ دھوتی پہنتا ہے یا پاجامہ اس کے سر پر ترکی ٹوپی ہے یا فلٹ کیپ، حالانکہ انسان نام ظاہری وضع قطع کا نہیں بلکہ اس کے بطون کا ہے، اس کے دل کا ہے جس میں سما جانے کے لئے خدا کوئی تفریق نہیں کرتا ——— اگر آپ لوگ اس حقیقت کو سمجھ جائیں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے مذہب سے زیادہ امن پسند و صلح کل مذہب کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔
معاف فرمائیے اگر میں کہوں کہ آپ بھی دوسرے مذہب والوں کی طرح اپنے مذہب سے بہت دور ہو گئے ہیں اور جو تعصب ان میں پایا جاتا ہے وہی آپ میں بھی ہے

در میان کافراں ہم بودہ ام
یک کمر شایستۂ زنار نیست

یوروپ میں ویسالیوس کے زمانہ تک جو لوگ علم تشریح الاعضا سیکھتے تھے وہ بجائے اس کے کہ خود کسی لاش کو چیر پھاڑ کر اعضا کی تشریح سیکھیں، صرف حکیم جالینوس کی کتابیں پڑھ کر علم تشریح سیکھا کرتے تھے۔ عملی طور پر اگر تعلیم ہوتی بھی تھی تو وہ صرف ادنیٰ قسم کے جانوروں کی لاشوں پر اور اس کام کے لئے خنزیر کو خاص طور پر منتخب کیا جاتا تھا۔ علم تشریح کا درس دیتے ہوئے پروفیسر جالینوس اور بوعلی سینا کی کتابیں کھول کر پڑھتا جاتا تھا اور اس کا مددگار ایک لانبی جریب ہاتھ میں لے کر لاش کے مختلف اعضا کی طرف اشارہ کر کے بتاتا جاتا تھا۔ ویسالیوس اس طریقہ کا ہمیشہ سخت مخالف رہا اور اکثر شکایت کیا کرتا تھا کہ اس کا اُستاد جنٹرلیس اپنے چاقو سے قلم تراشی کے سوائے کوئی کام نہیں لیتا۔

الغرض لاشوں کی چیر پھاڑ کر کے تشریح اعضا معلوم کرنے کے لوگ سخت مخالف تھے۔ اور اب ماہرین طب اپنی معلومات کو مکمل کرنے کا کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کرتے۔ اور یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ پوسٹ مارٹم کے سوا دنیا میں کوئی طریقہ ایسا نہیں جس سے طبی معلومات میں مزید اضافہ ہوسکے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں اب صرف یہ مرحلہ طے کرنا باقی رہ گیا ہے کہ بیماریوں کے اسباب کے رد کرنے کا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ تحقیقات کرنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض صورتوں میں جن اسباب کے ماتحت موت واقع ہوئی وہ ہرگز رونما نہ ہوتے اگر تقدم بالحفظ پر عمل کیا جاتا اور اسی زمانہ سے علم طب انسدادیہ (Preventive Medicine) کو ترقی ہونا شروع ہو گئی۔

ابھی کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ انسان نے نظریۂ جراثیم اختراع کیا۔ جسے اب دنیا نے پوری طرح تسلیم کر لیا ہے۔ موسیو پاسٹیور نے علم طب میں جو شاندار کارنامہ انجام دیا اس سے بلاخوف تردید اب یہ نظریہ قائم ہو گیا ہے کہ بہت سے امراض جن کے اسباب و علل اس وقت تک پردۂ خفا میں تھے، درحقیقت بعض نہایت باریک خوردبینی جراثیم کے جسم میں داخل ہو جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور انھیں جراثیم کی وجہ سے موت واقع ہوتی ہے۔ اور اب طب انسدادیہ ترقی کرتے کرتے اسقدر کامیاب ہو گیا ہے کہ جو موذی اور متعدی امراض کچھ عرصہ پیشتر عالم انسانی میں تہلکہ ڈال دیتے تھے ان کو بڑی حد تک قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان انسدادی تدابیر کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بچوں کی تعداد اموات میں کمی ہو گئی۔ اور اس طرح گویا انسان کی زندگی کے اوسط طول میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

جوں جوں حیوانات کے مدارج حیات بلند ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی وہ قوت تجدید شباب (Rejuvenation) بھی زائل ہوتی جاتی ہے جو بعض ادنیٰ قسم کے جانداروں میں پائی جاتی ہے۔

یعنی جب حیوان منازل ارتقا طے کرتے کرتے انسان کے درجہ تک پہونچ جاتا ہے تو اس کی وہ قوت تجدید قطعی زائل ہو جاتی ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنا کوئی ضائع شدہ حصّہ پھر پیدا کر لیا کرتا تھا۔

چنانچہ کینچوے کی قسم کے جانور (Unicellular organism) جو ارتقاء جسمانی کے لحاظ ادنیٰ میں ہیں وہ اس لحاظ سے قطعی "لافانی" ہیں کہ ان کو فطری طور پر موت لاحق نہیں ہوتی۔ اگر ماحول موافق حال ہو تو فارامیسیم (paramecium.) یعنی پانی اور دیگر سیال چیزوں میں پائے جانے والے نہایت باریک خوردبینی کیڑے) کی ساڑھے آٹھ ہزار پشتیں یوں ہی گزر جاتی ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ان حیوانات کی جو نسلیں یکے بعد دیگرے ارتقائی حالت میں پیدا ہوتی ہیں ان میں جس قسم کی ترقی نہیں ہوتی۔ الغرض جوں جوں حیوانات کی زندگی زیادہ ترقی یافتہ ہوتی جاتی ہے اور ان کے مختلف اعضاء و جوارح کے افعال مخصوص ہوتے جاتے ہیں۔ اس کی قوت تجدید بھی زائل ہوتی جاتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بعض قسم کے رینگنے والے کیڑوں میں ایسی قوت تجدید حیات ہوتی ہے کہ اگر ان کے جسم کا $\frac{1}{200}$ حصّہ بھی کاٹ دیا جائے تو وہ نشو و نما پاکر پورا کیڑا بن جائے گا۔ اور یہ نئے کیڑے پرانے کیڑے سے جس کے جسم کا ٹکڑا لیا گیا تھا زیادہ تیز ہوتے ہیں۔

اس وقت باوجود اس یقین کے کہ کسی نہ کسی دن موت کا آنا ضرور ہے، انسان اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ موت کا وقت جس قدر ملتوی ہو سکے غنیمت ہے۔

زندگی اور موت کا درمیانی وقفہ ایسا نہیں جو ہر شخص زندگی میں طے ہو جائے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سانس بند ہو جانے کے بعد یا ڈیڑھ گھنٹہ تک قلب کی حرکت جاری رہتی ہے۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں۔ کہ بعض اعضاء کے خلایا (cells) موت طاری ہونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اگر ان خلایا کو مناسب حالات اور موافق ماحول میں رکھ دیا جائے تو وہ ایک غیر معین مدت تک زندہ رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ شخص یا فرد جس کا ان خلایا سے تعلق تھا کبھی کا مر چکا ہے۔

تحفظ ذات اور خواہش حیات یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جو نوع انسانی کی فطری خصوصیت سمجھی جاتی ہیں۔ اور زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی خواہش کیساتھ یہ تمنا بھی پیدا ہوتی ہے کہ زندگی اچھی طرح بسر ہو۔ کیونکہ اگر انسان کی قوت فکر، اور قوت احساس زائل ہو جائے تو اس کے لئے زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی خواہش بیکار ہے۔ ایسا شخص . . . . ایک ایکٹر ہے۔ جو اپنا پارٹ ختم ہو جانے کے بعد بھی اسٹیج پر فضول کھڑا ہے جب انسان کی ذہنی سرگرمیاں زائل ہو جائیں۔ اس وقت طول حیات کی آرزو قطعی ہیچ ہے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہیئے کہ زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کی جسمانی و دماغی صحت بھی کسی قدر بحال رہے۔

تطویل حیات کی جسقدر فکر انسان کو اس زمانہ میں دامنگیر ہوئی ہے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی - اور جس قدر اس مسئلہ پر انسان کا دماغ آجکل غور کر رہا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا - اب اس پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا جا رہا ہے اور ایسے ایسے لوگ غور کر رہے ہیں جن کے نقطہ ہائے نظر قطعی مختلف ہیں، قومی اور بین الاقوامی جماعتیں بھی اس مدعا کے حصول کے لئے سرگرم ہیں اور حکومتوں کو بھی یہ فکر لاحق ہے کہ اس کی رعایا کیونکر طول حیات حاصل کر سکے متعدی امراض کے انسداد میں محکمۂ صحت عامہ کے کارکن ہر وقت مصروف عمل رہتے ہیں - اور انسداد امراض کی غرض سے سختی کے ساتھ قرنطینے قایم کئے جا رہے ہیں -

مختلف جماعتوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اپنی قوم کے شہریوں کی صحت کا تحفظ کیا جائے - اور کوئی سیاسی جماعت اس وقت تک برسر اقتدار نہیں رہ سکتی - جب تک وہ اپنے شہریوں کے لئے عمدہ پانی کی بہم رسانی، صفائی کی مناسب تدابیر، قواعد حفظان صحت کے مطابق سامان خورد و نوش کی فراہمی اور متعدی امراض کے انسداد کی تدابیر عمل میں لانے کا فرض اپنے ذمہ نہ لے -

---

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسان زمانۂ قدیم میں زیادہ عرصہ تک زندہ رہتا تھا - اور اب اس کی عمر گھٹ گئی ہے - اور اس کا ثبوت وہ بائبل سے دیتا ہے - حالانکہ اس سلسلہ میں اوّل تو یہی بات قابل تشریح ہے کہ بائبل میں جو لفظ "سال" استعمال کیا گیا ہے وہ دراصل انھی معنی میں ہے جس سے ہم لوگ آشنا ہیں یا کسی اور معنی میں - اس میں شک نہیں کہ موسیٰؑ اور یعقوبؑ کی عمریں اپنے زمانہ کی اوسط عمروں سے زیادہ طویل ہوئیں - لیکن قدیم مصریوں کے مقابر سے جو پرانی تحریریں برآمد ہوئی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب سے دو ہزار برس پیشتر انسان کی عمر طبعی تیس برس تصور کی جاتی تھی - بچوں اور کمسن لڑکوں میں شرح اموات اب سے کہیں زیادہ تھی - البتہ رومیوں میں انسان کی عمر طبعی کسی قدر زیادہ سمجھی جاتی تھی - مشہور ہے کہ انھیں ڈاکٹروں سے سخت نفرت تھی اور جب یونانی اطبا نے رومۃ الکبریٰ میں آباد ہونا شروع کیا تو رومیوں نے ان کی طرف بہت کم توجہ کی - مورخ پلائنی (Pliny) نے اس بارہ میں لکھا ہے کہ :- "طبابت کا پیشہ اختیار کرنا اہل رومہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے - اور جو معدودے چند طب پڑھتے تھے - وہ درحقیقت یونانی ہو گئے تھے "

انسان کی عمر طبعی کے متعلق سب سے پہلا نقشہ مشہور ماہر فلکیات ہیلی (Halley.) نے تیار کیا تھا - یہ وہی شخص ہے جس کے نام سے ایک دمدار ستارہ مشہور ہے - ہیلی نے اپنے مرتب کردہ نقشہ میں دکھایا تھا کہ شہر برسلا (واقع جرمنی) میں سنہ ۱۶۹۱ء میں انسان کی عمر طبعی پیدائش کے وقت ۳۳ برس شمار کی

جاتی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں انگلستان کے اندر انسان کی عمر طبعی ۹ ۳ برس سمجھی جاتی تھی، لیکن جب سے تمام مہذب و متمدن دنیا میں حفظان صحت کے متعلق عظیم بیداری پیدا ہوئی۔ اس وقت سے انسان کی عمر طبعی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی خواہش کا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ انسان نے تطویل حیات کی تدابیر معلوم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ موت کا ایک دن آنا لازمی ہے۔ لیکن انسان کی خواہش یہی ہے کہ موت کا دن جب تک ملتوی رہے اسی قدر اچھا ہے۔ اور اس میں اس کی کوششیں صرف علمی یا سائنٹفک تدابیر تک ہی محدود نہیں رہیں، بلکہ وقتاً فوقتاً اس کام کے لئے انسان نے نہایت عجیب و غریب بلکہ مضحکہ انگیز تدابیر اختیار کی ہیں۔

دنیا کے مختلف ملکوں میں بڑے بڑے حوصلہ مند اور بہادر لوگ "امرت" کی تلاش میں سرگرداں پھرے آبحیات کی تلاش میں سکندر اعظم نے طبقہ ظلمات کی خاک چھانی۔ یورپ میں پونس ڈیلین چشمۂ حیات کی تلاش میں مارا مارا پھرا۔ الغرض انسان کی خواہش ہر زمانہ میں یہی رہی کہ بیماری، انحطاط، اور موت سے محفوظ رہے۔

ہمارے ہی زمانہ میں انحطاط سے بچنے کے سیکڑوں عجیب و غریب نسخے ایجاد ہوتے ہیں۔ سیکڑوں ترکیبیں قیام صحت اور استقرار شباب کی بیان کی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ غذا پر زور دیا جاتا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ تطویل حیات کا راز خالص نباتاتی غذا میں مضمر ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ فلاں چیز کھائی جائے تو صحت اور زندگی بحال رہتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کھٹی دودھ کا استعمال آبحیات کا کام دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ کہ ایسی چیزیں کھائی جائیں جن میں کسی قدر نشہ بھی ہو۔ اور کوئی کہتا ہے کہ زندگی چاہو تو نشہ آور چیزوں کے پاس نہ جاؤ۔ لیکن لطف یہ ہے کہ جس قدر کسی غیر معمولی چیز کی سفارش کی جاتی ہے اسی قدر لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ غذا کا تعلق تطویل حیات اور قیام صحت سے بہت زیادہ ہے۔ اور اسی سلسلہ میں بہت سے سائنسدانوں نے بعض خاص غذاؤں کی سفارش بھی کی ہے یہ بھی درست ہے کہ بعض کے فقدان کا نتیجہ بیماری ہوتا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض خاص قسم کی چیزوں کا کھانا خاص خاص بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ اب ایک جدید نظریہ قائم ہوا ہے کہ زیادہ تر وہ اغذیہ استعمال کی جائیں جن میں "وٹامین" (Vitamins جوہر حیات) زیادہ ہوں۔

حکیم پلوٹارک نے جو قواعد و ضوابط صحت کے متعلق قائم کئے ہیں ان میں زیادہ غذا پر بحث کی گئی ہے اور اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ انسان کو اپنی صحت قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ سادہ غذا استعمال کرنا چاہئے۔

صحت کے سلسلہ میں دوسری چیز جس پر زیادہ زور دیا گیا ہے وہ "ورزش" ہے - یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ اگر عضلات جسم کی حالت درست رکھنا منظور ہو تو ورزش ضرور کی جائے - اگر روزمرہ کھلی ہوا میں اعتدال کے ساتھ تھوڑی سی ورزش کر لی جایا کرے تو اس سے انسان کی صحت جسمانی درست رہتی ہے - تمدّن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ورزش جسمانی کی بھی ضرورت بڑھتی جاتی ہے - زمانہ قبل از تاریخ کے انسان کی تو یہ حالت تھی کہ وہ خوراک کی تلاش میں سرگرداں پھرتا تھا - اور اس طرح اس کی ورزش کافی ہو جاتی تھی - علاوہ ازیں اس کے لئے یہ بھی لازمی تھا کہ خود کو جنگل کے درندوں یا دشمن قبائل کی تاخت و تاراج سے محفوظ رکھنے کے لئے مضبوط رکھے - اور اس لئے اسے لازمی طور پر ورزش کرنا پڑتی تھی - پھر چونکہ قدیم انسان کے پاس اپنی ٹانگوں کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نقل و حمل نہیں تھا - اس لئے وہ مُلک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام رقبہ پیادہ پا طے کیا کرتا تھا - نہ کوئی راستہ تھا نہ سڑک نہ دریاؤں پر کوئی پل تھا - گرمی اور سردی - بارش اور برف سے اس کی جان عذاب میں رہتی تھی - اور ہمسایہ کے دشمن قبائل جو قتل و غارت کرتے تھے وہ علیحدہ - جو لوگ جسمانی لحاظ سے کمزور یا ناکارہ ہوتے تھے وہ ایسی زندگی کی سختیوں کو ہرگز برداشت نہ کر سکتے تھے - اس لئے وہ طے مراحل اور قطع منازل کرتے کرتے یا تو راستہ پر خود ہی گر پڑتے تھے یا ان کے ساتھی ان کو چھوڑ کر چلے جاتے تھے - الغرض اس وقت صرف وہی لوگ زندہ رہ سکتے تھے جن کے ہاتھ پاؤں طاقتور اور دل مضبوط ہوں - اس زمانہ میں نہ کوئی اسپتال تھا - نہ کوئی خیراتی شفاخانہ یا محتاج خانہ - نہ کمزوروں اور بیماروں کے لئے کوئی جائے پناہ تھی - الغرض جسقدر . . . . . بقائے زندگی کے لئے سامان خورونوش کا ہونا لازمی ہے اسی طرح سے انسان کے لئے ورزش جسمانی بھی ناگزیر چیز ہے - موجودہ تمدن نے زندگی کی راہ میں بہت کچھ سہولتیں پیدا کر دی ہیں - انسان بغیر تکلیف اٹھائے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا جا سکتا ہے - محنت سے بچنے کے صدہا طریقے ایجاد ہو گئے ہیں کہیں بجلی ہے کہیں ٹیلیفون - کہیں تلغراف ہے - کہیں موٹر کار اور کہیں لاسلکی - جن کے ذریعہ سے معمولی آمدنی کا آدمی بھی اپنی زندگی آرام بسر کر سکتا ہے -

الغرض فی زمانہ انسان پر کوئی ایسی محنت نہیں پڑتی جس سے اس کی ورزش جسمانی پوری ہو سکے - اس لئے سخت ضرورت ہے کہ انسان کو ورزش جسمانی کی ترغیب دی جائے - تطویل حیات کے لئے آج کل بیمہ کمپنیاں اسی اصول پر عمل کر رہی ہیں -

جو لوگ اعضا و جوارح کے افعال و فرائض سے واقف ہیں کہ انسان کے جسم میں اگر بعض خاص غدود نشوونما پا جائیں تو صحت پر بہت مفید اثر پڑتا ہے - یہی وجہ ہے کہ آجکل خاص قسم کے غدودوں کے بارہ میں بہت محنت سے تفتیش کی جا رہی ہے - اور تجربوں سے دکھلایا جا رہا ہے کہ اگر انسان کے جسم میں بعض

خاص غدود داخل کر دئے جائیں تو ان کے ذریعہ سے انسان کی عمر بڑھ جاتی ہے ———

کچھ عرصہ سے اس امر پر بھی بہت کچھ غور و خوض کیا جا رہا ہے کہ کسی بیماری کا تعلق والدین یا آباد و اجداد سے کیا ہے۔ اور اگرچہ ابھی اس قسم کی تحقیق و تدقیق کی ابتدا ہے۔ لیکن یہ امر روز بروز واضح ہوتا جاتا ہے۔ کہ انسان کے طول عمر پر جسقدر اثر اس کے آباد اجداد یا والدین کی صحت اور طاقت کا پڑتا ہے اسقدر کسی اور چیز کا نہیں پڑتا۔ اور یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ طویل العمر اسلاف کے اخلاف بھی طویل العمر ہوتے ہیں۔ اور کوتاہ عمر والدین کے بچے بھی عموماً کوتاہ عمر کے ہوتے ہیں

یہ امر مسلم ہے کہ ہر فرد بشر جو دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس کو قدرت کی طرف سے خاص نوعیت کے خلایا خاص مقدار میں عطا ہوتے ہیں۔ بعض صورتوں میں یہ نوعیت ادنیٰ اور بعض صورتوں میں اعلیٰ ہوتی ہیں۔ آجکل زیادہ تر اموات عوارض قلب یا شرائین کی وجہ سے واقع ہوتی ہیں اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو والدین مرض صرع میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے بچوں کے جسم کی رگیں بھی ادنیٰ قسم کی ہوتی ہیں۔

جن لوگوں کی نسبت یہ معلوم ہو چکا ہے کہ انھوں نے اوسط سے زیادہ عمر طبعی پائی ہے ان کی زندگیوں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لوگوں کے سوانح حیات کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالےٰ نے تطویل حیات کا کام جس دیوتا کے سپرد کیا ہے۔ اس کی نظر انتخاب بھی کچھ عجیب و غریب واقع ہوئی ہے۔ جب ہم ان "جوانان صد سالہ" کی سوانح عمریوں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ان کی ولادت اور ابتدائی زندگی کے حالات نہایت مبہم نظر آتے ہیں۔

جب ہم ان لوگوں سے ان کی تطویل زندگی کا راز دریافت کرتے ہیں تو ان کے جوابات اکثر مبہم مغالطہ انگیز بلکہ متضاد و متبائن ہوتے ہیں۔ ایک پیر صد سالہ بیان کرتا ہے کہ اس کے طول حیات کا راز یہ ہے کہ اسنے نہ کبھی تمباکو نوشی کی نہ کبھی مسکرات کا استعمال کیا۔ دوسرا کہتا ہے کہ اس کی طویل زندگی تمباکو کے استعمال اور اعتدال کے ساتھ شراب خواری کی رہین منت ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ وہ عمر بھر برابر گوشت کھاتا رہا۔ دوسرا کہتا ہے کہ اس نے کبھی گوشت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ایک شخص کہتا ہے کہ وہ ہمیشہ برابر روزمرہ ورزش کرتا رہا اور دوسرا کہتا ہے کہ اس نے کبھی اتنی بھی محنت نہیں کی کہ بازار ہی جا کر کوئی چیز خرید لایا ہو۔

ان پیران صد سالہ کی دماغی حالت بھی مختلف دیکھی گئی ہے۔ ایک شخص کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ نہایت سنجیدہ اور متین ہے اس کا حافظہ بھی اچھا ہے اور طبیعت میں بھی سکون ہے۔ دوسرے شخص کو دیکھتے ہیں کہ وہ حد درجہ کا سریع الحس ہے ذرا سی بات پر غضبناک ہو جاتا ہے اور ادنیٰ سی بات پر اس کے جذبات

منتقل ہو جاتے ہیں۔ امریکہ کے پریزیڈنٹ جان ایڈمس (John Adams) نے اکیانوے سال کی عمر پائی تھی۔ مگر وہ اسقدر سریع الغضب تھا کہ ذرا ذرا سی بات میں آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔

اکثر حضرات اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ انسان کی دماغی و ذہنی حالت کا اس کی صحت جسمانی پر بعید اثر پڑتا ہے۔ ہمیں اس نظریہ پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن ہنوز یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچی کہ انسان کی ذہنی قوتیں اس کو کسی بیماری سے محفوظ رکھ سکتی ہیں یا اس کے قویٰ کے انحطاط کو روک سکتی ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ "ہم نے کوئی فلاسفر ایسا نہیں دیکھا جو دانت کے درد سے رو نہ دیا ہو"

بہرحال تطویل حیات اور اس بات کی کوششوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے کہ قوائے انسانی کے قدرتی انحطاط کو روکا جائے۔ تاکہ عمر انسانی میں اضافہ ہو سکے۔

اس مختصر بحث کے بعد جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا امور ہیں جن کا انسان کی عمر پر اثر پڑتا ہے تو سب سے پہلی بات یہ نظر آتی ہے کہ والدین کے قویٰ اور ان کی صحت کو عمدہ ہونا چاہئے تاکہ بچہ کے خلایا بھی اچھے ہوں طویل العمر اسلاف کے اخلاف عموماً طویل العمر ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب اس طرح بچہ کو عمدہ قویٰ حاصل ہو جائیں تو آیندہ زندگی میں اس کو ان قدرتی وسائل سے باحتیاط کام لینا سکھایا جائے۔ آپ کے پاس قلب وجگر اور دیگر اعضائے رئیسہ کی عمدہ قوتوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے۔ کہ خواہ ان طاقتوں کو یک لخت صرف کر دیں یا کفایت شعاری کے ساتھ کام لیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ حفظان صحت کے اصول پر عمل کر کے اپنے ان خداداد قویٰ میں اضافہ کیا جائے۔ کام کاج، کھیل کود، سونے بیٹھنے کے متعلق کوئی ضابطہ مقرر کیا جانا تو محال ہے۔ کیونکہ ہر شخص کو اپنے ماحول اور حالات کردہ پیشہ کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ باتیں ہر شخص کے لئے مختلف ہوتی ہیں۔ جو چیز ایک شخص کو موافق ہوتی ہے وہی چیز دوسرے شخص کو مضر پڑتی ہے۔ اس لئے تمام آدمیوں کے لئے کوئی خاص ضابطہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ چوتھی بات یہ ہے کہ جو شخص اپنی عمر زیادہ کرنا چاہے وہ ہر بات میں اعتدال مدِنظر رکھے" اور نشہ کی چیزوں سے حتی الامکان محترز رہے۔

علم طب اسقدر ترقی کر چکا ہے کہ ہر شخص کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جو امراض ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے ہیں ان سے کس طرح محفوظ رہنا چاہئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک سمجھدار شخص اپنے بچوں کو چیچک، تپ محرقہ، یا سرخ بخار وغیرہ میں مبتلا ہونے سے محفوظ نہ رکھ سکے۔

تاریخی زمانہ میں علم الاغذیہ کو کبھی اسقدر ترقی نصیب نہ ہوئی تھی جسقدر کہ اس زمانہ میں ہو چکی ہے۔ اس لئے ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ واقفیت رکھے۔

اب معاملہ رہ گیا خصوصیات خاندانی کا سو ارتقاء حیات کے ابتدائی مدارج میں تو انسان اصول انتخاب فطرت کے زیر اثر کام کرتا تھا۔ لیکن مہذب اور متمدن ہونے کے بعد وہ اس منزل سے بہت دور نکل گیا ہے۔ اب ہر ملک کے شعبۂ صحت عامہ کے فرائض اس سے بھی متجاوز ہو چکے ہیں کہ امراض متعدی کا انسداد کیا جائے کیونکہ انسان کے قویٰ خواہ کمزور ہوں یا طاقتور مگر وہ ہر طرف حفاظتی قوانین کے ذریعہ سے محفوظ ہے۔ اور اب ہر ملک کا خزانۂ عامرہ اور اس کی خیراتی انجمنیں لکھوکھا روپیہ صرف کر کے ان لوگوں کی جانیں بچاتی ہیں جو قدیم زمانہ میں نذر اجل ہو جاتے تھے۔ یہ تو نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے ضعیف القویٰ لوگوں کا استیصال کر دیا جائے۔ لیکن یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد دنیا میں زیادہ نہ بڑھے۔

اگرچہ فی زمانا عرصہ تک زندہ رہنے کی خواہش بہت بڑھ گئی ہے۔ لیکن علم کی ترقی کے ساتھ باخبر لوگوں کے دلوں سے موت کا خوف بھی زائل ہو گیا ہے۔ اور جوں جوں انسان اپنی فطری موت کے قریب پہونچتا جاتا ہے اتنی ہی موت اس کو کم بھیانک معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور انسان دنیا میں اپنا کام ختم کرنیکے بعد مطمئن .... دل کے ساتھ پامردانہ قدم رکھتا ہوا اس عالم کی طرف روانہ ہو جاتا ہے جہاں کا حال آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا
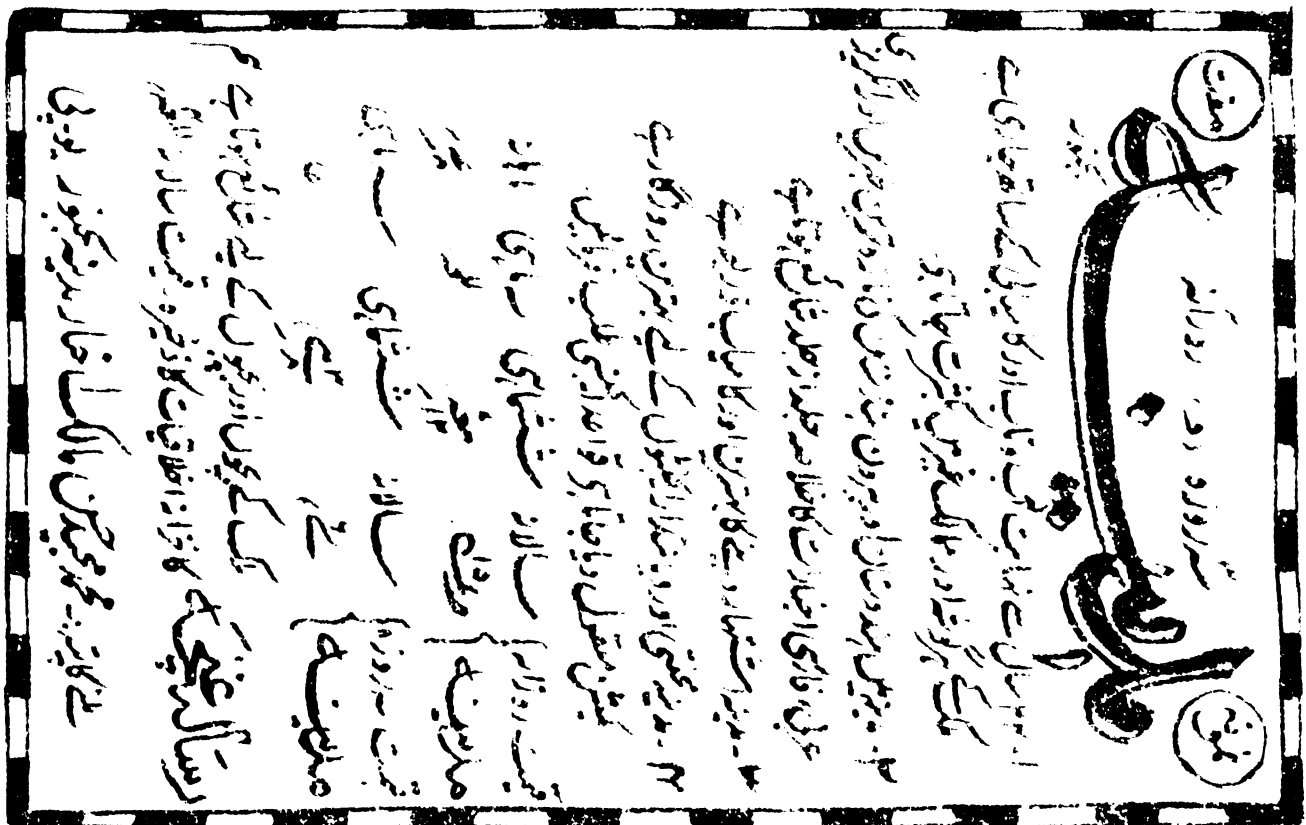
باب المناظرۃ والمراسلۃ

(جناب مولوی عبدالمالک صاحب آروی)

مارچ کے رسالہ میں آپ نے میرے خط کے جواب میں جو بحث کی ہے، میں نے پڑھی، آپ حدیث معراج کو موضوع قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے، تو (معاذاللہ) ذات رسول اللہ مورد الزام ہوتی ہے، کیونکہ ڈاکٹر ٹسڈل کی روایت کے مطابق "ارتادراف نامک" اور "اندرالوک گیمنم" وغیرہ میں بھی معراج اسلامی کے مثل واقعات پائے جاتے ہیں، آپ اس صورت میں بحث کی دو صورتیں قرار دیتے ہیں یا تو معراج نبوی کے واقعہ سے جو احادیث میں مذکور ہے یکسر انکار کردیا جائے یا پھر ارجن اور زردشت کی معراج پر بھی ایمان لایا جائے۔

میرا علمی عقیدہ ہے، کہ دنیا کی ساری تاریخ میں احادیث سب سے زیادہ صحیح اور معتبر ہیں کیونکہ روایات کی تنقید و تصحیح کے سلسلہ میں احادیث کے لئے جو انتظام کیا گیا۔ اس کی نظیر دنیا کی کسی قومی یا ملی تاریخ میں نہیں ملتی، لہٰذا بہ حیثیت ایک جویائے حق میرا ایمان ہے، کہ معراج کی حدیث صحیح ہے اور خود آں حضرت سے مروی ہے، اسی لئے ڈاکٹر ٹسڈل کے ہفوات کا ترجمہ پیش کرکے میں نے تنقید میں یہی ثابت کیا کہ ڈاکٹر صاحب جو محض ظن و قیاس کی بنا پر اس کا اظہار کررہے ہیں کہ روایت معراج مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کی عظمت و جلال قایم کرنے کیلئے مجوسیت اور برہمنیت کے نمونہ پر گڑھ لی ہے، صحیح نہیں، چونکہ معراج کی حدیث میرے نزدیک مستند ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی قیاس آرائی کی تردید کردی گئی، اور بتایا گیا کہ معراج کی حدیث خود آں حضرتؐ سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں اس صورت میں خود آں حضرتؐ پر اعتراض وارد ہوتا ہے، کہ انھوں نے "ارتادراف نامک" کی داستان کے مثل اپنی معراج کا واقعہ وضع کرلیا، چونکہ تاریخ اس کی شاہد ہے، کہ آں حضرتؐ پہلوی زبان سے واقف نہ تھے، اس لئے آپ ایک غیر مسلم معترض

کی طرف سے یہ قیاس پیش کرتے ہیں کہ آں حضرت کے زمانہ میں ایک ایسا "عجمی" موجود تھا جس کی طرف لوگوں کا گمان تھا، کہ وہ آپ کو سکھاتا ہے، اس سلسلہ میں آپ نے سورۂ نحل کی یہ آیت درج کی ہے،

یقولون انما یعلمہ بشر ط لسان الذی یلحدون البہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین۔ لوگ کہتے ہیں آپ کو کوئی آدمی سکھا جاتا ہے، اس شخص کی زبان جس کی طرف منسوب کرتے ہیں عجمی ہے، اور یہ صاف عربی زبان ہے

اس میں شک نہیں بعض مفسرین نے جن میں زمخشری اور بیضاوی بھی ہیں اس "اعجمی" سے سلمان فارسیؓ کی ذات مراد لی ہے، لیکن ایک مفسر قرآن کے لئے محقق تاریخ بھی ہونا ضروری نہیں اس لئے ہمارے مفسرین نے اس باب میں تاریخی غلطی کی، تعجب تو یہ ہے کہ آپ نے بھی اس سے استدلال کرلیا اور آپ کا بھی گمان غالب یہ ہے کہ اس "عجمی" سے حضرت سلمان فارسیؓ مراد ہیں، حالانکہ اصحاب سیر و تاریخ سے یہ پوشیدہ نہیں، کہ حضرت سلمان فارسیؓ مدینہ میں ایمان لائے، یہیں پہلی مرتبہ آپ کو سرور کائنات کا دیدار میسر ہوا، اور یہیں بنی قریظہ کے ایک یہودی سے مسلمانوں نے آپ کو آزاد کرایا، خود آں حضرت نے اپنے دست مبارک سے تین سو درخت لگائے اور حضرت سلمانؓ کی آزادی کے معاوضہ میں اس یہودی کو دیا، اس "اعجمی" سے ایک رومی غلام مراد ہے، جو نصرانیت کا پیرو تھا، صاحب موضح القرآن کی یہی رائے ہے، جارج سیل نے جتنے اسماء گنائے ہیں ان میں جبر (عمرو بن الحضرمی کے یونانی غلام) عابش، قیس، یاسر وغیرہ ہیں اور یہ تمام حضرات نہ تو ایرانی تھے، اور نہ مجوسی مذہب کے پیرو، حضرت سلمان فارسی کا نام بھی سیل نے حاشیہ میں لکھا ہے، لیکن اس کو زمخشری کی رائے سے غلط فہمی ہوگئی، سورۂ نحل مکی ہے، اور سلمان فارسیؓ مدینہ میں تھے، اس لئے آپ کا یہ قیاس کہ آں حضرت کو ان کی وساطت سے استادرات نامہ کی روایت پہونچ سکتی تھی، رد ہوجاتا ہے، حیرت ہے کہ آپ نے محض ظن و قیاس سے کام لے کر یہ تو لکھ دیا کہ سلمان فارسی کے ذریعہ ارتاد ورات نامک کی روایت آں حضرت تک پہونچ سکتی تھی، لیکن اس پر غور نہ فرمایا کہ اس کے مقابلہ میں نضر بن حرث جیسا ماہر ادبیات ایران موجود تھا، اور اس نے عربوں کو اس سے آگاہ کیا در آنحالیکہ وہ فارس کے سلاطین کا تذکرہ کرکے قرآن مجید کو "اساطیر الاولین" کہا کرتا تھا، اور اپنے پندار میں سرور کائنات کو حریف قرار دیکر خود کو خرافیات قدیمہ کا زیادہ ماہر بتاتا تھا، اب آپ کا یہ لکھنا کہ اسلامی مورخوں نے اس واقعہ کو حذف کردیا ہوگا، کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے، کیا مورخین اسلام "غیب بیں" تھے کہ انھوں نے ہونے والے مناظروں کا حال کئی صدیاں قبل معلوم کرلئے، اگر اسلامی علما اور مورخین اس پیش بینی اور احتیاط سے کام لیتے تو تاریخ اسلام میں وہ بے شمار واقعات درج نہ ہوتے جن کا غلط مفہوم پیدا کرکے آج حق ناشناس مشنری خوش ہوتے ہیں، اگر ڈاکٹر ٹسڈل کے ہفوات، اور خرافات پر لیشان پر ایمان لانا ضروری ہے تو زیادہ

سے زیادہ زردشت اور ارجن کی معراج کے واقعات کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے، اس کے جواب میں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ قرآن مجید نے تمام قوموں کے ہادیوں اور انبیا کے وجود کو تسلیم کیا ہے، لکل قوم ھاد اس لئے اگر پہلوی اور سنسکرت زبانوں میں معراج کے واقعات ملتے ہیں تو انکار کی کوئی وجہ نہیں قیاس کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ پہلوی اور سنسکرت چونکہ "اندوجرمانیہ" (Indo Germania) لغات کی شاخیں ہیں اس لئے بہت ممکن ہے، دونوں ایک ہی ماخذ کی بگڑی ہوئی صورتیں ہوں اور آریہ قوم کے کسی نبی کو واقعۃً معراج ہوئی ہو، زردشت، اور ارجن کے حالات وسوانح میں چونکہ خرافیات کا غالب اثر ہے، اس لئے معراج کی روایت کے متعلق کسی ذات کی تعیین نہ ضروری ہے، اور نہ ممکن، ہم یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ جس طرح سامی قوموں کے مسیحؑ، ایلیا، اور محمدؐ کو معراج ہوسکتی ہے، اسی طرح آریہ اقوام کے انبیا ورسل کو بھی معراج ہوسکتی تھی، یہ اور بات ہے، کہ ہم تحقیق واستقرائی بنا پر کسی ذات کی تعیین سے انکار کردیں

(نگار) ہر چند بار بار ایک ہی مسئلہ پر ردوقدح کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں، لیکن چونکہ آپ کو میرے بیان کی طرف سے تھوڑی سی غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے اس لئے اس کو دور کرنا ضرور ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ میں سورۂ نحل کے "اعجمی" سے حضرت سلمان فارسی کی ذات مراد لیتا ہوں۔ حیران ہوں کہ آپ نے میرے کس فقرہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ میں نے مارچ کے رسالہ میں آپ کے مراسلہ کا جواب دیتے ہوئے کسی جگہ اشارتاً بھی ظاہر نہیں کیا کہ میرے نزدیک اعجمی سے مراد سلمان فارسی ہیں۔ بلکہ فٹ نوٹ میں صراحتاً یہ درج کردیا تھا کہ " یہ بحث، غالباً دراز کار ہوگی کہ وہ شخص کون تھا۔ اس باب میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض جبر۔ یاسر۔ قیس۔ وغیرہ کا نام لیتے ہیں اور بعض نے سلمان فارسی کا نام لیا ہے ":

۱۔ معترض تو سورۂ نحل کی آیت پیش کرکے صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ کوئی اعجمی ضرور تھا جس کے متعلق لوگ کہا کرتے تھے کہ آں حضرت کو سکھاتا رہتا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ وہ کون تھا اور کون نہیں خارج از بحث ہے۔ اور نہ معترض سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ وہ اعجمی کون تھا۔ یہ آپ کا کام ہے کہ اس کی تعیین کیجئے یا نہ کیجئے

۲۔ غنیمت ہے کہ آپ معراج نبوی کی حدیث کو صحیح تسلیم کرنے کی ضد میں اس حد تک تو آگئے کہ زردشت وارجن کی معراج کو بھی ممکن سمجھنے لگے ـــــ محبت کی یہی وہ منزل ہے۔ جس کا ذکر کسی شاعر نے ان

الفاظ میں کیا ہے ؎

اس حال کو پہونچے ترے قصّہ سے کہ اب ہم
راضی ہیں گر اعدا بھی کریں فیصلہ اپنا

لیکن اتنی خامی ہنوز آپ میں باقی ہے کہ کسی جگہ "خرافیات" کا اثر غالب آپ کو نظر آتا ہے، کہیں "تحقیق و استقراء" کی بناء پر آپ کو "تعیین ذات" میں تامل ہوتا ہے۔ لیکن خود اپنے معاملہ میں نہ کہیں "خرافیات" کا شائبہ نظر آتا ہے نہ "تحقیق و استقراء" آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ مدا انحالیکہ جو نقطۂ نظر آپ دیگر مذاہب کی تحقیق کیلئے قائم کرتے ہیں بالکل وہی دوسرے مذہب والوں کا آپ کے مذہب کے باب میں ہوتا ہے اور جس طرح آپ اپنے کو دلائل و براہین کی بناء پر سچا سمجھتے ہیں بالکل اسی طرح وہ بھی اپنے آپ کو "برحق" یقین کرتا ہے ——— اس لئے بے لاگ تنقید کا اقتضاء تو یہی ہے کہ سب سے علیحدہ ہو کر شخص ثالث کی حیثیت سے غور کیا جائے اور یہی وہ چیز ہے جس کا ہمیشہ فقدان رہا ہے اور رہے گا، جب تک آزادانہ رائے قائم کرنے کی صلاحیت شروع ہی سے نہ پیدا کی جائے۔

کسی خاص ماحول میں پیدا ہونے اور مخصوص عقائد کی باتیں گہوارہ ہی سے کان میں پڑنے کا بڑا اثر ہوا کرتا ہے اور یہ نقوش دماغ میں اتنے گہرے مرتسم ہو جاتے ہیں کہ انسان سن شعور کو پہونچنے کے بعد بھی ان کے اثرات کو نہیں مٹا سکتا۔ اور یہی وہ اثر ہے جو با اینہمہ روشن خیالی و علم و فضل آپ کو اپنی جگہ سے ہٹنے نہیں دیتا ——— ورنہ حیرت ہے کہ آپ اور مجموعۂ احادیث کو دنیا کی سب سے زیادہ صحیح و معتبر تاریخ قرار دیں، جن میں رسول اللہ کی شان نبوت کے خلاف ایک دو نہیں سیکڑوں واقعات نظر آتے ہیں۔

بہرحال ڈاکٹر ٹسڈل نے تو صرف بربنائے روایت واقعۂ معراج پر بحث کی تھی کہ آخر کار مجبوراً آپ کو زردشت دارجن کی معراج بھی دبی زبان سے تسلیم کرنا پڑی، لیکن حیران ہوں کہ آپ کیا کریں گے۔ جب از روئے عقل و درایت بحث کرنے کے بعد ...... زردشت کی معراج اور ارجن کی سیاحت آسمانی دونوں لغو و غلط قرار پائیں گے۔ کیا آپ اس صورت میں بھی ان دونوں کی تکذیب پر تو آمادہ ہو جائیں گے۔ اور خود اپنے یہاں کے واقعۂ معراج کو قرین عقل قرار دینے میں بدستور زور آزمائی کرتے رہیں گے۔

میرے عزیز و مکرم دوست، نہ مذہب بڑی چیز ہے اور نہ اس کے مقاصد بڑے۔ لیکن اگر

مذہب عقل و ہوش چھین لینے والا ثابت ہو تو خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ اس کی حمایت کون کرسکتا ہے۔ مذہب ذریعہ ہے تزکیۂ اخلاق کا اور اخلاق کی درستی عقلی ضرورت ہے۔ اس لئے اصولاً مذہب کو بھی عقلی ضرورت ماننا پڑے گا۔ یہ کیا تماشہ ہے کہ جس چیز کے وجود کو ہم از روئے عقل ضروری سمجھیں اسی پر غور کرنے کے لئے ہم عقل سے کام نہ لیں ——— اسی لئے میں مذہب کے تمام اصول و معتقدات کو پہلے درایت و فراست کی کسوٹی پر کس کر دیکھتا ہوں، اگر وہ اس طرح کامل العیار نکل آئے تو پھر روایتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، ورنہ ان پر نگاہ بھی نہیں ڈالتا۔

پھر سچ بتائیے کیا واقعات معراج پر آپ نے درایتاً کبھی نظر ڈالی ہے اور کیا رسول اللہ کا براق پر سوار ہو کر درجہ بدرجہ آسمانوں پر چڑھنا اور ملائکہ وانبیاء سے وہ تمام باتیں کرنا جن کا تفصیلی ذکر حدیث میں موجود ہے۔ آپ بالکل صحیح باور کرتے ہیں ——— اگر آپ کے نزدیک اس میں کوئی استحالۂ عقلی نہیں ہے۔ اور اس کو حقیقتاً بالکل واقعہ سمجھتے ہیں، تو مجھے اک آہ بھر کر خاموش رہ جانے کے علاوہ کچھ نہیں کہنا، لیکن اگر آپ کا ضمیر واقعات معراج کو تمثیلی یا روحانی حیثیت سے زیادہ کوئی جگہ نہیں دیتا تو پھر آپ اس حدیث کی صحت پر کیوں اصرار کرتے ہیں جو رسول اللہ کے "معراج جسمانی" کو بالکل ارجن اور زردشت کی سیر آسمانی کی طرح پیش کر رہی ہے، اور کیوں نہیں آپ ٹسڈل کے ہمزبان ہو کر رسول اللہ کی ذات گرامی سے اس الزام کو دفع کر دیتے کہ خود انھوں نے ان واقعات کو بیان کیا ——

مجلس تحریک قرآن کا ماہوار رسالہ

"ترجمان القرآن"

مرتب :- ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے۔ اور ہر شخص جو اسلام کو سمجھنا چاہے اسے قرآن کو سمجھنا اور اس کے معانی میں غور کرنا چاہیے اس غرض کیلئے مجلس تحریک قرآن ایک ماہوار رسالہ شائع کر رہی ہے جس کا مقصد لوگوں کو قرآن سمجھنے میں مدد دینا، انکی مشکلات اور شبہات کو حل کرنا اور زندگی کے مسائل اور معاملات میں اس ہدایت و رہنمائی کو پیش کرنا ہے جو قرآن حکیم میں کی گئی ہے ——— مذہبی مناظرہ و مجادلہ اور فرقہ بندانہ نزاعات سے اس رسالہ کو کچھ سروکار نہیں۔ اس کا کام محض تعلیم و تفہیم ہے۔ قیمت سالانہ عہ

دفتر "ترجمان القرآن" خیریت آباد - حیدرآباد دکن

باب الاستفسار

موجودہ فن تمثیل کی ابتدا مغرب میں

(جناب مولوی عبد الغنی صاحب رائے پور)

کیا آپ براہ کرم مطلع فرما سکتے ہیں کہ مغرب میں موجودہ فن تمثیل کی ابتدا کیونکر ہوئی اور اول اول کیا صورت اس کی تھی ؟

(نگار) فن تمثیل کی ابتدا یورپ میں قرون وسطیٰ سے ہوتی ہے گیارھویں اور تیرھویں صدی کے درمیان وہاں ایک جماعت آوارہ گرد شعرا کی پیدا ہوئی جنھیں ٹروباڈور (Troubadour)...کے نام سے موسوم کرتے تھے اور غیر معمولی شہرت و قبولیت ان کو حاصل ہوئی خصوصیت کے ساتھ عورتوں کا طبقہ تو اس درجہ مانوس تھا کہ امرا و ملوک کو بھی اپنی بیویوں اور بیٹیوں کی طرف سے اطمینان باقی نہ تھا کیونکہ تاریک راتوں میں سیاہ ریشمی لباس پہن پہن کر یہ خود بھی ان سے ملنے باہر نکل جاتی تھیں اور پوشیدہ طور پر انھیں بھی اپنے حجروں میں بلا لیتی تھیں — اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ان میں سے بعض شعرا نہایت اچھے خاندان کے ہوتے تھے اور دوسرا یہ کہ فن شعری اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ان کا وہی مرتبہ تھا جو جاہلیت کے شعراء عرب کو حاصل تھا۔ یہ لوگ ہمیشہ حسن و جمال ہی کی داستان کو نہیں دُہراتے تھے بلکہ لوگوں میں جذبات شجاعت و حماست بھی پیدا کرتے تھے، چنانچہ اس لحاظ سے تالیور کے نام سے پکارے

میں نقش ودوام کی حیثیت . . . . . حاصل کرلی ہے کیونکہ جب انگلستان نے ولیم کے ساتھ جنگ کی ہے تو نارمنڈی کے لشکر کے آگے آگے یہی تھا اور سب سے پہلے اسی نے وار کرکے دشمن کے دو سپاہی ہلاک کر ڈالے تھے۔

ایک بڑا سبب ان کی اہمیت کا یہ بھی تھا کہ اس زمانہ میں نہ تفریح کے اسباب کافی تھے۔ اور نہ دوسرے مقاموں کے حالات معلوم کرنے کا کوئی بہتر ذریعہ حاصل تھا اور چونکہ اس جماعت کے ذریعہ سے یہ دونوں باتیں حاصل ہوجاتی تھیں اس لئے امراء و ملوک کے طبقہ میں بھی ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی اور جب کبھی کوئی جماعت ایسے شعراء کی پہونچ جاتی تھی تو یوں سمجھئے کہ عید ہوجاتی تھی۔

ایسا شاعر ہمیشہ ایک طائفہ یا جماعت کی صورت میں سیاحت کیا کرتا تھا یعنی اس کے ساتھ پہلوانی کا فن جاننے والے، فنون سپہگری کے ماہر، موسیقی کے استاد اور دیگر لہو و لعب کے مشاق سبھی طرح کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ وہ خود تو گھوڑے پر سوار ہو کر چلتا تھا لیکن اس کے ساتھی سب اس کے جلو میں پیدل چلتے تھے۔

جب یہ کسی امیر کے قصر کے پاس پہونچتا تھا تو اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے چاروں طرف اپنی آمد کا ڈھنڈورا پٹوا دیتا تھا اور منادی کرنے والے اس کی فصاحت و بلاغت کی تعریفیں کرکر کے لوگوں میں ہلچل ڈال دیتے تھے۔ اس خبر کے شایع ہوتے ہی امیر اپنے قلعہ کے خندق پر پُل گرا دیتا تھا اور اس جماعت کو قلعہ کے اندر جانے کی اجازت مل جاتی تھی —— جب وہ شہر کے اندر داخل ہوتے تھے تو امیر کے نمایندے ان کا استقبال کرتے تھے اور ان کے قیام و طعام کے لئے بہترین انتظام کیا جاتا تھا —— اس کی خبر جب پس پردہ پہونچتی تھی تو عورتوں میں بھی خاص ہیجان پیدا ہوجاتا تھا اور وہ اپنی آرایش و زیبایش کی تکمیل میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھتی تھیں محض اس امید پر کہ شاعر شاید انھیں کو برگزیدہ کر جائے اور ان کے حسن و جمال پر نظم لکھ کر شہرت دوام دیدے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی امیر اس اندیشہ سے ان کی پذیرائی نہیں کرتا تھا اور نہ ان کو قصر کے اندر بزم شعر و سخن یا محفل رقص و سرود قایم کرنے کی اجازت دیتا تھا، لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر "شاعر" کو برہم کردیا تو پھر وہ ملکوں ملکوں اس کی برائیاں بیان کرکر کے رسوا بھی کردے گا، اور اگر اس کو خوش رکھا تو پھر بگڑ تعریف بھی کرتا پھریگا۔

عورتوں کے میلان کا بھی اہم سبب یہی تھا کیونکہ اس زمانہ میں نقل اخبار کے ذریعے تو تھے نہیں کہ ایک جگہ کا حال دوسری جگہ آسانی سے پہونچ جائے اور لڑکیاں قدرتاً یہ چاہتی تھیں کہ دوسرے شہروں اور ملکوں میں ان کے حسن کے افسانے پہونچیں اور بہتر سے بہتر شوہر انھیں حاصل ہوں۔ چنانچہ اس خدمت کو "شاعر" بخوبی انجام دیتا تھا اور اپنے شعروں میں ایک ایک کے حسن کا ذکر کرکے دھوم مچا دیتا تھا —— لیکن اس کا معاوضہ

بھی "شاعر" رات کی تنہائیوں میں کافی سے زیادہ وصول کرلیتا تھا۔

"شاعر" کے ساتھ جو جماعت پہلوانوں وغیرہ کی رہتی تھی وہ اصل میں ان مثلین کی اولاد تھی۔ جو چھٹی صدی سے قبل اطالیہ کے تماشہ گاہوں میں کثرت سے نظر آتے تھے۔ لیکن جب شمال یوروپ کی وحشی قوموں نے اطالیہ کو فتح کیا تو انھوں نے ان مثلین کو بھی دیکھا اور ان کے کرتب وغیرہ دیکھ کر سخت حیرت انھیں ہوئی، لیکن چونکہ وہ ان فاتحین کی توہین آمیز نقلیں بھی کیا کرتے تھے۔ اس لئے تماشہ گاہیں برباد کردی گئیں اور تماشہ کرنے والے تمام اکناف یوروپ میں منتشر ہوگئے ـــــ چنانچہ انھیں لوگوں کی نسل تھی جو "شاعر آوارہ گرد" کے ساتھ رہتی تھی اور مختلف شہروں میں گھوم پھر کر تماشہ دکھایا کرتی تھی۔

ان لوگوں نے ایک "فانوس سحری" بھی ایجاد کیا تھا جسے موجودہ [illegible] کی ابتدا سمجھنا چاہئے۔ آوارہ گرد "شاعروں" کی جماعت اپنا تماشہ ہمیشہ کھانے کے بعد دکھایا کرتی تھی، جب شراب کے نشے سے حاضرین پوری طرح مغلوب ہوجاتے تھے۔ روشنیاں گل کردی جاتی تھیں اور پھر یہ "جادو کا فانوس" آڑ میں روشن رہتا تھا۔ جماعت کا سردار تماشائیوں سے پوچھتا تھا کہ کیا وہ شیطان کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دفعتاً دیوار پر ایک سایہ عجیب الخلقت انسان کا نظر آتا تھا جس کے بڑے بڑے سینگ ہوتے تھے۔ لوگ یہ دیکھ کر خائف ہوجاتے تھے۔ اور ان کی غیر معمولی قوتوں کا یقین کرکے ان سے ڈرنے لگتے تھے ـــ

اس کے بعد ایک زمانہ وہ آیا جب "شاعر" اس جماعت سے علیحدہ ہوگیا اور ان بازی گروں کی اخلاقی حالت بہت خراب ہوگئی۔ یعنی سر بازار تماشہ کرنے کی حالت میں یہ لوگوں کی جیبوں سے چیزیں چرانے لگے۔ اور سخت بدنام ہوگئے۔ اسی کے ساتھ یہ لوگ امرا کی بری بری نقلیں بھی کیا کرتے تھے، آخر کار ۱۵۷۲ء میں ایک قانون وضع کیا گیا کہ جب تک کوئی باضابطہ اجازت نہ حاصل کرے اس قسم کے تماشہ نہیں دکھا سکتا۔

یہ لوگ علاوہ ان شعبدوں کے دواؤں کی تجارت بھی کیا کرتے تھے اور بالکل اسی طرح جیسی آج کل ہندوستان میں سڑک پر سانڈے کا تیل بیچنے والے کیا کرتے ہیں ـــــ ان کی ترکیب یہ ہوتی تھی کہ مثلاً ایک شخص دفعتہً تماشہ دکھاتے دکھاتے تھک کر کرسی پر بیٹھ جاتا تھا اور زور زور سے کھانسنے لگتا تھا۔ اس کے بعد وہ تیل کی شیشی نکال کر اپنے گلے پر ملتا تھا اور کھانسی فوراً دور ہوجاتی تھی۔ معاً اسی وقت انھیں میں سے ایک شخص جو ہجوم میں شامل ہوتا تھا، باہر نکل کر کہتا کہ مجھے بھی کھانسی ہے اور اگر مجھ کو فایدہ ہوجائے تو جانوں کہ تمھاری دوا مفید ہے۔ یہ کہہ کر زور زور سے کھانسنے لگتا، لیکن دوا ملتے ہی کھانسی دور ہوجاتی اور اس طرح لوگوں کو یقین دلا دلا کر دوائیں بیچتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مجمع میں سے کوئی زخمی

شخص نکلتا اس حال میں کہ زخموں سے خون بہتا ہوتا، لیکن دوا کا استعمال ہوتے ہی خون بند ہو جاتا۔ حقیقتاً یہ تمام باتیں مصنوعی ہوا کرتی تھیں۔ اور کسی خاص تدبیر سے جسم میں زخم کی کیفیت پیدا کر لی جاتی تھی۔

جب لندن میں ([illegible]) کا دور ہوا تو ان بازیگروں کو یوں سڑک پر مجمع عام میں تماشہ کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور لندن سے باہر ایک عمارت بنا دی گئی۔ جس کا نام ([illegible]) رکھا گیا۔ یہ عمارت اصل میں دیوار کا ایک حصہ تھا جس پر چھت قائم نہیں کی گئی تھی ——— اس کے بعد دوسری عمارت طیار کی گئی جس کا نام ([illegible]) رکھا گیا اور یہ گویا ابتدا ہے موجودہ اسٹیج کی اور ایکٹروں کی جنہیں عربی میں ممثلین کہتے ہیں۔

کاجل - سُرمہ - چورن - منجن

(اڈیٹر) جب نگار سے خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے، دوسری تازہ سند ملاحظہ ہو:۔ سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا، ایک شیشی اور بھیج دیجئے۔

(ایڈیٹر رضا، زیر سر پرستی - بیت محل)

کاجل - آشوب - سُرخی، ضعف بصارت کے لئے ازبس مفید ہے۔ ایک ڈبیہ کی قیمت عہ ایک روپیہ (علاوہ محصول)

سُرمہ - یہ بہشتی ہما سرمہ ۴۰ دن میں جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے۔ جالا۔ دھند موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیا ایک روپیہ عہ (علاوہ محصول)

چورن - یہ وہ اکسیری چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد۔ قبض۔ نفخ و ریاح کا پیدا ہونا سوء ہضم، دستوں کا آنا۔ یک لخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فیڈبیہ ۲ تولہ ایک روپیہ

منجن - اس کی ادنےٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فیڈبیہ ۲ تولہ (عہ) علاوہ محصول

نوٹ:۔ سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف۔

م بیگم - ذریعہ دفتر نگار لکھنؤ

سنہ ۳۱ء کے اکتشافات

(صحت انسانی کے متعلق)

انسان کی موجودہ ترقی مختلف علوم وفنون سے وابستہ ہے اور انھیں میں ایک وہ بھی ہے جس کا تعلق انسان کی صحت سے ہے۔ یوروپ میں ایک جماعت مستقلاً اس تحقیق وجستجو میں لگی رہتی ہے کہ امراض کو دنیا سے محو کر دیا جائے اور انسان کی عمر طبیعی کا اوسط اگر عمر خضر تک نہیں پہونچ سکتا تو کم از کم سو تک تو ضرور پہونچ جائے۔ اس سلسلہ میں جو اکتشافات سنہ ۳۱ء میں ہوئے ہیں انکا بیان فائدے سے خالی نہیں۔

(۱) انگلستان کے مشہور فاضل سر لیونارڈ ہیل نے عرصہ تک اس امر پر غور کیا کہ برودت وحرارت کا احساس مختلف لوگوں میں کیوں کم وبیش ہوتا ہے۔ کسی کمرہ میں دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں، ان میں ایک کھڑکی بند کرنے پر اصرار کرتا ہے، دوسرا اس کے کھول دینے پر۔ ایسا کیوں ہے؟

فاضل موصوف کی تحقیق اس باب میں یہ ہے کہ ناک کے اندر جو اعصاب پائے جاتے ہیں۔ وہ جلد کی سطح اور اندرونی پردوں کے درمیان پھیلے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ بعض لوگوں کی جلد حرارت کو زیادہ جذب کرنے کی اہل ہوتی ہے اور بعض کی کم اس لئے گرمی سردی کے احساس میں یہ تفاوت پایا جاتا ہے۔

(۲) زکام ونزلہ کے متعلق اب سے قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جراثیم سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ لیکن اب ثابت ہوا کہ اس کے بھی جراثیم ہوتے ہیں لیکن اتنے دقیق وباریک کہ خوردبین کے ذریعہ سے بھی ان کو نہیں دیکھ سکتے ــــ امریکہ کے ڈاکٹر کنڈال کی تحقیق ہے کہ اس کے جراثیم تو وہی معمولی خوردبینی جراثیم ہوتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ وہ اتنے چھوٹے ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح نظر نہیں آتے۔

(۳) ڈاکٹر کرڈلستانگ نے متعدد تجربوں کے بعد یہ بات معلوم کی ہے کہ وہ لوگ جن کی طبیعت یاس و اضمحلال کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے وہ جراثیمی بیماریوں میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ ان میں اثر قبول کرنے کی بہت صلاحیت ہوتی ہے اور وہ جراثیم کی مقاومت اچھی طرح نہیں کرسکتے کیونکہ

سانسیں جلدی جلدی لیتے ہیں اور آکسیجن کی کافی مقدار ان کے پھیپھڑوں میں نہیں پہونچتی جو جراثیم کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے۔

(۴) امریکہ کے ایک ڈاکٹر جان واکر نے ثابت کیا ہے کہ صابون کے جھاگ جراثیم کو ہلاک کرنے میں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں چنانچہ پھیپھڑوں کے التہاب، خون کی سمیت، اور انفلوئنزا کے جراثیم بھی اس سے فنا ہو جاتے ہیں۔

(۵) ایک فلم کے ذریعہ سے آنسوؤں کے اثرات ہلاکت جراثیم کے متعلق انگلستان میں دکھائے گئے اور ثابت کیا گیا کہ آنسو جراثیم کو نہ صرف ہلاک کر دیتے ہیں بلکہ بالکل محو کر ڈالتے ہیں۔ آنسو میں ایک خاص مادہ انزیم پایا جاتا ہے۔ جو جراثیم کا سخت دشمن ہے۔ چونکہ آنکھ نہایت نازک عضو ہے اور جراثیم سے متاثر ہونے کی اس میں بہت زیادہ اہلیت پائی جاتی ہے اسی لئے قدرت نے اس میں آنسو پیدا کر دیئے تاکہ آنکھوں کی حفاظت ہو سکے۔

(۶) کچھ عرصہ سے خیال تھا کہ انسان کی جلد میں بھی کوئی مادہ ایسا موجود ہے جو امراض سے بچاتا ہے۔ چنانچہ امریکہ کے مشہور ڈاکٹر ہوکمز نے اس مادہ کے وجود کو ثابت کر دیا اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ حبشیوں کی جلد میں نسبتاً دفع امراض کی بہت زیادہ اہلیت پائی جاتی ہے۔

(۷) ہچکی کا ایک عجیب و غریب علاج ڈاکٹر گولڈن نے دریافت کیا اور وہ یہ کہ معمولی کاغذ کا بڑا لفافہ جس میں بازار والے کپڑا وغیرہ لپیٹ کر دیتے ہیں ناک اور منہ پر رکھ کر سانس لیا جائے۔ اس طرح کاغذ کا کاربن دماغ کے مرکز عصبی کو متاثر کرتا ہے اور ہچکی دور ہو جاتی ہے۔

(۸) دانتوں کی خرابی کا ذمہ دار عدم صفائی اور منہ کے جراثیم کو بتایا جاتا تھا لیکن اب معلوم ہوا کہ اس کا بڑا سبب غذا ہے۔ کیونکہ اگر ایسی غذا استعمال کی جائے جس میں ویٹامین اور چونہ کے مرکبات کی کمی ہو تو دانت خراب ہو جاتے ہیں۔

(۹) مچھروں، مکھیوں اور پسوؤں کے دور کرنے کے متعلق بہترین طریقہ ڈاکٹر منرو نے یہ بتایا کہ اگر کھڑکیوں کے شیشے سرخ، زرد یا نیلگوں ہوں تو ان کیڑوں سے نجات مل سکتی ہے۔ کیونکہ حشرات کو ان رنگوں سے سخت نفرت ہے۔

"دُنیا"

ہمنشیں! مجروحِ غم ہوں، جان کو بہنے دے مجھے
خلق کی بیگانگی پر، آہ، رو لینے دے مجھے

گرچہ مجھ پر بھی ستم ڈھائے ہیں، دُنیا نے بہت
حشر اٹھائے ہیں جہانِ فتنہ آرا نے بہت

دردِ محرومی، غمِ ناشادمانی کے لئے
میں بنا ہوں تلخیٔ ناقدردانی کے لئے

زندگی میں روح کے اجزا پریشاں کردئے
میں نے اپنے دل کے ٹکڑے نذرِ دوراں کردئے

نرم رو میں صبح کی جب جھلملاتے ہیں چراغ
مدتوں کھولا ہے جوشِ فکر سے میرا دماغ

شب کی خاموشی میں، جب سوتی ہے نبضِ جستجو
مدتوں برسا ہے میری چشمِ گریاں سے لہو

کیف کی اس فصل میں جب مسکراتی ہے بہار
مدتوں میں تشنہ کامی سے رہا ہوں بیقرار

چاندنی کے رقص میں جب گنگناتی ہے صبا
مدتوں کانپی ہے میرے نالۂ غم سے فضا

اس فضائے نور میں جب حسن الٹتا ہے نقاب
مدتوں بیگانۂ عشرت رہا میرا شباب

عیش کے اُس عہد میں، جب پھول بنجاتی ہے خاک
مدتوں میں کاوشِ غم سے رہا ہوں سینہ چاک

اُس جواں سالی میں جب ہر چیز ہوتی ہے حسیں
مدتوں دھندلی رہی ہے، میری دنیا کی جبیں

آہ اس سعی و عمل کا دیکھنا، ہمدم! مآل
میں ہوں اور اک مستقل کیفیتِ حزن و ملال

خاک ہوتا بندگی بخشی ضیائے مہر نے
میری جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا دہر نے

لیکن اے ہمراز! میں اس پر نہیں اندوہگیں
خلق کی بیگانگی سے یہ مرا مطلب نہیں

صبر سے پیتا میں اپنی زندگی کا تلخ جام
خوں رلاتا ہی مجھے دنیائے فانی کا نظام

ہ دنیا، سر بسر معمورۂ وہم و قیاس
زندگانی ہے جہاں وابستۂ اندوہ و یاس

س میں ظلمت آفریں ہے مہر تاباں کا جلال
یادگار ناتمامی ہے جسے ناز کمال

ٹے جہاں گردش میں اک ٹوٹا ہوا سا جامِ عقل
عقل ہے، جس بزم میں آئینۂ اوہامِ عقل

ہیں جہاں ناآشنا اسرارِ فطرت سے دماغ
جادۂ تکمیل ہے، اور بیرِ مکتب کا چراغ

ل جہاں سینوں میں ہیں نامحرمِ احساسِ درد
قبر کے مانند تیرہ، برف کے مانند سرد

ہر دولت ہے جہاں انساں کی نبضوں میں رواں
روح کی وادی ہے اور ابرِ غلامی کا دھواں

سمیں ہیں اک سطح پر، مجروح، آزاد و اسیر
ہے جہاں انسان، ننگِ روح و محرومِ ضمیر

جسمیں نفرت سے سنا جاتا ہے فطرت کا پیام
ہے گراں جس کی طبیعت پر محبت کا نظام

چھیڑتی ہے سازِ نواب گردشِ ایام کیا
دیکھئے ہوتا ہے اس آغاز کا انجام کیا

"رعنائیِ غم"

تو سطح بیں ہے ناداں! دھوکے میں آگیا ہے　　لفظوں کو تو نے اصلی مقصد بنا لیا ہے

غمناک عاشقی کی فرضی کہانیاں ہیں　　بے کیف آنسوؤں کی جھوٹی روانیاں ہیں

"ڈوبی ہوئی ہیں نبضیں، ڈھلنے لگا ہے منکا　　ساماں ہو رہا ہے عشاق کے کفن کا"

"اکھڑی ہوئی ہیں سانسیں ہنگامِ نزع طاری　　اٹکی ہوئی ہے ہچکی ہوتی ہے دم شماری"

"احباب بیٹھے ہیں بالیں پہ آکے سینہ　　ماتھے پر آگیا ہے اب موت کا پسینہ"

"میت پڑی ہوئی ہے۔ اک حشر کا ہے عالم　　روشن ہے شمعِ بالیں۔ برپا ہے شورِ ماتم"

لے دے کے تیرے غم کی ہے کائنات اتنی　　اس پر ترا ہے مہمل دعوائے غم پرستی

کم عقل! عمر بھر میں یہ کی ہے جانچ تو نے　　غم کو سمجھ لیا ہے دوزخ کی آنچ تو نے

کتنی حسین شے ہے تو جانتا نہیں ہے!　　لیلائے غم کی صورت پہچانتا نہیں ہے

تو "غم" سمجھ رہا ہے "غم کی علامتوں" کو　　ساحل پہ ڈھونڈتا ہے تہ کی حقیقتوں کو

ناداں! گدازِ غم تو خود مستقل زباں ہے　　رنگیں تجلیوں کی رنگین داستاں ہے

فریاد کی تو کوئی مخصوص لے نہیں ہے
نالہ کہ سبیح کہا ہے پابند لے نہیں ہے　(غالب)

ذوقی

التجا

ای خدا ای جفاکشوں کے خدا　　سخت جانوں، بلاکشوں کے خدا
خوں آشام امتحانوں میں　　دے جگہ مجھکو کامرانوں میں
عزم کو عزم آہنیں کردے　　دلمیں غیرت کی بجلیاں بھر دے
تشنۂ عیشِ کامرانی ہوں　　طالب سوزِ جاودانی ہوں
دلمیں جوشِ کمال پیدا کر　　طلبِ لازوال پیدا کر
عرش پیما نگاہ دے مجھ کو　　قوّتِ بے پناہ دے مجھ کو
زندگی دی تو سرخوشی بھی دے　　کیفِ صہبائے زندگی بھی دے
واقفِ عرض و التجا ہے تو　　حالِ دل خوب جانتا ہے تو
اپنے الطاف سے مرے مالک　　دُکھ کا درمان دے مرے مالک
جانگزا ہے عذابِ ناکامی　　تابکجا اضطرابِ ناکامی

بے نیازِ غمِ جہاں کردے
سرخرو کردے، کامراں کردے

عدم

قطعات

عشرتِ جاوید

فرصت ہی، کوئی فکر نہیں، کُنجِ باغ ہے　　بھیگی ہوا ہی، ابر ہے، دیوانِ داغ ہے
ای دنیوی شکوہ و زر و جاہ کے خیال!　　مجھ سے نہ بول، عرش پہ میرا دماغ ہے

شبیہِ شاعر

سوزِ درون و برقِ نہاں کی جھلک سے رخ　　آئینہ دار ہی دلِ خانہ خراب کا
تصویر بھی بدلتی ہے کاغذ پہ کروٹیں　　دُھندلا سا عکس ہی یہ مرے اضطراب کا

زبانِ محبت

ہر چند نامرادِ محبت ہے بیزباں!　　موسیقی حزیں ہی مگر اُسکی ترجماں
بجتا ہی جب ستار تو یہ جانتا ہوں میں　　دہرا رہا ہے کوئی مرے غم کی داستاں

اختر انصاری دہلوی

نعرۂ عشق

دار پر چڑھ کے مسکراتا ہوں ۔ موت سے زور آزماتا ہوں
زندگی کو ابھارتا ہوں میں — زلفِ ہستی سنوارتا ہوں میں
بے تکلف ہی رسم و راہ مری — توڑ دیتی ہے دل نگاہ مری
روح کا سرمدی خرام ہوں میں — عرش والوں سے ہمکلام ہوں میں
موت مجھ سے نظر چُراتی ہے — دیکھ کر مجھ کو کانپ جاتی ہے

دستِ قدرت کا شاہکار ہوں میں
دوشِ اقبال پر سوار ہوں میں

باقی صدیقی
(راولپنڈی)

غزل — اثر رحمانی

خیال آتے ہی دل بیخود ہوا ہے — وہ چشمِ مست کتنی کیف زا ہے
وفا کیسی۔ کہ محرومِ جفا ہے — یہ دل اس پر بھی مجبورِ وفا ہے
اسی نے تجھ کو پایا ہے۔ ہمیشہ — جو تیری جستجو میں کھو گیا ہے
کسی کے ٹوٹے دل کو جوڑ دینا — یقیناً حاصلِ مہر و وفا ہے
سمجھتے ہیں اسے کچھ اہلِ دل ہی — محبت میں فنا ہونا بقا ہے
تمہارے جبر سہتے سہتے دن رات — ہمیں بھی صبر آخر آ چلا ہے
برتتے ہو اسی سے غیریت تم — جو دل سی چیز تم کو دے چکا ہے
خرابِ عاشقی۔ ناکامِ حسرت — مرا دل اب ترے کس کام کا ہے

اثرؔ ثابت ہوا یہ تجربہ سے
جوانی ہے تو جینے کا مزا ہے

کیفیات

جوہرِ مطلب نہیں شرمندۂ عرضِ کلام
ہر نگاہِ یاس ہی ٹوٹے ہوئے دل کا پیام

ذرہ ذرہ بن گیا آئینہ دارِ جوششِ حسن
کس قدر حیرت اثر تھی شوخیٔ موجِ خرام

ہے بہت میرے لئے اک عشوۂ نیم التفات
کون ہوتا ہے خریدارِ متاعِ ننگ و نام

کیوں نہ ہو شانِ کرم میں شوخیٔ رنگِ ستم
حسن کی فطرت میں ہی ذوقِ وفا کا احترام

اس نگاہِ ناز کا طالب ہوں جو مخصوص ہو
ننگِ ذوقِ عشق ہے کیفِ نگاہِ لطفِ عام

عشق میں منت کشِ حرف و حکایت کیوں ہو
جب خموشی میں بھی ہو رعنائیٔ حسنِ کلام

قطعہ

بادہ نوشانِ طرب ہیں اور تکلیفِ خمار
اب نہ وہ میخانہ باقی ہے نہ وہ صہبا و جام

الحذر خمیازۂ کیفیتِ عیش و نشاط
سرگراں ہیں خستہ جاں ہیں تشنہ لب ہیں تلخکام

انتہائے خود فراموشی نے آنکھیں کھولدیں
فطرتِ سفاک کا اللہ رے جوشِ انتقام

کوکب شاہجہانپوری

معلومات

دُنیا کا دورِ جمیل

چند سال قبل کی بات ہے کہ حسن و جمال کی جستجو صرف تماشہ گاہوں اور تھیٹروں میں ہوا کرتی تھی، یعنی جو عورتیں نغمہ و رقص کا پیشہ اختیار کرتی تھیں انھیں کو اس امر کی ضرورت ہوتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو خوبصورت بنا کر پیش کریں، لیکن اب حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ اور حسن و جمال کی طلب دنیا میں اسقدر بڑھ گئی ہے کہ عملی زندگی کے کسی شعبہ میں اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک ظاہری حسن و جمال بھی حاصل نہ ہو ـــــ خانگی خدمت کے لئے ایک حسین لڑکے یا لڑکی کی جستجو ہوتی ہے تاکہ اس کو دیکھ کر وجدان کو صدمہ نہ پہونچے، دفاتر میں کلرکی کے لئے جمیل عورتوں کی تلاش ہوتی ہے تاکہ اہل دفتر کی قوت عمل میں ہیجان پیدا ہوتا رہے، دوکانوں میں خوش گل عورتوں کی ضرورت ہے تاکہ خریدار متوجہ ہوں، اسکولوں میں خوبصورت معلمات درکار ہوتی ہیں تاکہ بچوں کے نفسیات پر اچھا اثر پڑے، ہوٹلوں میں خدمت کے لئے صاحب جمال لڑکیاں ڈھونڈی جاتی تھیں تاکہ لوگ کھنچ کھنچ کر وہیں پہونچیں اسپتالوں میں تیمارداری اور علاج کے لئے بھی حسین عورتوں ہی کی جستجو ہے تاکہ بیمار جلد اچھا ہو جائے۔

(در انحالیکہ اس باب میں مشرقی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ـــ خوش طبیبے ست بیا تا ہمہ بیمار شویم)

اس میں کلام نہیں کہ جنگ عظیم نے غیر معمولی تباہیاں عالم میں پھیلائیں لیکن انھیں کے ساتھ "فن تجمیل" کی بنیاد ڈال کر بڑی حد تک تمام نقصانات کی تلافی بھی کر دی ـــــ جو لوگ جنگ میں بیکار ہوئے تھے محض ان کے اعضاء درست کرنے کے لئے ڈاکٹری کا ایک نیا شعبہ ظہور میں آیا تھا۔ لیکن اب اسی شعبہ نے "فن تجمیل" کو ہاتھ میں لے کر دنیا کی بدصورتی و بدوضعی محو کر دینے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے، اور یوروپ کے جمالیاتی ذوق پر اتنا زبردست اثر اس کا پڑا ہے کہ بُرے اخلاق کو تو وہ نظر انداز بھی کر سکتے ہیں لیکن بدصورت کے لئے ان کے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ حال ہی کا واقعہ ہے کہ امریکہ میں ایک شخص نہایت بدصورت تھا اور کوئی شخص اس سے کسی کام کے لینے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ آخرکار اس نے مجبور ہو کر خودکشی کا ارادہ کیا، لیکن زندگی باقی تھی اس لئے قبل وقوع موت کے لوگوں کو پتہ چل گیا اور وہ شفاخانے بھیجدیا گیا۔ یہاں فن تجمیل کی جراحی سے اس کی بدصورتی دور کر دی گئی اور اسے ملازمت مل گئی ـــ اس سے قبل تو یہ تھا کہ صرف ناک کان وغیرہ کی معمولی بدنمائی کو جراحی سے دور کر دیا کرتے تھے، لیکن اب تو چہرہ و جسم کے ہر

حصہ کے قبیح ترین عیب کو دور کر دیتے ہیں اور وہاں اخباروں میں ڈاکٹروں کے اشتہارات نکلتے رہتے ہیں کہ جسکو حسین بننا ہو ہم سے رجوع کرے۔

دو سال ہوئے کہ نیویارک میں ایک خیراتی شفاخانہ فن تجمیل کا قائم کیا گیا ہے اور وہاں بغیر کسی فیس کے بدصورتی کا علاج کیا جاتا ہے —— ایک عورت کا واقعہ ہے جو اپنی بدصورتی کی وجہ سے نہایت خراب و شکستہ حالت میں زندگی بسر کرتی تھی، لیکن عمل جراحی کے بعد اس کی مالی حالت نہایت اچھی ہوگئی اور لوگوں کو پہچاننا دشوار ہوگیا کہ آیا واقعی یہ وہی عورت ہے یا کوئی اور۔

پھر یہ ذوق وہاں صرف کمسن عورتوں ہی میں نہیں پایا جاتا بلکہ ساٹھ ساٹھ سال کی بڑھیا عورتیں بھی عمل جراحی کی اذیتوں کو برداشت کرتی ہیں اور صرف اس لئے کہ جب وہ آئینہ دیکھیں تو خود اُن کو اپنی صورت بُری نہ معلوم ہو ——

اس میں شک نہیں کہ بہ نسبت مردوں کے عورتوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ بعض کو یہ تمنا ہوتی ہے کہ ان کا شوہر ان سے محبت کرتا رہے۔ بعض کو یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں ان کی ملازمت نہ جاتی رہے، بعض کو جو تھیٹر وغیرہ میں نوکری کرتی ہیں یوں بھی بقاء حسن کی ضرورت ہوتی ہے اور جو مطلقہ یا دوشیزہ ہیں۔ وہ شوہر کی تلاش و جستجو میں اپنے آپ کو جمیل ظاہر کرنے پر مجبور ہیں —— بعض ایسی عورتیں بھی ہیں جو بلا ضرورت محض غرور حسن کی رعایت سے اپنے کان چھوٹے، دہانہ تنگ، اور آنکھیں بڑی کرا لیتی ہیں تاکہ ان کا فتنۂ حسن اور سحر کشش اور زیادہ بے پناہ ثابت ہو۔

پھر یہ شوق صرف عورتوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ مردوں میں بھی عام ہوتا جاتا ہے چنانچہ ڈاکٹر ہوارڈ کرام جو اس فن کا بڑا ماہر ہے۔ لکھتا ہے کہ ایک بار میرے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ میرے چہرہ پر عمل جراحی کر کے خط و خال اور شباہت بدل دو۔ مجھے شبہ ہوا کہ کہیں یہ کوئی مجرم تو نہیں ہے جو اپنی شکل میں تبدیلی پیدا کر کے سزا سے محفوظ رہنا چاہتا ہے، چنانچہ میں نے پولیس کو اطلاع دی —— (کیونکہ وہاں کا قانون ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے چہرہ کی شباہت تبدیل کرائے تو پولیس کو اطلاع دینی چاہئے تاکہ وہ تحقیق کرے کہ گرفتاری کے ڈر سے تو وہ اپنی صورت تبدیل نہیں کراتا) —— اور جب وہاں سے تصدیق ہوگئی کہ یہ کسی جرم میں مطلوب نہیں ہے تو میں نے عمل جراحی کیا۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے اپنی بیوی سے بہانہ کیا کہ وہ باہر سفر پر جا رہا ہے اور خفیہ طور پر عمل جراحی کرا لیا۔ جب گھر واپس آیا تو چہرہ پر پٹیاں وغیرہ بندھی ہوئی تھیں۔ بیوی نے پوچھا تو کہدیا کہ کسی حادثہ کی وجہ سے چہرہ مجروح ہوگیا ہے۔ جب زخم اچھے ہوگئے اور پٹیاں کھولی گئیں تو بیوی نے وہاں

عالم ہی دوسرا دیکھا، نتیجہ یہ ہوا کہ آخرکار خود بیگم کو بھی اپنے چہرہ پر جراحی کرا کے شوہر کے مقابل حسین بننا پڑا ——

پھر اگر لوگوں کا میلان اسی طرح بڑھتا رہا اور عمل تجمیل کے ذریعہ سے چہرہ وجسم کے معائب ونقائص دور ہوتے رہے، تو یقیناً ایک زمانہ وہ آئے گا۔ جب نسل پر اس کا اثر پڑے گا۔ اور اولاد خود اتنی حسین جمیل پیدا ہونے لگے گی کہ عمل جراحی کی ضرورت باقی نہ رہے گی —— بہرحال موجودہ انسان نے فطرت کے ساتھ جو جنگ اختیار کی ہے اسی کا ایک پہلو یہ بھی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں کامیابی قدرت کو حاصل ہوگی یا انسان کو۔

بنک کس نے ایجاد کیا بنک کا کاروبار ایسی چیز ہے کہ اگر آپ کسی سے پوچھیں گے کہ اس کاروبار کب سے ہے تو وہ فوراً کہہ دے گا کہ یہ زمانہ حال کی چیز ہے اور موجودہ تمدن تہذیب نے اسے قائم کیا ہے۔ لیکن عراق میں علماء طبقات الارض کی تحقیق یہ ہے کہ اب سے ۲۷۰۰ سال قبل اہل بابل بنک اور اس کے فواید سے واقف تھے۔

ایک تختی زمین سے برآمد ہوئی ہے اور اس کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح سے ۷۰۰ سال قبل بابل میں ایک بنک قائم تھا جس کا نام ایجیبی تھا اور اس میں موجودہ بنکوں کی طرح شرکا بھی تھے —— اس بنک میں لوگوں کی حسابات جاریہ (Current account) بھی تھے۔ امانتیں بھی رکھی جاتی تھیں، مسکات بھی جاری کئے جاتے تھے اور اس کے حصے بھی مقرر تھے۔ لیکن چونکہ کاغذ اس وقت تک ایجاد نہ ہوا تھا اس لئے اینٹوں پر کندہ کر کے اسے پکا لیتے تھے تاکہ تحریر محفوظ رہے۔

فرانس کا قومی خزانہ شہر پیرس کے وسط میں فرانس کا وہ بنک واقع ہے جس کے اندر حکومت فرانس کی دولت سونا اور سونے کی اینٹوں کی صورت میں ایک جگہ ڈھیر ہے۔ مشہور ہے سونے کے لحاظ سے اس وقت کوئی ملک فرانس سے زیادہ دولتمند نہیں کیونکہ دنیا میں جتنا سونا پایا جاتا اس کے تہائی حصہ کا مالک فرانس ہے —— ہزاروں لوگ روزانہ اس عمارت کے پاس سے گزر جاتے ہیں اور انھیں مطلق خبر نہیں کہ اس کے اندر کتنے قارونوں کی دولت محفوظ ہے —— اس بنک کی عمارت بظاہر نہایت معمولی ہے، لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عمارت کا اصل حصہ جہاں یہ خزانے محفوظ ہیں، زمین کے اوپر پایا ہی نہیں جاتا بلکہ وہ زیر زمین منزل در منزل چلا گیا ہے —— خزانہ سب سے نیچے کے عمیق غار میں رکھا ہوا ہے اور وہاں تک پہونچنے کے لئے بجلی کا ایک (لفٹ) بنایا گیا ہے جو بغیر کسی آواز کے اوپر نیچے آتا جاتا ہے۔ چاروں طرف بجلی کی روشنی ہے اور ہوا صاف رکھنے کے لئے خاص خاص

لات نصب کئے گئے ہیں ــــــ سب سے نچلی منزل میں پہونچنے کے بعد ایک نہایت مستحکم دروازہ فولاد کا نظر
آتا ہے جس کے کھولنے اور بند کرنے کے لئے بجلی کا انجن کام کرتا ہے ــ اس دروازہ کا طول قد آدم کے برابر ہے۔
لیکن اس کی دبازت یا موٹائی چھ آدمیوں کی دبازت کے برابر ہے اگر وہ برابر برابر ایک صف میں کھڑے کئے جائیں
یہ دروازہ اسقدر محفوظ ہے کہ نہ کوئی گولہ اس پر اثر کرسکتا ہے نہ بجلی کا شعلہ اسے بھونک سکتا ہے۔
دروازہ کے کھلتے ہی ایک آہنی سرنگ ملتی ہے جو اندر ہی اندر ایک وسیع فولادی مکان تک پہونچادیتی ہے۔
یہاں خزانہ محفوظ ہے ــــــ یہاں کے کام کرنے والوں کے لئے ۸۰ دن کے لئے تمام ضروری اشیا فراہم کردی
جاتی ہیں۔ اور وہ اس مدت کے بعد دوسری جماعت آجاتی ہے جو اتنے ہی دن تک یہاں کام کرتی ہے
یہاں کی روشنی اور آبرسانی کا انتظام بالکل علیحدہ ہے اور شہر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ــــــ یہاں
صرف سونا اور قیمتی تمسکات محفوظ ہیں، بلکہ فنی و ادبی نوادر بھی اسی جگہ مقفل کردئے گئے ہیں۔

دنیا کی وسیع ترین عمارت

اس وقت تک امریکہ اپنی سر بفلک عمارتوں کے لئے بہت مشہور تھا لیکن
اب اس نے وسعت تعمیر کی طرف بھی قدم اٹھا کر ساری دنیا کو شکست دیدی
ہے ، ــــــ چنانچہ حال ہی میں شکاگو کی " عمارت تجاری " کا افتتاح ہوا ہے جس کو دنیا کی وسیع
ترین عمارت کہنا چاہیئے۔ اس کی بلندی تو اتنی زیادہ نہیں ہے کیونکہ صرف ۲۲ منزلیں اس میں پائی جاتی
ہیں لیکن اسکی وسعت اور گھرائی بہت غیر معمولی ہے ــــــ یہ عمارت حقیقتاً بجائے خود ایک مختصر سا شہر
ہے جس کے اندر ہر قسم کے کارخانے پائے جاتے ہیں۔ اس کے اندر بازار ہیں، کارخانے ہیں، دفاتر
ہیں، بینک اور ہوٹل ہیں، سینما اور تھیٹر ہیں، ڈاکخانے اور تار گھر ہیں، باغات اور کھیل گھر ہیں
الغرض تمدن جدید سے متعلق کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو وہاں نہ پائی جائے۔
اس عمارت میں پانچ ہزار کمرے، دس ہزار کھڑکیاں اور سات ہزار دروازے پائے جاتے ہیں۔
یہاں دس بڑے بڑے انجن، بجلی پیدا کرنے کے لئے نصب ہیں اور ۲۰۰ موٹر ([illegible]) ہر وقت
کام کرتے رہتے ہیں۔

تعلیم زدہ بیوی مصنفہ فضل حق قریشی دہلوی عصر جدید سے متعلق ایک نہایت لطیف مزاحیہ ڈرامہ ہے
بلحاظ رفعت تخئیل اور انداز بیان بہت کامیاب ہے۔ تمثیلی کشش کے پورے عناصر اسمیں موجود ہیں۔ تعلیمیافتہ عورتوں کی
جدید روش پر ایک ہلکی طنز ہے۔ ہر جملہ ایک مستقل قہقہہ ہے سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ڈرامہ روشن تھیٹر دہلی میں نہایت کامیابی کیساتھ مسلسل کئی
رات اسٹیج کیا گیا۔ اور خود مصنف نے اختر کا پارٹ کیا۔ قیمت صرف ۸ر ملنے کا پتہ :ــــ ساقی بک ڈپو ــــ دھلی

ٹیلیفون ۵۵۶۶

تار کا پتہ مسیحی سنز - دہلی

مُصفّی

طبِ یونانی کا تازہ کرشمہ

انسان کی زندگی کا مدار خون پر ہے خون اگر خراب ہوگیا ہے تو آدمی کی تندرستی قائم نہیں رہ سکتی۔ **ہندوستانی دواخانہ دہلی**۔ 'مصفی' ایجاد کرکے تمام ملک کو مقابلہ کی دعوت دیتا ہے۔ اور بلاخوف تردید دعویٰ کرتا ہے کہ صفائی خون کے لئے مصفیٰ سے بہتر دوا آج تک نہ ایشیا پیش کرسکا ہے نہ یورپ۔ مصفیٰ ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کا خلاصہ ہے۔ اور مسیح الملک ثانی **حکیم حاجی محمد احمد خاں صاحب** کے مشورہ سے جدید سائنٹفک طریق پر طیار کیا گیا ہے۔ خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے ہر مرض کی تیر بہدف دوا ہے۔ کھجلی۔ داد۔ پھنسیاں وغیرہ حتّٰی کہ سوزاک۔ آتشک۔ اور جذام کا زہریلہ مادّہ بھی اس کے استعمال سے ہمیشہ کے لئے نابود ہوجاتا ہے۔ اوس کی خوراک چیا۱ کا ایک چمچہ ہے۔ اور بلحاظ نفع مصفیٰ درحقیقت اکسیری چیز ہے۔

قیمت ۱۲ خوراک کی شیشی صرف ۱۲؍ محصول ذمہ خریدار

ترکیب استعمال

ایک خوراک صبح ایک شام تھوڑے پانی میں ملاکر اور اگر مرض کا جوش زیادہ نہ ہو تو دن میں ۳ مرتبہ استعمال کیا جائے۔

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی سے طلب کیجئے

نوکر کہ در عرف عام شہرت دارد غلط محض است بے مراد و نا نوکر باید گفت لیکن اگر بے نوکر بایمعنی کہ آن شخص نوکر ندارد استعمال کنند جائز باشد مولوی گوید ؎

عاشقاں از بے مرادیہائے خویش
باخبر گشتند از مولائے خویش

اعتراض مرزا غالب - وہ میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے جناب عبدالواسع فرماتے ہیں کہ بے مراد صحیح اور نامراد غلط - ارے تیرا ستیاناس جائے - بے مراد اور نامراد میں وہ فرق ہے جو آسمان اور زمین میں ہے - نامراد وہ ہے کہ جس کی کوئی مراد کوئی خواہش کوئی آرزو نہ برآوے - بے مراد وہ کہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوش مدعا سے سادہ ہو از قسم بے مدعا و بے غرض و مطلب - حسبۃً للہ ان دونوں امروں میں کتنا فرق ہے - ناپروا - اور ناکام - اور نادرست اور ناچار کہ یہ مخفف ناچارہ اور ناہار کہ یہ مخفف "ناآہار" ہے اور نامراد اور ناانصاف یہ سب درست - ہائے کہاں گئے ہانسی والے معلم -

(مؤلف) ملائے ہانسوی کا مقصد کلام یہ ہے کہ نا اکثر مشتقات اور صفات پر داخل ہوتا ہے جیسا کہ نابالغ اور نامسموع اور لفظ بے اسمائے غیر صفت پر جیسا کہ بے دانش و بے علم و بے شعور و بے زر لیکن حسب قول صاحب فرہنگ انندراج بعض جگہ اس کے برعکس بھی پایا جاتا ہے - جیسا کہ تواں - اور امید کہ یہ دونوں لفظ غیر مشتق ہیں - ان پر حرف نفی خلاف قیاس بجائے بے کے نا داخل ہوتا ہے - اور ناتواں و ناامید کہا جاتا ہے - بے تواں اور بے امید مستعمل نہیں ہے - جیسا کہ سعدی نے کہا ہے ؎ امید ہست پرستندگان مخلص را کہ ناامید نگردد ز آستاں اللہ - یا خواجہ حافظ ؎

ہاں مشو ناامید چوں واقف نۂ ز اسرار غیب
باشد اندر پردہ بازیہائے پنہاں غم مخور

بعض جگہ ایسے مرکبات بھی نظر آئے کہ ایک ہی لفظ پر دونوں لفظ داخل ہوئے ہیں - جیسے کہ بے سپاس اور ناسپاس وغیرہ وغیرہ

میرے خیال میں ملا عبدالواسع نے جو قاعدہ لکھا ہے وہ صحیح ضرور ہے اس واسطے کہ قواعد کی اکثر کتابیں اوس کی تائید کرتی ہیں - مگر انھوں نے چونکہ مستثنیات کا ذکر نہیں کیا اسی لئے مرزا غالب کو اعتراض کا موقع مل گیا - ورنہ اصل میں خلاف قیاس - اور شاذ کے طریق پر وہ الفاظ واقع ہوئے جنھیں مرزا نے اپنے واسطے دلیل قاطع سمجھا ہے - اور اس قسم کے شاذ الفاظ کی عربی کے علم صرف میں کوئی انتہا نہیں ہے - اسی لحاظ سے ملا عبدالواسع پر یہ اعتراض واقع نہیں ہوتا اور چونکہ تمام متقدمین کا اوسی قاعدہ پر اجماع ہے اس لئے مرزا کی رائے اتنے لوگوں کے مقابلے میں نہیں مانی جاسکتی - یہ اور بات ہے کہ بے مراد اور نامراد کے دو خاص معنے آپ کے یہاں ہوگئے مگر ان پر قاعدہ کی بنا نہیں رکھی جاسکتی -

علی سرہندی و اعجاز اکبر آبادی

شاہ آفریں لاہوری نے حاکم لاہوری سے اور حاکم نے مولانا آزاد بلگرامی سے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک زمانے میں وزیر خاں کی مسجد میں موزوں طبعوں کے مجمعے رہتے تھے۔ صحن مسجد میں چند لوگ جمع ہوتے اور شعر خوانیاں ہوا کرتی تھیں اتفاق سے ایک روز مجمع میں ملا محمد سعید اعجاز اکبر آبادی بھی شریک تھے۔ شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ عمدہ عمدہ شعر پڑھے جا رہے تھے۔ کسی نے ناصر علی کا یہ شعر پڑھا ؎

صریر خامہ میدانم کہ با طبیعت نمی سازد

دریدی نامہ - دل صد پارہ شد - قاصد رسید اینجا

لہ ناصر علی علی سرہندی کا سلسلہ نسب حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ اوّل میں سیف خاں بدخشی کے ملازم ہوئے۔ جب سیف خاں الہ آباد کی صوبہ داری پر متعین ہوئے تو ناصر علی بھی الہ آباد میں عرصہ تک مقیم رہے۔ جب سیف خاں کا انتقال ہو گیا تو یہ سرہند چلے گئے۔ نہایت بے باکی اور رندی سے اوقات گزاری کرتے رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ چہارشنبہ آخر ماہ صفر کو سیر باغ کے لئے گئے تھے اور وہیں بیٹھے ہوئے شراب پی رہے تھے کہ اتنے میں شیخ محمد عاصم خلف حضرت مجدد قدس سرہما اُدھر سے گزرے ناصر علی سے خفا ہو کر پوچھا کہ یہ کیا ہے ——— ناصر علی نے جواب دیا — "شکر کہ [illegible] ندارند" اس فقرہ سے علماء میں اتنی برہمی ہوئی کہ فتووں کے بعد ناصر علی کے قتل کا محضر تیار کیا گیا۔ اور یہ سخت آفت میں مبتلا ہوئے۔ میر محمد زماں راسخ کو یہ واقعہ معلوم ہوا۔ اپنے بال بچوں کو ساتھ لیا اور ناصر علی سے کہا کہ جان بچانا ہے تو میرے ساتھ چلو۔ غرض کہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکال کر دہلی پہونچایا۔ یہاں پہونچ کر بھی مدتوں تک وہی رنگ رلیاں مناتے رہے۔ آخرکار توفیق الٰہی نے دستگیری کی اور تمام مکروہات سے توبہ کر کے شیخ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہو گئے۔ آخر میں ذوالفقار خاں ابن اسد خاں کے مصاحب ہو گئے۔ چنانچہ جس روز پہلی مرتبہ قصیدہ نذر گزرانا تو قصیدہ کا یہ مطلع پڑھا ؎

اے شان حیدری ز جبین تو آشکار

تیغ تو در نبرد کند کار ذوالفقار

یہ سنکر نواب موصوف نے ناصر علی کو باقی قصیدہ پڑھنے سے منع کر دیا۔ اور کہہ دیا کہ بس کافی ہے۔ اس مطلع ہی کا صلہ میں نہیں دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد ایک ہاتھی اور تیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ مگر ناصر علی نے سب روپیہ مستحقین کو تقسیم کر دیا

آخر عمر میں دلی میں تھے اور یہیں ۲۰ رمضان المبارک ۱۱۰۸ ہجری میں مرحوم ہو کر جوار مزار حضرت نظام الدین اولیا میں مدفون ہوئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شایع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۳	فہرست مضامین جون ۳۳ء	شمارہ ۶

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۶	جون سنہ ۱۹۳۳ء	جلد ۲۳

ملاحظات

ایک قوم کی تباہی کا راز اس کی قدامت پرستی ہی

"کسی زمانہ میں ایک بزرگ تھے جو دریا کی سطح پر مصلا بچھا لیتے تھے اور اس پر نماز پڑھتے ہوئے پانی کو عبور کر جاتے تھے"

"کوئی ولی اللہ کسی طرف سے گزر رہے تھے کہ ایک کنویں پر انھوں نے آدمیوں کا ہجوم دیکھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ ایک بھینس اندر گر گئی ہے اور لوگ اس کے نکالنے کی فکر میں ہیں۔ انھوں نے کنویں میں ہاتھ لٹکا کر جو باہر نکالا تو لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ بھینس باہر کھڑی ہوئی ہے"

"کسی زمانہ میں ایک صاحب کرامت درویش کثرت ریاضت سے اسقدر "لطیف" ہو گئے تھے کہ ٹیکا اُن کے جسم کے آر پار ہو جاتا تھا اور ان کا بدن حائل نہ ہوتا تھا"

"تذکرۃ الاولیاء" قسم کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے تو ہزاروں واقعات آپ کو اس سے زیادہ حیرت انگیز نظر آئیں گے۔ لیکن آج

اس پر بھی غور کیا ہے کیا واقعی کسی وقت ہمارے یہاں کے اکابر مذہب وتصوف سے اس قسم کی محیر العقول باتیں ظاہر ہوتی ہیں اور اگر یہ صحیح ہے تو اس کا کیا سبب تھا اور کس فائدہ و نتیجہ کے لئے تھا اور اب اس "کشف و کرامات" کے لوگ کیوں نظر نہیں آتے؟

آپ کسی شخص سے جو ان باتوں کی صحت کا قائل ہے یہ سوال کریں گے تو وہ نہایت ہی غم آلود و حسرتناک چہرہ بنا کر کہے گا کہ "یہ اگلے لوگوں کی باتیں ہیں جو انھیں کے ساتھ گئیں، نہ اب وہ ریاضتیں ہیں نہ عبادتیں، نہ وہ روحانیت ہے نہ صداقت، نہ وہ ایمان ہے نہ وہ یقین" پھر آپ اس سے پوچھئے کہ اب ایسا کیوں نہیں ہے، کیا مسلمان دنیا میں نہیں رہے، کیا عبادت کا اصول بدل گیا، کیا اصول اخلاق و روحانیت میں کوئی تغیر پیدا ہو گیا، تو وہ اس کے جواب میں سوائے اس کے کہ اپنی کمبختی کا رونا روئے، خدا کی مرضی پر محمول کرے یا کلجگ کی خرابی بتا کر خاموش ہو رہے اور کچھ نہ کہے گا ——— اکثر و بیشتر میرے پاس ایسے حضرات کرم فرماتے رہتے ہیں جو میرے کفر و الحاد میں میرے ساتھ ہمدردی رکھتے ہوئے مجھے راہ راست پر لانے کی سعی فرماتے ہیں چنانچہ چند دن ہوئے ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے اور اس عزم کے ساتھ کہ وہ مجھ بیدین کو بغیر مسلمان بنائے ہوئے نہ اٹھیں گے، میں ان کی مقطع صورت، ان کی شرعی وضع، اور ان کے ہنگامہ خیز "السلام علیکم" سے چونک کر پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آج پھر کوئی "خداوند" اپنے "ناچیز بندہ" کو سعادتِ جلوہ بخشنے کے لئے آیا ہے، اس لئے تعظیماً واحتراماً اٹھ بیٹھا، صدر میں جگہ دی اور مؤدب ہو کر خاموش بیٹھ گیا۔ پہلے تو وہ بڑی دیر تک نہایت غور سے میری صورت و وضع کو دیکھتے رہے اور پھر ایک نہ چھپ سکنے والی خشونت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ "میں نے سنا ہے کہ تم معجزہ و کرامت کے قائل نہیں"، ——— میں نے عرض کیا کہ "یہ تو آپ نے غلط سنا ہے۔ کیونکہ کل ہی میں سرکس میں وان نارمن کا معجزہ دیکھ چکا ہوں جو ۱۰۰ فٹ کی بلندی سے ۳۰ فٹ کی جست لگاتا ہوا آگ کے شعلوں کے اندر غائب ہو جاتا ہے، علاوہ اس کے یہاں کے پروفیسر معشوق علی کی کرامتیں بارہا دیکھ چکا ہوں جو ایک رومال سے سینکڑوں رومال اور ایک روپیہ سے سیکڑوں روپے آن کی آن میں بنا دیتے ہیں"

یہ سنتے ہی اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور برہم ہو کر بولے۔ "تو کیا رسولوں کے معجزے اور اولیاء کی کرامات بھی کوئی شعبدہ بازی تھی"

میں نے کہا "مجھے اس کا علم نہیں، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرے لئے تو ان لوگوں کے یہ تماشے بھی معجزے ہی کا حکم رکھتے ہیں، کیونکہ میں ویسا کرنے سے عاجز ہوں" ——— فرمایا ——— "مشق سے ہر شخص ایسا کر سکتا ہے" ——— میں نے کہا کہ ——— "ایک منکر مذہب معجزوں کے متعلق بھی یہی کہہ سکتا ہے" ——— بولے ——— "مگر اس کا یہ کہنا تو غلط ہو گا کیونکہ وہاں مشق و اکتساب کا کوئی سوال نہ تھا۔ اور معجزہ اصطلاح میں کہتے ہی اس کو ہیں جو ایک نبی سے بغیر کسی مشق و اکتساب کے سرزد ہو" ——— میں نے کہا "بجا ارشاد ہوا، لیکن اگر آجکل کے شعبدے دکھانے والے بھی

یعنی دعوےٰ کر بیٹھیں کہ جو کچھ وہ دکھاتے ہیں اس کا تعلق مشق و اکتساب سے نہیں ہے، تو آپ کیا فرمائیں گے"
کہنے لگے ــــ "ہم اسے جھوٹا کہیں گے اور سیکڑوں مثالیں ایسی بتا دیں گے کہ مشق سے لوگ ویسا کرنے میں کامیاب ہوگئے"
میں نے کہا ــــ "یہ درست ہے، لیکن نتیجہ کے لحاظ سے شعبدہ و معجزہ میں کوئی فرق مجھے نظر نہیں آتا، سوائے
اس کے کہ ایک شخص کسی وہبی قوت کی وجہ سے اس کے ظہور کا مدعی ہے اور دوسرا مشق و اکتساب سے ــــ اس سے
اخلاق انسانی کو کیا فائدہ پہونچتا ہے" ــــ بولے ــــ "معجزہ تو صرف اس لئے ہے کہ نبی کو نبی مانیں اور اس کے کہنے
پر عمل کریں" ــــ میں نے کہا ــــ "تو خلاصہ یہ ہوا کہ نبی وہ ہے جس سے معجزہ سرزد ہو اور معجزہ وہ ہے جو نبی سے ظاہر
ہو" ــــ کہنے لگے ــــ "بیشک"

ظاہر ہے کہ جس جماعت کے رہنما و قاید اس عقیدہ و خیال کے ہوں گے، وہ کیوں نہ اعجوبہ پرست ہوگی اور
اس کا یہ عقیدہ کہ "اسلاف" کے سے صاحبان علم و عزیمت، حاملان فضل و کرامت اب نہیں پیدا ہو سکتے" اس کو
کس درجہ مایوس اور ناکارہ نہ بنا دے گا - اس میں شک نہیں کہ "عہد ماضی" میں انسان کے لئے بہت کچھ دلچسپیاں
ہوا کرتی ہیں اور گزرے ہوئے واقعات بعض دماغوں کے لئے ایک "طلسم زار" کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں، لیکن
اس کا تعلق صرف ہمارے جذبات محبت و عقیدت سے ہے - جو انسان کے عہد وحشت سے وراثتاً منتقل ہوتے
چلے آئے ہیں اور اب ہم ان کو ایک "حقیقت و واقعہ" سمجھنے لگے ہیں

ادارہ مذہب کے قیام کی تاریخ کا اگر آپ مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بنیاد ہمیشہ کسی ایک مخصوص
ہستی کے ساتھ جذبۂ خوف و احترام یا محبت و عقیدت پر قائم ہوئی اور اس ہستی کے اٹھ جانے کے بعد انسان نے
اپنی عقیدت و ارادت کو وسیع و مستحکم بنانے کے لئے بہت سی ایسی باتیں اپنی طرف سے اضافہ کر کے بیان کرنا شروع کیں
جو لوگوں کو مرعوب یا راغب کرنے والی تھیں - چنانچہ انبیاء کے معجزے، اولیاء کے کرامات، درویشوں کے خوارق
عادات سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ صرف ہمارے ہی ارادتمندانہ جذبات
یا مصالح تبلیغ کی پیداوار ہیں - پھر جس طرح سو سال پیشتر کے کسی بزرگ کے حالات میں اسوقت ایک معتدبہ اضافہ
اُس کے کرامات کا نظر آتا ہے، اسی طرح آج کسی بزرگ کے متعلق بھی سو سال بعد ایسی ہی روایتیں منسوب کردی
جائیں گی، اور جس طرح چار قرن پہلے کی پختہ قبر آج کسی نہ کسی بزرگ کا مزار بن گئی ہے، اسی طرح نصف صدی
بعد آج کی بنی ہوئی قبر پر بھی پھولوں کی چادر کا چڑھایا جانا مستبعد نہیں، اگر جہل و واہمہ پرستی کا یہی عالم رہا

ہمارے اسلاف نے اپنے عہد میں جو کچھ کیا وہ اس میں شک نہیں کہ لایق صد ہزار آفرین و ستایش ہے
لیکن یہ کہنا کہ جو کچھ وہ کر گئے ہیں، اس میں کسی اضافہ کی گنجایش نہیں اور جو کچھ وہ کہہ گئے ہیں - اس کو بلا چون و چرا آنکھ
بند کر کے تسلیم کر لینا چاہئے، حد درجہ مضر تعلیم ہے اور ایک قوم کی دماغی و ذہنی ترقی کو خاک میں ملا دینے والی ہے

آئیے اپنے بعض اسلاف کی علمی تحقیق اور ذہنی ترقی کا ایک لطیفہ سُن لیجئے :۔

علامۂ قزوینی اور علامۂ دمیری سے غالباً ہر وہ شخص واقف ہوگا جس نے تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے علامۂ قزوینی وہی ہیں جنھوں نے "تاریخ گزیدہ" مرتب کی، ظفرنامہ لکھا اور نزہتہ القلوب تصنیف فرمائی یہ حُر بن یزید کی اولاد میں سے تھے جنکو میدان کربلا میں سید الشہداء کے ہمرکاب جہاد کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور مذہباً شیعہ تھے۔ علامۂ دمیری آٹھویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ، محدث ومفسر تھے، جامع ازہر قاہرہ میں فلسفہ وادب کے لکچرار تھے، خاص سرزمین مکہ میں سلسلۂ درس وتدریس جاری رکھتے تھے، صاحب کرامات بھی مانے جاتے تھے اور منجملہ خطبات ودیگر کتب کے ایک مشہور کتاب حیات الحیوان کے بھی مصنف تھے

الغرض یہ دونوں ایسے صاحب فضل وکمال تھے کہ آج کوئی مولوی وعالم ان کے مرتبہ تک پہونچنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ لیکن ان کی تحقیق انیق اور ان کی پختگی ذہن کا کیا عالم تھا۔ حیاۃ الحیوان لے کر اسکول کے کسی طالب العلم کو دیدیجئے اور فیصلہ اسی پر چھوڑ دیجئے ——— مثالاً ان حضرات کی کاوش علمی کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ عقاب کی تحقیق کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے :—

"جب عقاب (چیل) سال خوردہ ہوجاتی ہے اور بینائی کھو بیٹھتی ہے تو وہ فضا میں بلند ہوتی ہے اور اس حد تک اوپر اُڑکر چلی جاتی ہے کہ اس کے پر تمازت آفتاب سے جل جاتے ہیں، اس کے بعد وہ نیچے گرتی ہے اور ایک شور وتلخ پانی کے کنوئیں میں غوطہ لگاکر از سرنو جوان ہوجاتی ہے

(قزوینی)

جب چیل ضعیف وکمزور ہوکر اندھی ہوجاتی ہے تو اس کے بچے اس کو چاروں طرف لادے پھرتے ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک چشمہ تک پہونچتے ہیں اور اس میں غوطہ لگاتے ہیں۔ اس کے اثر سے چیل کی بینائی عود کرآتی ہے اور وہ ازسرنو جوان ہوکر اپنی شکاری زندگی شروع کردیتی ہے

کرگس، چیل کے انڈے سے پیدا ہوتا ہے اور چیل کرگس کے انڈے سے۔ تمام چیلیں مادہ ہیں اور دوسری چڑیوں سے جفتی کھاتی ہیں۔ یہ صرف تین انڈے دیتی ہیں۔ لیکن تیسرے انڈے کو پھینکدیتی ہیں اور صرف دو سیتی ہیں، تیسرے انڈے کو ایک اور طایر جس کا نام کاسر العظام (ہڈی توڑ) ہے اٹھالاتا ہے اور اس سے بچہ نکالتا ہے

چیلی، ہندوستان سے ایک پتھر لے آتی ہے اور گھونسلے میں رکھدیتی ہے۔ تاکہ انڈا دینے میں آسانی ہو۔ یہ پتھر کھوکھلا ہوتا ہے جس کے اندر ایک اور پتھر ہوتا ہے یہ پتھر عورتوں کے وضع حمل میں بھی آسانی پیدا کردیتا ہے

(دمیری)

غالباً یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عقاب کے متعلق جو کچھ ان محققین نے لکھا ہے وہ صرف نقل ہے قدیم یونانی روایات کی

ہد قدیم سے اُن کے یہاں رائج چلی آرہی تھیں۔ پھر جب آٹھویں صدی ہجری تک ہمارے یہاں کے مورخین
صنفین کی تحقیق کا یہ عالم تھا کہ وہ روایات قدیمہ سے ایک انچ ہٹ کر خود اپنے ذہن و عقل سے کام لینا گناہ سمجھتے تھے
ظاہر ہے کہ اس سے قبل اور کیا عالم رہا ہوگا اور ان کے علمی کارناموں کی زمانۂ موجودہ میں کیا وقعت ہوسکتی ہے
یقیناً ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں، کیونکہ جو کچھ انھوں نے کیا وہ ان کی بساط عقل کے لحاظ سے بالکل درست
تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ تفتیش و تحقیق نے غیر معمولی وسعت اختیار کرلی ہے، کیوں کسی کو اس امر
کے ماننے پر مجبور کیا جائے کہ اسلاف جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے اور ہم انھیں کا اتباع کرکے ترقی حاصل
کرسکتے ہیں

یہی وہ قدامت پرستی ہے جو اس سے قبل خدا جانے کتنی قوموں کو تباہ و برباد کرچکی اور اب مسلمانوں کی جماعت
ان کا شکار بنی ہوئی ہے ـــــ اعجوبہ پرستی کا دور گزر گیا، یہ دور ہے صرف تجربہ و مشاہدہ کا، اس لئے اب نہ
معجزہ و کرامات پر محض اس لئے یقین کیا جاسکتا ہے کہ قدیم کتابوں میں ایسا لکھا ہوا ہے اور نہ صرف خوارق عادات
کی بنا پر کسی کی عظمت و بزرگی ثابت کی جاسکتی ہے، کیونکہ جب تک "طبیعیات" کی دنیا تک انسان کا دسترس
نہ تھا کسی کا دس فٹ بلند جست کر لینا بھی معجزہ کہلایا جاسکتا تھا، لیکن اب کہ طیاروں اور ہوائیوں کے ذریعہ
سے ہمدوش ثریا ہو جانا بھی مستبعد نہیں، اولیائے کرام کے خوارق عادات کو اُن کی بزرگی کے ثبوت میں پیش کرنا
صرف یہی معنی رکھتا ہے کہ آج ہم یورپ کے ایک ایک موجد و مخترع کو صاحب کرامات یقین کرنے پر
مجبور ہیں

کسقدر افسوسناک امر ہے کہ اس وقت بھی جب تمام دنیا میں علم کا اجالا پھیل گیا ہے اور انسان حقیقی معنی
میں "معرفت الٰہی" کے دور سے قریب تر ہوا جارہا ہے، ہم بدستور اسی زمانہ میں ہیں جب بقول قزوینی و دمیری چیل
کے گھونسلے میں پارس پتھر پایا جاتا تھا اور مستقبل کی امیدیں صرف نزول مسیح اور ظہور مہدی موعود سے وابستہ کئے
ہوئے ہیں

کاش ہم سمجھ سکتے کہ اس وقت دنیا کو حاجت نہ مہدی کی ہے نہ مسیح کی بلکہ ضرورت ہے اڈیسن و مارکونی
اور پاسٹر اور یوس کی کیونکہ انسان اب معجزہ و کرامات کی حدود سے گزر کر عالم جد و جہد کی اس منزل تک پہونچ گیا ہے جہاں خود
اس میں "جذبۂ الوہیت" پیدا ہوتا نظر آرہا ہے اور "انسانیت کبریٰ" کا مشاہدہ ایک ایسی حقیقت ذاتی "
فضا اس کے اندر پیدا کر رہا ہے جس کو اگر ہم چاہیں تو معرفت ربانی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں اور قرب الٰہی
سے بھی ـــــ

اس لئے اگر تم قدامت پرستی کی لعنت سے آزاد ہونا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو احمق و جاہل نہ سمجھو بلکہ

ہوش گوش والا انسان باور کرے ہر بات کے سمجھنے کی کوشش کرو، اپنے ذہن و دماغ کو نوامیس قدرت کی گتھیاں سلجھانے کا اہل بناؤ اور پرستش اسلاف کو ترک کردو کہ اس سے زیادہ سنگ گراں ترقی کی راہ میں اور کوئی نہیں ہوسکتا اسی کے ساتھ اپنی اولاد کی تربیت و تعلیم میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ اُن کی عقلی آزادی محو نہ ہونے پائے اور دوسروں کی روشنی میں مطالعۂ اشیاء کی عادت اُن کی "حریت فکر" کو تباہ نہ کردے - پھر اگر تمھاری ایک نسل بھی اسی اصول کے ماتحت تربیت پاگئی تو سمجھ لو کہ تمھاری تمام مصیبتیں دُور ہوگئیں - ورنہ کل جو تم کو اور تمھاری اولاد کو دیکھنا ہے اسے آج میری زبان سے سن لو اور یاد رکھو کہ جس طرح اور ہزاروں اندھی قومیں اب سے قبل تباہ ہو چکی ہیں، اسی طرح تم کو بھی تباہ و برباد ہوجانا ہے اور خدا اس سے بالکل بے نیاز ہے کہ مسلمان کا وجود دنیا میں باقی رہے یا نہ رہے

ایک مولوی کی عجیب و غریب حرکت

۲۶ مئی کے لیڈر میں ایک خبر شایع ہوئی ہے کہ سسرام ضلع آرہ کے ایک مولوی نے جن کا نام عبد العزیز ہے یہ عہد کیا ہے کہ وہ پیادہ سفر کرکے حج کریں گے اور دوران سفر میں ہر پانچ قدم کے بعد دو رکعت نماز نفل بھی پڑھیں گے چنانچہ ۹ مہینے ان کے سفر کو ہوگئے ہیں اور ابھی تک وہ الہ آباد نہیں پہونچے - نامہ نگار کا بیان ہے کہ پندرہ دن کے بعد وہ الہ آباد پہونچیں گے اور ایک ہفتہ یہاں قیام کریں گے گویا سسرام سے الہ آباد تک کی مسافت ۱۵۶ میل کی دس مہینے میں طے ہوگی —— اگر سسرام سے مکہ معظمہ تک خشکی کا راستہ کم از کم ۳۰۰۰ میل کا ہو اور مولوی صاحب موصوف اسی رفتار سے بغیر کسی اضمحلال و علالت کے اپنا سفر جاری رکھیں تو منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے کم و بیش بیس سال درکار ہوں گے

یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ممکن ہے مولوی ذہنیت کا شاہکار سمجھا جائے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ خدا کی یہ عجیب و غریب مخلوق اس سے زیادہ عجیب و غریب حرکتیں کرسکتی ہے اور دنیا کی بڑی سی بڑی گمراہی خیال بھی اُن واقعات کا مقابلہ نہیں کرسکتی جو اس جماعت کی طرف سے ظہور میں آسکتے ہیں

کیا سسرام میں کوئی ایسا شخص نہیں جو اس دیوانۂ مذہب کو اس حرکت سے باز رکھتا اور کیا ہندوستان میں بھی کوئی ایسا مسلمان نہیں جو اس غریب کو سمجھا سکے کہ مذہب اسلام ان لغویات سے بہت بلند واقع ہوا ہے اور یہ تقشف و جنون خدا و رسول کے نزدیک کسی طرح پسندیدہ نہیں —— لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس "تن آزاری" کا مقصود کیا ہے - اور ہمارے سامنے بہت سے اُن سادھوؤں کی مثالیں موجود ہیں جو اپنے ہاتھ پاؤں تک خشک کرڈالتے ہیں صرف اسلئے کہ جہلا کھنچ کھنچ کر اُن کے پاس آئیں اور خدا کو چھوڑ کر انکی پرستش کرنے لگیں

جنگ چین و جاپان سے ایک سبق

چین و جاپان کی جنگ اصولاً و عملاً دونوں طرح ختم ہو چکی، یعنی جاپان نے اپنی عسکری تنظیم، اپنی آراستگی علوم اور اپنے جوشِ وطنی سے باوجود ایک نہایت ہی محدود سلطنت ہونے کے دشمن کو شکست دیدی اور چین باوجود اتنی کثیر آبادی، اتنی وسیع سلطنت ہونے کے، اعترافِ شکست پر مجبور ہو گیا —— پھر اگر اس واقعہ میں ایک طرف ہمارے لئے یہ درسِ عبرت پنہاں ہے کہ "کم و کیف" کی جنگ میں ہمیشہ کامیابی "کیف" ہی کو ہوتی ہے، تو دوسری طرف جمعیۃ الامم کی بیچارگی بھی ایک دفترِ بصیرت ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جس نے ایک سال قبل یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ اس جنگ میں بزورِ شمشیر کوئی صلحنامہ نہیں ہو سکتا اور آج وہ جاپان کے اس زورِ شمشیر کو دیکھ رہی ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتی وہ لوگ جو قلم کی قوت کو تلوار کی قوت سے زیادہ کارگر یقین کرتے ہیں، چین اور جاپان کی اس فتحمندی کا مطالعہ کر کے عبرت حاصل کریں کہ آج مغرب کی بڑی بڑی قوتوں کی بزم آرائیاں، جاپان کی صرف ایک "داستان رزم" کی بھی حریف نہیں ہو سکتیں —— سچ کہا تھا ڈی ولیرا نے کہ جمعیۃ الامم جس چیز کا نام ہے وہ صرف ایک ہو کے کی ٹٹی ہے جس کو ہر نیزہ باز اپنی ادنیٰ قوت سے کام لے کے پامال کرتا ہوا گزر سکتا ہے

حضرت نیاز فتحپوری کی دو اور معرکۃ الآرا کتابیں

زیر ترتیب و طباعت ہیں

نگارستان حصۂ دوم —— جس میں جناب **نیاز** اپنی پوری شان ادبیت کے ساتھ نظر آئیں گے —— اور

مجموعۂ استفسار و جواب (سنہ ۲۲ء سے سنہ ۳۳ء تک) —— جو نگار کے فاضل اڈیٹر کا زبردست علمی کارنامہ ہے

ظاہر ہے کہ ان دونوں کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا

مینیجر نگار لکھنؤ

مایا

رانی پور کے زمیندار بسنت کمار کے باپ سرگباش ہو چکے تھے۔ اور اب بوڑھی ماں رادھا اور نوجوان بیوی پاروتی کے سوا ان کا اس دنیا میں اپنا کوئی نہ تھا۔ وہ بی۔ اے پاس کر چکے تھے اور قانون کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے ہی میں گذرتا تھا۔ رادھا جو پرانے خیال کی ماں تھی اپنی بہو پاروتی کو بسنت سے ملنے کا بہت کم موقع دیتی تھی، جب کوئی پڑوس کی عورت رادھا سے اس کی وجہ پوچھتی تو وہ کہتی " دونوں ابھی ناسمجھ اور ناتجربہ کار ہیں، بیوی کے پھندے میں پھنس کر بسنت پڑھ لکھ نہیں سکتا ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے عیش و آرام کے لئے ساری زندگی پڑی ہے۔" چنانچہ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ رادھا اپنی بہو کو بڑی کوشش سے خانہ داری کا کام سکھا رہی تھی۔ اور پاروتی کا سارا دن رسوئی، بھنڈار خانہ اور ٹھاکر جی ہی کے گھر میں گذرتا تھا۔ رات کو بھی رادھا بہو کو اپنے پاس سلاتی تھی۔ جیسے کوئی لاپرواہ مالی گنے کا رس خوب چوس چوس کر پھینک دیتا اور اس کو دور سے دیکھ کر للچائے وہی حال بسنت کا بھی تھا اس کی آنکھوں کے سامنے ہی نوجوان بیوی کا رس گرہستی کی چکی میں پس پس کر مٹی میں ملا جا رہا تھا لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ماں کے خلاف کوئی کام کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی مگر ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے یہ سعادت مندی زیادہ دن تک نہ قائم رہ سکی آخر ایک دن وہ ماں سے باغی ہو گیا۔ پھاگن کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا بسنت اپنی بیٹھک میں کچھ پڑھ رہا تھا یکبارگی اس کے کانوں میں آواز آئی :-

گئیاں برجائے ایسی ہوری اُن بن دیہے جرت موری۔

گاؤں میں اس نے اکثر لوگوں کو پھگوا گاتے سنا تھا مگر اس وقت دیہاتی لڑکیوں کے گیت "گئیاں برجائے ایسی ہوری" نے بسنت کے دل کو تڑپا دیا اُسے ایسا معلوم ہونے لگا گویا لڑکیاں گیت میں اس کا مذاق اڑا رہی ہیں پھر دوسری 'ہولی' شروع ہوئی :-

ہوری آئی سجن نا ہیں آئے دیکھو شیام ہمارے بدلیسوا میں چھائے
رنگ کھیلیں سکھیاں اپنے پیا سنگ ہنس ہنس گروا لگائے
رہ رہ آوے یاد بلم کی عبیر گلال نہ بھائے　　　ہوری آئی سجن .....

جب وہ اپنے دل کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ پیاسے کے سامنے پانی کا گلاس رکھا تھا لیکن اسے پینے کی اجازت

نہ تھی۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ وہ پھاگن کے مہینہ میں بھی اپنی بیوی سے بات چیت نہیں کرسکتا تھا۔ ماں تو پُرانے خیال کی ہے لیکن وہ تو تعلیم یافتہ اور نئی روشنی کا تھا وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر اپنے گھر میں داخل ہو اس کی ماں سو رہی تھی۔ بسنت کی نگاہیں پاروتی کو تلاش کرنے لگیں وہ رسوئی گھر میں بیٹھی چاول چُن رہی تھی شوہر کو دیکھ کر اس نے گھونگھٹ کرنا چاہا لیکن بسنت نے اشارہ سے اس کو اپنی طرف بلایا۔ اس نے ..
"پاروتی کتنی گنوار ہے شوہر سے پردہ کرتی ہے" مگر یہ کوئی نئی بات نہ تھی وہ ہمیشہ سے پردہ کرتی چلی آئی تھی لیکن آج سے پہلے بسنت نے اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کی تھی۔ پاروتی نے گھبرا کر ساس کی طرف دیکھا وہ سو رہی تھی ——"آج ان کو کیا ہو گیا ہے ...... مجھے کیوں بلاتے ہیں ... ماں جی کا بھی کچھ خیال نہیں ...... اگر میں ان کا حکم نہیں مانوں گی تو یہ ناراض ہو جائیں گے ..... اور اگر ان کے پاس جاؤں اور ماں جی جاگ اٹھیں تو ......" پاروتی کو سوچتے دیکھ کر بسنت سے خاموش نہ رہا گیا اس نے کہا —— "اجی سنتی ہو یا نہیں میں کہتا ہوں ادھر آؤ ......" یہ کہتا ہوا بسنت ... چھت پر چلا گیا۔
پاروتی سہمی ہوئی اٹھی اور ساس کی طرف خوف بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی دبے پاؤں بسنت کے پاس پہونچ گئی

"کھڑی کیوں ہو پلنگ پر بیٹھ جاؤ"

"جی ——"

"میں تو کہتا ہوں کہ پلنگ پر بیٹھ جاؤ اور تم "جی! جی!" کی رٹ لگا رہی ہو"

"اگر ماں جی جاگ اٹھیں اور انہوں نے مجکو یہاں دیکھ لیا تو بڑی بُری بات ہوگی"

"یعنی مجھ سے ملنا بُری بات۔ ہے کیا خوب؟ کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتی ہو۔ ہو نہ آخر دیہاتن؟"

"لیکن اب تک نہیں ملے یہ کس کی بیوقوفی تھی۔ میں تو دیہاتن ہوں لیکن آپ کو شہر میں رہ کر بھی آج سے پہلے کبھی اس کا خیال نہیں آیا"

بات معقول تھی لیکن بسنت اپنی ہار ماننے کیلئے تیار نہ تھے انھوں نے کہا۔ "خیر فضول بحث کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ سنو اور غور سے سنو میں نے اب تک بہت ضبط کیا لیکن اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا اب میں جاتا ہوں اور دل سے چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھو مجھ سے باتیں کرو۔ اور میرا دل بہلاؤ۔" اتنا کہہ کر بسنت نے پاروتی کا ہاتھ تھام کر پلنگ پر بٹھا لیا۔

گون ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ دن کے وقت پاروتی اپنے شوہر کے پاس بیٹھی ہو شرم و لحاظ کے ڈر سے وہ کانپنے لگی یہ حالت دیکھ کر بسنت نے پاروتی کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا ...... ٹھیک اسی

ادھا جو جاگ اٹھی تھی پاروتی کو تلاش کرتی ہوئی اوپر پہونچی - کمرہ کا ایک دروازہ کچھ کھلا ہوا تھا اس کے سامنے
ہونچتے ہی رادھا اس طرح چونک اٹھی جیسے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہو ــــــ دو بہر کی روشنی میں یہ نظارہ
یھ کر نئی روشنی سے متنفر قدیم خیالات پر جان دینے والی ماں سناٹے میں آگئی اور چپ چاپ اُلٹے پاؤں نیچے
گئی - وہ دل میں سوچ رہی تھی ــــــ " رام ! رام ! میری بھی ایک دن شادی ہوئی تھی مگر میں نے
یسی بے شرمی سے کبھی کام نہیں لیا - کلجگ کا زمانہ ہے جو کچھ نہ ہو جائے تھوڑا ہے "

(۲)

ہَوا اور آگ کا میل ہو گیا - ادب و لحاظ سب کچھ محبت کی آگ میں جل کر خاک سیاہ ہو گئے - بیوی کی تربیت
بسنت کی زندگی کا اصلی مقصد ہو گیا - لوک لاج سے اس نے چشم پوشی اختیار کر لی اب پاروتی دن رات بسنت
کمرہ میں رہنے لگی پاروتی یتیم تھی اس کے ماں باپ مر چکے تھے خیال تھا کہ سسرال میں اُسے آرام ملے گا مگر یہاں آتے
رادھا نے اُسے گھر ستی میں ایسا جکڑا کہ اُسے آرام ہی نہ ملا اس کا حسن و شباب مٹی میں ملنے والا تھا مگر بسنت
ٹھیک وقت پر سوکھے ہوئے کھیت کو حمیت کی آبیاری سے شاداب کر دیا اس کی ناز برداریوں سے پاروتی
دل کا باغ لہلہانے لگا -

پاروتی حُسن کی دیوی تھی مگر وہ تعلیم یافتہ نہ تھی بسنت نے اس کو پڑھانا شروع کر دیا - پہلے پہل تو دیہاتی
پڑھنے سے گھبرائی مگر پھر مجبوراً اس کو شوہر کا حکم ماننا پڑا - جب دیکھیے کمرہ میں بیٹھی ہوئی سر ہلا ہلا کر پڑھتی رہتی
اور ماسٹر صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے قانونی کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے تھے بیچ بیچ میں ترچھی نظروں
شاگرد کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے کہ وہ جی لگا کر پڑھتی ہے یا نہیں - کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ بسنت اپنی
بند کر کے یکبارگی پکار اٹھتے ــــــ " پاروتی ! " پاروتی چونک اٹھتی اور گھبرا کر بسنت کی طرف دیکھنے
- اس وقت اس کی ہرنی سی نشیلی آنکھیں ایسی پیاری معلوم ہوتیں کہ بسنت بیتاب ہو جاتا اور کہتا
اچھا اب اپنی کتاب میرے پاس... تو لاؤ دیکھوں تو سہی تم کیا پڑھتی ہو ؟" پاروتی گھبرا جاتی کہ
ماسٹر صاحب امتحان نہ لینے لگیں - کیونکہ امتحان میں پاس ہونے کی اسے بہت کم امید ہوا کرتی
ت کوشش کرنے پر بھی اس کا جی پڑھنے میں نہ لگتا تھا وہ سبق پڑھ کر جتنا یاد کرنے کی کوشش کرتی
کالے کالے حروف چیونٹیوں کی قطار کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سے نکلتے جاتے تھے -
ماسٹر صاحب کے بُلانے پر پاروتی ملزم کی طرح ڈرتے ڈرتے کتاب لے کر جاتی - بسنت اپنا ایک ہاتھ
ں کمر میں اس طرح سے ڈال دیتا کہ وہ بھاگ نہ سکے اور دوسرے ہاتھ میں کتاب لے کر کہتا - . . .

اچھا . . . .

بتاؤ آج کتنا پڑھا ہے" پاروتی جتنی سطروں پر اس کی نظر پڑتی انگلی سے بتا دیتی۔ بسنت حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا۔ " اوہو! بہت پڑھ ڈالا مجھ کو دیکھو میں تو کچھ بھی نہیں پڑھ سکا"

بھولی بھالی پاروتی حیرت زدہ ہو کر کہتی۔ " تو اتنی دیر تک آپ کیا کرتے رہے؟"

بسنت اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا ——" میں ایک بیدرد۔ سنگدل دیوی کا درشن کر رہا تھا اور وہ میری طرف دیکھتی بھی نہ تھی ——"

پاروتی اس کا جواب دے سکتی تھی مگر لاج کے مارے اور پریم کے دباؤ سے وہ اپنی ہار مان لیتی تھی کبھی کسی دن بسنت کہیں باہر جاتا تو موقع پاکر پاروتی پڑھنے میں لگ جاتی اتنے میں بسنت نہ معلوم کہاں سے دبے پاؤں آکر پیچھے سے اس کی آنکھیں بند کر لیتا اور کہتا —— " اچھا بتاؤ! میں کون ہوں؟" اس پر پاروتی اپنی آنکھوں سے بسنت کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتی ہوئی کہتی —" واہ جی واہ! میں جان گئی بس اب آنکھیں کھول دو۔ آپ میرے ہردیشور ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نہ؟" اس پر بھی بسنت ہاتھ نہ ہٹاتا تو پاروتی اس کے ہاتھوں میں چٹکیاں لینے لگتی اور کوشش کرکے یکبارگی کھڑی ہو جاتی اس طرح سے اس کی آنکھیں تو کھل جاتیں لیکن اس کے دونوں ہاتھ بسنت تھام لیتا۔ اس " جنگ عظیم" میں پاروتی کے رخسار بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو جاتے کتاب دور گر جاتی اور ساڑی کا پلہ سر سے کھسک کر کندھے پر اور پھر وہاں سے سینہ پر سے گذر کر پاؤں پر گر پڑتا۔ اپنی اس بے بسی پر پاروتی کو غصہ آجاتا اور وہ رو پڑتی۔ بس جنگ عظیم، فوراً ختم ہو کر صلح کی کارروائی شروع ہو جاتی۔

پاروتی کے پڑھنے کے وقت جب بسنت اس کو بہت پریشان کرتا تو وہ کتاب بند کرکے کہتی۔ " تو کیا آپ مجھے جاہل رکھنا چاہتے ہیں؟"

" تو تمہاری کرپا سے میں ہی کون پنڈت ہوا جاتا ہوں"

یہ سنکر پاروتی اٹھ کر چلنے کے لئے تیار ہو جاتی اور کہتی۔ " اچھا اب میں سمجھ گئی میری وجہ سے آپ کے پڑھنے میں حرج ہوتا ہے۔ اب میں یہاں نہ بیٹھوں گی لو جاتی ہوں ——"

بسنت اس کا ہاتھ تھام کر پھر بٹھا لیتا اور کہتا —— " اس کا خیال تم کیا جانو مجکو چھیڑ کر تم آسانی پڑھنے لگتی ہو مگر تم کو چھیڑ کر پڑھنا میرے لئے آسان نہیں ہے"

" اچھا جب آپ یہاں نہ رہا کریں گے تو میں پڑھا کروں گی"

" یہ تو میں ہرگز پسند نہ کروں گا"

" کیوں "

"اس لئے کہ تمھارا جی پڑھنے میں لگ جائے گا تو پھر تم مجھے بھول جایا کروگی"
"واہ! واہ! کیا بات بنائی ہے"

اسی قسم کی نوک جھونک دونوں میں ہوتی رہتی تھی اس کے بعد کنوار کی ہلکی بارش کی طرح رونا دھونا شروع ہو جاتا جیسے دھوپ میں کبھی کبھی ترشح ہو کر یکایک بند ہو جاتا ہے اسی طرح پاروتی کا بھی حال تھا روتی بھی تھی اور ہنستی بھی تھی۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہونا چاہئے وہی ہوا نہ تو بسنت ہی وکالت پاس کر سکا اور نہ پاروتی ہی اپنی پہلی کتاب ختم کر سکی۔

(۳)

پاروتی اور بسنت تو پریم لیلا میں پھنسے تھے اور رادھا گرہستی کے کاموں میں پسی جا رہی تھی اس کو کسی وقت آرام نہ ملتا تھا اگر پاروتی کوئی کام کرنے کے لئے تیار بھی ہوتی تو رادھا کہتی ــــــ "رہنے دو بہورانی! تم کیوں تکلیف اٹھاتی ہو بسنت دیکھ لیگا تو خفا ہوگا جاؤ جاؤ آرام کرو پڑھو لکھو کر پنڈتائن بن جاؤ۔ مجھے تمھاری ضرورت نہیں بڑھی ہوں تو کیا میں اب بھی گرہستی کا کام تم ایسی نازک بدن لڑکیوں سے زیادہ اچھی طرح سے کر سکتی ہوں۔ جیتے جی بھگوان مجکو تمھارا محتاج نہ بنائے" یہ الفاظ پاروتی کے دل پر تیر کی طرح سے لگتے ان الفاظ میں کتنا زہر بھرا تھا یہ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن سمجھ کر بھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ رادھا کی خواہش تھی کہ ہمیشہ کی طرح پاروتی اس کے اشارہ پر چلے مگر اب یہ محال تھا پاروتی اپنے شوہر کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھی اور اب جبکہ وہ بڑی آزادی سے اپنے شوہر کی محبت کا لطف اٹھا رہی تھی وہ ساس کی خوشامد کیوں کرتی۔ عرصہ تک اسی طرح کام چلتا رہا لیکن ہڈیوں کا ڈھانچہ کہاں تک کام دیتا بوڑھی اور کمزور رادھا محنت۔ رنج و غم اور جلن سے بیمار پڑ گئی شروع میں معمولی زکام ہوا اور پھر اسی نے رفتہ رفتہ مہلک بیماری کی صورت اختیار کر لی اور رادھا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پرلوک سدھاری۔ پاروتی اور بسنت کو بہت صدمہ ہوا لیکن رفتہ رفتہ سب رنج و غم دور ہو گیا اور پھر دونوں محبت کے گہوارے میں جھولنے لگے۔ مگر اب یہ وقت پیش آئی۔ کہ گرہستی کا کام کیسے چلے۔ پاروتی آرام طلب ہو چکی تھی جو کا برتن تو کہارن کر دیتی تھی لیکن پاروتی کو کھانا پکانا پڑتا تھا کچھ دن تک تو اس نے کسی نہ کسی طرح کام چلایا لیکن پھر بیمار پڑ گئی اب بسنت گھبرا گئے ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کام کیسے چلے۔ پاروتی کے میکے "بسیڑھی" میں اسکی ایک چچیری بال ودھوا بہن مایا جو اس سے دو چار سال بڑی تھی رہتی تھی۔ بسیڑھی ایک ویران مقام پر چھوٹا سا گاؤں تھا اسی گاؤں میں مایا ناامیدی کے تاریک سمندر میں غوطے کھاتی ہوئی باغ کی اس بیل کی طرح جس کی جڑ پہلے ہی سے کٹی ہوئی ہو اپنے باپ کے ساتھ دن کاٹ رہی تھی ماں لڑکپن ہی میں مر چکی تھی۔ ایک دن پاروتی نے مایا کو یاد کیا اور بسنت

سے کہا۔ " اگر کہو تو مایا کو میں یہاں بلالوں بڑی نیک لڑکی ہے اس سے مجکو بڑی مدد مل جائے گی "
بسنت۔ " بھلا تمھارے چچا اس کو یہاں آنے کی کیوں اجازت دیں گے "
پاروتی۔ " میری بیماری کا حال سنکر وہ مایا کو ضرور بھیجدیں گے۔ مایا میری سہیلی ہے اس کے آنے سے میری طبیعت بھی بہل جائے گی "

بسنت نے دوسرے ہی دن مایا کو بلوا بھیجا اور وہ رانی پور آگئی۔ شام کا وقت تھا جب مایا بہلی سے اُتر کر پاروتی کے گھر میں داخل ہوئی اس وقت بسنت کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ پاروتی پلنگ پر پڑی تھی مایا کو دیکھتے ہی وہ خوش ہو کر اُٹھ بیٹھی ——— " آؤ جیجی! اچھی تو رہیں تم نے تو کبھی بھول کر بھی میری خبر نہ لی "
مایا ——— " بس رہنے دے باتیں نہ بنا یہ تو کہتی نہیں کہ سسرال میں آکر ہم غریبوں کو بھول گئی الٹا مجھے الزام دیتی ہے خیر یہ باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی یہ تو بتا کہ تیرا یہ کیا حال ہو گیا۔ جیجا سے اچھی طرح بنتی تو ہے نہ؟
پاروتی نے مسکرا کر کہا۔ " ہاں خوب۔ پرماتما کا ہزار ہزار شکر ہے " وہ " مجھ پر بہت مہربان ہیں مجھے یہاں کسی بات کی تکلیف نہیں۔ رہ گئی میری بیماری کو سچی بات یہ ہے کہ ساس جی ہی گھر کا سب کام کرتی تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد سے گرہستی کا کام مجکو سنبھالنا پڑا کام کرنے کی عادت نہ تھی اس وجہ سے بیمار پڑ گئی جیجی! میں نے اسی وجہ سے تم کو تکلیف دی ہے کہ تم میرا گھر سنبھال لو مجھ اکیلی جان سے گرہستی کا کام نہیں سنبھل سکتا اب تم کو یہاں سے کبھی نہ جانے دوں گی ——— مگر جیجی! ایک بات کہتی ہوں دیکھو بُرا نہ ماننا تم میری بہن ہو اور میں نے تم کو اسی رشتہ سے بلایا ہے کہیں کچھ اور خیال نہ کرنا "
مایا نے منھ بنا کر کہا ——— " واہ ری پگلی! بھلا اس میں کون بُرا ماننے کی بات ہے۔ کسی غیر کا تو کام ہے نہیں یہ اپنا کام ہے دونوں میں اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ بسنت آگئے۔ مایا نے اس سے پہلے بسنت کو نہ دیکھا تھا وہ خاموش ہو گئی "

پاروتی نے بسنت سے کہا ——— " یہ لو میری مایا جیجی آگئیں۔ اب میری طبیعت اچھی ہو جائے گی "
بسنت نے مسکرا کر کہا ——— ضرور۔ کہو جیجی اچھی تو رہیں "
مایا نے کچھ شرما کر جواب دیا ——— " ہاں بھیا "

تعارف ہو جانے کے بعد سب نے کھانا کھایا۔ پاروتی اور بسنت تو اپنے کمرہ میں چلے گئے اور مایا کو ایک دوسرا کمرہ جو اُن کے کمرہ سے کچھ دور پر تھا رہنے کو مل گیا۔ دن بھر کی تھکی مایا بہت جلد نند یا دیوی کی گود میں سو گئی۔

(۴)

رات میں تو مایا کو گھر دیکھنے کا اچھی طرح سے موقع نہ ملا تھا صبح کو اس نے دیکھا کہ گھر بہت ردی حالت

یں ہے صحن میں کوڑا کرکٹ کا انبار لگا ہے رسوئی گھر میں کوئی چیز سلیقہ سے نہیں رکھی ہوئی ہے۔ مایا نے سب سے پہلے گھر کی صفائی کی بسنت کے کمرہ کو صاف کیا اور پھر کھانا پکایا۔ اس دن بسنت نے کھانا کھایا تو بہت تعریف کی پاروتی بھی بہن کی تعریف سنکر بہت خوش ہوئی۔ اب وہ پھر آزاد ہوگئی اسے کوئی کام نہ کرنا پڑتا تھا اس نے بھنڈار خانہ کی کنجی مایا کو دیتے ہوئے کہا۔ "بس جیجی اب میں بے فکر ہوگئی اب تم میرا گھر سنبھال لوگی"۔

مایا نے کنجی واپس کرنیکی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں پاروتی! اس کو تم اپنے پاس ہی رکھو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے"

پاروتی۔ "بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کنجی تم اپنے ہی پاس رکھو۔ کیا تم مجکو اپنی بہن نہیں سمجھتی ہو؟"

مجبوراً مایا نے کنجی لے لی۔ اب مایا ہی تمام گھر کا انتظام کرتی تھی اس نے تھوڑے ہی دنوں میں پاروتی کا گھر بنا دیا وہی گھر جو پہلے گندگی کا مخزن تھا اب رشک چمن بن گیا۔ پاروتی اور بسنت سوتے ہی رہتے لیکن مایا علی الصبح اٹھکر ان کے کمرہ کو صاف کر آتی بسنت کی کتابیں جو ادھر اُدھر بے ترتیبی سے پڑی رہتیں ان کو ٹھکانے سے رکھ آتی۔ مایا کی سلیقہ مندی نے آہستہ آہستہ بسنت کے دل میں جگہ پیدا کر لی تھوڑے دن تک مایا بسنت سے بے تکلف نہ ہوئی ایکدن پاروتی نے مایا سے کہا۔ "جیجی! تم "اُن" سے شرماتی کیوں ہو انسے خوب کھل کر باتیں کیا کرو"۔ مایا اس کے جواب میں مسکرا کر چپ ہوگئی اتفاق سے بسنت بھی اس موقع پر آگئے اور انھوں نے بھی شکوہ کیا کہ مایا اُن سے کیوں بات نہیں کرتی۔ اس دن سے مایا بسنت سے کچھ کچھ باتیں کرنے لگی اور رفتہ رفتہ وہ اسّں بے تکلف ہوگئی۔ پہلے وہ اس جگہ سے ہٹ جاتی تھی جہاں مایا اور بسنت ہنستے بولتے تھے روکنے سے بھی نہ ٹھیرتی تھی مگر اب وہ ان کی ہنسی مذاق میں بھی حصہ لینے لگی۔ جب پاروتی کبھی بسنت کا مذاق اُڑاتی تو مایا بھی پاروتی کا ساتھ دیتی۔ میل جول اور بات چیت ہی سے کسی کی خوبی یا برائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بسنت کی نگاہوں میں مایا کی قدر و وقعت بڑھنے لگی اب اُسے مایا کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی خوبی نظر آنے لگی۔

مایا نے بائیسویں سال میں قدم رکھا تھا اس لحاظ سے وہ ایک شگفتہ پھول تھی لیکن ایسا پھول جو عموماً دوپہر کے وقت کھلتا ہے اور دھوپ سے مرجھانے لگتا ہے۔ مایا کے خوشنما چہرہ پر ایک خاص قسم کی رونق ضرور تھی لیکن ایسی رونق جو عموماً دوپہر کے وقت پھولوں پر ہوتی ہے جن پر صبح کی شبنم سے بنائے ہوئے پھولوں کی صباحت اور نسیم سحری کے پنکھا جھلے ہوئے تازگی کے آثار کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ مایا کی آنکھوں میں نشۂ شباب سے سُرخ ڈورے دوڑ رہے تھے۔ مگر ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ اور مانگ میں سُہاگ کی لکیر نہ تھی کیونکہ وہ بیوہ تھی اور ایسی بدنصیب بیوہ جس کا سہاگ لڑکپن ہی میں اُجڑ گیا تھا۔ اور اب وہ بیوگی کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے حسن و شباب پر خزاں نے اپنا قبضہ جما رکھا تھا۔

عرصہ تک پانی نہ ملنے سے جس طرح پودا مرجھانے لگتا ہے لیکن پانی پاتے ہی وہ لہلہا اٹھتا ہے۔ وہی حال مایا کا بھی ہوا جب اس پر پاروتی کی محبت اور بسنت کی عنایت کی بارش ہوئی تو اس کا غنچۂ دل کھل اٹھا اس کے چہرہ پر شگفتگی آگئی۔ گلاب کے پھول پر گرد جم گئی تھی ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے نے وہ گرد اڑادی اور پھول نکھر کر خوبصورت معلوم ہونے لگا۔

برسات کی اندھیری رات تھی زمینداری کے کام سے بسنت کسی دوسرے گاؤں میں گیا ہوا تھا واپس ہونے میں اُسے بہت دیر ہوگئی۔ مایا کھانا پکا کر پاروتی کے کمرہ میں بیٹھی ہوئی ادھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی پاروتی نے کہا۔ "رات زیادہ ہوگئی ہے آسمان گھرا ہے پانی برسنے والا ہے مگر وہ اب تک واپس نہیں آئے"

مایا۔ "آتے ہی ہوں گے"

پاروتی۔ "میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے میں تو اب سوتی ہوں وہ آئیں تو بھوجن پروس دینا۔ تکلیف تو ہوگی"

"نہیں نہیں تکلیف کس بات کی اچھا تم آرام کرو" یہ کہکر مایا رسوئی گھر میں چلی گئی اور آرام طلب مایا تھوڑی دیر میں خراٹے لینے لگی۔ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج میں بسنت گھر میں داخل ہوا اب پانی بھی برسنے لگا تھا مایا نے رسوئی گھر سے نکل کر کہا۔ "پارو (پاروتی) کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ آپ کا انتظار کرکے سوگئی کہے بھوجن پروس دوں"

"اوہو تو کیا تم اب تک میرے ہی انتظار میں بیٹھی ہو"

مایا کے رنگیلے رسیلے ہونٹ اس کا جواب دینے کے لئے پھڑک اُٹھے لیکن وہ صرف "جی ہاں" کہہ سکی۔ اس وقت بجلی پھر چمکی سفید دھوتی میں مایا کا چہرہ چمک اٹھا بسنت کی آنکھیں چوندھیا گئیں بسنت نے سنبھل کر کہا۔ "اچھا میں رسوئی گھر ہی میں آتا ہوں وہیں بھوجن کروں گا کمرہ میں کھانا لانے کی ضرورت نہیں"

بسنت کپڑے بدلنے کے لئے اپنے کمرہ میں چلا گیا اس عرصہ میں مایا نے جلدی جلدی آگ جلا کر گرم گرم پوریاں تل ڈالیں۔ بسنت آیا تو اس نے آسن بچھا کر بھوجن پروسا اور بسنت کے سامنے رکھدیا۔ آج خلاف معمول بسنت کو ہمیشہ سے زیادہ کھانے میں مزہ ملا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "مایا! اُف مایا! کتنی ہنرمند۔ سلیقہ شعار اور دلکش لڑکی ہے۔ اس کی آنکھوں میں تو جادو بھرا ہے" بسنت نے نظر اٹھا کر مایا کی طرف دیکھا وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی بسنت کی زبان سے بے خودی میں نکل گیا۔۔۔ "مایا!" مایا نے سر اٹھایا بسنت اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا دونوں کی نظریں لڑ گئیں مایا کانپ اٹھی بسنت کا دل مچل اٹھا۔ اس کی زبان سے نکل گیا "آہ تم کتنا اچھا کھانا پکاتی ہو اور کھانے ہی کا کیا ذکر تمھاری تو ہر بات بہت اچھی معلوم ہوتی ہے

اور کیوں نہ ہو جب تم خود اچھی ہو ——" مایا نے شرماکر سر جھکا لیا وہ پھر بسنت سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ کرسکی "اور کیوں نہ ہو جب تم خود اچھی ہو ——" یہ صدا اس کے کانوں میں بار بار گونجنے لگی۔ آج تک کسی مرد نے اس سے ایسی باتیں نہ کی تھیں۔ ایسی باتیں اس کے لئے معیوب تھیں —— مگر اس وقت مایا کا جی چاہتا تھا کہ بسنت برابر ایسی ہی باتیں کرتا رہے۔

کھانا کھانے کے بعد جب بسنت منھ ہاتھ دھو چکا تو مایا نے پان دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بسنت نے اس کی انگلی کو دبا دیا مایا کو ایسا معلوم ہوا گویا بچھو نے ڈنک مار دیا اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور رسوئی گھر سے نکل کر اپنے کمرہ کی طرف بھاگی تمام صحن میں پانی بھرا تھا اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑی بسنت نے جلدی سے دوڑ کر اسے اٹھا لیا۔ مایا کی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی لٹیں بسنت کے رخساروں کا بوسہ لینے لگیں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مایا تڑپ کر بسنت کی آغوش سے جدا ہو گئی۔ شرم و غیرت سے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

بسنت نے کہا —— "کہیں چوٹ تو نہیں لگی"

"نہیں"، کہتی ہوئی مایا دوڑ کر اپنے کمرہ میں گھس گئی اور اندر سے زنجیر لگا دی۔ وہ تمام رات روتی رہی۔ غیرت شرم و لحاظ۔ ڈر رسوائی یا اپنی بیکسی پر، یہ معلوم نہیں۔ ادھر بسنت کی بھی ساری رات بڑی بے چینی سے گذری —— "کیا میں نے کوئی پاپ کیا ہے؟ —— وہ گر پڑی تھی اس کو اٹھانا کیا میرا فرض نہیں تھا۔ مگر —— کیا میں پاردتی کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں —— کہیں مایا میری شکایت پاردتی سے نہ کر دے —— اُف پھر تو میں منھ دکھانے کے لائق نہ رہ جاؤں گا۔ مگر اُدھر اشکایت بھی کر دے گی تو میرا کیا ہوگا ——"

بسنت کی ساری رات اسی ادھیڑ بُن میں گذری۔

(۵)

اس کے بعد کئی دن تک پھر بسنت کو مایا سے ملنے کا موقع نہ ملا یا خود مایا ہی تنہائی میں بسنت کے پاس نہ گئی۔ بسنت کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ مایا نے پاردتی سے اس کی شکایت نہیں کی تو وہ دل میں بہت خوش ہوا۔ اور اب اس کی ہمت بڑھ گئی لیکن جتنا مایا کے قریب پہونچنے کی کوشش کرتا مایا اتنا ہی اس سے دور بھاگتی مگر یہ حالت بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ برسات میں ندی جب جوش پر آتی ہے تو اس کی تھاہ نہیں ملتی پھر بھی ملاح تھاہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح مایا بھی بسنت کے دل کی تھاہ لے رہی تھی وہ عورت تھی اور ایسی عورت جس کا سہاگ اجڑ چکا تھا جو سماج کی ستائی ہوئی تھی جس نے محبت کا کبھی مزہ ہی نہ چکھا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے دل میں محبت کے جذبات نہ تھے یا اس کا دل محبت سے خالی تھا وہ

پریم کی پیاسی تھی اس کی دلی خواہش تھی کہ کوئی اس سے محبت کرے اور وہ بھی اس کے بدلے میں اپنی محبت پیش کرے لیکن سماج کے ڈر سے اُسے اس کا موقع ہی نہ ملتا تھا وہ اپنی خواہش کو دبائے ہوئے تھی مگر جب سماج ہی نے اس کا موقع دیا تو اس کے دل سے محبت کا دریا پھوٹ نکلا - اتفاق سے وہ ایسے گھر میں پہونچی - جہاں اس کو سماج کے ایک خوش مزاج مرد نے شراب محبت کا پیالہ پیش کیا وہ انکار نہ کرسکی - جس طرح راکھ میں دبی ہوئی چنگاری ذرا سا کریدنے سے چمک اٹھتی ہے اسی طرح مایا کی محبت کی آگ بھی بھڑک اٹھی جس نے شرم و لحاظ اور خوف رسوائی کو جلا کر خاک کر دیا -

بسنت کا عجیب حال تھا اب اس کو مایا کا لب و لہجہ اتنا دلکش اور سرور انگیز معلوم ہوتا کہ اس پر ایک بیخودی سی طاری ہو جاتی مایا کے ایک ایک لفظ میں بسنت نے وہ اثر محسوس کیا کہ بھولی بھالی پاروتی کی پریم رس میں بھری باتیں اسے پھیکی معلوم ہونے لگیں سچے موتی کی آب و تاب کو جھوٹے موتی کی عارضی چمک نے ماند کر دیا - شرابی نشہ کے بعد درمیان ہی میں خمار آنے پر پھر شراب پینے کی خواہش کرتا ہے تاکہ رنگ جما رہے مگر یہ نشہ پاروتی کہاں سے لائے وہ مایا کے جال سے بے خبر تھی بسنت کی طرف سے اس کو اطمینان تھا اپنی بہن پر پورا بھروسہ تھا عین اس خماری کی حالت میں جب مایا نے پرانی شراب نئے رنگین پیالہ میں بھر کر ایک عجیب ادا سے بسنت کو پیش کی تو وہ مدہوش ہو گیا اس کا سر ساقی کے قدموں پر جھک گیا مگر بسنت کی مدہوشی نے مایا کے قدموں کو بھی ڈگمگا دیا بہت کوشش کرنے پر بھی وہ سنبھل نہ سکی اور خود بھی نشہ میں چور ہو گئی

سردی رُت تھی صاف شفاف دن تھا آسمان نیلگوں تھا دوپہر کے سناٹے میں پاروتی سو رہی تھی - مگر جوانی سے دیوانی مایا اپنی آرام گاہ میں فرشی تکیہ کے سہارے لیٹی ہوئی اپنے مستقبل کے متعلق کچھ سوچ رہی تھی اس وقت اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس کے سر پر کوئی کپڑا بھی ہے یا نہیں - وہ ایک نیم آستین اور سفید دھوتی پہنے ہوئے تھی دھوتی سر سے سرک کر کمر کے گرد لپٹ گئی تھی اور نیم آستین بھی اپنا فرض اچھی طرح سے نہیں ادا کر رہی تھی - اتفاق سے بسنت کسی کام سے مایا کے کمرہ کی طرف نکل گیا سوانتی کو دیکھ کر متوالا پپیہا آپے میں رہے یہ محال ہے مایا کے پلنگ سے دو قدم کے فاصلہ پر پہونچ کر بسنت ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ سب بناؤ اسی کو تڑپانے کے لئے کئے گئے ہیں اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا — "اُف مایا! اس وقت تم کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی ہو" یہ کہتے ہی اس کے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھ گئے - اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مایا کو گلے لگانا چاہتا ہے - مایا گھبرا کر اٹھی اور بسنت سے دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی - خوف اور شرم سے اس کے چہرہ کا رنگ غروب ہونے والے آفتاب کی طرح سرخ ہو گیا اس نے کمرہ سے باہر نکل جانے کے لئے قدم بڑھایا مگر بسنت نے روکتے ہوئے کہا — "مایا! ہاتھ جوڑتا ہوں ٹھیر جاؤ — صرف تھوڑی دیر کے لئے ٹھیر جاؤ —" مایا کے قدموں

میں جیسے کسی نے زنجیر ڈال دی بسنت کی محبت آمیز آواز سنکر پاؤں ہی نہیں بلکہ سارے جسم نے ایک مٹی کے بنے ہوئے بت کی سی شکل اختیار کرلی۔ بسنت نے جرأت کرکے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مایا کے کندھوں پر کانپتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ بسنت کے چھونے سے مایا کے دونوں گال سرخ اور پیشانی پسینہ سے تر ہو گئی اس کی تمام شوخی اور تیزی نہ جانے کہاں چلی گئی اور وہ منتر کے بس میں آئی ہوئی ناگن کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑی رہ گئی۔ بسنت نے مایا کے گلابی گالوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —— "کیا مجھ سے خفا ہو ؟"

"نہیں ——"

"تو پھر مجھ سے کیوں دور بھاگتی ہو۔ مجھ سے ہنس کر باتیں کیوں نہیں کرتی ہو۔"

"مجھ سے باتیں کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ مجکو میرے حال پر پڑا رہنے دیجئے۔ اگر آپ کی یہ منشا ہے کہ میں اس گھر کو چھوڑ دوں تو اچھی بات ہے میں کل بیسیر ڈی چلی جاؤں گی۔ اچھا بس اب آپ یہاں سے چلے جائیے۔"

"میں کیا کروں اپنے دل کے ہاتھوں سے مجبور ہوں مایا !"

"ایسے دل کو نکال کر پھینک دیجئے جو پاپ ساگر کی طرف لئے جا رہا ہو" یہ کہکر مایا نے بسنت کے دونوں ہاتھوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیا اور کسی قدر ہٹ کر بولی۔ "آپ کا کیا بگڑے گا آپ مرد ہیں مگر میں دکھیا تو کہیں کی نہ رہوں گی، سماج میں کہیں مجھے جگہ نہ ملے گی"

"اونھ! سماج کا کیا ذکر۔ سماج کو میں ٹھیک کر لوں گا اس کو ہمارے تعلقات کا پتہ ہی نہ چلنے پائے گا"

"جی ہاں پتہ نہ چلنے پائے گا۔ یہ خوب کہی! آپ کو باتیں بنانی خوب آتی ہیں مگر میرے حال پر کرپا کیجئے اور فوراً یہاں سے چلے جائیے کہیں پاروتی آگئی تو میں منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاؤں گی۔"

بسنت نے گویا کچھ سنا ہی نہیں اس نے مایا کا ہاتھ تھام کر کہا —— "تو اچھا صرف دو منٹ جی بھر کر اس چاند سے مکھڑے کو تو دیکھ لینے دو"

زور سے جھٹکا دے کر مایا نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پاروتی کے کمرہ میں چلی گئی۔

(۶)

اب پاروتی کو بسنت گویا بھول گیا تھا وہی پاروتی جسکو وہ کسی وقت اپنی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا وہی پاروتی جس کے لئے اس نے اپنی ماں کی بھی کچھ پرواہ نہ کی تھی اب دن رات اپنے کمرہ میں پڑی رہتی تھی۔ بسنت کے دل کا حال اس سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ بسنت اب پاروتی سے بہت کم بولتا تھا کچھ عرصہ تک تو اس نے پاروتی کا لحاظ کیا لیکن پھر اس نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اب اس کا زیادہ وقت مایا سے ہنسی مذاق میں گذرتا تھا۔ ہر وقت اس کی زبان پر مایا ہی کی تعریف رہتی تھی۔ وہی پاروتی جو کبھی مایا کی تعریف سنکر

خوش ہوا کرتی تھی وہی اب مایا کی تعریف سنکر جلنے لگی - اب تو اُسے مایا کی صورت سے بھی نفرت ہوگئی - مرد کے دل کو کس طرح سے اپنے قابو میں کیا جا سکتا ہے - مرد کس بات سے خوش ہوتا ہے یہ اس کو معلوم نہ تھا بسنت اس کو بغیر کسی کوشش اور محنت کے بڑی آسانی سے مل گیا تھا اب اس کو مایا کے جال میں پھنسا دیکھ کر پاروتی تلملا اٹھی لیکن پھر بھی اس نے وہ طریقہ اختیار نہ کیا جس سے مایا کا جال ٹوٹ جاتا بلکہ اس کی ناتجربہ کاری نے اسے غلط راستہ پر ڈال دیا بسنت کو سنبھالنے کے بجائے وہ مایا سے لڑنے کو تیار ہوگئی اب وہ اُٹھتے بیٹھتے مایا کو طعنہ دینے لگی لیکن مایا نے کچھ بُرا نہ مانا اس نے پاروتی کے طعنوں کو بڑی خندہ پیشانی سے سنا اور خاموش رہی - پاروتی کی یہ حرکت بسنت کو بہت بُری معلوم ہوئی اور اُس نے پاروتی کو بہت لعنت ملامت کی اور ضد میں آکر پاروتی سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا اب وہ ہر کام مایا ہی کے اشارہ پر کرتا مایا ہی کی خاطر داری اور ناز برداری اس کی زندگی کا خاص مقصد ہوگیا اب مایا ہی گھر کی ملکہ تھی لیکن مایا ہمیشہ پاروتی کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی مگر اس کا نتیجہ اُلٹا ہی ہوتا تھا ایک دن پاروتی نے مایا کو خوب گالیاں سنائیں مایا جو اب تک خود کو سنبھالے ہوئے تھی گالیاں سنکر اپنے غصہ کو نہ ضبط کر سکی اس نے کہا " زبان سنبھال کر بات کر "

"مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی" پاروتی نے منھ بنا کر کہا -

"کیسی ؟"

"خود اپنے دل سے پوچھ لو"

"میں کچھ نہیں سمجھی"

"سمجھ کر بھی نہ سمجھو تو بھلا کوئی کیسے سمجھا سکتا ہے"

"تو صاف صاف کیوں نہیں کہتی ہو دل میں رکھنے سے کیا فائدہ - میں تو تمھاری خدمت کرنے یہاں آئی تھی اگر اب تم کو میری خدمت کی ضرورت نہیں ہے تو مجھے بسرٹھی بھیجدو - یہ روز روز کے طعنے شکوے مجھ سے اب نہیں سنے جاتے"

"میں نہ کہوں مگر دنیا کی کون زبان بند کر سکتا ہے - مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ خدمت کے صلہ میں تم میرے پتی کو مجھ سے چھین لوگی اگر مجھے یہ پہلے معلوم ہوتا تو میں تم کو ہرگز نہ بلاتی"

مایا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا — "پاروتی تمھارا خیال غلط ہے - پرماتما جانتا ہے کہ میرا دل اب تک پاک ہے - تمھارا سوامی تم کو مُبارک رہے"

"بہن جی! باتیں نہ بناؤ - میں تمھاری چال کو خوب سمجھتی ہوں پہلے تو مایا کے جال میں پھنسا دیا اور اب کہتی ہو کہ تمھارا سوامی تم کو مبارک رہے"

مایا کی بھنویں تن گئیں اس نے تڑپ کر کہا۔ " بارو! سچ کہتی ہو عورتوں کی ذات ہی مایاونی ہوتی ہے۔ مجھ میں کیا مایا تھی یہ تو میں نہ جان سکی مگر تم نے جان لیا۔ اسی طرح تم میں کیا مایا ہے تم نہیں جان سکتیں مگر میں واقف ہو گئی۔ مجھ میں مایا ضرور تھی ورنہ ایسی نوبت کبھی نہ آتی میں نے کچھ جان کر اور کچھ نہ جان کر پھندا ڈالا ہی مگر اس میں میری کوئی خطا نہیں تم نے ہی مجھے اس کا موقع دیا ہماری جاتی کا دہرم ہی ایسا ہے۔ میں نے قسم بھی کھائی لیکن تم نے یقین نہ کیا اچھی بات ہے اب ہوشیار ہو جاؤ میں اب بتا دوں گی کہ مجھ میں کیا مایا ہے ــــ"

اتنا کہکر غرور۔ غصہ اور نفرت کی شکست سے مایا روپڑی وہ پاروتی سے اور کچھ نہ کہہ سکی جلدی سے اٹھی اور اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ رہی۔ شہد کی مکھی جب ضد پر آتی ہے تو جو بھی اس کے سامنے آئے اُسے کاٹ کھاتی ہے اسی طرح غصہ سے بھری ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی مایا بھی پاروتی کے گھر میں آگ لگانے کے لئے تیار ہو گئی اگر اُسے سکھ نہیں ملا تو وہ بھی اس کو جو اس کی راہ میں کانٹا ثابت ہو گا جلا کر خاک سیاہ کر دے گی۔

(۷)

اُس دن مایا دن بھر اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلی۔ شام کے وقت بسنت نے جب مایا کو نہ دیکھا تو اس نے گھر کی کہارن سے دریافت کیا اس نے پہلے تو چھپانا چاہا لیکن جب بسنت نے بہت مجبور کیا تو کہا " وہ اپنی کوٹھری میں ہیں ملکن سے کچھ بات ہو گئی ہے مگر کون بات ہوئی ہے یہ مجکو نہیں معلوم، رام جانیں "

بسنت کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس نے پاروتی سے جا کر غصہ میں پوچھا۔ " مایا کہاں ہے؟ "

" واہ ری مایا! مایا ہی سب کچھ ہے میں کچھ نہیں بہت دنوں کے بعد بات بھی کی تو وہی مایا کا ذکر! سچ ہے مرد کی ذات بڑی بے وفا ہوتی ہے ــ " یہ سوچ کر پاروتی کے دل پر چوٹ لگی اور اس نے تڑپ کر جواب دیا۔ " میں کیا مایا کے پیچھے پھرا کرتی ہوں۔ تمھارے دل میں تو ہر وقت مایا بسی رہتی ہے اُسی دل سے پوچھ لو کہ مایا کہاں ہے؟ "

غصہ کے مارے بسنت کا بُرا حال ہو گیا۔ سچی باتیں ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہیں مرد ہو کر وہ اپنی عورت سے شکست ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اُس نے بھی جل کر کہا۔ " مایا میرے دل میں ہے یا نہیں یہ تو پرماتما جانے لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ تم مایا کے جلن میں جلی جا رہی ہو اس کی خوبیاں تمھاری آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہی ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ تم مایا کا کسی بات میں مقابلہ نہیں کر سکتی ہو۔ اب اس ضد میں تو میں تم کو اور جلاؤں گا دیکھوں تم میرا کیا بگاڑ سکتی ہو ــ راتی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی اس کے سوا اور کیا ہو گا؟ تم بے فائدہ مایا سے لڑا کرتی ہو اور آج بھی لڑی ہو یہ مجھے معلوم ہو گیا یاد رکھنا اس کا نتیجہ تمھارے حق میں اچھا نہ ہو گا ــ " اتنا کہکر بسنت مایا کے کمرہ میں پہونچا۔ پاروتی کی آنکھیں کھُل گئیں نتیجہ کا خیال کر کے وہ کانپ اٹھی۔

بات اتنی بڑھ جائے گی یہ اس نے نہ سوچا تھا اس وقت بسنت کی دھمکی سُن کر وہ پریشان ہوگئی اس کی آنکھوں میں سارا جہان تاریک معلوم ہونے لگا اس نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالا اور کچھ سوچکر مایا کے کمرہ کی طرف چلی - فتح ہوگی یا شکست - یہ سوچنے کا موقع نہ تھا مگر مایا کی یہ بات کہ " ہم عورتوں کی ذات ہی مایا وِنی ہوتی ہے" اُسے یاد آگئی - پاروتی بھی عورت تھی اس میں بھی کوئی نہ کوئی مایا ہوگی پاروتی بھی اپنی مایا کا امتحان دینے کے لئے تیار ہوگئی - مایا کے کمرہ کا دروازہ کھلا تھا اور وہ پلنگ پر منھ لپیٹے پڑی تھی - پاروتی دروازہ ہی پر چھُپ کے کھڑی ہوگئی کہ بسنت اُسے نہ دیکھ سکے - مایا نے کروٹ لی بسنت نے کہا ---- " مایا ! "

محبت بھری آواز سنکر پیار کا دریا لہریں مارنے لگا وہ لہریں لطیف تھیں ان سے رگوں میں محبت کا رس دوڑ گیا مایا نے سر اٹھا کر بسنت کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر منھ چھپالیا

بسنت نے عاجزانہ لہجہ میں کہا ---- " مایا ! سچ بتاؤ آخر کیا بات ہے - کیا تم کو پاروتی نے کچھ کہا ہے "

مایا نے کچھ جواب نہ دیا مگر وہ رو پڑی - بسنت نے بیتاب ہو کر کہا - " مایا ! مایا ! مت روؤ - ہاتھ جوڑتا ہوں مت روؤ - میں تمھاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتا میری ہی وجہ سے تم کو بے فائدہ باتیں سننی پڑتی ہیں لیکن اب آیندہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا پاروتی بیوقوف ہے - نالائق ہے - میں اب اسکو ایسا سبق دوں گا کہ وہ بھی عمر بھر یاد رکھے گی - تم کو رنج کرنیکی کوئی ضرورت نہیں ہے لو بس اب اٹھو میں پاروتی کو اسی وقت گھر سے ..... " اس سے زیادہ بسنت کو کہنے کا موقع نہ ملا پاروتی یکایک کمرہ میں داخل ہوئی اور مایا کے قدموں پر گر کر رونے لگی وہ بڑی مشکل سے اتنا رُک رُک کہہ سکی - " جیجی ! مجھے معاف کردو اب میں تمھارے دل کو کبھی نہ دکھاؤں گی ..... مجھ سے غلطی ہوئی ..... تم میری بڑی بہن ہو میری کھشا کرو "

مایا گھبرا کر کھڑی ہوگئی - پتی ورتا پاروتی کے چہرہ پر دُکھ کی جلتی ہوئی آگ دیکھ کر مایا کے دل میں ایک جھلکی پیدا ہوئی - رنج و غم کے بہتے ہوئے پانی میں نہائی ہوئی بھولی بھالی پاروتی نے پراچین زمانے کی دیویوں کی طرح اپنے من کو مار دیا اب وہ معمولی عورت نہیں تھی بلکہ ستی ساوتری عورتوں کی طرح ہوگئی تھی ---------- وہ ہار کر جیت گئی اور مایا جیت کر بھی ہار گئی - جب آگ بہت تیز ہوتی ہے تو پانی کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے - پاروتی بچوں کی طرح سے بلک بلک کر رو رہی تھی مایا نے اُسے زور سے اپنے کلیجہ سے لگا لیا - مایا کا جال آناً فاناً ٹوٹ گیا - یہ موثر سین دیکھ کر پھر بسنت سے کمرہ میں نہ ٹھیرا گیا وہ دبے پاؤں باہر نکل گیا -

(۸)

بھادوں کی اندھیری رات تھی گھر کے سب لوگ سو رہے تھے مایا چپکے سے اٹھی اور دبے پاؤں پاروتی کے کمرہ میں جا پہونچی وہاں پہونچکر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے بڑی مشکل سے اس نے اپنے دل کو سنبھالا اور بھنڈار خانہ کی کنجی پاروتی کے آنچل میں باندھ دی ایک مرتبہ حسرت بھری نظروں سے بسنت کی طرف دیکھا اور پھر وہاں سے نکل کر

اور پھر ہمیشہ زندہ رہیں گے کیا تمھارے پاس ان مذہبی عقائد کا جو انسانوں کو مصائب زندگی برداشت کرنے کی طاقت بخشتے ہیں کوئی نعم البدل موجود ہے؟ عقلیت پسند کے پاس اس الزام کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ آئیے اس پر غور کریں۔

(۱)

منکر خدا واقعی کسی ایسی ہستی کا قائل نہیں ہے جو قادر مطلق ہو یا رحم و محبت کا مجسمہ ہو۔ وہ اس خیال کو اپنے دماغ میں جگہ نہیں دے سکتا کہ ایسی کائنات کا جیسی کہ ہمارے سامنے ہے کوئی خالق ہو سکتا ہے کیونکہ ایک کامل خالق کی پیدا کی ہوئی کائنات بھی کامل ہونی چاہیئے تھی اور تمام مخلوق کو مکمل اور عیوب و نقائص سے مبرّا ہونا چاہیئے۔ درانحالیکہ جدید طبیعی تحقیقات ہم کو یقین دلاتی ہے کہ یہ کائنات یعنی نظام ثوابت معہ کرۂ زمین کے قطعی مکمل نہیں اور مکمل ہونا کیسا جبکہ ابھی تک ان کا دور تعمیر ہی ختم نہیں ہوا اور روز کے طبیعی مشاہدات اس کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں زلزلوں کا آنا، آتش فشاں پہاڑوں کا پھوٹ نکلنا، سواحل سمندر کا ابھر ابھر کر ڈوبنا، آہستہ آہستہ پہاڑوں کا سمندروں میں پہونچ جانا، پہاڑوں کی جگہ وادیاں اور وادیوں کی جگہ پہاڑ بن جانا، جو بے شمار قرنوں سے جاری ہے اور آیندہ بیشمار قرنوں تک جاری رہیگا۔ کیا اس عدم تکمیل کا کافی ثبوت نہیں۔ اور آگے چلئے۔ کرۂ ارض میں قطبین مقناطیسی کا انتقال مقامی، نیز اس کے قطبین ہندسی کا تغیر، زمین کے محور کا اپنے دائرۃ البروج کے مقابل مائل ہو کر کرۂ باد میں تبدیلیاں پیدا کرتے رہنا اور نسل انسانی کے واسطے بے شمار مصائب و آلام کا باعث ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ کرۂ ارض کی تخلیق ہنوز کس درجہ نامکمل و ناقص ہے۔ پھر یوں دیکھئے کہ دنیا میں ہر مخلوق اعلیٰ سے ادنےٰ تک زندہ رہنے کے لئے اس بات پر مجبور ہے کہ دوسری مخلوق کو تباہ کرے اور کھا جائے۔ اور اس طرح دنیا میں ایک بیرحمانہ قتل ایک بے پناہ خونریزی اور ایک وحشیانہ سعی فتحمندی جاری ہے۔ اور ہر چیز محض زندہ رہنے کے لئے اس جد و جہد میں مصروف ہے کہ اپنی ہستی قائم رکھنے کے حق کو دوسروں سے بہ جبر تسلیم کرائے۔ بس ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت کسی ایسے خدا کا تصور جو یکسر محبت در افت بتایا جاتا ہے کیونکر ممکن ہے۔ عقلیت پسند، خدا پر اعتقاد رکھنے والے کو یقین دلاتا ہے کہ ایسے خدا کی کوئی ہستی موجود نہیں ہے جو مکمل دانائی انصاف اور محبت کی صفات سے متصف ہو اور نہ کوئی ایسی شخصیت موجود ہے جو اس ذرہ بے مقدار انسان کی کوششوں کے نتایج اور انجام پر حکمراں ہو۔ ان باتوں کو سُنکر معتقد کانپ اٹھتا ہے۔ اور خوف و ہراس کی حالت میں آسمان کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے کیونکہ اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تمام نظام اجتماعی کی بنیادیں منہدم ہو گئی ہیں۔ لیکن عقلیت پسند اپنا نہایت مدلل اور ہمت افزا جواب پیش کرتا ہے کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں بلکہ برخلاف اس کے نسل انسانی کی نجات اسی خیال میں مضمر ہے کیونکہ وہ کامل دانائی جس کے متعلق فریب خوردہ انسان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ عرش معلےٰ سے حکومت کر رہی ہے خود اسی کے اندر موجود ہے

وہ کامل انصاف جس کے واسطے آپ فلک الافلاک کی طرف نگاہیں اٹھا رہے ہیں حقیقتاً خود آپ ہی کے اندر موجود ہے اور وہ کامل محبت جس کے متعلق آپ کا یہ خیال ہے کہ اس کائنات پر حکمران ہے، خود آپ ہی کے دل میں پوشیدہ ہے۔ جو کچھ انسان نے ہزارہا سال کے افکار کے بعد کیا وہ صرف یہ ہے کہ اس نے اُس چیز کو جو خود اسی کے پہلو میں پائی جاتی ہے خلاف عقل طریقوں سے استدلال کرکے عالم موجودات سے باہر لامکان میں پہونچا دیا، وہ ہزارہا سال تک ایک خوفناک غلطی میں مبتلا رہا لیکن آج جبکہ وہ اپنی اُس غلطی کو دُور کرنا چاہتا ہے، اس کو بجز اس کے اور کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ کہ اس نور دانائی کو پستی سے اٹھا کر بلند ترین سطح پر پہونچا دے یعنی اب اس کا کام یہ ہے کہ اس اپنی اور آئندہ نسل کے قوائے دماغی کو معقول تعلیم کے ذریعہ سے کامل بنائے۔ اور انصاف کی شمع مردہ کو اور راستی کے چراغ سحری کو آفتاب کی طرح روشن اور منور کرے، ناانصافی اور ناراستی کی تاریکی کو محو کردے یہاں تک کہ تمام نسلی امتیازات، تمام اقتصادی ناہمواریاں ایک ہموار سطح پر آجائیں، اور تمام تعصبات صفحۂ ہستی سے مٹ کر ایک انصاف کامل کی حکومت کا آغاز ہوجائے

(۲)

عقلیت پسند گروہ بقائے روح اور حیات بعد الموت کے خیال کو اپنے دماغ سے نکال دیتا ہے کیونکہ اس اعتقاد کی تائید میں خفیف ترین شہادت بھی میسر نہیں آتی برعکس اس کے حیات عضوی (Organic life) اس امر کی تائید کرتی ہے کہ موت خواہ طبیعی ہو خواہ غیر طبیعی زندگی کے خاتمہ کا نام ہے جس میں انسانی زندگی بھی شامل ہے عقلیت پسند جانتا ہے کہ عہد قدیم میں انسان نے خود کو باقی موجودات سے اسقدر افضل خیال کیا کہ اُس نے یہ سمجھ لیا کہ صرف اسی کو روح سے سرفراز کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب انسان نے حیات حیوانی پر زیادہ توجہ کی اور افعال حیوانی کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا تو اس کو اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ حیوان مطلق کو بھی روح عطا ہوئی ہے بلکہ بعض تو یہاں تک اقرار کرتے ہیں کہ درختوں میں بھی روح یا روح کے مشابہ کوئی چیز پائی جاتی ہے۔

اسی کے ساتھ ایک ماہر علم الاعصاب میدان میں آتا ہے۔ اور مذہب پرست کو یقین دلاتا ہے کہ یہ نام نہاد روح سوائے نظام عصبی کے اور کچھ نہیں ہے اور یہ کہ جس حد تک کسی حیات عضوی میں نظام عصبی موجود ہے اسی حد تک اس میں روح بھی موجود ہے اور اس لئے وہ یہ نتیجہ ظاہر کرتا ہے کہ جب نظام عصبی فنا ہوجاتا ہے تو اس کے ساتھ روح بھی فنا ہوجاتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس نام نہاد روح کی کیا اصلیت ہے یہ ایسا سوال ہے جس پر متفکرین کے دماغ اسی روز سے غور کر رہے ہیں جس روز سے انسان نے زندگی کے آغاز و انجام پر غور کرنا شروع کیا اور جس کے متعلق عجیب و غریب قیاسی توہمات قائم کئے، مگر عقلیت پرست اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ روح کا آغاز عین اسی وقت شروع ہوتا ہے جب کہ نظام عصبی کا آغاز ہوتا ہے اور نظام عصبی کا آغاز عین اسی وقت یا اس کے کچھ مابعد

ہوتا ہے جبکہ فعل جنسی کے ذریعہ سے حمل قائم ہوتا ہے ۔ الغرض عقلیت پرست اپنی رائے کو قدیم روحانیات کی تعلیم کے موافق نہیں بنا سکتا اور اسی بنا پر وہ ہمیں اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ متقدمین کی تمام روحانیات کی کتابیں از سر نو تحریر کی جانی چاہئیں تاکہ وہ طبیعیات اور علم الاعصاب کی موجودہ تحقیقات کے نتائج کے ساتھ موافقت پیدا کرسکیں

مگر اب سوال یہ ہے کہ عقلیت پرست اس مقلد کی تسکین کے واسطے کیا چیز پیش کرتا ہے اس بیچاری ماں اور مغموم باپ کی تسلی کے لئے کیا چیز پیش کرسکتا ہے جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کھلی ہوئی قبر کی طرف دیکھ رہے ہیں جو ان سے اس چیز کو ہمیشہ کے واسطے چھین لینے کے لئے تیار ہے جو اُن کی زندگی کا سہارا، محبت کا واسطہ اور خوشی کا ذریعہ ہے ۔ کیا اس کے پاس کوئی تسلی بخش الفاظ سُنانے کے واسطے اور کوئی ہمت افزا باتیں پیش کرنے کے واسطے نہیں ہیں جنکے ذریعہ سے اُن کے آنسو بند ہوجائیں ۔

اس کا صرف ایک جواب ہے جس کی پوری اہمیت سمجھنے کے لئے ہمیں موت کا وہ رسمی موروثی نظریہ قطعی طور پر بدلدینا پڑے گا جو نسل انسانی میں اس وقت پایا جارہا ہے اور اس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اعلیٰ درجہ کے روشن خیال اپنی متفقہ کوششوں کے ذریعہ سے عوام الناس کے دماغوں میں اور خاصکر آنے والی نسلوں کے ذہن میں یہ خیال پختگی کے ساتھ جمادیں کہ جہاں تک ضعیف العمری کی موت کا تعلق ہے وہ فطری چیز ہے اور فطری زندگی کا فطری نتیجہ موت ہے، جہاں تک بیماری کے ذریعہ سے موت کا تعلق ہے وہ دانشمندانہ حفظ ما تقدم کے ذریعہ سے روکی جاسکتی ہے اور علاج کے ذریعہ سے اُس کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ بھی کیا جاسکتا ہے اور جو اموات بطور حادثہ واقع ہوتی ہیں وہ بھی سخت ترین قوانین تحفظ کے ماتحت بند کی جاسکتی ہیں ۔ اسی طرح موجودہ اور آنے والی انسانی نسلوں میں یہ خیال ذہن نشین ہوجائے گا کہ ملکی جنگوں کے باعث جو موتیں واقع ہوتی ہیں ان کو بین الاقوامی مجلس صُلح کے ذریعہ سے قطعی ناممکن الوقوع بنایا جاسکتا ہے ۔

اس نقطہ پر پہونچکر نظریۂ ارتقا ہمارے پیش نظر ہوتا ہے نہ بطور لعنت کے جیسا کہ مقلدین کا عقیدہ ہے بلکہ بطور برکت کے جو غیر متعصب لوگوں پر یہ واضح کرتا ہے کہ تمام فاسد نفسانی خواہشات میں ایک خواہش بھی ایسی نہیں ہے جو کسی شیطانی ہستی نے اُس کے اندر پیدا کردی ہوں اور جو اُس کے اختیار سے باہر ہوں بلکہ یہ تمام آثار ہیں اس بات کے کہ انسان نے ان ادنیٰ درجہ کی خواہشوں کو جانوروں سے وراثتاً حاصل کیا تھا ۔

پھر ممکن ہے کہ خود ہمارے اندر اسقدر ہمت پیدا نہ ہوسکے کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں اس پر عمل کرکے دکھلادیں لیکن ہماری اولادیں اور ہماری اولادوں کی اولادیں متحدہ عمل اور مشق کے ذریعہ سے اسقدر کافی ہمت پیدا کرلیں گی کہ موت، تابوت اور قبر کا بخندہ پیشانی خیر مقدم کریں اور بغیر کسی یاس و حزن کے موت کا مقابلہ کریں

بلکہ یہاں تک کہ موت کی عظمت سے اُن کے چہرے جگمگا اُٹھیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک عقلیت پرست، آسمانی قوانین کے مقابلہ میں کیا چیز پیش کر سکتا ہے ؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ مقلد کو یقین دلاتا ہے کہ اول تو دنیا میں کبھی کوئی ایسی چیز آئی نہیں جسکا نام آسمانی قوانین ہو بلکہ برعکس اس کے جو قوانین آسمانی قوانین کے نام سے لوگوں کے سامنے پیش کئے گئے وہ حقیقت میں مذہبی لوگوں ہی کا اختراع تھے جنھوں نے ان کو موثر اور مقبول بنانے کے لئے لوگوں پر یہ ظاہر کیا کہ یہ خدا نے ان کو الہام و وحی کے ذریعہ سے بتلائے ہیں اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک ایسا جہنم بھی ایجاد کیا جسمیں آگ روشن ہے اور جس میں قدیم یونانیوں کے خیال کے مطابق استمراری عذاب موجود ہے۔ لیکن جوں جوں تہذیب ترقی کرتی گئی، انسانی قوانین رفتہ رفتہ نام نہاد آسمانی قوانین کی جگہ لینے لگے اور بالآخر خود اُن کی جگہ قائم ہوگئے اس لئے اب انسانی فرض یہ ہے کہ جب اور جہاں خدائی قوانین انسانی آزادی اور انسانی حقوق کے متعارض واقع ہوں، ان پر نظرثانی کرے ترمیم و تنسیخ کرے یا نئے حالات کے ساتھ موافقت پیدا کرنے کے لئے اُن کو قطعی مسترد کردے۔

بقائے روح کے متعلق جو جواب ابھی دیا گیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے عقلیت پرست اس بات کو بھی محسوس کرتا ہے کہ اُس کا یہ نظریہ کہ ماورائے لحد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے اس موجودہ زندگی کو اسقدر بیش بہا بنا دیتا ہے کہ ہم اس کے ایک ایک لمحہ کو مستحق حیات بنانا اولین فرض سمجھتے ہیں اس لئے ہمارے واسطے یہ لازم ہے کہ ہم اس زندگی کو خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہو شرافت اور رحمدلی سے اُس حد تک مالا مال رکھنے کی کوشش کریں جس حد تک کہ ہم میں اس کی صلاحیت موجود ہے۔ ہماری اولادوں کو یہ بات سکھائی جائے گی کہ کوئی سخت کلمہ یا ناروا سلوک نہ کبھی واپس لیا جا سکتا ہے نہ اس کا کبھی تدارک کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی قربانی اس کا کفارہ ہو سکتی ہے اس لئے اُس سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہئے۔

اس طرح عقلیت پرست یقین رکھتا ہے کہ اس کے پاس فی الحقیقت ایک ایسا نعم البدل پیش کرنے کے واسطے موجود ہے جو اُس مذہبی عقیدہ کی جگہ لے سکتا ہے جس کو مذاہب عالم نے نشو و نما دیا ہے۔

(نگار) آپ، بینڈرٹ کے اس مقالہ پر مجھ سے اظہار خیال چاہتے ہیں، درانحالیکہ انداز بیان اور انتخاب الفاظ کے ادنیٰ تغیر کے ساتھ یہی سب کچھ میں بھی لکھ چکا ہوں اور ایک مغربی ملحد کو میرے مقابلے میں اگر کوئی امتیاز حاصل ہے تو صرف یہ کہ وہ سرے سے خدا کے وجود یا خدا کے مفہوم ہی کو قابل تسلیم نہیں سمجھتا اور میں ایک ایسی قوت کا قائل ہوں جو حقیقی معنی میں "فعال لما یرید" ہے — وہ مصائب عالم اور حوادث

طبیعی کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ کائنات ہنوز نامکمل ہے اور ایک مکمل خالق سے نامکمل مخلوق کا ظہور میں آنا قابل یقین نہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی قوت اعلی، عالم خلق و کون میں تدریج کے ساتھ عمل تکمیل کو جاری رکھنا چاہتی ہے تو اس میں کونسا استحالہ عقلی ہے، اور کیا "فعال لما یرید" کے مفہوم میں وہ قوت و اقتدار داخل نہیں ہے جو "مسئولیت" و "پرسش" سے بہت بلند ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ میں یہ باور کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا کہ وہ قوت انفرادی کی سطح حیثیت سے عالم کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک ذرّہ کی ہر وقت نگرانی کرتی ہے اور اسی لئے میں دعا و استجابت دعا کو بالکل فعل عبث قرار دیتا ہوں

مقدرات الٰہیہ سے حقیقتاً وہ نوامیس فطرت مراد ہیں جو ایک خاص اندازہ سے تمام عالم طبیعیات میں اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور مادی اسباب کے تغیر و انقلاب یا کمی و بیشی سے کبھی کبھی اُن نتائج میں بھی تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں جو عادتاً ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کو عدم تکمیل یا عدم یکسانیت قرار دے کر کیوں کسی "مکمل خدا" کے وجود سے انکار کیا جائے جبکہ اسی کیفیت کو خدا کے "ارادہ آزاد" سے متعلق کر کے بہ آسانی اس گتھی کو سلجھایا جا سکتا ہے ـــــــ بہرحال کسی ایسی قوت کے وجود سے جو عالم تکوین میں کارفرما ہے۔ سخت سے سخت ملحد بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس کا نام خدا نہ رکھے اور اُسے "علت اولین" یا "علت العلل" وغیرہ کے نام سے موسوم کرے۔

ایک مذہبی انسان اور غیر مذہبی انسان کے اس اعتقاد میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ وہ عوام کی ذہنیت کو سامنے رکھکر (یا حقیقتاً خود اپنی ذہنیت کے لحاظ سے جو ممکن ہے ترقی یافتہ نہ ہو لیکن اصلاح پسند ضرور ہے۔) ایک ایسا خیال خدا کے متعلق پیش کرتا ہے جو فلسفہ کی گتھی میں الجھائے بغیر نوع انسانی کی اصلاح چاہتا ہے اور یہ خود اپنی تسکین قلب کے سامنے اُن مصالح کی پرداہ نہیں کرتا جو عوام سے متعلق ہے ـــــــ البتہ اگر وہ زمانہ کبھی آیا (اور یقیناً آئے گا) کہ تمام افراد انسانی ایسے ہی ترقی یافتہ ہو جائیں، جیسے کہ مسٹر بینڈررٹ ہیں اور تکمیل اخلاق کا وجوب ایک کھلی ہوئی روشن حقیقت کی صورت اختیار کرلے تو یقیناً انسان مذہب سے بے نیاز ہو جائے گا۔ اور ہو جانا چاہئے کیونکہ ایک مذہب کا انتہائی ارتقا صرف یہی ہے۔ اور اس کی تکمیل کے بعد اس کو از خود تحلیل ہو جانا چاہئے۔

الہامی کتابوں کے متعلق جو خیالات فاضل مقالہ نگار نے ظاہر کئے ہیں، اُن سے مجھے اس حد تک تو ضرور اتفاق ہے کہ اُن کو خدا کا کلام کہنا حقیقتاً کوئی وزن نہیں رکھتا اور اس کو اب کوئی صاحب عقل انسان صحیح باور نہیں کر سکتا، لیکن میں یہ کبھی نہ مانوں گا کہ انبیاء و رسل نے مقصداً لوگوں کو دھوکا دیکر ایسا باور کرایا، کیونکہ اُن کی سیرت کا مطالعہ ہم کو بتاتا ہے کہ وہ لوگ جھوٹے یا مکار نہیں تھے اور نہ وہ اپنے مقصد میں

کامیاب ہو سکتے تھے اگر ان کی کارگاہِ عمل صرف مکر و فریب پر قائم ہوتی ـــــ اس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کہ الہامی کتب خدا کا کلام بھی نہیں ہیں اور انبیاء نے بھی غلط بیانی سے کام نہیں لیا ہے تو پھر تیسری صورت کیا ہو سکتی ہے ؟

میں اس سے قبل کئی بار "وحی و الہام" کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہوں جن کا ماحصل یہ ہے کہ انبیاء کی زبان سے ایک خاص تاثر کے ماتحت بے اختیارانہ طور پر کلمات رشد و ہدایت کا نکل جانا اصل وحی ہے اور چونکہ اس حال میں انسان پر ایک قسم کی "مقناطیسیت ذاتی" (Self Magnetism) طاری ہو جاتی ہے۔ اور یہ کیفیت رفتہ رفتہ "اشارۂ ذاتی" (Auto Suggestion) میں تبدیل ہو جاتی ہے جسے "لطیفۂ غیبی یا روح القدس" بھی کہہ سکتے ہیں، اس لئے وہ باور کرنے لگتا ہے کہ جو کچھ اس کے منہ سے نکل رہا ہے وہ خود اس کی ذاتی فکر و کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ کوئی قوت برتر و اعلیٰ اس کے وساطت سے بول رہی ہے اور اسی بات کا یقین وہ دوسروں کو دلانا چاہتا ہے۔ خود کلام مجید کے طرز عبارت کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جا بجا اس میں خود رسول اللہ سے بھی خطاب کیا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اور کا کلام سول سنا رہے ہیں۔ لیکن آپ سمجھے کہ یہ کیا بات ہے۔

یہ "مقناطیسیت ذاتی" کی وہ انتہائی کیفیت ہے۔ جب انسان اپنے پیکر مادی سے علیحدہ ایک اور "لطیف ہستی" (Ethereal Being) کے وجود کو اپنے اندر محسوس کر کے اس کے "داعیات" کو علیحدہ ایک مستقل صورت میں دیکھنے لگتا ہے اور اس حال کے ماتحت جو کچھ اس کے منہ سے نکلتا ہے وہ واقعی انسانی دماغ کی پیداوار سے بلند تر مرتبہ کی چیز ہوتا ہے۔ پھر جس طرح یہ صحیح ہے کہ ہم اس کو (لغوی معنی کے اعتبار سے) کلام خداوندی یا "منطوقات الٰہی" نہیں کہہ سکتے، اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ انبیاء و رسل کا اپنی شدید کیفیاتِ نبوت کے لحاظ سے اس کو "ماوراء عالم مادہ" کی چیز کہکر پیش کرنا غلط بیانی یا مکر و فریب نہیں کہلایا جا سکتا

حیات بعد الموت یا معاد کے متعلق جو خیالات فاضل مقالہ نگار نے ظاہر کئے ہیں۔ ان سے مجھے بالکل اتفاق ہے اور اس میں کلام نہیں کہ انبیاء کا "دوزخ و جنت" کے خیال کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا بالکل تمثیلی و تشبیہی چیز ہے، لیکن اس کو "حقیقت" کے رنگ میں اس لئے پیش کیا کہ عوام کے متاثر کرنے کا بہترین ذریعہ یہی تھا

جن حضرات نے شروع سے نگار کا مطالعہ کیا ہے وہ واقف ہوں گے کہ مسئلہ معاد میں میرے خیالات میں تدریجی طور پر برابر انقلاب پیدا ہوتا رہا ہے۔ خیر، اس کا قائل تو میں کبھی نہیں ہوا کہ قیامت کے دن مردے

قبروں سے اٹھیں گے، جوق درجوق محشر میں جمع ہوں گے اور باقاعدہ حساب کتاب ہو کر دوزخ و جنت کی سزا و جزا انھیں ملے گی، لیکن یہ ضرور یقین کرتا تھا کہ مرنے کے بعد رُوح قایم و باقی رہتی ہے اور روحانی مسرت و اذیت کا دوسرا نام فردوس و جہنم رکھا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال بھی محو ہوتا گیا یہاں تک کہ آج میں روح کی بقا کا بھی قایل نہیں اور پورے اعتقاد و یقین کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ زندگی نام ہے امتزاج عناصر کے اعتدال کا اور جب یہ اعتدال باقی نہیں رہ جاتا تو انسان پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ اور موت نام ہے بالکل "نسیا منسیا" ہو جانے کا۔

اس میں شک نہیں کہ مذہب کی بنیاد تمام تر منحصر ہے اعتقاد معاد پر اور کوئی شخص اس کو تسلیم نہ کرے تو پھر مذہب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ جس طرح ایک مذہب کو مابعد الطبیعیات سے متعلق کر کے غیر ترقی یافتہ عقول انسانی کے لئے مفید و کارگر بنایا جا سکتا ہے، اسی طرح اس کو اسی دنیا سے متعلق کر کے موجودہ ترقی علوم و فنون کے دور میں قابل عمل نہیں ٹھیرایا جا سکتا ——— میرا خیال یہی ہے کہ اس خدمت کو صرف مذہب اسلام ہی انجام دے سکتا ہے اور یہی میرا موجودہ مشن ہے جس کی تبلیغ میں ایک زمانہ سے کر رہا ہوں۔

اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ نوع انسانی کی فلاح کا تعلق صرف دو چیزوں سے ہے: ایک سعی و عمل اور دوسرے اتحاد و مساوات۔ اور عملی طور پر ان دونوں چیزوں کو جس طرح اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ جا بجا "تفکر و تدبر" کی ہدایت کرنا، صرف جد و جہد ہی کو ذریعۂ فلاح و نجات قرار دینا اور تمام نوع انسانی کو ایک رشتہ سے وابستہ سمجھنا، یہ ہے قرآن مجید کی تمام تعلیم کا خلاصہ۔ لیکن ایک قدیم خیال کے مذہبی انسان میں اور مجھ میں اتنا فرق ہے کہ وہ ان سب کے نتائج عالم مابعد الموت سے متعلق کرتا ہے۔ اور میں اسی دنیا سے وابستہ سمجھتا ہوں۔ پھر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے اس سے زیادہ لچک کسی اور مذہب میں پائی جا سکتی ہے اور کیا اسلام کو فطری و آخری مذہب کہنا اس کا مقتضی نہیں کہ وہ ترقی کے ہر دور میں یکساں طور پر مفید یقین اور رہبر و رہنما ثابت ہو۔

یہاں پر ایک اعتراض ضرور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر قدیم خیال کے لوگ بقاء روح اور عقیدۂ معاد کو بھی تسلیم کراتے ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے اور اس کی مخالفت کیوں کی جائے جبکہ وہ دنیاوی ترقی کے مانع نہیں ——— لیکن یہ اعتراض موجودہ عقلی دور میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ اس وقت انسان کا مطالبہ ایسی تعلیم کا ہے جو ذہنی و عقلی آزادی کو برقرار رکھنے والی ہو اور بغیر سمجھے ہوئے محض روایات اعتقادیہ کی بناء پر کسی امر کا باور کر لینا یا دوسرے کو باور کرانا عقلی آزادی کو تباہ کرنے والا ہے جس پر اب کوئی راضی نہیں

ہو سکتا ـــــــ محض اس لئے کسی بات کو یقین کر لینا کہ اس کے یقین کر لینے میں کوئی حرج نہیں، نہایت غلط منطق ہے اور اب اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا۔ جب تک ایک انسان بالکل بچہ ہے، ہم اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر اس کو ڈرا سکتے ہیں کہ "اس کو نہ لو یہ کاٹ لیتا ہے" لیکن سن شعور تک پہونچنے کے بعد تو ہم اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ "تم تو یہی یقین کئے جاؤ کیونکہ ایسا یقین کرنے میں کوئی حرج نہیں"۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ دلیل سنکر سوائے ہنس دینے کے اور کیا کر سکتا ہے۔

بہرحال اس میں کلام نہیں کہ یہ زمانہ مذاہب عالم کے لئے نہایت ہی خطرناک زمانہ ہے۔ اور اس وقت صرف وہی مذہب و مسلک زندہ رہ سکتا ہے جو ذہنی ترقیوں کا ساتھ دینے والا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ایسا مذہب صرف اسلام ہے بشرطیکہ اس کی صحیح روح سمجھ کر لوگوں کو اس کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے، ورنہ مولویوں کا بتایا ہوا مذہب تو اب چلنے کا نہیں

ایں خستہ اگر دیر زید شام بمیرد

کتاب شہوانیات کے بعض عنوانات یہ ہیں

فحاشی کی تعریف — فحاشی کے اسباب — مذہبی فحاشیاں — مذہبی فحاشیوں کی علامتیں — فحاشی پر عمومی تبصرہ — مقدس مباشرت — فحبگی کے اسباب — فحش کی ابتدا — فحاشی قدیم روم میں — استلذاذ بالمثل — استلذاذ بالنفس — استلذاذ بالوحوش — استلذاذ بالنفس — استلذاذ بالخیال — استلذاذ بالاذویہ — فحاشی عہد قدیم میں — فحاشی قرون وسطے میں — عہد جدید اور فحاشی — اخلاق جنسی کا ماضی حال اور مستقبل — وغیرہ وغیرہ

اگر آپ ابھی تک یہ کتاب ملاحظہ نہیں فرمائی تو اب طلب کیجئے۔ ضخامت ۲۷۵ صفحات قیمت علاوہ محصول مجلد ؏ غیر مجلد ؏

خریداران نگار سے ایک روپیہ کی رعایت۔

مینجر نگار لکھنؤ

باب المراسلة والمناظرة

(جناب شوق قندھاری)

مدت سے آرزو تھی کہ جناب سے طرح گفتگو ڈالوں لیکن موقعہ و محل کے خیال نے اب تک ایک مناسب عنوان کا منتظر رکھا اور اب جبکہ ملاقات کے لئے ایک موزوں تقریب ہاتھ آگئی ہے میں اپنی اسی دیرینہ خواہش کو پوری کر رہا ہوں یہ تقریب کیا ہے ؟ اس کو اسی وقت بیان کر دینے سے پہلے میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ نگار سے اپنی شناسائی اور بوسطہ نگار آپ سے ہے۔۔۔۔ اپنی غائبانہ واقفیت کی داستان مختصر الفاظ میں بیان کر دوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ آپ کی کوششیں کسی نہ کسی عنوان اور کسی نہ کسی طریقہ سے کامیاب اور بارآور ہو رہی ہیں اور ہوتی جائیں گی۔

آج سے آٹھ نو سال بیشتر میں نے پہلے پہل آپ کا نام سنا اور وہ بھی معاند اسلام اور دشمن مذہب کی حیثیت سے۔ اور سچ پوچھئے تو اس وقت نہ مجھ کو اتنی فرصت تھی کہ نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کرتا اور نہ اتنی اہلیت کہ مطالعہ کے بعد تنقید کرتا آپ کے خیالات پر اور اپنی کوئی ذاتی رائے قائم کرتا اس لئے خاموش رہا۔ اور منتظر رہا وقت و موقعہ کا۔ اس طرح چار پانچ سال گذر گئے۔ اور اس عرصہ کے بعد میں نے اپنے میں اتنی اہلیت محسوس کی کہ اب میں نگار کا بامعان نظر مطالعہ کر کے بطور خود کوئی شخصی رائے قائم کر سکتا ہوں چنانچہ اتفاق وقت سے اتنی مہلت بھی زمانہ نے دی کہ ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر ایک مدت کی تمنا کو پوری کر سکوں۔

اب فرصت کے زمانہ میں جتنے بھی پرچے مجھے دستیاب ہو سکے میں نے پڑھ ڈالے اس میں شک نہیں کہ شروع شروع میں اپنے عقاید و ایمانیات کے بارے میں ایسی تلخ بلکہ مخالفانہ آرا کا مطالعہ کرتے مجھے نہایت تکلیف ہوئی اور اس احساس تکلیف کا ذمہ دار وہ تعصب مذہبی اور وہ اسلوب تربیت تھا جو کسی تنقید و تبصرہ کو مطلق برداشت اور گوارا نہیں کر سکتا۔ اس احساس تکلیف کے دوران میں کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے پرچے پڑھتے پڑھتے پھینک دئے۔ لیکن وہی جستجوئے حقیقت جس نے مجھے شروع میں نگار کے مطالعہ پر آمادہ کیا تھا پھر مجھے اکساتی اور میں پڑھنا شروع کر دیتا

تھوڑے دنوں کے مطالعہ کے بعد میں نے خود غور کرنا شروع کیا کہ نگار کا مشن کیا ہے اور وہ کہاں تک حامل حقیقت ہے۔ چنانچہ میرے تعمق و وجدان نے مجھ پر یہ امر واضح کیا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ حق و صداقت کے اعتبار سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ چنانچہ اس وقت سے میں نگار کا مستقل خریدار ہوں اور ہر ماہنامے کو مطالعہ کو ——— اور خصوصاً شعبہ مذہب کے مطالعہ کو اپنے اوپر فرض سمجھتا ہوں۔

نگار کی اس خاموش تبلیغ نے مذہب کے متعلق اور سنجیدہ و عمیق مطالعہ کا شوق مجھ میں بیدار کر دیا میں چاہتا تھا کہ اس بارہ میں غائر تصانیف کا مطالعہ کروں تاکہ تسکین ہو اس سلسلہ میں میں نے علاوہ دیگر بے شمار کتب کے مقبول احمد صاحب کی کتاب فلسفۂ مذہب کو ——— جو بالالتزام نگار میں شائع ہوا کی ——— بھی لگے ہاتھوں پڑھ ڈالا لیکن معاف فرمائیے کہ اسے بالکل سطحی تصنیف پایا بعد ازاں میں نے فلسفہ کی باقاعدہ اور منضبط تحصیل شروع کی۔ اور مسلسل دو تین سال کے درس فلسفہ نے مجھے تشکیک کے دامن میں پناہ دی اور میں نے جان لیا کہ علم کی رسائی نارسائی سے آگے نہیں یعنی

معلومم شد کہ ہیچ معلومم نیست

ہماری ساری علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اب میں تشکیک و ارتیابیت کا قائل ہوں اور مذہب اور مذہب کی پیداوار کے متعلق میرے خیالات وہی ہیں جو ایک متشکک کے ہوتے ہیں۔ اور آپ ہی فرمائیے۔ کہ اگر آپ کسی چیز کا انکار نہیں کر سکتے تو کیا اس کا اثبات کر سکتے ہیں ؟

خدائے تعالیٰ کو آپ بدیہی الوجود کہتے ہیں ——— اور اس کے شاہد نگار کے ملاحظات ہیں ——— لیکن آپ ہی فرمائیے کہ کیا آپ اسکا اثبات کر سکتے ہیں۔ اگر مصنوع کو دیکھ کر صانع کا خیال پیدا ہونا ناگزیر امر ہے تو یہی فرمائیے کہ کیا آپ کا صانع اسی نوع کا ہے جس نوع کے صناع انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہی تو پھر ایک اور چیز اس کی شریک ازلیت ہو جاتی ہے جسے مادہ کہتے ہیں اور شاید اس ثنویت کو آپ جائز نہ رکھیں اور اگر آپ کا "صانع حقیقی" صناعان مجازی کے مانند نہیں تو کیا وہ خود ہی صانع اور خود ہی مصنوع ہے۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ ؟

اور کیا اس میں اسی قسم کا استحالۂ عقلی نہیں جس قسم کا کہ مصنوع کو خود بخود بن جانے کے اعتقاد میں ہے ؟

اگر آپ اثبات کی جرأت کریں تو شاید آپ برکلے کے ہمنوا ہو کر آخری دلیل جو پیش کریں گے وہ یہی ہوگی کہ مادہ کو عامل و فاعل ماننے سے تنفر لازم آتا ہے۔ اور خدائے تعالیٰ کے بارے میں ایسا کوئی تنفر لازم نہیں آتا لیکن

میرا سوال اس وقت یہی ہوگا کہ اس تنفر کا ذمہ دار کون ہے سوا آپ کے متعصب اسلوب تربیت کے؟ اور یہ بھی کہ خدائے لم کے بارے میں ایسا کوئی تنفر کیوں لازم نہیں آتا؟

اس پر سے مجھے آپ کہیں مادیت کا وکیل نہ سمجھئے میرا مسلک تو "لاعلمی" ہے اور بس اور اس سے اتنا تو ثابت ہے کہ ہمارے علم میں وثوق و اذعان کوئی چیز نہیں اور یہ بھی کہ اگر ہم کسی چیز کا انکار ایقان و وثوق کے ساتھ نہیں کر سکتے تو اس کے اثبات میں بھی وہ ادعائے شان باقی نہیں رہتی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا ——— جو کائنات مذہب کی سب سے زیادہ جلیل القدر ہستی ہے ——— ذہن انسانی کی سب سے زبردست تصنیف ہے ——— اور تعجب ہے کہ ہمیں کو اپنے ذاتی خیالات سے ——— جن کا امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر ہونا یقینی ہے ——— اب انحراف و روگردانی ناممکن سی ہو گئی ہے!!

اس طرح ارتیابیت نے مجھے وہ سکون و اطمینان بخشا جس کا میں جویا تھا اور اس کے لئے میں نگار کا کس قدر ممنون ہوں ظاہر ہے۔

اب آپ نے اچھی طرح پتہ چلا لیا ہوگا کہ مذہب کے متعلق میرا زاویہ نگاہ کیا ہے مذہب کی فی الوقت دنیا کو ضرورت ہے یا نہیں اس کے متعلق میں یکطرفہ رائے نہ دوں گا البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ صاحبان علم و عقل کے لئے کسی مذہب کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے اور نہ ہے ان کا اپنا ضمیر ان کا بہترین رہنما ہے۔ ہاں اس طبقہ کو چھوڑ کر بقیہ افراد بنی نوع انسان کے لئے مذہب کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نہ وہ معاشرۂ انسانی کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں اور نہ وہ خود کوئی پسندیدہ زندگی کر سکتے ہیں۔

یہاں پر میں اپنے معتقدات سے الگ ہو کر آپ سے چند استفسارات کرنا چاہتا ہوں ——— اور دراصل یہی تقریب ملاقات ہے ——— یہ کہ عبادات کا مفہوم و منشا، جو آپ نے سمجھا ہے اور سمجھانا چاہا ہے وہ تو ہر لحاظ سے بالکل درست و احسن ہے اور واقعہ بھی یہی ہے ——— یہ میں بحیثیت ایک ارتیابی کے نہیں بلکہ بحیثیت ایک ایسے مسلم کے جو نیاز کی تبلیغ پر ایمان لایا ہے کہہ رہا ہوں ——— کہ اوامر اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے کہ انسان کو معاشرہ کے لئے اور زیادہ کارآمد بنائیں مدنیت و معاشرت میں مد و معاون ہوں اور خیالات کی درستی، اخلاق کا تصفیہ اور نفس کا تزکیہ کریں بنابریں آپ کا یہی کہنا بالکل درست ہے کہ "محض نماز پڑھ لینا یا ایک ماہ کے روزے رکھ لینا اصل ایمان نہیں" لیکن یہ تو بتلائیے کہ جب عبادات کا مقصد اتنا ارفع و اعلیٰ ہے تو پنجوقتہ یا سہ وقتہ اور ایک ماہ یا بلا قید مدت کی پابندی اور اس پر اصرار کیوں اور پھر مناقشہ و ردو قدح کیا معنی؟ اگر کوئی شخص تمام رات نماز پڑھنے کے بعد اپنے میں وہ بات پیدا کرلے جو مقصود ہے تو اس کو کیوں مطعون کریں آپ؟ اور اگر کوئی شخص بغیر رکوع و سجود کے

وہ اپنے پر کیف طاری ہوتا پائے جو اصل نماز ہے تو وہ کیوں جہنمی ہو؟ جیسا کہ مولوی کہتے ہیں!

دوسرا استفسار میرا الہامی کتب سے متعلق ہے آپ نے اپریل کے نگار میں الہام کی حیثیت اور الہامی کتب کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس کی افادیت سے مجھے انکار نہیں آپ کا یہ فرمانا کہ "یہ وہ الفاظ وخیالات ہیں جو انتہائی تاثر کے عالم میں اصلاح ملک وقوم کے لئے بے اختیارانہ انبیاء کے منہ سے نکل گئے" دعویٰ مستغنی عن الدلیل لیکن آپ نے اس امر کی نسبت بھی غور کیا ہے کہ الہامی کتب کا پیرایہ بیان کیا ہے دور کیوں جائیے قرآن ہی کو لیجئے اس میں کہیں تو رسول اللہ کو مخاطب کیا گیا ہے اور کہیں مسلمانوں کی جماعت کو اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خود خدا خطاب کر رہا ہے اگر آپ کا کہنا مان لیا جائے تو یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ انبیاء نے یہ دیکھ کر کہ ان کے اپنے مخاطبہ کا جماعت پر کوئی اثر نہ ہوگا یہ جھوٹ تراشا کہ خدا کی زبان میں بولنے لگے۔ مولانا ماجد اور ان کی قوم کے دیگر انبیاء بنی اسرائیل کے ان ہفوات کو تو میں درخور اعتنار نہیں سمجھتا کہ یہ خود خدا کا کلام ہے جو بہ اہتمام خاص "لوح محفوظ" سے ذریعہ "جبریل امین" نازل ہوا اس پر جتنے اور جس قسم کے اعتراضات ہو سکتے اور ہوتے ہیں ان کے نہ اعادہ کی ضرورت ہے اور نہ مجھے خط کی طوالت اس کی اجازت دیتی ہے۔ مذکورہ اعتراض اسلام کی اس صنف پر کیا گیا ہے جو یکسر عقلی ہے۔ نقل کا تو ذکر ہی کیا

کیا ان امور کی نسبت قریبی اشاعت میں آپ کچھ روشنی ڈالنی پسند کریں گے اور ایسی امید اگر میں کوئی باندھوں تو وہ ناسزا تو نہیں؟ فقط

۶ مئی ۱۹۳۳ء

مخلص
شوق قندھاری

(نگار) گرامی نامہ پڑھنے کے بعد میرا ارادہ یہ ہوا کہ آپ سے نجی کے طور پر سلسلہ مراسلت قائم کروں لیکن افسوس ہے کہ نہ آپ نے اپنا پورا نام اور پتہ تحریر فرمایا اور نہ ڈاکخانہ کی مہر سے کچھ سراغ چل سکا کہ خط کہاں پوسٹ کیا گیا ہے۔ ہر چند لفافہ کی پشت پر ایک چھوڑ اڑ دو کی دو دو مہریں "عمری" اور "ہدگاؤں" نظر آتی ہیں، اور اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ ریاست نظام میں کسی جگہ آپ کا قیام ہے لیکن مراسلت کے لئے اس کو ناکافی سمجھ کر مجبوراً نگار ہی کے ذریعہ سے رسید پیش کرتا ہوں۔

مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ نے نگار کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے وہ کامل غور و مطالعہ کے بعد کیا ہے اور قدامت پرستی کی زنجیروں سے علیحدہ ہو کر —— ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء —— نگار کی زندگی

کے تقریباً بارہ سال گزر چکے ہیں اور اس دوران میں ایک عشر لمحہ بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اپنے مشن کی صداقت کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا ہو ـــــ پھر یہ تو ہوا کہ کسی مسئلہ پر میری رائے میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں، لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ اس تغیر کو ظاہر کرنے میں میں نے پس وپیش سے کام لیا ہو۔ یہاں تک کہ آج نصف قرن کی تحقیق و مطالعہ اور غور و تفکر کے بعد میں اپنے آپ کو اس منزل میں پاتا ہوں جسے صحیح معنے میں "ایقان و عرفان" کی منزل کہنا چاہیے ـــــ نہ اب مجھ پر کوئی کیفیت "ارتیاب و شک" کی کبھی طاری ہوتی ہے، نہ "اضمحلال وتزلزل" کی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ ایک زمانہ کے اضطراب روحانی اور تذبذب ذہنی کے بعد جو یہ سکونِ ضمیر نصیب ہوا ہے تو کتنی راحت ولذت اپنے اندر محسوس کرتا ہوں ـــــ جب تک میں مذہب کو اپنے آبا و اجداد کی نگاہ سے دیکھتا رہا، درسِ نظامی کی کتابوں کے اوراق میں ڈھونڈھتا رہا، مولویوں کے مواعظ اور صوفیوں کے اقوال میں تلاش کرتا رہا، ایک لمحہ کے لئے بھی قلب کو اطمینان نصیب نہ ہوا، لیکن جب ان تمام واسطوں سے علیحدہ ہوکر، ان تمام علائق کو توڑ کر اور ان جملہ ذرایع سے بے نیاز ہوکر، خود اپنی آزاد آنکھوں، اپنی آزاد عقل، اور اپنے آزاد ضمیر کو رہبر بنایا تو حجابات اٹھنے لگے، تاریکیاں مٹنے لگیں اور آخر کار شاہد مقصود کو بے نقاب دیکھ کر جس کیفیت سے لطف اٹھا رہا ہوں اس کا حال نہ پوچھئے

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگ رہِ ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

میری پیدایش، میری تربیت ایسے شدید مذہبی ماحول میں ہوئی تھی کہ اگر فطرت خود میری رہنمائی نہ کرتی تو میری ہلاکت میں کوئی شک وشبہ نہ تھا، لیکن باور کیجئے کہ ابتدا ہی سے میں مولویوں کے بتائے ہوئے مذہب کو اپنے لئے غیر تشفی بخش پاتا تھا اور ایسا محسوس کرتا تھا کہ میری روح کی شیرینی میں کوئی تلخ شے ملائی جارہی ہے پھر جب بعد کو مجھے آزادی نصیب ہوئی اور میں اس غلامی سے نکل کر خود تحقیق کی لذت سے آشنا ہوا تو مختلف دور سے مجھے گزرنا پڑا اور سب سے آخری دَور جس کے بعد شمع یقین کا روشن ہونا مقسوم ہوچکا تھا، وہی ارتیاب و تشکیل کا دور تھا جس سے آپ اس وقت گزر رہے ہیں،

گر غبار آلودہ گشتی باک نیست
اے ہزاراں دیدہ در راہِ تو خاک

انتظار کی گھڑیاں ختم ہو رہی ہیں، جلوۂ حقیقی کی ساعت قریب تر آتی جارہی ہے اور وہ لمحۂ درخشاں آنے ہی والا ہے جب خدا، "انسانیت کبریٰ" کے صورت میں آپ کے سامنے جلوہ گر ہوگا اور آپ بھی بے اختیارانہ کہہ اٹھیں گے کہ یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

جس وقت تک میں نے نگار جاری نہ کیا تھا، یہ سمجھتا تھا کہ جو حالت "تذبذب" و "عدم یقین" کی مجھ پر طاری ہے۔ وہ شاید ہی کسی اور جگہ نظر آئے، لیکن جب نگار کے ذریعہ سے میں نے اپنے "اضطراب رُوحانی" کو ظاہر کیا اور اپنے شکوک واوہام لوگوں کے سامنے پیش کئے تو مجھے یہ معلوم کرکے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ ایک میں ہی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا بڑا حصہ یہ خلش اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور ایک عام بے اطمینانی لوگوں کے دلوں میں پائی جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد میری آواز کا حلقہ جتنا وسیع ہوتا گیا، اتنے ہی زیادہ ہم خیال نظر آنے لگے، یہاں تک کہ اس وقت نگار ہزاروں آدمیوں کے "تذبذب و اضطراب" کو دور کرچکا ہے اور آج ہندوستان کا شاید ہی کوئی مقام ایسا ہو جہاں نگار کی تبلیغ پر ایمان لانے والے دو چار موجود نہ ہوں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ جتنی کامیابی ہونی چاہئے تھی نہیں ہوئی، اور جس وسعت کے ساتھ اس خیال کو پھیلنا چاہئے تھا نہیں پھیلا، لیکن اس کا سبب اصل تحریک کا نقص نہیں بلکہ اس کا سبب فقدانِ علم ہے جو علم و تحقیق کے اس دَور میں بھی ہندوستان کی خصوصیت خاصہ بنا ہوا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نگار کا مخاطبہ صرف اہل علم ہی سے ہے اور انھیں کے ذہن و دماغ میں تبدیلی پیدا کرنا نگار کا مقصد ہے۔

آپ نے دو باتیں بھی مجھ سے دریافت کی ہیں۔ ایک عبادات کے مفہوم کے متعلق ہے اور دوسرا وحی و الہام کے متعلق ——— میں ان دونوں مسئلوں پر کئی بار صراحت کے ساتھ نگار کے صفحات میں گفتگو کرچکا ہوں لیکن غالباً نگار کے وہ پرچے جناب کی نگاہ سے نہیں گزرے ——— میں نے کبھی روزہ و نماز کی مخالفت نہیں بلکہ ہمیشہ صاف صاف الفاظ میں یہی ظاہر کیا ہے کہ اگر کوئی ان ذرائع سے مقصد حقیقی کو حاصل کرسکتا ہے تو یقیناً ان کی پابندی واجب ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ ضرور کہا ہے کہ ان کو اصل چیز نہ قرار دو بلکہ صرف ذریعہ سمجھو تزکیۂ اخلاق کا اور اس لئے اُس شخص کو بھی جہنمی نہ کہو جو بغیر اس ذریعہ کے کسی اور وساطت سے اصل مقصد تک پہونچنا چاہتا ہے ———

جنوری ۳۱ء کے نگار کا غالب حصہ اسی بحث کے لئے وقف تھا۔ اگر آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا تو اب دیکھئے۔ اسی کے ساتھ مئی ۲۹ء، جولائی ۲۹ء، اگست ۲۹ء اور اگست ۳۰ء کے پرچے بھی ملاحظہ فرمائیے کہ صحیح فیصلہ آپ ان کے مطالعہ کے بعد ہی کرسکتے ہیں۔

وحی والہام کے متعلق آپ نے اپریل ۳۳ء کے نگار کا حوالہ دیکر استفسار کیا ہے، حالانکہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف ضمنی و سرسری طور پر ہے، اس مسئلہ پر بسیط گفتگو میں نے اپریل ۳۰ء کے پرچہ میں کی ہے

اس کو ملاحظہ فرمائیے اور اس ماہ کی اشاعت میں بھی باب الاستفسار پڑھنے کی تکلیف گوارا کیجئے۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی کیفیت منتظرہ باقی رہے تو مطلع فرمائیے تاکہ اس کے دور کرنے کی کوشش کروں

اخیر میں ایک بار مجھے اور اجازت دیجئے کہ "حریت فکر" کے حصول پر آپ کو مبارکباد دوں اور اس تحریک کو اس استدعا پر ختم کروں کہ:-

بیا کہ روی بہ محراب گاہ نور نہیم　　بنائے کعبۂ دیگر ز سنگ طور نہیم
حطیم کعبہ شکست و اساس قبلہ بریخت　　بتازہ طرح یکے قصر بے قصور نہیم

صرف اخیر جون ۳۳ء تک

سات روپیہ کی تین کتابیں تین روپیہ میں معہ محصول

تذکرۂ خندۂ گل - جس میں ۳۰۰ سے زاید اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات معہ انتخاب کلام کے درج ہیں۔ ضخامت ۴۸۰ صفحات اصلی قیمت للعہ

فلسفۂ مذہب - اردو میں بالکل پہلی کتاب جس میں مذہب کی حقیقت، اس کے ارتقاء اور مسائل اعتقادی پر فلسفیانہ نظر ڈال کر حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اور نسیہ و نقد میں تمیز کرکے مذہب کے صحیح خط و خال پیش کئے گئے ہیں۔ اصلی قیمت عہ

فراست التحریر مکمل - اردو میں بالکل پہلی کتاب جس کو دیکھ کر آپ ایک شخص کے سواد خط سے اس کے حالات و اخلاق پر بہ آسانی حکم لگا سکتے ہیں۔ اصلی قیمت عہ

حضرت نیاز کے تین معرکۃ الآرا مضامین

فلاسفۂ قدیم کی روحوں کا اجتماع —— مادئین کا مذہب —— حرکت کے کرشمے

اصلی قیمت عہ

مینیجر نگار

گدا

تو نے پھیلایا ہے میرے سامنے دستِ سوال　　　چھیڑ دی یا اے گدائے بینوا! نبضِ خیال

یہ تری سہمی ہوئی نظریں سراپا التماس　　　اسقدر افسردہ حالی، خال و خد اتنے اُداس!

سر سے پا تک بید کے مانند تھراتا ہے تو　　　ہر قدم پر ناتوانی سے گرا جاتا ہے تو

چبھ رہی ہے روح میں صبر آزما افسردگی　　　تلخ ہے کس درجہ آنکھوں کی بھیانک بے وشنی!

زندگی کو ناز ہے جس پر وہ حُسنِ مستعار　　　آج تک تیری نگاہوں پر نہیں ہے آشکار

کس قدر دُھندلا ہے اس پیکر میں نورِ جانِ پاک
کوچۂ بیچارگی ہے اور تیری مشتِ خاک

تو ہے ای ناشاد! پامالِ جفائے روزگار　　　ٹھوکریں کھاتا ہے تو یا آدمیت کا وقار

عظمتِ نوعِ بشر ہے دورِ گردوں کا فراخ　　　ہوش میں آ- اے رہینِ نخوتِ اورنگ و تاج

ہے یہی ہمدردیِ پست و بلندِ کائنات　　　سر جھکا اے دعویِ یکرنگیِ بزمِ حیات

درسِ آزادی اسی کا نام ہے کیا ای خدا!　　　شرم کر اے دانشِ تہذیب و زعمِ ارتقا

جس نے پایا ہے کمالِ آدمیت کا سُراغ　　　اب کہاں ہے، سامنے آئے وہ عقلِ بددماغ

ہے اسی پستی پہ یہ آوازہ طبعِ غیور　　　بول اے انسانِ فانی کے فلک پیما غرور

ہے یہی تنظیم اجزائے معارف کا مآل   کچھ بتا اے محوِ بال افشانیٔ نبض جمال

چاہیئے لبریز تجھ کو عشرتِ فانی کا جام   اے پرستارِ خودی، اے مال و دولت کے غلام

ان سے تیری غفلتیں کیا داخل عصیاں نہیں

ہیں جو کہنے کے لئے انساں، مگر انساں نہیں

جنکی روحیں مر چکی ہیں بھیک ہے جنکا شعار   بیچتے پھرتے ہیں جو بے دام انسانی وقار

جنکے سینوں میں نہیں سعی و عمل کی دار و گیر   جنکے دل خوابیدہ ہیں خاموش ہیں، جنکے ضمیر

جنکی ہر جنبش ہے استعمارِ ذلت کے لئے   جو بنے ہیں، ظلم و تحقیر و اہانت کے لئے

جادۂ منزل سے واقف ہیں نہ گرم جستجو   سست جنکی نبض دل ہے، سرد ہے جنکا لہو

جھلملا کر بجھ چکا ہے جن کی روحوں کا کنول   زندگی میں چھا رہا ہے جن پر اک خوابِ اجل

ان کو تیرے سامنے لایا ہے فطرت کا عتاب   یہ ترے باطن کی تصویریں ہیں کچھ بیرنگ و آب

تاکہ تو آنکھوں سے دیکھے اپنی بربادی کا حال   رقص کرتے ہیں ان آئینوں میں تیرے خد و خال

ان کے نالے ہیں زمانے کو جگانے کے لئے   قوم کی غفلت کا افسانہ سُنانے کے لئے

لیکن اس ہنگامۂ ادبار میں غیرت کہاں

قوم جب مجروحِ پستی ہو تو پھر غفلت کہاں

علی اختر (حیدرآباد دکن)

احساس آتشیں

گاہے گاہے کس لئے مغموم ہو جاتا ہے تو ! اے مرے غمخوار شاید میرا غم کھاتا ہے تو

چھوڑ دے ، یہ روز کی دلدوز باتیں چھوڑ دے رنج پہونچاتی ہیں یہ جانسوز باتیں چھوڑ دے

میری ہستی خود مرے آزار کی بنیاد ہے میرے ہر ذرے میں سوزِ جاوداں آباد ہے

جاگتا رہتا ہوں میں راتوں کو جلنے کے لئے شمع کی مانند جل جل کر پگھلنے کے لئے

ختم ہو سکتا نہیں شاعر کا روحانی عذاب پھونک دے گا مجھ کو اک دن غم کا طولانی عذاب

دوسروں کی آگ میں جلنا مری تقدیر ہے میرے پیارے شاعری اک دردِ عالمگیر ہے

دے کے قدرت نے مجھے اک دوررس، گہری نظر غیر مرئی حادثوں کو دیکھنے والی نظر

کر دیا ہے اک عذابِ دائمی کا اہتمام ہو گئی ہیں زندگی کی راحتیں مجھ پر حرام

کاش تو میری نظر سے دیکھ سکتا ، ایکبار سینۂ گیتی کے لامحدود داغوں کی بہار

کیا کہوں اس غمکدے میں کیسا نازک دور ہے اور ہی کچھ ہم نشیں! قدرت کے زیرِ غور ہے

وقت آتا ہے کہ بے چون و چرا اُڑ جائیں گے

اِک دھماکا ہوگا اور ارض و سما اُڑ جائیں گے

عدم

نمودِ شبنم

جلوہ آرا تھی عروسِ شب عجب انداز سے
ٹہنیوں پر غنچہ و گل جھولتے تھے ناز سے

کیف آگیں تھیں چمن میں حسنِ گل کی گرمیاں
ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی میں تھیں ہوا کی نرمیاں

حسن کی انگڑائیاں تھیں عشق کی آغوش میں
اک جہانِ آرزو تھا محشرِ خاموش میں

عشرتوں کی مستیوں میں، شب بسر ہوتی رہی
چھاؤں میں تاروں کی، دنیا بے خبر سوتی رہی

یک بیک شب کی فضاؤں میں تغیر ہو گیا
لشکرِ انجم فلک سے کوچ کرنے کو ہوا

اب عروسِ شب سحر سے منہ چھپانے کے لئے
یا طلسمِ رنگ و بو کو آزمانے کے لئے

تیزیِ رفتار یوں شرما کے دکھلانے لگی
سوئے مغرب ناز سے اُڑتی ہوئی جانے لگی

اُف دمِ رخصت عروسِ شب کی وہ جلوہ گری
پیر میں پازیب اور سر پر ردائے عنبری

یاد ہے وہ شب کا جانا منہ گلوں کا چوم کر
شاخِ گل کا پھر قدمبوسی کو بڑھنا جھوم کر

کانٹوں سے پازیب کا پیہم اُلجھنا۔ چھوٹنا
پھر روپہلے موتیوں کا وہ چھما چھم ٹوٹنا

غنچہ و گل اس ادا پر بے تحاشا ہنس دیئے
ہنس کے اپنے جیب و دامن موتیوں سے بھر لیے

فطرت واسطی

داعیات

آہ نارسا اپنی، نالہ ناتواں اپنا
اشک داستان دل کی، خامشی بیاں اپنا

کیا کہیں، محبت میں دل پہ کیا گزرتی ہے
حسن بے نیاز اُن کا، عشق بدگماں اپنا

آپ اور دلداری! خواب ہے کہ بیداری
ہے ہنوز کچھ باقی شاید امتحاں اپنا

لطفِ زندگی کیسا سیرِ گلستاں کس کی
ہے وہ اب قفس اپنا تھا جو آشیاں اپنا

آنہ جائے حرف اک دن اُنکی بے نیازی پر
تا کجا محبت میں آپ امتحاں اپنا

تا کجا رہیں گھٹ کر دل کی حسرتیں دل میں
لوٹ لے کوئی رہزن کاش کارواں اپنا

فکر کی لطافت میں ذکر کی حلاوت میں
کون ہے شریک اپنا کون ہم زباں اپنا

دوست کے سوا کس سے حالِ دل کہوں کوکب
اور ہے دو عالم میں کون رازداں اپنا

کوکب (شاہجہانپوری)

افسردگی!

روئے گیتی سے نمایاں ہو رہا ہے انتظار!
چھا رہی ہے بے دلی ہر شے ہے گویا سوگوار!

خشک ہو کر رہ گئی ہے ہر رگِ ابرِ بہار!
تیز رو سیل ہوا میں کانپتے ہیں برگ و بار!

بند تھا غنچے کے سینے میں کبھی طوفانِ رنگ!
یا یہ عالم ہے کہ اس کی دید بھی ہے ناگوار!

اب وہ اگلی سی نہیں رخسارِ گل کی آب و تاب
اب وہ پہلی سی نہیں کیفیتِ موجِ بہار!

چہرۂ گیتی نظر آتا ہے اک تصویرِ غم!
دہر کی ہر چیز سے افسردگی ہے آشکار!

آج ہر اک شے مری نظروں میں ہے تصویرِ یاس!
دل ہی افسردہ ہو جب تو کیوں نہ ہو دُنیا اُداس!

راز بنگش سرحدی

غزل ——— فرخ بناری

غم نہیں گر غمِ ہستی کو فراوانی دے — ہاں مگر دل کو مرے ذوقِ پریشانی دے
شوقِ دیدار کی منزل ابھی طے کرنا ہی — اور جلووں کو ذرا رخصتِ عریانی دے
کون ہوتا ہی حریفِ مئے حسن و نغمہ — دل دیا ہی تو اسے قوتِ روحانی دے
جذبِ آنکھوں سے کروں دل میں جنتوں کی دنیا — اور تھوڑی سی جو گنجائشِ ویرانی دے
مکتبِ عشق میں لینا ہی مجھے درسِ تپش — چشمِ سفاک کو تادیبِ ستم رانی دے
ہوں وہ بلبل کہ قفس لیکے اڑوں سوئے چمن — مجکو صیاد اگر اذن پر افشانی دے
جادۂ شوق میں گم ہوکے تجھے پا جاؤں — عقل کو راہ بتاتی ہوئی نادانی دے
یوں تو ہی عام نگاہ غلط انداز کا فیض — ای خوشا دل جسے وہ مژدۂ حیرانی دے
شاد و واسی زمانہ ہوا خالی فرخ — کون ہی اب جو تجھے دادِ سخندانی دے

غزل ——— اختر انصاری

مری جبیں سے، یہ سچ ہے، سکوں ٹپکتا تھا — مگر نظر میں تو کربِ نہاں جھلکتا تھا
نظر تو پھر بھی نظر ہے، غمِ محبت میں — ہنسا میں جب، تو ہنسی سے لہو ٹپکتا تھا
چھپا ہے حسنِ بہاراں خزاں کی زردی میں — رُخِ بہار میں رنگِ خزاں جھلکتا تھا
ربابِ زیست سے پیدا تھی جب نوائے شباب — شمیمِ حسن سے باغِ جہاں مہکتا تھا
وہ وقت، آہ! افق سے نکل رہا تھا چاند — کلیجہ، تاروں بھری رات کا دھڑکتا تھا
مرے شباب کی قسمت بُری سہی، لیکن — جوان ہونے سے پہلے میں مر تو سکتا تھا

مری نگاہ بھی کس درجہ مست تھی اختر!
جب اُسمیں عکسِ خراباتِ دل جھلکتا تھا

مطبوعات موصولہ

ترجمان القرآن ماہوار رسالہ ہے جو ۶ ماہ قبل مولوی ابو محمد صاحب مصلح کی ادارت میں حیدرآباد سے جاری ہوا تھا، اور اب مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی اڈیٹری میں شایع ہونا شروع ہوا ہے۔

اس رسالہ کا مقصود اس کے نام سے ظاہر ہے، یعنی مطالب قرآنی اور تعلیمات فرقانی کو ان کی صحیح و حقیقی روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا۔ یقیناً اس مقصود کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، لیکن جیسا کہ خود فاضل اڈیٹر نے ظاہر کیا ہے۔ عہد حاضر میں اس مدعا کی تکمیل آسان نہیں ــــ عہد ماضی میں جب مذہب نام صرف اسلاف پرستی و قدامت پرستی کا تھا کسی شخص کا مبلغ یا مصلح بن جانا دشوار نہ تھا، لیکن اب جبکہ علوم جدیدہ اور اکتشافات حاضرہ نے "عمل و خیال" کی بالکل نئی طرح ڈال کر "حریت فکر و ضمیر" کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے۔ کوئی مذہب صرف اس دلیل کی بنیاد پر زندہ نہیں رہ سکتا کہ اس کے اسلاف کا بھی طرز عمل یہی تھا اور وہ بھی وہی سوچتے تھے جو اب بتایا جاتا ہے۔

پہلے اگر خدا کی وحدانیت سے بحث کی جاتی تھی تو اب سرے سے خدا کا وجود ہی محل نظر بتایا جاتا ہے۔ اگر پہلے ایک رسول کی ہدایت اس کے معجزوں سے ثابت کی جاسکتی تھی تو اب "علوم مقناطیسیہ" انھیں معجزوں کی دلیل پر ہزاروں رسول وہنی پیدا کرنے کے لئے آمادہ ہیں ــــ پہلے ایک واعظ آسمان کی طرف دیکھ کر "عرش و کرسی" والے خدا کو پکار سکتا تھا لیکن آج جبکہ آسمان ہی کوئی چیز نہیں رہا اس کا ایسا کرنا کسی طرح مفید یقین نہیں ہوسکتا۔ الغرض اب زمانہ "یومنون بالغیب" کا نہیں رہا بلکہ "یومنون الجربۃ والشہود" کا ہے اور اسلئے ایسے ازکار رفتہ قسمیں ہی شخص کا مذہب کی حمایت کے لئے کھڑا ہو جانا آسان کام نہیں، جبکہ خود نفس "مذہبیت" کا خیال بھی اپنی جگہ چنداں قابل قبول نہیں

اس وقت تک جتنے مذہبی رسائل مسلمانوں کے نکلے ہیں ان سب کی شان یہی رہی ہے کہ مخاطب کو مسلمان سمجھکر خطاب کیا گیا ہے اور میرے نزدیک یہ پہلی کمزوری ہے جو کسی مذہب والے کی طرف سے ظاہر ہوسکتی ہے۔ ضرورت ایسے رسائل کی ہے جن میں مسلم و غیر مسلم دونوں سے خطاب کیا جائے۔ اور جتنے خدشات و شبہات ایک شخص کے دل میں پیدا ہوسکتے ہیں ان کو سامنے رکھ کر دلائل کو استوار بنایا جائے ــــ محض یہ کہدینا کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے، یا احادیث

میں یوں بتایا گیا ہے، یا ہمارے فقہا و علماء یہ کہہ گئے ہیں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ آپ ایک مسلمان کی زبان بند کر کے طوعاً یا کرہاً اس کا سر انقیاد جھکا سکتے ہیں، لیکن جس چیز کو شمع یقین کہتے ہیں وہ خود ایک مذبذب ایمان والے مسلمان کے دل میں بھی روشن نہیں ہو سکتی، چہ جائیکہ ایک غیر مسلم یا کافر و ملحد جو آپ کی کسی کتاب سے مرعوب ہونے کے لئے طیار نہیں

اس لئے اگر یہ رسالہ بھی صرف مسلمانوں کے لئے جاری کیا گیا ہے اور غیر مسلم اس سے نور ہدایت حاصل نہیں کر سکتا تو بیکار ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے جیسا کہ خود اڈیٹر کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر ان کے لئے مناظرہ کا باب کھولنا ضروری ہوگا۔ (درانحالیکہ وہ اپنے اشتہار میں اس سے علٰحدہ رہنے کا اظہار کر رہے ہیں) ——

چاہئے تو یہ تھا کہ مولوی ابو الاعلیٰ صاحب ذاتی و انفرادی احساس و یقین کی بنا پر خواہ کچھ ہوتے، لیکن رسالہ نکالتے ایک غیر مسلم کی حیثیت سے اور پھر اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر وہ اسلام کی صداقت کو ثابت کرتے، لیکن وہ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کی ترتیب ہی میں وہ کچھ ایسی بات پیدا کر دیں۔ جو ایک غیر مسلم کو اس کے مطالعہ کی طرف مائل کر سکے —— میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ خواہ مخواہ کلام مجید کی آیتیں یا دوسری عربی کتابوں کی عبارتیں نقل کر کے پہلے ہی سے ایک غیر مسلم کے دل میں وحشت پیدا کر دی جائے اور وہ نگاہ ڈالتے ہی رسالہ کو بند کر کے رکھدے۔ اس لئے میں مشورہ دوں گا کہ ظاہری حیثیت اور انشاء و تحریر کے لحاظ سے بھی اس کو "اغیار" کے مطالعہ کے قابل بنایا جائے۔ اگر واقعی اسلام کی صحیح خدمت انجام دینا ہے

قرآن پاک اپنے معنی کے لحاظ سے تین حصوں پر منقسم ہے ایک وہ جس میں اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسرا وہ جس میں اعتقادات پیش کئے گئے ہیں۔ اور تیسرا وہ جو قصص و تمثیلات پر مشتمل ہے۔ حصۂ اول کے متعلق نہ زیادہ سمجھنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و برہان کے لانے کی، کیونکہ تعلیم اخلاق تمام مذاہب کی تقریباً یکساں ہے اور ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہے کہ مذہب اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مختلف یا فروتر نہیں، البتہ حصۂ دوم اور حصۂ سوم پر زیادہ توجہ کرنا چاہئے، کیونکہ علوم جدیدہ اور انکشافات حالیہ نے انھیں دو حصوں کی طرف سے ریب و تذبذب کی کیفیت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان شبہات کے دور کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ اس صدی کا مجدد کہلائے جانے کا مستحق ہوگا

اس لئے میں مشورہ دوں گا کہ ایک مستقل باب اس موضوع پر قائم کر کے تمام اُن آیات قرآنی کا استقصاء کرنا چاہئے جو عقاید و قصص سے متعلق ہیں اور ان کا صحیح مفہوم و مدعا متعین کر کے اُن اعتراضات کو رفع کرنا چاہئے جو اس وقت اہل علم و تحقیق کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا بلکہ صرف پند و موعظت کو شعار بنا لیا تو پھر یہ رسالہ صرف بچوں، عورتوں اور جاہلوں ہی کے پڑھنے کی چیز رہ جائے گا۔ اور علمی و تحقیقی دنیا میں اسے کوئی

نہ پوچھے گا

مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب ان کا جاننے والا صرف میں ہی تھا۔ اور اس لئے میں اچھی طرح واقف ہوں کہ باوجود قدامت پسند ہونے کے وہ بہت سلجھی ہوئی طبیعت رکھتے ہیں، خدا نے "فکر سلیم" کی توفیق بھی انھیں دی ہے، اور اگر ضرورت و ماحول کے اقتضاء نے انھیں مجبور نہ کر دیا تو ہمیں امید رکھنا چاہیے کہ وہ ترجمان القرآن کو صرف پرانے خیالات کے مولویوں کا پرچہ نہ ہونے دیں گے۔ بلکہ جدید روشن خیال والوں کے لئے بھی اسے مفید بنانے کی کوشش کریں گے ——— محرم کا جو رسالہ ہمیں موصول ہوا ہے اس کو دیکھ کر آیندہ کے متعلق ہم کوئی رائے قائم کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ نئے اڈیٹر کی پہلی فکر کا نتیجہ ہے۔ آیندہ کے لئے میں ان کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ سب سے پہلے وحی والہام کی حقیقت پر گفتگو کریں کہ اسی کے سمجھنے پر کلام اللہ کی حقیقت کا سمجھنا منحصر ہے اور پھر مسئلہ معاد کو لیں کہ اسی کے حل ہونے پر انحصار مذہبیت و لامذہبیت کا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کلام الٰہی اور معاد کا کیا مفہوم متعین کرتے ہیں، اس کے بعد میں اپنے شبہات و اعتراضات پیش کروں گا۔ اور اگر ان کی کوشش سے وہ دور ہو گئے تو مجھے بڑی مسرت ہو گی کیونکہ "ناچار مسلماں شو" کی جس لعنت میں بہت سے لوگ گرفتار ہیں، اس کا ایک بڑا سبب "عقیدۂ معاد" بھی ہے

خمستان ایک ماہوار ادبی رسالہ ہے جو کم و بیش ایک سال ہوئے سرزمین راولپنڈی سے نکلا۔ اور اب تک جاری ہے ـــ اس رسالہ کی نظم و ترتیب وہاں کی ایک ادبی انجمن کے ہاتھوں میں ہے جس کے روح رواں ہمارے عزیز دوست حضرت عدم ہیں۔ جناب عدم کی ادبیت کا اثبات ضروری نہیں کیونکہ ناظرین نگار اچھی طرح واقف ہیں، کیونکہ ان کی نظمیں اکثر نگار میں شائع ہوتی رہتی ہیں اور بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں

اُمید ہے کہ یہ رسالہ جناب عدم کی کوشش سے "معیاری" اصول کو نہ چھوڑے گا۔ اور زبان کی مفید خدمت انجام دینے والا ثابت ہو گا

محشرستان مجموعہ ہے جناب محشر عابدی بی۔ اے کے چند مختصر افسانوں کا جسے مطبع عہد آفریں حیدر آباد نے پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ شایع کیا ہے۔ جناب محشر کے جو افسانے اس مجموعہ میں شامل ہیں وہ ہندوستان کے مختلف رسائل میں اس سے قبل شایع ہو کر پسند کئے جا چکے ہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ ان کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شایع کیا جاتا

جناب محشر کے افسانے عموماً جذبات محبت سے لبریز ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے کافی تاثر کے ساتھ انھیں لکھا ہے۔ زبان و طرز ادا بھی کافی دلکش ہے اور پلاٹ بھی اکثر افسانوں کے فن کے لحاظ سے

اچھے ہیں۔
یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۲۳۶ صفحات پر محیط ہے اور مجلد عہ ہیں، غیر مجلد عہ میں دفتر نگار سے بھی مل سکتا ہے

نوجوان ورتھر کی داستان غم ترجمہ ہے جرمنی کے مشہور فیلسوف شاعر گوئٹے کے ایک رومان محبت کا، جناب ریاض الحسن صاحب ام۔ اے کے قلم سے۔

گوئٹے کو دنیائے ادب میں جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور جو بین الاقوامی شہرت اسکو حاصل ہوئی وہ مشکل ہی سے کسی اور کو نصیب ہوئی ہوگی۔ گوئٹے دنیا کے اُن چند مخصوص لوگوں میں سے تھا جن کے دماغ کو قدرت نے ادب و فلسفہ کے لئے نہایت ہی معتدل امتزاج کا حامل بنایا اور عمر بھر اُن سے وہی خدمت لی جس کے لئے وہ وضع کئے گئے تھے

گوئٹے نے اس داستان محبت کو صرف ہیرو (ورتھر) کے خطوں سے مرتب کیا اور جذبات کی ایک دنیا اُن میں منتقل کردی۔ افسانہ صرف اتنا ہے کہ ورتھر ایک لڑکی سے محبت کرنے لگا اور وہ اس سے۔ لیکن اس کی شادی کسی اور شخص سے ہوگئی، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ورتھر نے ہجر و فرقت کی کڑیاں جھیلتے جھیلتے آخرکار ایک دن خودکشی کرلی۔ ورتھر کا وہ خط جو اس نے خودکشی سے پہلے اپنی محبوبہ کو لکھا ہے۔ ایک ایسا شاہکار ادب ہے جس کی مثالیں بہت کم کسی زبان کے لٹریچر میں ملتی ہیں

فاضل مترجم کا ملک کو ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ کرکے زبان کی گرانقدر خدمت انجام دی۔ ترجمہ بڑی حد تک صاف و سلیس ہے، گو ترقی کی گنجایش اس میں ابھی بہت کچھ پائی جاتی ہے۔

فاضل مترجم نے مقدمہ میں گوئٹے کی مفصل سیرت بھی قلمبند کردی ہے اور اس کی تصانیف پر بھی دلچسپ تبصرہ کردیا ہے جسکی سخت ضرورت تھی۔ یہ کتاب عہ میں لٹریری سنڈیکیٹ نمبر ۱۔ بیلی روڈ الہ آباد سے مل سکتی ہے

تجدید عمل لاہور میں ایک مذہب شکن انجمن قائم ہوئی ہے اور یہ رسالہ اس انجمن کی پہلی تبلیغی کوشش ہے یہ رسالہ لکھنؤ کے مرزا عسکری علی خاں مجازی نے لکھا ہے اور صحیح آئینہ ہے ان خیالات کا جو آجکل ہر سوچنے والے دماغ میں پیدا ہورہے ہیں اور آہستہ آہستہ مذہب کی عمارت کو متزلزل کرتے چلے جاتے ہیں

اس رسالہ میں مختلف ابواب کے ماتحت مختلف عنوانات سے بحث کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مذہب کا وجود عہد تاریک کی یادگار ہے اور اب زمانۂ حال میں مذہبیت کو قائم رکھنا ذہنی ارتقاء کی راہ میں ایک سنگ گراں حائل کرنا ہے جسے انسانیت کبھی گوارا نہیں کرسکتی ---- رسالہ فی الجملہ دلچسپ اور مطالعہ کے لائق ہے معلوم نہیں ہمارے علماء کرام کی نگاہ سے یہ رسالہ گزرا ہے یا نہیں، اور عبدالماجد صاحب دریابادی

"قبلۂ دیں مددے، کعبۂ ایماں مددے" نے بھی کوئی کارروائی اس انجمن اور اس رسالہ کے مصنف کے خلاف مقدمہ چلانے کی کی ہے یا نہیں اور اپنے مذہب کی حمایت کے لئے حکومت برطانیہ کے سامنے دستِ سوال پھیلایا یا نہیں۔ اگر اُن کے علم میں یہ بات اب تک نہیں آئی تو اب میں ان کو آگاہ کرتا ہوں اور اُن کے جوش ایمانی کے مظاہرہ کا منتظر ہوں، لیکن اگر یہ جاننے کے بعد بھی وہ خاموش ہیں تو سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

یہ رسالہ ۸ر میں اُردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتا ہے

اِس کا تجربہ نہ کیجئے

اگر آپ کو پندرہ کتابیں مختلف سائز کی ایک الماری میں رکھی ہوئی دیدی جائیں اور کہا جائے کہ ان کو الٹ پلٹ کر جتنی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں الماری میں ترتیب دیجئے تو بظاہر آپکو یہ کام بہت آسان نظر آئیگا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک کتاب کے بدلنے اور رکھنے میں صرف ایک منٹ صرف ہو تو بھی آپکو ۲۴۸۷۹۹۶ سال کا زمانہ درکار ہوگا

معلومات

فن خطابت کے دس اہم اصول

فرانس کے مشہور ماہر خطابیات نے ذیل کے دس اصول فن خطابت کے بتائے ہیں :-

۱ — ہمیشہ نرم و آہستہ آواز سے بولنا شروع کرو اور رفتہ رفتہ آواز کو بلند کرو

۲ — ہر لفظ کو زبان اور لب کی پوری حرکت سے صاف صاف ادا کرو

۳ — ہر لفظ دوسرے سے علیحدہ ادا کرو، تاکہ باہم گرمل نہ جائیں

۴ — ٹھہر ٹھہر کر، گہری سانس لیکر تقریر کرو اور ایسا کبھی نہ ہو کہ تم کچھ بول رہے ہو اور تمھارے دانت بند ہوں

۵ — اپنے سامنے سامعین کی طرف دیکھتے رہو اور اگر کوئی تحریر پڑھ رہے ہو تو کوشش کرو کہ آواز کی موجوں کا رُخ سامعین کی طرف سے نہ ہٹے

۶ — جب خطبہ دو تو پوری طرح تنکر کھڑے ہونے کی کوشش کرو

۷ — تقریر کے وقت کبھی تنگ و چسُت کپڑے استعمال نہ کرو

۸ — کھانا کھانے کے بعد تقریر کرنے سے احتراز کرو

۹ — میٹھی چیزیں زیادہ استعمال کرو

۱۰ — اور اگر ان تمام احتیاطوں کے باوجود تمھاری آواز کام نہیں دیتی تو کسی طبیب سے رجوع کرو

موت کے بعد تاجپوشی

پرتگال کا ایک بادشاہ تھا جس کے بیٹے اور ولی عہد کا نام بدرو تھا - بدرو کی شادی ایک عورت انیز سے ہو چکی تھی، لیکن چونکہ یہ شادی شاہ پرتگال کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی اور وہ اپنے بیٹے کی شادی کسی اور جگہ کرنا چاہتا تھا، اس لئے اس نے اپنی بہو کو قتل کرادیا

اس کے تین سال بعد جب وہ مرا اور بدرو تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی مقتول بیوی کی لاش کو نکلوایا اور لباس فاخرہ لپیٹ کر اس کو تخت پر بٹھایا اور سر پر تاج رکھا جس وقت یہ رسم ادا ہو رہی تھی بدرو اپنی مقتول ملکہ کے سامنے کھڑا ہوا رو رہا تھا اور تمام امرا سر جھکائے ہوئے رسم احترام کو ادا کر رہے تھے

ایک عظیم الشان درخت

کلیفورنیا کے جنگلوں میں جو جماعتیں مفتشین کی پھرتی رہتی ہیں ان کو وہاں ایک عجیب و غریب درخت نظر آیا ہے جس کی عظمت کا مقابلہ دنیا کا کوئی درخت نہیں کر سکتا

یہ درخت ۳۰۸ گز لمبا ہے اور بیس گز اس کا دور ہے - ہر چند اس کی لمبائی زیادہ حیرت انگیز نہیں کیونکہ اس لمبائی کے

درخت وہاں اور بھی پائے جاتے ہیں لیکن اس کی موٹائی البتہ حیرتناک ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس درخت کی لکڑی سے پورے بیس گھر طیار ہو سکتے ہیں

کلیفورنیا میں لکڑی کے مکانات کثرت سے طیار ہوتے ہیں، چنانچہ وہاں ایک کلیسہ ایسا ہے جو صرف ایک ہی درخت کی لکڑی سے طیار ہوا ہے، لیکن اس درخت سے تو درجنوں کلیسا طیار ہو سکتے ہیں

حسن کا مقابلہ چار ہزار سال قبل

اس وقت یوروپ میں ہر جگہ مقابلۂ حسن کا سودا سمایا ہوا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ کوئی نئی چیز ہے، درانحالیکہ اب سے چار ہزار سال قبل بابل و آشوریہ میں بھی یہی رواج پایا جاتا تھا اور وہاں کے بادشاہ بھی بالکل اسی طرح اس کا انتظام کرتے تھے جیسا آجکل یوروپ و امریکہ میں نظر آتا ہے

فیصلہ کرنے والوں کی ایک جماعت بٹھا دی جاتی تھی اور مقابلۂ جمال میں شریک ہونے والی لڑکیاں انکے سامنے سے گذرتی تھیں یہ ایک ایک کو دیکھ کر باتفاق رائے اس کی حسن کی قیمت کا اندازہ کرتی تھیں اور جو شخص اُن سے نکاح کرنا چاہتا تھا، اس کو مقررہ قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس طرح جو روپیہ جمع ہوتا تھا وہ انھیں لڑکیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا تاکہ ان کے مصارف نکاح اور جہیز کے کام آئے

نہ جلنے والا کاغذ

جرمنی کے کسی شخص پاول براؤن نے ایک کاغذ ایجاد کیا ہے جس پر آگ کا اثر نہیں ہوتا اور سخت سے سخت آگ اس کو جلانے سے عاجز ہے، درانحالیکہ بظاہر دیکھنے میں وہ بالکل معمولی کاغذ معلوم ہوتا ہے

یہ کاغذ نوٹ، دستاویز وغیرہ کے لئے بہت موزوں ہے اور اب جرمنی میں غالباً اسی کاغذ کے "اوراق مالی" طیار کئے جائیں گے۔ یہ شخص اس سے قبل پچاس ایجادیں کر چکا ہے جو سب کی سب جرمنی میں رجسٹرڈ ہو چکی ہیں

ڈاک ہوائی کے ذریعہ سے

جرمنی، فرانس، امریکہ میں تجربے کئے جا رہے ہیں کہ ڈاک ہوائیوں کے ذریعہ سے پہونچائی جائے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایک بڑی نلکی لی جائے گی جس کے نصف حصہ میں ڈاک ہوگی اور بالائی نصف حصہ ہوائی ہوگا۔ اس ہوائی میں اتنی طاقت ہوگی جو ایک متعین مقام تک پہونچ سکے۔ اس مقام تک پہونچنے کے بعد وہ پھٹے گی اور ڈاک کے تھیلے چھتریوں کے ذریعہ سے آہستہ آہستہ زمین پر اتر آئیں گے

اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ گویا ڈاک تار کے ذریعہ سے بھیجی جا سکتی ہے۔ اور اس کے بعد دوسرا قدم غالباً یہ ہوگا کہ بجائے ڈاک کے تھیلوں کے انسانوں کو ہوائی میں بٹھا کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچایا جائے ــــ جرمنی میں اس کے تجربے ہو رہے ہیں اور پوری کامیابی کے ساتھ

امریکہ میں اشتہار کا بالکل نیا طریقہ

امریکہ کی ایک کتب فروش کمپنی نے ایک عجیب و غریب طریقہ کتابیں فروخت کرنے کا اختیار کیا ہے ۔ اس نے دس ہزار اشتہار معہ ایک لفافہ کے ملک میں تقسیم کئے ہیں اور اشتہار میں صرف یہ لکھا ہے کہ لفافہ چاک کرکے مطالعہ کیجئے ۔ لفافہ کے اندر ایک ٹکڑا ڈورے کا ملتا ہے اور ایک گوند لگا ہوا فیتہ جس پر کارخانہ کا پتہ چھپا ہوا ہے ، اسی کے ساتھ ایک تحریر ملتی ہے جس میں درج ہے کہ آپ ہماری دوکان سے ہر نئی شائع شدہ کتاب مفت لے کر پڑھ سکتے ہیں اگر پسند ہو تو قیمت بھیجدیجئے ورنہ یہ ڈورا لپیٹ کر اور فیتہ چپکا کر ڈاک خانہ میں دیدیجئے ، کتاب ہم کو واپس مل جائے گی

غار کے اندر رہنے والی قوم

چین کے صوبۂ شانسی میں تمام لوگ ان غاروں کے اندر زندگی بسر کرتے ہیں جو کسی وقت اُن کے آباؤ اجداد نے پہاڑوں میں کھودے تھے ۔ یہ لوگ مغل نسل کے ہیں اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے کافی ترقی یافتہ ہیں کیونکہ یہ لوگ کاشتکاری ، پارچہ بافی ، اور سنگتراشی وغیرہ سے بخوبی واقف ہیں

حال ہی میں جرمنی کے ایک سیاح نے ان کا حال لکھا ہے جو بہت دلچسپ ہے ۔ اس سیاح کو حیرت ہوگئی جب اس نے دیکھا کہ ان کے مکانات جو غاروں کے اندر پتھر کاٹ کر بنائے گئے ہیں نہایت پاکیزہ ساخت کے ہیں اور فن تعمیر و سنگتراشی کا بہترین نمونہ کہلائے جا سکتے ہیں ۔ یہ لوگ نہایت نفیس کپڑے طیار کرتے ہیں ، عمدہ چٹائیاں بُنتے ہیں اور گھروں کی آرایش و زیبایش کے لئے بھی مختلف قسم کی چیزیں بناتے ہیں ان کی صحت بہت اچھی ہے اور باوجودیکہ غاروں میں رہنے سے سورج کی روشنی ان تک بہت کم پہونچتی ہے ان کی تندرستی قابل رشک ہے ۔ ان کے یہاں جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کے دفن کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور قبر کی طیاری میں حد درجہ فنی نزاکت صرف کی جاتی ہے

صرف اخیر جون ۱۹۳۳ء تک

بالکل مفت

سائنس کے عجائب ۶ر —— فراست التحریر مکمل عہ ر —— فراست الید عہ ر

یعنی

صرف ۸ر کے ٹکٹ بھیجدیجئے ، تینوں کتابیں آپ کو مل جائیں گی

منیجر نگار لکھنؤ

تار کا پتہ مصفی دہلی

ٹیلیفون ۵۵۲۲

مُصَفّیٰ

طب یونانی کا تازہ کرشمہ

انسان کی زندگی کا مدار خون پر ہے خون اگر خراب ہو گیا ہے تو آدمی کی تندرستی قائم نہیں رہ سکتی
ہندوستانی دواخانہ دہلی "مصفی" ایجاد کرکے تمام ملک کو مقابلہ کی دعوت دیتا ہے اور بلا خوف
تردید دعویٰ کرتا ہے کہ صفائی خون کے لئے مصفی سے بہتر دوا آج تک نہ ایشیا پیش کر سکا ہے نہ یورپ
مصفی ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کا خلاصہ ہے۔ اور مسیح الملک ثانی حکیم حاجی محمد احمد خاں صاحب
کے مشورہ سے جدید سائنٹفک طریق پر طیار کیا گیا ہے۔ خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے ہر مرض
کی تیر بہدف دوا ہے۔ کھجلی۔ داد۔ پھنسیاں وغیرہ حتیٰ کہ سوزاک۔ آتشک۔ اور جذام کا زہریلہ مادہ
بھی اس کے استعمال سے ہمیشہ کے لئے نابود ہو جاتا ہے۔ اوس کی خوراک چار کا ایک چمچہ ہے۔ اور
بلحاظ نفع مصفی درحقیقت اکسیری چیز ہے

قیمت ۱۲ خوراک کی شیشی صرف ۱۲؍ محصول ذمہ خریدار

ترکیب استعمال

ایک خوراک صبح ایک شام تھوڑے پانی میں ملا کر اور اگر مرض کا جوش زیادہ نہ ہو تو دن میں
۲ مرتبہ استعمال کیا جائے

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی سے طلب کیجئے

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا۔
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سہ)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۴	فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۳۳ء	شمارہ ۱

جو دے ہے تو وہ معلوم کر سکتا ہے سنہ ۲۴

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۴	جولائی سنہ ۱۹۳۴ء	شمار ۱

ملاحظات

نوع انسانی کی تفریق دنیا میں جن جن صورتوں سے پیدا ہوئی، ان کی تفصیل تو خیر مشکل ہے لیکن بند کھلی کھلی صورتیں ایسی ہیں جن کو آسانی سے بتایا جاسکتا ہے اور آسانی سے ہر شخص سمجھ بھی سکتا ہے

عہد ظلمت و جہل کو چھوڑیئے جب انسان کی حالت ایک جانور سے زیادہ نہ تھی اور وہ انسان کے "مفہوم اجتماعی" سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ دوسرے انسان پر حملہ کرتا تھا اور اُسے کھا جاتا تھا۔ وہ اپنے ہی خاندان کے افراد پر غصہ کرتا تھا، اور انھیں ہلاک کر ڈالتا تھا بلکہ اس زمانہ کو لیجئے جب انسان نے اجتماعی زندگی شروع کی اور "من و تو" کی تفریق مٹانے کے لئے "مذہب" کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مذہب کو اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی؟ کیا وہ دنیا سے خود غرضی و حبِ ذات کے جذبہ کو مٹا سکا؟ —— اس کے جواب میں تاریخ کی ورق گردانی کرو اور دیکھو کہ اس کے جتنے صفحات خون سے رنگین نظر آتے ہیں۔ ان میں کیا سوائے مذہبی جنگوں کے کوئی اور چیز پائی جاتی ہے —— پھر تماشہ یہ کہ جس مذہب نے اپنے آپ کو جتنا زبردست علمبردار امن و سکون کا بتایا، اتنا ہی زیادہ وہ "غارتگر امن و سکون" رہی کو جتنا زیادہ برا ظاہر کیا اتنی ہی زیادہ خونریزی اس نے کی —— لیکن خیر اس کو بھی

چھوڑئیے کہ یہ افسانہ بھی بہت پُرانا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ دور مذاہب چونکہ انسان کے عہد وحشت سے قریب تر تھا اس لئے یہ سب کچھ ظاہر ہونا مستبعد نہ تھا ——— آئیے، اس دَور کو دیکھئے جسے دورِ عقل و حکمت کہتے ہیں، عہد اخلاق و انسانیت سے تعبیر کرتے ہیں اور جو علوم و فنون، اور گوش و ہوش کا زمانہ کہلاتا ہے ——— ہاں، تو سوچئے کیا اس عہد میں انسان زیادہ صلح جو و امن پسند ہوگیا ہے، کیا اس کی خونریزیاں وخوں آشامیاں کم ہوگئی ہیں، کیا اب وہ آپس میں مل جُل کر زندگی بسر کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا اس کی خود غرضی و نفس پرستی مٹ گئی ہے؟ یقیناً نہیں — اگر پہلے ایک وحشی انسان صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دوسرے انسان کو ہلاک کر ڈالتا تھا تو اس عہد کا متمدن انسان اپنی اجتماعی گرسنگی دور کرنے کے لئے قوم کی قوم کو کھا جانے کے لئے آمادہ ہے اور اگر پہلے صرف اس بات پر لڑائی ہوتی تھی کہ فلاں اہرمن پرست ہے اور فلاں یزداں پرست، تو اب اس بات پر ہوتی ہے کہ فلاں کا رنگ سیاہ ہے اور فلاں کا سپید، پہلے انسان کی خواہشیں محدود تھیں اور تمنائیں مختصر اس لئے لڑائی بھی جلد ختم ہو جاتی تھی، لیکن اب حرص انسانی کی کوئی حد و پایاں نہیں اس لئے جنگ کے ختم ہونے کی بھی کوئی توقع نہیں ——— پہلے انسان لڑتا تھا صرف زندہ رہنے کے لئے اور اب لڑتا ہے عیش کرنے کے لئے، پہلے جنگ ہوتی تھی بقاء حیات کے لئے اور اب ہوتی ہے "توفیق معصیت" کے لئے، یعنی اگر پہلے سوال ضرورت کا تھا تو اب لذت کا ہے

یہ استعماری مظالم، جو صنعت و تجارت کی ترقی کے بہانہ سے کئے جاتے ہیں، یہ مستبدانہ حکمرانیاں جو تہذیب و شائستگی کے نام سے روا رکھی جاتی ہیں، یقیناً نہ بقاء حیات کے لئے ہیں نہ "سد رمق" کے لئے بلکہ اُس جذبۂ حرص و خود غرضی کی تسکین کے لئے ہیں، جو آتشکدۂ جہنم کی طرح ہر وقت صدائے ہل من مزید بلند کر رہا ہے

پھر چونکہ اجتماعی معاصی و جرائم کے لئے اجتماعی تدابیر کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے ظالم جماعتوں نے مظلوم جماعتوں کے خلاف اپنے اندر اتحاد عمل پیدا کرنے کے لئے مختلف تدابیر پر غور کیا اور آخر کار انھوں نے ایک ایسا بہانہ تلاش کر ہی لیا جو کافی نمایاں اور بہ اندازۂ حرص و طمع کافی وسیع تھا - یعنی انھوں نے بنی نوع انسان میں تفریق پیدا کرنے کے لئے اب مذہب یا مذہبیت کو سامنے نہیں رکھا - بلکہ اس سے بھی زیادہ وسیع ذریعہ نسل و رنگ کے امتیاز کا پیدا کیا - یہاں تک کہ آج یورپ و ایشیا کا افتراق نہ جغرافی اصول پر قائم ہے نہ تاریخی حقیقت پر، بلکہ صرف اس نظریہ پر کہ یوروپ کا انسان گورا ہے اور ایشیا کا کالا - ایک کا رنگ سفید ہے اور دوسرے کا سیاہ ——— پھر جنھوں نے استعمار مغربی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اُن سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ یہ امتیاز کب سے مشرق کو پامال کر رہا ہے اور کس کس طرح اس تفریق سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا

لیکن چونکہ ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے اور ہر انسانی تدبیر کی ایک عمر، اس لئے یہ ضرور تھا کہ مشرق کسی نہ کسی وقت اس ذلت کو محسوس کرتا، اس لعنت سے بیزار ہو جاتا اور اگر کسی کے پاس چشم بینا موجود ہے تو وہ معلوم کر سکتا ہے کہ اس

احساس کی لہر اب مشرق کے ہر ہر گوشہ میں پائی جاتی ہے

اس احساس و بیداری کے کیا اسباب ہیں؟ — اس میں شک نہیں کہ انحطاط و زوال خود اپنے اندر عروج و ترقی کے اسباب پنہاں رکھتے ہیں، لیکن ان اسباب کو بروئے کار لانے کے لئے کوئی نہ کوئی تحریک ضروری ہے۔ پھر جنھوں نے بیسویں صدی کی ابتدا سے سیاسیات عالم کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس تحریک کا باعث صرف وہی امتیاز نسل و رنگ کی دیوار تھی۔ جو مغرب نے اپنے اور مشرق کے درمیان حائل کر رکھی ہے اور جسے جنگ عظیم نے نمایاں طور پر ظاہر کر کے اہل مشرق کو خواب گراں سے جگا دیا

تیس سال اس طرف کی بات ہے کہ جاپان سوائے اپنے جزیرہ کے ایشیا میں کسی ایک جزیرہ کا بھی مالک نہ تھا، لیکن اب کیا ونشا اس کے قبضہ میں ہے، منچوریا میں اس کی حکومت ہے، خط استوا تک تمام جزائر جنوبی اس کی ملکیت میں ہیں، دول عظمیٰ میں اس کا شمار ہوتا ہے اور بحری قوت میں تیسرا درجہ اس کا سمجھا جاتا ہے

سنہ ۱۹۰۰ء میں چین کی حالت ایک ایسی لاش کی تھی جسے مختلف کتے نوچنے کے لئے گھیرے ہوئے تھے لیکن جب وہاں ملوکیت ختم ہو کر جمہوریت پیدا ہوئی، اور ملک میں بیداری کے آثار ظاہر ہوئے تو اس کی تمام املاک جو دول یورپ کے اجارہ میں تھی واگزاشت ہوئیں اور اس کا حق استقلال تسلیم کر کے وہ امتیازات اٹھانے پڑے جو اہل مغرب کو وہاں حاصل تھے

افغانستان کی جو حالت تیس سال قبل تھی وہ بھی کسی سے مخفی نہیں کہ اس کا وجود صرف اغراض برطانیہ کی تکمیل کے لئے تھا اور حکومت ہند کا تابع اس کو سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح ایران کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف روس اس کو دباتا چلا جاتا تھا اور دوسری طرف برطانیہ ——— بلاد عرب دولت عثمانیہ نہیں بلکہ حقیقتاً دول یورپ کی سیادت میں تھے، لیکن اب یہ تمام ممالک خود مختار ہیں، آزاد ہیں اور استقلال تام کے مالک کہلائے جاتے ہیں۔ ہر چند ہندوستان اس وقت تک حصول آزادی میں کامیاب نہیں ہوا، لیکن جو تحریک ملک میں پیدا ہو گئی ہے اور جسنے "نظم نیابت" کے حقوق حاصل کر کے ایک خوشگوار مستقبل کی بنیاد ڈال دی ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں ——— اس لئے اب سوال یہ ہے کہ مشرق کی اس عام بیداری کا سبب کیا تھا۔ یعنی کیا کوئی اندرونی تحریک از خود بروئے کار آئی یا کسی خارجی محرک نے یہ احساس پیدا کیا ——— اس کا جواب وہی ہے جو اس سے قبل ہم دے چکے ہیں اور پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اہل مغرب کی نخوت و کبریائی کا، عُجب و غرور کا جس نے مشرق کے انسان کو انسان نہ سمجھ کر جانوروں کا سا سلوک اس کے ساتھ کیا اور اس کو سنگ جامد جان کر ہمیشہ ٹھکرایا ——— پھر چونکہ انسان ہمیشہ ٹھوکریں کھانے کے بعد ہی سنبھلتا ہے اس لئے اہل مشرق کو بہر حال احساس ذلت ہونا چاہئے تھا۔ اور جب ایک بار یہ

احساس پیدا ہو گیا ہے تو کسی نتیجہ تک پہونچنا ضروری ہے، خواہ اس کے لئے کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ کرنا پڑیں
یہ تو ایک عمومی تبصرہ ہوا ایشیاء کے تمام ممالک پر لیکن انھیں میں ایک مخصوص ملک ایسا بھی ہے جو اپنی نوعیت آبادی کے لحاظ سے جداگانہ تنقید کا محتاج ہے اور وہ ہندوستان ہے

تمام ایشیاء میں یہی ایک ملک ایسا ہے جہاں دو متضاد خیال واعتقاد کے انسان بستے ہیں اور اس لئے اگر حصول آزادی میں یہ دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ جائے تو حیرت کی بات نہیں، کیونکہ جب تک کوئی ایک غرض مشترک کسی ملک کی آبادی میں نہ پیدا ہو، حصول مدعا آسان نہیں، اور یہاں یہی امر ازبس دشوار نظر آتا ہے

یقیناً اس باب میں ہندو مسلمان دونوں قابل الزام ہیں، لیکن میں مسلمانوں کو زیادہ قصور وار ٹھیراتا ہوں کیونکہ باوجود اس امر کے کہ وہ یہیں کے قدیم باشندے ہیں، یہیں کی آب وہوا میں پیدا ہوئے، پلے اور بڑھے، لیکن وہ محض اختلاف مذہب کی وجہ سے اپنے آپ کو ہندوؤں سے بالکل الگ تھالگ رکھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اختلاف مذہب انسان کی قومیت کو نہیں بدل سکتا۔ اور وطنیت کا رشتہ ایسا مضبوط رشتہ ہے جو کسی طرح ٹوٹ ہی نہیں سکتا —— یہ ہو سکتا ہے کہ آج ایک ہندو مسلمان ہو کر ہندوؤں کی برادری سے خارج ہو جائے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک مسلمان آریہ یا عیسائی ہو کر، مسلمانوں کی جماعت سے نکل جائے، لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ بجائے ہندوستان کے فرانس یا امریکہ کا باشندہ کہلائے اور اس کی وطنیت بدل جائے۔ پھر مسلمانوں نے حجاز وعرب، ترکی وایران سے تو ہمیشہ دلچسپی لی کیونکہ سوال ہم مذہب ہونے کا تھا، لیکن خود ہندوستان کے حالات سے کبھی اعتناء نہ کیا جہاں خود انھیں اپنی زندگی بسر کرنا ہے۔ اگر اسلام کسی انسان کے قومیت کو بدل دینے کا مدعی ہو کر دنیا ہوا ہے، تو نتیجہ معلوم اور اگر اس کا مقصد وادعا یہ نہیں ہے تو پھر یہ ذہنیت کیسی ؟

میں اس کا خطاوار اپنے یہاں کی مولوی جماعت کو قرار دیتا ہوں، جن کو آج تک مذہبیت و وطنیت کے امتیاز کا سلیقہ پیدا نہیں ہوا اور جو ملک وقوم کے مسائل میں بھی مذہبی تقشف کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتے

آجکل بعض اہل نظر مسلمان بھی یہ شکایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ہندوؤں کی جماعت ہندوستان میں ہندو حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اور مسلمانوں کے جذبات کے ساتھ کسی رواداری کے لئے آمادہ نہیں۔ درانحالیکہ انھیں غور کرنا چاہئے کہ کیا وہ خود باشندۂ ہندوستان ہونے کی حیثیت سے ہندو نہیں ہیں اور کیا ان کا یہ کہنا دربردہ اس خواہش کا اظہار نہیں کہ وہ مسلم حکومت چاہتے ہیں۔ پھر جب وہ خود ہندوستان سے کوئی رشتۂ وطنیت قائم رکھنا نہیں چاہتے تو ہندوؤں سے شکایت کیوں ؟ وہ تو بہرحال ہندو ہیں، ہندو رہیں گے۔ اور ان کا قومی فرض ہے کہ وہ اپنی حکومت قائم کریں خواہ مسلمانوں کو گوارہ ہو یا ناگوار

یہ بات اب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے کہ ایک بار جنگ اور ہوگی، اور ایسی شدید کہ شاید دنیا پھر کبھی سر نہ اٹھا سکے ــــ اسلحہ سازی کے خلاف جلسے پر جلسے ہو رہے ہیں، صلح و امن کی ہر طرف سے پکار ہو رہی ہے، لیکن حقیقت کے لحاظ سے امن و سکون، غالب کے اس مصرعہ کی تفسیر سے زاید نہیں کہ

آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

ٹھیک اسی وقت جبکہ فرانس، جرمنی کی اسلحہ سازی کو ناقابل معافی جرم قرار دیکر اس کا انسداد کلی چاہتا ہے، وہ خود اپنے ملک کے محاصل کا بڑا حصہ فراہمی اسلحہ میں صرف کر رہا ہے، اور عین اسی لمحہ میں جب جرمنی صدائے امن وسکون پر لبیک کہتا ہوتا ہے، روہر کے کارخانے اس کے لئے لاکھوں کوہ شکن توپیں ڈھالنے میں سرگرم کار نظر آتے ہیں ــــ بالکل یہی حال اٹلی و برطانیہ کا ہے اور روس و امریکہ کا

اس لئے اس سلسلہ میں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ در پردہ جنگ کی طیاریاں کرتے ہوئے، جنگ سے احتراز کرنے کی تبلیغ کرنا کیا معنی رکھتا ہے اور دوسرے یہ کہ اگر واقعی جنگ ہوئی تو کیوں ہوگی اور کہاں سے یہ شعلہ بلند ہوگا ــــ امر اول کا جواب زیادہ مشکل نہیں، کیونکہ وسائس سیاسی کی یہ پہلی مثال نہیں ہے جس پر تعجب کیا جائے اور تجارتی حرص و طمع کا عفریت جب تک سر پر سوار ہے، باہمی مسابقت یقیناً قائم رہے گی اور اس طرح جو بے اعتمادی و خودغرضی قدرتاً پیدا ہونا چاہئے، وہ ہمیشہ ایک کو دوسرے سے اسی طرح برسر پرخاش رکھے گی، یہیں سے "کیوں" کا جواب بھی مل سکتا ہے ــــ رہ گیا سوال جائے مقام کا سو اس کے متعلق لوگوں کی مختلف رائیں ہیں بعض کہتے ہیں کہ جنگ مستقبل کی آگ مشرق اقصیٰ سے بلند ہوگی، بعض اس کا وسط ایشیا سے بھڑکنا ظاہر کرتے ہیں اور بعض کو یقین ہے کہ وہ پھر جرمنی ہی سے رونما ہوگی ــــ لیکن ایک بالغ نظر جماعت ایسی بھی ہے جس کی نگاہ جنوب یوروپ پر جاتی ہے اور جسے یقین ہے کہ جہاں سے یہ شعلہ اول بار بھڑکا تھا وہیں سے دوبارہ بھی بھڑکے گا

گزشتہ جنگ سے بڑی بڑی قوتوں کو فائدہ پہونچا ہو یا نقصان، لیکن یہ واقعہ ہے کہ یوروپ کی بعض چھوٹی چھوٹی قوتیں ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئیں ــــ جزیرہ نمائے بلقان میں ہنگاری، سلوون، کروٹ، مقدونی، البانی اور مانٹی نگرن بہت سی قومیں آباد تھیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو ترقی و آزادی کا مستحق جانتی تھی لیکن جنگ عظیم نے حکومت سرویا کو محو کر کے ان تمام قوموں کو اُن کے فطری حقوق سے محروم کر دیا اور جگوسلیویا کی حکومت قائم کر کے ایک ایسے کوہ آتش فشاں کی بنیاد ڈالدی جس کا بھڑک اٹھنا کسی نہ کسی دن بالکل یقینی ہے

اس وقت جگوسلیویا مالی حالت کے لحاظ سے تقریباً دیوالیہ ہو چکا ہے اور اشتراکی انقلاب کی لہر وہاں نہایت تیزی کے ساتھ دوڑ چکی ہے، کروٹ جماعت جو حکومت ہنگری سے جدا کر دی گئی ہے کھلی ہوئی بغاوت پر آمادہ ہے اور مقدونی لوگ جنھیں حکومت جگوسلیویا حد درجہ بیدردی سے قتل کر رہی ہے، لاکھوں کی تعداد میں بلغاریا بھاگ

گئے ہیں اور ایک عام برہمی ان میں پیدا ہے۔ اسی طرح ۵ لاکھ البانیوں کی جماعت ہر وقت آمادہ ہے کہ ذرا سا موقعہ آئے اور جگوسلیویا کی غلامی سے آزاد ہو۔ الغرض سیاسیات یوروپ کی یہ نوزائیدہ سلطنت جس کو دُول مغرب نے ایک (Buffer State) قرار دے کر ہنگری، سربیا اور مانٹی نگرو وغیرہ کی قوت کو توڑنا چاہا ہے، حد درجہ خطرناک چیز ہے اور کسی نہ کسی دن اس کو تمام دنیا میں تباہی پھیلانا ہے۔

مانٹی نگرو کی داستان بہت زیادہ دردناک ہے، کیونکہ گزشتہ جنگ میں اتحادیوں کا ساتھ دینے کے باوجود اس کی مٹی پلید ہوگئی اور اس کے قومی اجتماع کو بالکل درہم برہم کر دیا گیا —— ہر چند عہد نامۂ لندن کی رُو سے خدا جانے کیا کیا اس کو دئے جانے کا وعدہ کیا گیا تھا، لیکن عملاً سوائے اس کے کچھ نہ ہوا کہ اس کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کر دیا گیا اور اسوقت تقریباً ایک لاکھ اہل مانٹی نگرو جو بالکل مسلح ہیں۔ سربیا سے باہر جلاوطنی کی حالت میں لطیفۂ غیبی کے منتظر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جسوقت ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی تو مانٹی نگرو کسی کا مقروض نہ تھا اور جنگ کے بعد ۲، کرور ۳۰ لاکھ طلائی مارک بطور معاوضہ اس کو دیا جانا طے پا گیا تھا، لیکن غریب کو معاوضہ تو کیا ملتا، جو کچھ اس کے پاس تھا وہ بھی چھین لیا گیا اور جگوسلیویا کی لعنت اس پر اور اضافہ کر دی گئی۔

الغرض اس وقت یوروپ میں سب سے زیادہ بے چینی جس جگہ پائی جاتی ہے وہ جزیرہ نمائے بلقان ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے، یقیناً کسی نہ کسی دن یہاں فساد شروع ہوگا اور اس آگ میں ایک ایک کر کے تمام دُول یوروپ کو پھر کودنا پڑے گا۔ خواہ اس کا نتیجہ دنیا کے لئے قیامت کبریٰ ہی کی صورت میں کیوں نہ ظاہر ہو

یہ سال ارباب ادب و انشاء کے لئے بہت خوں آشام ثابت ہوا۔ مرزا رسوا کی موت، طباطبائی کا انتقال، ناصر نذیر فراق کی رحلت اور پھر اخیر میں میر ناصر علی کا اٹھ جانا، ایسے معمولی واقعات نہیں جنھیں دنیائے علم و ادب فراموش کر سکے

یہ سب، بزم اُردو کے اُس دَور کی یادگار تھے جس کو دنیا بھلا چکی ہے اور جو متقدمین و متاخرین کے درمیان "عقدۃ الوسطیٰ" کی حیثیت رکھتے تھے،

مرزا رسوا پر لکھنؤ کی زباندانی ختم ہوگئی، اور فراق پر دہلی کی، طباطبائی کے ساتھ لکھنؤ کے عہد آخریں کا فضل و کمال ختم ہوگیا اور ناصر علی ادب و انشاء کو اس رنگ کے اپنے ساتھ لے گئے جو ان کی زندگی میں بھی کسی دوسرے کا حصہ نہ ہو سکا، اب مرنے کے بعد کیا ہوگا

میر ناصر علی کی ساری زندگی اُردو زبان کی خدمت میں گزری اور ہر چند وہ خدمت صلائے عام کے اجراء سے آگے نہ بڑھ سکی، لیکن جنھوں نے صلائے عام کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کی جلدوں میں کیسے کیسے

جواہر ادب پوشیدہ ہیں اور وہ کونسی خدمت زبان تھی جو اسی رسالہ کے ذریعہ سے میر ناصر علی نے تقریباً ایک ثلث صدی تک انجام نہیں دی

وہ ان کا سہل ممتنع انداز تحریر، وہ ہلکے ہلکے مزاحیہ فقروں کے ساتھ مابعد الطبیعیات کے خشک و بے آب و رنگ نظریوں کو ہمارے لئے گوارا بنا دینا۔ میر ناصر علی کی وہ خصوصیت تھی جس سے اُن کی تحریر کا کوئی فقرہ خالی نہ ہوتا تھا۔ پنشن لینے سے قبل بھی ان کا محبوب مشغلہ کتابوں کے مطالعہ کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن پنشن کے بعد تو ان کی زندگی کا کوئی لمحہ لکھنے پڑھنے کے علاوہ کسی اور شغل میں بسر ہی نہیں ہوا —— جب دیکھئے وہ ہیں اور خاک آلود کتابوں کا ڈھیر، کتابوں کا ڈھیر ہے اور اُن کی جھکی ہوئی گردن۔ پڑھ نہیں رہے ہیں تو لکھ رہے ہیں، اور لکھتے لکھتے تھک گئے تو پھر پڑھنے میں مصروف ہیں۔ الغرض ان کی زندگی ایسی قابل رشک زندگی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے اور جس پر حقیقتاً ایک انسان کو فخر کرنا چاہئے

مجھے معلوم ہے کہ جناب انصار ناصری (بی۔ اے) مرحوم کے صاحبزادہ ان کے مضامین کا مجموعہ شایع کرنا چاہتے ہیں، خدا کرے یہ خبر صحیح ہو کیونکہ اس طرح مرحوم کے ادبی خدمات سے مُلک کو مستفید ہونے کا موقع حاصل ہو جائے گا —— لیکن میں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ انتخاب مضامین کا کام کسی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ اور تنہا ایک شخص اس اہم ذمہ داری کو اپنے سر نہ لے

نگارستان کے دوسرے حصہ کی کتابت شروع ہو گئی ہے اور غالباً ۳، ۴ ماہ میں شایع ہو جائے گا اس کے صفحات کا اندازہ کم از کم ۵۰۰ صفحات کیا گیا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ہو جانا ممکن ہے

نگارستان حصۂ اول میں سنہ ۱۹۲۴ء تک کے ادبی مضامین و افسانے درج کئے گئے تھے۔ اور اس حصہ میں سنہ ۱۹۲۴ء کے بعد سے لے کر اس وقت تک کے ادبی مقالات اور افسانوں کا انتخاب درج ہوگا۔ جو حضرات اشاعت سے قبل مدد فرمانا چاہیں گے اُن کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہوگا

انقلاب ترکی کی بے مثل تاریخ ایک زندہ قوم کی جد و جہد کی سبق آموز داستان، مصنفہ مسٹر ضمیر احمد ہاشمی ام۔ اے
قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)
منیجر نگار

بنائے گا۔ اس طرح سے اگر ایک پیر کو ایک استاد ہوگا۔ تو دوسرے پیر کو دو استاد ہوں گے۔ اور ہر ایک اُستاد دس مزید آدمیوں کو سبق دے رہا ہوگا

اون۔ نہیں۔ نہیں۔ اس طرح بہت دیر لگے گی۔ ہر روز ایک نیا استاد بننا چاہیئے

زرشن۔ ہاں اسطرح ہم جلدی آزاد ہو جائیں گے

ایلکسے۔ نہیں اگر اب ہمارے پاس پچاس استاد ہو جائیں اور ہر ہفتہ میں وہ دگنے ہوتے رہیں تو چار مہینوں میں ساٹھ ستر لاکھ استاد ہو جائیں گے

زرشن۔ ساٹھ ستر لاکھ!

ایلکسے۔ ہاں کوئی ایک کروڑ کے قریب

زرشن۔ خوب

ایلکسے۔ ہم یقیناً کامیاب ہو جائیں گے

زرشن۔ اور پھر۔ چار ماہ کے بعد کیا ہوگا؟

ایلکسے۔ پھر ہم کچھ دیر اور انتظار کریں گے

زرشن۔ اور پھر؟

ایلکسے۔ پھر ہم تمام لوگوں کو تعلیم دے چکے ہوں گے۔ کہ عصائے حاکم کی حیثیت سونے کی چھڑی سے زیادہ نہیں۔ اور اس میں کوئی چیز بھی سکہ سے بہتر نہیں اور یہ کہ زار اور اس کے عصا کا تقدس ایک خواب تھا۔ جس سے دوسرے خوابوں کی طرح عوام الناس بیدار ہو سکتے ہیں۔ ہم انھیں قریب مستقبل میں بیدار کر دیں گے۔ اس وقت خواب ختم ہو جائے گا۔ اور رُوس بالکل اسی طرح آزاد ہو جائے گا۔ جس طرح صبح کے چہچہانے والے پرندے

اون۔ کیا تمام لوگ بیدار ہو جائیں گے؟

زرشن۔ ہاں۔ یقیناً

ایلکسے۔ نہیں کچھ ایسے بھی ہوں گے۔ جو ہماری آواز نہیں سنیں گے۔ ایسے بے حس لوگ جو رقص و سرود کے وقت بھی سوتے رہتے ہیں۔ ان کے خلاف ہم قتل کی تعلیم دیں گے۔ یہ سب کچھ روس کے لئے کیا جائے گا۔ اور جب یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ روس آزاد ہو جائے گا

زرشن۔ (متحیر ہوکر) روس آزاد ہو جائے گا!

ایلکسے۔ ہاں۔ کیونکہ اسوقت صرف وہی لوگ زندہ رہیں گے۔ جنھیں آزادی مرغوب ہے۔ وہ کسی پر جبر نہیں کریں گے۔ تمام پرانے مظالم نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اُنھیں آزادی کی دیوی پر بھینٹ چڑھا دیا جائے گا

زرشن۔ اور ہم آزاد ہوں گے؟

ایلکسے۔ بالکل پرندوں کی طرح آزاد ہوں گے۔ پھر ہم اس حکومت کے ماتحت ہوں گے جس کی ہیئت ترکیبی کے عناصر معقول ہوں گے۔ اور جس میں زمانۂ جاہلیت کی بیہودگیاں اور نامعقول باتیں نہ ہوں گی۔ ہم .... اون اب تمھاری چال ہے

(وہ بساط پر جھک جاتے ہیں۔ موضع کا سپاہی داخل ہوتا ہے)

سپاہی۔ اخاہ۔ شطرنج کھیلی جا رہی ہے؟

(لیکن اون کھیل میں محو ہو جاتا ہے۔ اور جواب نہیں دیتا)

ملکسے۔ ہاں

سپاہی۔ اس کھیل میں ہشیاری کی ضرورت ہے۔ بڑا مشکل کھیل ہے

(چلا جاتا ہے)

ملکسے۔ ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت نہیں ہوگی

ون۔ شائد کچھ آدمیوں کی ضرورت ہو۔ یہ ہمارے قوانین کے نفاذ میں مدد دیں گے

ملکسے۔ نہیں۔ تمھیں معلوم ہے۔ روسی قوانین کے خلاف ورزی کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ انکے اپنے قوانین نہیں۔ یہ آزاد آدمیوں کے قوانین نہیں۔ بلکہ جابر حاکموں کے قوانین ہیں۔ جنھیں روسی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جب یہ جبریا نہ ہوں گی۔ اور قوانین لوگوں کے ساختہ ہوں گے۔ اس وقت ایسا کونسا روسی ہوگا۔ جو انکی خلاف ورزی کرے گا

ون۔ دیکھو زرشن تمھیں تعلیم دی جارہی ہے۔ ابھی تمھیں نئے روس کا طرز حکومت بتایا جائے گا

زرشن۔ یہ بہت عجیب باتیں ہیں

ملکسے۔ اور پھر کسی آدمی کے دل میں قوانین کے خلاف ورزی کرنے کی خواہش نہیں پیدا ہوگی۔ کیونکہ ہر ایک آدمی امیر ہونے کی وجہ سے اپنے حال پر قانع ہوگا

زرشن۔ تو کیا ہم سب امیر ہوجائیں گے؟

ون۔ ہاں۔ سنو۔ تمھیں ابھی پتہ چل جائے گا

ملکسے۔ ہاں۔ کیونکہ اس وقت روس کے شاہی محلات میں اتنا سونا اور جواہرات ہیں۔ کہ ان سے ایک سال تک روس کی تمام لوگوں کے اخراجات مہیا کیے جاسکتے ہیں۔ خواہ اس عرصہ کے لئے تمام لوگ بیکار ہی بیٹھے رہیں۔ مگر وہ کام کریں گے اور اپنے لئے کسی زمیندار کو پیداوار میں سے حصہ نہ دیا جائے گا کسی قرضہ پر سود نہ ہوگا۔ کیونکہ ہم ساہوکاروں کو مٹا دیں گے۔ روس کی دولت روس کے لوگوں کے لئے ہوگی۔ اس کی کوئی انتہا نہیں۔ ہم نے اسکا اندازہ کیا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہونچے ہیں۔ کہ ہر ایک کسان تمام عمر (شاہی) امیر رہیگا۔ جتنا کہ ایک وکیل۔ یا دری یا ڈاکٹر ہوسکتا ہے۔ علاوہ بریں رعایا پر یا تو بالکل کوئی ٹیکس نہ ہوگا اور یا بالکل معمولی

اون۔ اسلئے کہ اسوقت فوج کا کوئی خرچ نہ ہوگا کیوں ایلکسے یہی بات ہے نا؟

ایلکسے۔ نہیں اسوقت تک فوج رکھنی لازمی ہے جب تک کہ دوسری اقوام ہم سے یہ سبق نہ لے لیں کہ جنگ کی خواہش کرنا حماقت کے مترادف ہے

زرشن۔ اور اگر کوئی آدمی آزاد روس کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو پھر کیا ہوگا؟

ایلکسے۔ اگر کوئی کرے؟ ہاں اگر کوئی کرے۔ تو ہم اسے اصلاحی مکتب میں بھیجدیں گے۔ ان شاہی استعمار پرستوں کی طرح ہم مجرموں کو سائبیریا کے زندان میں نہیں ڈال دیں گے۔ بلکہ اصلاحی مکاتب میں ہم انھیں اس وقت تک تعلیم دیں گے جب تک کہ انھیں اپنی غلطی کا احساس نہ ہوجائے۔ پھر ہم انھیں آزاد کردیں گے۔ اور وہ

دوسرے شہریوں کی نسبت بہتر شہری ہوں گے
کیونکہ ہم انھیں معاشرت کے تمام آداب میں
ماہر کر کے بھیجیں گے

زرشن۔ تو وہ بہت اچھے دن ہوں گے!

ایلکسے۔ یہ تم اس لئے کہ رہے ہو۔ کہ ہم امیر ہو جائیں گے؟

زرشن۔ (حیرت سے) نہیں تو۔ میں یہ اس لئے کہ رہا تھا۔ کہ
روس آزاد ہو جائے گا

اون۔ آؤ۔ ہم اس دن کی یاد میں شراب پئیں۔ چچی میریا

میریا۔ اون میں آئی

اون۔ چچی کیا تم ہمیں کچھ شراب دوگی؟

میریا۔ شراب! اس وقت؟

اون۔ ہم ایک عظیم الشان دن کے تصور میں شراب
پینا چاہتے ہیں

میریا۔ اوہ توبہ۔ تمھاری سیاسیات دم نہیں لینے
دیتیں

اون۔ ہماری سیاسیات روس کو آزاد کرا دیں گی

میریا۔ میرا دل تو انھیں تکرتیزی سے حرکت کرنے لگتا ہو

(میریا اندر چلی جاتی ہے)

زرشن۔ روس آزاد ہو جائے گا

اون۔ ہاں آج ہم اس دن کی یاد میں خوب پئیں گے

زرشن۔ میں نہیں پیوں گا

اون۔ کیوں؟

زرشن۔ میں ان عظیم الشان ایام کے متعلق سوچنا چاہتا
ہوں۔ اس حکومت کی مقبولیت اور آزادی کی
شان کے خیال سے میرے دل میں اتنا جوش پیدا
ہو رہا ہے۔ کہ مجھے اب شراب کی ضرورت نہ
رہی

ایلکسے۔ یہ کیا بیہودگی ہے؟ ہمیں اس دن کی یاد
شراب پینی چاہیئے۔ اسطرح وہ دن نزدیک تر معلوم

زرشن۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں

اون۔ لو وہ شراب لے آئی۔ ہم سب پئیں گے۔
اس طرح بہتر کام کر سکیں گے

زرشن۔ نہیں

اون۔ صرف ایک جام

زرشن۔ اچھا صرف ایک جام۔ اور اس سے زیادہ نہ

ایلکسے۔ ہاں ہمیں صرف ایک ہی جام کی ضرورت
ہمیں اپنے ذہن کو بالکل صاف رکھنا چاہئے!
اس کی مدد سے روس آزاد ہوگا

میریا۔ (اینا سے) یہ عجیب باتیں کرتے ہیں

اینا۔ ہاں خدا کرے کوئی آفت نہ آجائے

میریا۔ آفت! میرے خیال میں ایسی تو کوئی بات

(میریا اور اینا دونوں چلی جاتی ہیں)

زرشن۔ بڑی اچھی شراب ہے

اون۔ ایک اور جام لے لو۔

زرشن۔ ایک اور دے دو۔ مگر صرف ایک اور پھر
چلا جاؤں گا۔ ورنہ بہت پی جاؤں گا۔ میں
روس اور اس کے متعلق سوچنا چاہتا ہوں

(اون شراب انڈیلتا ہے)

بس بس بس بس۔ تم نے تو بہت زیا
ڈال دی ہے

اون - تم سب نہ پینا
زرشن - میں وہاں بیٹھ کر سوچتا ہوں - اگر میں تمھارے
پاس بیٹھا رہا - تو اس قابل ہی نہیں رہوں گا
(وہ جام اٹھا کر ایک گرے ہوئے درخت کی جڑوں پر جا بیٹھتا ہے) آہ عہد زریں!
(شراب کا ایک گھونٹ لیتا ہے - روشنی مدھم ہو جاتی ہے وہ ایک اور گھونٹ لیتا ہے - ایک لطیف اور سفید جالی کا پردہ اس کے سامنے آجاتا ہے - وہ پھر ایک گھونٹ لیتا ہے - اور ایک اور پردہ گرتا ہے - ایک دفعہ پھر اسی عمل کا اعادہ ہوتا ہے - حتیٰ کہ اس کے اور دوسرے آدمیوں کے درمیان ایک دھندلی سی سفیدی آجاتی ہے - پھر ایک شوخ سی عورت نہایت بھڑکیلے اور چست لباس میں جھلا تک مار کر اس کے سامنے آجاتی ہے)
زرشن - تم کون ہو؟
نو وارد - خمر
زرشن - خمر کیا؟
خمر - ایک نہایت ہی قدیم تخلیق - دیکھو!
(وہ اپنا ہاتھ ہلاتی ہے - تو ایک پردہ کے سوا باقی تمام پردے اٹھ جاتے ہیں - اور روشنی بہت تیز ہو جاتی ہے - ایلکسے اسوقت تک جا چکا ہوتا ہے - اون اسی میز پر بیٹھا ہوا ہے - لیکن اسکا سر اور ہاتھ میز پر پھیلے ہوئے ہیں - ایک چھوٹی سی چبائی ہوئی شاخ اس کے ایک ہاتھ میں ہے - میریا اور ایناز مین پر لیٹی ہوئی شاخوں کی چھال اور رگ اس چبا رہی ہیں - سپاہی مایوسی کے انداز میں ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہے - منظر کی وحشت سے نمایاں ہے - کہ تمام افراد بھوک سے بیتاب ہیں

مکان کی دیواروں کی مٹی جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی ہے)
زرشن - آہ! قحط اور فاقہ!
خمر - (مسرت سے) ہاں
زرشن - کیا! روس میں؟
خمر - ہاں یہاں روس میں
زرشن - اوہ!
(خمر زرشن کے پہلو والے درخت سے ٹیک لگا کر دوپٹہ کے آنچل سے کھیلنے لگتی ہے - اور فاقہ زدہ لوگوں کی طرف دیکھتی ہے)
نہیں - مگر یہ نہیں ہو سکتا - روس کے لوگ فاقہ سے نہیں مر سکتے - میں انھیں خوراک خریدنے کے لئے دولت دوں گا - میرے پاس سو روبل کا نوٹ ہے - اور میں اور بھی لا سکتا ہوں - روس کے لوگ فاقے نہیں کریں گے - یہ لو - اچھے لوگو
(وہ ہاتھ میں سو روبل کا نوٹ پھیلا کر ان کی طرف بڑھتا ہے)
یہ لو - (مگر پردہ کے سامنے آکر رک جاتا ہے - اس کے دونوں ہاتھ ٹٹولتے ہیں مگر وہ پردہ کو چھو تی نہیں - اور آگے نہیں بڑھ سکتی - دوسرے آدمی اُسے نہیں دیکھ رہے ہیں)
خمر - یہ نہیں ہو سکتا - وہ وقت بہت دور ہے
زرشن - بہت دور؟
خمر - ہاں - یہ ۱۹۲۰ء کے روس میں ہوگا
زرشن - آہ مستقبل میں! مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟
خمر - تم جو کچھ کر سکتے تھے - وہ کر چکے ہو
زرشن - میں؟
خمر - دیکھو!

زرشن - (بچوں کی طرح نوٹ کو آگے پھیلائے ہوئے حسرت بھرے لہجہ میں بولتا ہے) میں یہ روپیہ انھیں دینا چاہتا ہوں

خمر - دیکھو!

میریا - (اون کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے) اون - اون - اون - اٹھو

اون - (سر کو اٹھانے کے بغیر بھراتے ہوئے) کیوں؟

میریا - ہمیں خوراک تلاش کرنی چاہئے

اون - (حقارت آمیز لہجہ میں) خوراک؟ کہاں سے؟

میریا - سنو اور میں تمھیں بتاتی ہوں - اون سنو

اون - مجھے سونے دو

میریا - اون سنو - صرف سن لو - بٹولسکا میں خوراک ہے

اون - بٹولسکا میں خوراک؟

میریا - آہستہ بولو - اون سنو

اون - اچھا

میریا - (رازداری کے انداز میں) کل سکوبلف نے مچھلی کا ڈبہ کھولا تھا - مجھے معلوم ہے - وہ انگلستان سے آیا تھا - اس نے دو تین کھائی تھیں - مگر ان میں سے بو آتی تھی - اس لئے انھیں اس نے رکھ چھوڑا تھا - اب بھی تو مچھلیاں پڑی ہوئی ہونگی جاؤ انھیں خرید لاؤ

اون - میرے پاس دام نہیں صرف یہ ہیں (چار نوٹ دکھاتا ہے)

میریا - کتنے ہیں

اون - چار ہزار روبل - مگر ان سے تمام مچھلیاں نہیں مل سکتیں

میریا - اُن میں سے بو آرہی تھی - شائد دیدے

(زرشن نوٹ کو گرا دیتا ہے - اور مایوس ہو کر منہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیتا ہے - منظر پر تاریکی بڑھتی جاتی ہے - اور سوائے زرشن کے خاکے کے اور کچھ نظر نہیں آتا - زرشن رو رہا ہے خمر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئی ہے - کچھ عرصہ کے بعد زرشن کے گریہ سے زیادہ بلند اور مہیب آواز جماہی لینے کی آتی ہے - یہ خمر بیدار ہو رہی ہے - اب اس کا تمام لباس زرد ہو گیا ہے - وہ انگڑائیاں اور جمائیاں لیتے آہستہ آہستہ اٹھتی ہے - وہ اپنے آپ کو بمشکل سنبھال رہی ہے - جیسے بہت تھکی ہوئی ہو - اور درختوں سے ٹیک لگائی ہوئی باہر نکل جاتی ہے - پہلا منظر پھر سامنے آجاتا ہے - ۱۹۱۲ء کے روس میں ایلکسے اور اون میز کے گرد بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں - میریا اور ابنا کے درمیان خوش گپیاں ہو رہی ہیں)

زرشن - (روشنی کے تیز ہونے پر آنسو خشک کر رہا ہے) آہ! میں انھیں بچاؤں گا (اٹھ کر ایلکسے اور اون کے پاس چلا جاتا ہے) دوستو - دوستو - فیصلہ کرنے سے پیشتر میری ایک عرض سن لو

ایلکسے - کہو

زرشن - اگر اس انقلاب نے ہماری تجارت اور مالیات کو خراب کر دیا - تو پھر؟ ہو سکتا ہے کہ فوری انقلاب سے انھیں نقصان پہنچ جائے

ایلکسے - میں نے تمھیں بتایا ہے - کہ میں لوگوں کو امیر بنا دوں گا

زرشن - ہاں ایلکسے یہ تو صحیح ہے - لیکن اس سے اگر ہمارے اعتبار میں فرق آگیا - تو پھر کیا ہوگا - اگر

روبل اس قابل ہی نہ رہے - کہ ان سے خوراک خریدی جاسکے - تو پھر؟

میریا - تو ابھی تک سیاسیات پر ہی گفتگو ہو رہی ہے

اینا - تمھیں کیا - مردوں کا جس مضمون پر جی چاہے وہ گفتگو کرسکتے ہیں

(میریا ہنس دیتی ہے)

ایلکسے - میں ابھی تم پر سب کچھ واضح کردوں گا

اون - ایلکسے نے اس کا خوب مطالعہ کیا ہے

زرشن - ہاں - اون - مجھے معلوم ہے - لیکن ابھی .....

ایلکسے - میں ابھی اس کی توضیح کرتا ہوں - اگر ناخوشگوار اثر کی وجہ سے روبل اپنی قدر کھو دے - جس کا اندیشہ نہیں - تو اس صورت میں مرکزی انقلابی بنک انتظام کرے گا کہ ....

پردہ

(ماخوذ)

نسیم رضوانی

نگارستان حصۂ دوم

یعنی حضرت نیاز فتحپوری کے ۳۰ بہترین افسانوں کا مجموعہ جو اس سے قبل کبھی کتابی صورت میں شایع نہیں ہوئے زیر کتابت ہے - حجم ۵۰۰ صفحات سے زاید ہوگا - اور غالباً ستمبر ۳۳ء تک شایع ہوسکے گا ---- اس کی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ سے کم نہ ہوگی لیکن جو حضرات دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیج کر ابھی سے اپنا نام درج رجسٹر کرالیں گے - اُن کو اسی دو روپیہ میں یہ نادر مجموعہ مل جائے گا

غالباً یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت صحیح معنی میں انشاء عالیہ کا لکھنے والا اگر کوئی ہے تو وہ صرف حضرت نیاز ہیں اور اس لئے اس مجموعہ میں ایسے ایسے جواہر ادب آپ کو ملیں گے، جو کسی دوسری جگہ میسر آہی نہیں سکتے

منیجر نگار لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرۃ

بقائے روح و معاد کے متعلق مدیر نگار سے اختلاف

(مسٹر عبد المجید حیرت بی۔ اے۔ شملہ)

محترمی - السلام علیکم

حوالہ نگار (جون ۱۹۳۳ء) - باب الاستفسار - حاشیہ از صاحب نگار

(۱) آپ یہ باور نہیں کرتے کہ خدا (فعال لما یرید) "عالم کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک ذرّے کی نگرانی کرتا ہے"

(۲) آپ بقائے روح، حیات بعد الموت یا معاد کے قائل نہیں

بہر حال آپ اس کے تو قائل ہیں کہ اسلام دنیا کا آخری اور فطری مذہب ہے۔ پھر اگر یہ وہی اسلام ہے جسے قرآن مجید پیش کرتا ہے تو کیا آپ قرآن مجید سے نمبر (۱) و (۲) پر کوئی دلیل پیش کر سکیں گے

بقائے روح کے باب میں آپ غالباً مغرب کے تازہ انکشافات سے بے خبر نہ ہوں گے

میں آخرت کا قائل ہوں، اس لئے کہ

(۱) لفظ دنیا آخرت پر دلالت کرتا ہے

(۲) آخرت دنیا کے لئے انتہائے بے نفسی کے ساتھ نیکی کئے جانے کی تعلیم ہے۔ پھر جب یہ نہیں کہا جا سکتا، اور یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ ہر طاعت کا ثواب اور ہر گناہ کا عذاب —— یا آپ کے رنگ میں ہر طاعت کا واقعی عذاب اور ہر گناہ کا واقعی ثواب —— انسان کو اسی دنیا میں مل جاتا ہے، تو پھر کیا وجہ کہ اس شک کو یقین سے بدلنے کے لئے ایک یوم آخرت تسلیم نہ کر لیا جائے

(۳) بدرجۂ آخر آخرت پر جناب علی کرم اللہ وجہہ کے اس منطقی استدلال کو دیکھئے جسے سن کر ایک یہودی حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ یعنی اگر یہ دنیا ہی دنیا ہے اور بس تو نیک و بدکی جزا و سزا میں مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر ہیں لیکن اگر آخرت ایک امر واقعی ہے تو پھر نقصان میں کون رہتا ہے اور نفع میں کون

چنانچہ میں اگر آخرت کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہوں تو اس میں کیا "حرج" ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس عقیدے کے رکھنے والے پر بیچے اور چاقو کی دوراز کارمثال کیوں کر چسپاں ہو سکتی ہے۔

(نگار) ۱۔ میرا یہ کہنا کہ "خدا ایک ایک چیز، ایک ایک ذرہ کی نگرانی نہیں کرتا" صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ انفرادی طور پر (Individually) کائنات کی ہر ہر چیز کے لئے اپنی قوت کو منقسم نہیں کرتا۔ بلکہ مجموعی طور پر تمام نظام عالم کے لئے چند اصول وضوابط مقرر کردئے ہیں اور انھیں کے ماتحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے

آپ کپڑا بننے کے کسی بڑے کارخانہ میں ضرور کبھی نہ کبھی تشریف لے گئے ہوں گے اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں ہزاروں "کرگھے" خود بخود چل رہے ہیں، کپڑا بنا جا رہا ہے۔ رولر اپنے آپ کپڑے کو لپیٹ رہے ہیں، درانحالیکہ وہاں کوئی انسانی ہاتھ موجود نہیں —— پھر یہ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ کارخانہ کا انجنیر بجلی یا بھاپ کی مدد سے مشین کو حرکت دے کر عمومی طور پر ہر ہر کام کی نگرانی کر رہا ہے، لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مشین کے ہر ہر پرزے کی جنبش، کرگھے کے ہر ہر تار کا اوپر نیچے ہونا، ایک ایک بنولے کا روئی سے علیحدہ ہونا، ایک ایک پونی کا طیار ہونا، ان سب پر انجنیر کی نگاہ ہے

پھر چونکہ انجنیر کے ہاتھ میں بھاپ یا بجلی کی وہ قوت موجود ہے۔ جس سے تمام کام انجام پا رہے ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام کارخانہ کا نگراں ہے، لیکن یہ کہنا کہ کارخانہ کے ہزاروں لاکھوں چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھی علیحدہ علیحدہ اس کی نگاہ ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

۲۔ بقاء روح اور معاد کے متعلق آپ کا مجھ سے مطالبہ ہے کہ اگر میں اسلام کو دنیا کا آخری فطری مذہب تسلیم کرتا ہوں تو مجھے قرآن مجید سے ثابت کرنا چاہیئے کہ بقاء روح اور معاد دونوں خیال صحیح نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے میرا کا بھی ثبوت قرآن پاک سے طلب کیا ہے

میرے عزیز دوست، آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں تو ان باتوں کا منکر ہوں یعنی میں آپ کے اس دعویٰ کو نہیں مانتا کہ خدا ہر ہر ذرہ پر انفرادی طور سے نگرانی کرتا ہے اور اسے بھی تسلیم نہیں کرتا کہ روح باقی رہتی ہے اور حیات بعد الممات کوئی چیز ہے —— اس لئے اصولاً پہلے آپ کو اس ایجاب پر دلیل پیش کرنا چاہیئے نہ کہ مجھے —— آپ جس سے پوچھیں گے وہ بتا دے گا کہ ثبوت پیش کرنا اس شخص کا کام ہے جو کسی بات کا اقرار کرتا ہو یا کرانا چاہتا ہو، منکر یا تو آپ کی دلیل سے قائل ہو کر آپ کا ہمنوا ہو جائے گا یا آپ کے دلائل کی کمزوری کو ثابت کرکے دوسرا ثبوت آپ سے چاہے گا —— اس لئے براہ کرم پہلے آپ ہی کلام مجید سے یہ ثابت کیجئے کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں وہ درست ہے، پھر میں بتاؤں گا کہ آپ کے دلائل ان وجوہ کی بنا پر ناقابل تسلیم ہیں

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ روح کے باب میں مغرب کے تازہ انکشافات سے غالباً میں بے خبر نہ ہوں گا ——— یقیناً میں بے خبر نہیں ہوں اور نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مکر و فریب کا اتنا بڑا جال شاید ہی دنیا میں کبھی پھیلایا گیا ہو ——— اگر سائنٹفک امریکن کی شائع کی ہوئی وہ رپورٹ آپ کے سامنے ہے جو ایک کمیشن نے تمام بلاد یورپ کی سیاحت کرنے کے بعد مرتب کی تھی تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت تک جتنے روحانئیں یورپ میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ۹۰ فیصدی مکار و شعبدہ باز ہیں اور باقی دس فیصدی وہ ہیں جو اس فریب میں مبتلا ہونے کے بعد قصور فہم کی وجہ سے، فریب کو حقیقت باور کرنے لگے ہیں

۳ - آپ نے آخرت کے وجوب پر تین دلیلیں پیش کی ہیں اور معاف فرمائیے اگر میں یہ کہوں کہ ان میں سے ایک دلیل بھی ایسی نہیں جو فریق ثانی کو قائل کر سکے

پہلی دلیل یہ ہے کہ لفظ دنیا، آخرت پر دلالت کرتا ہے اس لئے آخرت کا ماننا ضروری ہے ——— لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ لفظ دنیا کا وہ مفہوم جو آخرت پر دلالت کرتا ہے کس کا متعین کیا ہوا ہے۔ کیا آپ ہی اس کے واضع اور آپ ہی اس کے مفسر نہیں ——— میرے سامنے اگر لاکھ مرتبہ لفظ دنیا بولا جائے تو کبھی ایک بار بھی اس کو سنکر آخرت کا یقین نہیں ہوتا۔ آپ دنیا کو آخرت کا نقیض بتاتے ہیں۔ میں اسے انعدام کا نقیض سمجھتا ہوں، یعنی جس طرح لفظ دنیا بول کر آپ کا خیال اس کے نقیض (آخرت) کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ یوں مُردے اٹھیں گے، اس طرح ان کا حساب و کتاب ہوگا، یوں عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے وغیرہ وغیرہ، اسی طرح لفظ دنیا بول کر میرا خیال اس کے نقیض انعدام محض کی طرف جاتا ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو حالت عدم میں چلا جاتا ہے گویا کہ وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا

آپ کی دوسری دلیل اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "آخرت انتہائی بے نفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم ہے" درانحالیکہ آخرت کا جو مفہوم پیش کیا جاتا ہے اس میں سوائے غرض و طمع کے کچھ اور ہی نہیں۔ کیا اچھے کاموں کے عوض میں سونے چاندی کے محلوں، دودھ شہد کی نہروں، حسین و جمیل دوشیزہ حوروں اور بے ریش و بروت لڑکوں کے دیے جانے کا وعدہ کرنا بے نفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم ہو سکتی ہے اور کیا بُرے کاموں کی پاداش میں شعلہ زار جہنم کا منظر پیش کرنا ایک شخص کو بے نفسی کے ساتھ نیکی کی طرف مائل کر سکتا ہے۔ جبکہ بے نفسی کا تعلق نہ لالچ سے ہونا چاہیے نہ خوف سے، ہم اگر کسی کے ساتھ کچھ احسان کرتے ہیں اس ڈر سے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہم کو قید و بند میں ڈال دیا جائے گا، یا اس لالچ سے کہ اس احسان کا معاوضہ زیادہ بہتر صورت میں ملے گا تو کیا دنیا میں کوئی شخص ہمارے اس فعل کو بے نفسی پر محمول کر سکتا ہے؟ اسی نکتہ کو غالب نے اس طرح بیان کیا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اگر آپ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ جنت و دوزخ کا بیان صرف تشبیہی بیان ہے اور حقیقت کچھ اور ہے، تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس بیان میں ترغیب و تخویف ضرور پائی جاتی ہے، جو بے نفسی کے بالکل منافی ہے میں کہتا ہوں کہ مطلق جزا و سزا کا خیال ہی بے نفسی کو محو کر دینے والا ہے۔ اور جب تک عذاب و ثواب کی تمام کارگاہ کو باطل ٹھہرا کر یہ اصول نہ قرار دیا جائے کہ "نیکی ایک فرض انسانی ہے جو بلا خیال مزد یا بغیر اندیشہ تعزیر ظاہر ہونی چاہیے"۔ بے نفسی کا خیال کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا

اسی ضمن میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب ہر طاعت کا ثواب اور ہر گناہ کا عذاب اس دنیا میں نہیں ملتا تو کیا وجہ ہے کہ یوم آخرت نہ تسلیم کیا جائے۔

اس میں بھی آپ نے خود ہی ایک بات فرض کر لی ہے اور خود ہی اس کو دلیل بنا کر پیش کر دیا۔۔۔۔ میں تو کہتا ہوں کہ کوئی طاعت ایسی نہیں جس کا ثواب یہاں نہ مل جاتا ہو اور کوئی گناہ ایسا نہیں جس کی سزا انسان کو یہاں نہ بھگتنا پڑتی ہو، بشرطیکہ آپ طاعت کا مفہوم "اچھا کام" قرار دیں اور گناہ کا مفہوم "برا کام"۔۔۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ فرض شناسی و ادائے فرض کے بعد ضمیر انسانی کو جو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے اس سے زیادہ مسرت کسی اور چیز میں ہو سکتی ہے اور حق تلفی و ناحق کوشی کی بدولت جو اضطراب نفس انسانی میں پیدا ہوتا ہے اس سے زیادہ عذاب کوئی اور ممکن ہے۔۔۔۔ لیکن اگر کسی کا ضمیر بالکل محو ہو چکا ہے اور حق و باطل کی تمیز کسی کو باقی نہیں رہی، تو تاریخ عالم اٹھا کر دیکھئے کہ اسی دنیا میں ان کا کیا انجام ہوا، افراد کو چھوڑیئے میں تو قومی و اجتماعی زندگی میں بھی اسی اصول کو کارفرما دیکھتا ہوں اور قرآن پاک کی اس آیت پر پوری طرح ایمان لاتا ہوں کہ

هل يهلك الا القوم الفاسقون

پھر بتائیے کہ کیا اس آیت میں جس ہلاکت قومی کا ذکر کیا گیا ہے وہ کسی اور دنیا سے متعلق ہے، اور کیا یہ عذاب آپ کی مفروضہ اخروی زندگی سے تعلق رکھتا ہے

ممکن ہے ابھی آپ کی تسکین نہ ہوئی ہو، لیکن اگر میں خود کلام مجید سے یہ ثابت کر دوں کہ عذاب و ثواب کا تعلق اسی دنیا سے ہے تو پھر آپ کیا کہیں گے۔۔۔۔ اچھا تکلیف تو ہوگی کلام مجید اٹھائیے اور سورۂ ہود کی آیات ۱۰۶ و ۱۰۷ و ۱۰۸ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

فاما الذين شقوا ففي النار لهم فيها زفير و شهيق o خلدين فيها ما دامت السموات والارض واما الذين سعدوا ففي الجنة خلدين فيها ما دامت السموات والارض	جن لوگوں نے شقاوت کی وہ آگ میں پڑے کراہ رہے ہوں گے اور اسی حالت میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین کا وجود ہے اور جن لوگوں نے اچھے کام کئے وہ جنت میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین کا وجود ہے

کیا عذاب و ثواب کو اس دنیا سے متعلق سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ روشن و واضح الفاظ کی ضرورت ہے۔ کیا مادامت السموات والارض کے الفاظ اس بات کا ثبوت نہیں کہ جنت و دوزخ اس دنیا سے علاوہ کسی اور عالم سے متعلق نہیں ــــ کیونکہ اگر آپ عذاب و ثواب کو عالم آخرت سے متعلق کریں گے تو پھر مادامت السموات والارض کہنا کوئی معنی نہ رکھے گا۔ کیونکہ عالم آخرت تو آپ کے نزدیک قیامت یا ماورا عالم دنیا سے واسطہ رکھتا ہے جب یہ زمین و آسمان کچھ نہ ہوں گے

۳۔ آپ کی تیسری دلیل جس میں آپ نے جناب امیر اور یہودی کی گفتگو کا حوالہ دیا ہے اس کے متعلق سوائے اس کے کیا عرض کروں کہ

بر تمنا ہائے عرفی خندہ می آید مرا

اسی قسم کا ایک واقعہ جناب امام جعفر صادق کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کسی ملحد نے آپ سے سوال کیا کہ مرنے کے بعد روح کہاں چلی جاتی ہے، آپ نے جواب دیا کہ چراغ گل ہونے کے بعد اس کی لو کہاں چلی جاتی ہے ــــ راوی کا بیان ہے کہ جواب سننے کے بعد وہ ایمان بھی لے آیا

درانحالیکہ نہ جناب امیر کے جواب پر یہودی کو آخرت پر ایمان لانے کی ضرورت تھی اور نہ ملحد کو جناب امام جعفر صادق کے استدلال پر مسلمان ہونے کی

میرے نزدیک یہ دونوں روایتیں نادرست ہیں اور میں کبھی باور نہیں کر سکتا کہ جناب امیر یا جناب امام جعفر صادق نے ایسی بچوں کی سی باتیں کی ہوں گی، کیونکہ اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم مان بھی لیں کہ جناب امیر کا جواب واقعی مسکت تھا اور یہودی آخرت پر ایمان بھی لے آیا تو کیا اس کا آخرت کے وجود کو تسلیم کرنا حقیقتاً اطمینان قلب کے ساتھ تھا، یعنی اس دلیل سے کوئی اذعانی و ایقانی کیفیت اس کے دل میں پیدا ہو سکتی تھی۔ ہرگز نہیں، اس نے اگر مانا بھی تو صرف اس لئے کہ ایسا ماننے میں کوئی حرج نہیں اور مصلحت اسی میں ہے۔ پھر مصلحت و یقین میں جتنا فرق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں

فرض کیجئے میں آپ کے پاس آؤں اور کہوں کہ مجھ میں اتنی قوت موجود ہے کہ چاہوں تو آپ کے کپڑوں میں آگ لگا دوں اور واقعی میں آگ لگا دوں گا اگر آپ نے میری اس قوت کا اعتراف نہ کیا، آپ کو اس کے ماننے میں تامل ہوتا ہے لیکن آپ کا ایک دوست آتا ہے اور کہتا ہے کہ "مان بھی لو تمہارا کیا حرج ہے۔ اگر اس میں ایسی قوت نہیں ہے تو مان لینے میں تمہارا کیا نقصان ہے، لیکن اگر واقعی وہ ایسا کر سکتا ہے تو پھر نقصان تمہارا ہی ہے" آپ اس دلیل کو سنکر میری اس قوت کا اعتراف کر لیتے ہیں، لیکن خدا کے لئے بتائیے کہ کیا آپ کا یہ اعتراف تصدیق قلب کے ساتھ ہوگا، ہرگز نہیں۔ پھر اگر جناب امیر کی اس دلیل پر وہ یہودی ایمان لے بھی آیا تو کیا واقعی وہ مسلمان

ہوگیا ہوگا - جبکہ اسلام و ایمان کے لئے تصدیق بالقلب ضروری ہے

یہی حال جناب امام جعفر صادق کی دلیل کا ہے ـــــ ایک ملحد جو روح کے بقا کا منکر ہے۔ آپ سے سوال کرتا ہے کہ مرنے کے بعد روح کہاں جاتی ہے، آپ چراغ کی لَو کا حوالہ دیکر خود اسی سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ وہ کہاں چلی جاتی ہے آپ ہی انصاف فرمائیے کہ اس میں بقاء روح کے لئے کونسی دلیل پیش کی گئی، بلکہ اس سے تو اور اسی ملحد کے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ جس طرح چراغ گُل ہونے کے بعد اُس کی لَو فنا ہو جاتی ہے اسی طرح مرنے کے بعد روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ اکابر اسلام سے اس قسم کی روایتوں کو نسبت دینا حقیقتاً ان کی توہین کرنا ہے، اور یہ نتیجہ ہے صرف اُن ادنیٰ درجہ کی ذہنیتوں کا جو اپنی دماغی اُپج کو اہمیت دینے کے لئے خواہ مخواہ بڑے بڑے لوگوں سے اس کو منسوب کر دیتے ہیں۔ جناب امیر اور جناب امام جعفر صادق کا کیا ذکر ہے، احادیث اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ خود رسول اللہ کی ذات گرامی سے ایسے ایسے افعال واقوال منسوب کئے جاتے ہیں کہ آج اُن کو دیکھ کر شرم آتی ہے اور عقل حیران رہ جاتی ہے کہ کیا ایک رسول کے اخلاق واقعی ایسے ہو سکتے ہیں۔ اور کیا ایک ملہم من اللہ ہستی سے ایسی باتوں کا ظاہر ہونا کسی طرح ممکن ہو سکتا ہے؟

اب رہا یہ سوال کہ میں آخرت کو کیوں نہیں مانتا، یعنی قیامت اور جزا و سزا کے نظریہ کو کیوں قابل قبول نہیں جانتا۔ اس کے متعلق آپ مجھ سے کوئی استفسار نہ کیجئے بلکہ خود اُن تمام روایات کا تفصیلی طور پر مطالعہ کیجئے جو اس باب میں بیان کی جاتی ہیں کہ مرنے کے بعد سے لے کر دوزخ یا جنت میں پہونچنے تک کیا کیا مراحل ومنازل سامنے آتے ہیں اور پھر خود ہی اپنی عقل سے کام لے کر فیصلہ کیجئے کہ وہ باور کرنے کے لائق ہیں یا نہیں

ایک خاتون کا گمنام خط

۱۲ر جون کی ڈاک سے مجھے ایک لفافہ ملا جس پر (Solan) کی مُہر تھی اور ایک مضمون کے علاوہ حسب ذیل تحریر بھی اندر موجود تھی۔

مکرمی ـــــ! آداب نیاز

یہ مضمون جو میرے جذبات کا مکمل آئینہ دار ہے، آپ کی خدمت میں ارسال ہے، نگار کے ایک دیرینہ خریدار ہونے کی حیثیت سے مجھے اس کا علم ہے کہ نگار میں عورتوں کے مضامین شائع نہیں ہوتے، لیکن پھر بھی اس جسارت کی مرتکب ہوتی ہوں، اشاعت وعدم اشاعت کا آپ کو اختیار ہے، اگر یہ اس لائق ہو کہ شرف قبولیت بخشا جائے تو نگار کے صفحات میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں

میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتی، اور نہ ہی یہ پسند کرتی ہوں کہ کسی مفروض نام سے دنیا کے سامنے نمودار ہوں، لہٰذا اس مضمون کے کاتب کو گمنام ہی رہنے دیجئے، خیر طلب ـــــ!

مضمون کا عنوان تو "اظہار تشکر" ہے لیکن ہے وہ حقیقتاً صرف "اظہار محبت" ایک ایسی ہستی کے حضور میں جس کا حصول مضمون نگار کو محال معلوم ہوتا ہے ــــ یہ مضمون بالکل اسی قسم کا ہے جس میں بہت سی لمبی لمبی لکیریں، بات بات میں متعدد سوالیہ نشان اور ہر ہر جملہ کے بعد درجنوں علامات حیرت و استعجاب نظر آتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ لکھا گیا ہے خاص تاثر کے ساتھ

یقیناً میں یہ مضمون شایع کرنے کے لئے تیار نہیں اور میں اس کو واپس کر دیتا اگر خاتون محترم نے اپنا پتہ لکھا ہوتا لیکن چونکہ انھوں نے میرے لئے عزت تخاطب کی کوئی صورت پیدا ہونے نہیں دی ہے اور میں جانتا ہوں کہ کسی طرح اُن کی تحریر کا جواب بھی اُن تک پہونچ جائے اس لئے مجبوراً نگار ہی کی وساطت سے اُن کو مطلع کرتا ہوں کہ نگار میں یقیناً عورتوں کے مضامین اس وقت تک شایع نہیں ہوئے، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدانخواستہ مجھے یا نگار کو عورتوں سے کوئی ضد ہے بلکہ صرف اس بناء پر کہ نگار کے معیار کے مضامین لکھنے والے مردوں میں بھی بہت کم ہیں چہ جائیکہ عورتیں جنکا ادبی ذوق ہنوز بہت زیادہ پست حالت میں ہے

ہمارے یہاں کی عورتیں لکھ پڑھ کر دنیائے ادب میں آتی بھی ہیں تو صرف دو طرح سے، یعنی یا تو وہ غزلسرایانہ انداز سے تشریف لاتی ہیں یا "والہانہ محبت" کی بیباکیوں کے ساتھ ــــ اور میں ان دونوں کو مردوں کے لئے بھی مضرت رساں سمجھتا ہوں، چہ جائیکہ عورتیں جو سوسائٹی میں اساس اخلاق کی حیثیت رکھتی ہیں

بہرحال میں عورتوں کے مضامین نہایت مسرت سے شایع کرنے کے لئے طیار ہوں بشرطیکہ ان میں کچھ کام کی باتیں ہوں - ورنہ محض مصنوعی آہ و فریاد کی گرم بازاری اور تھکے ہوئے جذبات محبت کا تھکا ہوا اظہار اب تو دل میں بھی کوئی جنبش پیدا نہیں کرتا عقل و دماغ کا کیا ذکر ہے

افسوس ہے کہ مجھے یہ مضمون تلف کرنا پڑا، درانحالیکہ اس کے اوراق کے ٹکڑے اب بھی اپنی عطریت سے "دعوت نزلہ" دے رہے ہیں ــــ

نیاز

صرف اخیر جولائی ۱۹۳۳ء تک

سات روپیہ کی چار کتابیں تین روپیہ میں مع محصول

تذکرۂ خندۂ گل - فلسفۂ مذہب - فراست التحریر مکمل - حضرت نیاز کے تین معرکۃ الآرا مضامین

مینجر نگار

مطبوعات موصولہ

مغل اور اُردو یہ کتاب صرف ایک باب ہے، اُس کتاب کا جسے نواب نصیر حسین خاں خیال داستان اُردو کے نام سے مرتب کر رہے ہیں۔ اس قابل قدر تصنیف کا مقصد جیسا کہ اس نام سے ظاہر ہے۔ اُردو زبان کی مبسوط و مفصل تاریخ لکھنا ہے اور جو حضرات، جناب خیال کی ادبی قابلیت سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ شاید ہی کوئی شخص ان سے بہتر اس خدمت کو انجام دینے والا ہندوستان میں مل سکتا ہے

کتاب زیر تبصرہ میں ابتدائے عہد مغلیہ سے لے کر انتزاع سلطنت تک زبان اُردو کے رواج و ترقی پر نہایت پُرلطف طریقہ سے محققانہ نگاہ ڈال کر مسلسل طور پر مغلیہ دَور کی اُردو کی داستان سنا دی گئی ہے کتاب نہایت مفید و دلچسپ ہے اور وہ حضرات جن کو ادب اردو سے ذوق ہے اُن کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں ـــ تنقید کی جو روش جناب خیال نے اس کتاب میں اختیار کی ہے وہ حد درجہ دلکش ہے۔ یہ کتاب دو روپیہ میں عثمانی اینڈ سنس ۷۵ چونہ گلی کلکتہ سے مل سکتی ہے

تعلیم زدہ بیوی جناب فضل حق قریشی بی۔ اے (دہلوی) کا لکھا ہوا ڈرامہ ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ عورت کی تعلیم بعض صورتوں میں مردوں کیلئے کیسی عذاب ثابت ہوتی ہے۔ زبان صاف و شگفتہ ہے، مزاح کا پہلو بھی کافی سنجیدہ ہے، لیکن پلاٹ میں ترقی کی گنجایش تھی اگر توجہ کی جاتی۔ قیمت ۸/ ملنے کا پتہ ساقی بکڈپو دہلی

سلمیٰ ترجمہ ہے آسکر وائلڈ کے مشہور ٹریجڈی سالومی (Salome) کا جسے سید انصار ناصری بی۔ اے (دہلوی) نے پیش کیا ہے۔ اس سے قبل مجنوں گورکھپوری بھی اسی کتاب کا ترجمہ کر کے شایع کر چکے ہیں اور غالباً خلاف انصاف نہ ہوگا اگر مجنوں کے ترجمہ کو اس ترجمہ پر ترجیح دی جائے۔ کیونکہ مجنوں کا ترجمہ کسی جگہ ترجمہ کی شان سے نہیں ہٹا اور جناب انصار ناصری نے اکثر جگہ صرف اخذ مفہوم کو کافی سمجھ کر حذف و اضافہ سے بھی کام لیا ہے۔ قیمت ۵/ ہے اور ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی

نجمہ نوری جناب انصار ناصری دہلوی کا لکھا ہوا ڈرامہ ہے جس میں مادری محبت کے کرشمے دکھائے گئے ہیں۔ زبان سلیس ہے اور پلاٹ دلکش ساقی بکڈپو دہلی سے ۱۲/ میں مل سکتا ہے

چندرا موہنی یہ فسانہ بھی جناب انصار ناصری کا لکھا ہوا ہے، جس میں بتایا ہے کہ محبت کا تعلق صورت سے نہیں

بلکہ سیرت سے ہے - زبان وطرز ادا کی خوبی کے ساتھ جذبات کا بھی مصنف نے کافی لحاظ کیا ہے - قیمت درج نہیں ہے، ملنے کا پتہ ساقی بکڈپو دہلی ہے

اخوان الشیاطین اور دیگر افسانے مجموعہ ہے جناب افضل حسین صاحب چشتی بی - اے کے افسانوں کا جو علامہ مضحک کے نام سے رسالہ ساقی میں اکثر لکھتے رہتے ہیں - آپ ملک کے اچھے مزاح نگاروں میں سے ہیں اور کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں - قیمت ۸ہ، ملنے کا پتہ ساقی بکڈپو - دہلی

رقص وسرود جناب عظیم بیگ چغتائی کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ رقص وسرود اسلام میں ممنوع نہیں ہے - اس مسئلہ میں مولویوں کی طرف سے جناب چغتائی پر کافی لے دے ہو چکی ہے اور ہونا بھی چاہیے تھی کیونکہ مولوی ایک ایسا درندہ ہے، جو جوع البقر کی بیماری میں مبتلا ہے اور جو ہر وقت اسی فکر میں رہتا ہے کہ کوئی شکار اس کے ہاتھ آئے اور وہ اپنی چیر پھاڑ شروع کردے

اب جناب چغتائی نے اپنے خیالات ایک مستقل رسالہ کی صورت میں پیش کئے ہیں دیکھئے کیا ہوتا ہے ؟ قیمت ۴ر ہے اور ساقی بکڈپو دہلی سے مل سکتا ہے ؛

اعادۂ شباب ودرازیٔ عمر اس وقت یوروپ میں فن طب کا ایک مخصوص شعبہ صرف اس جستجو کے لئے علیحدہ کر دیا گیا ہے کہ انسان کی عمر طبیعی کو کس حد تک طویل بنایا جاسکتا ہے - اور اعادۂ شباب ممکن ہے یا نہیں ؟ لیکن ہندوستان میں لوگوں کو اس فن سے صرف اسقدر دلچسپی ہے کہ اخباروں میں اس قسم کے تجربات کو پڑھ لیتے ہیں اور یوروپ کی ترقی کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے حیران ہو جاتے ہیں

لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب (جو گولکنڈہ حیدرآباد میں افواج باقاعدہ کے سینیر میڈیکل افسیر ہیں) ایک زمانہ سے اس طرف عملی جستجو میں لگے ہوئے تھے - اور مختلف قسم کے جانور جمع کر کے تجربہ میں مصروف تھے چنانچہ انکا یہ شوق انھیں کشاں کشاں یوروپ لے گیا اور وہاں تمام ممالک میں گھوم پھر کر اس فن کے ماہرین سے ملے اور کافی روپیہ خرچ کرکے علمی وعملی درس لے کر واپس آئے - اس رسالہ میں انھوں نے اپنے نتائج مطالعہ پیش کئے ہیں اور ظاہر کیا ہے کہ کہاں کہاں کس طریقہ سے اعادۂ شباب کی کوشش جاری ہے اور ہندوستان کے لئے کونسا طریق کار مفید ہے

ڈاکٹر صاحب موصوف نے یوروپ سے آکر خود بھی متعدد آپریشن کئے ہیں اور اس باب میں وہ ہر شخص کو مفت مشورہ دینے کے لئے طیار ہیں

اس رسالہ کے علاوہ اور بھی متعدد رسالے انھوں نے شائع کئے ہیں جنمیں یوروپ کے قائم کئے ہوئے مختلف نظریہ ہائے اعادۂ شباب سے بحث کرتے ہوئے وہاں کے مختلف طریق جراحی پر ماہرانہ رائے دی ہے

ہندوستان کو ڈاکٹر صاحب موصوف کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے اسقدر محنت شاقہ اور زرخطیر صرف کرنے کے بعد اس مخصوص شعبہ میں مہارت حاصل کی اور اب وہ اپنی معلومات سے اہل ہند کو بلا خیال کسی مادی منفعت کے فائدہ پہونچانے کے لئے طیار ہیں

یہ تمام رسالے ڈاکٹر صاحب موصوف سے مفت مل سکتے ہیں۔ لوگوں کو چاہیے کہ ان کا مطالعہ کریں اور جن کو اعادۂ شباب سے کچھ بھی دلچسپی ہے وہ خط و کتابت کرکے ڈاکٹر صاحب کا مشورہ حاصل کریں

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

اس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور اُن کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کے بُنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز حالات و واقعات درج ہیں۔ کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول آٹھ آنے کے مجلد کتاب صرف ۱۲/ میں — اور غیر مجلد ۱۰/ میں ملے گی — اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۱۲/ میں۔ اور غیر مجلد ۱/ میں علاوہ محصول ۸/ کے ملے گی — اگر ارشاد ہو تو کتاب ذریعۂ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۳۷۵ صفحات۔ آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے —

منیجر نگار لکھنؤ

انعامی مضمون

(لمحۂ غور و فکر کی دعوت)

موجودہ آبادی کی رُو سے، بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ہندوؤں کے مقابلہ میں یہ ہے :—

مسلمان = ۵۴٫۸ فی صدی

ہندو = ۴۲٫۱ ″

لیکن تعلیم کے لحاظ سے ہندو باوصف کمی آبادی کے کسقدر بڑھے ہوئے ہیں، اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ بہ مقابلہ مسلمانوں کے عام تعلیمی حالت اُن کی ۶۲٫۲ فی صدی ہے اور انگریزی تعلیم میں ان کا تناسب ۶۹٫۶ ہے

جو طلبہ اس وقت زیر تعلیم ہیں اُن میں ہندوؤں کی تعداد بہ مقابلہ مسلمانوں کے حسب ذیل ہے :—

ہائی اسکولوں میں -	۷۹٫۶	فی صدی	انجنیری میں =	۵۵٫۵	فی صدی
انٹر کالجوں میں =	۸۳٫۶	″ ″	تجارتی مدارس میں =	۸۶	″
یونیورسٹیوں میں =	۸۲٫۸	″ ″	بنک، بیمہ کے کاموں میں	۸۳	″
پوسٹ گریجویٹ جماعتوں میں =	۸۵٫۷	″ ″	قانون پیشہ =	۸۷٫۷	″ ″
میڈیکل کالجوں میں =	۸۶٫۳	″ ″	ڈاکٹری = ۹۰٫۷ فیصدی	دیگر فنون میں = ۹۱٫۳	″

اب اسی کے ساتھ تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ ہو کہ افلاس و ذلت بداخلاقی و بداقبالی میں مسلمانوں کی ترقی کا کیا عالم ہے :—

آوارہ گرد، فقیروں میں ان کی تعداد ۵۲٫۷ فی صدی ہے

قلتبانی و فحاشی وغیرہ میں ″ ۶۲٫۷ ″ ″

اخلاقی جرائم کے ماتحت جیل خانوں میں ۵۳٫۱ ″ ″

اِس کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے ؟

جو صاحب اس کا معقول جواب دیں گے اور اس کا زود اثر علاج بتائیں گے ان کی خدمت میں ایک طلائی تمغہ پیش کیا جائے گا۔ مضمون کا انتخاب مُدیر نگار کریں گے۔ اور منتخب مضمون نگار ہی میں شایع کیا جائیگا

ایک دردمند مسلمان

حُسن سرِ رَاہ

ہوئی ہے آج یہ کس سحری نگاہ دوچار — کہ خود بخود ہوئی جاتی ہے، سلبِ طاقتِ ہوش

یہ کس کا جلوہ ہے یہ کس کے جلوہ کی ہر کرن — کیا ہے خاک کے ذرّوں کو جس نے آئینہ پوش

مچل رہی ہیں رگ وپے میں کیف کی موجیں — یہ کس نے چھیڑ دیا زندگی کا سازِ خموش

ہجومِ رنگ سے ہے نبضِ کاہ میں حرکت — وفورِ حُسن سے ہے موجِ خاک نالہ فروش

اٹھا رہا ہے کوئی بزمِ راز کے پردے — سرودِ موجِ صبا ہے کہ ہے نوائے سروش

ندیم! کس کو ملی ہے یہ نعمتِ سرمد — نگاہِ جلوہ شناس و نگارِ جلوہ فروش

خوشا! لطافتِ پنہاں کہ آج دل میں نہیں — خیالِ تلخیٔ فردا، غمِ مصائبِ دوش

گئی وہ تیرگیٔ شب، وہ رسمِ بے خبری

جبینِ دہر پہ چمکا ستارۂ سحری

نگاہ حسن طلب چاہیئے کہ بزمِ حیات نہیں کچھ اور بجز اک ادائے جلوۂ ناز

کھلا ہوا ہے ازل سے درِ حریمِ جمال کوئی حجاب ہے، صبر آزما نہ پردۂ راز

جھلک رہا ہے پیالوں میں رنگ بادۂ ناب لرز رہی ہے سر دوش موجِ زلفِ دراز

سمجھ نہ شانِ تغافل کو درسِ محرومی کہ ہے نیاز کے اعجاز سے حسن خلوتِ ناز

جُدا ہے عقل کی سرحد سے بیخودی کا مقام نہ پیچ و خم ہیں نہ اس راہ میں نشیب و فراز

درونِ ساغرِ دل چاہیئے، رہینِ طپش وہ موج بادہ کہ ہو آتش پیالہ گداز

یہ مشتِ خاک اور اتنی بصیرت افروزی مگر عمیق ہے کتنا فریبِ حسن مجاز

نہاں ہے بے خبری میں نشاطِ منزل بھی

شکستِ دل میں ہے تعمیرِ ہستیٔ دل بھی

علی اختر

(حیدر آباد دکن)

ارمغانِ غم

نگاہ اندوہناک، چہرہ اُداس، دل بیقرار کیوں ہے
خبر نہیں اسقدر فراوانیٔ غمِ روزگار کیوں ہے

وفا شعاروں پر اوجفا کیش! بیدریغ اور بے محابا
عنایتِ جانگداز کیوں ہے، نوازشِ دلفگار کیوں ہے

مری خموشی نہیں ہے تسکینِ دل کی آئینہ دار ہمدم
میں دم بخود ہوں کہ زندگی ایک ذلتِ ناگوار کیوں ہے

کبھی کبھی لب پہ آہی جاتا ہے آہ کے ساتھ نام تیرا
خبر نہیں تیرا ذکر ٹوٹے ہوئے دلوں کا قرار کیوں ہے

کچھ ایسا مانوس ہوگیا ہوں مصیبت آمیز زندگی سے
کبھی نہیں یہ خیال آیا، زمانہ ناساز گار کیوں ہے

یہ زندگی خود بہت بڑا غم ہے، اے غمِ عشق دینے والے
یہ دردمندوں کے حال ہی پر نوازشِ بیشمار کیوں ہے

کہو عدم دل کا حال کیا ہے؟ یہ کیسی چُپ تم کو لگ گئی ہے
یہ ہر گھڑی، "آہ! آہ!"، اور بات بات میں اختصار کیوں ہے

عدم

وارداتِ امروز

افسونِ بیخودی کا عمل بیکراں ہے آج
دل بے نیازِ ہستی کون و مکاں ہے آج

ڈوبی ہوئی ہے وجد میں رفتارِ زندگی
اِک کیف ہے کہ ہوش کی روح رواں ہے آج

کیا تذکرہ ہے ارض و سما کے وجود کا
ہر چیز محویت کے سوا بے نشاں ہے آج

رعنائی مجاز میں ہیں وہ تجلّیاں!
رعنائی مجاز میں گم سب جہاں ہے آج

اک پُر بہار و روح فزا جوئے بار میں
محوِ خرام کشتیٔ عمرِ رواں ہے آج

بیتاب ہے عناصرِ دل میں خوشی کی لہر
ہر سانس میں گدازِ مسرت نہاں ہے آج

پھر کاروبارِ شوق کا بازار گرم ہے
پھر دل سے محو کاوشِ سود و زیاں ہے آج

پھر افتتاح جلسۂ عیش و نشاط ہے
پھر اہتمام زندگی کامراں ہے آج

حسن اپنے کیف و ناز سے سرشار ہی عدم!
عشق اپنے سوز و ساز سے آتش بجاں ہے آج

عدمؔ

خالد

آہ! اے اک غمزدہ شاعر کی تسکینِ حیات — زندگی کی ایک چھوٹی سی منوّر کائنات

امن کی اک پُرسکوں دنیا ہے گہوارہ ترا — شورشوں کی دسترس سے دور ہے جھولا ترا

تیری میٹھی نیند کے پردے میں کوئی حور ہے — تیرا سپنا خلد کے انوار سے معمور ہے

جھولا لے جی بھر کے جھولے میں، اٹھا لے لطفِ خواب — اے مرے لختِ جگر! آنیکو ہے اک انقلاب

تلخیاں ہی تلخیاں ہیں گردشِ ایام میں — جھولنا ہے کل تجھے گہوارۂ آلام میں

عہدِ طفلی کا رُوپہلا خواب ہے ناپائدار — دیکھنی پڑتی ہے انساں کو جفائے روزگار

پیارے خالد تجکو لے آئیگی دنیا ہوش میں — کھولنا ہے آنکھ تجھکو حشر کے آغوش میں

امتحانِ عزم و استقلال کرنے کے لئے — ناتواں انسان کو پامال کرنے کے لئے

گرم ہے آفات کا بازار ازل سے دہر میں — سرخرو ہوتے ہیں ذی ہمت عمل سے دہر میں

اک سپاہی بن کے میداں میں اترنا ہے تجھے
روح فرسا حادثوں سے جنگ کرنا ہے تجھے

عدم

پروانہ

اے سراپا گداز پروانے ملتہب، عشقباز پروانے

بامراد اور کامگار ہے تو مذہبِ عشق کا وقار ہے تو!

کیا ابدتاب ہے حیات تری کیا منور ہے کائنات تری

اُف! ترے آب و گل میں کیا شے ہے دل ہے سینے میں، دل میں کیا شے ہے؟

شمع، خاموش جلتی رہتی ہے آگ کی لَو نکلتی رہتی ہے

پہلے اُس کا طواف کرتا ہے عشق کا اعتراف کرتا ہے

اور پھر بیخودی میں گم ہو کر نشۂ سرمدی میں گم ہو کر

خوب دل کی لگی بجھاتا ہے شوق سے آگ میں نہاتا ہے

عشق نغمہ ہے اور ساز ہے تو

وہ حقیقت ہے اور مجاز ہے تو

عدم

لمعات اختر انصاری

مہتاب:-

آسماں کے ہاتھ میں ہے اک ستار — پڑ رہی ہے مست نغموں کی پھوار
آہ! ان نغمات سے ہے مرتعش — سازِ دل کا کوئی نامعلوم تار

دھوپ اور آئینہ

ہلکی ہلکی پھوار کے دوران میں، — دفعتہً سورج جو بے پردہ ہوا
میں نے یہ جانا کہ وحشت میں کوئی — روتے روتے کھل کھلا کر ہنس پڑا

مطربہ:

تیری نازک اور پتلی انگلیاں — ساز کے تاروں کو جب کرتی ہیں مس
کانپنے لگتی ہے زہرہ عرش پر — دل پکار اٹھتا ہے "بس، للہ! بس!"

مغنیہ

تیرے شوق انگیز اور جاں سوز نغموں کی قسم — تیرے نوش آہنگ اور دل دوز نغموں کی قسم
تیرے کیف آور طرب افروز نغموں کی قسم — تیرے صہبا ریز، وجد آموز نغموں کی قسم

جب دلوں کو سحر زا نغموں سے تڑپاتی ہے تو — جب رگوں میں زندگی کا خون دوڑاتی ہے تو
بزم کو جب راگ کی حدت سے گرماتی ہے تو — غرق ہو کر بحرِ موسیقی میں جب گاتی ہے تو

گیت کے طوفاں میں بہ جاتی ہے ساری کائنات
ایک نغمہ بن کے رہ جاتی ہے ساری کائنات

لذتِ غم

یوں بھی ہوتا ہے کہ فکر و ذوق کی تشنہ لبی! چھین لیتی ہے نشاطِ غم سے آسودگی!
یوں بھی ہوتا ہے کہ رہتا ہوں میں اکثر سوگوار! روح میں پاتا ہوں اپنی مستقل اک اضطرار!
صرفِ غم ہوتی ہے جب میری حیاتِ سوگوار اور چھا جاتا ہے مجھ پر سخت ذہنی انتشار!
دفعتاً ایسے میں "اے محبوب" تو آتا ہے یاد! اک خیالِ روح پرور دل کو کر دیتا ہے شاد!
ایک نامعلوم سرمستی میں کھو جاتا ہوں میں! حسن کی رنگینیوں میں جذب ہو جاتا ہوں میں!
دل میں وہ پہلا سا احساسِ الم ہوتا نہیں! روح میں پیدا اب وہ جوشِ غم ہوتا نہیں!!
کیا کہوں ہوتا ہوں کیسی شادمانی سے دوچار؟ سیکڑوں ایامِ خوش اس ایک ساعت پر نثار!

کوئی اس احساس کی لذّت بتا سکتا نہیں!!
کوئی اس روداد عشرت کو سنا سکتا نہیں!!

جمیل راز بنگش سرحدی

"تازیانہ"

اسیرِ دامِ خیال و شکستہ پر کب تک ذلیل و خستہ، فریادِ بے اثر کب تک
قصورِ حوصلہ، کوتاہیٔ نظر تا کے سپرِ نیاز، تمنائے سنگِ در کب تک
درازِ دستِ سوال و شکستہ پائے عمل [illegible] نگار، لبِ افسردہ، چشمِ تر کب تک
دماغ سست، دلِ بد شعار، طبع رکیک مذاقِ پست، خیالاتِ منتشر کب تک
اسیرِ یاس، تن آساں، مریضِ وہم و خیال رہینِ غم، ہدفِ مشقِ چارہ گر کب تک

وطن فروشی و غداری و ضمیر کشی فریفتگیٔ طلسماتِ جاہ و زر کب تک
درندگی و برادر کشی و سفاکی ستیزہ کاری و اندازِ فتنہ گر کب تک
غلامِ نفس اسیرِ کمندِ حرص و ہوس سیاہ مستِ مئے عشرتِ مختصر کب تک
عدو نواز و عدو دوست وعدہ و پرور فریب خوردہ و مدہوش و بے خبر کب تک

ہوا پرست، غلط رو، فساد خیز، شریر
تباہ کار، زیاں کوش، بے بصر کب تک

کوکب (شاہجہانپوری)

معلومات

چیونٹی چھوٹا انسان ہے اور انسان بڑی چیونٹی

امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں ڈاکٹر ولیم مارٹن ہویلر نہایت مشہور طبیعی عالم ہیں اور حشرات میں خصوصیت کے ساتھ چیونٹی کی تحقیق کے لئے انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کر دیا ہے۔ اس موضوع پر جو لٹریچر انھوں نے پیش کیا ہے وہ نہایت عجیب و غریب حقایق اور نادر معلومات کا ذخیرہ ہے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کرۂ ارض پر چیونٹی کا وجود تقریباً ۳۰ کرور سال سے پایا جاتا ہے اور اپنی معیشت وغیرہ کے لحاظ سے وہ نظام بشری سے بہت زیادہ مشابہ ہے، یہاں تک کہ ان دونوں میں اگر کوئی خاص فرق پایا جاتا ہے تو یہ کہ چیونٹیوں کا نظام اجتماعی انسان کے نظام اجتماعی سے زیادہ بسیط ہے، کیونکہ اس نے جو ایک وتیرہ اختیار کر لیا ہے اس سے کبھی ہٹتی نہیں اور انسان تغیر پسند ہے

چیونٹی کی مشہور قسموں کی تعداد ۳۵۰۰ تک بتائی جاتی ہے، لیکن ان میں سے اگر ہر نوع کی مختلف قسموں کو سامنے رکھا جائے تو یہ تعداد سات ہزار سے متجاوز ہو جاتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ کثرت انواع کے لحاظ سے شاید ہی کوئی مخلوق اس کے مقابلہ میں پیش کی جاسکے

چیونٹیاں روئے زمین کے ہر حصہ پر پائی جاتی ہیں سوائے شمال و جنوب کے اس منطقہ باردہ یا پہاڑ کی اُن اونچی چوٹیوں کے جہاں ہر وقت برف منجمد رہتی ہے۔ ان کی اکثر قسمیں اپنا گھر ہمیشہ زمین کے اندر بناتی ہیں اور جب غیر معمولی رطوبت پیدا ہو جاتی ہے یا درجۂ حرارت بدل جاتا ہے تو دوسری جگہ منتقل ہو جاتی ہیں

چیونٹی کی کوئی غذا متعین نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر ایک طرف وہ کیڑے مکوڑے کھا کر اپنے گوشت خوار ہونے کا ثبوت دیتی ہے تو دوسری طرف غلہ اور پتیاں وغیرہ کی شایق ہونے کے لحاظ سے نباتاتی بھی کہلائی جا سکتی ہے، یعنی اس باب میں جو حالت انسان کی ہے وہی اس کی بھی ہے۔ پھر جس طرح انسان میں یہ دستور ہے کہ وہ دوسروں سے خدمت لیتے ہیں۔ اسی طرح چیونٹیاں بھی اپنے خادموں سے کام لیتی ہیں اور جس طرح انسانوں میں سارق و رہزن پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح چیونٹیوں میں بھی پائے جاتے ہیں

چیونٹی کی ایک قسم ایسی ہے جو اپنی غذا صرف لوٹ مار کے ذریعہ سے حاصل کرتی ہے اور دوسری امن پسند محنتی چیونٹیوں سے غذا چھین کر خود لے بھاگتی ہے۔ ایک قسم چور چیونٹیوں کی بھی ہے جو زیادہ تر دیواروں کے اندر رہتی

اور اندر ہی اندر نہایت پیچیدہ راستے بناکر چرائی ہوئی غذا کو ان میں جمع کرتی رہتی ہے - یہ زرد رنگ کی چھوٹی چیونٹی ہوتی ہے اور گھروں میں ہر جگہ نظر آتی ہے

ان میں باہمد گر علاقۂ محبت بھی پایا جاتا ہے اور ایک قسم کی چیونٹیاں دوسری قسم کی چیونٹیوں کے ساتھ رہتی بھی ہیں - ایک چھوٹی قسم اس کی ایسی ہے جو بڑی چیونٹی کی پیٹھ پر سوار ہو جاتی ہے اور اس کے سر اور منھ کو چاٹتی رہتی ہے - یہ بڑی چیونٹی اسی حال میں غذا کی بھی تلاش کرتی رہتی ہے اور اُسے یہ بار مطلق ناگوار نہیں ہوتا - بعض چیونٹیاں دوسری چیونٹیوں کو غلام بنانے اور اُن سے خدمت لینے کی بہت شائق ہوتی ہیں - چنانچہ ایک قسم اس کی جس کا نام آمازون ہے، یہ پوری اجتماعی قوت سے دوسرے گروہ پر حملہ کرتی ہے اور غلام بنالیتی ہے، یہ محارب قسم کی چیونٹی خود اپنے بچوں کو نہیں پالتی بلکہ انھیں غلام چیونٹیوں سے یہ خدمت لیتی ہے

بعض چیونٹیاں دوسرے کیڑوں کو متبنی بناکر ان کی پرورش بھی کرتی ہیں - یہاں تک جب وہ متبنی کیڑا بڑھ جاتا ہے تو بھی انھیں کے درمیان رہتا ہے اور یہ اس کی راحت و آسایش کا پورا لحاظ رکھتی ہیں

الغرض چیونٹی کی دنیا بھی بالکل انسانی دنیا ہے اور سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ چیونٹی ایک چھوٹا انسان ہے اور انسان ایک بڑا چیونٹا

فرانس کا قدیم طریقۂ احترام

فرانسیسی قوم بھی مغرب کی دوسری قوموں کی طرح زمانۂ وحشت گزر چکا ہے اور اس عہد کے بعض مراسم ان کے یہاں عجیب و غریب تھے، مثلاً آٹھویں صدی تک وہاں یہ رواج عام طور پر پایا جاتا تھا کہ جب کوئی معزز کسی شخص کے گھر آتا تھا اور عزت و احترام کے ساتھ اس کی پزیرائی کی جانی مقصود ہوتی تھی تو صاحب خانہ یا میزبان سب سے پہلے اپنے سر کا ایک بال اکھاڑ کر آگے بڑھتا تھا اور ہاتھ پر رکھ کر اس کے سامنے پیش کرتا تھا - چنانچہ جس وقت سان برمان فرانس آیا ہے تو کلوفیس نے یہی حرکت کی تھی اور دربار کے تمام امراء نے بھی اپنے اپنے بال اکھاڑ کر اس رسم کو ادا کیا تھا - تنکا مُنہ میں داب کر ایک پاؤں سے سامنے کھڑے ہو کر خیر مقدم کرنے کی رسم ہندوستان کی بعض خانہ بدوش قوموں میں اب بھی پائی جاتی ہے اور ایران میں بھی کسی وقت یہ رواج پایا جاتا تھا - چنانچہ اظہار عجز کے مفہوم میں "خس بدنداں" کا محاورہ فارسی میں اسی رسم کے بنا پر قائم ہوا تھا

غالب لکھتا ہے :-

ہجوم نالہ، حیرت عاجز عرض یک افغاں ہے
خموشی، ریشۂ صد نیستاں سے "خس بدنداں" ہے

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہجوم نالہ فرط حیرت سے اس قابل بھی نہیں کہ نالہ و فریاد کر سکے اور میری یہ خاموشی میرے

عجز، کو بالکل اسی طرح ظاہر کر رہی ہے جس طرح "نیستاں" کی خاموشی جس کا ریشہ دار ہونا گویا "خس بدنداں" ہونا ہے،

ایک عجیب بازار برلن کے ہر ہوٹل و قہوہ خانہ میں ایک بار ہر مہینے خاص قسم کا بازار لگتا ہے جہاں خرید و فروخت یا لین دین سکوں کے ذریعہ سے نہیں ہوتا بلکہ ایک چیز کا تبادلہ دوسری چیز سے کر لیا جاتا ہے۔ انعقاد بازار کے دن مختلف لوگ مختلف چیزیں لیکر آتے ہیں اور باہم کر تبادلہ کر لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی مچھلی لے کر آیا ہے تو وہ کسی دوسرے جانور سے تبادلہ کر لیتا ہے، کوئی خاص قسم کی تیتری لے کر آیا ہے تو کسی پودھے کے عوض میں دیدیتا ہے۔ الغرض اپنی بے ضرورت چیز کے عوض دوسرے سے اپنی ضرورت کی چیز یہاں لے لیجاتی ہے۔ حال ہی میں ایک شخص یہاں گھڑیال کا چھوٹا بچہ لایا۔ اور صرف ایک پھول کے عوض اس کو دے گیا —— دنیا بھر میں کسی جگہ یہ رواج نہیں پایا جاتا اور عہد قدیم کے طریق خرید و فروخت کی یہ یادگار اس وقت صرف برلن ہی میں پائی جاتی ہے

اندھوں کا شہر مشرقی ترکی میں ایک مقام ہے جس کا نام ادلیامان ہے جہاں سات ہزار کی آبادی ہے لیکن لطف یہ ہے کہ ان میں سوائے ۲۰۹ آدمیوں کے باقی سب اندھے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدیم ترکی حکومت نے اندھوں کے لئے یہاں کوئی خاص انتظام علاج کا کیا تھا جو اب باقی نہیں ہے اور اس طرح ایک مستقل آبادی اندھوں کی یہاں ہو گئی ہے اور اب نسل میں اثر پیدا ہو کر اولاد بھی اندھی پیدا ہونے لگی ہے

تحفۂ قبر دنیا کا شاید سب سے عجیب تحفہ وہ ہے جو امریکہ کے ایک پادری ویل ہوالن کو قبر کی صورت میں دیا گیا —— اس کا واقعہ یوں ہے کہ سنہ ۱۹۰۵ء میں ایک ولیم سنگ مرا اور دفن کر دیا گیا، لیکن بعد کو اس کے ورثہ کا ارادہ یہ ہوا کہ اسے کسی دوسری جگہ دفن کر دیں چنانچہ اس قبر کو خالی کر کے اس کا کتبہ وغیرہ علیحدہ کر لیا اور ایک دوسرا کتبہ لگوا دیا۔ جس میں پادری ویل ہوالن کا نام لکھ دیا۔ تاریخ وفات کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا تو یہ خالی شدہ قبر معہ کتبہ کے پادری ویل ہوالن کو تحفۃً دیدی گئی تاکہ جب وہ مرے تو اس قبر سے کام لے اور کتبہ میں تاریخ وفات درج کر دے۔ لطف یہ ہے کہ پادری صاحب موصوف اس ہدیہ سے بہت خوش ہیں کیونکہ ان کے نزدیک محبت کا ہدیہ خواہ وہ موت ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو قابل قدر ہے

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

- گوڈر کا لال
- شوکت آرا بیگم حصہ ۱ و ۲
- ،، حصہ سوم
- سعیدہ کے خطوط
- پیاری سہیلی — ۱۰ر
- نئی نویلی پیاری سہیلی
- عورتوں کی انشا
- انشاء نسواں — ۸ر
- سیرۃ الکبریٰ
- طرز زندگی
- مخدرات تیموریہ
- ازواج النبی — ۱۲ر
- ازواج الانبیا
- سیرۃ عائشہ صدیقہ
- عفت المسلمات
- سبیل الجنان
- بچوں کی پرورش
- حرز اطفال
- تہذیب نسواں
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت — ۴ر
- تربیت اطفال — ۱۲ر

- فرائض مادری — ۱۲ر
- افسانۂ نادر جہاں
- اقبال دلہن
- حسن معاشرت
- ایامیٰ
- سولہ کہانیاں — ۱۲ر
- سترہ کہانیاں — ۱۲ر
- سولہ قصے — ۸ر
- مراۃ العروس — ۸ر
- بنات النعش — ۸ر
- توبۃ النصوح — ۱۲ر
- کنیز فاطمہ — ۸ر
- پنکھ ڈالی — ۸ر
- نصیحت کا کرن پھول — ۸ر
- برکات سلطانی — ۸ر
- ابن الوقت
- چند پند — ۴ر
- منتخب الحکایات — ۴ر
- تندرستی
- حفظ صحت
- طبیب نسواں
- رہبر صحت — ۸ر

ناول، ڈرامے اور افسانے

- قطرات اشک
- جتندر ناتھ
- بس کا ردکھ
- فسانۂ سعید — ۸ر
- خوفناک ڈکیتی
- سیلاب اشک با تصویر
- بے زبان عورت
- جمال ہم نشین
- تفسیر عصمت
- جوہر قدامت
- تائید غیبی — ۸ر
- پر اسرار قتل
- اعلان آزادی — ۵ر
- سرگذشت ہاجرہ — ۱۰ر
- قصہ زندگی
- قلب حزیں — ۸ر
- عروس کربلا
- شہید مغرب
- ماہ عجم
- تیغ ستمگر
- سراب مغرب — ۸ر
- منازل السائرہ کامل

- موہنی — ۱۲ر
- وداع ظفر
- یاسمین شام
- طوفان اشک
- شاہین دوراج — ۸ر
- درس عشق
- کرور پتی چور
- تین بندوق باز
- کرشمۂ رقابت — ۸ر
- انقلاب قسطنطنیہ — ۸ر
- شاہد رعنا
- وڈیا کی سرگذشت — ۴ر
- شگوفۂ محبت
- نسوانی زندگی — ۸ر
- ولایتی گھنٹی — ۸ر
- شمع خاموش — ۸ر
- شب زندگی کامل
- مودودہ — ۸ر
- چندکلا — ۸ر
- گلدستۂ خاتون
- صبح زندگی
- شام زندگی

تاریخ و سوانح عمریاں

- تاریخ مغرب
- مختصر تاریخ اسلامی — ۸ر
- ،، ،، حصہ ۲ — ۹
- ،، ،، حصہ ۳ — ۱۰ر
- ،، ،، حصہ ۴
- الصالحات
- امت کی مائیں
- الزہرا — ۱۲ر
- اسوۂ حسنہ — ۸ر
- ہند کی شعراء
- شو بہار
- سوانح اکبر الٰہ آبادی
- سفرنامہ عراق
- تاریخ افاغنہ
- اسلام اور غیر مسلم — ۸ر
- سیر المصنفین حصہ ۱
- ،، حصہ ۲
- تاریخ اسلام ۵ جلد
- اخبار الاندلس ۳ جلد
- خلافت موحدین
- خلافت مولدین
- عرب اور اس کا مستقبل

لغات و ادب

- بازاری زبان — ۸ر
- لغات سعیدی
- لغات کشوری
- گنجینۂ تحقیق مجلد
- غیاث اللغات فارسی
- محاورات نسواں — ۸ر
- جواہر اللغات — ۱۲ر
- گوہر اللغات — ۱۲ر
- چراغ سخن
- دکھنی لغت — ۸ر
- جواہرات کلیات نظیر
- عزیز اللغات
- تذکرۂ ریختی
- تاریخ ادب اردو قدیم
- دکن میں اردو
- منتخب کلام ہندی
- رباعیات عمر خیام
- منتخب کلام ہندی
- اردو کے اسالیب بیان
- تصریح الاغلاط — ۴ر
- فیض اردو — ۵ر
- نور اللغات ۴ جلد

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز
- کلیات عراقی — ۱۲ر
- دیوان حافظ
- دیوان بیدل
- دیوان عرفی — ۱۲ر
- کلیات جامی

- کلیات غالب
- کلیات صائب
- دیوان ناصر علی — ۶ر
- کلیات سعدی
- کلیات حزیں
- دیوان عنصری — ۱۲ر

- دیوان غنی کشمیری
- دیوان ہلالی — ۶ر
- اسرار خودی و رموز بیخودی
- زبور عجم
- پیام مشرق
- قصائد عرفی مجلد

دواوین اردو

- کلیات ظفر — ۱۲ر
- کلیات مومن
- دیوان ناسخ
- کلیات میر
- کلیات سودا
- کلیات انشا

- کلیات نظیر اکبر آبادی
- گلزار داغ
- دیوان رند
- دیوان ذوق
- گلکدۂ عزیز
- مراۃ الغیب

- مثنوی فسانۂ عشق
- فریاد داغ — ۴ر
- عالم خیال با تصویر
- دیوان شہیدی — ۴ر
- کلیات اکبر الٰہ آبادی
- نغمۂ ملک الشعرا جہانگیری

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۱۰۴

تذکرہ و تاریخ

پیغمبر اعظم
شب معراج
سراج منیر
پیغمبر عالم
سوانح حضرت رسول
سید المرسلین
حیدر کرار
سیرۃ الصدیق
عمر ابن خطاب
ابوبکر صدیق
ائمہ اسلام ۱۲
الحبیب
عمر بن عبد العزیز
دولت فاطمیہ
مکمل سوانح زیب النساء بیگم
تذکرہ اولیا
تذکرہ اولیائے ہند
مرأۃ الکونین
قصص الانبیا مکمل
سفرنامہ چین
تلخیص التواریخ
خاتون جنت
مختارات الصوفیہ
خواتین انگورہ
مشاہیر نسواں
مشاہیر ہند
مخدرات تیموریہ
بیگمات بنگال

جاسوسی کی ناول

شرلاک ہومز
محاصرۂ پیرس ۸ر
شیخ چلی
بہرام کی چالاکی
انقلاب فرانس
بحری قزاق
فطرتی جاسوس
ترکی حرم سرا ۸ر
ہنگامہ ابلیس
بہرام چور ۱۲ر
زر پرست
گنجی کا راز ۸ر
عبد الرحمن ناصر
فاروس مصر
سیلاب خون
سیاحت زمین
سیاحت ہوا
نازنین مراکش ۸ر
سمندر کی سیر
اسرار بالغوئیزم
دیو پیلی
ایمن بک ۱۲ر
حجاج بن یوسف
یوسف پاشا
انقلاب عثمانی
بہرام کی رہائی
بہرام کی آزادی
بہرام کی سرگذشت

مراثی

مراثی دبیر
مراثی انیس کامل
مراثی ضمیر
مراثی مونس
مراثی دلگیر

عجائب و غرائب

عجائب مخلوقات
تصویر رنگین
با تصویر سادہ
مجمع الفنون
طلسم زنگ
کارخانۂ عالم

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

الہ دین دیلی
فریب حسن
سوزن عشق
روز الیمبرٹ
ناول اسرار
شام جوانی
حرم سرا

ناول سجاد حسین

احمق الذی ۸ر
حاجی بغلول ۸ر
پیاری دنیا ۸ر
کایا پلٹ ۸ر
میٹھی چھری ۶ر
طرحدار لونڈی
طلسمی فانوس

ناول جوالا پرشاد

مرنالنی ۱۰ر
مار آستین ۱۰ر
بنگالی دولہن ۱۲ر
معشوقۂ فرنگ ۸ر
پرتاب ۱۲ر
روہنی ۱۰ر

ناول سرشار

سیر کہسار
خدائی فوجدار
جام سرشار
الف لیلہ بطرز ناول
کامنی
سوانح عمر و عیار

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری
بہرام کی گرفتاری

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب
بزم خیال
مشاطۂ سخن
مکاتیب محسن الملک

تذکرۃ الشعراء

تذکرۂ حسینی ۱۲ر
گلشن بیخار ۱۰ر
سراپائے سخن
سوانح نظیر اکبرآبادی

ناول شرر

جنید بغدادی
مخدرات
جویائے حق
لعبت چین
فاتح و مفتوح
بابک خرمی
ایام عرب
قیس و لبنیٰ
یوسف و نجمہ
زوال بغداد
حسن کا ڈاکو
دربار حرام پور
مینا بازار
قدس نازنین
رومۃ الکبریٰ
فلپانا
شوقین ملکہ

مولانا شبلی نعمانی

سیرۃ النبی جلد اول
سیرۃ النبی جلد دوم
سیرۃ النبی جلد سوم
الفاروق
الغزالی
المامون
رسائل شبلی
موازنہ انیس و دبیر
کلام شبلی اردو
الکلام
علم الکلام
شعر العجم جلد اول
شعر العجم جلد دوم
شعر العجم جلد سوم
شعر العجم جلد چہارم
شعر العجم جلد پنجم

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

قیمت ۸ر

تصانیف حضرت نیاز فتحپوری
نگارستان
حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت علاوہ محصول عا ر
گہوارۂ تمدن
مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا کے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول عا ر
شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ ر
فراست الید
مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیر دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال مدت حیات صحت بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ ر
شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند ہے کہ دوسری جگہ مل نہیں سکتی۔ قیمت علاوہ محصول ۱۰ ر
جذبات بھاشا
جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی شرح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے۔ قیمت علاوہ محصول
صحابیات
جس میں عہد رسالت کی خواتین کے مستند حالات بیان کر دئے گئے ہیں۔ مولانا نیاز کی انشاء سے زیادہ صحابیات کے حالات عبادت نہایت نفیس ہے۔ قیمت علاوہ محصول
نقاب اٹھ جانیکے بعد
تین افسانوں کا مجموعہ جنمیں بتایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں۔ زبان و پلاٹ انشاء و تخیل کے لحاظ سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے۔ قیمت ۵۔ علاوہ محصول
مذاکرات نیاز
یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کر دینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہگئی ہیں۔ قیمت ۱۲ ر علاوہ محصول
فلاسفۂ قدیم
اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں۔ ۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ ۲۔ مادئین کا مذہب ۳۔ حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت عہ ر علاوہ محصول
تاریخ الدولتین
جرجی زیدان کے تاریخ تمدن الاسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ قیمت عہ ر علاوہ محصول
المسئلۃ الشرقیہ
مصطفیٰ کامل پاشا کی شہرۂ عالم کتاب کا ترجمہ۔ یہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ و ایشیا کے سیاسیات میں ہلچل ڈال دی تھی۔ علاوہ محصول
دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں
تذکرۂ خندۂ گل
مولفہ عبد الباری آسی جس میں ۲۰۰ صفحات سے زیادہ اردو و فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع لطائف و ظرائف و انتخابات کلام ۔ محصول ۸ ر
مثنوی لالہ رخ
طامس مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ، دلی شاعری کا بے مثل نمونہ۔ قیمت مع محصول عہ ر
مثنوی زہر عشق
مرتبہ مجنوں گورکھپوری جسمیں ملک کے چار بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں۔ عہ ر
فراست التحریر مکمل
یعنی اردو و انگریزی رسم خط اور تحریر دیکھ کر کسی کی سیرت چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن۔ اردو میں بالکل پہلی۔ قیمت ۸ ر علاوہ محصول۔

ضرورت ہے ایجنٹوں کی ہر شہر میں

کیلاس کیلئے

جو ہندوستان کی سب سے زیادہ حیرت انگیز اور کثرت سے فروخت ہونیوالی دوا ہے

دماغ کی تقویت کے لئے اکسیر اور بالوں کی پرورش میں بے نظیر

گھر بیٹھے پانچ روپیہ (صہ) سے پندرہ روپیہ (صعہ) روزانہ تک کمالینا کوئی بات نہیں - ہر شخص آسانی سے کرسکتا ہے

مستقل کاروبار چونکہ کیلاس کے علاوہ اور بھی متعدد دوائیں ایسی ہی مفید و زود اثر طیار ہیں، اس لئے کیلاس کے بعد دوسری دوا ایجنٹوں کو دی جائے گی، پھر تیسری، پھر چوتھی - الغرض اسی طرح ہر ایجنٹ کا مستقل کاروبار ہو جائے گا - اور ۵ ہزار سالانہ تک کمالینا دشوار نہ ہوگا

کیلاس کی خصوصیت کیلاس چودہ نایاب جڑی بوٹیوں سے طیار کی جاتی ہے اور اس کے اجزا بہت قیمتی ہیں، لیکن اس کی قیمت عہ رکھی گئی — دماغ، آنکھ اور بال کی تقویت کے لئے اس دوا کا نظیر نہیں -- حال ہی میں کیلاس کے ایک ایجنٹ نے ۴۸۲ روپیہ دس آنے ایک مہینے میں کمائے

اشتہار کی وسعت چونکہ ہم نے ۳۶ ہزار سالانہ اس کے اشتہار کے لئے مقرر کیا ہے - اور ہر اشتہار میں ہمارے تمام ایجنٹوں کے نام درج ہوں گے اس لئے ایجنٹوں کو اور زیادہ سہولت اس کے فروخت کرنے میں ہوگی

تھوک کا حساب تین درجن شیشیوں کی قیمت ۳۶، اور ۱۲ درجن کی ۱۲۶ لی جائے گی اور محصول وغیرہ بھی معاف ہوگا — ایجنٹ عہ فی شیشی کے حساب سے فروخت کریں گے — تین درجن سے کم شیشیاں روانہ نہوں گی

واپسی روپیہ کی ذمہ داری چونکہ کیلاس کے متعلق یقین ہے کہ وہ ضرور فائدہ کرے گی۔ اس لئے ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں کہ غیر فروخت شدہ مال اگر محفوظ طور پر وقت کے اندر ہم کو واپس بھیج دیا جائے گا۔ تو صرفہ نکال کر روپیہ واپس کر دیا جائے گا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایجنٹ کو کوئی خطرہ اس کاروبار میں

(بقیہ اشتہار دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ہو ہی نہیں سکتا

اس لئے اپنے حلقہ میں کیلاس کے ایجنٹ بن جائیے

اور تھوڑی سی محنت، تندہی اور کوشش سے کام لے کر گھر بیٹھے روپیہ کمائیے۔ ایجنٹوں کی بھرتی کا کام نہایت تیزی سے جاری ہے اس لئے پہلی فرصت میں تین درجن شیشیوں کی قیمت ذریعہ منی آرڈر بھیجکر ایجنٹ بن جائیے ورنہ ممکن ہے آپ کے شہر سے کوئی اور ایجنٹ مقرر ہو جائے اور پھر آپ کو افسوس کرنا پڑے، اگر آپ کے شہر میں کوئی ایجنٹ پہلے مقرر ہو چکا ہے تو آپ کا منی آرڈر واپس کر دیا جائے گا۔ خط و کتابت صرف انگریزی میں کیجئے

کیلاس کے استعمال کرنے والے کیا کہتے ہیں

بابو سرور خاں تحصیلدار کالندری ریاست سروہی لکھتے ہیں:- آپ کی کیلاس دماغ اور بالوں کو تقویت کے لئے بے نظیر ہے، تعریف ہو نہیں سکتی

پرائیویٹ سکرٹری ٹھاکر صاحب رتنپج ریاست لکھتے ہیں:- ٹھاکر صاحب کی ہدایت کے مطابق آپ کو اطلاع دیجاتی ہے کہ کیلاس تیل غیر معمولی طور پر بالوں کے لئے مفید ثابت ہوا۔ مہربانی فرما کر تین درجن شیشیاں اور بھیجد یجئے

ڈاکٹر پرامودرام۔ ڈنسٹ، بی۔اے۔ صاحب باغ، احمد آباد لکھتے ہیں:- میں تصدیق کرتا ہوں کہ کیلاس تیل دماغ اور بال کے لئے بہت تقویت بخش ہے اور اس میں کوئی مضر جزو شامل نہیں ہے

بیوٹی کرائس کمپنی ۱۰ اچرچ اسٹریٹ پنانگ لکھتی ہے:- کہ کیلاس تیل ہمارے بہت سے گاہکوں نے بہت پسند کیا

بنکرز:-
بنک آف انڈیا لمیٹڈ بمبئی
سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ بمبئی

Dharamsay & Co.
317 Hornby Road
Bombay.

تار کا پتہ:- "Charm" Bombay.

ٹیلی فون نمبر کارخانہ ۲۰۰ ۸۹
" " دفتر ۲۳۱۰۵

ساڑھے سات ہزار روپیہ انعام حاصل کیجئے

آٹھ الفاظ نوروزی مقولہ کا مقابلہ

پہلا انعام ۵۰۰۰ روپیہ
دوسرا انعام ۱۵۰۰ ٫٫ ٫٫
تیسرا انعام ۵۰۰ ٫٫ ٫٫
دس انعامات پچاس پچاس روپے ۵۰۰
میزان ۷۵۰۰ ٫٫

مقابلہ کے متعلق شرائط

۱ N
۲ A
۳ V
۴ A
۵ R
۶ O
۷ Z
۸ I

آٹھ الفاظ کا کوئی فقرہ یا محاورہ لکھئے۔ جسکا ہر لفظ مندرجہ ذیل آٹھ حروف میں سے ایک حرف کیساتھ شروع ہوا ہو NAVAROZI اور اس فقرہ یا محاورہ میں نوروزی تعویذ کی مناسب تشریح ہو۔ سب سے بہترین منتخبہ مقولہ یا محاورہ بھیجنے والے کو پانچہزار روپے انعام دیا جائیگا۔ دوسرے درجہ پر رہنے والے کو پندرہ سو روپے ملینگے تیسرے درجہ والے کو پانسو روپے۔ اسکے علاوہ پچاس پچاس روپے کے دس انعامات اور ہیں۔ حبیب اللہ صاحب بذات خود مقولوں کا انتخاب کریں گے اور انعامات کا فیصلہ کرنیوالے اور اس مقابلہ کے سلسلہ میں ہر بات کے متعلق وہ واحد منصف ہوں گے

ایسا موقع عمر بھر میں ایک ہی آتا ہے

آپ کیلئے پانچہزار روپیہ نقد حاصل کرنیکا یہ حیرت انگیز موقع ہے۔ آپ چند منٹ صرف کرکے اس بڑی نقدی کے انعام کو حاصل کرسکتے ہیں صرف ایک فقرہ یا مقولہ مندرجہ ذیل طریقہ کے مطابق بھیجدیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ آپ ہی کی کوشش کامیاب ہو تب آپکی قسمت چمک اٹھیگی اور پانچہزار روپے آپ کا انعام ہوں گے

بہت آسان سی کوشش کرکے ساڑھے سات ہزار روپے جیت لیں

پہلے ایسا کیجئے کہ نوروزی تعویذوں کے متعلق آپ جتنی واقفیت حاصل کرسکیں کرلیں کہ انکا کیا اثر ہوتا ہے پھر آپ اس قابل ہونگے کہ ایک ہی فقروں میں نوروزی طاقت کی تشریح کرسکیں اور یہ مقولہ مذکورہ بالا طریقہ پر بنایا جائے

(۱) مقابلہ ہر ایک کیلئے کھلا ہے۔ جو اشخاص پہلے ہی نوروزی کے معتقد ہیں۔

نوروزی تعویذوں کے استعمال کرنیوالے کیا کہتے ہیں!

آپکا تعویذ پہننے کے بعد مجھے فوراً اطلاع ملی کہ مدراس گورنمنٹ نے بحال ہی میں احکام دئے ہیں جنکے مطابق میری اپنی جگہ قائمقام سب انسپکٹر پولیس کے عہدہ پر بحال کردیا گیا ہوں.

یہ تحریر مدراس پریزیڈنسی کی ایک سب انسپکٹر پولیس کی ہے مورخہ ۸ فروری سنہ ۱۹۳۳ء (پورا نام پتہ میرے دفتر میں آکر دیکھا جاسکتا ہے)

تعویذ نمبر ۳ جو آپنے مجھے جون میں بھیجا تھا میرے لیے بہت فائدہ کا باعث ہوا ہے (دستخط) ٹی۔ راجو پلائی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ورنگرام

آتما رام بہت سنگھ اسپیشل فرسٹ کلاس مجسٹریٹ لاڑکانہ (سندھ) آپکا تعویذ نمبر ۵ جو میں نے منگوایا تھا اسنے فائدہ دینا شروع کیا ہے میں آپکا شکریہ ادا کرونگا اگر آپ مجھے اپنا بہترین گاہک خیال کرینگے۔ ہزاروں اور مزید تحریریں میرے دفتر میں دیکھی جاسکتی ہیں

(بقیہ اشتہار دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

فیس داخلہ صرف دو روپے بھیجیں اور جنھوں نے کبھی نوروزی تعویذ حاصل نہیں کیا وہ نوروزی نمبر ا تعویذ کیلئے آرڈر بھیجیں جسکی قیمت تین روپے ہے۔ جو اشخاص نوروزی نمبر ۲ قیمت چھ روپے طلب کرینگے تو وہ دو داخلے (ENTRIES) بھیج سکتے ہیں اگر وہ نمبر ۳ تعویذ جسکی قیمت پچیس روپے ہے طلب کرینگے تو وہ نو داخلے بھیجنے کے مستحق ہونگے۔ نمبر ۴۔ اسپشل جیبی تعویذ منگوانے پر جسکی قیمت پچھتر روپے ہے وہ پچیس داخلے بھیج سکیں گے۔ ایک شخص جتنے بھیجنا چاہے ایک ہی لفافے میں بھیجدے۔

(۲) مقابلہ میں شریک ہونیوالے ہر فقرہ کو علیحدہ کاغذ پر لکھیں اور نیچے اپنا نام اور پورا پتہ تحریر کریں اور اسے لفافے میں بند کرکے اسپر الفاظ نوروزی مقولہ کا مقابلہ (NAVAROZI SLOGAN CONTEST) لکھدیں۔ تمام رقوم بذریعہ منی آرڈر بھیجی جائیں اور روپیہ بھیجنے کے متعلق ڈاکخانہ کی رسید داخلے کیساتھ ارسال کیجائے جہاں سے منی آرڈر نہیں آسکتا وہاں ڈاکخانہ کی ٹکٹ قبول نہیں کیجائینگے۔ برٹش پوسٹل آرڈر شلنگ ۱۔ ۲ پنس فی روپیہ کے اندازہ کے حساب سے بھیجا جائے اور اسپر ترچھے رخ حبیب اللہ صاحب لکھا جائے۔

(۳) ان داخلوں یا دعوؤں کیلئے جو گم ہوجائیں یا کسی اور جگہ چلے جائیں یا دیر سے پہنچیں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کیجا سکتی۔ کوئی خط و کتابت یا ملاقات نہیں ہوسکتی اس مقابلہ کے متعلق تمام امور میں حبیب اللہ صاحب کا فیصلہ بالکل آخری فیصلہ ہوگا جسکی قانوناً پابندی لازمی ہوگی اور یہ داخلہ کی ضروری شرط ہے۔ مقابلہ میں شریک ہونے والا کوئی شخص جو مندرجہ بالا قواعد و شرائط کی پابندی نہیں کریگا مقابلہ سے خارج کیا جائے گا حبیب اللہ صاحب کے ملازموں کو مقابلہ میں شریک ہونے کی اجازت نہیں

(۴) اس مقابلہ میں شرکت کیلئے بھیجی ہوئی فیس داخلہ یا تعویذ وں کے لئے بھیجا ہوا روپیہ کسی حالت میں بھی واپس نہیں ہوسکتا۔ خط و کتابت اور داخلے صرف انگریزی یا اردو زبان میں ہوں

(۵) تمام داخلہ مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجے جائیں (۶) مقابلہ میں شرکت کی آخری تاریخ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء ہے اور نتائج کا اعلان ۱۵ نومبر ۱۹۳۳ء کو کیا جائیگا جو ہندو مدراس۔ بمبئی کرانیکل۔ ہندوستان ٹائمز دہلی۔ لبرٹی کلکتہ۔ رنگون ٹائمز میں شائع کرایا جائے گا۔

نوروزی کیا اثر کرتا ہے

(۱) بیروزگار کو روزگار دلاتا ہے (۲) امتحانات میں کامیابی (۳) مقدموں میں کامیابی (۴) محبت اور شادی کے متعلق آپکی خواہشات کی تکمیل (۵) آپکو دشمنوں پر فتح (۶) بری عادات دفع ہوتی ہیں۔ بری خواہشات کے مقابلہ کی طاقت پیدا ہوتی ہے (۷) کاروبار میں وسیع ترقی۔ آپکی آمدنی کے صندوق میں پیسے کا فائدہ ہوتا ہے۔ اور اگر ملازمت میں ہیں تو جلدی ترقی ہوتی ہے (۸) رہنمائی۔ لیاقت۔ دوسروں پر مقدم ہونا۔ شخصیت اور کیرکٹر میں بہتری۔ افسروں۔ بزرگوں یا درباروں کی طرف سے خاص التفات (۹) غائبانہ ذرائع سے دولتمند ہونا (۱۰) پرانی بیماریوں میں یقینی فائدہ اور بحیثیت مجموعی صحت کی بہتری (۱۱) خاندانی محبت میں افزائش دوستی میل ملاپ میں کامیابی کی خوشیاں۔ خطرات حادثوں اور جادو وغیرہ کے خلاف محافظ

یقینی کامیابی کا نوروزی طریقہ اختیار کریں!

نوروزی تعویذ

وہ طاقت جو مدت دراز سے اس پر اسرار زمین میں موجود تھی میرے جد کو ۱۸۰۰ء میں نوروزی کی شکل میں ملی یہ زندگی کی کامیابی خوشی اور اقبالمندی کی پر اسرار کنجی ہے جسنے ہزاروں کو شیطان کے ہیبتناک چنگل سے چھڑایا ہے اور لاکھوں کو صحت برکت کامیابی اور خوشحالی دی ہے۔ یہی طاقت تعویذ کی شکل میں آپکی زندگی میں چھوڑ جاتی ہے اور آپکی آرزوؤں ترقی اور کامیابی کی طرف حرکت کرنا شروع کرتے ہیں اور آپکو کامیابی اور مسرت کی بلندی پر پہنچا دیگی یہ حقیقت ہے زندگی کی اعلیٰ ترین آرزوئیں سب سے بڑی نعمت جو محض نظری نہیں بلکہ ٹھوس آزمودہ اور عمر بھر کی تو مسرت بخش ہے۔ ہزاروں نے اس طاقت کا استعمال کیا ہے اور اسکی تعریف میں رطب اللسان ہیں

حبیب اللہ صاحب نوروزی مقولہ کا مقابلہ

پوسٹ بکس ۱۴۳ ڈیپارٹمنٹ ۱۴۳ بمبئی

تعویذ اور اُن کی قیمتیں

نمبر ۱۔ مذکورہ بالا (۱) کیلئے فائدہ دیتا ہے چھ مہینے تک اثر رکھتا ہے قیمت چاندی کے لاکٹ سمیت تین روپے

نمبر ۲۔ نمبر ا سے زیادہ طاقت رکھتا ہے مذکورہ بالا (۱) سے (۷) تک بالیقین فائدہ دیتا ہے ایک سال تک اثر رکھتا ہے قیمت سلور لاکٹ کے چھ روپے

نمبر ۳۔ حیرت انگیز نتائج پیدا کرنیکی قابلیت رکھتا ہے نمبر ۲ سے دس گنا زیادہ اثر رکھتا ہے زندگی کا محافظ اور عمر کا ساتھی خوبصورت سونے کے کیس میں ملتا ہے قیمت پچیس روپے

نمبر ۴۔ اسپشل جیبی تعویذ اعتقاد رکھنے والے کی تاریخ پیدائش اور وقت کے مطابق ذاتی برے اثرات کے مقابلہ کیلئے تیار کیا گیا ہے بہت کمیاب جڑی بوٹیاں رکھتا ہے اور ۲ پاؤنڈ کے سونے کے لاکٹ میں نگینہ نصب کردہ ہوتا ہے تمام تعویذوں سے سب سے زیادہ۔ فوری نتائج دکھاتا ہے فرمائش بھیجتے وقت اپنی پیدائش کا وقت یا خط لکھنے کا وقت ضرور دیجئے

نوٹ۔ تمام تعویذ مکمل تفصیلات اور ہدایات کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں (غیر ملکی) قیمت نمبر ا چار شلنگ۔ نمبر ۲ دس شلنگ۔ نمبر ۳ دو پونڈ دس شلنگ۔ نمبر ۴ چھ پونڈ۔ تمام غیر ملکی آرڈر کے ہمراہ برٹش پوسٹل آرڈر یا بنک ڈرافٹ کو ذریعہ رجسٹری کرا کر پوری قیمت بھیجی جائے

سے شام تک سوائے ایک خرگوش مارنے کے چڑیا کا ایک بچہ بھی نظر نہ آیا - گرمی کے مارے ناک میں دم آگیا تھا - بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا - حتیٰ کہ اس روز سلیم بھی کھسیانا ہو گیا

شام کے چھ بجے تھے اور ہم ابھی جنگل ہی میں تھے کہ یکایک آندھی چلنی شروع ہو گئی - اور دیکھتے دیکھتے اس نے اسقدر زور پکڑا کہ ہم مجبوراً ایک ویران شدہ قدیم عمارت میں گھس گئے - اور گھوڑوں کو بھی قریب کے ایک درخت سے باندھ دیا آندھی ختم ہونے پر بارش شروع ہو گئی - اور اسقدر موسلا دھار کہ ہمارا دل دہلنے لگا - بجلی کی کڑک سے اوسان خطا ہوئے جاتے تھے - دس بجے کے قریب یہ طوفان کچھ کم ہوا ——— تاہم بجلی کی چمک باقی تھی - اور ایک خاص وقفہ کے ساتھ اندھیرے میں اجالا کر کے عجیب منظر پیش کر دیتی تھی - روشنی ہونے پر ہم نے دیکھا تو سوائے پانی کے اور کچھ نظر نہ آیا - کچی سڑک کے نشانات بھی کسی قدر گم ہو گئے تھے - ایسی عالت میں گھر پہونچنا آسان کام نہیں تھا - علاوہ تاریکی کے اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ اگر بارش دوبارہ آگئی تو پناہ لینے کے لئے کوئی جگہ بھی نہیں ملے گی - لہذا یہ فیصلہ کیا کہ قریب کی سرائے میں رات بسر کی جائے - یہ سرائے اس جگہ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی - وہاں عموماً گھوسی ٹھیرا کرتے تھے - جو علی الصباح قریب وجوار کے گاؤں میں اپنے مویشی لے جا کر دودھ فروخت کرتے تھے

——— ہم نے گھوڑوں کی باگ پکڑ لی - اور پا پیادہ سرائے کی طرف روانہ ہو گئے

سرائے کا دروازہ بند ہو چکا تھا - کیونکہ چوکیدار کو اب کسی اور مسافر کے آنے کی امید نہیں تھی - تاہم کنڈی کھٹکھٹانے پر دروازہ بہت جلد کھل گیا - چوکیدار نے ہمارے گھوڑے ایک سائبان کے نیچے باندھ دیئے اور سب سے بڑا کمرہ سونے کے لئے دیدیا - جو اس وقت کی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت غنیمت تھا

زین کے ساتھ بندھے ہوئے تھیلے میں کچھ سامان خورد و نوش موجود تھا - مگر ہم نے کچھ نہیں کھایا - کیونکہ دن بھر کی تکان سے ہاتھ پاؤں میں درد ہونے لگا تھا - بہت جلد آرام کرنا چاہتے تھے - بستر موجود نہ تھا - اس لئے مجبوراً کھری چارپائی پر سونا پڑا - چوکیدار ایک کمبل دے گیا تھا جسے سلیم نے اوڑھ لیا - اور میں نے محض مچھروں سے بچنے کے لئے ایک چادر تان لی - بارش ہونے کے باعث ہوا میں معمولی خنکی پیدا ہو چلی تھی

معلوم نہیں - کس قدر رات گذری تھی کہ مجھے ایک خواب دکھائی دیا ——— نہایت بھیانک - اور پریشان کن خواب ——— اب بھی میں اس کو یاد کرتا ہوں تو ایک ہولناک کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی ہے - وہ خواب کیا تھا - ایک اسرار سربستہ تھا - جس کی حقیقت آج تک معلوم نہ ہو سکی - میں نے اپنی زندگی میں بہت سے خواب دیکھے ہیں مگر اس شان کا کوئی بھی نہیں تھا اور نہ شاید آیندہ کبھی دیکھونگا - میں نے دیکھا کہ ایک عالیشان کمرہ جو مغربی ساز و سامان سے مزین ہے میں ایک خوشنما میز کے قریب آرام کرسی پر لیٹا کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہوں - اور میرا دوست سلیم ایک آرام دہ صوفہ پر بے خبر سو رہا ہے - کافی رات

گذر جانے کے باوجود مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ کیونکہ کتاب نہایت دلچسپ تھی
یکایک ایک دھماکے کے ساتھ بجلی کا قمقمہ پھٹ گیا۔ اور تمام کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ میں ابھی اس کی حقیقت کو سمجھنے میں کامیاب نہ ہوا تھا — کہ مقابل کی کھڑکی میں روشنی نمودار ہوئی۔ ایک عورت ہاتھ میں مشعل لئے کھڑی تھی۔ اور ایک نوجوان حسین لڑکی اس کے پاس تھی — کھڑکی میں سے ایک موٹی رسی لٹکائی گئی۔ اور بوڑھی عورت مشعل لئے ہوئے نیچے اترنے لگی۔ اس کے بعد وہ لڑکی بھی اتر آئی
دبے پاؤں دونوں ہماری طرف آرہے تھے۔ میں خوفزدہ حالت میں جوں کا توں لیٹا رہا۔ سلیم کے قریب آکر نوجوان عورت نے مشعل کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔ اور ایک دم بول اٹھی
"بے شک یہی ہے۔ یہی ہے۔ میں نے پہچان لیا"
ضعیفہ نے پوچھا۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"
حسینہ نے حقارت آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ "میرا ارادہ وہی ہے جو بروئے انصاف ہونا چاہیے۔ اس شخص نے مجھ سے محبت کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر اُسے نباہ نہ سکا۔ اس نے میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ اور اب ایک دوسری عورت کو زینتِ آغوش بنانے کے لئے تیار ہے۔ کیوں نہ میں بھی اس کی آرزوؤں کو خاک میں ملا دوں؟ — میں اس سے انتقام لوں گی — ایک زبردست بے پناہ انتقام — جو اس کی ہستی کو نیست و نابود کر دے — اس نے میرا دل دُکھایا ہے — میں بھی اس کا دل دکھاؤں گی۔ اس طرح کہ مرنے کے بعد اس کی روح بھی پریشان رہے۔ ابھی چشم زدن میں اس کا سینہ چیر کر دل نکالے لیتی ہوں — اور اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی — اس بیوفا دل کو"
— میرا تمام جسم کانپ اٹھا۔ مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ زبان سے ایک لفظ نکال سکوں
حسینہ نے ایک خنجر نکالا — جس کو اپنی قمیص کے نیچے کمر کی پیٹی میں چھپا رکھا تھا۔ خنجر کی تیز چمک نے میری آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے چکاچوند پیدا کر دی۔ اور میں ایک بار پھر کانپ اٹھا اس کے بعد اس نے اپنی جیب میں سے اسفنج کا ایک بڑا ٹکڑا نکالا اور اس کے دو حصے کر دیے — ایک چھوٹا اور ایک بڑا — اس نے کمرے میں رکھی ہوئی صراحی کا گلا توڑ کر بھی ایک پیالے کی شکل میں تبدیل کر دیا — سب کام سے فارغ ہو کر وہ اپنے زبردست انتقام کے لئے تیار ہو گئی — اس نے مشعل قریب لانے کے لئے بڑھیا کو اشارہ کیا — اس کی آنکھیں غیظ و غضب کے باعث سُرخ ہو رہی تھیں — اور میرا دوست دُنیا و مافیہا سے بے خبر چین و آرام کی نیند سو رہا تھا — میں نے دیکھا کہ اس کے لبوں پر خفیف تبسم رقص کر رہا ہے
میں نے اٹھنے کی کوشش کی تاکہ اس کو اس حادثہ جانکاہ سے بچا سکوں — مگر پاؤں جنبش نہ کر سکے — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی غیر مرئی زنجیر سے جکڑے ہوئے ہیں — یکایک کمرے کی دُھندلی روشنی میں خنجر بلند ہوا اور بائیں

جانب دو پسلیوں کے درمیان سینہ کو چیرتا ہوا سلیم کے جسم میں اُتر گیا ——— میری آنکھیں خوف سے بند ہونے لگیں - اور باوجود انتہائی کوشش کے میرے منہ سے کوئی چیخ نہ نکلی — میں چاہتا تھا کہ دوسرے لوگوں کو خطرہ کی اطلاع دے کر موقعۂ واردات پر بلا لوں

خنجر کے باہر نکلتے ہی خون بہنا شروع ہو گیا - مگر اس قاتلہ نے ایک قطرہ بھی پلنگ کی چادر پر گرنے نہ دیا - بلکہ اسفنج کے ایک ٹکڑے میں جذب کر کر کے مٹی کے پیالے میں جمع کر لیا — وہ یقیناً نہایت ہوشیار اور دور اندیش تھی - جب خون کی رفتار کم ہو گئی - تو اس نے زخم کے اندر اپنی انگلیاں ڈال کر سلیم کا دل باہر نکال لیا ——— الٰہی توبہ ! وہ خون میں لت پت تھا - اور باہر نکل آنے کے باوجود اس کی حرکت بند نہ ہوئی تھی — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ محبت کی شیریں جفاؤں سے متاثر ہو کر اب بھی سینہ ہی کے نیچے دھک دھک کر رہا ہے - اس نے دل کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا - میں نے دیکھا کہ اس وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے - اور جسم میں بھی خفیف تھرتھری پیدا ہو گئی تھی - اس نے نہایت بیتابی کے ساتھ اپنے کپکپاتے ہوئے لب خون آلود دل پر رکھ کر ایک طویل بوسہ لیا اور . . . . . . میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ دو موٹے موٹے آنسو اس کی خونیں آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر آ گئے ہیں - کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایسے بے رحم دل میں بھی ہمدردی کا مادّہ موجود ہو ؟ ——— کیا یہ درست ہے کہ عورت کے دل میں جس قدر آتش انتقام ہوتی ہے - اتنے ہی زیادہ محبت کے لطیف جذبات بھی ہوتے ہیں ؟ ——— کیا درحقیقت صنفِ نازک فطری طور پر یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے محبوب کی محبت میں کوئی دوسری عورت شریک ہو ؟

ہاں میں یہ بیان کرنا بھول گیا کہ اس دوران میں بڑھیا اسفنج کے اندر خون جذب کر کر کے پیالے میں نچوڑ رہی تھی - اور جب خون کا رسنا بالکل بند ہو گیا - تو اس نے اسفنج کا دوسرا ٹکڑا پسلیوں کے درمیان رکھ کر زخم کے منہ کو بند کر دیا - اور کوئی ایسی چیز اس پر مل دی کہ نشان بھی غائب ہو گیا

حسینہ نے ایک طویل حسرت بھری نگاہ میرے دوست پر ڈالی اور چلنے کے لئے تیار ہو گئی ——— بڑھیا نے اس کا بازو پکڑ کر میری طرف اشارہ کیا - مگر اس نے لاپروائی سے یہ کہہ کر ٹال دیا

" اس کی فکر نہ کرو — یہ مُردے سے زیادہ بدتر اور مٹی کے بُت سے زیادہ غیر حساس ہے - یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا "

اور واقعی اس کا قول دُرست تھا - میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے ——— اور سوائے قلب کی خفیف حرکت کے کسی چیز میں جنبش نہیں تھی

اس نے ایک بار پھر مُڑ کر دیکھا - اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے - اور چہرہ کا اڑا ہوا رنگ اس کے سوزِ دل کا پتہ دے رہا تھا - صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت اس کو روحانی انقباض شدید حاصل ہو رہا ہے - وہ اپنے کئے پر پشیمان نہیں تھی - مگر اظہار افسوس ضرور کر رہی تھی - کچھ دیر سکوت کے بعد اس کے لبوں کو جنبش ہوئی اور اس نے کپکپاتے ہوئے لہجہ

میں کہا

" میں نے اس بے وفا کا دل چرالیا مگر ابھی آتش انتقام سرد نہیں ہوئی - خدایا! میری تمنا ہے کہ اس کا مردہ جسم بھی دریا کے خونخوار جانوروں کا لقمہ بنے، اگر میرے گرم گرم آنسو اور انفاس سوزاں تیری بارگاہِ عظمت وجلال میں پذیرائی حاصل کرسکتے ہیں تو اے میرے مالک! میری آخری آرزو قبول کرلے "

—— اس نے آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھولی اور بڑھیا کے ہمراہ مشعل کی مدھم روشنی میں باہر نکل گئی - کمرہ تاریک ہوگیا

اب میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ صبح ہوتے ہی یہ راز فاش ہوجائے گا۔ اور تمام دنیا کو سوائے میرے کسی پر شبہ نہیں ہوگا - کیونکہ سلیم کے ساتھ میں نے تمام رات بسر کی تھی۔ اگر میں یہ بیان بھی کروں کہ ایک پُراسرار عورت نے کھڑکی کی راہ آکر اس کو قتل کردیا ہے تو کوئی باور نہیں کرے گا۔ لہٰذا اپنی جان کی حفاظت ضروری ہے - چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ جتنی جلد ممکن ہوسکے یہاں سے فرار ہو جانا چاہیئے - ورنہ پھانسی کے تختے پر چڑھنا ہوگا

میں اٹھا - میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں - سلیم پر غور سے نگاہ ڈالی - کمرے کی تاریک فضا میں یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ وہ بے خبر سو رہا ہے یا موت کی آغوش میں پہونچ چکا - اس کی موت یقینی تھی کیونکہ سینہ چیر کر دل نکالا جاچکا تھا جس کی حرکت وسکون پر حیات وممات کا انحصار رہتا ہے —— دروازہ کھلا ہوا تھا —— میں دبے پاؤں باہر نکل گیا - تمام فضا تاریک اور سنسان تھی - میں صدر دروازہ کی طرف بڑھتا چلا گیا، یکایک چوکیدار کی آواز سنائی دی

" کون ہے ؟ "

میں ایک دم ٹھٹک کر رہ گیا —— اب معلوم ہوا کہ کسی نے قوتِ گویائی سلب کرلی ہے - جسم میں بھی رعشہ پیدا ہوگیا تھا - مگر دل کڑا کرکے حواس درست کئے اور میں نے جواب دیا

" ایک ضروری کام کے باعث میں بہت سویرے جانا چاہتا ہوں تم اپنا کرایہ لے لو - اور گھوڑا اصطبل کے باہر نکال دو "

اس نے اندھیرے ہی میں لیٹے لیٹے مخمور لہجہ میں جواب دیا

" جب تک صبح کا اُجالا نمودار نہ ہو، تم نہیں جاسکتے یہ ہمارا دستور ہے کہ مسافروں کو آدھی رات کے وقت روانہ ہونے کی اجازت نہیں دیتے —— بالفرض کوئی حادثہ وقوع پذیر ہو جائے تو اس کے ذمہ دار ہم لوگ ٹھیرائے جائیں گے -

ہوسکتا ہے کہ تم اپنے ساتھی کا مال چُرا کر یا اس کو قتل کرکے رات کی سیاہی میں فرار ہو جانا چاہتے ہو اگر یہ خیال درست نکلے تو اس صورت میں چوری یا قتل کا ذمہ دار کون ہوگا ظاہر ہے کہ پولیس ہم کو حراست میں لے لیگی "

غنیمت ہے کہ اس جگہ اندھیرا تھا اور چوکیدار میرے دلی اضطراب کو —— جو تمام جسم کی کپکپاہٹ میں ظاہر ہو رہا تھا —— محسوس نہ کرسکا —— ورنہ وہ اسی وقت کھٹک جاتا - اور شاید اپنے شبہ کو دور کرنے کے لئے میرے ہمراہ کمرے میں چلا

آتا ــــ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کیا درحقیقت کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا
مایوس ہو کر میں واپس کمرے میں آیا - کواڑ بند کئے - اور اسی آرام کرسی پر لیٹ گیا - قلب کی حرکت بڑھی ہوئی تھی - اور تمام معصومیت کے باوجود میں خود اپنے آپ کو گنہگار تصور کرنے لگا تھا - دنیائے تخیل میں پولیس کے سپاہی خاکی وردیاں پہنے نظر آرہے تھے - پھانسی کا تختہ بھی دکھائی دے رہا تھا - اور کوئی سرگوشی کرتے ہوئے کسی سے کہہ رہا تھا
"بے شک مقتول کا ساتھی ہی اس جرم کا مرتکب ہے"
میں اسی قسم کی ادھیڑ بن میں محو تھا - یہاں تک کہ غنودگی طاری ہونے لگی

"کھٹ کھٹ ....کھٹ کھٹ ...."
دروازے کے کواڑ زور سے بج رہے تھے - کہ میری آنکھ کھل گئی - طلسم خواب ٹوٹ چکا تھا - میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی ــــ سرائے کا وہی کمرہ تھا - جس میں میں اور سلیم پناہ گزیں ہوئے تھے - اب نہ وہ عالی شان کمرہ تھا - اور نہ وہ قیمتی ساز و سامان - بارش تھم گئی تھی - ایک چھوٹے سے روشندان میں سے سورج کی شعاعیں اندر آرہی تھیں - جن میں خاک وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے ذرات چمکتے رقص کرتے نظر آرہے تھے ــــ آفتاب کافی طلوع ہو چکا تھا - میں نے صرف ایک لمحہ میں ان تمام گرد و پیش کی چیزوں پر نظر ڈال لی - اور اٹھ بیٹھا، کیونکہ باہر کی طرف سے کوئی مسلسل کواڑوں کو پیٹ رہا تھا
میں نے اٹھ کر کنڈی کھولی - چوکیدار میری نظر کے سامنے تھا - معاًرات کا سارا خواب میرے تصور میں آگیا - اس نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا
"یوں تو آپ کو بہت جلدی تھی کہ آدھی رات کو مجھ سے گھوڑا طلب کر رہے تھے - مگر اب جبکہ کافی دن چڑھ گیا تھا ــ آپ بیدار ہونے کا نام نہیں لیتے - آئیے آپ کے گھوڑے تیار ہیں"
میں عجیب اضطراب کے عالم میں تھا - رات کے واقعات کو خواب سے تعبیر کروں یا حقیقت سے؟ یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا ــ تاہم میں نے یہ کہہ کر اُسے ٹال دیا کہ "ہم ابھی آٹھ دس منٹ میں آتے ہیں - تم باہر چل کر ٹھیرو"
میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی موجودگی میں سلیم کو بیدار کرنے کی کوشش کروں ــــ چوکیدار کے الفاظ سنکر میں رات کے واقعات کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنے لگا تھا　میں تنہائی چاہتا تھا - بالکل تنہائی - تاکہ اگر سلیم مردہ پایا جائے تو فرار کی کوئی ترکیب نکالی جا سکے - اس کے چلے جانے کے بعد میں نے آہستہ سے کمبل کا کونہ اٹھا کر سلیم کا جسم ٹٹولا - وہ بالکل سرد تھا - اور مجھے پسینہ کی سی نمی محسوس ہوئی - میرا جسم کانپ اٹھا تھا - مگر پھر بھی میں نے دل کڑا کر کے اس کو زور سے جھنجھوڑ دیا
سلیم نے کسمسا کر کروٹ لی اور جمائی لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں - میں نے بے چینی کے ساتھ دریافت کیا
"کیسی طبیعت ہے؟"

اس نے لاپرواہی سے جواب دیا

" اچھی طرح ہوں - ابھی خمار باقی ہے "

وہ بھی اٹھ بیٹھا ــــ اور میرے کہنے پر بہت جلد واپس چلنے کے لئے تیار ہو گیا ــــ ہم دونوں باہر آئے - اور مقررہ کرایہ ادا کرکے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے ــــ ہمارا رُخ شہر کی طرف تھا - رات کو کچھ نہ کھانے کے باعث بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی - پھر بھی میں خاموش تھا - مگر سلیم سے برداشت نہ ہو سکا ــــ وہ دریا کے پُل کے قریب ایک سبز قطعہ دیکھ کر گھوڑے پر سے اُتر گیا - تاکہ باقی ماندہ ڈبل روٹی اور مکھن سے تھوڑا ناشتہ کر لیا جائے

مجھے بھی کافی بھوک محسوس ہو رہی تھی - مگر روٹی کے لقمے حلق سے نہ اتر سکے - ابھی تک میرے دل پر دہشت طاری تھی کھانا کھاتے ہوئے سلیم نے کہا

" تم نے غلطی کی کہ مجھے جگا دیا ، میں ایک خواب دیکھ رہا تھا - نہایت پُرلطف خواب "

" خواب " ! میں نے چونک کر پوچھا " کس قسم کا خواب ؟ "

" وہ ناتمام رہ گیا ــــ میں صرف اس قدر دیکھنے پایا تھا کہ ایک شخص میری جان لینے کے درپے ہے - اور طرح طرح سے میری گھات میں لگا ہوا ہے ــــ اس کے بعد کچھ نہ دیکھ سکا - تم نے جگا دیا تھا "

" سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا اسرار ہے - ایک ہی موضوع کا خواب میں بھی دیکھتا ہوں اور تم بھی - اور اسی کا ایک جزو چوکیدار کو دکھائی دیتا ہے "

پھر میں نے رات کا تمام خواب سلیم کے سامنے بیان کر دیا ــــ وہ بجائے ڈرنے کے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا

" دن کو زیادہ تھک جانے کے بعد عموماً رات کا ابتدائی حصّہ بے خبری کی نیند میں اور باقی حصّہ بھیانک خواب دیکھنے میں گذرتا ہے "

" لیکن یہ تو بتاؤ کہ کیا درحقیقت کوئی عورت تم سے محبّت کرتی ہے ــــ اور تم اس کی طرف مائل نہیں ہو "

" ہاں " ــــ اس کا چہرہ .... ایک دم سنجیدہ ہو گیا ــــ " تمھارے خواب میں کسی قدر واقعیت ضرور ہے ــــ میں ایک حسینہ کے دامِ محبّت میں مبتلا ہوں - اور دوسری طرف میری خالہ زاد بہن مجکو اپنا گرویدہ بنا لینا چاہتی ہے - یہ بھی صحیح ہے کہ میں نے ایک مرتبہ غلطی سے اس کے سامنے اظہارِ محبّت کر دیا تھا ــــ مگر مجھے یقین ہے کہ اس عشق کا انجام تلخ نہیں ہو گا "

تاہم مجھے اطمینان نہ ہوا - اور اپنے شکوک کو رفع کرنے کے لئے اس کے سینہ کی بائیں پسلیوں کو گھور کر دیکھنے لگا - تعجب ہے کہ وہاں کوئی نشان نہیں تھا

(۵) اس لئے روایات مابعد کے تفصیلی واقعات کتاب ارد وراف نامک سے ماخوذ ہیں

مولوی عبد المالک صاحب کا بیان

(۱) معتبر راویوں نے بیان کیا ہے کہ خود پیمبر صاحب نے تفصیلی واقعات معراج کے بیان فرمائے ہیں
(۲) پیمبر صاحب اور اُس زمانے کے عرب پہلوی زبان سے واقف نہیں تھے
(۳) اس لئے معراج کے تفصیلی واقعات اردِ وراف نامک سے اخذ نہیں کئے گئے ہیں

فاضل ایڈیٹر نگار کی بحث

(۱) ڈاکٹر ٹسڈل کے اعتراض کا مدعا یہ ہے کہ واقعۂ معراج کوئی حقیقت نہیں رکھتا
(۲) ڈاکٹر ٹسڈل کی اس بحث کا کہ واقعاتِ معراج پرانی کتابوں میں درج ہیں اور انھیں سے ماخوذ ہیں، معقول جواب نہیں دیا جاسکتا
(۳) اس لئے واقعۂ معراج کو رسول اللہ سے منسوب کرنا اُن کو جھوٹا قرار دینا ہے اور
(۴) یہ ماننا لازم آئے گا کہ دوسرے نبیوں کو بھی معراج ہوئی یا
(۵) یہ ثابت کرنا ضروری ہوگا کہ پرانی کتابوں میں کوئی ایسا بیان درج نہیں ہے جس کا ذکر ڈاکٹر ٹسڈل نے اپنے مضمون میں کیا ہے
(۶) رسول اللہ کو غلط بیانی کے الزام سے بچانے کے لئے روایات متعلق معراج کو موضوع قرار دینا مناسب ہوگا

نوٹ متعلق اعتراض ڈاکٹر ٹسڈل

(۱) ڈاکٹر ٹسڈل نے واقعۂ معراج کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کسی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اور نہ اُس کے متعلق کوئی بحث کی ہے۔ اس کے برعکس اوس نے واقعۂ معراج کو پیمبر صاحب کے خواب پر امکان کے طور پر مبنی ہونا تسلیم کیا ہے
(۲) اگر دو جگہ ایک سے بیان درج ہوں اور وہ مختلف زمانوں کے ہوں تو یہ نتیجہ لازمی طور سے نہیں نکلتا کہ بیان مابعد بیان ماسبق سے اخذ کیا گیا ہے۔ جب تک کہ معتبر شہادت سے اوس کا اخذ کیا جانا ثابت نہ کیا جائے چونکہ ڈاکٹر ٹسڈل نے ایسا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے اس لئے اوس نے جو استنباط کیا ہے وہ محض ایک قیاسی یا ظنی امر ہے جس طرح ممکن ہے کہ قیاس مذکور صحیح ہو اوسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صحیح نہ ہو
(۳) ڈاکٹر ٹسڈل نے اپنا استدلال اس مفروضہ پر مبنی کیا ہے کہ جو شہادت بعد میں میسر آئے وہ محض اس وجہ سے قابل اعتبار نہیں کہ اس کا ذکر کبھی پہلے نہیں آیا ہے۔ اس کے بجائے ڈاکٹر ٹسڈل کو یہ ثابت کرنا چاہئے تھا۔ کہ جن راویوں نے تفصیلی واقعات بیان کئے ہیں اُن کی پیش کردہ شہادت معتبر نہیں ہیں

نوٹ متعلق مضمون مولوی عبدالمالک صاحب

(۱) مولوی صاحب کے مضمون سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ واقعۂ معراج کے متعلق خود اُن کا عقیدہ یا مفہوم یا رائے کیا ہے جس کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے ڈاکٹر ٹسڈل کے مضمون کی تردید کی کوشش کی ہے۔ آپ نے معراج کے جسمانی یا روحانی یا رویائی واقع ہونے کے متعلق تنقید سے کام لے کر یکایک ڈاکٹر ٹسڈل کے مضمون کے اُس حصہ سے بحث شروع کر دی ہے جو معراج کے تفصیلی واقعات سے تعلق رکھتا ہے" تنقیدِ روایات" کے سلسلہ میں آپ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے اس سے اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ آپ کس قسم کی معراج کے قائل ہیں اور کن حالات کے تابع خلاصہ یہ کہ جب تک جواب دینے والے کے پیش نظر خود اس چیز کا مفہوم نہ ہو جس کے متعلق وہ اعتراض کا جواب دے رہا ہے۔ اس وقت تک وہ کیا صحیح جواب دے سکتا ہے ؟ مضمون سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا عقیدہ روایات اولین تک محدود ہے لیکن آپ بحث کرتے ہیں روایاتِ مابعد سے۔ اگر روایاتِ مابعد پر بھی آپ کا عقیدہ ہے تو اس عقیدہ کی تفصیل مضمون میں درج ہونی چاہئے تھی اور اس تفصیل کے ہر جزو کی نسبت یہ ثابت کرنا چاہئے تھا کہ وہ پیغمبر صاحب تک پہونچتا ہے اور عقلاً یا اعتقاداً قابل تسلیم ہے۔ عقلاً سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں جیسے اور معمولی یا غیر معمولی واقعات ہوتے ہیں اسی طرح واقعات معراج کا ہونا ممکن ہے۔ اعتقاداً سے یہ مراد ہے کہ کسی ایسے اصول کے تحت جس کا تعلق ایقانِ قلب یا روحانیات سے ہو ایسے واقعات کا وجود قابل تسلیم ہے

(۲) مولوی عبدالمالک صاحب نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی ایک طریقۂ استدلال مخالفت کے دعوی کو غلط قرار دینے کا ہے لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ ڈاکٹر ٹسڈل کے دعاوی کی تردید کرتے

(۳) مولوی صاحب نے یہ ثابت نہیں کیا ہے کہ جس شہادت کو وہ پیش کرتے ہیں وہ معتبر ہے محض شہادت کا بیان کر دینا اس شہادت کے کافی یا معتبر ہونے کی دلیل نہیں ہے

(۴) مولوی صاحب نے غالباً اس امر پر غور نہیں فرمایا کہ اصولِ شہادت کے اعتبار سے نفی کا اثبات بہت مشکل ہے۔ دعوی یہ کیا گیا ہے کہ اہل عرب یا پیمبر صاحب کو پُرانی داستانوں کا علم نہیں تھا۔ کیا اس قسم کے دعاوی قابل اطمینان طریق پر ثابت کئے جا سکتے ہیں

نوٹ متعلق بحث ایڈیٹر صاحب نگار

(۱) آپ کی تمام بحث اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ واقعۂ اسریٰ یا معراج غلط ہے لیکن آپ نے اس کی کہیں تفصیل نہیں کی ہے کہ کیونکر غلط ہے

(۲) آپ نے یہ تصور کر لیا ہے کہ ڈاکٹر ٹسڈل نے ثابت کر دیا ہے کہ واقعۂ معراج کوئی حقیقت نہیں رکھتا ہے

لیکن خود ڈاکٹر ٹسڈل نے اپنے مضمون میں کسی جگہ ایسا ظاہر نہیں کیا ہے

(۳) آپ نے اپنی بحث میں واقعۂ معراج اور معراج کے تفصیلی واقعات (جو مابعد کی روایات میں پائے جاتے ہیں)، کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ہے ورنہ ڈاکٹر ٹسڈل کا دعویٰ ثابت قرار پاجانے کی صورت میں آپ واقعۂ اسریٰ یا معراج کو غلط نہ فرماتے۔ آپ نے ایسے جملوں کے استعمال سے بھی جن میں لفظ واقعات یا روایات شامل ہے صحیح مفہوم اخذ کرنے کا موقع ناظرین رسالہ کو نہیں دیا ہے ——— مثلاً مولوی صاحب نے بحوالۂ روایات بیانِ معراج کو پیمبر صاحب تک پہونچایا ہے لیکن ایڈیٹر صاحب اُن کی دلیل کو روائتی قرار دیتے ہیں ۔ جہاں تک غور کیا جاسکتا ہے۔ مولوی صاحب نے جن روایات کو پیش کیا ہے وہ بمنزلۂ شہادت ہیں جو سلسلۂ بیان کو پیمبر صاحب تک پہونچاتی ہے اور دیگر مذاہب کی روایات تک (جن کو فاضل ایڈیٹر تسلیم کرانا چاہتے ہیں یا جن کی موجودگی سے انکار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں) وہ خود بیان ہیں کسی امر کا یعنی صورت اوّل میں مولوی صاحب نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک خاص بیان ایک خاص شخص نے کیا ہے صورت ثانی میں سوال کی شکل یہ ہوجاتی ہے کہ کوئی خاص بیان غلط ہے یا صحیح ۔ فاضل ایڈیٹر یہ کہتے ہیں کہ اگر صورتِ اوّل میں اس شہادت کو قابل اعتبار سمجھا جائے تو بیان واقعۂ معراج کو پیمبر صاحب تک پہونچاتی ہے تو صورتِ ثانی میں یہ تسلیم کرلینا لازمی ہوگا کہ دیگر اشخاص کا بھی دعویٰ معراج صحیح ہے۔ بہ ظاہر معلوم نہیں ہوتا کہ یہ نتیجہ کسی غیر مسلم کے نزدیک کس طور سے مستنبط ہوتا ہے

(۴) ڈاکٹر ٹسڈل کے قیاس کو آپ نے یقینی طور پر ثابت تصوّر کرکے معراج کے متعلق روایتوں کو موضوع قرار دینے کا مشورہ بغیر کوئی وجہ بیان کرنے کے دیا ہے۔ کسی غیر مسلم کے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ پیغمبر عربی کو الزام سے بچانے کے لئے معتبر شہادت کو رَد کردے۔ شہادت کو رَد کرنے کے لئے کافی وجوہ علیحدہ ہونا چاہئیں۔ یعنی روایات کو موضوع قرار دینے کے لئے نہ تو ڈاکٹر ٹسڈل کا قیاس کافی ہے اور نہ پیغمبر صاحب کے جھوٹا ثابت ہونے کا احتمال

(۵) اگر دو جگہ دو بیان ایک سے کئے گئے ہوں تو فاضل ایڈیٹر کے نزدیک ایک بیان کو صحیح تصوّر کرنے کی صورت میں دوسرے بیان کو بھی صحیح ماننا لازم ہوگا ۔ یہ کیوں ؟ ممکن ہے کہ ایک جگہ ایک بیان محض تخیّل کی کارفرمائی ہو اور دوسری جگہ دوسرا بیان امر واقعی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بیان کے باور کرنے کی شہادت موجود ہو اور دوسرے بیان کی کوئی تائید نہ ہوتی ہو۔ اگر آج ہم ہوائی جہاز کو امر واقعہ مانتے ہیں تو ہمارے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم مہابھارت اور رامائن کے ہوائی تخت اور الف لیلہ کے اُڑنے والے

قائلین کو بھی اُمورِ واقعی سمجھ لیں۔ فاضل ایڈیٹر کا ڈاکٹر ٹسڈل کی اس رائے سے بھی متفق ہونا پایا جاتا ہے کہ اگر دو بیان دو مختلف زمانوں میں ایک سے کئے گئے ہوں تو بیانِ مابعد لازمی طور سے بیان ماسبق سے ماخوذ ہوگا۔ علاوہ استدلال کی خامی کے یہ ظاہر ہے کہ عبارت معنی اور خیالات کا توارد اکثر ہوتا رہتا ہے۔ عبارت کے توارد کی مثالیں سیکڑوں ہیں۔ خیالات کے توارد کی ذیل میں اسلامی تصوف کی پیدائش اور اُس کا نشوونما ہندی تصوف سے مختارانہ طور پر جداگانہ تسلیم کرلیا گیا ہے اور اگرچہ بابی مذہب کے بہت سے اصول زردشتی مذہب سے ملتے جلتے ہیں لیکن اُن کا زردشتی مذہب سے ماخوذ ہونا اس وقت تک ثابت نہیں ہوا ہے

(۶) ڈاکٹر ٹسڈل نے کتاب اردوراف نامک کا اسلام سے چار سو برس بیشتر تصنیف ہونا بیان کرکے اپنے آپ کو اور اپنے استدلال کو اس طریق پر محفوظ کرنا چاہا ہے کہ اگر زردشتیوں کی روایت کو مان لیا جائے تو کتاب کی تصنیف کا اسقدر زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر آج ڈاکٹر ٹسڈل پر یہ اعتراض کیا جائے کہ کتاب مذکور اس قدر پرانی نہیں ہے تو وہ اپنی شرط کی آڑ جائز طور پر لے سکتا ہے لیکن معلوم نہیں ہوتا کہ مولوی عبدالمالک صاحب اور فاضل ایڈیٹر نگار نے اس بارے میں کیا توجہ فرمائی۔ پہلوی زبان میں صرف گنتی کی کتابیں مذہبی اور غیر مذہبی رائج وشائع ہیں جن میں سے اردوراف نامک بھی ایک مذہبی کتاب ہے۔ تنقیح طلب یہ امر ہے کہ یہ کتاب کب تصنیف ہوئی۔ فاضل ایڈیٹر نگار نے جس طرح ایک دیگر مضمون کے سلسلہ میں مزدک کا زمانہ زردشت کے تو ہزار و صدی بعد کا قرار دیا ہے اُسی طرح وہ اس کتاب کا بھی کوئی زمانہ اسلام سے پہلے کا قرار دے سکتے تھے لیکن بہ ظاہر صاحب موصوف نے ڈاکٹر ٹسڈل کے شرطیہ بیان کو بھی تسلیم کرلیا ہے۔ اس لئے اس بارے میں کسی زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اسقدر ذکر کردینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اس وقت تک محققین کی جو رائے ہے وہ یہ ہے کہ پہلوی زبان کی کوئی کتاب سنہ عیسوی کی آٹھویں صدی سے پہلے کی تصنیف شدہ موجود نہیں ہے اردوراف نامک پارسیوں کا بہشت و دوزخ نامہ ہے۔ اس میں اس جوش مذہبی اور تجدید مذہب کا حال ضرور لکھا گیا ہے جس کا دور ساسانیوں کی حکومت شروع ہونے کے بعد ہوا۔ لیکن اس کتاب کی مانند جو اور کتابیں اس وقت موجود ہیں مثلاً "دین کرت" یا "مینوئے خرد" وغیرہ یہ سب نویں صدی عیسوی اور اوس کے بعد کی تصنیف شدہ کتابیں ہیں۔ ساسانیوں کا زمانہ ۲۰۰ء کے کچھ بعد سے شروع ہوتا ہے اور ۶۵۰ء تک ختم ہوجاتا ہے۔ اس مدت کے آثار میں سے بہ لحاظ زبان پہلوی صرف سکے اور کتبے پائے جاتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی موجودہ کتابوں کی تصنیف آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے کی نہیں پائی جاتی۔ بالفاظ دیگر یہ تمام کتابیں زمانۂ اسلام کی تصنیفات میں سے ہیں۔ ممکن ہے کہ اردوراف نامک پہلے کی تصنیف ہو مگر ڈاکٹر ٹسڈل کا اعتراض تسلیم کرنے سے بیشتر تحقیقی طور پر یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ (۱) یہ کتاب کب تصنیف ہوئی (۲) سورۂ

بنی اسرائیل کب نازل ہوئی (۴) ابتدائی روایاتِ معراج کا زمانہ کب کا ہے اور (۵) روایات مابعد کب سے نقل کی جاتی ہیں

گزارش

واقعۂ معراج سے کسی مسلمان نے اپنے آپکو مسلمان کہہ کر انکار نہیں کیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ ایک صاحب مولوی محمد عنایت اللہ صاحب المشرقی نے اپنی کتاب "تذکرہ" میں سورۂ نجم کی تاویل پیمبر صاحب کے معراج علم وکمال کی ہے اور اس طور سے کی ہے کہ عبارت اور معنی میں بہت کچھ مطابقت پیدا ہو جاتی ہے لیکن سلسلۂ تاویل میں وہ سورۂ بنی اسرائیل کی شروع کی آیت کا مضمون یا حوالہ بالکل حذف کر گئے ہیں۔ یہ آیت اسقدر صاف معلوم ہوتی ہے کہ اس سے گریز ممکن نہیں۔ عبارت صاف ہے کہ اللہ تعالےٰ ایک رات اپنے بندے کو پاک مسجد سے دور کی مسجد کی طرف لے گیا۔ پاک مسجد کو کعبہ مانئے یا کوئی اور مسجد۔ دور کی مسجد کو بیت المقدس کی مسجد مانئے یا کوئی اور مسجد۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک رات میں اللہ تعالےٰ اپنے بندے کو مہینوں کی راہ سے لے گیا اور واپس لایا۔ سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کس طریق سے لے گیا۔ یہ طریقے مولوی عبدالمالک صاحب اپنے مضمون میں ظاہر کر چکے ہیں۔ اسی سورۂ بنی اسرائیل میں آگے چل کر کئی آیتیں ایسی ہیں جن سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ پیمبر صاحب کو رویا کے ذریعہ سے مکاشفہ ہوا۔ مثلاً ایک آیت اس مضمون کی ہے کہ کافروں نے پیغمبر صاحب سے یہ سوال کیا کہ تم آسمان پر چڑھ جاؤ تو پیمبر صاحب کو یہ ہدایت ہوئی کہ وہ منکرین کو ایسا جواب دیدیں کہ میں بشر ہوں۔ ایک آیت کا مضمون یہ بھی ہے کہ جب پیمبر صاحب کو رویا میں اللہ تعالےٰ نے اپنی نشانیاں دکھائیں تو اس امر کا اظہار بھی منکرین کی جانب سے فتنۂ وفساد کا باعث ہوا۔ خلاصہ یہ ہے کہ واقعہ اسریٰ ایسا واقعہ ہے جسکی کسی مسلمان یا غیر مسلمان کے نزدیک کوئی تردید یا تاویل نہیں کی جاسکتی۔ البتہ اس طریقہ کے متعلق تاویل کو گنجایش ہے جس طریقہ سے پیمبر صاحب پر یہ واقعہ گذرا۔ یہ مانکر کہ پیمبر صاحب کو عالم خواب یا عالم بیداری میں مکاشفہ ہوا کون سی وجہ ایسی ہو سکتی ہے کہ اگر ڈاکٹر ٹسڈل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو تفصیلات معراج روایاتِ مابعد میں پائی جاتی ہیں وہ پیغمبر صاحب نے بیان نہیں کی ہیں تو واقعۂ اسریٰ سے انکار کر دیا جائے جیساکہ فاضل ایڈیٹر نگار نے رائے ظاہر کی ہے

آیت اسریٰ کے متعلق جو ابتدائی روایات ہیں اون میں واقعۂ معراج کا بھی حوالہ ہے اور وقوع معراج کے متعلق اس قدر حدیثیں موجود ہیں جن سے (واقعات معراج کی تفصیل کو جُدا رکھ کر) نفس واقعۂ معراج کے متعلق کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا کہ خود پیمبر صاحب کے بیان کے مطابق پیمبر صاحب کو معراج بھی اُسی طرح حاصل ہوئی جس طرح کہ وہ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے جائے گئے

علم روحانیات میں مکاشفہ ممکن الوقوع قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں معجزوں اور سچے خوابوں کے وجود کا

اقرار موجود ہے جب کہ ہم قرآن کو صحیح اللفظ اور صحیح المعنی قرار دیتے ہیں اور جبکہ ماہرین روحانیات مکاشفہ کے امکان کی خبر دیتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اپنے اس دعوی کے پیش کرنے میں شرمائے کہ پیمبر صاحب کو معراج ہوئی خصوصاً جب کہ ایسا دعوی کسی ایسے شخص کے روبرو پیش کیا جائے جو خدا کی ہستی کے راز کو تثلیث پر مبنی سمجھتا ہو اور اُس کی کوئی عقلاً تاویل نہ بیان کر سکتا ہو۔ نیز جبکہ وہ عیسیٰ کی معراج کا قائل ہو تو کیا وجہ ہے کہ اُس کے ظن اور قیاس کا مقابلہ اوسی کے اعتقادی اصولوں اور روحانیات کی دلیل سے نہ کیا جا سکے۔ ایسے شخص سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر خدا میں یہ قدرت تھی کہ اس نے عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا تو اُس کی قدرت میں یہ ضرور داخل ہو سکتا ہے کہ وہ پیغمبر عربی یا اوس کی روح کو اپنی عجائبات کا مشاہدہ کرائے۔ یہ سوال بالکل جداگانہ ہے کہ کیا کیا عجائبات مشاہدہ کرائے گئے۔ ممکن ہے کہ جن روایات میں یہ عجائبات مذکور ہیں اُن میں سے بعض ضعیف ہوں۔ نامعتبر ہوں۔ ناقص ہوں۔ لیکن یہ معترض کا فرض ہے کہ وہ ایسا نقص یا ضعف ظاہر کرے۔ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ فلاں روایت ضعیف ہے یا قابل اعتبار نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی روایات کو قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں رہیگی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ معراج کے بارے میں جو احادیث موجود ہیں اون میں پچھلی تحقیقات کے مطابق صحیح بھی ہیں حسن بھی اور ضعیف بھی۔ اگر زمانۂ حال میں کامل تر تحقیقات ہو سکتی ہے تو ایسی تحقیقات کے کئے جانے میں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا

فاضل ایڈیٹر نگار سے امید ہے کہ وہ اس گذارش اور نوٹس مندرجۂ بالا پر غور کر کے ظاہر فرمائیں گے کہ کیا موجودہ صورت میں ڈاکٹر ٹسڈل کا اعتراض صحیح ہے ——

(نگار) ہمارے فاضل دوست مولوی حکیم احمد صاحب نے واقعۂ معراج پر اظہار خیال فرماتے ہوئے ڈاکٹر ٹسڈل اور مولوی عبدالمالک صاحب آروی کے بیانات پر جو تبصرہ فرمایا ہے، وہ صحیح ہو یا غلط، لیکن میری تحریر سے جو نتیجہ انھوں نے اخذ کیا ہے وہ یقیناً درست نہیں

اگر فاضل مقالہ نگار میری تحریروں کو جو فروری و مارچ ۱۹۳۳ء کے نگار میں شائع ہوئی ہیں بامعان نظر ملاحظ فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ میرا اصل مدعا صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ مولوی عبدالمالک صاحب ڈاکٹر ٹسڈل کے اعتراض کا کوئی شافی جواب نہیں دے سکے۔ کیونکہ ایک روایت صرف اس بنا پر کہ راویوں کا سلسلہ رسول کریم تک پہونچتا ہے، ایک مسلمان ہی کے لئے قابل قبول ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر ٹسڈل یا کوئی اور غیر مسلم کیوں اسے یقین کرنے لگا، وہ تو برملا کہدے گا کہ اگر واقعی یہ بات تمھارے رسول نے کہی ہے تو اور زیادہ ثبوت اُن کے نبی نہ ہونے کا ہے

اس لئے سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ واقعۂ معراج کے متعلق جو تفصیلی روایت مسلمانوں میں رائج ہے۔ اسے آج کی

عقل انسانی قبول کر سکتی ہے یا نہیں ــــــــ آج سے میری مراد علوم و فنون کا دور ترقی ہے جب ریاضیات و فلکیات وغیرہ نے بہت سے معتقدات ماضیہ کو درہم و برہم کرکے رکھ دیا ہے ــــ اب سے تیرہ سو برس قبل جب زمین ساکن اور آسمان متحرک مانا جاتا تھا، جب آسمان کو ایک مادی چیز کی طرح جامد سمجھ کر اسے "طبق علی طبق" باور کیا جاتا تھا، جب کشش زمین اور جذب مرکزی کی حقیقت سے لوگ ناواقف تھے، اس وقت تو اس کا امکان تھا کہ ایک شخص ان سب کو چیرتا پھاڑتا نکل جائے لیکن آج جبکہ آسمان و فلک نام ہے صرف فضائے بسیط کا اس کو کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے

جبرئیل کا براق لے کر آنا اس پر سوار کراکے مسجد اقصےٰ تک لیجانا، وہاں سے سات آسمانوں پر چڑھکر مختلف انبیاء سے گفتگو کرنا۔ اور اخیر میں سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ کر خود ذات باری سے ہمکلام ہونا اور یہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد اس قدر جلد واپس آجانا کہ آپ کا بستر بھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ اور دروازہ کی زنجیر بھی بدستور ہل رہی تھی ــــ کیا سمجھ میں آنے والی باتیں ہیں اور آج کون ہے جو اس کو باور کرے گا

اسریٰ اور معراج کے متعلق جتنی روایات پائی جاتی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معراج کو بالکل دنیاوی سیر و سیاحت کی طرح سمجھا گیا اور آسمانوں کو ٹھوس مادی چیز سمجھ کر وہاں انبیاء کا قیام کرنا بھی تسلیم کیا گیا جن سے رسول اللہ نے باتیں کیں ــــ اور نہ صرف یہ بلکہ خدا کے لئے بھی ایک جگہ متعین کرکے وہاں ایک درخت (سدرۃ المنتہیٰ) کا ہونا بتایا گیا جس کے پتے ہاتھی کے کان کے برابر تھے اور پھل مٹکوں کے برابر ــــ

ظاہر ہے کہ کوئی صحیح العقل انسان ان باتوں کا یقین نہیں کر سکتا اور اگر بقول ہمارے فاضل مقالہ نگار کے "کوئی مسلمان اپنے آپ کو مسلمان کہکر ان واقعات سے انکار نہیں کر سکتا" تو یہ بھی یقینی ہے کہ کوئی صحیح الدماغ شخص "مسلمان" کو کبھی انسان نہیں کہہ سکتا ــ

مجھے سخت حیرت ہے کہ مولوی حکیم احمد صاحب بھی جو "عقل و نقل" دونوں سے کام لینے کی اہلیت رکھتے ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں اور اگر کوئی شخص اس کی لغویت ثابت کرکے رسول اللہ کی ذات سے اس الزام کو دور کرنا چاہتا ہے تو اوسے مخالف اسلام سمجھتے ہیں

اگر فاضل مقالہ نگار مذہب کے باب میں عقل سے کام لینا گناہ سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک مذہب نام ہے صرف سمجھ میں نہ آسکنے والی باتوں کا، تو وہ کم از کم روایتوں ہی کے اختلاف پر غور کرتے، اور انھیں اختلافات کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کرتے، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے یہ بھی نہیں کیا

فاضل مقالہ نگار کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسریٰ اور معراج کے باب میں اتنے اختلافات پائے جاتے ہیں کہ شاید ہی کسی دوسرے مسئلہ میں نظر آتے ہوں اور اسی سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف اس زمانہ میں بلکہ اُس وقت بھی لوگ اس کو صحیح باور کرنے کے لئے طیار نہ تھے

نفسِ معراج و اسراء کے وقوع کے متعلق اختلافات کی مختصر فہرست ملاحظہ ہو:۔

(۱) معراج و اسراء دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں علیحدہ علیحدہ ہوئیں

(۲) معراج و اسراء دونوں ایک ساتھ ہوئیں

(۳) ایک بار اسراء ہوئی اور دوسری بار معراج

(۴) معراج دو بار ہوئی ایک بار بغیر اسراء کے اور دوبارہ معہ اسراء کے

(۵) معراج معہ اسراء کے دو مرتبہ ہوئی

اور لطف یہ ہے کہ ہر شخص اپنے بیان کے ثبوت میں روایات بھی پیش کرتا ہے

اب اُن روایات کو لیجئے جو تفصیل معراج کے متعلق بیان کی جاتی ہیں سو ان کا اختلاف اور زیادہ حیرت انگیز ہے صحاح ستہ کی روایتوں کو یکجا کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس واقعہ کے ایک ایک جزو کے متعلق روایتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ آج یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت اور کس جگہ سے آپ معراج کے لئے لیجائے گئے، ایک فرشتہ آیا تھا یا دو تین، آپ جاگ رہے تھے یا سو رہے تھے براق پر سوار ہو کر گئے یا سیڑھی کے ذریعہ سے جیسا کہ ابن ہشام، طبری اور ابن سعد کا بیان ہے اور کون کون سے پیغمبر کس کس آسمان پر آپ کو ملے،

پھر جب حالت یہ ہے کہ اس عقل و نقل کی حیثیت سے واقعہ معراج کی صحت کا یقین نہیں ہو سکتا تو اس پر اصرار کیوں ہو —— اگر معراج آنحضرت کو بہ حالت خواب ہوئی جیسا کہ بعض کا خیال ہے تو اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں، جسکا اس اہتمام کے ساتھ ذکر کیا جائے کیوں کہ سونے کی حالت میں اس سے زیادہ حیرت انگیز باتیں لوگوں کو نظر آتی رہتی ہیں، اور اگر بہ حالت بیداری مانی جائے تو خیر عقلاً تو محال ہی، نقل و روایت کی رُو سے بھی اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ اس سے زیادہ مہتم بالشان واقعہ آنحضرت کی زندگی کا اور کوئی نہیں ہو سکتا اور اسی کے متعلق اسقدر اختلافات پائے جاتے ہیں

اب رہگیا یہ امر کہ معراج کا خیال زردشتی کتابوں سے لیا گیا یا ہندوؤں کے روایات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ ایک غلط بات خواہ وہ اختراع کی گئی ہو یا کسی کے تتبع میں بیان کی گئی ہو، ہمیشہ غلط رہے گی —— اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم اس کو مان بھی لیں کہ وردرات نامک میں زردشت کی معراج کا ذکر کہیں نہیں پایا جاتا، اور ارجن کی سیاحت آسمانی ہندوؤں کے قدیم لٹریچر میں کسی جگہ بیان نہیں کی گئی، تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمانوں کی روایت معراج کو صحیح باور کر لیا جائے —— اس لئے فاضل مقالہ نگار اگر بجائے اس دور ازکار بحث کے نفس مسئلہ معراج کی تحقیق و تنقید پر اپنا وقت صرف کرتے تو زیادہ مناسب تھا ——

فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت " اسریٰ بعبدہ " کھلی ہوئی شہادت اس امر کی ہے کہ معراج ہوئی، لیکن دبی زبان سے سلسلۂ کلام میں وہ یہ بھی ظاہر کر گئے ہیں کہ معراج غالباً حالت خواب میں ہوئی، لیکن اگر کلام مجید کی تمام آیتوں پر بغیر کسی تاویل کے ایمان لانا فرض ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ معراج بہ حالت خواب مانی جائے کیونکہ الفاظ اسریٰ بعبدہ سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ معہ اپنے جسد ظاہری کے لیجائے گئے بلکہ یہ بھی کہ خود خدا اُن کے ساتھ تھا آیت مذکورہ میں لفظ اسریٰ کے ساتھ (ب) کا صلہ استعمال کیا گیا ہے، درانحالیکہ اسریٰ میں جو تعدیہ پایا جاتا ہے وہ حرف (ب) کے صلہ کا محتاج نہیں۔ اسریٰ عبدہ سے بھی سیر کرانے کے معنی پیدا ہو سکتے تھے، پھر ظاہر ہے کہ ب کا صلہ کسی خاص مفہوم کے لئے لایا گیا ہے اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ خدا خود رسول اللہ کو اپنے ساتھ لے گیا ——— لیکن اگر وہ اس کی کوئی تاویل کر کے معراج جسمانی کے عقیدہ سے منحرف ہونا چاہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرا شخص کوئی اور تاویل کر کے اس آیت کا کوئی اور مفہوم نہ قرار دے ——— کیونکہ معراج منامی کے تسلیم کرنے سے تو بدرجہا بہتر یہی ہے کہ سرے سے اس کا انکار ہی کر دیا جائے، کیونکہ محض خواب میں رسول اللہ کا یہ دیکھنا کہ وہ ہفت افلاک طے کر کے خدا سے ہمکلام ہوئے کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں جس پر کسی رسول یا اس کے متبعین کو ناز کرنا چاہیئے ——— علاوہ اس کے اگر فاضل مقالہ نگار واقعی معراج منامی مانتے ہیں تو پھر بدرجۂ اولیٰ انھیں روایات احادیث کو نہ ماننا چاہیئے جن میں تمام وہی تفصیلات موجود ہیں جو جسمانی سیر و سیاحت کے لئے ضروری ہوتے ہیں ——— مگر کسقدر حیرت ہے کہ وہ ایک طرف احادیث کی صحت کے بھی قائل ہیں۔ اور دوسری طرف معراج کا بہ حالت خواب ہونا تسلیم کرتے ہیں ———

واقعہ یہ ہے کہ کلام مجید میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن میں صرف تشبیہ و استعارہ سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً ید اللہ فوق ایدیہم ، یا خلق السموات والارض وما بینہما فی ستۃ ایام یا وہ تمام آیات جن میں دوزخ و جنت کا ذکر ہے اور غالباً ہمارے فاضل مقالہ نگار بھی یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ واقعی نہ خدا کے ہاتھ ہے اور نہ چھ دن میں آسمان و زمین بن گئے پھر جب وہ کلام مجید کے سمجھنے میں تاویل سے کلیتہً احتراز نہیں کر سکتے تو پھر تاویل کی تعیین و تحدید کے کیا معنی یعنی وہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ فلاں جگہ تو تاویل ہو سکتی ہے اور فلاں جگہ نہیں۔ تاویل اسی وقت کی جاتی ہے جب عقلاً کسی قول کے ظاہری معنی قابل قبول نہ ہوں، پھر جس طرح خدا کے لئے ہاتھ منہ کا ہونا یا کائنات کا چھ دن میں بن کر طیار ہو جانا ایک شخص کے لئے عقلاً قابل قبول نہیں اسی طرح دوسرے کے نزدیک یہ بھی لایق تسلیم نہیں کہ رسول اللہ براق پر سوار ہو کر یا سیڑھی کے ذریعہ سے آسمانوں پر چڑھ گئے ہوں اور یہ فضائی ہفتخواں طے کر کے خدا سے ہمکلام ہوئے ہوں اور وہ گفتگو صرف یہ ہو کہ ان کی امت کے لئے بجائے ۵۰ وقت کے صرف پانچ وقت کی نماز فرض کر دی جائے، درانحالیکہ یہ بات یوں بھی آسانی سے طے ہو سکتی تھی ——— بہرحال احادیثِ معراج یقیناً سب کی سب موضوع ہیں اور رسول اللہ نے کبھی ان واقعات کا اظہار نہیں کیا جو رُوداد بیان کرتے ہیں اور اگر کوئی مسلمان اس کا یقین کرتا ہے کہ واقعی رسول اللہ نے ایسا بیان کیا کہ اپنے جسد ظاہری

کے ساتھ فلک الافلاک تک پہونچکر عرش خداوندی تک بار یاب ہوئے تو وہ رسول اللہ کی توہین کرنے والا ہے اور اگر کوئی شخص صرف معراج بہ حالت خواب کا قائل ہے تو وہ رسول اللہ کی ذات گرامی سے استہزا کرتا ہے کیونکہ نیند میں تو ایک معمولی انسان اپنے آپ کا خدا ہو جانا بھی دیکھ سکتا ہے۔ چہ جائیکہ خدا کے حضور تک پہونچ جانا، اور خواب کی اس کیفیت کو کبھی رسول اللہ اہمیت دیکر بیان نہیں کر سکتے تھے

اب رہا یہ امر کہ معراج کا خیال لوگوں نے کہاں سے لے کر رسول اللہ سے منسوب کیا، اس کے متعلق میں کسی آیندہ صحبت میں اپنی تحقیق پیش کروں گا، کیونکہ علاوہ زردشتیوں کے اور بھی اقوام قدیمہ میں اس قسم کی روایتیں پائی جاتی تھیں اور محض ارداویراف نامک ہی ایک ایسی کتاب نہیں ہے جس میں اس کا ذکر پایا جاتا ہو، حالانکہ ارداویراف نامک بھی عہد قبل اسلام کی کتاب ہے اور پہلوی زبان کی جدید تحقیقات کے سلسلہ میں علاوہ ارداویراف نامک کے اور بھی متعدد مخطوطات عہد زردشت کے دستیاب ہوئے ہیں

شہوانیات　یا　ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

اسمیں فحاشی کی تمام فطری وغیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخ ونفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کے بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے۔ اور ایکبار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز حالات و واقعات درج ہیں۔ کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے —— اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول (۸ر) آٹھ آنے کے مجلد کتاب صرف ۱۲ر میں اور غیر مجلد ۱۰ر میں ملے گی —— اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۲ میں۔ اور غیر مجلد ۱ر میں علاوہ محصول ۸ر کے ملے گی —— اگر ارشاد ہو تو کتاب ذریعۂ وی پی روانہ کی جائے حجم ۳۷۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے ——

مینیجر نگار لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

رہنمائے مقدمات مقدسہ یہ کتاب خانصاحب حاجی محمدؐ اشرف خاں مہتمم خزانہ ڈیرہ اسماعیل خاں کا سفرنامہ ہے جو دوران زیارت اماکن مقدسہ انھوں نے مرتب کیا ہے

ہر چند اس موضوع پر اس سے قبل متعدد کتابیں شایع ہو چکی ہیں اور کوئی اہل قلم ایسا نہیں جس نے سفرحج کے سلسلہ میں اپنے تجربات کو قلمبند نہ کیا ہو، لیکن کم کتابیں ایسی ہیں جو " مجموعۂ تجربات " سے بڑھکر نتائج مطالعہ وتنقید " کہلائی جائیں ــــــ راستہ کی دشواریاں اور اُن کو دور کرنے کی تدابیر، مناسک حج کی تفصیل اور اُن سے عہدہ برآ ہونے کے طریقے، تو ہر شخص لکھ سکتا ہے، لیکن اس محدود سے نکل کر کسی مُلک کے تمدن و معاشرت صنعت و حرفت، اقتصاد و تجارت اور طبعی حالات پر گفتگو کرنا آسان نہیں۔ اس کے لئے ایک خاص دماغ، ایک خاص اہلیت، اور ایک مخصوص ذوق مُطالعہ وتنقید درکار ہے۔ حج کو آسانی سے طے کرادینے والی کتابیں تو بہت نظر آتی ہیں، لیکن حج کو ذریعۂ معلومات بنادینے والی بہت کم ہیں

اس لئے ملک کو فاضل مؤلف کا ممنون ہونا چاہئے کہ ان کا سفرنامہ صرف معمولی ڈائری نہیں ہے جو صرف مناسک حج سے بحث کرتا ہو بلکہ اس میں وہ سب کچھ ہے جس کی ایک نگاہ نکتہ رس اور فہم رمز شناس کو ضرورت ہوسکتی ہے۔ کتاب میں جا بجا تصاویر بھی دی گئی ہیں اور کتابت و طباعت کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب عہ ہیں فاضل مؤلف سے ڈیرہ اسماعیل خاں کے پتہ پر مل سکتی ہے

سیلاب تبسم اس سے قبل جناب شوکت تھانوی کے مضامین کے دو مجموعے موج تبسم اور بحر تبسم کے نام سے شایع ہو چکے ہیں۔ چونکہ موج اور بحر کے بعد تدریجی ارتقاء کے ماتحت ایک سیلاب کی بھی ضرورت تھی، اس لئے یہ تیسرا مجموعہ " سیلاب تبسم " کے نام سے شایع ہوا ہے، درانحالیکہ اس امر میں اختلاف ہوسکتا ہے کہ موج، بحر اور سیلاب میں از روئے فرق مراتب مقدم و مؤخر کی نسبت وہی صحیح ہے جو شوکت صاحب نے سمجھی ہے یا اس کے برعکس ــــــ بہر حال اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ بحر میں سیلاب بھی آتا ہے (درانحالیکہ ایسا نہیں ہوتا) اور موج بھی بحر پر مقدم ہے (جو یقیناً غلط ہے) تو یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ سیلاب کے بعد کی منزل کیا ہوگی۔ خدا کرے وہ نہ ہو جو سیلاب کے گذرنے کے بعد علی العموم ہوا کرتی ہے ــــــ

شوکت صاحب مُلک کے مخصوص مزاحیہ نگاروں میں سے ہیں اور میں ایک سے زائد بار اُن کے رنگ انشاء پر اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہوں ـــــ اس مخصوص طرز تحریر میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ مطالعہ جزئیات، بے ساختگی تحریر اور استدلال شاعرانہ (جو تعبیر وکناہی سے آگے نہ بڑھنے پائے) شوکت صاحب میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں اور اسی لئے اُن کے مضامین کا مطالعہ سنجیدہ طبایع کو بھی ناگوار نہیں ہوتا۔ چونکہ شوکت صاحب اکتسابی مزاح نگار نہیں ہیں بلکہ قدرتاً (معاف فرمائیں) "ہنسوڑ" واقع ہوئے ہیں، اس لئے اُن کے یہاں تصنع و آورد کا پتہ نہیں اور اُن کی کامیابی کا یہی اصل راز ہے

اس مجموعہ میں اُن کے چوبیس مضامین ہیں جو چھوٹی تقطیع کے ۲۸۰ صفحات کو محیط ہیں۔ کتاب مجلد شایع کی گئی ہے اور دو روپیہ میں صدیق بک ڈپو امین آباد لکھنؤ سے مل سکتی ہے جس نے اس کی اشاعت کی ہے

کلیات طغرائی مجموعہ ہے (مرحوم) حکیم فیروزالدین احمد فیروز طغرائی امرتسری کے فارسی اُردو کلام کا جسے جناب تبسم ایم۔اے نے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ شروع میں شاعر کے سوانح حیات بھی درج ہیں اور اُن کے اُردو کلام پر تنقید بھی کی گئی ہے ـــــ یہ مجموعہ اوسط تقطیع کے ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں قصاید و منظومات، قطعات و غزلیات وغیرہ سبھی کچھ پایا جاتا ہے

فیروز طغرائی امرتسر کے اچھے شعراء میں سے تھے اور پنجاب کی وطن پرستی نے انھیں اور زیادہ مشہور کر دیا تھا افسوس ہے کہ میں بالاستیعاب اُن کے کلام کا مُطالعہ نہیں کرسکا لیکن جستہ جستہ ورق گردانی سے میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کا فارسی کلام، اُردو سے بدرجہا بہتر ہے اور کشمیری الاصل ہونے کی وجہ سے فارسیت کے ساتھ انکو زیادہ لگاؤ تھا ـــــ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے کسقدر پاکیزہ ہیں:-

آں ترک نازک ست دگران ست جانِ ما ہم امتحان اوست دمِ امتحان ما
کے جائے ماندن ست بہ بازار عاشقی خالی ست از متاع تحمّل دکان ما

منصور انا الحق زدہ دیگر نتواں گفت حرفے کہ کسے گفتہ مکرر نتواں گفت
زیں سنگ دلیہا کہ بہ بینیم بتاں را نازک نتواں گفت، سمن بر نتواں گفت

از بادہ نوش میکدۂ آرزو مپرس چندانکہ خم کشید رہینِ خمار بود

بے کہ پردہ نشین حریم دل بود ست بہ حیرتم چہ قدر عالم آشنا افتاد

کشیدم در تمنایش من از ہر آرزو دستے چہ خوش لے ناصح ناداں کہ بردارم از و دستے

طغرائی کے فارسی قصائد بھی خوب ہیں اور زور کلام کی اچھی اچھی مثالیں ان میں ملتی ہیں یہ مجموعہ ۱۲؍ میں کتب خانہ طغرائی امرت سر سے مل سکتا ہے

تہذیب عمل مجموعہ ہے ملک محمد باقر نسیم ام، اے گجراتی کے چند مقالات کا جو عملی زندگی کی اصلاح کے لئے انھوں نے وقتاً فوقتاً لکھے تھے —— فاضل مولف کا مقصود اس کتاب کی اشاعت سے یہ ہے کہ ملک کے نوجوان اور خصوصیت کے ساتھ طلبہ اپنی قوت مطالعہ کو بڑھائیں کہ اسی کا نام قوت حافظہ ہے اور یہی مستقبل کی شاہراہ ترقی کہلاتی ہے

غالباً اُردو میں یہ بالکل پہلی کتاب ہے جس میں قوتِ ارادی سے بحث کرکے عملی زندگی میں اس کی غیر معمولی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے

یہ کتاب اس قابل ہے کہ نوجوان طلبہ کے درس میں داخل کی جائے اور مجھے بڑی مسرت ہے کہ جناب نسیم رضوانی نے باوجود جوان ہونے کے اپنے شباب کی رعایت سے سب سے پہلے کوئی فسانہ حسن وعشق شائع نہیں کیا بلکہ کام کی چیز پیش کی ہے۔ جس سے خود اُن کی قوتِ عمل پر کافی روشنی پڑتی ہے یہ کتاب ۶؍ میں دفتر ''تذکرہ'' گجرات سے مل سکتی ہے

میک اَپ جس کا دوسرا نام ''شکل بدلنے کا طریقہ'' بھی ہے۔ یہ ترجمہ ہے کسی انگریزی کتاب کا جسے ''فلم ریویو'' کلکتہ نے شائع کیا ہے —— اس کے مترجم کوئی صاحب عکاس دہلوی ہیں ——

موجودہ زمانہ میں چونکہ صنعت فلم سازی یہاں بھی مقبول ہوتی جارہی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اُردو میں ایسی کتابیں لکھی جائیں۔ اس کی قیمت ۱۲؍ بیشک کچھ زائد معلوم ہوتی ہے

فلسفۂ مذہب

اگر آپ مذہب اسلام کو سمجھ کر اس کی پیروی کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے موضوع کے لحاظ سے اُردو میں بالکل پہلی چیز ہے قیمت عہ

تذکرۂ خندۂ گل

جس میں ۳۰۰ سے زیادہ اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف وظرائف اور انتخاب کلام کے درج ہیں۔ قیمت مع محصول ۱۲؍

منیجر نگار

سرودِ رُوح

چل رہی ہے شام کی ٹھنڈی ہوا گاتی ہوئی
دل کو فرحت، روح کو تسکین پہنچاتی ہوئی

کچھ سنہرے اور شفق گوں بادلوں کے درمیاں
دیدنی ہے ڈوبتے سورج کا کیف افزا سماں

دور تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں کی بہار
کوہسار اور اُن میں اک ہلکا سا نورانی غبار

پیچ و خم کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں میں بے نقاب
حریت کے روح پرور ولولوں کا التہاب

خامشی کے حسن میں نغموں کے ہلکوروں کا رنگ
کیف، رعنائی، لطافت، زندگی، شوخی، اُمنگ

اک مئے جاں بخش سے لبریز ہے دل کا ایاغ
دھل گئے ہیں بادۂ کوثر سے اجڑے دماغ

کیا طرب آموز ہے شاداب جنگل کی فضا
ہو رہی ہے اک مسلسل بارش کیف دُنیا!

چھیڑتی ہے شام جب سازِ نشاط و تازگی
ہر رگِ مُردہ میں دوڑ اٹھتا ہے خونِ زندگی

دور ہو جاتے ہیں یہ تلخ اور غم فزا وہم و قیاس
روح کی موسیقیوں میں ڈوب جاتے ہیں حواس

شام کا مقصد نہیں ہے صرف تخلیقِ جمال
دے رہی ہے بزمِ قدرت دعوتِ فکر و خیال

کر رہا ہے کوئی در پردہ بشر کا احترام
گوشِ دل سے سُن ذرا فطرت کا نورانی پیام

کاش یوں ہموار ہو جائے زمانے کا نظام
کر سکیں منعم غریبوں کا بھی دل سے احترام

عقل صرفِ گمرہی ہے، ہوش وقفِ اختلال
آہ کیا ہوگا ہوس زائیدہ دنیا کا مآل

مذہبِ انسانیت سے ہے خبر کو احتراز
زندگی ہے یا جہنم کی عقوبت کا گداز

ہر بشر کی روح اطمینان سے محروم ہے
کیا زمانے کی ترقی کا یہی مفہوم ہے؟

ہمنشیں دل میں اگر رکھتا ہے احساسِ عمیق
دیکھ عبرت کی نظر سے دہر کے طرز و طریق

کیا یہی دنیا ہے لفظِ "کن" کی جو تفسیر ہے
عشق کے ذوقِ جہاں سازی کی یہ تعبیر ہے؟

وسعتِ تخئیل میں جب ڈوب جاتا ہوں کبھی
اور چھا جاتی ہے دل پر ایک گہری بیخودی

آنکھ سے مستور ہو جاتی ہے بزمِ آب و گل
جگمگا اٹھتے ہیں نورِ فکر سے اعماقِ دل

زندگی کی عظمتوں کے راز ہوتے ہیں عیاں
اور نظر آتا ہے اک پُر امن نورانی جہاں

گو ہنوز اُس سطح پر دنیا کا آنا ہے محال
ہے مرے پیغام میں مضمر حقیقت کا جلال

جب محبت مذہبِ اہلِ جہاں ہو جائے گی
کائنات اک وادیٔ جنت نشاں ہو جائیگی

عدم

نغمۂ محبت

ازل سے درد بہ دل ہوں، جنوں بہ سر ہوں میں
کہ اک غریب، محبت زدہ بشر ہوں میں

ترے خیال میں گم ہو گیا ہے میرا وجود ! !
مجھے کچھ اپنی خبر کیوں نہیں اگر ہوں میں

ہر ایک سانس ہے تشریحِ دردِ دل، صد حیف!
خود اپنے عشق کی رسوائیوں کا گھر ہوں میں

یہ کیا سمجھ کے غمِ عشق دے رہے ہو مجھے
یہ کس نے تم سے کہا صاحب جگر ہوں میں

ازل سے ضامن گردش ہے زندگی میری
یمِ حیات کا چھوٹا سا اک بھنور ہوں میں

محرومی

جفا کا لطف باندازۂ وفا نہ ملا
تمھارے عہد میں مرنے کا بھی مزا نہ ملا

نہ دل سے محو ہوئی آرزو نہ بر آئی
ستم ظریفیٔ فطرت کا مدعا نہ ملا

جنوں سوار تھا سر پر کہ پاؤں توڑ آئے
کچھ اپنی منزلِ موہوم کا پتا نہ ملا

کوئی ٹھکانا ہے دنیا ترے حوادث کا
کہ خود کو ڈھونڈنے نکلے مگر پتا نہ ملا

جناب شیخ! یہ کیا ماجرا ہوا آخر!
سنا ہے آپ کو کعبہ میں بھی خدا نہ ملا

عدم

قطعات

شعر گوئی —

خوں بھرے جامِ اُنڈیلتا ہوں میں　　ٹیس اور درد جھیلتا ہوں میں
تم سمجھتے ہو شعر کہتا ہوں !　　اپنے زخموں سے کھیلتا ہوں میں

یاس میں اُمید —

میرے مایوس دل میں اے اختر !　　اس طرح سے اُمید آتی ہے
جس طرح اک اُداس چہرے پر　　مسکراہٹ سی کھیل جاتی ہے

حُسن و نغمہ —

حُسن ہے ایک نغمۂ دل گیر　　اور نغمہ ہے روح افزا حُسن
دونوں جذبات خیز ہیں یعنی　　حُسن نغمہ ہے اور نغمہ حُسن !

مغنیہ !

اے کہ تو راگنی میں ہے مدہوش !　　اے کہ تو گم ہے مست تانوں میں !
تھم، کہ گیت اپنے بازوؤں پہ مجھے　　لئے جاتا ہے آسمانوں میں !

کیفِ برشگال —

آتشِ غم بھڑک رہی ہے آج !　　میری چھاتی دھڑک رہی ہے آج
ابر ہے، مینھ ہے، ہوائیں ہیں　　میری رگ رگ پھڑک رہی ہے آج

نشاطِ نغمہ —

زمزمہ سنج مطربہ جس وقت　　طرب افزا سُروں میں گاتی ہے
زندگی کی اندھیری راتوں میں　　ایک بجلی سی کوندجاتی ہے

اختر انصاری (بی۔ اے)

شعرائے لکھنؤ سے خطاب

تم سے کچھ کہنا ہے مجکو شاعرانِ لکھنؤ
اس لئے میں چھیڑتا ہوں آج سازِ گفتگو

نیند کے ماتوں کو غفلت سے جگانیکے لئے
غمزدوں کو بادۂ عشرت پلانے کے لئے

مردگانِ ذوق کو دیتا ہے پیغامِ حیات
اے گرفتارانِ غم پابستۂ دامِ حیات

تم نے چکھا ہی نہیں ہے بادۂ مینائے شعر
تم نے دیکھا ہی نہیں ہے جلوۂ لیلائے شعر

شعر کیا ہے قلزمِ عرفاں کی اک موجِ خوش آب
شعر کیا ہے روح کی شانِ جمیلِ اضطراب

شعر کیا ہے جنتِ معنی کی صہبائے طہور
شعر کیا ہے لیلئ مقصد کی تقریبِ ظہور

شعر کیا ہے اک پیامِ جانفزائے زندگی
شعر کیا ہے محفلِ دل میں نوائے زندگی

شعر کیا ہے آتشِ خاموشِ جذباتِ نہاں
شعر کیا ہے شعلۂ بےنام و جوشِ بےاماں

شعر کیا ہے آیتِ انجیلِ تخئیلِ جمیل
شعر کیا ہے عظمتِ ہستئ انسان کی کفیل

شعر کیا ہے منتہائے رفعتِ پروازِ شوق
شعر کیا ہے ایک روح نغمہائے سازِ شوق

شعر اقوامِ جہاں کے حق میں ہے درسِ حیات
ملتوں کو شعر سے ملتی ہے تعلیمِ ثبات

اور تمہارا شعر دنیا کے لئے تعلیمِ خواب
عقلِ انسانی کے حق میں غفلتوں کا ہے حجاب

زندۂ جذبات کو مُردہ بنا دیتا ہے وہ
جاگنے والوں کو بھی آخر سلا دیتا ہے وہ

روح کو پیغامِ کلفت قلب کو پیغامِ یاس
محفلِ عشرت کو کر دیتا ہے مجروحِ ہراس

دیدۂ روشن کو کر دیتا ہے محرومِ بصر
ہے تمہارا شعر ننگِ محفلِ اہلِ نظر

دست بر سینہ جماعت اک گروہ نوحہ خواں
گلستانِ شاعری میں آ گئی تجھ سے خزاں

دشمنِ احساسِ ملت ہے تمہارا ہر کلام
امتِ مرحوم کے حق میں ہے نکبت کا پیام

نزع و تربت کی حکایت قصۂ آہ و بکا
نامرادی کا فسانہ خودکشی کا سلسلا

زندہ ہو کر قوم کو بہرِ خدا زندہ کرو
اس طرح تم شعر کے جوہر کو تابندہ کرو

فکری (سلطانپوری)

غزلیات

اختر انصاری

غمِ حیات کہانی ہے، قصہ خواں ہوں میں — دلِ ستم زدہ ہے راز، رازداں ہوں میں
نظر کے سامنے کوندی تھی ایک بجلی سی : — مجھے بتا و خدارا کہ اب کہاں ہوں میں
خزاں یہ کہتی تھی "میں شوخیٔ بہاراں ہوں" — بہار کہتی ہے "رنگینیٔ خزاں ہوں میں"
مری بلا، غمِ ہستی! اٹھائے تیرے ناز — مجھے نظر نہیں آتا ابھی جواں ہوں میں
شباب نام ہے اس جاں نواز لمحے کا — جب آدمی کو یہ محسوس ہو "جواں ہوں میں"
جہانِ درد والم پوچھتا ہے مجکو، آہ — تپش جبیں ہے، لہو سجدہ، آستاں ہوں میں
وہ دن بھی تھے کہ میں جانِ شباب تھا اختر — اب اپنے عہدِ جوانی کی داستاں ہوں میں

کوکب (شاہجہانپوری)

سجدۂ شکر ہے ہر لغزشِ مستانۂ عشق — جوشِ وحشت میں بھی ہشیار ہے دیوانۂ عشق
مائلِ عرضِ تمنا ہے دل خانہ خراب — المدد المدد اے غیرتِ مردانۂ عشق
شعلۂ آہ نے اک آگ لگا دی دل میں — خستۂ بادۂ سرجوش ہے پیمانۂ عشق
کون کہتا ہے؟ ہوس کو بھی محبت سمجھو! — کافرِ عشق حقیقت میں ہیں بیگانۂ عشق
غیرتِ مہر ہے ہر ذرہ زہے پرتوِ حسن — عین تعمیر تھی بربادیٔ کاشانۂ عشق
شوخیٔ رنگِ تجلی سے ہیں مست اہلِ نظر — بادۂ حسن سے معمور ہے میخانۂ عشق
پھول بن بن کے ہر اک نقشِ تمنا ابھرا — نہ چھپی خاک میں رعنائیٔ کاشانۂ عشق
کیوں نہ ہو حسرتِ ناکام سے دل ذوق پذیر — کیفِ اندوہ تو ہے حاصلِ میخانۂ عشق
دلِ مجروح میں باقی نہیں اک قطرۂ خوں — اور ابھی تشنۂ تکمیل ہے افسانۂ عشق
ایک اک ذرہ ہے "معمورۂ حسرت" کوکب — کون کہتا ہے کہ ویران ہے ویرانۂ عشق

فرخ بنارسی

جورِ الفت نما کو کیا کہیے — اس فریبِ وفا کو کیا کہئے
جلوۂ حسن عام ہے لیکن — نگہِ نارسا کو کیا کہئے
بندگی خود ہے بندگی کا صلہ — طاعتِ بے ریا کو کیا کہئے
دل پہ جب اختیار ہی نہ رہے — نگہِ فتنہ زا کو کیا کہئے
میں نہیں درخورِ کرم نہ سہی — ستمِ ناروا کو کیا کہئے
جھکنے والی تھی کب جبینِ نیاز — کششِ نقشِ پا کو کیا کہئے
ہوئی جاتی ہے گم نظر فرخ — حسن حیرت فزا کو کیا کہئے

معلومات

اشتہاری جدت

مغرب کی جدت پسند دنیا بھی کیسی عجیب وغریب دنیا ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو اُن کی ذہانت اختراع کا ممنون نہ ہو — وہ کتابیں لکھتے ہیں تو اس میں ابداع وجدت سے کام لیتے ہیں اور کتابیں بیچتے ہیں تو اس کے لئے بھی وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی جدت تجویز کرتے رہتے ہیں

حال ہی میں پیرس کے دو نوجوانوں نے مل کر گزشتہ جنگ عظیم کی تاریخ لکھی اور اخباروں میں یہ اعلان کرادیا کہ

> "دونوں مصنفوں میں جنگ کا سبب متعین کرنے میں اختلاف ہوگیا ہے اور یہ اختلاف اسقدر شدید ہوگیا ہے کہ اُن کے درمیان نبرد آزمائی ضروری ہے"

اس اعلان کے بعد وہ دونوں ایک وقت مقرر کرکے آپس میں تلواروں سے لڑے بھی اور جب یہ خبر شائع ہوئی تو لوگوں کو شوق پیدا ہوا کہ اصل کتاب کو دیکھنا چاہیے جس پر دو پڑھے لکھے آدمیوں میں یوں وحشیانہ جنگ ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند دن میں تمام نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئے

فرانس کا غدار مچھر

اب سے ہزاروں سال قبل جب مچھر اور نمرود کے درمیان جنگ ہوئی تھی تو کہا جاتا ہے کہ مچھر جیت گیا تھا، اور اب بھی جبکہ انسان نے یہ جنگ دوبارہ اختیار کی ہے مچھر ہی کی فتح یقینی معلوم ہوتی ہے کیونکہ باوجود جدید ترین ذرائع ہلاکت کے اس وقت تک انسان اس حقیر مگر زبردست دشمن انسان کیڑے کو نیست ونابود نہیں کرسکا

جب سے یہ امر متحقق ہوا ہے کہ ملیریا کا باعث مچھر ہے اس وقت سے تمام متمدن ممالک نے مچھر کے خلاف ایک عام اعلان جنگ کردیا ہے اور مختلف وسائل اس کی تباہی کے لئے اختیار کئے جارہے ہیں۔ خصوصاً امریکہ میں تو حد درجہ جد وجہد اس باب میں کی جارہی ہے

آپ کو معلوم ہوگا کہ حکومت چونکہ مچھر پانی کی سطح پر رہتا ہے اس لئے سمندروں میں اور سواحل پر ایسی چڑیاں، مچھلیاں اور مینڈک پائے گئے ہیں جو مچھر کو بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ لیکن حال ہی میں اہل امریکہ نے سواحل فرانس بڑی تعداد ایسے مچھروں کی فراہم کی ہے جنکی غذا مچھر ہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ بہترین طریقہ مچھروں کی ہلاکت ادھر ادھر

مچھر فرانس سے لائے گئے ہیں ہر چند ان سے ملیریا نہیں پھیلتا، لیکن ہیں بہرحال مچھر ہی اور اس لئے اگر ان کو غدار مچھر کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ کیونکہ یہ خود اپنی ہی جنس کو برباد کرتے ہیں

ایک سیاح عالم کتا چالیس سال قبل امریکہ کی ایک جماعت جو وہاں کے محکمۂ ڈاک سے تعلق رکھتی تھی، اطراف ملک کا دورہ کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا جس کا نام "اونی" تھا یہ کتا ہر جگہ ان کے ساتھ رہتا تھا خواہ موٹر میں ہوں یا پیدل، جہاز پر ہوں یا ریل میں

اس کے بعد اسی جماعت نے یہ تجویز کی کہ تنہا کتے کو سیاحت عالم کے لئے بھیجا جائے، چنانچہ ۱۸ اگست ۱۸۹۵ء کو یہ کتا روانہ کیا گیا اس کے گلے میں ایک تختی ڈال دی گئی جس پر یہ عبارت تحریر تھی :-

"یہ امریکہ کے ایک لاکھ ملازمین محکمۂ ڈاک کا نہایت محبوب کتا ہے
اور ۱۸ اگست کو سیاحتِ دنیا کے لئے روانہ کیا گیا ہے۔ جس کو
یہ کتا ملے براہ کرم اس کی سیاحت میں مدد کرے۔"

الغرض اس طرح اس کتے نے اپنا سفر شروع کیا اور فروری ۱۸۹۶ء میں سیاحت کرکے یہ کتا اپنی جگہ پر واپس آگیا۔

ملکۂ شراب مشرق میں تو ہر وہ عورت جو پیمان وفا باندھ لیتی ہے "گھر کی ملکہ" بنجاتی ہے، لیکن چونکہ مغربی تہذیب کی رُو سے وہاں کی عورت میں سب کچھ ہے مگر یہی نہیں ہے، اس لئے اس کا وہاں ملکہ بننا بھی تفنن سے خالی نہیں

حُسن و جمال کی ملکہ، ملبوسات کی ملکہ، پھولوں کی ملکہ، عطر و لونڈر کی ملکہ، موٹر کی ملکہ — الغرض سبھی قسم کی ملکائیں اس وقت تک وہاں پیدا ہو چکی ہیں، لیکن "ملکۂ شراب" اس وقت تک کوئی نہ ہوئی تھی، سو فرانس نے اس کمی کو بھی پورا کردیا۔ اور مس ایوان جولی کو اس عزت کا مستحق سمجھ کر مجمع عام میں اس کا اعلان بھی کردیا گیا

رہا یہ امر کہ "ملکۂ خمر" ہونے کا کیا مفہوم ہے اور کیوں مس ایوان جولی کا انتخاب کیا گیا، سو اس کے متعلق دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں یا تو یہ کہ اس سے زیادہ شراب پینے والی خاتون فرانس میں کوئی اور موجود نہیں یا یہ کہ اس کے سراپا کی مینائیت یا "میگونی" ایسی ہے جو شراب کے یونانی دیوتا کی یاد کو تازہ کرنے والی ہے

بہ حال جو سبب بھی ہو، "ملکۂ شراب" اب اصنامی و خرافیاتی چیز نہیں رہی، بلکہ دنیا کے ادر حقائق کی ت ہو کر رہ گئی ہے اور ظاہر ہے کہ بادہ خواری کے لئے اس سے زیادہ موثق فتوائے جواز اور کیا پیش کیا

…کا بادشاہ بوہیمیا میں جہاں اور سالانہ مشاغل تفریح ہیں، وہیں ایک مشغلہ یہ بھی ہے کہ جسم

میں سوئی چبھونے کا میچ ہوتا ہے اور جو شخص سب سے زیادہ سوئیاں اپنے جسم میں چبھولیتا ہے اس کو کامیاب سمجھا جاتا ہے

۱۹۳۲ء میں جب یہ سالانہ میلہ قائم ہوا تو ایک شخص نے جس کا نام باگرو ہے اور جو کسی خانہ بدوش قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے تمام اگلے پچھلے رکارڈ توڑ دئے اور دنیا کو حیرت میں ڈال دیا

اس نے تین ہزار دو سو (۳۲۰۰) سوئیاں اپنے داہنے بازو اور کلائی میں چبھولیں اور ۳۱ گھنٹے تک اسی طرح اُن کو رہنے دیا — اس سے قبل کوئی شخص یہ جرأت نہ کرسکا تھا اور نہ آیندہ اس کی امید کی جاتی ہے

ایک لطیف حکایت

مشہور ہے کہ عورت کبھی اپنی صحیح عمر نہیں بتاتی اور یہ سوال اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ اگر وہ اس سوال کا جواب بھی دیں گی تو ہمیشہ اپنی عمر کو کم بتائیگی تاکہ ان کے شباب کی جاذبیت کم نہ ہو

حال ہی میں ایک خاتون کسی موٹر سے ٹکرا گئی اور ناک پر زخم آگیا۔ اس نے موٹر چلانے والے کے خلاف معاوضہ طلب کرنے کا دعویٰ عدالت میں دائر کردیا۔ عدالت نے ڈگری دیدی۔ لیکن موٹر والا بہت ہوشیار تھا، اسنے عذر پیش کیا کہ معاوضہ کی مقدار سن وسال کے لحاظ سے ہونا چاہئے کیونکہ ایک جوان عورت کی ناک اور معمر عورت کی ناک میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ عدالت نے اس عذر پر مدعیہ کو طلب کیا اور حکم دیا کہ اپنی عمر بتائے، لیکن عورت نے معاوضہ سے ہاتھ دھونا تو گوارا کرلیا، لیکن اپنی عمر ظاہر کرنا کسی طرح گوارا نہ کیا

ایک مغربی صحافتی کے کارنامے

مینچسٹر سٹی نیوز کے اڈیٹر "کمنگ وولٹرز" نے حال ہی میں اپنی خدمت سے سبکدوشی حاصل کی ہے۔ انھوں نے ۲۵ سال تک اس اخبار کی خدمت کی اور اس دوران میں انھوں نے بیس کتابیں لکھیں، ۲۵۰ لکچر دئے، ۲۰۰۰۰ افتتاحیہ مقالے لکھے، ۲۰۰۰۰ کتابوں پر تقریظ لکھی، ۱۵۰۰۰ مقالے مختلف موضوع پر لکھے اور ۸۰۰۰ ڈراموں پر تنقید کی —

ہندوستان میں بھی ایسے دماغوں کی کمی نہیں، لیکن قدرت کی طرف سے ایک بڑا مانع دماغی کام کے لئے یہاں کی گرمی ہے جو سال میں ۶ مہینے بالکل ضائع کردیتی ہے۔ برخلاف یوروپ کے کہ وہاں ۲۴ گھنٹے کام کرنے کے بعد دماغ نہیں تھکتا

سلطنت کی بنیاد محبت پر

ترکوں کی حکومت جو کسی وقت دولت عثمانیہ کے نام سے موسوم تھی اس کے گزشتہ اقتدار سے ہر شخص واقف ہے لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حکومت عثمانی کی اس وسعت کی بنیاد ایک واقعۂ عشق ومحبت پر قائم ہوئی

جب فتنۂ چنگیزی نے ایشیاء کوچک کی تمام امارتوں کو درہم برہم کررکھا تھا اور جوش وقبائل ادھر اُدھر

بھاگتے پھر رہے تھے تو انھیں میں ایک قبیلہ خراسانی ترکوں کا بھی تھا جو چار سو سواروں پر مشتمل تھا۔ اور جس کا قائد ارطغرل تھا ۔۔۔ اسی دوران میں یہ قبیلہ ایسے حصۂ ملک سے گزرا جہاں سلجوقی اور تاتاری لشکر باہم گر لڑ رہے تھے ۔۔۔ یہ دیکھ کر ارطغرل نے سلجوقیوں کا ساتھ دیا اور فتح حاصل کی ۔۔۔ اس امداد کے صلہ میں علاء الدین سلجوقی نے، حکومت بازنطینی کے حدود پر ایک صوبہ ارطغرل کو دیدیا۔ ارطغرل نے یہاں خود مختارانہ حکومت کی طرح ڈال کر اپنی مختصر سلطنت کا نام سلطانونی رکھا

ارطغرل کے بعد اس کا بیٹا عثمان ۱۲۸۸ء میں تخت نشین ہوا (جس کے نام پر ترکوں کی حکومت کا نام دولت عثمانیہ قرار پایا۔) اس نے بازنطینی حکومت کے متعدد قلعے سر کر لئے اور اپنی سلطنت کے حدود کو زیادہ وسیع کر لیا لیکن "اسکی شہر"، پر جو بازنطینی حکومت میں واقع تھا۔ اور عثمان کے صدر مقام سے بالکل ملا ہوا تھا اس کا قبضہ نہ ہوا تھا

اسکی شہر کے ایک گاؤں میں جس کا نام ابترونی تھا۔ ایک فاضل شیخ رہا کرتا تھا جس کا نام "ادب عالی" تھا ۔۔۔ عثمان بچپنے ہی سے اس کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ اور اس کی صحبت سے مستفید ہوتا تھا۔ اس شیخ کے ایک لڑکی بھی جس کا نام " مال خاتون " تھا ۔۔۔ یہ لڑکی نہایت جمیل تھی۔ اور عثمان اس پر فریفتہ ہو چکا تھا۔ کچھ دنوں تک تو اس نے انتظار کیا لیکن جب معاملہ صبر و ضبط کی حدود سے گزر گیا تو مجبوراً اس نے شیخ کو پیغام دیا، لیکن شیخ نے انکار کر دیا ۔۔۔ اتفاق سے اسی دوران میں امیر اسکی شہر کو بھی اس کے حسن و جمال کا حال معلوم ہوا۔ اور اس نے بھی پیام بھیجا، لیکن شیخ نے اس کو بھی رد کر دیا ۔۔۔ شیخ اس ڈر سے کہ امیر زیادتی نہ کرے اپنی بیٹی کو لے کر ایک دوسرے سردار کے حدود میں چلا گیا اور اس کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا۔ عثمان بھی اتفاق سے یہیں تھا ۔۔۔ جب امیر اسکی شہر کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن عثمان نے باہر نکل کر اس کو شکست دی اور بھگا دیا۔ اسکے بعد بھی ایک زمانہ گزر گیا اور عثمان کی محبت کامیاب نہوئی۔ ایک رات عثمان نے ایک خواب دیکھا کہ وہ شیخ کے پاس بیٹھا ہوا ہے کہ ناگہاں شیخ کے سینہ سے چاند نے طلوع کیا اور اسکے سینہ میں داخل ہو گیا تھوڑی دیر بعد اسنے دیکھا کہ اسکی ناف سے ایک بڑا درخت پیدا ہوا جسکی پھیلی ہوئی شاخوں کے نیچے جبال قوقاز پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں اور جڑوں سے دریائے ڈانوب، نیل اور دجلہ و فرات جاری ہیں۔ اسی درخت کے سایہ میں اسے بہت سی وادیاں، پہاڑیاں اور آبادیاں بھی نظر آئیں جن پر ہلال طلوع کئے ہوئے ہے اور چڑیوں کے چہچہوں سے فضا گونج رہی ہے ۔ اسنے یہ خواب شیخ سے بیان کیا۔ شیخ نے سنکر کچھ دیر تامل کیا اور پھر یہ سوچکر کہ غالباً یہ تمام ترقیاں عثمان کی اولاد کو حاصل ہونیوالی ہیں اپنی لڑکی کیساتھ اسکی شادی کر دی ۔ اس خواب کی یہ تعبیر کس حد تک صحیح ثابت ہوئی اس کا ذکر فضول ہے، کیونکہ آل عثمان کا تمام شرق ادنیٰ پر قابض ہو جانا اور مغرب میں آسٹریا و اطالیہ تک اپنی سلطنت کو وسیع کر لینا تاریخ کا روشن واقعہ ہے جس سے ہر شخص آگاہ ہے ۔۔۔

کالیداس کی شکنتلا پر ایک ناقدانہ تبصرہ

(۱)

حُسن نام غلط نگاہی کا ہو یا نہ ہو، عشق عبارت فریب کاری دل سے ہو یا نہ ہو لیکن یہ یقینی ہے کہ شاعری نام ہے حُسن صحرائی اوس مصوری کا جس کے پس منظر کو اگر آپ علٰحدہ کر کے دیکھیں تو سوائے موسیقی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کیونکہ آج بیسویں صدی میں بھی جب کہ علوم و فنون کی کثرت نے ذہن انسانی کی بہت زیادہ صیقل کر دی ہے۔ حُسن کی " کافرادائیاں " گو سرحد ادراک کے اندر ہوں مگر الفاظ کے حدود سے بدستور باہر ہیں اور آخرکار مجبوراً ایک شاعر کو اپنے عجز کا اعتراف اس طرح کرنا پڑتا ہے کہ

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست!

ادبیات مشرقیہ میں تنقید و تاثر دو جداگانہ شعبے ہیں۔ جو یقیناً بمراحل دور ہیں کیونکہ یہ بہت ممکن ہے کہ ایک نغمہ دلکش کسی کے روح پر رقص بہیم کی کیفیت پیدا کر سکے لیکن یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اوس نغمہ کے تاثر اور اوس کی روح کی تاثیر میں جو ربط معنوی ہے اس پر بھی وہ حکیمانہ و فلسفیانہ نظر بھی رکھتا ہو ؎

کہ بچشمان دل مبیں جز دوست　　　ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست

حقیقت یہ ہی کہ کالیداس کا کلام جس کا ایک ایک حرف کمال شاعری کا دلکش مرقع ہے اوس کی نسبت ناقدانہ حیثیت سے کچھ بھی لکھنا آسان نہیں ہے واقعہ یہ ہے کہ مجھ میں اس قدر اہلیت نہیں ہے کہ میں اس قادر الکلام شاعر اعظم پر شان شایاں تبصرہ پیش کر سکوں اور اس لیے یہ بہت آسان امر ہے کہ اپنی حقیقی بے بضاعتی کا ابتدا میں اعتراف کر لوں۔ کیونکہ واقعہ یہ ہی کہ اس تہی مائگی کا اعتراف ہی میرے صحت ذوق کا ہر آئنہ ثبوت ہوگا ؎

ادائے بندگی آوردہ در وجود مرا
وگرنہ ذوق جبیں آمدن نہ بود مرا

ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب کائنات کے اکثر حصوں میں خورشید علم کی شعاعیں نہ پھیلی تھیں اور ان پر ظلمت و جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اوس وقت قدرت نے چند ایسے ممالک بھی منتخب کر لئے تھے۔ جہاں حُسن و جمال فلسفہ و تصوف فنون لطیفہ مصوری و موسیقی نسائیات و عمرانیات ادبیات و مذہبیات کی تعلیم رائج تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ

ممالک عرب یونان مصر و ہندوستان تھے۔ یہ دور یونان میں اصنام پرستی کے لئے مشہور ہے۔ ہندوستان میں بھی حسن و جمال کے مظاہرہ سے یہ عہد خالی نہیں ہے۔ مصر کے افسانے بھی زبان زد خلائق ہیں اور یاد ش بخیر عرب کے ایام جہالت کے بازار عکاظ کے میلے آج بھی آپ کو محو حیرت بنائے ہوئے ہیں۔ "جذبہ حسن و جمال" واقعہ یہ ہے کہ اس دور عشرت کی ہر تاسیس میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ فلسفہ و تصوف بھی حسن و جمال کی تجلیوں سے معریٰ نہ تھا۔ خانقاہیں بھی اس کیف سے خالی نہ تھیں مصوری و موسیقی تو اون کا خاص حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ فنون لطیفہ و خطابت کا شعبہ بھی اس حسن و جمال کے مظاہرات کا کچھ کم رہین منت نہیں تھا۔ اگر یونان میں ہیلنا کا قیامت سوز حسن فتنہ محشر ثابت ہو سکتا تھا۔ تو عرب کی بادیہ نشیں لیلائیں اور وادی نیل کی بنات زلیخا غالباً انسانی قلوب ..... کو اپنے بے پناہ حسن کا آماجگہ بنا کر صاعقہ فتنہ شکن ثابت ہوا کرتی تھیں۔ بھلا ایسے رنگین عہد میں ہمارا وطن کس طرح پیچھے رہ سکتا تھا۔ لہٰذا اب آپ کی اس علم پرور جماعت کو اوسی دور باستاں کے ایک عشرت افزا، حیرت انگیز ہوش ربا افسانہ کو اس غنیمت صحبت شبی میں سناتا ہو

ہمارے دوست حکیم عبدالقوی صاحب کا ایمان ہے کہ حسن قدرت کی پہلی شان نمود ہے جب حسن تخلیق ہوا تو اس کی نمایش کے لئے عشق بھی ظاہر ہوا اور ظہور عشق کے بعد ہی نظام دہر کی جلوہ طرازیاں شروع ہو گئیں۔ حسن نہ ہوتا تو عشق کا پتہ بھی نہ ہوتا اور اگر عشق نہ ہوتا تو کائنات اپنی گراں خوابی سے کبھی بیدار نہ ہوتی ؎

پیش از ظہور عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن میہماں کوئی میزباں نہ تھا

عشق کو حسن نے پیدا کیا عشق قدیم نہیں حادث ہے مگر آفرینش کے جملہ عشوہ طرازیوں کے مقابلہ میں قدیم ہے اور پیکر آب و گل کے سرشت میں داخل ہے یہ جذبۂ فطری ہے اور بحر کائنات کے ایک ایک قطرہ نے اوس کی آغوش ناز میں آنکھ کھولی ہے

کمند حسن کی ہمہ گیریوں سے کائنات کی کوئی طاقت انکار نہیں کر سکتی حسن میں جاذبیت ہے یا حسن ہی عین جاذبیت ہے بلکہ مقناطیسی کشش ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو یہ مشاہدہ ہے کہ جہاں شمع روشن ہوئی وہاں پرستاران حسن خود بخود کھنچکر چلے آتے ہیں۔ قوموں کے عروج زوال کی داستان ہوشربا ہو۔ یا نسلوں و ملتوں کے بننے و بگڑنے کی خون آگیں تاریخیں ہوں۔ آپ یقین کیجئے حسن و عشق کے تاثرات آپ کو ہر جگہ یکساں کارفرما نظر آئیں گے۔ بلکہ ایسے ہی مواقع افسانہ نگاری کی جان ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس دور میں فرانس سے بہتر افسانہ نگاری کسی دوسرے ملک کی تسلیم نہیں کی جاتی کیونکہ اوس کا پس منظر خونی ہے اور اس کی پشت پناہی کے لئے انقلاب فرانس یا فرنچ ریولیوشن بھی موجود ہے

یہ صحیح ہے کہ طرازی حسن کا دائرہ غیر محدود ہے اوس کی جولانگاہ ارض سے سماوات تک نہیں۔ بلکہ عرش تک اوس کی

حکمرانی مسلم ہے آفرینش کا ایک ایک ذرہ اس کے جعد مشکیں میں مقید ہے بس یہ کیوں نہ کہا جائے کہ قصہ مختصر نظام کائنات کا انحصار حُسن ہی پر ہے "

یہ حُسن کی کرشمہ سازیاں تھیں جس نے روز الست ہی سے آزاد معصوم ارواح کے حلقوم میں طوق عبودیت ڈال دیا۔ جو ابھی قید آب وگل میں بھی نہ آئی تھیں۔ کیا اس حقیقت سے بھی انکار ممکن ہے کہ حُسن ہی کی جلوہ آرائیاں تھیں جس نے ایک نادیدہ مجسمۂ حُسن کو خواہ آپ اوس کو مذہبی لغات میں کچھ ہی کیوں نہ کہئے مسجودِ خلائق بنا دیا

قول فیصل یہ ہے کہ حُسن ازل سے ہے اور ابد تک رہیگا۔ نیست میں بھی حُسن تھا۔ اور ہست میں بھی حُسن ہے اور فنا میں بھی حُسن جلوہ گر رہے گا

ادبیات مشرقیہ میں "بدلیشی" پرستاران حُسن کے دلی تاثرات کی صحیح تصویر کھینچنا مشکل ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ادبیات شرقیہ ہو یا غربیہ اس کو پڑھا جائے تو اوس کا ایک ایک صفحہ حُسن وعشق کی گلکاریوں سے مزین ہے لیکن اس بارگاہ "ناز و نیاز" کی نقابت کا شرف محض ایک شاعر کو حاصل ہوسکتا ہے۔ عرب کے تپتے ہوئے میدان میں اگر یہ صدا سنائی دیتی ہے کہ

الا من العشق وحالاتہٖ
احرق قلبی بحراراتہٖ

تو "تجلی گاہ یزدان" سے یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ

دلم بسوخت تنم سوخت استخواں ہم سوخت
تمام سوختم و ذوق سوختن باقی است

تو گنگا جمنا کے ساحلوں پر بیٹھکر چاندنی راتوں میں بانسری بجاتے ہوئے آپ نے اکثر یہ دل وجگر جلا دینے والا نغمہ بھی سنا ہوگا کہ

مورے ہردے میں لاگی آگ پریم کی

غرضکہ حسن وعشق کی عشوہ طرازیوں سے کوئی شے خالی نہیں ہے اور آج کی بجنگ میں اسی سے متعلق ایک حیرت انگیز واقعہ سناتا ہوں

دنیا جس قدر ترقی کرتی جائے گی اسی حد تک عہد اصنام کے قادر الکلام شاعر کالیداس کی عظمت میں اضافہ ہوتا جائیگا وہ یقیناً زمانہ قدیم کا ایک بہترین شاعر ہے۔ اُس نے شکنتلا کا ڈرامہ لکھا۔ اور اس صہبائے کہن کو نئے ساغر میں ایسی دلکشی کے ساتھ پیش کیا کہ لوگ متحیر ہو کر رہ گئے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ شکنتلا کا ڈرامہ آریہ ورت کے ادبیات میں ایک شاداب گلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جسقدر اوس کی تعریف و توصیف کی جائے وہ کم ہے۔ جس عمدہ پیرائے میں کالیداس نے آئین دلنوازی پیش کئے ہیں۔ اون کا مغربی ادبیات میں مجکو باوجود تحقیق کے پتہ نہیں ملتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ المانی فلسفی گئٹے چیخ اٹھا کہ:

"سال نو کی کلیاں اختتام سال کے میوے اور وہ تمام چیزیں جو غذائے روح ہو سکتی ہیں یا زبان کو لذت دینے والی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ارض و سما میں جو کچھ ہے وہ سب تو نے ایک نام میں جمع کر دیا ہے اور اے شکنتلا! تیرا نام زبان پر آتے ہی وہ تمام نعمتیں مل جاتی ہیں"

کیا ادبی دنیا کا یہ افسوس ناک سانحہ نہیں ہے کہ آج تک بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کالیداس کہاں پیدا ہوا۔ اور کب اوس نے اس عالم فانی کو چھوڑا اور کب اوس نے یہ ڈرامہ لکھا۔ آیا کالیداس ہی وہ خوش نصیب شاعر ہے جو اس دلفریب نزہت آفریں۔ جذبات خوابیدہ کو بیدار کرنے والے شاہکار ڈرامہ کا قادر الکمال مصنف بے ہمتا ہے؟ خود اس شاعر اعظم کی شخصیت ادبی دنیا کے لئے ایک معمہ ہے، ایک راز ہے۔ کالیداس خود اس درجہ بے نیاز ہے کہ کسی تصنیف میں بھی اوس نے اپنا نسب نامہ یا شاہانہ سرپرستوں کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ یہ بھی مشتبہ ہے کہ آیا کوئی ایسا ادبی مجمع جس کو "نورتن" کہتے ہیں راجہ بکرماجیت کے عہد زریں میں پایا جاتا تھا یا نہیں۔ اور یہ مسئلہ بھی محتاج تحقیق ہے کہ کہیں راجہ بکرماجیت راجہ بھوج کا دوسرا نام تو نہیں ہے[۵]۔ اس وقت کالیداس کی تصانیف کی تعداد جو ایک معتبر ذریعہ[۶] سے معلوم ہوئی ہے ۱۴ تک پہونچتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلی صدی (ق۔م) سے لے کر ساتویں صدی عیسوی تک کم از کم تین شاعر اسی نام کے گزرے ہیں۔ اور جہاں تک میں نے علمائے متبحر سے اس مسئلہ میں گفت و شنید کی اون کا خیال ہے کہ ان تینوں شاعروں کی تصانیف بھی ان ۱۴ نسخوں میں شامل ہیں۔ بہرحال کالیداس کی تصانیف میں تین ڈرامے اور تین مسلسل نظمیں بہت مشہور ہیں۔ جن میں سے ایک شکنتلا بھی ہے۔ کالیداس کس زمانہ میں پایا جاتا تھا تحقیق کے اس حصہ کو مضمون سے علیحدہ کر کے مختصراً اتنا ظاہر کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ کالیداس یقیناً حضرت مسیح سے قبل داد سخن دے رہا تھا

کالیداس کے حالات بہت کچھ پردۂ خفا میں ہیں لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عہد میں عمرانی اور تاریخی حالت آریہ ورت کی کیا تھی۔ جس کا اثر اوس کی شاعری پر بھی لازماً پڑا ہوگا۔ کالیداس کی تصانیف سے تاریخی حالات کا بہت

---

[۵] کالیداس کی قبر سیلون میں سمندر کے کنارہ ایک پہاڑی پر تھی۔ جس کا اب پتہ نہیں ملتا۔ پروفیسر مورٹر۔ مانک ساگر صد ۳۳۱

[۶] قاصد سحاب۔ بابو گجپت سرن داس ایڈوکیٹ۔ سہیل۔ ج ۱۔ ش ۳۔ مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ

کم پتہ چلتا ہے - شمالی ہند کے شرقی حصہ میں سورج بنسی خاندان حکمران تھا - غربی حصہ میں چندر بنسی حکومت تھی - اور وسط ہند میں ریاست مگدھ شباب پر تھی - جس میں مالوہ بھی شامل تھا - لیکن باہم جنگ و جدال کا بازار گرم نہ تھا - ورنہ کالیداس کو اس قدر سیر و سیاحت کا موقع نہ ملتا - راجگان ہند کے دربار میں ایشیائی ممالک کے حسب دستور علاوہ وزرا سلطنت اور مشیران مملکت کے دیگر ارباب علم و ہنر کو بھی شرف باریابی بخشا جاتا تھا - حکمران بالعموم عادل، رعیت نواز، رحمدل، فیاض طبع اور علم دوست تھے - رعایا فارغ البال - بلند حوصلہ اور علم و ہنر کی شائق تھی - گرنہ تو تجارت کی گرم بازاری تھی اور نہ ادس کی ضرورت - مذہبی حیثیت سے نرا کار پرماتما کی قوت انہدام کو شیو کی شکل میں محسوس کیا جاتا تھا - جابجا شیو پرستی ہوتی تھی - اور اسی جذبہ کے تحت اخلاقی و عمرانی ڈرامہ کھیلے جاتے تھے - بود و باش کے طریقے بہت دلچسپ تھے - رہبانیت کا دور دورہ تھا - دور دراز جنگلوں میں نفس کشی اور علائق دینوی سے قطع تعلق کی تعلیم بالعموم دی جاتی تھی - جنگلوں میں ستار - مردنگ - جل ترنگ، بالنسری اون کی دل بستگی کے سامان تھے - شہری نفیس مکانات میں رہتے تھے - موسم گرما میں تپش سے محفوظ رہنے کے لیے پہاڑی غاروں اور دریائی ساحلوں اور شاداب مرغزاروں میں رنگ رلیاں مناتے تھے - اون کے طرز بود و باش میں سادگی کی خصوصیت نمایاں تھیں - شوق تزئین - مصنوعی دستکاریوں کا محتاج نہ تھا - عورتوں میں شوق آرائش بہت زیادہ تھا - گو شادی کی تعداد محدود نہ تھی مگر کثرت بھی نہ تھی - شوہر کے خلوص کی بنا پر سوکنوں میں رشک و حسد پیدا نہ ہوتا تھا - اور جب ہوتا تھا تو انجام خوفناک ہوتا تھا - طلاق رائج نہ تھا - ستی کے واقعات سنے جاتے تھے - چنانچہ ہندی شاعری ان بزرگوں سے مالامال ہے

زرعی حالت کے لحاظ سے خشک سالی کا پتہ خال خال چلتا ہے - آبادی کم تھی - وسائل درامد و برآمد عنقا تھے - اس لئے دیہاتوں اور شہروں میں سود سے فائدہ اٹھانے والے مہاجن مفقود تھے - زراعت پیشہ افراد میں زمیندار و کاشتکار کی تخصیص نہ تھی - تعلیم والدین - اور ادھیاپک کے ذریعہ سے ہوتی تھی - گو شہروں میں ابتدائی مدرسوں (پاٹ شالوں) کا رواج تھا - وید اور اپنیشد کی تعلیم کم تھی

شاشتر - پوران - رامائن - مہابھارت - اور گیتا کی تعلیم کا رواج زیادہ ہو گیا تھا - کتھا کا دستور شایع ہو رہا تھا - فلکیات سے زیادہ دلچسپی شروع ہو گئی تھی - اور ادویات کی بھی تحقیقات کی جاتی تھی - نسائیات کے متعلق خاصا لٹریچر مہیا کیا گیا تھا - ادبیات میں نظم کا حصہ بلند تھا - اور اس صنف میں شعرا کی زیادہ توجہ تھی - تاریخ کا عنصر بہت کم تھا - لیکن فنون لطیفہ کا ستارہ عروج پر تھا - حسن کی نمائش ہر رنگ میں جلوہ گر تھی

یہاں پر یہ بھی واضح کر دینا غالباً نامناسب تصور نہ کیا جائے گا - کہ ہندوستان فن تمثیل نگاری (ڈرامہ) میں کسی دوسرے ملک کا رہین منت نہیں ہے - چنانچہ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کا فاضل مقالہ نگار لکھتا ہے کہ "ہندوستان میں یہ فن اُسوقت بھی پایا جاتا تھا - جب کسی بیرونی اثر کا خیال بھی ناممکن تھا"

مشہور المان فلسفی شیگل نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے - چنانچہ لکھتا ہے کہ

"ہندوستانیوں میں جنکی عمرانی اور ذہنی تہذیب زمانہ لامعلوم سے چلی آتی ہے۔ ڈرامہ کا عنصر اوس وقت بھی موجود تھا۔ جب کسی بیرونی ملک سے متاثر ہونے کا خیال و گمان بھی نہ ہوسکتا تھا"

کالیداس کی عظمت اس آخری صداقت تامہ کی روشنی میں بہت ارفع ہوجاتی ہے کیونکہ شینگل کالیداس کے مداحین کی فہرست میں گئٹے کے بعد دوسرا نمبر رکھتا ہے۔ شینگل نے اپنی بنظیر کتاب میں شکنتلا پر بھی عمدہ تبصرہ کیا ہے

مشرق مغرب میں شکنتلا کی ستایش و تنقید میں اسقدر کافی لکھا گیا ہے کہ اوسے بار بار دُھرانا بے سود ہے لیکن پھر بھی چند مخصوص ناقدین کے تبصرہ کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سر ولیم مونیر جو مشہور ناقد گزرا ہے اوسکا صداقت نامہ ملاحظہ کیجئے ۔۔۔ وہ شکنتلا کے متعلق کیا خیال رکھتا ہے کہ :-

"کالیداس نے جس قدر معنی آفرینی پرواز تخیل۔ گرمجوشی۔ شوخیٔ طبع۔ قلب انسانی سے شناسائی اور اوس کے نہایت پاکیزہ اور نازک جذبات کی دقیقہ شناسی اور اونکی متضاد خواہشات کی کشاکش سے واقفیت کا اظہار شکنتلا میں کیا ہے اوس قدر کسی دوسرے کی تصنیف میں نہیں پایاجاتا۔ قصہ مختصر محض شکنتلا کی تصنیف ہی کالیداس کو ہندوستان کا شکسپیر بنا سکتی ہے"

سنسکرت کا اشلوک اب بھی اس دیسی ہومر کے لئے مشہور انام ہے :-

"عشقیہ نظموں میں ڈرامہ۔ اور ڈراموں میں شکنتلا۔ اور شکنتلا میں چوتھا ایکٹ شیرینی اور لطف کا مخزن ہے اور اس میں بھی آخری چار اشلوک انتہائی خوبی سے معمور ہیں"

کمار لاشاعر نے بہت لطیف پیرایہ میں کالیداس کے کمال کا اعتراف کیا ہے

کالیداس نے انسان اور پری اور دیوی کے حسن کی توصیف جس طریقہ سے کی ہے گو اپنے اپنے دور پر اپنے طبقہ کے اعتبار سے ہر ایک بے نظیر ہے لیکن اگر کسی ایک کا مقابلہ دوسرے سے کیاجائے تو یقیناً ایک قسم کا خوشگوار اختلاف محسوس ہوتا ہے اور دراصل یہی اوس کا کمال ہے۔ کیونکہ یہ بہت مشکل امر کہ باوجودیکہ ہر ایک کو بطور خود منتہائے حسن پر پہونچا دیا ہے۔ لیکن پھر بھی عورت عورت ہی معلوم ہوتی ہے اور پری پری ہے اور دیوی دیوی ہے اوس کا بڑا کمال یہ ہے۔ کہ خواہ اُس نے اجمال سے کام لیا ہے خواہ تفصیل سے خواہ تشریح سے خواہ تشبیہ سے لیکن ہر حالت میں جو کچھ بھی حوالۂ قلم کیا ہے اُس سے بہت زیادہ پڑھنے والوں کی قوت متخیلہ کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور اس لئے بعینہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی نے حسن مجسم کی تصویر عالم مثال سے لاکر عالم شہود میں رکھدی ہے یا یوں کیوں نہ کہا جائے کہ اس میں ہر شخص کو اپنی ہی شبیہ ذہنی یا مثالیہ حسن کا جلوہ نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ذہن انسانی سے فضول خیالات حسن کا جلوہ نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ذہن انسانی سے فضول خیالات خوش کن امیدیں غلط نظریہ ذہنی تصورات اور اون کے مثل دیگر اشیا خارج کر دیا جائیں تو کون شک کرسکتا ہے کہ بہت سے انسانوں کے دماغ محض کھوکھلے ہوکر غم اور افسردگی سے لبریز اور خود اپنے کو ناگوار کرنے والی چیز بن کر نہ رہ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کالیداس کے نقوش مکمل اور ہمیشہ غیر فطری حیثیت سے ہمارے دماغ

پر مستولی ہوا کرتا ہے۔ اور یہ قادر الکلام شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ غم اور افسردگی سے اگر لبریز ہے تو دوسری جانب ابیکورین فلسفہ کا بھی قایل ہے اگر وہ بچوں کی جماعت میں ہے تو وہ معصومانہ خوش فعلیاں کرتا ہے کہ آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے اور سنجیدہ افراد میں اس درجہ متین ہو جایا کرتا ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ واقعی یہی کالیداس ہے۔ خیام کا فلسفہ عیش بھی اوس کے کلام میں آپ کو ملیگا۔ لیکن مذہبی احترام اور اخلاقیات کے حدود سے ایک اِنچ نہیں ہٹتا۔ یہی وہ کلام ہے جو دوسرے کو نصیب نہیں ہے۔ نقاش کو حسن کی تصویر کھینچنے میں کسی مادی نمونے کی ضرورت ہوتی ہے گو کہ اس کو آئینی مثالیہ کے مطابق بنانے کے لئے بہت کچھ رنگ و روغن کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن شاعر کا میدان اس سے بہت زیادہ وسیع ہے اوس کو خد و خال کی مصوری کے لئے کسی مادی نمونہ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے محسوسات ذہنی سے یہ کام لینے کا عادی ہوتا ہے بشرطیکہ وہ شاعر ہو اور انسان بھی! اہل یونان نے جو کمال فنون لطیفہ میں پیدا کیا وہ محتاج تصریح نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کو آغاز ہی میں توصیفِ حُسن کی طریقہ داخلی تک آسانی پیدا کرنے میں کامیابی ہوئی ہومر نے ہیلن کی تصویر پیش کی ہے جس کے عالم سوز حُسن نے تمام دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اور یورپ و ایشیا کو دس سال تک جنگ میں مصروف رکھا تھا۔ لطافت بیان اور نزاکت خیال تو یونانیوں کا حصہ تھا۔ وہ کسی اور قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ البتہ یہ کمال سنسکرت کے شعرا میں مہاکوی کالیداس کو حاصل ہے کہ جہاں کہیں اوس کو "حُسن و جمال" کے اظہار کا موقع ملا ہے اوس نے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے اور اس نے حسن و جمال کی ایسی زندہ اور دلکش تصاویر پیش کی ہیں کہ بھلانے سے بھی ذہن انسانی سے فراموش نہیں ہو سکتیں کالیداس "گھر کی رونق" ایک ہنگامہ پر موقوف نہیں تصور کرتا بلکہ وہ فلسفی ہومر کی طرح اس کا کوشاں تھا کہ وہ مسرت و شادمانی کو تمام خارجی اشیائے سے آزاد بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرے۔ وہ بیک وقت واعظ مجلس بھی ہے اور رندمے پرست بھی وہ خیام کے الفاظ میں اپنی مے نوشی کو چھپاتا نہیں ہے بلکہ دنیا کے سامنے پیش کر کے لوگوں کو بھی مے نوشی کی دعوت رندانہ دیتا ہے۔ خیام نے کیا خوب کہا ہے کہ

> اُفتادہ مرا پائے دمستی کار سے بہ خلقم زچہ می کند ملامت یارے؟
> اے کاش کہ ہر گناہ مستی دادے تا من بجہاں ندیدمے ہشیارے

اور کالیداس بھی یہی کہتا ہے کہ " اگر میں حُسن پرست ہوں تو دنیا مجکو کیوں مطعون کرتی ہے اے کاش "ہر طاعت" خمار آلود ہو جائے۔ تاکہ تمام کائنات میں مجکو جلوۂ حق کے شاہدان پاک نظر کے سوا کوئی دوسرا دکھائی نہ دے۔ کالیداس کی نگاہ خیام کے راستہ سے ہٹ کر معرفت تک بھی پہنچی ہے اور اسی لئے زیادہ آزادی سے مذہب کے خلاف کچھ کہنے کی کالیداس کی ہمت نہ ہوئی

اجین (مالوہ) کی ہُن پرستی دار الحکومت میں یہ عدیم المثال شاعر و بے نظیر تمثیل نگار حضرت مسیح سے ایک صدی قبل

مہاراجہ بکرماجیت کے عہد ہمایونی میں شکسپیر۔ ہومر۔ چاسر۔ بن جانسن۔ فردوسی۔ امراءالقیس۔ علقمہ۔ ابنس۔ بالغہ وعمر کے کمالات دکھلا کر بقائے دوام کی مہر مقبولیت محض اپنے نام کے لئے وقف وثبت کر رہا تھا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ الیڈ (Homers Illiad) وسبع معلقات کی طرح کالیداس کی شاعرانہ حکمت وموعظت شب و روز ترقی کر رہی ہے۔ اظہار حیات کی نزاکت اور تخیل بلند پردازی اوس کا حصہ خاص ہے۔ اور تاثرات قلبی کو عیاں کرنے میں کالیداس نے جو کمال پیش کیا ہے۔ اوس کو اب تک سنسکرت میں اوس سے بہتر کوئی دوسرا شاعر مظاہرات حسن وعشق کی حیثیت سے پیش نہ کرسکا۔ وہ محاکات کا بادشاہ تھا۔ جو تصویر وہ اپنے موقلم سے پیش کرتا تھا۔ وہ آپ اپنی نظیر ہوتی تھی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ شکنتلا کو ادبیات (آریہ) ہندی کے شاداب سدا بہار چمن میں حسین وجمیل پھول کی حیثیت حاصل ہے" اگر زندہ جاوید شاعر کو اس فن خاص (تمثیل نگاری) کا قلب تصور کیا جائے تو شکنتلا یقیناً اس قلب کا درد۔ تمنا۔ آرزو اور خواب ہو گی" اس ڈرامہ کا ترجمہ انگریزی، فارسی۔ المانی، فرانسیسی۔ بنگالی۔ ہندی اور اردو میں ہو چکا ہے انگریزی میں عدالت عالیہ کلکتہ کے فاضل جسٹس سر ولیم جونز (ہفت زبان) نے (۱۷۸۹ء) پیش کیا اور نظم کا جامہ پروفیسر ولیم منرو نے پہنایا۔ المانی ترجمہ شلیگل برادران وگئے ہرڈر کا رہین منت ہے۔ ہندی میں راجہ لکشمی سنگھ (۹۵-۱۸۲۶) سابق ڈپٹی کلکٹر ممالک متحدہ نے ۱۸۶۲ء میں غالباً اٹاوہ سے شایع کیا بنگلہ میں سر ٹیگور نے "اپنایا" اردو میں جہانتک میں نے تحقیقات کی ہے محض تین نسخہ شایع ہوئے ہیں۔ جس میں بحیثیت قدامت میر کاظم علی جوآن کا آزاد ترجمہ نثر بہت وقیع ہے جوآن کا اصلی وطن عروس البلاد دہلی تھا۔ لیکن وہ لکھنؤ آیا اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ اور لکھنؤ سے وہ کلکتہ کے مدرسہ (فورٹ ولیم کالج)، کے لئے بحیثیت مترجم ومددگار کے ڈاکٹر جان گلکرائسٹ صدر مدرس (پرنسپل) کی خواہش پر گیا۔ اور ڈاکٹر کی حسب خواہش اس نے ۱۸۰۱ء میں شکنتلا کا ڈرامہ ترجمہ شروع کیا جو ۱۸۰۴ء میں چار سال کی محنت شاقہ کے بعد مکمل ہوا[1]۔ یہ ترجمہ للوجی لال کب بولتے تھے اور جوآن اردو میں لکھتے جاتے تھے۔ یہ ڈرامہ فرخ سیر بادشاہ کے عہد میں سنسکرت سے برج بھاشا میں بھی منتقل ہو چکا تھا۔ فرخ سیر نے نواز کیشور کو حکم دیا کہ سنسکرت سے شکونتلا کو برج بھاشا میں منتقل کرو۔ چنانچہ کبت ودہرے یہ ترجمہ للوجی کی شرکت سے ریختہ میں ہوا۔ یہ اڈیشن ۱۸۰۴ء میں شایع ہوا۔ اور رومن حروف میں چھاپا گیا۔ اور نصاب میں شامل ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اشاعت خاطرخواہ نہ ہوسکی۔ ۱۸۴۸ء میں علم دوست پارسی کریم بہمن ڈوسا بھائی منشی نے اسے لیتھو میں مرزا حسن کاشانی کے مطبع سے شایع کیا۔ لیکن اس کو بھی عام مقبولیت حاصل نہ ہوئی حتیٰ کہ برنی صاحب کا خیال یہ ہے کہ سیر المصنفین سے لائق مرتب کو بھی اس کی زیارت نصیب نہ ہوئی اوس کا ایک نسخہ برنی[1] صاحب کے پاس ہے اور وہ مقدمہ کے ساتھ شایع کرنیوالے ہیں لیکن این خیال است ــــ دیکھئے برنی صاحب کیا کیا

[1] سید حسن صاحب برنی بی۔ اے ال ال بی (علیگ)، وکیل ہائیکورٹ۔ یہ انصاف کے خلاف ہوگا اگر میں برنی صاحب کا شکریہ نہ ادا کروں مجکو آپ کے مضمون سے بہت قیمتی امداد ملی ہے اور میں نے بہت آزادی سے اوس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ م۔ا۔ علوی

وعدے پورے کرتے ہیں - ایک منظوم ترجمہ رشک گلزار کے نام سے مولوی سید محمد تقی صاحب نے نولکشور مطبع سے شایع کیا - غالباً اس امر کے اظہار میں کوئی ہرج نہیں ہے کہ ان صاحب نے قصہ کو بڑی خوبصورتی سے نظم کیا لیکن انھوں نے قدیم سنت قائم رکھتے ہوئے ہر ایک فصل میں بہار ساغر و مینا کا تذکرہ چھیڑا ہے اور وہ اس کے لئے مجبور بھی تھے کیوں کہ وہ زمانہ ہی ایسا تھا اور اس حمام میں سب عریاں ہی نظر آرہے تھے - دقت یہ ہوگئی ہے کہ آج ہمارے لئے یہ مسئلہ بہت مشکل ہے کہ آیا قصہ ایرانی ہے یا خالص ہندی - اس ترجمہ میں عجمی عنصر (رنگ) اس درجہ گہرا ہے کہ میر حسن و گلزار نسیم سے اس کا امتیاز مشکل ہے "مثنویات" کے تحت خواہ اوس کا درجہ کسی قدر ارفع کیوں نہ ہو لیکن مقامی معاشرت (آریائی تہذیب !) (Aryan Civilization) کی عدم واقفیت نے مصنف کی کاوشوں پر پانی پھیر دیا ہے اور ہم اس کو کوئی درجہ ادبی حیثیت سے نہیں دے سکتے - عرصہ ہوا زمانہ کے مقبول مقالہ نگار مسٹر اقبال ورما سحر ہتگامی نے اس تمثیل کو منظوم حیثیت سے دنیائے ادب میں پیش کیا - اور یہ نہایت درجہ مسرت سے کہا جا سکتا ہے کہ جو نقائص رشک گلزار میں تھے اونکی اصلاح اس میں ہوگئی ہے - وجہ یہ ہے کہ سحر اپنے آبائی وطنی مراسم سے واقفیت تامہ رکھتے تھے انھوں نے قصہ (اصلی) کی "وطنیت" کو بدرجۂ اتم قائم رکھا - اون کے کردار اون کے مماثل - اون کے اداب، اون کے اخلاق، اون کے اداب صحبت، مراسم و مدنیت خالص ہندی نژاد ہیں اور مسٹر نگم کا یہ خیال ایک بڑی حد تک بالکل صحیح ہے کہ بلاغت اور روانی بیان میں سحر کی مثنوی نیرنگ سحر - گلزار نسیم سے بہت کچھ مشابہت رکھتی ہے - سحر ہتگامی محض رسماً مہاکوی کے رہین منت ہیں - ورنہ طرز بیان کلیاً اون کا ہے گو میں اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ انھوں نے شعر کی مجبوری سے قصہ میں بھی انحراف کیا ہے اگر یہ نہ کرتے اور بجائے اس کے جدید شاہراہ پر اوس کو پیش کرتے تو میرے خیال میں اوس کا حسن اور چمک اٹھتا میرا مطلب قوافی و بحور کی قدیم پابندی سے آزادی تھا ! لیکن پھر بھی قصہ کی نوعیت اور دلچسپی میں کوئی فرق نہیں ہے

کالیداس کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ حسب ذیل امور پر غور کر لیا جائے :-

(۱) سنسکرت کے قدیم شعراء زیادہ تر عزلت نشین ہوتے تھے

(۲) لطف سخن اصول مذہب تاریخ اور ادبیات کو اس طریقہ پر ملایا گیا گویا وہ کسی سماوی ہستی کے چار روشن موتی ہیں تاریخ کو اصول مذہب کی تائید سے استوار کیا گیا - وقت و تفصیل سے کوئی علاقہ نہ تھا

(۳) آریہ ورتہ کی قناعت پسندی اور رجحان روحانی نے - اون کی ضروریات کو ہندوستان کی قدرتی پیداوار تک محدود رکھا - اسی لئے استعارات تشبیہات رموز معرفت اور کرشمہائے قدرت سے مالامال ہیں

عام خیال ہے کہ کالیداس آزاد منش اور شوخ طبع تھے - اس مبحث پر واقعہ یہ ہے کہ بہت کچھ دونوں جانب کہا جا سکتا ہے - کالیداس کا کلام حسن و جمال کا ایک دلکش مرقع ہے لیکن اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو جس تصویر میں کالیداس کے قلم نے حسن و عشق کی کوئی رنگین داستان صفحات جمیل پر پیش کی ہے - اوس مرقع کے اصلی خد و خال پاکیزگی - طہارت - توحید پرستی

اور معرفت کے وہ لافانی نقوش ہیں جن کی تعریف دانایان فرنگ کو بھی مجبوراً کرنا پڑی !

کسی کا خیال ہے کہ حسن میں کشش لازمی اور عشق میں شورش لابدی ۔ اگر ایک عطیہ الٰہی ہے تو دوسرا خاصۂ طبع انسانی اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ دونوں ناگزیر ہیں ! ــــــ نہ اس کو واپس کرسکتے ہیں اور نہ اوس کو ترک ۔ مغربی عینک سے اگر نہ دیکھا جائے تو اس " حسن " کا لطف معلوم ہوتا ہے یا ترن پر سر دھننے والے ۔ خدا کی شان مشرقی شوخیوں کو ابتذال کہ کر سامنے سے ہٹا دیا کرتے ہیں ۔ بہرحال یہ مسئلہ بہت بحث طلب ہے اس وقت ہم کو کالیداس کی خصوصیات کلام پیش کرنا ہے اور اس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ ہندوستان میں اوس کی کن تصانیف کو مقبولیت عامہ کا خلعت عطا ہوا ہے ۔ کالیداس کی شاعری مرکب ہے ان اجزائے ترکیبی سے :-

(۱) صفائی ۔ سادگی ۔ نزاکت اور پاکیزگی کالیداس کی شاعری کی روح رواں ہے

(۲) تصنع اور طویل مرکبات پامال محاورات ذومعنین الفاظ سے کالیداس کا کلام پاک ہے

(۳) روانی ۔ سلاست ۔ موزونیت پُرمعنی اور دلفریب تشبیہات سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہیں

(۴) معنی خیز اساطیر ۔ اخلاقی رموز افسانوں اور حسب حال قابل تقلید کرداروں کی کوئی کمی کالیداس کے یہاں نہ ملیگی

(۵) تزکیہ نفس و تزکیہ باطن کی فضا میں سوزش عشق اور شوخی حسن کو روحانیت کی معراج پر پہنچانا ۔ کالیداس کی عدیم المثال خصوصیت ہے

(۶) لوکل کلر (مقامی رنگ) کالیداس کے کلام کا نمایاں عنصر ہے ۔ ہمالہ کی برفانی چوٹیاں معدنیات سے پر اور جڑی بوٹی سے لدے ہوئے شاداب مرغزار اور پُرسکون پہاڑ ۔ راج ہنس آہوئے رم خوردہ ۔ طاؤس زرنگار ۔ مہر و مہ سیارگان فلکی ۔ مان سرور جھیل کے عرفانی نظاروں کو پیش کرنا ہندوستان کے فردوسی (کالیداس) ہی کا کام تھا

آمدم برسر مطلب ۔ اوس کے شاہکار ڈرامہ شکنتلا کو ملاحظہ کیجئے ؛ ایک ایک لفظ میں ندرت کا خزانہ پوشیدہ ہے ۔ ملاحظہ ہو شکنتلا ایک چمپا کے درخت کے پاس کھڑی ہے اوس کی سہیلی کہتی ہے ۔ شکنتلا ! تو ایسی نظر آتی ہے کہ گویا اس درخت پر ایک بیل لپٹی ہے ۔ سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ کو سنکر منچلا دشینت اس تشبیہ کی اپنے دل میں وضاحت کرتا ہے ۔ اور اس وضاحت کو کالیداس اس طرح پیش کرتا ہے

برگ ملائم لعلیں لب ہیں نازک شاخیں بازو ہیں　　　جوبن سے معمور عجب اثمار جوانی دلجو ہیں[۱]

---

[۱] یہ ترجمہ مجکو بابو گجپت سرن داس صاحب قاصد سحاب سے دستیاب ہوا ہے جو آیندہ اوراق میں پیش کیا جا رہا ہے ۔ مرتب

آبیاری کرتے کرتے شکنتلا تھک گئی ہے اور خانقاہ کو واپس جانا چاہتی ہے اوس کی سہیلی روکتی ہے۔ ادر مے عشق سے مدہوش دشینت شکنتلا کی دکالت کرتا ہے ؎

جھکے کندھے کلسوں کی آفت کے مارے | ہتیلی ہوئیں لال زحمت کے مارے
بلا وجہ یہ سینہ ابھرا نہیں ہے | ہے "پھولی ہوئی" سانس محبت کے مارے
گر پھول بھی رخ پر ہلتا نہیں ہے | یہ چپکا ہے عرق مشقت کے مارے
پریشان ہوئی کھل کے جب جعد شکیں | تو لی۔۔۔۔ کلفت کے مارے

شکنتلا کو سوز عشق پریشان کر رہا ہے۔ تمام سہیلیاں اوس کی حالت زار دیکھ کر متفکر ہیں راجہ دشینت بھی دلگرفتہ درختوں کی آڑ سے شکنتلا کے مرض کی تشخیص کرتا ہے ؎

لیپ سینہ پہ کیا خس کا مٹانے کو جلن | ہاتھ میں ڈالے کمل نال کے ڈھیلے کنگن
رخ پہ ہی سوز دروں گرچہ نمایاں کچھ کچھ | دلفریبی تو وہی ہو مری ترچھی چتون
فصل گرما کی تپش عشق کی سوزش کیا ہو | وہ بگاڑے یہ بنائے گل تر کا جوبن
دیکھکر اوسکی پھبن دل کو یقین آتا ہے | اوسکے جی کو بھی لگی ہو کسی دلبر کی لگن

سہیلیوں میں مشورہ ہوتا ہے اور برگ نیلوفر پر شکنتلا پریم پترا لکھتی ہے ؎

کیا جانوں ترے دلکو میں اے یار خوشخصال | مجکو تو کر رہا ہی پریشان ترا خیال
سوز دروں جلاتا ہے فرقت میں تن | دل میں ہو شوق وصل نظر میں ترا جمال

راجہ دشینت کی رانی ہنس یادکا بازار حسن سرد پڑنے لگا تو مہاراجہ کا التفات بسومتی کی جانب بڑھ گیا تو ہنس یاد سرود خانہ سے ایک شکایتی نغمہ بلند کرتی ہے ؎

ای حریص مجل نو۔ زنبور ناداں خود غرض | ام پر جب مول تھا رہتی تھی حاضر دائما
جب نظر آ کنول صورت دکھائی چھوڑ دی | تھی یہی شرط وفا! او بے مروت بے وفا

دربار سار شی کی بد دعا رنگ لائی۔ دشینت نے شکنتلا کو فراموش کر دیا۔ منکا اوس کو لے کر اڑ گئی۔ انگشتری ملتے ہی طلسم شکست ہوا۔ راجہ کو شکنتلا یاد آئی جوش محبت عود کر آیا تصاویر دیکھتا اور دل بہلاتا۔ اس کیفیت کو کالیداس

یوں پیش کرتا ہے

یا تو وہ دن تھا کہ بہر وصل تھی وہ بیقرار — اور میں نے دیدیا تھا اک جواب دلفگار
آج وہ دن ہے کہ اس کا کچھ پتا چلتا نہیں — تک رہا ہوں کب سے اس تصویر کو دیوانہ وار
اس فضائے چشمۂ آب بقا کو چھوڑ کر — ہو رہا ہوں اس سراب بے حقیقت پر نثار

ایک تصویر اور بھی نہایت دلفریب عنوان سے فردوسی ہند نے پیش کی ہے۔ راجہ اپنے آخری ایام میں شکنتلا کے ساتھ دن گذار رہا ہے اور اس کے ساتھ رہ کر اپنا دل بہلا رہا ہے آخر میں یہ خیال آیا کہ ایک تصویر اس موقع میں اور ہونا چاہیے۔ لیکن اوس کو علانیہ پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کالیداس کی عقل نے ایک لطیف جدت سے کام لیا۔ اور دونوں کو ہرن اور ہرنی کی صورت میں دکھلا دیا ہے ——
اور اون کے راز و نیاز کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ ہرنی اپنے بائیں آنکھ کی خارش کی شدت کو دور کرنے کیلئے ہرن کے سینگ سے رگڑ رہی ہے۔ اس حصہ میں جس منظر کو وہ شیت دکھانا چاہتا ہے وہ دراصل دشینت و شکنتلا کی ملاقات ہے اسے سنئے:

ایک منظر اور بھی تمہیں دکھاؤں ہم نشیں — کچھ نہ کچھ آخر بندھے تو اس دل غمگیں کو آس
شوخی و ناز و ادا سے موجزن ہو مالنی — ہنسوں کے جوڑے کنارہ ونیز قریں ہو بھیر اس
دونوں جانب دامن کوہ ہمالہ کی فضا — چرتے ہوں آہوئے ہمالہ سے نیلوں پہ گھاس
ایک درخت خوشنما کی شاخ ہو سایہ فگن — سوکھتا ہو جن پہ ان صحرا نشینوں کا لباس
اسکے سایہ میں ہرن کا خوشنما جوڑا بنے — ہوں محبت سے کھڑے اک دوسرے کے آس پاس
چشم چپ کو سینگ پر نر کے رگڑتی ہو غریب
شدت خارش سے نادم ہو کے مضطر ہو اداس

علم الحیوانات کے ماہر اس مسئلہ سے واقف ہیں کہ ہرنی کی بائیں آنکھ میں جب خارش ہوتی ہے تو وہ کیوں ہرن کے سینگ پر رگڑتی ہے —— کیا اس "افشار راز" کو ——— پہلے اس سے زیادہ لطیف کنایہ میں پیش کیا جا سکتا تھا[1]۔ یہی وہ اوصاف ہیں۔ جنہوں نے ہمارے شاعر اعظم کو ہومر فردوسی چاسر اور شکسپیر کا ہم پایہ بنا دیا ہے

---

[1] اس امر کا اظہار کر دینا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی عنصر کے لئے میں بہت بڑی حد تک سہیل کے فاضل مقالہ نگار بابو تجمیت کے نداس بی۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل ہائی کورٹ دیرہ دون کا رہین منت ہوں

شکنتلا کو لوگ غلطی سے محض ایک عورت ہی تصور کرتے ہیں حالانکہ وہ تو ایک مستقل تاسیس ہے جس کے عناصر ترکیبی، شعریت، حسن، موسیقی، وفا، درد و سوز و ہجر ہیں" چونکہ یہ جملہ عناصر کسی ایک ہستی میں بہ یک وقت جمع ہونا بظاہر مشکل ہیں اس لئے اوس کو محض ایک عورت کہنا یقیناً غلط ہے۔ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس میں سیتاجی کی سی روحانیت کا اعلیٰ جذبہ اوس میں ساوتری کا سا استقلال کا زبردست عنصر اوس میں دمینتی کا سا صبر کا معرکۃ الآرا شریفانہ کردار یقیناً نہیں ہے یہ بھی تسلیم ہے کہ وہ کوہ تحمل نہیں وہ مضبوط درخت نہیں وہ سنگ گراں نہیں بلکہ وہ کمزور ہے۔ ناتوان ہے اور عاجز ہے مصیبت کی باد صرصر چلتی ہے اور اوس کے متاع صبر کو تاراج کر دیتی ہے اوس کے پائے ثبات میں لغزش ہوتی ہے اور اوس کا خرمن حیات خس و خاشاک کی طرح جل کر ہوا میں منتشر ہو جاتا ہے۔ وہ غریب الدیار مصیبت زدہ بن باسی ہے محبت کرنا چاہتی ہے لیکن محبت کی راہوں سے ناآشنائے محض ہے اور میرے نظر میں یہی وہ اعلیٰ جوہر ہے جو شکنتلا کو اوس کے ہمجنسوں پر فوقیت عطا کرتا ہے۔ اوس کی انسانی کمزوری سے ایک لطیف سبق کائنات کو ملتا ہے اور اسی خامی نے اوس کے کردار کو ماہ تابہ ماہی پہونچا دیا ہے ؎

در خرمن کائنات کردم چو نگاہ
یکدانہ محبت است باقی ہمہ کاہ!

اُجین کے افراد آج بھی اپنے قادر الکلام شاعر پر بجا طور سے ناز کرتے ہیں۔ اور فرط عقیدت سے یہ بالکل درست کہتے ہیں کہ سلاست زبان اور صداقت جذبات میں شکنتلا سے بہتر کوئی دوسرا ڈرامہ نہیں ہے۔ شکسپیر کی طرح کالیداس نے بھی اس ڈرامہ کا پلاٹ خود اختراع نہیں کیا بلکہ اساطیر اولین اس ڈرامہ کی بنیادی پتھر ہیں لیکن ان اساطیر میں قادر الکلام شاعر نے وہ رنگین بیانی اور لطافت جذبات سے کام لیا ہے کہ ڈرامہ بالکل نادر اور نیا ہو گیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ آئین دلنوازی جس دلفریب عنوان سے کالیداس نے پیش کیا ہے اور رموز الفت کے نکات کو جس طرح اوس نے بے نقاب کیا ہے وہ اس کے ما قبل کے شعرا میں یقیناً نہیں ہے۔ کالیداس معلوم ہوتا ہے کہ ازل سے فطرت پرست یا یوں کیوں نہ کہا جائے شاہد حقیقی کا پرستار دل لایا تھا۔ اور اس کی بیباک نظریں حسن پنہاں کو آشکارا کرنے پر تلی رہتی تھیں۔ جو جذبات انسانی ہی تک محدود نہ تھی بلکہ وحوش و طیور و اشجار و اثمار غرضیکہ ساری کائنات اوس کے خاص نقطۂ نگاہ کے جلوہ حسن سے معمور تھی اور وہ اوس شاہد حسن کا واحد پرستار تھا! اوس کا موضوع محض حسن و جمال کی نمایش تھا۔ اس نے اپنے موقلم سے جو ہلکے سے نقوش بھی قرطاس عالم پر قائم کئے ہیں وہ انتہائی دلکش ہیں اور اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان نقوش کا — بنانے والا محض ایک شاعر ہی ہو سکتا ہے جس کا جذبہ حسن مکمل ہو اور یہ تخیل دلکش محض ایک خلاق معنی ہی کے دلفریب احساس حسن سے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی وہ وصف ہے جس نے دانایان فرنگ کو کالیداس کا مداح بنا دیا ہے

مہاراجہ بکرماجیت کالیداس کو اپنے تاج شاہی کا بیش قیمت ہیرہ تصور کرتے تھے۔ اس لئے جب اون کو اطلاع ہوئی کہ درباری شاعر نے شکنتلا کا ڈرامہ تصنیف کیا ہے تو حکم دیا کہ اس کی پہلی نمائش موسم بہار میں شاہی محل میں ہو گی اور ایوان شاہی کے اسٹیج کو یہ شرف حاصل ہو گا کہ شکنتلا کا ڈرامہ وہیں شاہی سرپرستی میں پہلی بار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شایع ہوا اور اوس نے بقائے دوام کا خلعت حاصل کیا۔ آئیے آپ کو بھی اس ڈرامہ کا پرلطف حال سنائیں اور ڈاکٹر ہورو ٹز نے تقریباً ۱۴۰۰ سال قبل کے ساز و سامان کا جو تذکرہ کیا ہے اوسی میں رنگ آمیزی کر کے آپ کو آج اس صحبت میں داستاں ہوشس رُبا کا ابتدائی باب دکھلائیں۔ دیکھئے سامنے ایوان شاہی ہے اور وہ سرکاری اسٹیج ہے جس پر شکنتلا کا ڈرامہ پیش کیا جانے والا ہے۔ منتخب روزگار ایکٹر "جگت اُستاد شاعر" علم پرور دربار اور اس پر موسم بہار کے لطیف اجتماع سے جو کیفیت اس وقت طبائع میں رونما ہوئی ہو گی۔ اوس کا اندازہ تھوڑا بہت تو آپ حضرات بھی کر سکتے ہیں دیکھئے وہ ایوان شاہی کا سنگت سال[1] رقص و سرود کے لئے وقف ہے بڑے بڑے دروازوں پر زردوزی پردے آویزاں ہیں سامنے کشادہ صحن میں نشست کا انتظام ہے جس کے چاروں طرف خوبصورت سنگی مجسمے ہمہ تن انتظار بنے ہوئے ستونوں کا حق ادا کر رہے ہیں ان اصنام مجازی پر پھولوں کی نچھاور ہوتی ہے۔ صحن کے بیچ وسط میں سرخ رنگ کا شاہی شامیانہ نصب ہے جس کی سنہری جھالریں دنیاوی نظروں کو خیرہ کئے دیتی ہیں شامیانہ چھ نقرئی چوبوں پر قائم ہے۔ اور یہ حیرت نزاکت طبع اور رعنائی خیال کا خاتمہ ہے کہ بجائے زمین کے یہ چوبیں پھولوں کے ڈھیر پر رکھی ہوئی ہیں۔ اسٹیج کے سامنے بھی کثرت سے پھول سلیقے سے سجائے گئے ہیں جس کے پہلو میں شہنشاہی پرچم ہوا میں لہرا رہا ہے اور لعل و الماس کا پُرتکلف پردہ طلائی زنجیروں سے اسٹیج پر آویزاں ہے۔ یہ سنکر غالباً آپ محو حیرت ہوں گے اور مسرور بھی کہ یہ گراں انعام اس قادر الکلام شاعر کو عطا کیا جائے گا۔ سنئے آج کی طرح ناقدری کا دور نہیں ہے۔ راجہ سے پرجہ تک علم دوست ہیں مہاراجہ بھی اپنے سبھا کے بیش قیمت لعل کو اوس کے شان شایاں معاوضہ دینا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے اور حیرت کیجئے کہ اس

(۱) سنگت سال ایوان رقص کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایوان کشادہ اور خوشنما ہونا چاہئے اور اس کی سقف لاجوردی نہایت اعلےٰ اور منقوش ہونا چاہئے جو جابجا ستونوں پر قائم ہو۔ جن پر پھولوں کے ہار چڑھے ہوں۔ وسط ایوان میں سنگھاسن پر میزبان بیٹھے داہنی جانب معزز مہماں اور بائیں جانب اہل حرم کو جگہ دینا چاہئے عقبی حصہ میں عمال سلطنت یا خانگی ملازم ہونا چاہئے۔ شاعروں۔ جوتشیوں۔ علماء کرام حکمائے حاذق کو حلقہ کے درمیان میں جگہ دی جائے۔ خوب صورت کنیزیں اپنے حسن و جمال کے حلقہ میں شفیق آقا کو لئے ہوں کسی کے ہاتھ میں اگر چنور ہو تو کسی کے ہاتھ میں مور ذنکا یا عصا بردار بجا شانتی کے لئے کھڑے ہوں۔ خاموشی کے بعد ساز چھڑے۔ اور لائق رقاصہ پردہ سے نکل کر سلام کے بعد رقص شروع کرے۔

(ڈاکٹر ولسن ناٹک ساگر صفحہ ۳۳)

دَورِ باستان میں عالم ادبیات کی قدر افزائی کس طرح کی جاتی تھی۔ غالباً یہ منظر ہوش رُبا دیکھ کر چند لمحات کے لئے آپ بھی یہی دعا کریں گے۔ کہ اے کاش ایسے علم پرور اور عزت افزا شہنشاہ کے عہد سعید میں ہوتے!

ملاحظہ ہو۔ سپیدۂ سحر کے نمودار ہوتے ہی اسٹیج کے عقبی حصّہ سے ساز عشرت بجتا ہے اور مہاراجہ بکرماجیت اکلیل جہانبانی فرق مبارک پر رکھے قبائے شاہی زیب تن کئے عصائے شاہی دست مبارک میں لئے اپنے خدم حشم کے ساتھ "جاہ وجلال" کا مجسمہ بنے ہوئے "حسن وجمال" کے گنگا جمنی حلقہ میں اپنی بے تاب پرستار اور اولاد سے زیادہ شفیق رعایا کو دعوت مظاہرہ بخشتے ہیں۔ اور ہر شخص شرقی عقیدہ کے مطابق ظل اللہ تصوّر کرتا ہوا فرط ہیبت سے سربسجود ہو جاتا ہے۔ آکاش سے نور کی بارش ہوتی ہے اور دنیا والے اس تار بارش میں یہ غیبی آواز بھی سنتے ہیں کہ جس ملک پر ہم مہربان ہوتے ہیں وہاں ایسے ہی عادل اکبر جہانگیر شاہجہاں اور نگزیب سریرآرائے سلطنت ہوتے ہیں" باجگزار سلاطین اورنگ شاہی کے "پوتر درشیوں" کو داہنی جانب نشست عطا ہوتی ہے۔ کنیزان شاہی سراپردہ کے قریب مورچھل لئے ادب سے استادہ ہیں۔ حریم سلطنت کی حاشیہ نشین جمال وتمکنت کا مجسمہ بنی ہوئی ظل اللہ کے قرین دنیا کو محوحیرت بنائے ہوئے ہیں، العظمت للہ۔ دنیا والوں نے حیرت سے بے تاب ہوکر کہا۔ کیا آج ہی قران السعدین ہے؟ کہیں محسن سکے دیوتا نے تو اوتار نہیں لیا ہے؟

اس جاہ وجلال سے اگر ایک طرف کسی کی فرط ہیبت سے نظریں نیچی ہیں تو دوسری جانب کسی کا وقار وجمال سینوں کو پامال کرتے ہوئے قلوب میں لطیف گدگدی پیدا کرکے نظروں کو اوپر رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اغیار کی دُزدیدہ نظریں اوپر اٹھتی ہیں اور حسن شاہی کا جائزہ لیتی ہوئی جلدی سے سراپردہ تک کی خبر لیتی ہوئی واپس آکر فرط عظمت سے جھک جاتی ہیں۔ دیکھئے یہی نہیں بلکہ وہ خواص اپنے پنجۂ حنائی میں طلائی نئے اور سدابہار پھولوں کا گلدستہ بھی لئے ہے۔ یہ ملکۂ زمانی کی جانب سے وہ غیر معمولی تحفہ ہے۔ جو آج کالیداس کی خدمت میں پیش کیا جائیگا۔ اور یہی شاداب پھولوں کا گلدستہ آج بھری مجلس میں ارباب علم وادب کے حضور میں سیّاحوں اور شعرائے ادبی کو محوحیرت بناکر کالیداس کو ملک الشعراء کا معزز خطاب دلوائے گا۔ آپ سمجھے بھی آخر حریم سلطانی سے آج پھول کیوں منتخب کئے گئے ہیں اور یہ طلائی سکے سے کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟ لیکن حضرات میرے خیال میں یہ ایک لطیف کنایہ ہے۔ حسن وجمال کے مظاہرہ کا۔ کہ جس طرح آج اس مجمع میں ملکۂ زمانی کے لافانی حسن کا افسانہ "بردوش صبا" اقطاع ہند میں رائج ہے اسی طرح مستقل قریب وبعید کی آنے والی نسلیں اس سدابہار پھولوں کی مست کن خوشبو کو سونگھیں گی اور بیخود ہوکر اس قادر الکلام شاعر کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہوکر اس بانسری کے دلکش بے تاب کن اور ولولہ انگیز نغمات

سے مسحور ہو کر اپنا سر دُھنیں گے

ہاں ہاں دیکھئے ۔ میں تو بہکا ہی تھا اشہب خامہ بھی یہ ساز و سامان دیکھ کر بہک گیا ۔ ہاں وہ ملاحظہ کیجئے ابیسنیا کے حبشی نژاد نہیں بلکہ کول و دڑاوڑ قوم کے سیاہ فام غلام سُرخ بانات کی دلفریب وردیاں پہنے اور ارغوانی پٹکے لٹکائے محترم و مفتخر مہمانوں کو عطر و پان و فواکہات تقسیم کر رہے ہیں دیکھئے وہ سیاہ سیاہ کالی گھٹاؤں میں سفید گیسوؤں والی ماہ جبیں درمیں لعبت چین خواتین بیش قیمت مروارید کی ہار پہنے الماسی تاج (تبسم) خوبصورت بالوں پر رکھے بجلی سی کوند کر فضائے حسن میں تہلکہ ڈال کر طبائع میں انقلاب پیدا کر رہی ہیں ۔ مہمانوں کے حواس گم ہیں عقلیں بیکار ہیں اور نگاہیں خیرہ ہو گئی ہیں ۔ مشیران سلطنت اور علمائے کرام قرینہ سے اپنی اپنی جگہوں پر رونق افروز ہیں ۔ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اس وقت انجمن کے مہذب سماج کا روح عطر اور عمرانی حیثیت سے بھی بہترین عنصر ایوان شاہی میں موجود ہے ۔ وہ شمالی جانب دیکھئے مدبران سلطنت نیپال کی تازہ شورش کے استیصال پر گفت و شنید کر رہے ہیں دیکھئے وہ جنوبی جانب ایک شاہی رصدگاہ کا منجم سفید ریش ایرانی سے گفتگو کر رہا ہے اور وہ شاہی مدیر سنسکرت لغات کے آخری اجزا ر چینی سیاح کے حوالہ کر رہا ہے جو محض اسی غرض سے پیکن سے آیا ہے اور مخصوص حیثیت سے اوس کو اس سبھا میں مدعو کیا گیا ہے ۔ وہ دیکھئے نازنینان حرم کے حسن کا جائزہ لیا جا رہا ہے کہ دفعتاً سارنگی جل ترنگ ۔ ستار ۔ بانسری ہم آہنگ ہو کر انسانی قلوب میں مد جزر کی لطیف کیفیات پیدا کرتے ہیں اور خوش گو ماہران فن اپنے صبیح و ملیح رنگ اپنے تناسب اعضا اور اپنے شباب کی رعنائیوں اور عشوہ آفرینیوں میں ستار ہاتھوں میں لیئے زلف جھٹکائے ساز کے ...... ساتھ ہم نوائی کرتے ہوئے ہر تان کو شراب کی حوضوں میں غوطہ دیتے سرشار و مدہوشی کے چشموں سے غسل دیتے شہنشاہ وقت اور علمائے کرام کا خیر مقدمی ترانہ چھیڑتے ہیں سامعین محسوس کر رہے ہیں کہ تار مضراب پر کسی کی انگلیاں مصروف رقص نہیں ہیں بلکہ کائنات کے رشتہ حیات پر ہیں اور بلوری حلق و دہن سے آواز نہیں نکلتی بلکہ تخلیق کے ساز سے غیر فانی رقص ہو رہا ہے !

سوتر دھارا (منتظم اسٹیج) ادب سے اشیرباد پیش کرتا ہے ۔ اور ایک فی البدیہہ مزاحیہ نظم میں حضار مجلس کی توجہ تمثیل کی جانب منعطف کرتا ہے ! حاجب ۔ شاہی ایماء پا کر آگے بڑھتے ہیں اور جواہرات کی مرصع زنجیر ملک الشعرا کے قدموں پر نثار کرتے ہیں دوسری جانب سے ملکۂ زمانی کی خواص رعنائی و شباب کا پیکر مجسم اور حسن و جذبات کا متحرک پیکر بنی ہوئی آگے بڑھتی ہے ۔ اور سدابہار پھولوں کا گلدستہ قادر الکلام درباری کے حضور میں عقیدتانہ پیش کرتی ہے اور طلائی نیزو کمر مجمع کا خدنگ نظر غلط انداز سے ایک جائزہ لیتی ہوئی اور حضار کے خرمن عقل کو جلاتی حدیقۂ فہم کو تاراج کرتی اپنی جگہ پر واپس جاتی ہے دیکھئے وہ انگشت شاہی کو حرکت ہوئی کہ دفعتاً اسٹیج کا خوبصورت پردہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے تحسین و آفرین کی صداؤں سے ماہ تا بہ ماہی غل مچتا ہے اور تالیوں کی پر زور موسیقی میں ڈرامہ کا افتتاح ہوتا ہے

(باقی) مشیر احمد علوی (بی ۔ اے)

حسن کی شہر آشوبیاں

شام کا وقت ہے، ہلکی ہلکی تاریکی افق سے بڑھ رہی ہے، اور اُن چڑیوں کی طرح جن کو بسیرا لینے کے لئے دیر ہوگئی ہو، ماہی گیر اپنی اپنی کشتیوں کے بادبان جلدی جلدی لپیٹ رہے ہیں

ساحل اسکندریہ پر آخری کشتی آہستہ آہستہ پہونچتی ہے، ایک آدمی سیاہ لبادہ میں لپٹا ہوا خاموشی سے اُترتا ہے، اور ایک عورت کو ہاتھ کا سہارا دیتے ہوئے نیچے اُتارتا ہے ——— ہم نے اس کو عورت کہا، حالانکہ اپنے چھریرے نازک جسم کو لئے ہوئے جس طرح وہ ہلکے قدموں کے ساتھ اتری تھی۔ اس کے لحاظ سے کمسن لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا

سترہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے اور وہ کونسی عورت ہے جسے اس عمر میں "لڑکی" سے زیادہ کسی اور لفظ سے منسوب کیا جاسکے، لیکن کلیوپیٹرا جو اس وقت کی نہایت ہی شائستہ و ترقی یافتہ قوم کی فرد تھی اور جو ادب وانشا و فنون لطیفہ میں مہارت تامہ حاصل کرچکی تھی، اپنے دل ودماغ کے لحاظ سے اسی عمر میں "پوری عورت" ہوچکی تھی اور حقیقت یہ ہے۔ کہ ٹولمی کی لڑکی کو ایسا ہی ہوجانا چاہئے تھا ——— وہ ٹولمی جس نے اندرونی بغاوتوں اور بیرونی حملوں کے وقت بھی بانسری اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑی اور جس نے ملک کی ہر تباہی کا خیر مقدم تازہ جام شراب سے کیا ——— ظاہر ہے کہ وہ لڑکی جس کی پرورش ایسے عیش کوش دربار میں ہوئی ہو، جس کا ماحول صرف "شباب و شراب" کی بدمستیاں رہا ہو، وہ سترہ سال کی عمر میں کیا کچھ نہ ہوگئی ہوگی

یہ وہ زمانہ ہے جب کلیوپیٹرا کو اس کے بھائی نے جلا وطن کرکے قصباڈ میں نظر بند کردیا تھا اور سیزر اسکندریہ میں موجود تھا ——— یوں تو کلیوپیٹرا ہر وقت اسی ادھیڑبن میں لگی رہتی تھی۔ کہ کیونکر اپنے بھائی سے انتقام لے کر مصر کے تخت و تاج پر قابض ہو، لیکن سیزر کی آمد سے اس کو اپنی کامیابی کی امیدیں زیادہ قوی ہوگئی تھیں اور اس لئے وہ اپنے ایک خاص شخص اپالوڈورس کی مدد سے خفیہ طور پر ساحل اسکندریہ تک پہونچ ہی گئی تاکہ سیزر کی امداد سے اپنی کھوئی ہوئی حکومت مصر پھر حاصل کرسکے

کلیوپیٹرا، ساحل اسکندریہ تک تو تمام مصائب برداشت کرنے کے بعد پہونچ گئی تھی، لیکن اب بڑا اہم سوال یہ تھا کہ سیزر تک کیونکر پہونچ سکے۔ کیونکہ مصری سپاہیوں اور جاسوسوں سے اس وقت اسکندریہ کی ایک ایک گلی معمور تھی

اور کلیوپیٹرا جانتی تھی کہ اگر ذرا بھی پتہ کسی کو چل گیا تو اس کی گرفتاری یقینی ہے
اپالوڈورس نے جو بہت ذہین تھا۔ آخر کار ایک تدبیر نکالی اور کلیوپیٹرا کے نازک و لچیلے جسم کو قالینوں میں لپیٹ کر اپنے قوی شانوں پر رکھا اور قصرِ سیزر کی طرف روانہ ہو گیا
جب اپالوڈورس، قصر کے دروازہ پر پہونچا تو حاجبوں اور دربانوں نے اس کو روکا لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ شخص قالینوں کا تاجر ہے اور سیزر کے سامنے اپنا مال پیش کرنا چاہتا ہے تو کوئی تعرض نہ کیا گیا اور وہ آزادی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا

ہر چند سیزر اب جوان نہ تھا اور زندگی میں ایک انسان کو جتنی مسرتیں اور لذتیں میسر آسکتی ہیں۔ ان سب سے وہ لطف اندوز ہو چکا تھا، لیکن احساس نشاط ہنوز اس میں باقی تھا۔ اور یہی وہ خصوصیت تھی جس پر اعتماد کر کے کلیوپیٹرا اس کے پاس آئی تھی
جس وقت اپالوڈورس نے کلیوپیٹرا کو قالینوں کے اندر سے نکالا تو اس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی وحشی ہرن کو آزاد کر دیا جائے اور وہ تھوڑی دیر تک گھبرایا ہوا ادھر ادھر دیکھتا رہے۔ اس نے اپنے چھوٹے سے نقرئی آئینہ میں جو کمر کی طلائی زنجیر میں لٹکا ہوا تھا اپنی صورت دیکھی تو معلوم ہوا کہ نہ آنکھوں میں سرمہ کی تحریر کا کہیں پتہ ہے نہ گالوں میں غازہ کی سرخی کا، لباس بھی حد درجہ بے ترتیب ہے۔ اور بال بھی اُلجھے ہوئے شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں، لیکن تھوڑی دیر بعد اس کا احساس حُسن پھر قوی ہو گیا۔ اور وہ اس سادگی حسن و شباب کو لئے ہوئے سیزر سے ملنے کے لئے اور اس کو مغلوب کرنے کے لئے آگے بڑھی
وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی اور سیزر اس کے لچیلے جسم کی جنبش کو ناگن کی طرح اس کے چھریرے نازک جسم کے لوچ کو، اور اُس کے دلکش سُبک رفتار کی نزاکت کو نہایت حریصانہ نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ قریب آئی تو سیزر نے اس کی ابروُں کے خوبصورت خم کو دیکھا، اس کی مست و مخمور آنکھوں سے نکلنے والے جادو کو دیکھا، اس کے باریک پنکھڑی کی طرح باریک نتھنوں کو دیکھا، ایک دوسرے سے جدا رہنے والے گداز لبوں کو دیکھا، اس کے جسم کے نرم کندن کو دیکھا۔ اور ایک ایسے جذبہ کے ساتھ جو اس وقت تک کبھی اس کے دل میں پیدا نہ ہوا تھا بے اختیار کہہ اٹھا کہ "اے کلیوپیٹرا بول، میں تیرے لئے کیا کر سکتا ہوں"
کلیوپیٹرا نے جو یونانی، شامی، مصری اور لاطینی زبانوں کی ماہر تھی، سیزر کو اس کی ملکی زبان میں جواب دیتے ہوئے بھائی کے مظالم بیان کئے اور یہ التجا پیش کی کہ مصر کا تاج و تخت حاصل کرنے میں اس کی مدد کی جائے ظاہر ہے کہ سیزر جو ہمیشہ سے عورت کے حسن و شباب کا غلام رہا ہے۔ کلیوپیٹرا کی کسی خواہش کو رد نہ کر سکتا تھا اور

وہ فوراً اس کے فرمان کی تعمیل کے لئے آمادہ ہوجاتا، لیکن حالات اسقدر تعجیل کے مقتضی نہ تھے کیونکہ وہ اسکندریہ صرف سیاحانہ طور پر آیا تھا۔ اور اس کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ وہ مصری سپاہ کا مقابلہ کرسکتا

کلیوپیٹرا نے اس کو سمجھا اور کہا کہ " اگر یہ پس و پیش کمی افواج کی وجہ سے ہے تو فی الحال میری حکومت کا صرف اعلان کردیا جائے۔ اور جب روم سے فوج آجائے تو میرے بھائی کو تخت سے اُتار کر میرے سپرد کردیا جائے "

اُس طرف جب ٹولمی دوازدہم کو معلوم ہوا کہ اس کی بہن قید سے نکل کر سیزر کے پاس پہونچ گئی ہے، تو اس نے اچلیس کی قیادت میں ایک زبردست فوج اسکندریہ کی طرف روانہ کی اور رومی سپاہ کے ایک دستہ کو جو وہاں موجود تھا تہ تیغ کرادیا —— یہ تھی ابتدا اس جنگ کی جو کامل دو سال تک مصری و رومی سپاہ کے درمیان جاری رہی اور جس نے ہزاروں انسانوں کا خون بہانے کے بعد اسکندریہ کے مشہور کتب خانہ کو بھی جلا کر خاک سیاہ کردیا

سیزر تازہ رومی افواج کے انتظار میں قصر بروشیم کے اندر محصور رہے اور کلیوپیٹرا ابھی سرزمین مصر پر لڑائی کی آگ روشن کرکے سیزر کے ساتھ ہی قصر کے اندر مقیم ہے

بروشیم، اسکندریہ کا وہ مشہور محل تھا جس کی بنیاد سکندر اعظم نے ڈالی تھی اور جس میں اس کے جانشینوں نے برابر اضافہ کر کرکے اس کو ایک نہایت ہی مستحکم قلعہ، اور نہایت ہی جمیل قصر کی صورت دیدی تھی، اس کے بڑے بڑے مرمری ایوان جو یونانی و مصری فن تعمیر کی نازک ترین صناعیوں کا نمونہ تھے . . . .

. . . . اس کے زریں در و دیوار، مُطلا بام و سقف، صیقل شدہ آئینہ کے حوض، بلور کے ترشے ہوئے فوارے، وسیع قطعات چمن، یوں تو سیزر کے لئے ہمیشہ جاذب نظر تھے، لیکن یہ حقیقت کلیوپیٹرا کے آنے کے بعد ہی اُس پر کھلی کہ ان تمام چیزوں میں کبھی کبھی جان بھی پڑجایا کرتی ہے اور جس وقت ان مناظر میں یوں جان پڑجاتی ہے تو پھر ایک انسان کے لئے تمام کائنات کو بھلا دینا کسقدر آسان ہوا کرتا ہے

واقعی سیزر اس وقت تمام دنیا کو حرف غلط سمجھ رہا تھا اور کلیوپیٹرا کے معیت میں جو اُسے مجسّم "عطریت" نظر آتی تھی، ایک ایسی زندگی بسر کررہا تھا۔ جو اس سے قبل اس نے کبھی بسر نہیں کی تھی اور جسے وہ قدرت کا انتہائی انعام سمجھتا تھا

کامل چھ مہینے سیزر کو اس "خلوتکدۂ فردوس" میں زندگی بسر کرتے گزر گئے ہیں اور اسے مطلق ہوش نہیں کہ قصر بروشیم کے باہر کیا ہنگامہ برپا ہے اور مصری افواج نے اس کے سپاہیوں کو کسقدر پریشان کردیا ہے

ایک دن صبح کو تختۂ گلاب میں بیٹھا ہوا وہ کلیوپیٹرا کے بالوں کی عطریت کا لطف اٹھا رہا تھا۔ کہ اس کو افواج روم کی آمد کی اطلاع ملی اور اس کا عسکری احساس دفعۃً بیدار ہوگیا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور بولا کہ " اے کلیوپیٹرا، اب وقت آگیا ہے کہ میں تیرے احسانات کے اعتراف میں مصر کا تاج و تخت تیرے قدموں پر لاکر ڈال دوں، اس لئے

مجھے اجازت دے کہ چند دن کے لئے تجھ سے جدا ہو کر پھر انھیں تلواروں کے سایہ میں پناہ لوں۔ جو سیزر کو ملکہ مصر کے التفات کا زیادہ اہل بنا سکتی ہیں"

جس وقت روم کے سوار، گال کی پیادہ فوج، سلیشیا اور رموڈس کے جہاز سامان رسد سے لدے ہوئے، ساحل اسکندریہ پر پہونچے، تو سیزر بھی جو ۶ ماہ سے قلعہ بند تھا، باہر نکل آیا اور جنگ میں مصروف ہوگیا

اس میں شک نہیں کہ مصری فوج جو اچیلس کی سیادت میں برسرپیکار تھی، بہت قوی تھی، لیکن روم کی منظم سپاہ اور سیزر کی کوہ شکن جرأت کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی، آخر کار اسے شکست ہوئی، کلیوپیٹرا کا بھائی مارا گیا اور سیزر نے اسکندریہ کی کنجیاں کلیوپیٹرا کے قدموں پر ڈال کر اس کو ایک بار ملکہ مصر تسلیم کرا ہی دیا

یقیناً یہ وقت کلیوپیٹرا کی انتہائی مسرت کا وقت تھا اور اس کو وہ چیز حاصل ہوگئی تھی جس کے لئے وہ تڑپ رہی تھی، مگر وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھی کہ جس قوت سے یہ سلطنت حاصل کی گئی ہے اسی قوت سے قائم بھی رہ سکتی ہے اور اس لئے وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح سیزر کو ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لے

اُدھر چونکہ سیزر کی واپسی کے لئے روم نہ صرف یہ کہ بیتاب تھا، بلکہ اس کی طویل غیر حاضری سے برہم بھی ہو چلا تھا، اس لئے اس کو جلد سے جلد لوٹ جانا چاہیے تھا۔ کلیوپیٹرا نے بہت کوشش کی اور اپنے حسن و جمال کا ہر نا آزمودہ سحر اس نے آزما دیکھا لیکن چونکہ اس وقت سیزر میں جذبۂ وطنیت پھر ایکبار عود کر آیا تھا۔ اس لئے وہ کامیاب نہ ہوئی اور سیزر واپسی کی طیاریاں کرنے لگا

جب سیزر روانہ ہوا تو کلیوپیٹرا بھی اس کو جزیرۂ اسیس تک پہونچانے کے لئے ساتھ ہوگئی اور کافی حصہ وقت کا لطف و نشاط میں بسر کرنے کے بعد جب جدائی کا وقت قریب آیا تو اس نے باچشم پرنم سیزر سے کہا کہ "کم از کم اتنا انتظار تو اور کرو کہ تمہاری امانت جو میں اپنے شکم کے اندر لئے ہوئے ہوں، وہ تمہاری آغوش میں سونپ سکوں"

یہ ایک ایسی خبر تھی جس نے سیزر کو پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کیونکہ اس کی تین بیویوں میں سے کسی کے اولاد نہ تھی۔ اور وہ اس کا متمنی تھا کہ دنیا میں اپنے بعد کوئی وارث دولت و حکومت کا چھوڑ جائے۔ چنانچہ وہ پھر ٹھیر گیا۔ اس کے تیرہ دن بعد جب سرداران روم، سیزر سے اس کی واپسی کے لئے الحاح و زاری کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ اور مایوس ہو کر واپس جانے لگے۔ تو دفعتہً یہ خبر معلوم ہوئی کہ ولادت ہوگئی ہے اور ولادت بھی لڑکے کی۔ سیزر خوشی سے اُچھل پڑا۔ اور کلیوپیٹرا کو ایک موقعہ اور مل گیا کہ وہ اس سے نکاح کر لینے پر اصرار کرے

سیزر خود بھی یہی چاہتا تھا کہ ہمیشہ کے لئے کلیوپیٹرا کو اپنے لئے مخصوص کر لے، لیکن وہ مجبور تھا۔ کیونکہ اسکی بیوی موجود تھی اور علاوہ اس کے قانون رومہ کی رُو سے وہ کسی اجنبی عورت کو اپنے نکاح میں نہ لا سکتا تھا۔ کلیوپیٹرا

اس سے کہلا بھیجا کہ وہ قانون سیزر کے لئے نہیں ہے جو خود قانون بنانے اور توڑنے کے لئے پیدا ہوا ہو لیکن سیزر اس کو ٹال جاتا۔ اس بار بھی اس نے اس مسئلہ کو نظر انداز کرنا چاہا، لیکن اس میں کامیاب نہ ہوا۔ اور دبی زبان سے وعدہ کرکے اپنے ملک کی طرف روانہ ہوگیا

چونکہ سیزر کی غیر حاضری سے دشمنوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ اسلئے سلطنت رومہ اس وقت سخت خطرہ میں مبتلا تھی۔ اور پمپائی کی فوجیں برابر بڑھتی آرہی تھیں۔ کلیوپیٹرا کی آغوش سے جدا ہوتے ہی سیزر کے فاتحانہ عزائم پھر عود کر آئے اور بجائے اپنے وطن واپس جانے کے وہ سیدھا ایشیا کوچک کی طرف روانہ ہوا اور وہاں دشمن کے بیڑہ کو تباہ کرکے اس نے کیسیس پر حملہ کیا، فرناسس کو شکست دی اور افریقہ پہونچ کر تھاپسس کی مہم سر کی اور اس طرح بے شمار دولت، بے اندازہ مال غنیمت لے کر وہ روم واپس آیا، جہاں اس کی پذیرائی ایسے تزک و احتشام سے کی گئی کہ سرزمین رومہ نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا —— سیزر نے جشن عام کے لئے خزانہ کو ملک عام کر دیا اور کامل ۴۰ دن تک جوش مسرت کی یہ کیفیت برپا رہی کہ لوگوں کو تن بدن کا ہوش باقی نہ رہا۔ جب جشن سے فراغت ہوئی تو دربار منعقد کیا گیا۔ جہاں بانئ اعظم کا خطاب دے کر اس کی کرسی سب سے بلند مقام پر رکھی گئی اور معبد جیوپیٹر میں اس کا مجسمہ قائم کرکے اس پر دیوتا کا لفظ کندہ کیا گیا

اسکندریہ کی حالت البتہ قابل اطمینان نہ تھی اور باوجودیکہ سیزر وہاں فوج چھوڑ آیا تھا، کبھی کبھی بغاوت کے آثار پیدا ہو جاتے تھے۔ اور لوگوں کی بے چینیاں بڑھ رہی تھیں —— کلیوپیٹرا پر پبلک کی طرف سے یہ الزام قائم کیا جاتا تھا کہ وہ ایک اجنبی شخص کو مصر پر مسلط کرنا چاہتی ہے، جو اُن کے ملکی، مذہبی اور قومی روایات کے بالکل خلاف تھا، اور چونکہ کلیوپیٹرا کا تسلط اچھی طرح قائم نہ ہوا تھا اس لئے وہ سازش کرنے والوں کو پکڑ کر قید و بند میں بھی نہ ڈال سکتی تھی، اتفاق سے اسی زمانہ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ سیزر نے مہم افریقہ کے دوران میں ملکۂ یونونیا سے تعلق پیدا کر لیا —— اس خبر نے ایک طرف تو اہل مصر کو اور زیادہ جری بنا دیا کیونکہ اس سے اُن کو یقین ہو چلا کہ اب سیزر، کلیوپیٹرا کی حمایت نہ کرے گا۔ اور دوسری طرف خود کلیوپیٹرا کو بہت اضطراب پیدا ہوگیا کہ کہیں سیزر ہاتھ سے نہ نکل جائے

اس دوران میں سیزر اور کلیوپیٹرا کے درمیان باہم مراسلت قائم رہی اور ہمیشہ سیزر اس کو اپنی محبت و وفاداری کا یقین دلاتا رہا، لیکن کلیوپیٹرا اس کو محسوس کرتی تھی کہ اگر یہ مفارقت چند دن اور اسی طرح قائم رہی تو اس کا اثر سیزر پر بالکل مٹ جائے گا۔ اور پھر مصر کی حکومت کرنا محال ہو جائے گا —— اس نے کئی بار سیزر کو لکھا کہ وہ روم آنا چاہتی ہے لیکن سیزر اس خیال سے کہ اہل رومہ اس کو کبھی پسند نہ کریں گے، ہمیشہ ٹالتا رہا۔ آخر کار جب کلیوپیٹرا بالکل مجبور ہوگئی تو اس کے ذہین دماغ نے ایک تدبیر نکال ہی لی اور اس نے سیزر کو لکھا کہ جو دوستانہ معاہدۂ اتحاد

روما اور مصر کے درمیان ہوا ہے اور جس کے بعض شرائط معرض بحث میں ہیں ان کو طے کرنے کے لئے وہ خود آنے والی ہے، حقیقتاً یہ ایک ایسا بہانہ تھا جس کے خلاف نہ سیزر کچھ کہہ سکتا تھا نہ اہل روما کو اعتراض کی گنجائش تھی، اس لئے سیزر نے اجازت دیدی اور کلیوپیٹرا روانہ ہوگئی

جون کا مہینہ ہے اور روما کا موسم بہار پورے شباب پر ــــ دربار کی عظیم الشان عمارت کھچا کھچ آدمیوں سے بھری ہوئی ہے اور سڑکوں پر ہر جگہ لوگوں کا ہجوم تبادلۂ خیال میں مصروف نظر آتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ کلیوپیٹرا، دربار کی رقاصہ ہے، جو ہر وقت طلائی زیور اور موتیوں سے آراستہ رہتی ہے، بعض نہایت سنجیدگی سے یہ خیال قائم کئے ہوئے ہیں کہ وہ کوئی ساحرہ ہے، کاہنہ ہے، جو ہر شخص کو مسحور و مرعوب کرلیتی ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس کی آغوش میں ہر وقت ایک ناگن کھیلتی رہتی ہے اور جس کو چاہتی ہے ڈسوا لیتی ہے، بعض کا خیال ہے کہ اس کا حسن بہت غیر معمولی ہے۔ اور بعض اس کو قبیح ترین شکل وصورت والی عورت سمجھتے ہیں۔ الغرض اہل روما کلیوپیٹرا کے دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں۔ اور چاروں طرف ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں

جلوس میں سب سے پہلے حبشی غلاموں کا ایک دستہ نظر آتا ہے۔ جن کے کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں جھول رہی ہیں، اس کے بعد خواجہ سراؤں کی ایک جماعت سامنے سے گزرتی ہے جو لمبی عبائیں پہنے ہوئے ہیں، پھر امراء و وزراء کی قطار نظر آتی ہے ان کے پیچھے کاہنوں اور نجومیوں کی جماعت گزرتی ہے، جنکی لمبی لمبی مخروطی شکل کی ٹوپیوں کو دیکھ کر اہل روما حیرت کر رہے ہیں۔ اور پھر پجاریوں کا گروہ سامنے آتا ہے جو شیر کی کھال اپنے جسم پر لپیٹے ہوئے ہیں

جب یہ سب یکے بعد دیگرے گزرجاتے ہیں تو چمکیلے نیزوں اور سیاہ ڈھالوں کی جھرمٹ میں ملکۂ مصر کی زریں پالکی نظر آتی ہے، چاروں طرف سناٹا چھا جاتا ہے اور ہر شخص کلیوپیٹرا کو دیکھنے لگتا ہے جو اپنی آغوش میں چھوٹے سیزر کو لئے ہوئے مسکرا رہی ہے ــــ اس کے سر پر ایک طلائی تاج تھا جس کے پشت سے ایک طلائی ناگن جھانک رہی تھی، آنکھوں میں سرمہ کی تحریریں کی آنکھوں کے سحر آگینی کو اور زیادہ نمایاں کر رہی تھی، غازہ کی سرخی سے اس کے چہرہ کی ملاحت پر ایک خاص صندلی رنگ پیدا ہو رہا تھا اور لباس اتنا باریک تھا کہ اس کے سینۂ وشانہ کا شباب نگاہوں میں کھپا جا رہا تھا

الغرض اس شان واہتمام کے ساتھ کلیوپیٹرا، روما کی سڑکوں سے گزرتی ہوئی اس قصر تک پہونچی جو سیزر نے دریائے ٹیبر کے ساحل پر حال ہی میں تعمیر کرایا تھا

کلیو پیٹرا کو روم آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ زمانہ گزر گیا ہے اور جشن و مسرت کی جتنی صورتیں ممکن ہیں سب اختیار کی جا رہی ہیں، پرتکلف دعوتیں ہیں اور رقص و سرود کے جلسے۔ مردانہ کھیلوں کی نمائشیں ہیں اور علمی مجالس کے مظاہرے۔ لیکن باوجود اس کے کہ کلیو پیٹرا یہاں کے ذہین و علمی طبقہ کو اپنی ذہانت و قابلیت سے مسخر کر چکی ہے، باوجود اس کے کہ سیزر کے شاہانہ اقتدار و جبروت کی حمایت حاصل ہے، وہ اس کو اچھی طرح محسوس کرتی ہے کہ ایک جماعت ایسی بھی موجود ہے جو نہ صرف اُسے بلکہ سیزر کو بھی قہر و غضب کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور معلوم نہیں کس وقت یہ آگ بھڑک کر چاروں طرف مشتعل ہو جائے

جشن لیوپرکیلیا پورے انہماک کے ساتھ منایا جا رہا ہے سیزر، صدر کی حیثیت سے بیٹھا ہوا ہے اور کلیو پیٹرا اس کے پہلو میں طلائی کرسی پر متمکن ہے

جس وقت قربانیاں ختم ہو جاتی ہیں اور میدان خون سے کافی رنگین نظر آنے لگتا ہے تو مارک انطانی جو سیزر کا سب سے زیادہ معتمد علیہ افسر ہے۔ زریں تاج لئے ہوئے اٹھتا ہے اور سیزر کے سر پر رکھدینا چاہتا ہے۔ سیزر انکار کرتا ہے لیکن کلیو پیٹرا —— جو اصل محرک اسی تجویز کی تھی، پھر اصرار کرتی ہے اور جب انطانی دوبارہ تاج لیکر بڑھتا ہے تو سیزر پھر انکار کرتا ہے۔ کیونکہ سیزر جانتا تھا ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے اور مخالفین اس سے فائدہ اٹھاکر عام برہمی پیدا کر دیں گے —— بعض لوگوں نے سیزر کے اس طرز عمل کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا اور بعض جو اس کے مخالف تھے انھوں نے سرگوشیاں شروع کر دیں کہ یہ سب مکر و فریب ہے۔ اور آج نہیں تو کل ضرور یہ اپنی ملوکیت کا اعلان کر دے گا

صبح کا وقت ہے اور سیزر دار الامراء جانے کی طیاریاں کر رہا ہے، کلیو پیٹرا کہتی ہے کہ آج اسقدر جلد جانے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن وہ نہیں مانتا اور کام کی اہمیت کا ذکر کر کے کیسیس کے ساتھ ہو لیتا ہے جسے بروٹس نے بلانے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ بروٹس اس کے دشمنوں میں سے ہے، وہ واقف تھا کہ مخالف جماعت کی سازشیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ لیکن اس نے اپنے اقبال و خوش بختی پر اعتماد کر کے کسی بات کی پرواہ نہیں کی اور دار الامراء کی طرف روانہ ہو گیا، لیکن اس کا اندر داخل ہونا تھا کہ دفعۃً ایک شور پیدا ہوا۔ اور پھر آناً فاناً شہر کے ایک ایک گوشہ میں یہ وحشت ناک خبر پھیل گئی کہ سیزر مار ڈالا گیا

دنیا انسانی دسترس سے دُور

یقیناً دورِ حاضر کی یہ نمایاں خصوصیت کبھی فراموش نہیں ہو سکتی کہ وہ دنیا کے غیر معروف و مجہول مقامات کے دریافت کرنے میں پوری جد وجہد سے کام لے رہا ہے

پھر یہ کشف و اکتشاف کا شوق کسی خاص مُلک اور خاص قوم کے مخصوص افراد پر منحصر نہیں بلکہ تمام ممالک اور جمیع اقوام و ملل اس سے متاثر ہیں۔ اور یہ اشتیاق بوڑھوں نوجوانوں مردوں اور عورتوں سب میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے

جب ہم کرۂ ارض کے نقشہ پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتک بکثرت ایسے مقامات موجود ہیں۔ جہاں انسانی قدم نہیں پہونچ سکا اور وہ اپنے مکتشفین کے منتظر ہیں۔ ہر چند انسان قطب شمالی و قطب جنوبی تک پہونچ گیا اور اس نے دنیا کے چھ براعظموں میں سے بہت سے مجاہل کا اکتشاف کر لیا۔ چین، ہندوستان، تبت، سائبریا جنوبی امریکہ، آسٹریلیا، نیوگنی، وغیرہ کے بہت سے غیر معروف مقامات کو اس نے دریافت کر لیا لیکن ہنوز بہت سے مقامات روئے زمین پر ایسے پائے جاتے ہیں جنکا علم انسان کو ابتک نہیں ہو سکا

چین میں کوہ این شان کے جوار اور تبت کے شمالی حدود میں بہت سے مجہول اور غیر معروف مقامات پائے جاتے ہیں۔ اور دنیا نہ تو وہاں کے حیوانات کے متعلق کچھ جانتی ہے نہ اس کو وہاں کے نباتات کا کچھ علم ہے۔ اگرچہ بہت سے سیاحوں نے وہاں تک پہونچنے کا ارادہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے

بحر اوخوٹسک سے ملا ہوا حصۂ زمین اور ہمالیہ پہاڑ کی ایورسٹ چوٹی کا حال ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہوا، اسی طرح نیوگنی کے پہاڑی سلسلے جن کی بلندی ۱۸ ہزار فیٹ تک ہے اور جن کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں، ان کا حال بھی دنیا سے پوشیدہ ہے۔ اور یہی حال بحر مرجان ایک غیر معروف آبی حصہ کا ہے جس کو ابھی تک کسی متمدن ملک کی کشتی نے عبور نہیں کیا

جزیرۂ بورنیو کے اندرونی حصے اور جزائر سلیبز و ملکولا بھی ابھی تک مجہول ہیں۔ لیبراڈور کے مجاہل، گرین لینڈ کے بعض اطراف، دریائے امیزن اور اوراِنوک کے چشمے، الاسکا کے شمالی حصے اور قطب جنوبی کے مناطق یہ سب کے سب پردۂ خفا میں ہیں

تاریخ کا ایک صفحہ | کشفِ مجاہل کا خیال انسانی دماغ میں قدیم زمانے سے پایا جاتا ہے اس لئے جغرافی

اکتشافات کا بڑا حصہ تیرھویں اور اُنیسویں صدی کے درمیان ہی طے ہوگیا - اور امریکہ افریقہ، ہندوستان، اور چین کے بہت سے مجاہل کا حال معلوم ہوگیا - امریکہ اور اس کے مجاہل دریافت کرنے میں اونیسویں صدی سے قبل ارکسن، کولمبس، امریکو، کارٹیز، بیز یرو، وغیرہم نے شہرت پائی - ۱۷۶۸ء میں جیمس کک نامی سیّاح اور اس کے بعد دنیا کے مشہور سیاحین کا ایک گروہ جس میں خاص سیّاح میگلن، واسکو ڈیگاما، مارکو پولو، منگو پارک ہیں، مشہور ہوئے - یہ تمام سیاحین باوجود اتنی شہرت کے سیاحین روم و یونان اور عرب سے (جو ان سے کئی سو سال قبل مشہور ہوئے) زیادہ نہ تھے جنہوں نے اُس تیرہ و تار زمانہ میں بہت سے شہروں اور ملکوں کو معلوم کرلیا تھا

جغرافیائی انجمنیں یوروپ اور امریکہ میں جغرافی سوسائٹیاں قائم ہونے سے پیشتر بڑے بڑے اکتشافات ظہور پذیر ہوچکے تھے - مگر یہ اکتشافات متحدہ اور اجتماعی مساعی کے نتائج نہ تھے - بلکہ انفرادی کوششوں کا ثمرہ تھے - لیکن انجمنوں کے قیام کے وقت سے لوگ اکتشافات مجاہل میں متحدہ طور پر بھی مشغول ہوئے - اس قسم کی سب سے پہلی انجمن پیرس کی جغرافی انجمن (Societe de Geographie de Paris) ہے جو ۱۸۰۰ء میں قائم ہوئی، اس کے بعد ۱۸۲۸ء میں برلین کی جغرافی انجمن قائم ہوئی - پھر ۱۸۳۰ء میں لندن میں ایک انجمن رائل جغرافی سوسائٹی کے نام سے قائم ہوئی جو تمام یورپ میں اس قسم کی مشہور انجمن ہے - ۱۸۴۵ء میں روس نے بھی اسی طرح کی ایک انجمن بنالی - امریکہ نے بھی ان ممالک کی اتباع کرتے ہوئے ۱۸۵۲ء میں امریکن جغرافی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۸۸ء میں ایک دوسری انجمن ملکی جغرافی سوسائٹی کے نام سے قائم کرلی - یہ انجمن تمام دنیا میں دیگر جغرافی انجمنوں سے زیادہ مشہور ہے

اٹلی میں بھی ایک جغرافی سوسائٹی ہے جو فلورنس میں امریکن ملکی جغرافی سوسائٹی کے قیام سے چار سال قبل یعنی ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی

ان انجمنوں نے جو گراں بہا علمی خدمات انجام دیں ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا - انھوں نے سیاحین کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی اور ان کو جتنے روپیہ اور سامان کی ضرورت پیش آئی اس کو فراہم کرنے میں ان انجمنوں نے طرح طرح سے امداد کی - اور بہت سے کمیشنوں کی تنظیم کرکے انکو بڑی بڑی سیاحتوں پر آمادہ کیا

سیاحین دو طرح کے ہیں ایک تو وہ جنہوں نے اپنے ذاتی اغراض و مفاد کے لئے اجتماعاً یا انفراداً سفر کئے، دوسرے وہ جن کو علمی انجمنوں نے اطراف عالم میں بھیجا - اکثر سیاحین روم و یونان و عرب کی غرض تجارۃ اور تجارتی منڈیوں کی افتتاح اور اپنے معاملات کی توسیع تھی - ان میں بہت سے ایسے تھے جو تجارتی مال ایک ملک سے دوسرے ملک کو لے جاتے تھے - اور اس کو فروخت کرتے تھے - بہت سے معادن اور کانوں کی تلاش میں گھومتے تھے - اور ایسے بھی تھے - جو غلاموں لونڈیوں اور جواہرات وغیرہ کی تجارت کرتے تھے

لیکن وہ سیاح جو انجمنوں کی طرف سے بھیجے گئے ان کی غرض صرف علم وفضل کی ترقی تھی ـــــ ان انجمنوں کے متعلق کتب خانے بھی ہیں جن میں بکثرت علمی کتابیں، تصاویر اور نقشے موجود رہتے ہیں۔ بعض سوسائٹیاں اپنے ذاتی اخبار و رسائل بھی رکھتی ہیں۔ تاکہ پبلک کو ان کے کارناموں کی اطلاع دی جاسکے

دنیا میں جس وقت سے یہ انجمنیں قائم ہوئی ہیں اس وقت سے سیاحین کا مقصد صرف کسی غیر معروف مقام کا ہی دریافت کرلینا نہیں ہے بلکہ بہت سے علمی نظریات وقضایا کا اثبات ہے جو طبقات الارض، مسئلۂ ارتقاء ناپید حیوانات اور ظہور انسان کی تاریخ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور جنکے متعلق علماء بحث وتمحیص کرتے رہتے ہیں

عصر جدید

یہاں ان چند اکتشافات کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو سیاحین بلاد ۱۸۵۰ء سے لے کر بیسویں صدی کے ابتدائی حصہ تک پورا کرچکے ہیں

بہت سے سیاحوں نے وسط ایشیا میں پامیر پلیٹو اور بیچوریا (شرق ایشیا) کی سیاحت کرکے بکثرت غیر معروف مقامات کا پتہ لگایا جو اس سے پیشتر معرض خفا میں تھے۔ سر ولیم کونوائے نے ۱۹۰۹ء میں کراہورن کے مجاہل کو دریافت کیا جو اب الس لینڈ کے نام سے مشہور ہیں

۱۸۴۷ء میں جرمنی کے دو شخصوں نے افریقہ کے کلیمنگرو پہاڑ کا سلسلہ اور ملک کینیا دریافت کیا۔ اسی سنہ میں حیٹیولنسن نامی سیاح نے نگیمی جھیل کا اکتشاف کیا اور دوران سیاحت میں وکٹوریہ اور دریائے زمبیزی کے آبشار اور روڈیزیا کے شمال تک پہونچ گیا۔ ۱۸۵۸ء میں برٹن وسبیک نے ٹینجنیکا جھیل کا پتہ لگایا۔ اس کے دوسرے سال سبیک نے نیانیزا جھیل کو معلوم کیا۔ ۱۸۷۸ء میں سرد ابنٹو سیاح نے جنوبی افریقہ کو طے کیا۔ اسی سنہ میں ادسکار لنز نے صحارا میں طنجہ سے ٹمبکٹو تک سفر کیا۔ اور سوشی نامی سیاح نے مصر سے خلیج گنی تک سفر کیا۔ اسی سلسلہ میں بالگریو (Palgrave) کا سفر بلاد عرب ویمبرگ (Vambery) کا سفر ترکستان اور ویلیز (Villin) کی سیاحت اوسٹریلیا میں، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں

اہل جرمنی کی ایک جماعت (Shlagintwel) نے مجاہل ہندوستان اور تبت کا سفر کیا نیز کوہستان ہمالہ، قراقرم وکوئنلن میں گھومی۔ ۱۸۹۵ء میں انگریز سیاحین کا ایک گروہ قطب جنوبی تک پہونچا۔ اور اس نے قطب جنوبی کے مقناطیسی مقام کا تعین کیا۔ (۱۸۴۲ء میں روس ایک انگریز سیاح منطقہ قطب جنوبی کے ۸۰ درجہ دقیقہ تک پہونچ چکا تھا) ۱۹۰۹ء میں شکلٹن نامی سیاح ایک ایسے مقام پر پہونچا جو قطب جنوبی سے ۹۷ میل کے فاصلہ پر تھا

منطقہ قطب شمالی کے اکتشاف میں بھی بہت سے لوگوں نے حصہ لیا چنانچہ ۱۸۸۸ء میں نیسنن نامی سیاح نے بلاد گرین لینڈ کو طے کیا۔ اور ڈیوک ڈبروزی ۱۹۰۰ء میں ۸۶ درجہ ۳۲ دقیقہ تک شمال میں پہونچا

گزشتہ صدی کے ربع اخیر میں فرنکلن، کین، ہینکس، گریلے، اور مکلسن نے قطب تک پہونچنے کے لئے بے انتہا کوششیں کیں تاکہ کوئی قریب ترین اور سہل راستہ دستیاب ہو

قرن سابق کے اخیر میں زوربریگن نامی ایک سوئٹزرلینڈ کے سیاح اور اس کے ساتھی وین نے کوہستان انڈیز پر جانے کا ارادہ کیا اور وہ دونوں اکونگوا چوٹی تک (جس کا ارتفاع ۲۳۰۸۰ فیٹ ہے) پہنچ گئے یہ چوٹی کوہستان انڈیز کی کی بلند ترین چوٹیوں میں ہے اور کوہستان قراقرم کی بلند ترین چوٹی سے بھی کچھ زیادہ بلند ہے

۱۹۰۹ء میں پیرے امریکن سیاح قطب شمالی تک پہونچا اور راثنا سفر میں اس کو بہت زیادہ مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے دو سال بعد سوئڈن کا ایک سیاح جس کا نام امنڈسن تھا قطب جنوبی پہونچ گیا۔ اسی زمانہ میں مویر داکن، ڈوسن، رسل وغیرہ نے بھی چند سفر کئے اور بلاد لبراڈور۔ و۔ الاسکا میں سیاحت کر کے بہت سے ایسے غیر معروف مقامات کا پتہ چلایا جن کو دنیا اس سے قبل مطلق نہ جانتی تھی

اب کیا باقی رہگیا؟ مندرجۂ بالا بیان کو پڑھنے کے بعد یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ اب کوئی مقام سطح ارضی پر غیر معروف باقی نہیں رہا جس کے انکشاف کی ضرورت ہو، کیونکہ ابھی تک زمین کا بڑا حصہ ایسا پڑا ہوا ہے جہاں انسانی قدم اس وقت تک نہیں پہونچ سکا اور سیاحوں کی جماعتیں ان کے انکشاف کی فکر میں لگی ہوئی ہیں ——

ہم اس وقت برقی قوت، اسٹیم اور ریڈیو کے زمانہ میں ہیں اُنھوں نے بعید مقامات کو قریب اور بہت سی اشیاء کے چہرہ کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اب انسان آسانی کے ساتھ بحر و بر اور ہوا میں ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کر سکتا ہے —— موجودہ زمانہ میں کوئی سیاح کسی جگہ کی سیاحت کے لئے اس وقت تک آمادہ نہیں ہوتا۔ تاوقتیکہ اس کے ہمراہ بکثرت نقشجات، تصاویر، کتابیں اور آلات تصویر موجود نہوں اس کے علاوہ اور دیگر اشیاء (جن کے بغیر کامیابی دشوار ہے) کا ساتھ ہونا ضروری ہے

قدیم سیاحین کے سفرنامے اگرچہ رسوم و تصاویر سے خالی ہیں۔ مگر پھر بھی موجودہ زمانے میں ایک حد تک مفید ثابت ہوتے ہیں۔ آجکل کے سفرنامے قدیم سفرناموں سے بالکل مختلف ہیں۔ کیونکہ ان میں سرسری طور پر کسی غیر معروف مقام کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ وہ بڑے بڑے علمی مباحث پر مشتمل ہیں۔ ان میں نباتات و حیوانات کے فوٹو اور ان کے خصائص، جیولوجی، علم ارصاد جویہ وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ یا دوسری طرح یوں کہنا چاہیئے کہ جدید سفرنامے فی الحقیقت علمی مولفات ہیں جنسے انسان بے شمار معلومات کا استفادہ کرتا ہے

اس وقت دنیا کے کتنے حصے ایسے ہیں جنکا حال ابتک معلوم نہیں ہوسکا۔ اسی کا جواب محال ہے اور ان تمام غیر معروف مقامات کا حصر ممکن نہیں، تاہم سیاحین بلاد کو قرن حاضر کے اختتام سے قبل ہی ان کے انکشاف کی امید ہے۔ اس

انکشاف سے دنیا کا نقشہ مکمل ہوجائے گا اور کوئی مقام کرۂ ارضی کی سطح پر مجہول نہ رہیگا۔ سائنس و اختراعات کی ترقی، فن پرواز کا کمال۔ برق و بخار سے حرکت پانے والی مشینیں اور لاسلکی کے آلات یہ تمام چیزیں عنقریب سیاحین کے لئے اُن کی کامیابی کا باعث ہوں گی۔ ذیل میں خاص خاص مجاہل بیان کئے جاتے ہیں

(۱) بلاد سائبریا کا شمالی مشرقی حصہ جو ایک وسیع میدان ہے جہاں تمام سال برف گرتی ہے اور زمین برف سے ڈھکی رہتی ہے اس ملک میں ہوا کے بہت تیز بگولے اٹھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسان وہاں کا کچھ حال نہیں جانتا

(۲) افریقیہ میں جبال قمر کے گرد و پیش کے گھنے جنگل جہاں گوریلا بندر پایا جاتا ہے، یہ بندر اور بندروں کے بہ نسبت انسان سے زیادہ مشابہ ہے۔ علمار ان مقامات کا کچھ اور حال نہیں جانتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر علمار ایسے مقامات تک پہونچ سکے تو ان کو نظریۂ نشو و ارتقار، اسرار وراثت اور مخلوقات حیوئیہ کی ترقی کے راز کے اثبات کے لئے بہت کچھ مواد فراہم ہوجائے گا

(۳) قطب جنوبی کے وسیع مجاہل جن میں کہ اب تک کسی سیاح نے بہ تمام و کمال سیاحت نہیں کی

(۴) دریائے اور ونیکو اور امیزن کا منبع

(۵) نئی دنیا (امریکہ) کے قدیم متوحش باشندگان کے رہنے اور بسنے کے مقامات اور افریقیہ میں زنگی وحشیوں کے مسکن

(۶) جزیرہ گرینلینڈ (جو شمالی امریکہ کے مشرق و شمال میں واقع ہے) کا بہت بڑا حصہ

(۷) جنوبی امریکہ میں شمالی قطعہ کے بہت سے مقامات

(۸) شمالی اسٹریلیا کے چھوٹے چھوٹے حصے

(۹) جزیرۂ بورنیو جزائر نیوگنی اور جزائر فلیپائن کے وسطی حصے

(۱۰) بحرالکاہل میں شمالی اوسٹریلیا کے بعض جزائر

(۱۱) جنوبی امریکہ میں جنوبی مغربی ساحل کے بعض ٹکڑے

(۱۲) جزیرۂ آئسلینڈ کے شمالی اطراف

(۱۳) جزائر فرانسو جوزف کے بعض جہات

(۱۴) جزیرۂ سماترا کے بعض حصے

اس کے علاوہ بہت سے غیر معروف مقامات کرۂ ارضی پر موجود ہیں۔ اور وہ اپنے مکتشفین و سیاحین کے منتظر ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ موجودہ صدی کے اختتام سے قبل روئے زمین پر کوئی مجہول مقام باقی نہیں رہے گا

اپنی ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو ہی گئے

ان کی تبلیغ یہ تھی کہ نماز جمعہ و نماز عیدین ہندوستان میں نہ پڑھنا چاہئے کیونکہ یہ دارالحرب ہے اور بجائے لفظ پیر و مرید کے آیندہ اُستاد و شاگرد کے الفاظ استعمال کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے بیعت کے وقت ہاتھ میں ہاتھ لینے کے طریقہ کو بند کر کے صرف توبہ کو جاری کیا۔ ان مسائل میں تو خیر ان کی مخالفت زیادہ نہیں ہوئی، لیکن جس وقت انھوں نے یہ اعلان کیا کہ نوزائیدہ بچہ کی نال دائی سے کٹوانا ہندوؤں کی رسم ہے اس لئے اس کو ترک کرنا چاہئے اور خود باپ کو نال کاٹنا چاہیے، تو سخت برہمی لوگوں میں پیدا ہوئی اور ان کے بہت سے مرید پھر گئے۔ چونکہ کاشتکاروں کی بڑی جماعت پر ان کا اثر قائم ہو چکا تھا۔ اور وہ اس جماعت میں اتحاد پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے زمیندار بہت خالف تھے اور اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر وہ بھی درپئے آزار ہو گئے، یہاں تک کہ ان کو نوا باری (ضلع ڈھاکہ) چھوڑ کر، جہاں وہ مقیم تھے اپنے وطن چلا جانا پڑا

وطن پہونچ کر پھر انھوں نے اپنا سلسلۂ رشد و ہدایت قائم کیا اور جہلا کی کثیر جماعت ان کی مُرید ہو گئی۔ رفتہ رفتہ ان کا اثر اسقدر وسیع ہو گیا کہ کسی کو مخالفت کی ہمت نہ ہوئی۔ اور وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنا حلقہ بڑھاتے رہے

ان کے بعد ان کے بیٹے محمد محسن جانشین ہوئے، جو "دودھو میاں" کے نام سے مشہور تھے اور اب بھی اضلاع فرید پور، پبنا، باقر گنج، ڈھاکہ اور نواکھالی میں کوئی شخص ایسا نہیں جو "دودھو میاں" سے ناواقف ہو۔

دودھو میاں ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے اور بہت کمسنی میں مکہ چلے گئے۔ جب واپس آئے تو انھوں نے بیان کیا کہ انکو خواب میں بشارت ہوئی ہے اور وہ خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے مامور کئے گئے ہیں۔ چونکہ باپ کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے ان کی جگہ لے لی۔ اور بعض نئی تعلیمات بھی لوگوں کے سامنے پیش کیں ـــــ مثلاً یہ کہ بھنگا (ایک کیڑا جسے بوٹے بھی کہتے ہیں اور جو اُچک کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچتا ہے) کو انھوں نے حلال قرار دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ٹڈی عرب میں عام طور پر کھائی جاتی ہے اور ہندوستان کا بھنگا بھی بالکل وہی چیز ہے۔ پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی چیز وہاں حلال ہو اور یہاں حرام

دودھو میاں کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے باقاعدہ اجتماعی زندگی کی روح لوگوں میں پیدا کی اور ویشنوئی ہندوؤں کی طرح انھوں نے بھی مشرقی بنگال کے کئی حصہ کر کے ہر جگہ اپنا ایک خلیفہ مقرر کیا۔ خلیفہ کا فرض ہوتا تھا کہ وہ مرکزی تعلیمات کی اشاعت کر کے لوگوں کو منظم طور پر ایک رشتہ سے وابستہ رکھے اور ہر شخص سے چندہ فراہم کر کے صدر مقام پر دودھو میاں کے پاس بھیجتا رہے جو اس جماعت کی تنظیم کے تنہا ذمہ دار تھے

اس جماعت کے اتحادِ عمل کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر کوئی زمیندار اس جماعت کے کسی کاشتکار کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرتا مرکزی فنڈ سے مقدمہ لڑنے کے لئے روپیہ دیا جاتا اور بعض دفعہ اگر ضرورت ہوتی تو آدمی بھیجکر زمیندار

کی زدوکوب کی جاتی اور اس کا گھر لوٹ لیا جاتا۔

حاجی شریعت اللہ کی زندگی میں یہ جماعت نہ زمینداروں کے طبقہ سے برسرپیکار ہوتی تھی نہ قانون کی مخالفت کرتی تھی، لیکن جو باپ سے نہ ہوسکا وہ بیٹے نے کر دکھایا اور دُدھو میاں نے گویا علانیہ زمینداروں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

چونکہ زمینداروں کو اس جماعت کی تنظیم سے سخت نقصان پہونچ رہا تھا اس لئے وہ اپنے کاشتکاروں کو جسمانی ایذا دے دیکر اس جماعت میں شرکت سے باز رکھنا چاہتے تھے اور ادھر دُدھو میاں بھی ہر اس کاشتکار کو جو ان کی جماعت میں شریک نہ ہوتا تھا سخت سزائیں دیدیکر اپنی طرف کر لیتے تھے۔ سزا کا خاص طریقہ یہ تھا کہ جو لوگ کہنا نہیں مانتے ان کو باندھکر سرخ مرچ کا سفوف ناک میں ڈال دیا جاتا تھا۔ الغرض اس جنگ میں زمینداروں کو شکست ہوئی اور دُدھو میاں کی جماعت روز بروز بڑھتی رہی۔

دُدھو میاں کی تبلیغ یہ تھی کہ تمام انسان ایک ہیں اور غریب و امیر میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ جس طرح ایک امیر اپنی فلاح چاہتا ہے اسی طرح ایک غریب کو بھی اپنے مصالح کے تحفظ کا اختیار حاصل ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی ایک شخص جماعت کا کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو سب کا فرض ہے کہ وہ اس کی مدد کریں اور اس مقصد کے حصول کے لئے مخالف جماعت پر ہر ممکن ظلم روا ہے۔

زمینداروں کی طرف سے جو بے ضابطہ ٹیکس کاشتکاروں پر عائد ہوتے تھے، ان کے وہ سخت مخالف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دُرگا دیوی کے مندر کے لئے ایک مسلمان کاشتکار پر کیوں ٹیکس عاید کیا جائے یا رام لیلا کے جشن کے لئے کیوں اس کو چندہ دینے پر مجبور کیا جائے۔

اس کے بعد دُدھو میاں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، یعنی اب انھوں نے یہ اعلان کیا کہ زمین خدا کی ہے اور کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ وراثتاً اس پر قابض رہے اور لگان وصول کرے۔ چنانچہ ایک بڑی جماعت اُن کے مریدوں کی زمینداروں کی زمینیں چھوڑ بیٹھی اور خالصہ کی زمین کاشت کرنے لگی جہاں انھیں مالگزاری براہ راست گورنمنٹ کو دینا پڑتی تھی اور درمیان میں زمیندار حائل نہ تھے۔

زمینداروں نے مجبور ہو کر آخر کار دُدھو میاں کے خلاف بہت سے جھوٹے مقدمے بنائے۔ ۱۸۳۸ء میں ان پر لوٹ مار کا الزام قائم کیا گیا، ۱۸۴۱ء میں قتل میں ماخوذ کیا گیا، لیکن دونوں مرتبہ ثبوت فراہم نہ ہونے کی وجہ سے چھوٹ گئے۔ ۱۸۴۴ء میں مداخلت بیجا کا مقدمہ چلایا گیا، ۱۸۴۶ء میں بلوہ کا، اور ۱۸۴۷ء میں سرقہ بالجبر کا لیکن کسی میں کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۸۵۳ء میں جب ان پر مقدمہ چلایا گیا تو حالت زیادہ نازک ہو گئی تھی اور حکومت کو فوجی دستہ بھیجنا پڑا ــــــ تمام مشرقی بنگال میں ان کے جاسوس متعین تھے اور تمام خبریں پہونچایا کرتے تھے۔ حالت یہ ہو گئی تھی

کہ اس جوار کے تمام جھگڑے یہی طے کیا کرتے تھے اور کوئی شخص عدالت میں مقدمہ لیجاتا تھا تو اس کو سخت سزا دیتے تھے۔ یہ لوگوں کے نام احکام بھی صادر کیا کرتے تھے جن پر " احمد نام نامعلوم " کے دستخط ثبت ہوا کرتے تھے۔ جن لوگوں کے پاس اس دستخط کے احکام پہونچتے تھے وہ کانپ اٹھتے تھے اور خاموشی کے ساتھ بلا چون و چرا تعمیل کر دیا کرتے تھے
بتاریخ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۶ء بہادر پور میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے، لیکن دریائے اریل نے اب ان کے مکان و مزار دونوں کو بے نشان کر دیا ہے۔ انھوں نے تین لڑکے اپنے بعد چھوڑے، لیکن ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ اپنے باپ کی اس تنظیم کو قائم رکھ سکتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ جماعت کمزور ہو گئی۔ اب بھی بعض افراد اس مسلک کے پائے جاتے ہیں۔ جو جمعہ اور عیدین کی نماز نہیں پڑھتے۔ اس مسلک کا نام اہل الفرائض یا فرایضی تھا۔

شہوانیات　یا　ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے،
اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے۔ اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز حالات و واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول (۸ر) آٹھ آنہ کے مجلد کتاب صرف ۳ میں اور غیر مجلد ۲ میں ملے گی۔ اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۴ میں. اور غیر مجلد ۳ میں علاوہ محصول (۸ر) کے ملے گی۔ اگر ارشاد ہو تو یہ کتاب ذریعۂ وی۔ پی روانہ کی جائے۔ حجم ۳۷۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے

منیجر نگار لکھنؤ

آہِ طباطبائی

گلشنِ ماضی کو ویراں کر چکی اے ہمصفیر! انقلاب افگن ہوائے عہدِ نو کی دار و گیر
عہد حاضر نے بدل دی علم و دانش کی فضا کوئی تہذیب کہن کا اب نہیں منت پذیر
مٹ رہا ہے رفتہ رفتہ اضطرابِ خاکِ نجد اُٹھ رہے ہیں پے بہ پے گیسوئے لیلےٰ کے اسیر
مدتیں گزریں کہ دنیا کر چکی ان کو تباہ اب نہ وہ ایوانِ شیریں ہے نہ رقصِ جوئے شیر
پھر بھی ہیں اک چیز عہد رفتہ کے اہل کمال کر نہیں سکتا جنھیں مجروح دورِ چرخ پیر
ان کا ذوقِ علم تھا پابندِ تحقیق و تلاش کھو کھلے پندار کے مجرم نہ تھے ان کے ضمیر
صاف باطن، نیک دل، شائستہ خو، سادہ مزاج عہدِ عشرت کے ندیم، ایامِ غم میں دستگیر
ہو کہیں اے عہدِ نو! ان کی محبت کا جواب ان کی دانش کی مثال، انکی صداقت کی نظیر
پھول اس گلشن میں اب اس رنگ کے کھلتے نہیں بے ریا دل ڈھونڈھنے پر بھی کہیں ملتے نہیں

آہ اے نظم، اے فروغ مجلسِ اہل کمال! تھا سراپا درسِ بینش تیری فطرت کا جلال
تجھ سے روشن تھا چراغِ محفلِ داغ و امیر تجھ سے رخشاں تھی بساطِ گلشنِ رشک و جلال
بے تکلف اوجِ گردوں سے گزر جاتا تھا تو کس قدر یعنی سبک تھی تیری پروازِ خیال
عظمتِ عہدِ کہن جی کھول کر آنسو بہا اب کہاں ایسے ادیب و شاعرِ شیریں مقال
دے چکے دنیا کو داغِ ہجر شادِ نکتہ سنج ہو چکے رخصت جہاں سے اکبرِ نازک خیال
نظم نے بھی اب سنبھالا ایک بیک رخت سفر نظم تھا جو بالیقیں سر حلقۂ اہلِ کمال
کون اب بخشے گا روحِ عشق کو احساس درد کون اب کھولے گا اہلِ شوق پر رازِ جمال
کیا مگر کیجئے، اٹل آئینِ قدرت ہے یہی بدر کی صورت چمکنے پر بھی لازم ہے زوال

حیف اب یہ گلشن برباد کھل سکتا نہیں!
دہر میں ان کا جواب آئندہ مل سکتا نہیں

علی اختر (حیدرآباد دکن)

دَورِ جدیدْ

فلسفہ ہے زندگی کا آج کل بدلا ہوا — نشۂ عیش و طرب میں ذہن ہے ڈوبا ہوا

موسمی آثار میں ہیں جذب تنویریں تمام — توڑ ڈالیں عشق نے مستی میں زنجیریں تمام

رخصتِ پرواز ہے تخئیل بے زنجیر کو — جس طرح کیوپڈ ہواؤں میں چھوڑ دے اک تیر کو

ہے فضائے بزم حسن و عشق سے لبریز آج — آتشِ جذبات ہے حد سے زیادہ تیز آج

بھر دئے رنگیں پیالے وقت نے حسبِ مراد — ہر زباں پر آج ہے "عہد جوانی زندہ باد"

عمر میں اک وقت خود آتا ہے ایسا خوشگوار — زندگی انسان کے قدموں پہ ہوتی ہے نثار

خودپرستی ہے شرابِ لالہ فامِ زندگی — اور پی لیتا ہے اس کو تشنہ کامِ زندگی

بادلو آؤ کہ چھا جائیں فضائے مست پر — بارشِ کیف و مسرت ہو بلند و پست پر

بیخودی دل کو رباب و چنگ کا پیغام دے　　لا مجھے لرزیدہ ہاتھوں سے چھلکتا جام دے

سوچ رکھا ہے کہ سارے میکدوں کو توڑ کر

دل بناؤں مست و آوارہ سا اُن کو جوڑ کر

صبحِ عشرت زندگی کی ہے، مری ہر ایک شام　　ہے ضیائے جلوۂ خورشید، تاروں کا پیام

ساری دنیا سے الگ اک کیف میں ڈوبا ہوا　　گا رہا ہوں اپنے نغمے آپ ہی بیٹھا ہوا

منزلِ عشرت پہ آکر رُک گیا ہے کارواں　　ان مناظر سے اب آگے ہیں شکستہ وادیاں

چاہتا ہوں ختم ہو جائے مری منزل یہیں　　دیں یہیں، دنیا یہیں، محشر یہیں، محفل یہیں

بڑھ سکے اس سے نہ آگے کاروانِ زندگی　　ساز اپنا توڑ دے ای نغمہ خوانِ زندگی

زندگی کا مل گیا رنگین تر حاصل مجھے　　میری موجیں کھینچ لائی ہیں سرِ ساحل مجھے

صبح حُسنِ زندگی، راتیں جمالِ زندگی

میں سمجھتا ہوں یہ ہے حدِ کمالِ زندگی

محمد صادق ضیا (بی اے)

جانِ تغزل:—

جو ہدف ہو تیری نگاہ کا گلۂ ستم وہ کرے گا کیا جسے تو سکوت کا درس دے وہ زبان سے اپنی کہے گا کیا

مجھے اے نسیمِ بہار تو نہ سنا ترانۂ سرخوشی کہ گراں ہو جس پہ ہر اک نفس وہ یہ جامِ عیش پیے گا کیا

جو سکونِ دل سے ہو بےخبر اسے بزمِ عیش سے کیا غرض جسے آہ و اشک ہو زندگی وہ رہینِ درد ہنسے گا کیا

کوئی تجھ سے بلبلِ خوشنوا، مجھے دشمنی تو نہیں مگر جو خزاں کی زد میں ہو مضمحل وہ چمن کھلا تو کھلے گا کیا

جسے عشق لذتِ غم نہ دے، اسے کیوں حیات گراں نہ ہو جو پیامِ دل بھی نہ سن سکے وہ نوائے روح سنے گا کیا

رگ و پے میں صبر شکن خلش، جسے دو گھڑی بھی سکوں نہ دے

وہ مریضِ اختر بےنوا، کوئی دن جیا تو جیے گا کیا

علی اختر

(حیدرآباد دکن)

جذبات جاذب دہلوی :—

کون جاتا ہے گلستاں کی طرف؟   جا رہا ہوں میں بیاباں کی طرف
دشت میں کانٹے ہیں اسکے منتظر   کسنے دیکھا ہی گلستاں کی طرف؟
کیا بلندی اور پستی میں ہی فرق!   دیکھنا گورِ غریباں کی طرف

کہہ رہا ہی کون محفل میں پُرانی داستاں   یہ تو خود پہلے ہی سے مست خمارِ دوش ہی
وقت جب تاثیر کا آیا تو نالے تھم گئے   کارواں بیدار ہی بانگِ درا خاموش ہی

مجھے آتا ہی سب کچھ ایک خاموشی نہیں آتی   میں دانا ہوں اگرچہ مجکو دانائی نہیں آتی
کبھی جاتے تھے نالے آسماں پر اب یہ حالت ہے   تمنا ایک ہی دل میں جو لب تک بھی نہیں آتی

آنکھوں سے میری پردۂ غفلت اٹھا دیا   کس نے مرے بجھے ہوئے دل کو جلا دیا ؟
میرے مٹائے سے نہیں مٹی مگر خودی   ایسا تو ہو چکا ہی کہ خود کو مٹا دیا
اپنی نظر سے میں نہ گرا ایک بار بھی   گو اس نے لاکھ بار نظر سے گرا دیا

فرض انجم ملا ہے آنکھوں کو   ان کو دامانِ شب بھگونا ہے
ہاں ذرا اور تیز ہوں آنسو   زندگی کو مجھے ڈبونا ہے

"گریۂ یتیم"

(۱)

کوئی حسین نہیں جو دل میں جلوہ گر نہ ہوا   قرارِ جاں نہ ہوا راحتِ جگر نہ ہوا
سوادِ دیدہ میں جو تابشِ نظر نہ ہوا   مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۲)

مری نظر میں جمالِ حریمِ ناز رہا   ہجومِ عیش و مسرت سے ساز باز رہا
ہمیشہ دور میں پیمانۂ مجاز رہا   مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۳)

فسانے عشق و محبت کے عیش کوش رہے   ترانے محفلِ خلوت کے وقفِ گوش رہے
بہارِ عیش خیالات نائے و نوش رہے   مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۴)

گئی نہ کشمکشِ ہائے ہوئے رنج و ملال   مٹی نہ کاوشِ اندوہ و یاس و اضمحلال
وفورِ غم سے رہا سینہ صورتِ غربال   مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۵)

کھلا نہ دل پہ کبھی رازِ کارزارِ حیات   الم فزا ہے اسرارِ حشر و نشر و ممات
عذابِ جاں ہی ہر لحظہ آرزوئے نجات   مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۶)

کبھی نہ بند ہوا بابِ فتنۂ دوراں   رہا تسلسلِ سیلابِ فتنۂ دوراں
الم نوا رہی مضرابِ فتنۂ دوراں   مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۷)

جگر گداز تھا دردِ نہانِ گریۂ شمع   حدیثِ ناز تھی شرحِ بیانِ گریۂ شمع
زبانِ راز تھا اشکِ روانِ گریۂ شمع   مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۸)

صدائے صورِ قیامت تھا نالۂ بلبل   فراقِ گل کی حکایت تھا نالۂ بلبل
نمک فشانِ جراحت تھا نالۂ بلبل   مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۹)

فغانِ قمریِ حسرت زدہ وہ غم آموز   چکور کا غم مہ میں وہ نالۂ دلدوز
وہ "پی کہاں" کی صدا جاں گداز و مایۂ سوز   مگر ہوا نہ مرے قلب پر اثر نہ ہوا

(۱۰)

کیا نہ قلب کو آہِ لئیم نے ٹکڑے   کیا نہ قلب کو خوفِ جحیم نے ٹکڑے
کیا نہ قلب کو حالِ سقیم نے ٹکڑے   کیا تو گریۂ طفلِ یتیم نے ٹکڑے

غلام جیلانی عاصی

ذوق بے نیازی

وہ زندگی کا موسم — زندہ دلی کا موسم
وہ عہدِ کامرانی — وہ دورِ شادمانی
اب ختم ہو چکا ہے — نشتر چبھو چکا ہے
ارمان مٹ گئے ہیں — ہیجان مٹ گئے ہیں
وہ سرخوشی کہاں اب — وہ بے خودی کہاں اب
ارمان خیز دل پر — طوفان خیز دل پر
افسردگی ہے طاری — آزردگی ہے طاری
دنیا کی کلفتوں نے — ظاہر کی اُلفتوں نے
ناشاد کر دیا ہے — برباد کر دیا ہے

لیکن جہاں کے والی — کون و مکاں کے والی
ہر تلخ امتحاں میں — جینا تو ہے جہاں میں
پھر یہ عذاب کیسا ؟ — یہ اضطراب کیسا ؟
آہ و فغاں سے حاصل ؟ — رنجِ زیاں سے حاصل ؟
ہے مضمحل تو کیا غم — ٹوٹا ہے دل تو کیا غم
اک اور دل بنا دے
سب رنج و غم مٹا دے

عدمؔ

درس حیات

تذبذب ایک دردِ لا دوا ہے — امید و بیم کی کیا انتہا ہے
نتیجہ کیا ہے اس مستقل کا — تفکر خون پی لیتا ہے دل کا
یہ عقلِ روح آشام اک بلا ہے — مجسم موت، سراپا قضا ہے
خدارا چھوڑ شغلِ سینہ کاوی — کہ ہو جائے نہ تجھ پر موت حاوی
شعارِ بے نیازی زندگی ہے — خمارِ سرفرازی، زندگی ہے
حوادث خیز ہیں دورِ آسماں کے — حوادث تھم نہیں سکتے جہاں کے
دلِ بیتاب کو سیماب خو رکھ — تبسم سے لبوں کو سرخرو رکھ
دعا کو ہاتھ اٹھانا بزدلی ہے — شکستِ زندگی ہے، بیکسی ہے
جفاکش بن، جفا آشام ہو جا — فگارِ لذتِ آلام ہو جا !
نہ کر توہین لیکن زندگی کی — کہ یہ خوگر نہیں شرمندگی کی
ارادوں میں عمل کی آگ بھر دے
اُجالا محفلِ ہستی میں کر دے

عدمؔ

معلومات

یوروپ کے عہد وسطیٰ کی حماقتیں

اس وقت یوروپ و ایشیا ہر جگہ قانون کی دسترس صرف انسانوں تک ہے اور جانور اس سے مستثنیٰ سمجھے جاتے ہیں، لیکن قرون وسطیٰ کے یوروپ میں جانوروں کے خلاف بھی بالکل اسی طرح مقدمے چلائے جاتے تھے جس طرح انسانوں کے خلاف دائر کئے جاتے ہیں۔ باقاعدہ استغاثہ کیا جاتا تھا، شہادت طلب ہوتی تھی، جانور گرفتار کرکے قید و بند میں ڈالا جاتا تھا۔ اور اس کے خلاف یا موافق فیصلہ صادر کیا جاتا تھا

سنہ ۱۱۲۰ء اور سنہ ۱۷۴۰ء کے درمیان فرانس میں ۹۲ جانوروں کے خلاف فیصلے صادر کئے گئے اور ان کو قتل کی سزا دی گئی۔ ایک کسان کو کسی بیل نے اتنا زخمی کر دیا کہ وہ مر گیا، مقتول کے ورثا نے اس بیل کے خلاف مقدمہ چلایا اور عدالت سے حکم صادر ہوا کہ جلسۂ عام میں اس کو پھانسی دی جائے۔ اسی طرح سنہ ۱۴۹۹ء میں چودہ سال کے ایک لڑکے کو کسی بیل نے مار ڈالا اور اس کو بھی پھانسی کی سزا دی گئی۔ پھر یہ رواج صرف فرانس ہی تک محدود نہ تھا بلکہ دوسری مغربی سلطنتوں میں بھی پایا جاتا تھا

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواج صرف اس خیال کی بنا پر قائم ہوا تھا کہ ایک جانور اسی وقت ایسی حرکتیں کرتا ہے جب اس کے اندر کوئی عفریت حلول کر جاتا ہے اور یہ سزا فی الحقیقت جانور کو نہیں بلکہ اس عفریت کو دی جاتی ہے جو اس کے خون میں دوڑ رہا ہے

چنانچہ امریکہ کے کسی شخص کے پاس ایک سؤر تھا جسے اس نے سدھا کر بہت سے کھیل تماشے کرنا سکھایا تھا۔ یہ شخص اطراف ملک کا دورہ کیا کرتا تھا۔ اور تماشہ دکھا دکھا کر لوگوں سے انعام وصول کیا کرتا تھا۔ جب یہ شخص ہوآنا میں پہونچا تو یہ خیال کیا گیا کہ ضرور اس کے اندر کوئی عفریت کام کرتا ہے اور آخرکار اس کے خلاف مقدمہ چلا کر ہلاک کر دیا گیا

سنہ ۱۴۷۴ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر باسل میں ایک مرغ نے انڈا دیا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور حاکم نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ ضرور اس مرغ کے اندر عفریت پایا جاتا ہے اس لئے مجمع عام میں اس کو جلا دیا جائے

ایسے تمام جانور دوران مقدمہ میں حوالات کے اندر رکھے جاتے تھے اور جو صرف ان کے خلاف مقدمہ چلانے میں ہوتا تھا اسے درج کاغذات کیا جاتا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۴۹۴ء کے کچھ کاغذات جو حال ہی میں دستیاب ہوئے ہیں ان کے دیکھنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ ایک سُور کے خلاف مقدمہ چلانے اس کو غذا دینے اور جلاد کو اُجرت دینے میں کیا صرف ہوا

ان مقدموں میں سب سے زیادہ مشہور مقدمہ وہ ہے جو سانٹ جولیان کے باشندوں نے چوہوں کے خلاف دائر کیا تھا۔ اور جو ۳۴ سال تک چلتا رہا۔ چوہوں کا وکیل مارٹو لیو شاسنی تھا جو فرانس کی تاریخ عدلیات میں غیر معمولی شہرت رکھتا ہے۔

جس وقت چوہوں کے خلاف استغاثہ دائر ہوا تو حاکم نے ملزموں کی حاضری کا حکم دیا، تاریخ مقررہ پر چوہوں کے وکیل نے عذر کیا کہ ملزمین کی تعداد بہت زیادہ ہے اور کافی اعلان تاریخ مقررہ کا نہیں ہوا اس لئے وہ حاضر نہیں ہو سکے عدالت نے اس عذر کو معقول سمجھ کر دوبارہ نہایت وسیع پیمانہ پر اعلان کرنے کا حکم دیا اور دوسری تاریخ سماعت مقدمہ کی مقرر کی۔ جب اس تاریخ پر بھی چوہے حاضر نہ ہوئے تو ان کے وکیل نے کہا کہ بہت سے مدعیوں نے اپنے اپنے کھیتوں میں بلّیاں پال رکھی ہیں اس لئے اس کے موکل جان کے خطرہ سے حاضر نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اس پر مہینوں تک بحث رہی کہ آیا قانوناً مدعیوں کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ ملزمین کی ہلاکت کے لئے باختیار خود یہ طریقہ اختیار کریں۔ الغرض جب تاریخ مقررہ آتی تھی تو چوہوں کا وکیل اسی طرح کا کوئی عذر پیش کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ۳۴ سال تک اس کی کارروائی جاری رہی

دواؤں کے استعمال کا خبط

ڈاکٹر ہوکیارڈ نے ایک کیمیائی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے بیان کیا کہ گزشتہ سات سال کے اندر اس نے ۲۳ ہزار ٹکیاں دواؤں کی استعمال کی ہیں۔ لیکن ایک شخص سموئیل جیسپ اس سے بھی بڑھا ہوا تھا جس کا انتقال ۱۸۱۷ء میں ہوا۔ اس نے ۱۷۹۱ء اور ۱۸۱۶ء کے درمیان ۲۲۶۹۲۱ ٹکیاں دواؤں کی استعمال کیں یعنی سالانہ تقریباً ۱۰۸۰۶ ٹکیاں کھائیں لیکن اپنی عمر کے آخری پانچ سال میں یہ اوسط ۵۰۴ فی ہفتہ تک پہونچ گیا تھا۔ ان ٹکیوں کے علاوہ یہ ۴۰ ہزار بوتلیں رقیق دواؤں کی بھی پی گیا۔ جب وہ ان کی قیمت ادا کرنے سے عاجز آگیا تو دوا ساز نے اس کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا اور دواؤں کا جو حساب اس نے پیش کیا وہ ۵۵ صفحات کو محیط تھا

دُنیا کی ایک فضول خرچ عورت

تاریخ میں شاید ہی کوئی عورت اتنی فضول خرچ نکلے جتنی جوزفین (نپولین کی بیوی) تھی۔ ایک سال میں ۱۴۰ اشرفیاں صرف چہرہ کے سرخ غازہ پر صرف ہو جاتی تھیں۔ اور جو اُجرت سال میں اس کے حجام کو دی جاتی تھی وہ کسی بڑے سے بڑے جنرل کو بھی نہیں ملتی تھی

اس کے پاس ۵۰۰ قمیصیں تھیں اور دو سو جوڑیاں ریشمی موزوں کی روزانہ تین مرتبہ لباس بدلتی تھی۔ اور جس لباس کو ایک بار پہن لیتی تھی پھر دوبارہ استعمال نہیں کرتی تھی۔ ایک مہینے میں ۳۸ ٹوپیاں نئی خرید تی تھی اور سال میں ۹۸۰ دستانے اور ۵۰۰ جوڑے جوتیوں کے ـــــ ہر سال ۴۰ ہزار گنی وہ اپنی زینت میں صرف کر دیتی تھی

نپولین اس کو خرچ کے لئے بہت کافی رقم دیتا تھا لیکن اس کے مصارف کسی طرح پورے نہ ہوتے تھے، چنانچہ

۲۰ ہزار گنی سالانہ جو بطور رشوت کے وہ لوگوں سے حاصل کرتی تھی اسے بھی صرف کرڈالتی تھی اور پھر بھی یہ حال تھا کہ ایکبار نپولین کو اس کا قرض ادا کرنا پڑا جس کی مقدار ایک لاکھ پچاس ہزار گنی تھی

چاند کی روشنی بڑھ رہی ہے

اس وقت علماء فلکیات کی رائے یہ ہے کہ چاند کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے، لیکن پروفیسر فوربس کی تحقیق یہ ہے کہ چاند بڑھتا جارہا ہے اور اس کی روشنی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ چاند کے اندر ریڈیم کی مقدار کثرت سے پائی جاتی ہے جو اس کی حرارت کو قائم رکھے ہوئے ہے اور اس کے حجم کو بڑھا رہی ہے۔ پروفیسر مذکور کا خیال ہے کہ چاند کی روشنی و حرارت صرف سورج ہی سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ خود اس کے اندر کا ریڈیم بہت کچھ معاون ثابت ہوتا ہے

ایک حاکم کا فیصلہ خود اپنے خلاف

نیوجرسی (امریکہ) کا ایک مجسٹریٹ سائکل پر سوار چلا جارہا تھا لیکن جب لوگوں کا ہجوم سڑک پر زیادہ ہوا تو وہ فٹ پاتھ پر ہولیا (جو امریکہ میں مخصوص ہے صرف پیدل چلنے والوں کے لئے) یہ دیکھ کر سپاہی نے ان کو پکڑ لیا اور قریب کی عدالت گاہ میں پیش کیا جہاں کا خود یہی حاکم تھا —— عدالت گاہ میں پہونچ کر یہ اجلاس کی کرسی پر بیٹھ گیا اور سپاہی سے کہا کہ الزام کی نوعیت بیان کرو، جب سُن چکا تو اس نے بہ حیثیت ملزم کے جُرم کا اعتراف کیا۔ اور اپنے اوپر ۳ ڈالر ۵، سنٹ جرمانہ کرکے حکم دیا کہ اس رقم میں سے ۸۰ سنٹ کانسٹبل کو انعام کے طور پر دیا جائے، ایک ڈالر میونسپلٹی کے فنڈ میں جمع کیا جائے اور ۹۵ سنٹ مجسٹریٹ کو فیصلہ کرنے کی اُجرت دی جائے۔ چنانچہ یہ فیصلہ سنا کر جرمانہ کی رقم اس نے اپنی جیب سے نکالی اور ۸۰ سنٹ کانسٹبل کو دے کر ایک ایک ڈالر میونسپلٹی میں جمع کرنے کیلئے علیحدہ کردیا اور ۹۵ سنٹ پھر اپنی جیب میں رکھ لئے کیونکہ یہ معاوضہ بہ حیثیت مجسٹریٹ ہونے کے خود اسی کا تھا

چڑیاں کیوں ہجرت کرتی ہیں

یہ امر غالباً اکثر لوگوں کو معلوم ہوگا کہ بعض چڑیاں (مثلاً قاز وغیرہ) ہر سال شمال سے جنوب کی طرف ہجرت کرتی ہیں اور ہزاروں میل طے کرنے کے بعد اون مقامات میں پہونچ جاتی ہیں جو نسبتاً زیادہ گرم ہوتے ہیں —— عرصہ سے ماہرین اس کی جستجو میں تھے کہ اس کا کیا سبب ہے۔ آخر کار فرانس کے ایک ڈاکٹر نے اس راز کو معلوم کرلیا اور وہ یہ ہے کہ ان طیور کے خون میں ایک خاص قسم کا کیمیادی مادّہ پایا جاتا ہے جو دن کی لمبائی کے ساتھ ہیجان میں آتا ہے اور اسی لئے وہ خریف میں جنوب کی طرف اور ربیع میں شمال کی طرف چلی جاتی ہیں

اس کی تحقیق اس طرح کی گئی کہ جب غیر موسم میں بنفشئی شعاعیں ان پر ڈالی گئیں اور اس کیمیادی مادہ میں ہیجان پیدا ہوا تو فوراً انھوں نے اپنی جگہ چھوڑدی اور اُڑ کر دوسری جگہ چلی گئیں

دیوار چین

عجائب عالم میں کسی چیز کو اتنی اہمیت حاصل نہیں جتنی دیوار چین کو حاصل ہے۔ یہ دیوار بحر اصفر

شروع ہوتی ہے اور چین، منچوریا و منگولیا سے گزرتی ہوئی صحرائے گوبی تک پہونچ جاتی ہے۔ اس کی لمبائی ۲۵۰۰ میل ہے اور ۲۵۰ ملین ٹن پتھر اس کی تعمیر میں صرف ہوئے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے صرف دس سال میں اسکی تعمیر ختم ہوگئی کیونکہ تین لاکھ آدمی شب و روز اس میں کام کرتے رہتے تھے

اس کی بلندی ۲۰ فٹ سے لے کر ۴۰ فٹ تک ہے۔ اس میں جابجا ۲۵ ہزار بُرج بنائے گئے ہیں۔ جن میں کافی فوج رہ سکتی ہے۔ یہ دیوار شرق سے غرب کی طرف گئی ہے اور سنہ ۲۵۰ قبل مسیح میں مغلوں کا حملہ روکنے کے لئے طیار کی گئی تھی۔ اس کے بُرجوں میں اب بھی قدیم وضع کی توپیں لوہے اور تانبے کی رکھی ہوئی ہیں۔ کیونکہ چینی ہزاروں سال قبل بارود کا استعمال جانتے تھے

دنیا کا سب سے بڑا مینار جرمنی کے ایک مہندس نے جس کا نام ہران ہونیف ہے ایک مینار طیار کرنا شروع کیا ہے جس کی بلندی ۱۲۰۰ فٹ ہوگی۔ اس کی چوٹی پر پانچ چکر قائم کئے جائیں گے جو ہوا کے ساتھ گردش کریں گے اور جن میں سے ہر ایک کا قطر ۴۸۰ فٹ ہوگا۔ اس سے مقصود کہربائی قوت حاصل کرنا ہے اس بُرج کی تعمیر اس سال ختم ہو جائے گی اور اسکی بلندی فرانس کے برج ایفل سے بھی ۲۰۰ فٹ زیادہ ہوگی

جراحی کا معجزہ شہر پیٹرز برگ میں ایک طالب علم موٹر سے ٹکرا گیا اور اسقدر خون اس کے جسم سے نکل گیا۔ کہ زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ فوراً ایک ڈاکٹر (فریڈرک مارس) بلایا گیا۔ اس نے ضائع شدہ خون کو ایک برتن میں لے کر اس کا درجۂ حرارت وہی باقی رکھا جو جسم انسانی کا ہوا کرتا ہے۔ اور پھر بازو کی شریان کاٹ کر یہ خون اس کے جسم میں پہونچا دیا جس سے طالب علم کی جان بچ گئی

کاغذ کا خرچ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس وقت دنیا میں ہر سال ۷۴۰۸۰۰۰ ٹن کاغذ صرف ہوتا ہے جس میں سے ۶۰ لاکھ ٹن اخباروں کے کام آتا ہے۔ ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ کس ملک میں کتنا کاغذ صرف ہوتا ہے اور اسی سے وہاں کی صحافت کی ترقی کا اندازہ ہو سکتا ہے

امریکہ	۳۷۹۴۰۰۰ ٹن	فرانس	۴۱۱۰۰۰ ٹن
انگلستان	۹۳۱۰۰۰ ٹن	جاپان	۲۲۹۰۰۰ ٹن
جرمنی	۷۵۱۰۰۰ ٹن	کناڈا	۲۱۸۰۰۰ ٹن

تبسم کا عاشق حال ہی میں روس کا ایک شخص سرناف نامی مرا ہے جو قبل جنگ وہاں کے لکھ پتی آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ اسکو خبط تھا کہ لوگوں کے فوٹو لے اس حال میں کہ وہ مسکرا رہے ہوں، چنانچہ وہ دور دراز مقامات کا سفر کرتا تھا اور گھنٹوں کیمرا لئے ہوئے کھڑا رہتا تھا کہ کوئی مسکرائے اور یہ اسکی تصویر لے لے۔ اس نے اپنی تمام عمر میں لاکھوں روپیہ صرف کر کے چار ہزار نمونے تبسم کے فراہم کئے تھے۔ لیکن جنگ کے بعد یہ روس سے نکالدیا گیا۔ اور حد درجہ عسرت و افلاس کی حالت میں مر گیا۔ کاشکے یہ شخص لاکھوں روپیہ تبسم کی تصویروں میں صرف کرنے کے بجائے لوگوں کو متبسم بنانے میں صرف کرتا

کالیداس کی شکنتلا پر ایک ناقدانہ تبصرہ

(بسلسلۂ ماسبق)

ملاحظہ کیجئے شاداب جنگل کا منظر سامنے ہے۔ اور پہاڑی آبشار کے گرنے کی آواز دور دور تک سنائی دیتی ہے اور سورج کی زرّیں شعاعیں سرسبز اشجار کے پتیوں سے چھن چھن کر جھکر درنی مہاراج دھیاراج دشونت والی ہستنا پور کے رخسار مبارک پر پڑ رہی ہیں۔ مہاراج شکاری لباس پہنے " دھنش وبانڑ " ہاتھ میں لئے رتھ سے اترتے ہیں۔ اب ملاحظہ کیجئے اسٹیج کے پس منظر کو بلند کیا جا رہا ہے اور حد نظر تک ایک شاداب چراگاہ نظر آتی ہے کہیں خوبصورت ہرن کلیلیں کر رہے ہیں کہ دفعتاً دو سانولی کمسن لڑکیاں ایک راہب اعظم کے آشرم کے درختوں میں آبیاری کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ سوتردھار اپنے لانبے لانبے گنگا جمنی عصا کو گردش دیکر شکنتلا کے اسٹیج پر آنے کا اعلان کرتا ہے دم بخود حاضرین یہ دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں کہ آیا ایکٹریس اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوتی ہے یا نہیں! وہ اپنے لب جاں بخش سے مسیحائی کرتی ہے اوس کے منھ سے ہر لفظ موسیقی میں ڈوب کر نکل رہا ہے اوس کے مقیاس الشباب کی رعنائیاں اور بغیر کسی تصنع کے دل آویز۔ دلکش صبر رُبا سرکشیاں کچھ ایسے خالی حربے نہیں ہیں جو حاضرین خاموشی سے برداشت کرلیں۔ ہر شخص اپنے دل میں ایک خاص قسم کا میٹھا میٹھا درد محسوس کر رہا ہے۔ اسی طرح مہاراجہ دشینت کا گندھارویت پر شکنتلا سے شادی ——— بحران فراق ——— کنول پر خط لکھنا ——— کنو کا دربار میں بھیجنا۔ راجہ دشینت کا قول و قرار کو پورا نہ کرنا۔ منکا اپسرا کا آنا اور شکنتلا کا لے کر اڑجانا کشیپ رشی کے اشرم میں سرون ہرن کی پیدائش۔ اندر سبھا میں دشینت کی طلبی۔ اور وصال محبوب یہ تھا وہ خلاصہ اوس بے نظیر ڈرامہ کا جو ایوان شاہی میں سفرائے دول کو محو حیرت بنا رہا تھا۔ جس سے غالباً آپ حضرات بھی باوجود ادعائے اتقا محظوظ ضرور ہوئے ہوں گے ہاں یہ اور بات ہے کہ اُس کا اقبال آپ بوجوہ چند اس بھرے مجمع میں نہ کرسکیں یا اوس کا اظہار کرنا پسند نہ کریں۔"

آپ نے دیکھا اس قادر الکلام شاعر کے " خون جگر " کی داد کس انداز سے دی گئی۔ اور شاہی سرپرستی نے اوس کی شہرت کو دوبالا کر دیا وہ امرسن کے الفاظ میں " حقیقی شاعر " تھا اوس کی زبان ان حقائق کی ترجمان تھی جن کو اس سے قبل کسی نے بیاں نہیں کیا تھا وہ حقیقی شاعر اور حکیم حاذق تھا۔ وہ حقیقت شناس اور ترجمان حقیقت تھا۔ کیونکہ جن مشاہدات کو وہ بیان کرتا تھا ان کو اوس نے بہ چشم خود دیکھا تھا۔ وہ محرم راز فطرت تھا۔ کالیداس نے دنیائے خیال کا مشاہدہ کیا تھا اور اب آپکو کارخانۂ ازل کے حقائق اور بدیہیات ابدی کی داستان خرد ربا اپنے مخصوص لے میں سناتا ہے اور جب کالیداس کوئی موزونیت

آفریں موضوع تخلیق کرتا تھا تو اوس کے قلب میں ایک پرُجوش اور حیات بخش خیال رُونما ہوتا تھا جو نباتات و حیوانات کی طرح اپنے نظام فطری کو اپنے ہی دامن میں پرورش کرتا ہے۔ اور یہ خیال نشو و نما پاکر مُرقع فطرت میں ایک جدید آرائش کا سبب بن جاتا ہے یا ترجمان حقیقت علامہ اقبال کی لے میں

سینۂ شاعر تجلی زار حسن | خیزد از سینائے او انوار حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر | فطرت از افسون او محبوب تر
از دمش بلبل نوا آموخت است | غازہ اش رخسار گل افروخت است
سوز او اندر دل پروانہ ہا | عشق را ۰۰۰۰ از و افسانہ ہا
بحر و بر پوشیدہ در آب گلش | صد جہان تازہ مضمر در دلش
در دماغش نادمیدہ لالہ ہا | ناشنیدہ نغمہ ہا ہم نالہ ہا
فکر او با ماہ و انجم ہم نشیں | زشت را نا آشنا خوب آفریں

اثر صاحب[1] نے خوب کہا ہے کہ "شاعری ایک انفعالی کیفیت ہے کیونکہ ہم کسی جذبہ کو جب تک شدت کے ساتھ محسوس نہ کریں گے۔ دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتے۔ شاعری احساس حسن ہے کیونکہ اس کا مقصد انسانی جذبات کو بلندی کی جانب لے جانا اور ان میں انبساط کے ذریعہ سے تہذیب پیدا کرنا ہے اور حسن کچھ نہیں اگر انبساط کا محبوب ترین مجسمہ نہیں۔ شاعری جذبۂ راستی ہے کیونکہ جب تک ہمارے محسوسات حقیقت سے ہمکنار نہ ہوں گے۔ ان میں نقص و تصنع پایا جائے گا تخیل محسوسات شاعری کا متشکل ہوتا ہے تاکہ راستی کے نقوش دل پر مرتسم ہوکر موجب انبساط ہوں۔" کالیداس کی شاعری کسی میزان عمل میں تولئے تو یقیناً آپ مجبور ہوکر یہی کہنے پر تیار ہو جائیں گے کہ واقعی کالیداس ہندوستان کی قدیم تہذیب کا ایک ایسا لافانی گلاب ہے کہ وہ یقیناً مصنف کی حیثیت سے قیود مکانی و زمانی سے کلیتاً آزاد ہو چکا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ہر عہد ہر ملک۔ اور ہر نسل سے یکساں تعلق رکھتا ہے اور اوس کا ادبی ترکہ دنیا کے عام ورثہ اور مشترک سرمائے میں شامل ہے بالخصوص "شکنتلا" جس کی ہردلعزیزی غیر فانی اور دائمی ہے۔ شکنتلا میں قدیم ہند کی مدنیت اور روح جلوہ افگن ہے بلکہ ایک بڑی حد تک عمرانی حیثیات کا عطر اوس نے پیش کیا ہے اس میں ہندوستان کا شاندار ماضی عجیب شان و شوکت سے پیش کیا گیا ہے اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ ماضی بالعموم شاندار دکھلایا ہی جاتا ہے اور شاعر اپنے سحر نگاری سے اوسے اور بھی زیادہ دل فریب عنوان سے پیش کرتا ہے۔ بلکہ فی الواقع "ہندوستان کا ماضی شاندار تھا"، اور ترجمان حقیقت نے محض خیالی تصویر نہیں اُتاری ہے۔ بلکہ اوس کا سحر نگار موقلم فطرت و حقیقت سے باخبر تھا۔ اور شکنتلا ان فطری اور حقیقی مناظر کا ایک شاندار

---

[1] خانصاحب مرزا جعفر علی صاحب اثر بی۔ اے ڈپٹی کلکٹر۔ صاحب اثرستان ادب۔ سالنامہ۔ جنوری ۱۹۳۱ء

مجموعہ ہے ---

(۴)

انگریزی اور ہندی ادبیات میں ہیروئینس پر اگر کوئی تحقیقاتی مقالہ مرتب کیا جائے تو میرے خیال میں یہ امر محال ہوگا کیونکہ ان دونوں ادبیات میں ایک خاص فرق نمایاں یہ ہے کہ ہمارے برادران وطن ان ہیروئینس کو مقدس دیویاں تصور کرکے انکی پرستش کرتے ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ یہ اپسرائین تھیں جو انسانی شکل میں وقتاً فوقتاً دنیا میں نازل ہوتی رہی ہیں - ہم کو اس وقت اس نظریہ پر بحث و تمحیص کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن نفس مضمون سے چونکہ ہمارا تعلق ہے اس لئے یہ نظریہ زیر بحث آیا ورنہ ظاہر ہے - ذاتی عقائد کو ادبیات سے کیا علاقہ ہوسکتا ہے ؟ ہر شخص کو یہ اختیار کلی حاصل ہے کہ وہ اپنے عقل و تمیز کے مطابق ایک شاہراہ حقیقت دریافت کرکے اسی پر سختی سے گامزن ہو۔ مقصد یہ ہے کہ ایسی حالت خاص میں ہیروئینس پر تبصرہ کرنا کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ کیونکہ اون کی شخصیتیں زیادہ تر قدیمی قیاسی اساطیر اور سماعی افسانوں میں پوشیدہ ہیں اور مذہبی احترام کا خوبصورت ہلکا پردہ ان پر پڑا ہوا ہے ۔جس کی بنا پر اون کا صحیح کردار عوام کے روبرو آزادی سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اساطیر و واقعات کچھ اس طرح آپس میں ملے ہوئے ہیں کہ بسا اوقات صحت و عدم صحت، ممکنات و ناممکنات ، انسانی و ما فوق انسانی کردار میں امتیاز صحیح مشکل ہی نہیں یقیناً ناممکن ہے" بعض نقادان فن معترض ہیں کہ افسانوں میں انسانوں کے ساتھ دیویاں و دیوتا بھی امور مفوضہ سرانجام دیتے نظر آتے ہیں جس کی بنا پر افسانے کے واقعات قدرتی طور پر رونما نہیں ہوتے اور نہ اشخاص اپنے کردار قدرتی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور نہ اُن کے اعمال و سیرتوں کا مکمل انکشاف ہو سکتا ہے لیکن وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان اساطیر کے مصنف اور مخاطب ان سب اشیا پر اعتقاد تام رکھتے تھے اور اون کی نظر میں دنیاوی اشخاص اور سماوی افراد کا اشتراک عمل ایک حقیقی امر تھا ''

بات مذلف حبیب کی طرح بڑھتی گئی - کہنا یہ تھا اور کہنا یہ چاہتا تھا کہ میں نے شکنتلا کے ڈرامہ کو مہابھارت سے اخذ کیا ہے۔ کیونکہ آریہ ورت کے قدیم ادبی ترکہ میں راماین و مہابھارت ایسی مکمل کتب ہیں جو ہر آئینہ دائرۃ المعارف کہلانے کی مستحق ہیں ان میں ہر ممکن سائنس پر تعلیم موجود ہے - اور بہترین و بدترین دونوں قسم کے کردار ذکور و اناث کے آپ کو ملیں گے جن کے پڑھنے سے اگر ایک جانب دوزخ کا دروازہ قریب تر ہوتا جائے گا تو دوسری جانب رضوان جنت بھی نہایت مسرت سے پُرتپاک خیر مقدم کے لئے آپ کو انشاءاللہ تیار ملے گا - اور یہ واقعہ ہے کہ جس کسی کو قدیم آریہ ورت کی سادہ شریفانہ مدنی عمرانی اقتصادی کیفیات کا مطالعہ کرنا ہو - اس کے لئے یہ لابدی ہے کہ وہ ان کتابوں کو پڑھے اور لطف اندوز ہو - چنانچہ گیتا کی تعلیمات کے بعد میں نے یہ طے کیا تھا کہ آیندہ حقیر تحفہ جو میں اپنے برادران وطن کی خدمت میں پیش کروں گا وہ یہی شکنتلا ہوگی - شکر ہے کہ آج یہ ڈرامہ آپ کے سامنے موجود ہے - بہت کم افراد کو غالباً یہ بھی علم ہوگا کہ یہی وہ شکنتلا

ہے جو کوروں و پانڈون کے مورث اعلےٰ مہاراجہ بھارت کی واجب التعظیم ماں ہونے کا شرف بھی رکھتی ہے۔ گو آج دنیا شکنتلا کو کالیداس کے غیر فانی شاہکار کی حیثیت سے بخوبی جانتی ہے۔ اور چونکہ قادر الکلام شاعر پستی و بلندی روشنی و تاریکی سے پوری طرح واقف ہے اسی لئے شکنتلا مظاہر قدرت و جذبات انسانی کا ایک نہایت دلکش مرقع بن گئی ہے (گیا ہے)

اگر ہم شکنتلا کا کردار میزان تنقید میں تولیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اس میں وہ جملہ عناصر موجود ہیں جو ایک پیکر عصمت کو مکمل عورت بنا سکتے ہیں وہ حسین ہے شرمیلی ہے نازک ہے خاموش ہے صابر ہے اور سادگی سے عیش کے ایام گذار سکتی ہے یہی نہیں بلکہ ان عناصر کے علاوہ حور سرشت شکنتلا میں ایک خاص فطری سنجیدگی بھی پائی جاتی ہے جس کا اظہار کسی ایک لفظ میں ہونا یقیناً مشکل ہے۔ بچپن میں جب ماں باپ نے رفاقت سے منہ موڑا تو ایک عابد و مرتاض کے رشک ارم "اشرم" میں اوس کی پرورش ہوتی ہے۔ یہ خیال رہے اوس کو کبھی شہر کی متمدن مہذب جماعت میں شرکت کا موقع نصیب نہیں ہوا ہے مذہبی درسیات اوس کو اسی شانتی نکیتن میں راہب اعظم کنو دیتا ہے۔ اسی لئے اوس کے دماغ میں سوا قدرت کی دلکش تعلیمات اور بعثت کے دلفریب تخیل کے کوئی دوسرا نامحمود خیال نہیں ہے اوس کو کائنات اور اوس کے آلائشوں سے مطلقاً تعلق نہیں ہے۔ وہ خانقاہ کے خودرو پھولوں میں مثل ایک شاداب سدا بہار پھول کے بھولی بھلی اوس کی برادری انسانوں سے نہ تھی وہ نباتاتی قرابت کی قائل تھی۔ اگر ہم حور نژاد شکنتلا کا مقابلہ کسی مغربی ہیروئین سے کر سکتے ہیں تو وہ شکسپیر کے خیال کی تخلیق شدہ میرنڈہ (ٹمپسٹ) ہو سکتی ہے۔ گو واقعہ یہ ہے کہ کسی دوسرے ہم جنس سے اوس کا تقابل ناممکن ہے۔ شکنتلا کی طرح میرنڈہ بھی پھولوں کے دلفریب گہوارہ میں پل کر مہیب لیکن رنگین جنگلوں کی لامتناہی گہرائیوں میں نشو نما پا کر شاداب مرغزاروں اور قدرتی آبشاروں میں پرورش پا کر اپنی نشاط حیات سے آنے والی نسلوں کو محو حیرت بناتی ہے۔ اور ایک بڑی حد تک شکنتلا کی خوش گوار سادگی۔ اوس کی بے لوث پارسائی اور سماجی مراسم مروجہ سے مطلقاً بے نیاز میرنڈہ کو اوس کے مقابلہ میں پیش کر سکتی ہے۔ اور اسی وجہ سے ایک ناقد نے اوس کو "بنت فطرت" کا خطاب دیا ہے جو کہ "آرائش و تزئین کی تخلیق شدہ پیکر نہ تھی"[†] اور یہ واقعہ بھی ہے کہ شکنتلا حور نژاد شکنتلا بنت فطرت تھی اور دنیاوی فانی تزئین و آرائش کو اوس کی نشو نما سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ لیکن ایک دوسری حیثیت سے اوس کی شخصیت میرنڈا سے ارفع ہو جاتی ہے۔ میرنڈا کی پیدائش سحر کے حلقوں میں ہوئی ہے اور بجائے اس کے شکنتلا کی پیدائش بشری اصول پر ہوئی ہے۔ اور اوس کی پرورش ایک زاہد شب بیدار کے خانقاہ میں ایک راہبہ کے ہاتھوں ہوئی ہے میرنڈا کی طرح شکنتلا کو بھی اپنے محبوب سے اظہار محبت میں اصلا باک نہیں ہوتا اور وہ پہلی ملاقات میں حبیب کے حضور

"Shakuntala" - A. C. Mukerji - I. E. S. - She is a child of fashion, not a product of fashion [Oxford University Press Grade V. 1929]

میں نقد دل پیش کرکے سراپا سوز بن جاتی ہے - یہ تھی ایک فطری تعلیم اگر وہ بھی شہری ماحول میں نشو نما پاتی تو یقیناً وہ اس طرح صفائی سے اقرار محبت پر تیار نہ ہوتی لیکن اسی کمزوری نے اوس کو محبوب خلایق بنا دیا ہے

بس یہیں سے مشرقی و غربی کردار کا خفیف تقابل بھی ختم ہوجاتا ہے اوس کے بعد آریہ ورت کا ہومر جس دلفریب عنوان سے شکنتلا کا کردار پیش کرتا ہے اور لافانی محاسن سے عوام سے خراج تحسین وصول کرتا ہے وہ ڈرامہ کا آخری حصّہ ہے - اور یہی وہ سبب ہے جس نے شکنتلا کو ہر زمانہ کے لئے "سمو" دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر ملک و ملت کے خوش ذوق افراد آج بھی شکنتلا کے ڈرامہ کو پڑھ کر مغموم بھی ہوتے ہیں - اور مسرور بھی !

مشرقی تعلیم یہ ہے کہ انتہائے عیش کے بعد شاہ راہ غم بھی موجود ہے - چنانچہ اس قصہ میں بھی یہی منزل شکنتلا کو پیش آتی ہے راجہ دشینت شکار کے بعد ہستناپور میں داخل ہوا شاہی زندگی میں اپنے خواب عشرت کو بھول گیا - اور شکنتلا کو اوسنے مطلقاً یاد نہ کیا - اس عرصہ میں اس کی محبت کا ثمر بھی بار آور ہوا اور راہب اعظم کنو کی خانقاہ میں نومولود پرورش پاتا رہا - شکنتلا نہایت درجہ جرأت اور صبر سے فراق کے مصائب برداشت کرتی رہی اور کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اوس نے یہ تصوّر نہ کیا کہ اوس کے عزیز "پران پتی" نے اوس کو فراموش کر دیا ہے - جب یہ لڑکا ۶ سال کا ہوا تو راہب اعظم نے یہ خیال کرکے کہ اب اس کی ولیعہدی کا اعلان ہونا چاہیئے. شکنتلا کو اپنے دو چیلوں کی محافظت میں ہستناپور روانہ کیا - یہاں پر یہ بھی عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات نے اس قادر الکلام شاعر کے ڈرامہ کو پڑھا ہے اون کو یہ اختتام انوکھا نظر آئیگا - گو اصل مہابھارت میں یہ قصہ اسی طرح ختم کیا گیا ہے لیکن ہندوستان کے ہومر نے اس خاتمہ میں بے لطفی محسوس کی اور اس افسانہ کو ایک نئی شکل میں پیش کیا - اور اوس عہد کے علمائے کرام کا احترام و عظمت قائم کرنے کے لئے درپا سارشی کے شراپ[۱] کا افسانہ رشیون کے غیر معمولی عظمت پارینہ کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے اضافہ کیا اوس کو عوام کے جذبات پر قابو حاصل کرتے یا دوسرے الفاظ میں دماغی کیفیات پر بہت کافی عبور تھا اوس نے یہ تصوّر کرکے کہ یہ دور مذہب پرستی کا ہے اس لئے مذہب

---

[۱] اب بھی برادران وطن کی ایک کثیر جماعت اس شراپ سے خائف رہتی ہے - مسٹر - اے - سی - مکرجی دبی زبان سے یہ کہنے کی ہمت کرتے ہیں کہ یہ خوف غیر تعلیم یافتہ میں اب بھی پایا جاتا ہے اور گو اب ان شراپوں میں شاید کوئی اثر باقی نہ رہا ہو - میں اس قول کی تردید کرتا ہوں کیونکہ یہ کسی حد تک ان علما پر ایک برا تبصرہ ہے - واقعہ یہ ہے کہ اُس دور میں علماء کی عبادتیں ریاضتیں بہت بڑھی ہوئی تھیں اور زہد و اتقاکی بنا پر اگر اس قسم کی مافوق عادات اون سے سرزد ہوئی تھی تو چنداں تعجب نہیں ہے - چونکہ اب ان باکمال زہاد کی جماعت مفقود ہوگئی ہے - اور نہ اون کے نقش قدم پر اب کوئی چلتا ہے لیکن علمائے کرام معاف فرمائیں اب بھی اسی احترام کے اپنی ذات کو مستحق تصور کرتے ہیں - لیکن اگر اپنی ریاضات و عبادات اوسی پیمانہ کی کرلیں جتنی دور پاستان میں تھی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اونکی عظمت پارینہ دوبارہ مسلم نہ ہوجائے　　م - ا - ع

کی تعریف اور مذہبیات کے محافظین کی توصیف کرنا شہرت کے اضافہ کے مرادف ہے اور یہ وجہ اختراع کی کہ کس طرح ایک آریہ پتر اپنا قدیم وعدہ کو بھول گیا جو ہر آئینہ ایک شہنشاہ وقت کے شان شایاں نہ تھا۔ اس طرح میرے خیال میں قادر الکلام شاعر کو اپنے سرپرست و مربی مہاراجہ بکرماجیت کو ایک خوبصورت پیرائے میں سبق دینا منظور تھا۔ بہرحال شکنتلا شاہی محل کے صدر دروازہ پر پہونچی تو شرف باریابی اوس کو عطا کیا گیا اوس نے کہا آریہ پتر "تمھارا لڑکا ہے اب تم، حسب وعدہ اُس کو ولیعہد بناؤ"، راجہ نے جواب دیا۔ اے نظر فریب زاہدہ! مجکو کچھ نہیں معلوم تم کیا کہتی ہو۔ مجھے تم کو سلک مناکحت میں داخل کرنا یاد نہیں ہے۔ یہ الفاظ اپنے "پریتم پیارے" کے منھ سے سُنکر محبّت کی ماری شکنتلا یقین نہ کرسکی اور شرمندگی سے اوس کو غصہ بھی آیا لیکن وہ مصلحتاً ساکت ہوگئی۔ اس کے لبوں میں ارتعاش خفی محسوس کیا گیا آنکھیں فرطِ غم سے پتھرا گئیں معلوم ہورہا تھا گویا اوس کی آنکھیں حسن شاہی کا جائزہ لیتی ہوئیں کسی خاص مقام پر ٹھہر گئی ہیں تھوڑی دیر خاموشی کے بعد شکنتلا نے جھلا کر کہا کہ اے بے شرم! راجہ تجھ کو یقیناً سب یاد ہے لیکن تو ہنستا ہے اس لڑکے کو بھی تو جانتا ہے کہ یہ میرا ہی ہو۔ تو کیوں ہنسکر انکار کر رہا ہے" اب راجہ دشینت نے زیادہ سختی سے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا کہ یہ کون لڑکا ہے اور نہ یہ لڑکا میرا ہوسکتا ہے۔ عورتیں جھوٹی ہیں کون اس کو یقین کرے گا۔ تجکو میرے سامنے بھی ایسی بے پر کی گفتگو کرتے شرم نہیں آتی۔ جا میرے سامنے سے دور ہوجا"

اب آپ شکنتلا کے کردار کے اصلی خد و خال ملاحظہ کیجئے۔ کہ ایک وفا شعار بیوی کہ وہ سخت کلامی کو شیریں شربت کی طرح جرأت اور خوش روی سے سنتی ہے اور پی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس وہ کافی الفاظ نہیں ہیں جو اس بے نظیر کردار کے لئے پیش کئے جاسکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شکنتلا اپنی ذات کے لئے نہ لڑ رہی تھی۔ وہ نسوانی عزت عصمت اور پارسائی کے لئے جنگ کر رہی تھی۔ اور یہی نہیں بلکہ وہ ایک حق کے لئے لڑ رہی تھی۔ اپنے لڑکے دھرن سرود (بھرت) سے اوس نے اب آخری بار زیادہ ہمت اور جرأت سے کہا۔ مہاراج خالق اکبر کا نام سچا ہے اوسی طرح ایک پاک قول بھی حق ہے۔ اگر تم اپنی ضد پر قائم ہو اور صداقت سے منکر ہو تو اچھا اب میں جاتی ہوں اور رہا میرا مسئلہ شادی تو تمھارے ایسے شخص کے ساتھ میرا بیاہ کوئی معنی نہیں رکھتا ہے لیکن یہ سن لو کہ بھرت بغیر تمھاری امداد کے بھی چکرورتی راجہ ہوگا اور ایک دن یقیناً وہ اسی سنگھاسن پر سریر آرائے سلطنت ہوگا

مشرقی افسانہ نگاروں کا یہ ہمیشہ سے طریقہ رہا ہے کہ اون کا انجام حزنیہ نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ طربیہ اختتام ان میں رائج رہا ہے۔ چنانچہ مہابھارت کا فاضل مقالہ نگار غیبی امداد سے قصہ کا رُخ پلٹ دیتا ہے اور دشینت بھرت کا خیر مقدم کرتا ہے اور شکنتلا کو واپس بُلا کر رنواس میں داخل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پیاری شکنتلا چونکہ ہماری شادی دنیاوی نظروں سے پوشیدہ ہوئی تھی اس سے مجکو تذبذب تھا کہ میں کس طرح خوش اسلوبی سے تمھاری عزت بچا سکتا ہوں۔ فکر نہ کرو یہ لڑکا ولیعہد ہوگا

اور یہی میرا لڑکا ہے اس کے ہوتے ہوئے کس کی ہمت ہے کہ وہ تخت نشین ہوسکے۔ مہابھارت میں یہ محیر العقول افسانہ اسی طرح ختم ہوجاتا ہے لیکن ہندوستان کا جاسر اجین کی ملکۂ زمانی کو خوش کرنے کے لئے نسوانی وقار کو بڑھانے کے لئے۔ مروجہ مراسم ذہنی کو شکست دینے کے لئے تصویر کا رخ ایک نئے انداز سے پیش کرتا ہے کہ دشیت کی درشت کلامی کے بعد چیلے بھی شکنتلا کا ساتھ چھوڑ کر تپوبن میں چلے جاتے ہیں اوس وقت منکا اپسرا آتی ہے اور شکنتلا کو لے کر اڑ جاتی ہے ایک آشرم میں دھرن سرو پیدا ہوتا ہے اندر سبھا میں دشیت طلب کیا جاتا ہے وہیں واپسی میں ایک آشرم میں وہ ایک شیر کے بچہ سے ایک انسان کے لڑکے کو کھیلتے دیکھتا ہے اوس کا تعویذ اٹھاتا ہے اور انکشافات ہوتے ہیں۔ اور طالب و مطلوب ملتے ہیں " زود پشیماں " کی نگاہیں " چار ہوتی ہیں " تو " پیار " آتا ہے اور وہ اس وقت انتہائی شرمندگی سے شکنتلا کے قدموں پر گرنے لگتا ہے۔ شکنتلا سمجھاتی ہے اور یہ کہکر کہ پران پتی کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ یہ تو میرے گزشتہ کرموں کا انجام تھا جو یہ مصائب برداشت کرنا پڑے اور اس طرح سارا الزام اپنے ذمہ لے کر اپنے محبوب کو بے قصور ثابت کرکے میرے خیال میں ایک حیرت انگیز ایثار عدیم المثال صبر اور " ان دیکھے " غیر معمولی تحمل کا درس آیندہ آنے والی نسلوں کے لئے پیش کرتی ہے !

ایسا مکمل اتحاد عظمت و شیریں نوائی کا یہ سچ یہ ہے کہ شکنتلا کے کردار کے سوا بیک وقت کہیں آپ کو نہ ملے گا۔ اور خصوصیت سے جب ہندوستان کا شاعر اعظم اس پر نقش و نگار بناتا ہے تو یقیناً یہ ایک ادبی معجزہ ہوجایا کرتا ہے اگر ساوتری[1] کا افسانہ زن و شو کی فطری محبت کا ایک غیر مرئی منظر پیش کرتا ہے تو یقیناً شکنتلا کا افسانہ روحانی عشق کے مجسمہ کی نمایندگی بھی کرتا ہے ہندو شعراء کا ہمیشہ یہ رویہ رہا ہے کہ وہ محض اوسی عشق کے قائل رہے ہیں جو محض عیش نہ ہو بلکہ وہ پاک اور ماحول کے جملہ الائشوں سے بھی منزہ ہو۔ اور یہی ایک وجہ ہے کہ اون کی شاعری

---

[1] ساوتری مدراس کے ایک راجہ کی لڑکی تھی۔ اوس کو ایک راجہ کے لڑکے سے محبت ہوگئی کچھ لوگوں کو علم ہوا۔ اور مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ علمائے نجوم کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس کی زندگی کے محض دو سال اور باقی ہیں۔ والدین کو بھی معلوم ہوا انھوں نے بھی مخالفت کی لیکن آخرکار ساوتری کی شادی اسی راجہ کے لڑکے کے ساتھ ہوگئی۔ اوس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اوس کی شوہر کی زندگی ختم ہونے والی ہے اور جب وہ وقت آیا تو ملک الموت شوہر کی روح قبض کرنے کے لئے آیا۔ اوس نے کہا کہ جہاں تم اس روح کو لے جاؤگے وہیں میں بھی ساتھ جاؤں گی چنانچہ اس ثابت قدمی کو دیکھ کر ملک الموت نے اس کے شوہر کی جان واپس کردی۔ اور وہ عرصہ تک حکمرانی کرتا رہا۔ اور اب بھی یہ سدا سہاگن مئی جون (جیٹھ) میں کئی دن اسی خوشی میں خوشیاں مناتی ہیں اور اپنے شوہروں کی صحت و عافیت کی دعائیں مانگتی ہے

م۔ ا۔ ع

ہزار ہا برسوں سے رائج و مقبول ہے۔ کیونکہ اس شاعری میں محبت نفسانی خواہشات کی تکمیل کا نام نہیں ہے بلکہ محبت نام ہے زن و شو کی عمرانی پاک تعلقات کا جس کا لازماً ثمرہ اون کو اولاد کی شکل میں بھی ملتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا عشق ہمیشہ ہر دور میں زیادہ دیرپا اور خوشگوار تسلیم کیا گیا ہے۔ اور یہ عناصر ہندوستان کی جملہ ہروئینس میں مشترک حیثیت رکھتے ہیں اور حقیقت یہ ہی کہ جذبۂ عشق ہی اون کی حیثیات کو دوبالا کرتا ہے گو دمینتی[1] بھی ساوتری و شکنتلا کی طرح ایک صحیح جذبۂ عشق رکھتی تھی۔ لیکن فرق یہ ہے کہ دمینتی کے یہاں وحشیانہ زیادتی۔ خواہشات کی تکمیل۔ بھول جانے کی ناقابل بیان تکلیف۔ غصہ۔ رنج۔ ملال کے جذبات زیادہ ہیں جو میرے نظریہ میں اوس کی شخصیت کو شکنتلا سے گرا دیتی ہے۔ لیکن جو عشق شکنتلا کے صبر ایثار۔ اطاعت کے اجزائے ترکیبی سے مرکب ہے وہ یقیناً شرقی ادبیات میں کہیں دوسری جگہ اوس دور میں نظر نہیں آتا۔ گو دمینتی کا عشق بہت لطیف پیرایہ میں شروع ہوتا ہے یہ شکنتلا کی طرح ایک نظر میں نہیں۔ بلکہ ایک ہنس کے پیام پر راجہ نل کے حسن و شجاعت کا افسانہ ہوشربا سنکر اپنا قرار و صبر ان دیکھے محبوب کے قدموں پر نثار کر دیتی ہے۔ لیکن پھر بھی مجموعی حیثیت سے دمینتی و ساوتری شکنتلا سے میدان عظمت میں آگے نہیں ہیں لیکن اگر کوئی کردار ہندوستان ایسا پیش کر سکتا ہے جو شکنتلا کی عظمت مسلمہ کو شکست دے سکتا ہے تو وہ یقیناً سیتا جی[2] کی غیر فانی شخصیت ہے۔ شکنتلا تو بیچاری بن باسی

---

[1] دمینتی جس کا دوسرا نام دمن ہے ہندوستان میں لیلیٰ سے کم مشہور نہیں ہے۔ فیضی نے بھی اس کو فارسی میں ترجمہ کیا وہ بہت حسین و وفادار اور مستقل مزاج تھی۔ سوئمبر کی رسم میں راجہ نل نے اوس کو حاصل کیا اتفاق سے کچھ بری ساعت آئی اور اوس کے دیور راجہ پکارا نے اس کے شوہر اوس کے شوہر کو جوئے میں جیت لیا۔ اور ذلت و خواری سے شہر بدر کر دیا۔ ان دونوں کے پاس سوا ستر عورت چھپانے کے لئے کوئی کپڑا نہ تھا۔ جنگلی جانوروں پر نل نے ایک کپڑا ڈالا ———— مچھلی بھونی رکھی تھی وہ دریا میں چلی گئی۔ دمینتی کو ایک شب کو تنہا چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اور راجہ اجودھیا کے یہاں نام بدل کر رتھ بانی کی ملازمت کر لی۔ دمینتی فراق کے صدمہ جھیلتی ایک راجہ کے یہاں پہونچی اوس نے بہت عزت و احترام سے اوس کو اوس کے میکہ بھجوا دیا۔ جب وہ گھر پہونچ گئی تو اوس نے نل کی تحقیقات شروع کی اور جب اوس کو علم ہوا کہ نل اجودھیا میں ہے تو اوس نے راجہ اجودھیا کے پاس ایک سپاہی بھیجا کہ دمینتی دوبارہ سوئمبر منائے گی کیونکہ اوس کا شوہر لاپتہ ہو گیا ہے اس لئے فلاں وقت فلاں دن دودھیا میں سوئمبر رچایا جائے گا۔ جب نل نے یہ سنا اون کو بہت قلق ہوا۔ وقت کم تھا اور سوائے کے دوسرا رتھ اس کمال سے ہانک نہ سکتا تھا۔ فوراً رتھ تیار کر کے راجہ اجودھیا نل کے ساتھ اجودھیا سے چلا اور وہاں جا کر نل اور دمینتی کی ملاقات ہوئی۔ اور جب فراق دور ہوا تو نل نے دوبارہ پشکار سے جوا کھیلا اور اوس کو ہرا کر عیش و آرام سے حکومت کی

[2] سیتا۔ راجہ جنک کی صاحبزادی تھیں سوئمبر کے اصول پر راجہ رام چندر سے اون کی شادی ہوئی اور بن باس کے زمانہ میں بھی شوہر کی رفاقت سے منھ نہ موڑا۔ وہیں راون سیتا جی کو فقیر کے دھوکے میں آ کر لنکا لے گیا۔ جب رام چندر جی نے لنکا پر فتح حاصل کی اوس وقت سیتا جی کو رہائی نصیب ہوئی اور اجودھیا میں آ کر عیش سے زندگی گزارنے لگیں۔ لیکن ناکردہ گناہ اور مخلوق کے طعنوں تشنوں سے عاجز آ کر مہاراجہ رامچندر

یوسف صاحب

آخر آپ ہیں کہاں اور کس فکر میں سرگرداں ہیں۔ مہینوں ہوگئے کہ آپ نے نہ مجھے پوچھا نہ کسی اور کو ——

اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا !

آپ کی زلیخا بہت یاد کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ یہ یوسف اب کے مل بھر جائے اگر "فلا تمن ......"

کرکے واپس نہ بھیجا ہو تو سہی " —— سو بھئی میں یہ مشورہ تو کبھی نہ دوں گا کہ تم یوں ہنستے ان کے سامنے آجاؤ،

لیکن یہ ضرور کہوں گا۔ کہ جہاں تک ممکن ہو اس جھگڑے کو آگے نہ بڑھنے دو

یہ تو سمجھو کہ جو تم پر اعتماد کرکے ساری دنیا کو چھوڑ بیٹھے، اس کے جذبات کا کچھ تو خیال کرنا چاہیئے —— بیوی بننے کے لئے یہ شرط ضروری نہیں کہ وہ شوہر کے خلاف کبھی صدائے احتجاج بلند نہ کرے —— مانا کہ تم التزام کے ساتھ خرچ بھیجتے رہتے ہو، لیکن اگر دسویں پندرھویں ایک آدھ دن کے لئے اپنی صورت بھی دکھا جایا کرو تو کیا گناہ ہے —— فاصلہ بھی زیادہ نہیں کہ یہ عذر پیش کرسکو —— چاہو تو دن میں دو بار آجا سکتے ہو

ہاں، تو بتاؤ کب آؤگے۔ تاکہ میں یہ خوشخبری انھیں جاکر سنادوں۔ اور ساتھ ہی ساتھ دعوت کی فرمائش کردوں ——

نیاز

نگارستان حصہ دوم

یعنی

حضرت نیاز فتحپوری کے ۳۰ بہترین افسانوں کا مجموعہ جو اس سے قبل کبھی کتابی صورت میں شایع نہیں ہوئے زیر کتابت ہے حجم ۵۰۰ صفحات سے زائد ہوگا۔ اور غالباً اکتوبر ۳۳ء تک شائع ہوسکے گا۔ اس کی قیمت علاوہ محصول (ے ر) سے کم نہ ہوگی۔ لیکن جو حضرات دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیج کر ابھی سے اپنا نام درج رجسٹر کرالیں گے اون کو اسی عار میں یہ نادر مجموعہ مل جائے گا۔ غالباً یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت صحیح معنی میں انشاء عالیہ کا لکھنے والا اگر کوئی ہے تو وہ صرف حضرت نیاز ہیں اور اس لئے اس مجموعہ میں ایسے ایسے جواہر ادب آپ کو ملیں گے۔ جو کسی دوسری جگہ میسر آہی نہیں سکتے،

مینجر نگار لکھنؤ

یہ فسانہ ترجمہ ہے کسی بنگالی خاتون کے فسانہ کا جس کو کچھ حذف و اضافہ کے بعد نگار میں درج کیا جاتا ہے، نتیجہ بھی اس کا بالکل بدل دیا گیا ہے، جو بالکل "غیر رومانی" تھا۔ اُمید ہے کہ محترم عابدی صاحب معاف فرمائیں گے

نیاز

انندا، کلکتہ کے ایک نہایت سخت کٹر ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اور گو اس کا خاندان اتنے بڑے تہذیب و تمدن کے مرکز میں پشتوں سے رہتا چلا آیا تھا۔ لیکن موجودہ تمدن اور نئی روشنی کی اس کو ہوا تک نہ لگی تھی۔ انندا کا دادا آہنی چیزوں کا بیوپار کرتا تھا اور گو اس کی اولاد نے خود ہتھوڑے کو ہاتھ سے نہیں چھوا تھا۔ لیکن اس خاندان میں یہ تجارت برابر چار نسلوں سے چلی آتی تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی کبھی میز کرسی استعمال کرنے کا خیال نہیں کیا اور نہ کبھی کسی نے کلک کے قلم کی بجائے فونٹن پن کو استعمال کرنے کا خواب دیکھا۔ وہ اب بھی بڑی بڑی گھڑیاں جیبوں میں رکھتے تھے اور ان کی بجائے دستی گھڑی استعمال کرنے کا خیال تک دل میں نہ آتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے صرف ابتدائی تعلیم پائی تھی۔ اور جونہی اس گھرانے کے بچے کچھ لکھ پڑھ لینے کے قابل ہوتے ان کو تعلیم سے علٰحدہ کر کے دوکان میں لگا دیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ اس کا کام سیکھیں۔ انھوں نے کبھی کالج تک پہونچنے کی کوشش نہ کی۔ اور نہ ان کو جدید فیشن کے مطابق کپڑے پہننا آیا۔ اور نہ کبھی سگرٹ پینے کا شوق پیدا ہوا

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس گھرانے کی عورتیں کسقدر قدامت پرست ہوں گی۔ نسلاً بعد نسل یہ ہوتا چلا آیا تھا کہ لڑکیاں بارہ سال کی عمر سے پہلے ہی بیاہ دی جاتی تھیں۔ اور ازدواجی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی تھیں شادی سے قبل ان کا وقت کھیل کود یا ماں، خالہ اور چچی کے کام کاج میں گذرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی بھی دیکھ بھال کرتی تھیں یا ہمسایوں کے گھروں میں ماری ماری پھرتی تھیں۔ اور جب ان کی شادی ہو جاتی تھی، تو وہ زندگی کے پہچانے ہوئے راستہ پر قدم اٹھانے لگتی تھیں، اور زندگی کا چکر مسلسل ایک رفتار کے ساتھ انھیں پھراتا رہتا تھا۔ نہ تو اس میں آگے بڑھنے کا کوئی خیال پیدا ہوتا تھا۔ نہ پچھلی باتوں پر نظر ڈالنے کا موقعہ ملتا تھا۔ ان کی زندگی کا نظام یہ تھا کہ صبح اپنے بستر سے اٹھکر باورچی خانوں میں اور پھر شام کو باورچی خانوں سے اُٹھکر اپنے بستروں پر

اگر بڑ جائیں اور یکے بعد دیگرے ان کی گود، بچوں سے بھر جاتی۔ ایسے بچے جو آئندہ چل کر آہنی سامان کے تاجر بنتے، یا مناسب دیکھ بھال نہونے کی وجہ سے جلد اس دنیا سے رخصت ہو جاتے تھے، اگر بدقسمتی سے اولاد لڑکی ہوتی تو وہ خاندان کو تکلیف پہونچانے۔ اور گاڑھے پسینے کی کمائی ہوئی ایک کثیر رقم خرچ کرانے کے بعد دوسرے گھرانے میں چلی جاتی۔ جہاں وہ غیرارادی طور پر مائیں بن جاتی تھیں۔ اور وہ ان لڑکوں کے مستقبل کو خوشنما بنانے میں کوئی حصہ نہ لے سکتی تھیں۔ جیسے ہی ان کی اولاد ہوش سنبھالتی، پوتے اور نواسے پیدا ہونے لگتے۔ اور پھر ان نوآمدہ ہستیوں کو بھی اُسی دور سے گذرنا پڑتا، جس سے ان کے باپ اور دادا گزرتے آئے تھے۔ خانہ داری کے جھگڑوں اور بال بچوں کی پرورش میں ان کی ساری عمر گذر جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان عورتوں کو دنیا کے اور جھگڑوں سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اگر مرد اس سے زیادہ کما سکتے، جتنا ان کے اخراجات کے لئے کافی ہوتا، تو شاید زیور وغیرہ کا بھی اضافہ ہوجاتا۔ لیکن حقیقتاً ان کے پاس ان کے روزمرّہ اخراجات سے زیادہ ایک پیسہ بھی نہ بچتا تھا۔ اس لئے اس خاندان میں کسی قسم کے تفریحی مشاغل بھی پیدا نہ ہوئے تھے

خاندان میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن آمدنی میں اسی حساب سے کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اور وہ رفتہ رفتہ زیادہ تباہ حال ہوتا جارہا تھا۔ انندا نے اس تباہ حالی میں، اس گھر میں جنم لیا تھا۔ اس کا لڑکپن بھی اُسی طرح گذرا، جس طرح اور لڑکوں کا گذرا تھا، لیکن جب نکبت وافلاس کے ساتھ زندگی کے دس سال ختم کرچکا تو اس کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ انندا کے والد کے کسی دوست نے یہ رائے دی کہ انندا کو کسی ہائی اسکول میں تعلیم کی غرض سے شریک کردیا جائے۔ کیونکہ اگر انندا نے تعلیم حاصل کرلی تو بہت ممکن ہے کہ وہ مجسٹریٹ یا منصف ہوجائے اور اس طرح اس خاندان کے دن پھریں۔ انندا کے والد کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اس نے بہت جرأت سے کام لے کر انندا کو ایک اسکول میں شریک کردیا تاکہ وہ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ اس سے زیادہ اس نے یہ کیا کہ لڑکے کو بالکل آزاد چھوڑ دیا کہ موجودہ زمانہ کے مطابق جیسا فیشن اور جیسی معاشرت چاہے اختیار کرے

اس وقت تک انندا نے صرف دنیا کے حالات سنے تھے۔ لیکن کبھی دنیا کی حقیقتوں سے آشنا نہ ہوا تھا۔ اس کی دنیا صرف اپنے گھر اور باپ کی دوکان تک محدود تھی۔ یکایک وہ اس مختصر سی دنیا سے نکال کر دنیا کے ہنگاموں میں پھینک دیا گیا۔ اس کے والد نے گھر پر بھی ایک مدرس کو مقرر کردیا تاکہ وہ مدرسہ کا اچھا طالب علم بن سکے۔ اور اپنی بدتمیزیوں اور بے وقوفیوں پر کسی کو نکتہ چینی اور ہنسنے کا موقع نہ دے۔ خوش قسمتی سے مدرس بھی ایسا مل گیا جس کے خاندان میں سات پشتوں سے مدرسی کا پیشہ چلا آرہا تھا۔ اور جو خوابوں اور نیندوں میں بھی مدرسہ کا سبق دہرایا کرتا تھا۔ انندا نے ابتک بازاروں، کھاتہ داروں، قرضداروں کے سوا اور کچھ نہ سنا تھا اور اس کے کانوں میں صرف "درآمد" اور "برآمد" کے الفاظ گونجا کرتے تھے۔ مگر اب اُس کے کانوں میں، "امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرنے" "درجۂ اعلیٰ میں پاس

ہوتے" اور "سبق کو حفظ کرنے" کے الفاظ جاگزیں ہو رہے تھے

پہلے پہل تو انندا کو ہر چیز عجیب اور تحیّر آفریں معلوم ہوئی۔ اور وہ اچھے نمبر حاصل کرنے کی مسرتوں اور فخر کو سمجھ نہ سکتا تھا۔ لیکن وہ ذہین تھا اس لئے اس نے بہت جلد ہوش سنبھال لیا اور سمجھنے لگا، کہ امتحان کی کامیابی کے لئے دیوانہ وار کوشش کرنا، دوکانداری میں جان کھپانے سے بدرجہا بہتر ہے۔ وہ اس امر کو کبھی نہ بھولتا تھا کہ وہ اپنے خاندان میں جدید معاشرت کا بانی ہے۔ اس کے اطوار اور اس کی زبان بالکل تبدیل ہوگئی تھی۔ وہ اپنے تلفظ اور لہجہ کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔ تاکہ قدیم طرزِ گفتگو کا کوئی جملہ، اس کی گفتگو کو بدنما نہ کرے۔ وہ گھر کے اندر اور باہر جسقدر بھی انگریزی الفاظ اس کو یاد تھے، بولتا تھا، اور اس پر بہت فخر کرتا تھا۔ دوسری انگریزی کتاب ختم کرنے سے پہلے ہی اس نے بنگالی میں خط لکھنا اور حساب کرنا ترک کر دیا۔ جسے اس کے گھر والے محض حرکتِ طفلانہ سمجھتے تھے۔ لیکن ان سب میں اس کی ماں، سب سے زیادہ اس کی مداح تھی۔ وہ مسرّت سے جگمگاتے ہوئے چہرہ کے ساتھ کہتی۔ "کیوں انندا، تم اب حقیقت میں صاحب لوگوں کی طرح لکھنے لگے" انندا یہ سنکر خوشی سے پھولا نہ سماتا،

جس روز انندا کالج میں داخل ہوا، اس کو ایسا معلوم ہوا کہ اس نے نیا جنم لیا ہے، اس نے اپنا پرانا لباس پھینک دیا اور ماں سے کچھ روپیے کر نئے کپڑے بنوائے۔ وہ خیال کرتا تھا کہ اگر عمدہ اور جدید وضع و قطع کے لباس استعمال نہ کرے گا تو لوگ اس کی اصلیت کو سمجھ کر اس پر ہنسیں گے۔ وہ اب اس امر میں ندامت محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کے باپ دادا لوہار تھے

وہ اپنی ماں سے کہتا۔ "اگر کبھی کوئی آہنی سامان کا گودام، سونے کی کان بن سکتا ہے تو وہ صرف میری ہی وجہ سے ہوگا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں اس گھرانے میں کیسے پیدا ہوا"

ماں یہ خیال کرتی کہ لڑکا مستقبل کے خوشگوار خواب دیکھ رہا ہے۔ اور وہ جواب دیتی۔ "ہاں میرے پیارے حقیقت میں تم ہی اس گھر میں "پارس" لاؤگے۔ میں اس اُمید میں جی رہی ہوں کہ تم اس گھرانے کی ساری مصیبتوں کو دور کرو"

انندا کہتا "لیکن اماں جان۔ میں ایک سچے "پارس" کے متعلق نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ محض مثال کے طور پر"

"اونھ، سب ٹھیک ہے" ماں جواب دیتی۔ "یہ تمہارے کہنے کا طریقہ ہے۔ تم تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان بولتے ہو اور میں ایک معمولی دیہاتی کی۔ میرے بیٹے خدا تمہاری عمر دراز کرے"

وہ اپنے مدرس کے گھر کی چیزوں کو بہت غور سے دیکھا کرتا تھا۔ وہ اس کی آراستہ نشست گاہ کی آسائشوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس نے اپنے لئے بھی دو بید کی کرسیاں خرید لیں۔ اور اس نے تمام دن اپنے کمرہ کو سجانے میں گذار دیا۔ دن بھر کی محنت کے بعد کمرہ کسی قدر خوشنما نظر آنے لگا۔ لیکن شام کی تفریح کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس نے

اپنے کمرہ کو انتہائی خراب حالت میں دیکھا۔ انندا کے جانے کے بعد ہی اس کا باپ کمرہ میں آیا تھا، اور ایک کرسی پر بھیگا ہوا تولیہ رکھدیا تھا۔ دوسری کرسی پر اسکے بھائی کا کوٹ پڑا ہوا تھا۔ انندا نے اپنی میز پر ایک بھورے رنگ کا کاغذ بچھا دیا تھا۔ کیونکہ اس سے بہتر اور کوئی چیز اس کے پاس نہ تھی۔ لیکن کسی نے اس پر تیل انڈیل دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس شخص نے اس قسم کی بیہودگیاں کی تھیں اس نے کمرہ میں آرام بھی کیا تھا۔ وہ کرسی پر بھی بیٹھا تھا۔ اور اس نے اپنی تیل بھرے پاؤں پہلے میز پر رکھے۔ اور پھر میز پر سے اٹھا کر دیوار پر رکھدیے تھے۔ یہ دیکھ کر انندا غصہ کے مارے سُرخ پڑگیا۔ اس نے میلا تولیہ پھینک دیا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ کرُسیاں داغدار ہوگئی ہیں وہ غصہ سے رونے لگا

لیکن ابھی اس کو اپنی بدنصیبوں کا صحیح اندازہ نہ ہوا تھا۔ اس نے ایک پُرانی چادر میں، ماں کی ساڑی کی بیل لگاکر دروازہ کا پردہ بنایا تھا۔ لیکن جب اس نے اس کو دیکھا تو کسی نے اس میں سے ایک رومال کے برابر ٹکڑا کاٹ لیا تھا۔ باقی حصہ سے برتن پونچھے گئے تھے۔ اور دیوار پر کسی نے کوئلہ سے گھوسی کا حساب لکھا تھا۔ اس نے ایک لمبی آہ کھینچی اور اپنے گھر کی قدیم معاشرت کو جدید معاشرت میں تبدیل کرنے کا ارادہ ترک کردیا

لیکن اس کے بڑھتے ہوئے جوش کو دبانا ناممکن تھا۔ گو اس نے بڑوں کی معاشرتی اصلاح کرنے سے ہاتھ دھولیا تھا۔ لیکن اُسے چھوٹوں کی معاشرت کو بہتر بنانے کی اُمید ضرور تھی۔ اس نے اب اپنے چھوٹے بھائی کی طرف توجہ کی۔ اس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ اس کو نئی روشنی کی فضا میں رکھے گا۔ اور اس مقصد کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ اپنے بھائی کو اپنے مدرس کے گھر اور بعض اوقات کالج بھی لیجانے لگا

مگر اس کی یہ آخری سعی بھی کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ ایک روز اس نے لڑکے کو بہترین لباس پہنائے۔ اس کو بہت سی نصیحتیں کیں، بہت سے آداب سکھائے اور پھر کالج لے گیا۔ لڑکا اپنے بھائی سے بہت ڈرتا تھا اس لئے وہ جاکر بہت خاموشی سے بیٹھا رہا اس کے بعد وہ ایک ایسے کمرہ میں گیا۔ جہاں طلبہ کی کثرت تھی، لڑکا موٹا تازہ اور خوبصورت تھا۔ اس لئے ہر شخص آکر اس کی ٹھوڑی چھوتا اور اس کے رخساروں کو پیار سے مس کرتا۔ لڑکے نے دو تین منٹ تک تو ان بیجا تکلیفوں کو برداشت کیا۔ لیکن جب سب کی یہ شرارتیں حد سے متجاوز ہوگئیں تو اس کا صبر و تامل بھی جاتا رہا اور اس نے ایک شخص کو تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا "اُدھر جا بندر" تمام طلبہ نے یہ سنکر ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔ لیکن غریب انندا کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا۔ اس کو یقین ہوگیا کہ ہر شخص یہ سوچ رہا ہوگا کہ اس کے خاندان والے تہذیب اور ادب سے بیگانہ ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ اپنے بھائی کو کہیں نہیں لے گیا

ایک مرتبہ اس نے اپنے خاندان کی عورتوں کے لباس میں اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن اس کی بیحد مخالفت کی گئی۔ نئے لباس کے معنی یہ ہیں کہ مصارف میں اضافہ ہو۔ اور یہاں یہ حالت تھی۔ کہ صرف ایک دھوتی بالکل کافی سمجھی جاتی تھی۔ اس سے زائد کو فضول خرچی میں شمار کیا جاتا تھا ——— آخرکار اس نے سمجھ لیا کہ ایسی ذہنیت کو تبدیل کردینا،

جس نے آہنی تجارت میں پرورش پائی ہو، بہت دشوار ہے - اور اس کے بعد اس نے یہ طے کیا کہ اب وہ صرف اپنی ہی زندگی کی پروا کرے گا

استاد کے گھر میں وہ خاندان کے ایک رُکن کی حیثیت رکھتا تھا - اور اس کو ہر وقت اس گھر میں آنے کی اجازت تھی - گو اس گھر کا مالک ایک غریب اسکول ماسٹر تھا، لیکن اس کے تعلقات اور مراسم متمول اور بااثر لوگوں سے تھے - انندا بھی ان لوگوں سے تعلقات اور مراسم پیدا کرنے لگا - مگر اپنی ذات اور خاندان کو حتی الامکان ان لوگوں سے چھپاتا تھا - اگر کوئی اس کے خاندان یا خود اس کے متعلق دریافت کرتا تو وہ جواب دیتا "میرے لئے صرف اسقدر جاننا کافی ہے کہ میں اپنے استاد کا شاگرد ہوں

ماسٹر کے مکان پر ایک روز مختصر سی پارٹی تھی - نوجوانوں سے کمرہ بھرا ہوا تھا - اور انندا بھی اس مجمع کے ساتھ شور و قہقہہ بلند کر رہا تھا

دفعتہً ایک لڑکی، کمرہ میں داخل ہوئی - انندا کے لئے اس کا کمرہ میں اچانک داخل ہونا، ایک دیوی کے آنے سے کم نہ تھا جو بغیر کسی اطلاع کے چلی آئی ہو - وہ مسرت اور حسن کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی -

انندا سوچ ہی رہا تھا کہ یہ حسن کی دیوی کون تھی - کہ کمرہ کی دوسری لڑکیوں نے اس کا لطیف قہقہوں سے استقبال کیا ——— ایک لڑکی نے کہا :-

" اُجالا، ادھر آؤ، میں تمھارا تعارف انندا بابو سے کرا دوں - یہ ابا جان کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ہوشیار ہیں - یہ ہمارے حلقہ میں سب سے زیادہ ذہین اور خوش مذاق ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں کافی دلچسپی رکھتے ہیں"

اُجالا نے مسکراتے ہوئے کہا - "مجھے اُمید ہے کہ میں بھی آپ کی قابلیت کی تعریف اور لوگوں کی طرح کرنے کے قابل بن سکوں گی" ——— دوسری لڑکی نے کہا :——

" لیکن تم بھی تو مجسمہ قابلیت ہو - (انندا بابو سے) تم جانتے ہو - اُجالا کو، اگر کوئی شخص ایک دفعہ اس کو دیکھ لے تو پھر کبھی نہ بھولے - اس لئے تم کو ہوشیار رہنا چاہیئے"

اُجالا کو یہ بات کسی قدر ناگوار ہوئی - کیونکہ بہرکیف انندا اس کے لئے ایک اجنبی تھا - وہ پہلی ہی ملاقات میں اس قدر بے تکلفانہ گفتگو کی متوقع نہ تھی - اس نے شرماتے ہوئے بردنا کو ایک دھکا دیا - "چلو، چلو بس، اپنی بکواس رہنے دو"

اس کے بعد وہ پلٹی اور کمرہ کے دوسرے کنارے کی طرف اور لوگوں سے ملنے کے لئے بڑھی - جو وہاں جمع تھے - انندا نے، ایک لمحہ کے لئے اس کی نظروں سے نظر ملائی - اور پھر سنہرے کنارے کی ساڑی کی ایک جھلک دکھلاتی ہوئی اُجالا انندا کی نظروں سے غائب ہو گئی

انندا، اضطراب و بیخودی کے عالم میں کھڑا اس کو دیکھتا رہا - وہ کس قدر دلربا انداز سے چل رہی تھی - اس نے

قدیم کہانی اور قصوں میں سنا تھا کہ شہزادی کے ہر قدم پر ایک کنول کا پھول کھل جاتا تھا۔ جب وہ مسکراتی تو جواہرات کی بارش سی ہونے لگتی، اور جب وہ اشکبار ہوتی تو موتیوں کے دریا بہنے لگتے۔ اس کو محسوس ہونے لگا کہ کتاب کی پری انسانی لباس پہن کر آگئی ہے۔ اس کو یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کے راستہ پر پھول کھل رہے تھے، اور اس کے تبسم کی تنویروں سے سارا کمرہ ایسا جگمگ جگمگ کر رہا تھا کہ ایک اصلی ہیرے کی روشنی سے بھی ناممکن تھا۔ اور اس کے آنسو۔؟ انندا نے محسوس کیا کہ، وہ شخص، جس کے لئے وہ اپنے آنسو بہائے گی۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب ہوگا

اُجالا، اپنے پھول ایسے ہاتھوں سے جھک جھک کر لوگوں کو سلام کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کس قدر خوبصورت تھے، برونا اب تک بہت ہی غور سے اس کی تمام باتوں کو دیکھ رہی تھی۔ اب وہ انندا کے پاس گئی اور اس سے بولی۔ "کیا تم بھی اپنے آپ کو، اُجالا کے شیدائیوں میں شریک کرنا چاہتے ہو۔ اگر تم ایسا کرو تو اپنے تمام حریفوں میں سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوگے"

انندا ایک شرمیلی لڑکی کی طرح، شرما گیا، لیکن دل ہی دل میں اس کو مسرّت بے پایاں حاصل ہو رہی تھی۔ اس نے برونا سے کہا۔ "مذاق مت کرو۔ میں اس عزت کے قابل ہرگز نہیں ہوں"

سورج غروب ہونے کے بعد بھی اُفق پر رنگینیاں چھائی رہتی ہیں۔ اس لئے اجالا کے چلے جانے کے بعد بھی، وہ مسرتیں ہنوز دوستوں میں پھیلی ہوئی تھیں، جو اس نے لاکر بکھیر دی تھیں۔ انندا کے قلب معصوم میں اجالا کے حسن کی شعلہ باریاں، قیامت برپا کئے ہوئے تھیں۔ وہ اس کے متعلق جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے، مگر وہ برونا سے کچھ دریافت کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ لیکن اس کی مسرّت کی انتہا نہ رہی۔ جب برونا کی طرف سے اس کے اور اجالا کے لئے دعوت کے پیغام آنے لگے۔ اس کا گھر بہت ہی چھوٹا تھا۔ اور اس میں کسی بڑی تقریب یا دعوت کی گنجایش نہ تھی اس لئے معدودے چند ہی ان دعوتوں میں مدعو ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ چونکہ برونا ہی میزبان ہوتی تھی۔ وہ ایک ہی وقت بہت سے آدمیوں کو دعوت بھی نہ دے سکتی تھی۔ اس لئے وہ بہت ہی مختصر سی پارٹی دیتی تھی جس میں خاص لوگ ہوتے تھے، لیکن انندا ہمیشہ مہمانوں میں ہوتا تھا۔ اجالا اکثر مسکراتی ہوئی کہتی:— "کیا تم نے پوشیدہ طور پر برونا سے ساز باز کر رکھی ہے؟" برونا جواب دیتی "نہیں یہ میری وجہ سے نہیں ہے بلکہ انندا بابو کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اجالا کہاں ہے۔ اور اس لئے ان کو بھی، وہاں، پہونچ جانا چاہیئے"

ایک زمانہ اسی قسم کی بے تکلف صحبتوں میں گزر گیا۔ اور آخر کار جس روز کا انتظار تھا وہ بھی آگیا۔ وہ برونا کے مکان میں بیٹھا تھا، شام کا وقت تھا اور چاند کی ہلکی روشنی برآمدہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ یکایک برونا ایک تیسرے مہمان کے استقبال کے لئے وہاں اُٹھ کر چلی گئی۔ انندا نے نظر اٹھائی۔ سفید بادلوں کے ٹکڑے آسمان پر، ہنس کی طرح تیرتے پھر رہے تھے۔ اس نے اجالا کے نازک ہاتھ کو مس کیا۔ گویا یہ اتفاقی امر تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ نہ ہٹایا۔ اس کے برخلاف

اس نے انندا کے ہاتھ کو نرمی سے پکڑ لیا - اور اس کو دیکھ کر ترچھی نظروں سے مسکرا دیا - چند لمحوں کے بعد دو چمکدار آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے

تو گویا، وہ اس کے خوابوں کی شہزادی تھی وہ حقیقت میں موتیوں کے آنسو روتی تھی!

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا - " آپ میرے دل سے اس قدر قریب کیوں ہو گئے ہیں؟ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟

انندا نے کہا - " میں اس ہاتھ کو ہمیشہ اپنے ہاتھوں میں لئے رہنا چاہتا ہوں "

اُجالا نے کہا - " آپ یہ بھی جانتے ہیں یہ کس کا ہاتھ ہے - آپ علم، دولت اور شہرت کے مالک ہیں - میرے پاس کیا ہے؟ میں آپ کے قابل نہیں ہوں "

انندا بولا - " میرے پاس جو کچھ ہے - اور میں جس قابل بھی ہوں، صرف تم کو حاصل کرنے کے لئے ہے - اگر ایسا نہیں تو پھر میرا قابل ہونا، اور میری دولت بے معنی چیز ہے - تم کو معلوم نہیں کہ صرف تم تک پہونچنے کے لئے مجھے کتنے آہنی قلعے توڑنے پڑے - تم نے میری جو قیمت لگائی ہے - میں اس کے بھروسہ پر اپنے آپ کو تمھارا حقدار ثابت کر سکتا ہوں - اس کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں ہے "

اجالا نے کہا - " ایک شخص، اس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، جو وہ اپنی قابلیت سے حاصل کرتا ہے - اگر میں اس نظریہ... پر یقین نہ کرتی تو کبھی آپ سے گفتگو کرنے کی جرأت نہ کرتی - دولت، خاندان اور رسوخ ممکن ہے کہ ایک انسان کے شوکت اور وقار میں اضافہ کر دے، لیکن یہ عارضی چیز ہے - سچا سونا دریافت کیا جا سکتا ہے، بنایا نہیں جا سکتا "

ان کی زندگی کے ایام، رنگین خواب کی مانند گزرتے گئے - ایک روز یکایک انندا نے اجالا سے کہا - " اجالا اب ہم دونوں ایک دوسرے کی دلی کیفیات سے آگاہ ہو چکے ہیں - لیکن دُنیا کا بھی ہم پر حق ہے - مجھے اب یہ بتانا ہے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں؟ تم یہ سنکر تعجب کرو گی کہ میرے خاندان میں کسی عورت کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا - اور میرا باپ اپنے نام کے ساتھ (لوہار) لکھا کرتا تھا "

انندا کا جسم کانپ رہا تھا - اور اس کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے بہہ رہے تھے - اُس نے مسکراتے ہوئے اُجالا کو دیکھا ---- لیکن اس نے اُجالا کے چہرہ کو مسرّت اور تبسّم سے چمکتا ہوا پایا - اُس نے کہا - " اس میں کیا حرج ہے " میرا باپ اپنے نام کے ساتھ (چمار) لکھا کرتا تھا " جب بچپن میں مجھے لڑکیوں کے بورڈنگ میں شریک کر دیا گیا - تو صدر مدرسہ نے یہ لفظ نکال دیا " ---- انندا نے اُجالا کو اور اُجالا نے انندا کو پھر ایک بار دیکھا - اور پہلی بار دونوں کے لبوں کے اتصال سے یہ حقیقت ان پر ظاہر ہوئی کہ محبت کی دنیا میں قوم کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ مذہب کو دیکھا جاتا ہے - اور مذہب بھی وہ جس کا دوسرا نام صرف ایثار و قربانی ہے

محشر عابدی

ابوالہول

مصر کے جس عجیب و غریب بُت کو انگریزی میں (Sphynx) کہتے ہیں اسی کو عربی زبان میں "ابوالہول" کے نام سے موسوم کرتے ہیں - اگرچہ "ابوالہول" کے مجسمے مصر میں بہت عام ہیں - لیکن وہ ابوالہول جو مصر میں ہرم اعظم کے پاس ہے زمانہ حال میں بہت زیادہ مشہور ہوگیا ہے - مورخ پلاتی جب مصر گیا تو اس سے بیان کیا گیا کہ یہ شاہ آموسیس فرعون مصر کا مقبرہ ہے جس نے ہکسو قوم کو ملک مصر سے نکالا تھا - لیکن بعض قدیم مورخین کا قول یہ ہے کہ وہ گلرخ رودا پہ (Rhodope) کا مقبرہ ہے جس میں اس کی حنوط شدہ لاش رکھی گئی تھی - (واضح ہو کہ یہ وہ حسن فروش عورت تھی جو متعدد فراعنۂ مصر کے پاس رہ چکی تھی) بعض عرب مورخین نے ابوالہول کی شکستہ حالت کا سبب یہ بتایا ہے کہ ۱۳۷۹ء کے قریب ایک عرب شیخ کو جو بت شکنی کا جوش آیا تو اس نے ابوالہول کی ناک توڑ ڈالی - کئی صدیاں گذریں کہ مشہور عرب مورخ عبداللطیف نے لکھا تھا کہ :- "ابوالہول کے جسم پر ایک قسم کی سرخی جھلکتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اوس پر کوئی سرخ قسم کی وارنش پھیری گئی ہے - اس کے چہرے میں حسن و ادا کی تمام علامتیں موجود ہیں - کچھ عرصہ گذرا مغربی محقق مسٹر ڈبلو ہیملٹن نے بیان کیا تھا کہ "کسی زمانہ میں ابوالہول پر رنگ چڑھا ہوا تھا - اب رہا حسن و جمال تو وہ اسی دن کافور ہوگیا - جب مہذب "سیاحوں نے غریب "ابوالہول" کے چہرہ کو اس نیت سے پچھنا اور کھرچنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے کچھ اجزا بطور یادگار سیاحت اپنے ساتھ لے جائیں" سیاح تھیونو (Thevenot) نے ابوالہول کے متعلق ایک روایت لکھی تھی جس کا اعادہ بعد میں موسیو ڈی برلوس (De Brosses) نے بھی کیا ہے - وہ لکھتا ہے کہ "بعض مورخین کا یہ بیان ہے کہ "آفتاب طلوع ہوتے ہی اگر ابوالہول سے کوئی بات دریافت کی جائے تو وہ اس کا جواب دیتا ہے"۔ علاوہ ازیں جو لوگ ہرم اعظم کی سیر کرنے جاتے ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ قدیم زمانہ کے پجاری ہرم اعظم کے چاہ تاریک میں گھس کر کسی سرنگ کے ذریعہ سے ابوالہول میں چلے آتے تھے - لیکن تحقیق سے اس قول کی کوئی تائید نہیں ہوتی - لہذا ہمیں اس عرب مورخ کا قول زیادہ معقول نظر آتا ہے جس نے لکھا ہے کہ :- "دریائے نیل کی طغیانی سے سرزمین مصر میں جو زرخیزی پیدا ہو جاتی ہے اس کے اظہار کے لئے قدیم مصریوں نے یہ عظیم ابوالہول تعمیر کیا تھا"۔

ابوالہول کے متعلق بعض پیمائشیں

انگریز سیاح مسٹر پوکاک نے ابوالہول کے متعلق بعض مفصل پیمائشیں لکھی ہیں - بقول سیاح مذکور "گردن کا حصہ زیریں - جہاں

سے سینہ شروع ہوتا ہے ۳۳ فٹ چوڑا ہے - اور گردن کے اگلے حصہ سے گدی تک ۲۰ فٹ ہے - اور پھر گدی سے اس سوراخ تک جو کمر میں ہے ۵، فٹ ہے - یہ سوراخ یا شگاف ۵ فٹ طویل ہے - پھر اس سوراخ سے دُم تک کی پیمائش ۳۰ فٹ ہے۔" مگر یہ پیمائشیں بلانٹی کی درج کردہ پیمائشوں سے کسی قدر زاید ہیں - بلانٹی کے نزدیک ابوالہول کا طول صرف ۱۱۳ فٹ ہے - ۱۷۹۰ء میں گوبرٹ (Gobert) نے لکھا تھا کہ "درحقیقت ابوالہول کی صورت بگاڑ دی گئی ہے" تقریباً دوسو برس گذرے کہ موسیو میلٹ نے (Maillet) ابوالہول کی سیر کی تھی - چنانچہ اسوقت اس نے بھی ابوالہول کو ننگا اور اس کے جسم پر رنگ پھرا ہوا دیکھا تھا - اس سیاح کا خیال ہے کہ پہلے زمانہ میں اس بُت پر کوئی مندر بنا ہوا تھا

چونکہ ابوالہول کا سر و چہرہ عورت کا اور جسم شیر کا ہے اس لئے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ برج اسد اور برج سنبلہ دونوں کا مظہر ہے - اور چونکہ اس کا چہرہ متبسم ہے اس لئے بعض زاہدان خشک کے نزدیک وہ ترغیب معصیت کا مجسمہ ہے اور چونکہ اس کے پنجے شیر کے ہیں اس لئے ان لوگوں کے نزدیک یہ معصیت کے بعد آئندہ عذاب ہیں - ان زاہدان خشک کا خیال واقعی تھا تو اچھا مگر زمانہ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ بعض لوگوں کو اس ابوالہول کی ریش دراز کے شکستہ ٹکڑے بھی مل گئے چنانچہ مشہور مستشرق و ماہر فلکیات مسٹر پیازی اسمائتھ کا قول ہے کہ :- " ابوالہول کا چہرہ زنانہ نہیں بلکہ مردانہ ہے - اور کسی زمانہ میں یہ چہرۂ نسوانی صاحب ریش دراز تھا - اور سامنے کی ریت صاف کرنے کے بعد ریش دراز کا حصہ دونوں پنجوں کے درمیان پڑا ہوا پایا گیا اس ریت کی صفائی بصرف کثیر ۱۸۱۷ء میں ہوئی تھی، لیکن اوہام پرست اور ضعیف الاعتقاد لوگوں نے جنتروں یا تعویذوں کے لئے اس قدر نوچ کھسوٹ کی - کہ مجبور ہو کر اس ریت کو پھر اپنی اصلی جگہ پر بچھا دیا گیا ۱۷۹۸ء میں فرانسیسیوں نے ریت ہٹا کر ابوالہول کی صرف کمر صاف کی تھی - مگر کاونٹ کاوِجلیا نے ایک اور انکشاف کیا یعنی ابوالہول کے پھیلے ہوئے دونوں پنجوں کے درمیان ایک چھوٹا سا مندر دریافت کیا

ابوالہول کا پورا بُت ایک ٹھوس چٹان کا ٹکڑ بنایا گیا ہے - صرف دو حصے یعنی کمر اور اگلے پنجے کے ایسے ہیں جہاں دوسرا پتھر کاٹ کر جوڑا گیا ہے - ابوالہول کی شکل غالباً کسی ایسے فرعون مصر کی صورت پر بنائی گئی تھی - جسے ضعیف الاعتقاد رعایا نے دیوتا بنا دیا تھا - چنانچہ ابوالہول کی دستار کے جو علامات باقی ہیں ان میں سانپ کے نشانات پائے جاتے ہیں - جو فراعنۂ مصر کے تاجوں کا جزو لاینفک تھا

ابوالہول کا تمام بت ٹھوس ہے - اور اس کے اندر آج تک کوئی مخفی کمرہ یا حجرہ برآمد نہیں ہوا - کرنل وائس اور دیگر مستشرقین نے چھوٹی چھوٹی فولادی سلاخیں لے کر ابوالہول کے جسم میں ادھر سے اُدھر آر پار کر دیں - لیکن کہیں کوئی پولی یا خالی جگہ اس کے اندر نظر نہیں آئی

جو مندر اگلے پنجوں کے درمیان بتایا جاتا ہے وہ سنگ سُرخ کا ایک مستطیل ٹکڑا تھا - جو چودہ فٹ طویل اور سات

فٹ عریض تھا۔ وہ ابوالہول کے سینہ پر نصب تھا۔ اور اس پر تھیبز (Thebes) کے بادشاہ طوطمیس چہارم کی مہر منقوش تھی۔ بہت سی سنگین تختیاں پنجوں کے اردگرد بھی پائی جاتی ہیں۔ جن پر مختلف زبانوں میں کچھ عبارتیں منقوش ہیں

ابوالہول کے مذہبی پہلو سے قطع نظر، یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس ابوالہول کا اہرام مصر سے کیا تعلق ہے ؟ مسٹر اسمائتھ نے اس کی نسبت تحریر کیا ہے کہ :- " ابوالہول کا بت اہرام کے قدیم راستہ کے رُخ سے قطعی ہٹا ہوا ہے۔ یعنی وہ دوسری سمت واقع ہے۔ اور چونکہ یہ ہرم ممالے کے سامنے واقع ہے اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ شاید اس کی بھی وہی تاریخ ہو جو بانی ہرم ثانی ملک سفرین کی ہے۔ چنانچہ ماریٹ بے نے شہر تھیبز میں ایک چھوٹے سے مینار پر اس بادشاہ کا نام درج پایا تھا۔ ماریت بے لکھتے ہیں کہ :- " ایک سطر میں جو تقریباً نام بھر آگئی ہے ایک جگہ اس بادشاہ کے نام کی مہر کا ایک حصہ باقی رہ گیا ہے اور ابھی تک پوری طرح محفوظ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یقیناً اس ابوالہول کا تعلق اس ہرم کے بانیوں سے ضرور ہوگا۔ جو اس کے عقب میں واقع ہے "

بایںہمہ آج تک یہی سمجھا گیا ہے کہ ملک خوفو فرعون مصر یعنی بانی ہرم اعظم ہی نے ابوالہول کو بنایا تھا۔ ابوالہول کا مندر بھی عجیب دلچسپ چیز ہے۔ ملک سیفرن کا بت اور الواح اور مجسمے جو ہرم اعظم کے چاہ تاریک سے برآمد ہوئے ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی قومی نزاع کے سلسلہ میں مصری پجاریوں نے یہ مجسمے کنوئیں میں پھینک دیے تھے۔ بعض مورخین کا قول ہے کہ ابوالہول دنیا کا قدیم ترین بت ہے۔ اور بلحاظ قدامت وہ اہرام مصری سے بھی قبل کا بنا ہوا ہے

الغرض ابھی تک ابوالہول کی نسبت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ خیال آرائیاں ہیں۔ حقیقت ہنوز پردۂ خفا میں ہے ممکن ہے آئندہ زمانہ میں آثار قدیمہ کی گہری نظر ابوالہول کا راز معلوم کرے۔ اور اس وقت تک جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے اس میں مزید اضافہ ہو جائے

ترکی جمہوریہ

انقلاب ترکی کی بے مثل تاریخ، ایک زندہ قوم کی جد و جہد کی سبق آموز داستان، مصنفہ مسٹر ضمیر احمد ہاشمی ایم اے قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے (عہ/)

محشرستان

حضرت محشر عابدی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ جو اُردو کے ممتاز رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مجلد عا/ غیر مجلد عہ/ علاوہ محصول

مینجر نگار

قیامت برحق ہے

مُستقبل کی تباہکن جنگ

دنیا کی علمی ترقیاں جس اسلوب پر جاری ہیں وہ روز بروز اس حقیقت کو واضح کرتی جاتی ہیں کہ دنیا میں ایک بار قیامت ضرور آئے گی۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ قیامت صورِ اسرافیل کا نتیجہ ہو یا خود انسان کی گمراہ ذہانت کا اور [illegible] میں نگار کے صفحات پر متعدد بار بحث ہو چکی ہے کہ انسانی ترقیاں آہستہ آہستہ اس منزل سے قریب تر ہوتی جارہی ہیں۔ جنھیں مذہبی زبان میں "علیٰ شفا حفرۃ من النار" کہتے ہیں۔ اور غالباً وہ وقت دور نہیں جب ہر شخص اس ہولناک منظر دیکھ لے گا ——— ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" لیکن یوروپ اب جن اصول پر کاربند ہونا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ "نہ خود زندہ رہو نہ کسی اور کو زندہ رہنے دو"

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی علمی ترقیوں کی کوئی انتہا نہیں اور موجودہ دور نے ایک حد تک اس کو ثابت بھی کر دیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ترقی کی یہ راہیں انسان کو کس منزل پر لئے جارہی ہیں، اس کا حال خود انھیں سے پوچھیے جو علم و افکار کے بڑے علمبردار نظر آتے ہیں۔ چنانچہ سرگل نیومین جو امریکہ کے ملٹری اسٹاف میں کسی وقت ایک معزز رکن کی حیثیت رکھتے تھے، ٹائمس آف انڈیا میں "جنگ مستقبل" پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"اس امر میں اب کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں کہ آنے والی جنگ اپنی نوعیت کے لحاظ سے دنیا کی بالکل پہلی جنگ ہوگی جس میں بجائے ہاتھ پاؤں کے انسان اپنے دماغ سے لڑے گا۔ اور تیغ و تفنگ کی جگہ صرف گیس، کیمیائی مرکبات اور بجلی کی شعاعوں سے کام لے گا۔

ہم یہ کہنے میں کسی قیاس آرائی سے کام نہیں لے رہے ہیں کیونکہ اس قسم کے حالات حرب فی الحال طیار ہو رہے ہیں اور جس وقت تک کہ جنگ مستقبل کی ساعت آئے گی ان کی بے رحمانہ ہلاکت آفرینی کی اہلیت خدا معلوم کس حد تک [illegible] ہوگی

یہ کہنا بالکل درست ہے کہ آیندہ جنگ، جنگ نہ ہوگی بلکہ قتل عام ہوگا، خونریزی مخلوق ہوگی اور گناہ بے گناہ کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے گا، بچے، عورتیں، بڈھے، سب اس آگ کی نذر ہو جائیں گے اور کوئی ان کا بچانے والا نہ ہوگا سپاہی محاذِ جنگ پر جائیں گے (اگر واقعی کوئی مخصوص محاذ جنگ ہوگا۔) یہ سمجھ کر کہ اب انھیں واپس نہیں آنا اور اپنے پس ماندگان سے رخصت ہوں گے اس یقین کے ساتھ کہ ان کو بھی ہلاک ہو جانا ہے

جنگ کی ابتدا غالباً فضائی تاخت سے ہوگی اور جو سلطنت زیادہ قوت وہجوم کے ساتھ اس کی ابتدا کرے گی، اسی کو کچھ اُمید کامیابی کی ہوگی ـــــ حال ہی میں لندن کے فوجی محکمہ نے ہوائی تاخت کا مصنوعی مظاہرہ پیش کیا تھا جس میں ۲۵۰ جہاز شامل تھے، نیچے سے سرچ لائٹ ڈالی گئی تو صرف سولہ جہاز نظر آئے جن کو مار کر گرایا جا سکتا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی وقت غنیم ۲۵۰ ہوائی جہازوں سے لندن پر حملہ کرے تو ان میں سے ۲۳۴ جہاز بم گرانے کے لئے بالکل آزاد ہوں گے اور مدافعت کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی

آیندہ جنگ میں جو بم استعمال کئے جائیں گے وہ گزشتہ جنگ کے بموں سے بالکل مختلف ہوں گے۔ علماء کا بیان ہے کہ آیندہ ایک ایک بم میں ہزاروں آدمیوں کو ہلاک کرنے کی قوت موجود ہوگی۔ اور صرف زہریلی گیس ہی اُن سے پیدا نہ ہوگی؛ بلکہ آگ بھی پیدا ہوگی اور مہلک بیماریوں کے جراثیم بھی

لیوسؔ بم (جس کا دوسرا نام "شبنمِ موت" بھی ہے) گرانا تو نہایت معمولی بات ہوگی، گو اس میں بھی اتنی قوت موجود ہے کہ صرف ایک بم لندن کی بڑی سی بڑی عمارت کو آن واحد میں زمین کے برابر کر سکتا ہے

گیسوں میں زیادہ تر "گرین کراس گیس" اور "ییلو گیس" سے کام لیا جائے گا۔ اول الذکر کے استعمال سے لوگوں میں وہی کیفیت پیدا ہوگی جسے "خشکی میں ڈوب جانا" کہتے ہیں۔ یعنی جو حالت پانی کے اندر ڈوبنے والے کی ہوتی ہے وہی اس گیس کے زیر اثر خشکی میں ہوگی ـــــ موخر الذکر کا اثر یہ ہوگا کہ آنکھیں سوج جائیں گی، خون میں سمیت پیدا ہو کر جسم پھوٹ نکلے گا۔ اور ایک انسان اس طرح جھوم جھوم کر فنا ہو جائے گا جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو

علاوہ ان دو گیسوں کے اور بہت سی قسم کی گیسیں استعمال کی جائیں گی۔ جو فوراً ہلاک کر دیا کریں گی، اور کسی کو نظر نہ آئیں گی ـــــ اوّل اوّل تو کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ گیس ہوا میں منتشر ہے یا نہیں لیکن جب وہ اپنا اثر پیدا کر چکے گی تو لوگوں کو اس کا علم ہوگا۔ لیکن پھر اس کی کوئی تدبیر ممکن نہ ہوگی کیونکہ تمام اعضاء رئیسہ اس وقت تک بیکار ہو چکے ہوں گے

ہوائی جہاز رانوں پر استعمال کرنے کے لئے ایک اور خاص گیس استعمال کی جائے گی جو ہوا میں بہت بلندی پر جاکر پھیلے گی۔ اور جہاز رانوں کو اندھا کر دے گی۔ اوّل اوّل تو اس گیس کا پتہ نہ چلے گا لیکن جب آہستہ آہستہ اس کا اثر قوی ہو جائے گا تو جہاز راں ایسا محسوس کرے گا۔ کہ آنکھوں کے سامنے ایک تاریک پردہ پڑتا جارہا ہے۔ اور پھر بینائی بالکل

غائب ہو جائے گی - اندازہ کیا گیا ہے کہ سنو ہوائی جہاز جو ایک ٹن گیس لے جا سکتے ہیں، تمام پیرس کو ۲۰ میٹر موٹی گیس کی چادر میں لپیٹ سکتے ہیں اور اگر ہوا تیز نہ ہو تو ایک گھنٹہ کے اندر پورا شہر فنا ہو سکتا ہے

علاوہ ان کے بجلی کے بم بھی طیار ہو رہے ہیں - ان کا وزن صرف ایک کیلو گرام (اندازاً ایک سیر) ہوگا، لیکن جس وقت یہ جا کر پھٹیں گے تو ان سے ۳۰۰۰ درجہ کی حرارت پیدا ہوگی اور پھر جو چیز راہ میں حائل ہوگی اسے جلا کر خاک سیاہ کر دیں گے ـــــ پانی ڈالنے سے ان کی حرارت اور زیادہ بڑھے گی - اس وقت تک کوئی تدبیر ایسی دریافت نہیں ہوئی ہے جو اس آگ کو بجھا سکے ـــــ یہ بم سڑکوں پر پھینکے جائیں گے تاکہ وہ زمین کو پھاڑ کر اندر ہی اندر گیس پمپ میں آگ لگا دیں - اور لوگ مکانوں کے جلنے سے باہر نکل پڑیں ـــــ پھر ٹھیک اس وقت جبکہ یہ بجلی کے بم گرائے جائیں گے - اور آبادی گھبرا کر باہر نکل آئے گی تو اوپر سے زہر آلودہ بم گرائے جائیں گے تاکہ منظر ہلاکت بالکل مکمل ہو جائے

جرمنی ہوائی بیڑے کے انسپکٹر لفٹنٹ سیگریٹ کا بیان ہے کہ صرف چند ہوائی جہاز کافی ہیں کہ وہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے اور محفوظ ترین شہر کو دو گھنٹے کے اندر تباہ کر کے رکھدیں

افواج برطانیہ کے کرنل مارش اور امریکہ کے جنرل اسکویر اس رائے میں متفق ہیں کہ ہوائی تاخت اور حملۂ گیس کی مدافعت کا کوئی موثر طریقہ اس وقت تک دریافت نہیں ہو سکا

گزشتہ جنگ میں شہر کی آبادی کی حفاظت کا خیال پیش نظر نہ تھا، کیونکہ محاذِ جنگ شہر سے بالکل علیحدہ تھا لیکن آئندہ جنگ میں چونکہ شہروں ہی پر حملہ ہوگا اس لئے آبادی کی حفاظت کا مسئلہ بہت اہم ہو جائے گا - لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلے گا کیونکہ اس وقت تک دنیا کی توجہ صرف اسی طرف مبذول ہے کہ ہلاکت کیونکر پھیلائی جائے، ہلاکت سے بچنے کا سوال ان کے سامنے ابھی تک آیا ہی نہیں ـــــ یقیناً وہ وقت بھی عجیب وقت ہوگا - جب دنیا آبادی سے بالکل خالی ہوگی، جانوروں کی لاشیں پڑی سڑ رہی ہوں گی، نباتات خشک ہو چکے ہوں گے - اور بنکوں کے اندر گڑی ہوئی دولت سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک متنفس بھی باقی نہ ہوگا، درانحالیکہ اسی دولت کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا تھا ـــــ

تذکرۂ خندۂ گل جس میں ۳۰۰ سے زیادہ اُردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف اور انتخاب کلام کے درج ہیں قیمت معہ محصول ۱۲؍

فلسفۂ مذہب اگر آپ مذہب اسلام کو سمجھ کر اس کی پیروی کرنا چاہتے ہیں - تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے موضوع کے لحاظ سے اُردو میں بالکل پہلی چیز ہے - قیمت عہ

منیجر نگار لکھنؤ

لکھنؤ اب سے پچاس سال قبل

رسالۂ ہندوستانی میں پنڈت منوہر لال زتشی ام۔اے نے ایک رسالہ (مرأۃ الہند) کے جابجا اقتباسات پیش کئے ہیں جو اب سے تقریباً ۵۰ سال قبل لکھنؤ سے جاری ہوا تھا۔ انھیں میں سے ایک اقتباس یہ ہے:-

(نیاز)

"حال یہ ہے کہ نو بجے تو خواب سے جاگے اور بمجرد آنکھ کھلنے کے ارشاد ہوا کہ حقہ لاؤ خدمت گار جھٹ پٹ حقہ طیار کرکے لایا اوسے لیٹے لیٹے پیا کئے جب وہ جل کر خاک سیاہ ہوگیا تو جمائیاں لیتے ہوئے اُٹھے اور فرمایا میاں الٰہی بخش افیون جلد طیار کرو میں اس وقت بہت بے چین ہوں کل رات کو تو افیون نے ایسا کم نشہ کیا کہ رات بھر نیند نہیں آئی اور ہاتھ پیر ٹوٹا کئے ہر وقت یہی جی میں آتا تھا کہ تمھیں جگواؤں اور تھوڑی افیون پھر بنوا کر پیوں چونکہ رات زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لاچار اسی بے چینی کے عالم میں پڑا رہا۔ انھوں نے جواب دیا حضور بیت الخلا تشریف لے جائیں افیون طیار رہے۔ اچھا لوٹا رکھواؤ ہم بھی اٹھتے ہیں حقہ بھی بھر کر رکھوا دینا دس بجے چوکی پر سے حقہ اور لوٹا ہاتھ میں لئے ہوئے برآمد ہوئے اور افیون نوش کی حکم ہوا کہ ہمارے بٹیروں کی کابک لاؤ اور شبیر علی بٹیرباز کو بلاتے لانا دیکھوں تو کہ انھوں نے رات کو بھوک بھی دی یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ بھول گئے ہوں پھر پرسوں پالی میں ساری شیخی کر کری ہو۔ یہ کہہ کر بیٹھ گئے اور منہ دھوتے کو پانی طلب کیا پھر فراغ پان نوش کیا۔ خدمتگار نے حقہ بھر کر رکھ دیا۔ اب بٹیروں کے طرف متوجہ ہوئے۔ دوست احباب جمع ہوئے چوسر یا گنجیفہ ہونے لگا۔ اتنے میں بارہ بجے آدمی نے دست بستہ ہوکر عرض کیا کہ حضور خاصہ طیار ہے فرمایا بازی تمام ہولے تو چلتے ہیں ایک بجے کے قریب اندر گئے اور کھانا نوش کیا تو اب گویا جو ہے نے بارہ پیا۔ اب کب میٹھا جاتا ہے پان کھاتے ہوئے خسخانہ پہونچے پنکھا کھنچنے لگا پھر آرام کیا چار بجے اگر آنکھ کھل گئی اور کسی سے پوچھا کہ دن کتنا ہوگا۔ ذرا ٹٹی تو ہٹاؤ۔ ٹٹی ہٹانے کے ساتھ ہی دن تو دیکھنا بھول گئے بند کرو صاحب بند کرو اف اوہ کس قدر دھوپ ہے کہ منہ پھنکا جاتا ہے چلانے لگے۔ اگر کسی نے کہا کہ اے حضور چار بج گئے۔ اٹھئے تو فرماتے ہیں کہ چاہے چار بجیں یا پانچ بجیں ہم تو جب تک یہ دھوپ کی گرمی ہے نہ اٹھیں گے۔ خلاصہ یہ کہ دو گھڑی دن رہے جمائیاں لیتے ہوئے اٹھے اور منہ دھو کر حقہ کی طرف متوجہ ہوئے کہ مرغباز مرغ لے کر آیا۔ اور اس نے بیان کرنا شروع کیا کہ حضور کے نمک کی قسم رن سور ایسا لڑا کہ طرف ثانی کے مرغ کا بالکل خون خرابا ہو گیا اور تمام پالی بھر میں حضور کی دھوم ہوگئی اور دو دو پانی ان پٹھوں کے بھی ہوگئے۔ شام تک اس مشغلہ میں مصروف رہے آٹھ بجے اور چانڈو کی کشتی سامنے لاکر رکھی گئی اور سب احباب جمع ہوئے اور شغل شروع ہوا معاً شروع ہونے کے داستان گو نے بیچارے امیر حمزہ صاحبقراں پر جھوٹ

کے پُل باندھنے شروع کئے اور عمرو عیار کی جھوٹی عیاریاں اور دروغ بے فروغ بیان کرنا شروع کیا اور وہ جھوٹ کہ جس کا زمین اور آسمان پر کہیں ٹھکانا نہیں - اگر کسی صاحب نے بعد کچھ دیر کے اٹھنے کا قصد کیا تو صاحب خانہ نے اسی وقت ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا میاں ابھی دس بھی نہیں بجے اور تم نے چلتا دھندا کیا میرے سر کی قسم دو چار چھینٹے تو اور پیو دیکھو تو آج مرزا نے کیا عمدہ قوام بنایا ہے جب بارہ بجے تو خدمتگار نے آکر کہا کہ رات دوپہر سے زیادہ آئی محل میں تشریف لے چلئے خاصہ ٹھنڈا ہوتا ہے ہنسکر کہنے لگے کہ آج تو کیا جلد بارہ بج گئے ہیں تو ابھی نشہ بھی نہیں ہوا خدا خدا کرکے کشتی سامنے سے اٹھی اور لڑکھڑاتے ہوئے محل میں داخل ہوئے دسترخوان بچھا خاصہ نوش کیا بعد فراغ ہاتھ منھ دھو کر پان کھاتے ہوئے پلنگ پر گئے "

(مراۃ الہند اگست ۱۸۷۱ء صفحہ ۲)

آیندہ جنوری ۳۴ء کا نگار

(تقریباً دو چند ضخامت کا)

مخصوص ہوگا صرف ایک موضوع کے لئے جس پر اُردو میں اس وقت تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا

یعنی

"لبوں کی داستان　　زبان قلم سے"

آپ کے " لب " ہر وقت متحرک رہتے ہیں اور سب سے زیادہ خدمت انھیں سے لی جاتی ہے، لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ جذبات کی دنیا میں، نفسیاتی حقائق میں، عالمِ شعر و تصوف میں " لب " کو کیا اہمیت حاصل ہے اور دنیا کی تاریخ میں کیسے کیسے انقلاب اسکی وجہ سے رونما ہوئے ہیں ——— جنوری ۳۴ء کا نگار ——— اس کی مفصل داستان آپ کو سنائیگا اور اس موضوع پر تحقیق و تدقیق کے وہ نقوش آپ کے سامنے پیش کرے گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے

علاوہ اس کے

ایک حصہ حضرت نیاز کے اُن " مختصراتِ ادب " کے لئے بھی وقف ہوگا - جنھیں " الہامات ادب " اور " معجزات انشا " کہنا زیادہ موزوں ہے

اگر

آپ نے نگار کی خریداری جاری رکھی تو یہ مجموعہ آپ کو مفت مل جائے گا - ورنہ یوں کسی قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہو سکتا ———

مینیجر نگار لکھنؤ

بابُ المراسلۃ والمناظرہ

(جناب منظر الحق صاحب ضوی چھپروی - کریم چک)

قدیم ہند کی زرخیز وادیوں میں ہندوؤں، بدھیوں، سکھوں اور کبیر پنتھیوں کا مذہب، فرعون مصر کے عہد میں موسےٰؑ اور موسائیوں کا مذہب شائستہ روم میں عیسائیوں کا مذہب، عرب کے جھلسانے والے صحرا میں مسلمانوں کا مذہب متمدن یورپ میں پاپائے روم، لوتھر اور میتھاڈسٹ کا مذہب، انگریزی ہند کے دور جدید کی فضا میں قادیانیوں اور لاہوریوں کا مذہب، علیگڈھ کے نیچریوں کا مذہب، جناب اتنے مذاہب ہیں جن کے نام نامی میں اپنی چھ برس کی عمر سے، جس کو آج چودہ برس پانچ مہینے چھ دن ہوئے، سنتا چلا آرہا ہوں۔ میرے مولوی صاحب مرحوم، خدا ان کو اپنے سایۂ رحمت میں رکھے اور ان کی خدمت کے لئے اچھی اچھی حوریں، جو صرف مسلمانوں کے لئے پیدا کی گئی ہیں عنایت فرمائے قرآن کریم کی اکثر آیتوں کو رٹایا کرتے تھے جنکے مختلف اجزا اب تک اوسی "پہاڑی طوطے" کی طرح برزبان ہیں — بیچارے نے مذہب کی اتنی گتھیوں کو بغیر سلجھائے میرے موم جیسے دماغ پر نقش کردیا۔ مگر کبھی بھی یہ نہ بتایا کہ مذہب کس بلا کا نام ہے۔ جب کبھی پوچھا بھی تو وہی "کوہ" کے معنی "پہاڑ"

بہت کوششوں اور کاوشوں کے بعد صرف اسقدر سمجھ سکا ہوں یا یوں کہئے کہ سمجھایا گیا ہوں کہ مذہب نام ہے "نور ایمان" "کانشنس" "حسن اعتقاد" اور "محاسن اخلاق" کا ایک ذریعہ ہے خدا کے پہچاننے اور کیرکٹر کے سدھارنے کا۔ مگر یہ تعریفیں بذات خود بے جوڑ، مشکوک اور بے ربط نظر آتی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ "شمع نیاز" کی بکھری ہوئی نہیں بلکہ سمٹی ہوئی شعاعیں "مذہب اور اس کے مقاصد" کو روشن و منور کرکے میرے سامنے پیش کریں گی

یہ جو اُجلی اور کالی ڈاڑھی والے علمائے دین یہ کہتے پھرتے ہیں کہ مصطفےٰ کمال پاشا نے، جو آج کل ترکوں کے رہبر اور ترکی جمہوریت کے صدر ہیں، خانقاہیں منہدم کرائیں، خدا پرست اور "زاہد فریب" ملاؤں کو قید کیا اون کے "سینۂ بے کینہ" میں ترکی شمشیر کی نوکیں چبھائی گئیں۔ اونھیں خاک و خون میں تڑپایا گیا۔ صرف اس لئے کہ مارشل کمال پاشا کی جمہوریت پسندی کو اگر کوئی قوم صدمہ پہونچا سکتی ہے تو وہ انھیں ملاؤں کی قوم ہے۔ اس واقعہ سے کس کو انکار ہو سکتا ہے ؟ مگر وہ جو رُو در رُو کہتے جاتے ہیں کہ کمال پاشا نے "ترکستان" میں اپنی

حکومت کی بنیاد ڈالنے کی غرض سے جمہوریت قائم کی، سابق سلطان کو تخت سے اُجاڑ پھینکا اور خود جلوہ افروز ہوئے اور اُس وقت سے اس وقت تک جس نے بھی ان کی مخالفت کی "تیغ و تبر" کا نشانہ بنا۔ بادی النظر میں تو ان حضرات کا یہ قول درست معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ کیا ترکستان میں ادن سے بڑا کوئی دوسرا ترک نہیں ہے جو یہ جمہوریت کے قیام سے آج تک متمکن تخت صدارت ہوتے چلے آرہے ہیں۔ افسوس آتا ہے ادن کی بے بصری اور تنگ خیالی پر۔ جمہوریت کی بنیادی اصولوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ بیشک ان کی ہستی ترکستان میں ایک بے مثال ہستی ہے، ان کا ثانی وہاں کوئی بھی نہیں

پھر مذہبی نقطۂ نگاہ سے بھی مارشل کمال ملاؤں کے فتویٰ کفر سے محروم نہیں ہے۔ انھوں نے خانقاہوں کی جاگیریں ضبط کر کے "اسٹیٹ" میں شامل کرلیں، عورتوں کو طبّی اور قانونی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت عطا فرمائی، اونھیں مختلف محکموں میں ملازمت دی، "ہندوستانی نما" اسلامی پردے کو توڑ پھینکنے کا مشورہ دیا۔ خود کوٹ، پینٹ اور ہیٹ پہننے لگے اور رعایا اون کی تقلید کرنے لگی۔ اور اس کے صلہ میں مذہبی پیشواؤں سے وہی انعام پایا

اس قدر لکھنے کے بعد میں اب آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ "قیام جمہوریت" سے مارشل کمال کا مقصد کیا ہے؟ جو کچھ اونھوں نے کیا اوس کے صلہ میں کیا ان کو کفر ہی کا سرٹیفکٹ ملنا چاہیے؟ میرا تو ذاتی خیال یہ ہے کہ خانقاہوں کو منہدم کرنے، پردہ کے قید و بند توڑ پھینکنے سے کوئی مسلمان، کافر یا مرتد نہیں ہوسکتا ہے، خواہ وہ مارشل مصطفےٰ کمال پاشا ہوں یا کوئی ضیاء الملک یا سر ہوں یا ہز ہائنس یا اس سے بھی بڑھ کر کوئی مولانا، عالم یا فاضل

ممکن ہے کہ ہمارے محترم علما کا قول کسی حد تک حق بجانب ہو اور آپ ہی کی طرح مصطفےٰ کمال کے دماغ میں بھی کوئی طوفان یا انقلاب برپا ہوگیا ہو

ایک مدت سے آپ کے ذہنی انقلابات کا بھی تماشہ دیکھتا آرہا ہوں، مگر یہ سمجھنے سے قاصر ہوں......

......کہ دنیا میں نیاز کا "مشن" کیا ہے؟ کون سے "ڈاکٹرین" اور کون سے "گاسپل" کی اشاعت میں وہ محو ہے؟ وہ اسرار جن میں آپ نے اپنے کو محصور کر رکھا ہے میری سمجھ سے باہر ہیں۔ کیا یہ طلسم ٹوٹ سکتا ہے اور آپ بے نقاب ہوکر اپنی صورت دکھا سکتے ہیں

میں اب تک آپ کے تمام مضامین کو آپ کی نیک نیتی پر محمول کرتا رہا ہوں مگر مجھے خوف ہے کہ آگے چل کر یہ نیک نیتی حسن بن صباح یا پیر کرم حسین ملائے شور بازار کی نیک نیتی ثابت نہ ہو اور مجھے حسرت و یاس کے ساتھ آپ کا منہ تکنا پڑے!

(نگار) سب سے پہلے تو معافی چاہوں گا اس غیر معمولی تاخیر کی جو آپ کے مراسلہ کی اشاعت میں میری طرف سے ظاہر

ہوئی، لیکن یاد رکھیئے کہ یہ تاخیر ارادی نہ تھی بلکہ بالکل غیر اختیاری تھی ـــ کیونکہ آپ کا مراسلہ کاغذات میں مخلوط ہوکر گم ہو گیا تھا۔ اور آج (۲۶ راگست کو) جبکہ میں حیدرآباد جانے کے لئے اپنے بکس سے غیر ضروری کاغذات نکالنے میں مصروف تھا، بالکل غیر متوقع طور پر نظر آگیا ـــ آپ کے مراسلہ کا اکثر حصہ مصطفےٰ کمال سے تعلق رکھتا ہے، اور اگر درمیان و اخیر کی چند سطریں لکھ کر آپ ہلکی سی مذہبی جستجو اور میری "پرسش حال" کی طرف متوجہ نہ ہو جاتے تو غالباً اسوقت میں اس پس وپیش میں مبتلا ہوتا کہ آپکے کس سوال کو زیادہ اہم سمجھکر سب سے پہلے اس کا جواب دوں۔ بہرحال اس ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو آپ نے مکتوب گرامی میں قائم کی ہے مجھے بھی سب سے پہلے یہی بتانا چاہئے کہ "مذہب اور اس کے مقاصد" کیا ہیں ـــ

آپ نے خود اپنی ذاتی کاوش و کوشش کے بعد مذہب کی جو حقیقت سمجھی ہے وہ بالکل صحیح ہے اور اگر آپ مجھ سے پوچھتے تو میں بھی وہی کہتا جو آپ کہہ رہے ہیں، البتہ فرق صرف اتنا ہوتا کہ میں بجائے متعدد الفاظ کے صرف وہی ایک لفظ کہتا جو آپ نے سب سے اخیر میں لکھا ہے۔ یعنی ـــ "محاسن اخلاق" ـــ کیونکہ مذہب کا بتایا ہوا "نور ایمان" ایک حکیم اخلاق کی وضع کی ہوئی اصطلاح "کالنفس یا ضمیر" اور ایک صوفی کا ارشاد "حسن اعتقاد" سب حقیقتاً اسی ایک چیز کے مختلف نام ہیں۔ جنکو زیادہ صاف، سلجھی ہوئی زبان میں "حسن اخلاق" کہتے ہیں ـــ ممکن ہے آپ کو بظاہر ان میں باہم کوئی ارتباط نظر نہ آتا ہو، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ نتیجہ کے لحاظ سے سب کا مدعا وہی ایک ہے رہا الفاظ میں تنوع سو انسانی ذہنیت کے تنوع کے لحاظ سے ہمیشہ اس کو ضروری سمجھا گیا اور سمجھا جائے گا

کیا لفظ "ایمان" سے آپ "امن وسکون" کے مفہوم کو علیحدہ کر دیں گے۔ جس سے یہ لفظ بنایا گیا ہو اور کیا امن وسکون بغیر حسن اخلاق کے ممکن ہے ـــ کیا آپ لفظ ضمیر کے مفہوم سے "احساس باطن" کو جدا کر دیں گے۔ اور کیا انسان کا یہ احساس بغیر حسن اخلاق کے مطمئن ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کیا آپ لفظ "اعتقاد" سے اُس راسخ عہد و پیماں کے مفہوم کو نظرانداز کر دیں گے۔ جو اس لفظ کے صحیح معنی پر دلالت کرتا ہے اور کیا صداقت کا عہد و پیماں، حسن اخلاق کا ضامن نہیں ـــ بہرحال مجھے تو ان تمام الفاظ میں باہم ربط ہی ربط نظر آتا ہے، حیران ہوں کہ آپ انھیں کیونکر "مشکوک و بے ربط" کہہ سکتے ہیں

ابتداءً جس مولوی نے آپ کو قرآن کریم کی آیتیں یاد کرائیں، وہ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا تھا ـــ بچوں کا دماغ معانی و مطالب سمجھنے پر قادر نہیں ہوتا ـــ اس لئے اگر وہ غریب اس کی کوشش بھی کرتا تو نتیجہ کیا ہوتا ـــ اب رہا یہ امر کہ اس نے اس کوشش میں اتنا وقت کیوں ضائع کیا، اس کا جواب شاید یہ ہو سکتا ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو آج غالباً آپ کے سامنے یہ سوال بھی پیدا نہ ہوتا کہ "مذہب کیا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہو سکتے ہیں" ـــ نفس مذہب کا احترام پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ کہ ابتدا ہی سے آپ کے ذہن میں اس کی عظمت کا خیال جاگزیں کیا جائے اور آپ بڑے ہوکر اسی کے حدود میں زندگی کے مقصد کی جستجو کریں۔ کیونکہ اس سے علیحدہ ہوکر ایک انسان بہ لحاظ علم خواہ کچھ بن جائے

لیکن اخلاق کے لحاظ سے وہ یقیناً انسان سے فروتر ہو جاتا ہے ـــــ یورپ کی موجودہ علمی ترقیوں کو دیکھئے اور انصاف کیجئے کہ اُن سے دنیا کا امن وسکون تباہ ہو رہا ہے یا قائم ہو رہا ہے

اس میں شک نہیں کہ عہد حاضر میں مذہب کی طرف سے عام بیزاری پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن اس کا سبب غالباً یہ نہیں کہ مذہب کا خیال فی نفسہٖ بُری چیز ہے، بلکہ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ مذہب کا حقیقی مفہوم محو ہو گیا ہے۔ اور جس چیز کو مذہب کہکر پیش کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً مذہب نہیں ہے، اگر مذہب نام صرف چند مخصوص ظاہری علامات کا ہے تو مذہب سے زیادہ لغو وبیکار چیز کوئی نہیں اور اگر اس سے مقصود حقیقتاً کوئی ذہنی انقلاب یا کوئی باطنی تاثر ہے تو اس کی افادیت سے انکار کے کیا معنی، لیکن بات یہ ہے کہ اس کے بتانے والے بہت ہیں اور اس کے سمجھانے والے مفقود ـــــ

دوسرا سبب یہ ہے کہ انسان ترقی علوم کے سلسلہ میں بہت کچھ آزادی پسند ہو گیا ہے۔ اور وہ مذہب کی پابندی کو اپنی توہین سمجھتا ہے، حالانکہ اس کو سمجھنا چاہیئے کہ آزادی کامل تو کبھی کسی کو حاصل ہو ہی نہیں سکتی، اگر وہ مذہب کا پابند نہ ہوگا، تو اپنے خیال کا پابند ہوگا، خدا کا محتاج نہ رہے گا تو مادہ و قوت کے سامنے سرِ عجز جھکائے گا، بہرحال (بقول اکبر) ع

بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

اگر اس وقت تک کی علمی ترقیاں کوئی ایک مثال بھی ہمارے سامنے ایسی پیش کر سکتیں۔ جسے دیکھ کر انسان کو آزادی کامل مل جانے کا یقین ہو سکتا تو ہم سمجھتے کہ واقعی مذہب بیکار چیز ہے، لیکن جب باوجود اسقدر ادعائے قدرت کے انسان کی بیچارگی اپنے حال پر قائم ہے تو ہم کیونکر مان لیں کہ ترکِ مذہب ہی کے بعد انسان کو آزادی مل سکتی ہے۔

درانحالیکہ بے دھڑک آزادی بھی دنیا میں کوئی اچھی چیز نہیں ـــــ مذہب و انسان کا باہمی تعلق بالکل پتنگ اور رشتہ کا سا تعلق ہے کہ جب تک وہ ڈور سے بندھی ہوئی ہے بلندی میں اُڑ رہی ہے، لیکن جہاں یہ تعلق چھوٹا اور وہ جھپ کھا کر کہیں نہ کہیں ضرور گری

میرے متعلق غلطی سے لوگوں نے یہ خیال قائم کر لیا ہے کہ میں مذہب کا دشمن ہوں ـــــ حالانکہ میں دشمن اگر کسی چیز کا ہوں تو صرف اس بات کا کہ مذہب کو عوائد و مراسم کا پابند بنایا جائے، اور اعمال و حرکات کی بناء پر ایک دوسرے کی مخالفت کی جائے

اگر کوئی شخص نماز کو بہترین طریقہ عبادت کا باور کرتا ہے تو اُسے کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ کلیسہ و مندر کے جانے والے کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائے، یا اگر ایک شخص ناقوس بجانے کو زیادہ پسند کرتا ہے تو اس کو اذان کی آواز سُنکر پریشان نہ ہونا چاہیئے

میں مولویوں کا دشمن بتایا جاتا ہوں۔ اور یقیناً ہوں، لیکن مولویوں سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی کے علماء

نہیں بلکہ تمام مذاہب کے وہ تمام پیشوا ہیں جو اپنے آپ کو تعلیمات مذہب کے تنہا علمبردار سمجھ کر دنیا میں تفریق ونفاق کا بیج بو رہے ہیں ——— میں جس طرح کبھی اس کو پسند نہیں کرتا کہ ایک مولوی ناقوس کی آواز سنکر "لاحول" پڑھے، اسی طرح میں اس کا بھی مخالف ہوں کہ ایک ہندو مسلمان کو صرف اس لئے ملکش قرار دے کہ وہ گائے کا گوشت کھانا جائز سمجھتا ہے ۔ کیونکہ اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ ایک کے نزدیک مذہب نام صرف اذان ونماز کا ہے اور دوسرے کے نزدیک گائے کے احترام کا، درانحالیکہ حقیقت ان دونوں سے بالکل علیحدہ ہے

میں دنیا کے لئے سب سے بڑی لعنت جس چیز کو قرار دیتا ہوں وہ "عصبیت" ہے، یعنی ایک کا دوسرے کو صرف اختلاف مذہب کی وجہ سے بُرا سمجھنا یا بُرا کہنا ——— کیونکہ مذہب اگر واقعی کوئی اچھی چیز ہے ۔ اور اس کا مقصد اخلاق انسانی کو درست کرنا ہے، تو پھر ہندو مسلمان کو، مسلمان ہندو کو، عیسائی یہودی کو، یہودی عیسائی کو کیوں بُرا جانے ——— کیا ہندوؤں کے مذہب میں پوجا کرنے اور ناقوس بجانے کا مقصود یہ نہیں ہے کہ ان کے اخلاق درست ہوں، کیا مسلمان کا روزہ ونماز کسی اور مدعا کے لئے ہے، کیا موسیٰ وعیسیٰ کی پیروی دو متضاد تعلیمات کی طرف رہبری کرنے والی ہے

پھر جب حقیقت ایک ہے اور اسی ایک حقیقت کی جستجو سب کا مقصود ہے تو مخالفت کیسی ؟ یقیناً یہ ایک معمہ ہے، لیکن ایسا پیچیدہ نہیں جسے سلجھایا نہ جاسکے اور اگر میں نے غلط نہیں سمجھا (اور یقیناً غلط نہیں سمجھا) تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ گتھی صرف علما، مذاہب کی غلط تعلیم، غلط تعبیر اور غلط پندار کی وجہ سے پڑی ہے اور اس کے سلجھانے کی صرف یہی تدبیر ہے کہ ان تمام غلطیوں کو بے نقاب کر دیا جائے اور مذہب کا وہ صحیح مفہوم لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے جس میں کسی کو اختلاف ہو ہی نہیں سکتا، اور وہ مفہوم صرف "اخوت عامہ" ہو سکتا ہے ——— رہا یہ امر کہ اس کی سب سے زیادہ صحیح وممکن العمل تعلیم کس مذہب میں پائی جاتی ہے، سو اس کا معلوم کر لینا بھی چنداں دشوار نہیں اگر ہر شخص عصبیت کو ترک کر کے اس پر غور کرے

مذاہب کی خونریزیاں تاریخ عالم میں بہت بدنام ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان خونریزیوں کا سبب مذہبی تعلیم تھی یا اہل مذاہب کا غلط پندار۔ کس مذہب نے بتایا ہے کہ صرف مذہب کی اشاعت کے لئے جنگ کی جائے اور وہ کون سی مذہبی جنگ ایسی ہوئی ہے جس میں سلطنت وحکومت کی طمع اندرونی طور پر کام نہیں کر رہی تھی اور وہ کونسی ملوکانہ جنگ تھی جس میں مذہب کی آڑ پکڑ کر مذہب کو بدنام نہیں کیا گیا ——— مذہب کا کام امن وسکون پیدا کرنا ہے ۔ اور اگر کوئی مذہب ایسا ہے جو خونریزی وخون آشامی کی تعلیم دیتا ہے تو وہ ایک لعنت ہے جس سے نوع انسانی جس قدر جلد آزاد ہو جائے بہتر ہے

مصطفیٰ کمال پاشا کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی ایک حد تک محل نظر ہیں ۔ ترکی کی موجودہ

ترقی بالکل مغربی اصول پر قائم ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ جوحشر مغربی تہذیب وترقی کا ہونے والا ہے، وہی ترکی کی ترقی کا نہو
جس حد تک "مولویوں" کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ مصطفےٰ کمال نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہئے تھا، کیونکہ
انھیں کے وجود نے ترکی کو قعرِ مذلت میں گرا یا تھا۔ اور سب سے پہلے انھیں کو فنا کرنا چاہئے تھا۔ لیکن مولویوں کے انہدام
کے یہ معنی تو نہیں کہ سرے سے مذہب ہی کے خیال کو ترک کر دیا جائے ——— جس طرح مولوی نام مذہب کا نہیں اسی طرح مذہب
نام اُس آزادی کا بھی نہیں جو اصولِ اخلاق کو پس پشت ڈال دینے والی ہے

مجھے نہیں معلوم کہ واقعتاً ترکی کی کیا حالت ہے اور مصطفےٰ کمال کی تنظیم جدید نے کیا انقلاب وہاں پیدا کر دیا ہے لیکن
اخبار وجرائد سے جتنا معلوم ہوا ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ترکی نے جس قوم کی تاریخ کو اپنے سامنے رکھ کر اپنی ترقی
کی راہیں متعین کی ہیں، اس کا تتبع بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے تھا ——— اس میں شک نہیں کہ وضع ولباس کی تبدیلی
زیادہ اہم بات نہیں، عورتوں کو بے پردہ کر دینا بھی چنداں لائق اعتنا نہیں، لیکن اگر ان تمام باتوں کو واقعی ضروری مصلحت وحکمت
کے لحاظ سے اختیار کیا گیا ہے، تو خیر، اور اگر محض تقلید وتتبع ہے۔ یوروپ کی قومیں اس کو نہ صرف مضرت رساں سمجھتا
ہوں بلکہ قومی غیرت وخودداری کے بھی منافی خیال کرتا ہوں

بہرحال ترکی کے متعلق یہاں بیٹھ کر کوئی حکم لگانا دشوار ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کے حالات کا اقتضا کیا ہے
اور انتظار کیجئے، ممکن ہے واقعات وحالات کچھ ایسے رونما ہوں کہ زیادہ اعتماد کے ساتھ رائے زنی کی جا سکے

البتہ جس حد تک تہذیب معاشرت کا تعلق ہے، میں ترکوں کو تقلید یوروپ پر بالکل معذور سمجھتا ہوں، کیونکہ اسی
سرزمین میں انھوں نے پرورش پائی ہے اور وہیں کی آب وہوا میں انھیں زندگی بسر کرنا ہے۔ علاوہ اس کے یوں بھی مسلمانوں
کا قومی کلچر ہمیشہ سے عیسائیوں کے ماتحت رہا ہے اور مسلمان جب ترقی کرے گا تو تہذیب وعوائد میں وہ ہمیشہ مغرب کی طرف مائل
ہوگا۔ گو میں اس کو عمومی طور پر ان کے لئے مفید نہیں سمجھتا

ایک قوم کے کلچر پر ہمیشہ ماحول کا اثر غالب ہوا کرتا ہے اور ماحول کے تغیر سے کلچر میں بھی تبدیلی پیدا ہو جانا چاہئے
اس لئے اگر ترکی کا مسلمان اپنی تہذیب ومعاشرت میں یوروپ کا تتبع کرتا ہے تو اُسے کرنا چاہئے، لیکن افسوس تو ہندوستان
کے مسلمانوں پر ہے جو باوجود یوروپ سے اس قدر دور ہونے کے اس کی تہذیب پر مٹ رہے ہیں۔ اور ہندوؤں کے
کلچر سے اپنے آپ کو بالکل علیحدہ سمجھتے ہیں، درانحالیکہ وہ خود بھی اپنے مرز وبوم کے لحاظ سے ہندو ہیں اور غالباً کسی
وقت مذہب کے لحاظ سے بھی ہندو رہے ہوں گے

آپ کو میری طرف سے اندیشہ ہے کہ کہیں آگے چل کر میں حسن بن صبّاح، یا ملائے شور بازار نہ بنجاؤں، کاش آپ نے
نپولین دہنی بال کا نام لیا ہوتا، سکندر ودارا کا ذکر کیا ہوتا کہ میرے عزم وحوصلہ کی کچھ تو رعایت مقصود ہوتی

ہیں۔ کیونکہ خدا نے اسی کے ذریعہ سے زمین کو تھام رکھا ہے ——

طبری کا بیان ہے کہ اگر کوہ قاف زمین کو تھامے نہ ہوتا تو زمین ہر وقت لرزش میں رہتی اور کوئی شخص اس پر سکونت نہ کر سکتا۔ قزوینی کا بیان ہے کہ زمین پہلے ہر وقت ہلتی ڈلتی رہتی تھی۔ اس لئے خدا نے ایک فرشتہ پیدا کیا جس نے اوسے اپنے شانہ پر رکھ کر مضبوطی سے پکڑ لیا[1]۔ یہ فرشتہ ایک مربع قطعہ یاقوت زعفرانی پر کھڑا ہے جسے ایک بڑا بیل سینگوں پر سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ بیل ایک مچھلی کی پشت پر قائم ہے جو پانی میں تیرتی رہتی ہے

ابن الوردی کا بیان بھی قریب قریب یہی ہے سوائے اس کے کہ وہ اس میں اتنا اضافہ اور کرتا ہے کہ کوہ قاف اسی قطعۂ یاقوت زعفرانی سے پیدا ہوا ہے

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ قاف دنیا کے تمام پہاڑوں کی بیخ و بُن ہے اور سب پہاڑ اندر ہی اندر آکر اس سے مل گئے ہیں۔ جب خدا کسی قطعۂ زمین کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اندرونی سلسلۂ کوہ کو جنبش میں لے آتا ہے جس سے زلزلہ پیدا ہو کر لوگ مر جاتے ہیں۔ بعض نے زلزلہ کی حقیقت یہ بیان کی ہے کہ بیل جو زمین کو سنبھالے ہوئے ہے کبھی کبھی کانپ اٹھتا ہے اور اس کی کپکپی سے زمین بھی تھرا اٹھتی ہے

کوہ قاف زمین کی انتہائی حد ہے اور کسی کو معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہے۔ لیکن ابن الوردی کا بیان ہے کہ ماورا، قاف دوسرا عالم شروع ہو جاتا ہے اوس کی زمین چاندی کی ہے۔ اور فرشتے یہاں قیام رکھتے ہیں، ایک حدیث نبوی کی بنا پر یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ماورا قاف اور بہت سی زمینیں ہیں۔ ایک زمین سونے کی ہے، ستر زمینیں چاندی کی ہیں، سات مشک کی ہیں اور ہر زمین دس ہزار دن کی مسافت کی ہے جہاں فرشتے ہی فرشتے رہتے ہیں

آپ نے کرۂ ارض کی حقیقت، کوہ قاف کی اصلیت، اور زلزلہ کی ماہیت سُن لی جسے ہمارے یہاں کے مؤرخین و محققین بیان کرتے ہیں اور جس کے ثبوت میں قرآن کی آیات اور احادیث نبوی پیش کی جاتی ہیں۔ اچھا اب غور کیجئے کہ اس سے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے :-

(۱) ہر وہ شخص جو مسلمان ہو، یا مسلمان رہنا چاہے اسکے لئے ضروری ہے کہ ان باتوں پر ایمان لائے۔ کیونکہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اکابر اسلام کی تحقیق ہے اور تحقیق بھی وہ جس کی بنیاد قرآن و احادیث پر قائم ہے —— ان باتوں سے انکار کرنا گویا قرآن و حدیث سے انکار کرنا ہے۔ اور قرآن و حدیث کا منکر کافر ہے

(۲) اگر آج کوئی شخص کہے کہ یہ تمام روائتیں بالکل لغو و مہمل ہیں، نہ قرآن سے ان کا ثبوت مل سکتا ہے نہ احادیث سے تو فوراً یہ جواب دیا جاتا ہے کہ کیا ہمارے یہاں کے اکابر جو سب سے بہتر نقاد قرآن و حدیث کے تھے تمھارے برابر بھی

[1] قدیم یونانیوں کی یہاں بھی اس قسم کی روایت پائی جاتی ہے کہ اٹلس دیوتا زمین اپنے شانہ پر لئے ہوئے ہے

عقل نہ رکھتے تھے۔ اور کیا انھوں نے بغیر غور و تحقیق کے یونہی اسی قسم کی احادیث کو صحیح باور کر لیا تھا

(۳) ایک شخص کے سامنے جب اسلام پیش کیا جاتا ہے تو معہ اُن تمام روایات کے پیش کیا جاتا ہے جو اس میں پائی جاتی ہیں۔ اور یہ کہکر کہ اب مزید تحقیق و کاوش کی ضرورت نہیں کیونکہ اسلام اور اسلامی لٹریچر کے سمجھنے والے اب موجود نہیں ہیں اور ہم کو آنکھ بند کرکے ان کی تحقیق پر عمل کرنا چاہئے

(۴) مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی مذہبی روایات میں دیگر مذاہب کے خرافیات (میتھالوجی) نہیں پائے جاتے، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا علم الاصنام کسی اور چیز کا نام ہے، کیا خرافیات، ان روایتوں سے علیحدہ کوئی اور چیز ہو سکتی ہے، اور کیا مسلمانوں میں جو اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں وہ واقعی دوسرے مذاہب کی خرافیات سے استعارہ نہیں کی گئی ہیں ؟

آئیے ایک اسی کوہِ قاف کی روایات پر غور کیجئے کہ ان کا اصل ماخذ کیا ہے :-

قدیم ایران کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوہِ البرز، جسے قدیم پہلوی زبان میں ہرا برزائتی (یعنی اونچا پہاڑ) کہتے تھے، بالکل اسی قسم کے روایات اپنے سے متعلق رکھتا تھا۔ اور قدیم یونانیوں کے کوہ اولمپس کی طرح اُسے بھی خداؤں یا دیوتاؤں کا مسکن بتایا جاتا تھا۔

اس پہاڑ کے متعلق اوستا لٹریچر میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ زمین کے تمام پہاڑوں کی بنیاد ہے جو زمین کے اندر ہی اندر اس سے نکل کر پھیل گئے ہیں۔ اسی پہاڑ میں ایک جھیل وروکشا بھی پائی جاتی ہے اس پہاڑ کا دوسرا نام قاف بھی ہے۔ صاحب معجم البلدان نے بھی لکھا ہے کہ قاف کو پہلے البرز کہتے تھے ہندوؤں کے پُران میں بھی ایک ایسے ہی پہاڑ کا ذکر موجود ہے۔ جس کا نام لوکا لوک ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ پہاڑ اس دنیا کو اُس دنیا سے علیحدہ کرتا ہے اور اس کے دوسری طرف سوائے تاریکی کے کچھ نہیں ہے ــــــــ جینی مذہب والوں کی روایات میں بھی ایک پہاڑ مانوسوتر ایسا پایا جاتا ہے جو انسانی آبادی کی آخری حد سمجھا جاتا ہے

منڈائی قوم میں بھی ایک روایت پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کو چپٹا سمجھتے تھے اور تین طرف پانی سے گھرا ہوا باور کرتے تھے، شمال کی طرف وہ ایک ایسے پہاڑ کا وجود مانتے تھے جو زمرد کا بنا ہوا تھا اور جس کے انعکاس سے آسمان نیلگوں نظر آتا تھا

الغرض تمام مشرقی قوموں میں شمال کی طرف ایک پہاڑ کا پایا جانا باور کیا جاتا تھا اور غالباً یہ خیال اہل بابل سے لیا گیا تھا۔ قدیم عبرانیوں میں بھی قریب قریب اسی قسم کی روائتیں رائج تھیں جیسا کہ توریت کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے ــــ

متذکرۂ بالا بیان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ کوہ قاف وہی ہے جسے ایرانی البرز کہتے تھے اور جو روایات اس کے

متعلق ان کے یہاں پائی جاتی تھیں وہ مسلمانوں نے بھی اختیار کرلیں ۔ اور متعدد حدیثیں رسول اللہ سے ایسی منسوب کردیں جن سے ان روایتوں کی تصدیق ہوتی ہے ۔ لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ اور مذاہب کی تو تمام روایات خرافیات میں شامل کی جائیں گی ۔ لیکن اپنی روایات کو بالکل صحیح بتایا جائے گا ۔ کیونکہ رسول اللہ نے ایسا بیان کیا ہے ۔ پھر اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو بہ حیثیت مسلمان ہونے کے کوہ قاف کو انھیں خصوصیات کے ساتھ تسلیم کیا جائے جو احادیث میں پائی جاتی ہیں یا ان سے انکار کرکے کافر و مرتد بننا گوارا کیا جائے

اب رہا یہ امر کہ لفظ ق جو قرآن پاک میں آیا ہے اور جس کے سمجھانے کے لئے یہ تمام روایتیں گھڑی گئی ہیں کیا مفہوم رکھتا ہے ، غالباً ہمارے موضوع سے علیحدہ اور اس کے سمجھنے کے لئے یہ لازم نہیں کہ ایک شخص ان تمام روایتوں پر ایمان لے آئے　　　(باقی)

غالب کی شوخیاں اور شوخ نگاریاں

دنیا میں مشہور ہیں ، لیکن اگر کوئی آپ سے کہے کہ اس کے حالاتِ زندگی ، اس کے کلام نظم و نثر ، اس کی تصانیف اُردو و فارسی سے یکجا کرکے سب کی سب کتابی صورت میں پیش کیجئے تو آپ کے لئے اس کا صرف ایک جواب ہوگا اور وہ یہ کہ

رسالۂ نگار بابت ماہ جنوری ۳۲ء

اُٹھا کر جس کے ۱۶۰ صفحات اسی موضوع کے لئے وقف ہیں اور پورا استقصا کرکے ان کو یکجا کردیا گیا ہے

پھر اگر یہ رسالہ آپ کے پاس نہیں ہے یا گم ہوگیا ہے ، یا آپ کے کسی اور دوست کو ضرورت ہے یا آپ اس کے بعد سے نگار کے خریدار ہوئے ہیں تو ۱۲ر کے ٹکٹ بھیجکر طلب فرمالیجئے ۔ صرف چند کاپیاں باقی رہ گئی ہیں ۔ غالب کی سہ رنگی تصویر عالم شباب کی بھی اس میں شامل ہے

مینیجر نگار ۔ لکھنؤ

باب الاستفسار

مثنوی

(جناب سید افضل حسین صاحب - کٹک)

میں ایک کتاب فن شعر پر لکھ رہا ہوں اور اس سلسلہ میں مثنوی کے متعلق مجھے معلومات
کی ضرورت ہے - اگر نامناسب نہ ہو تو مطلع فرمائیے کہ فارسی زبان میں مثنوی کا کب رواج ہوا

(نگار) آپ کا استفسار بہت اہم ہے اور اسی قدر دلچسپ بھی، لیکن افسوس ہے کہ کافی شرح و بسط کے ساتھ جواب دینے کے لئے میں اس وقت آمادہ نہیں - مختصراً عرض کرتا ہوں :-

مثنوی، فن شعر کے لحاظ سے، جو چیز ہے وہ غالباً آپ سے بھی مخفی نہ ہوگی - یعنی ہر بیت کا علیحدہ علیحدہ ایک مستقل مضمون کو مساوی ہونا اور ہر بیت یا شعر کے دونوں مصرعوں کا متوازن قافیہ رکھنا

اردو، فارسی اور ترکی میں تمام وہ طویل نظمیں جن میں کوئی واقعہ یا داستان (رزم کی ہو یا بزم کی وہ مذہبی ہوں یا اخلاقی) بیان کی جاتی ہے اسی خصوصیت کی حامل ہوتی ہیں اور ان کو مثنوی کہتے ہیں، جس کی ابتدا غالباً ایران سے ہوئی ہے

تذکرہ " دولت شاہی " کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عضد الدولہ دیلمی کے زمانہ تک (جس کا ۳۷۲ھ میں انتقال ہوا) قصر شیریں پر ایک بیت، قدیم پہلوی زبان میں منقوش پایا جاتا تھا جس کے دونوں مصرعے برابر کے قافیہ رکھتے تھے - اور سوائے اس شعر کے قبل اسلام کی ایرانی شاعری سے کوئی نمونہ مثنوی کا نہیں پایا جاتا

البتہ عہد اسلام کی ایرانی شاعری میں متعدد مثالیں مثنوی کی نظر آتی ہیں، جن میں سب سے زیادہ قدیم " ابوشکور بلخی " کی مثنوی ہے، اور اسی لئے اس کو مثنوی کا موجد کہتے ہیں - اس کے بعد رودکی کا نام لیا جاتا ہے - جو ابوشکور بلخی کے اخیر عہد کا ہمعصر شاعر تھا - اور اس نے بھی جب کلیلہ دمنہ کا ترجمہ فارسی میں کیا تو مثنوی کا وہی انداز اختیار کیا - جو

ابوشکور بلخی نے اختیار کیا تھا۔ لیکن سب سے پہلی مثنوی جو مکمل صورت میں سامنے آئی، "شاہ نامہ" ہے جسے دقیقی نے شروع کیا اور فردوسی نے انجام تک پہونچایا۔ اس کے بعد اسی فردوسی کی یوسف و زلیخا ہے جو اسی بحر متقارب میں لکھی گئی

فردوسی کے ہمعصر عنصری سے بھی ایک مثنوی (وامق و عذرا) منسوب کی جاتی ہے جو اب دستیاب نہیں ہوتی کہا جاتا ہے کہ لامعی نے ترکی زبان میں اسکا ترجمہ کیا تھا اور اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کا پلاٹ کیا تھا :-

وامق کسی آتشکدہ کا مُغ تھا اور عذرا ایک نوجوان لڑکی تھی جس نے اس آتشکدہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ ان دونوں میں محبت ہوگئی، لیکن چونکہ یہ محبت مذہباً ممنوع تھی اس لئے دونوں جدا کردیے گئے، عذرا شمال کی برفیلی سرزمین کی طرف جلاوطن کردی گئی، اور وامق کو اتھوپیا کی گرم آب و ہوا میں بھیجدیا گیا، آخر کار یہ دونوں گھل گھل کر مر گئے اور مرنے کے بعد عذرا کی روح نے ستارہ سنبلہ کی صورت اختیار کرلی اور وامق کی روح نے "سماک رامح" کی"

قصہ کی نوعیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خالص ایرانی دماغ کی پیداوار ہے لیکن عربی نام وامق و عذرا بعد کے ترجموں میں بڑھا دیے گئے ـــــ اُن مثنویوں میں جو ہم تک پہونچی ہیں سب سے مقدم ناصر خسرو کی دو اخلاقی مثنویاں ہیں۔ روشنائی نامہ اور سعادت نامہ جو بحر ہزج میں لکھی گئی ہیں۔ ان کے بعد ویس و رامین ہے جسے عوفی نے فخر الدین گورگانی سے منسوب کیا ہے کہا جاتا ہے کہ گورگانی نے پہلوی زبان کے کسی قصہ سے اس کو لیا تھا

ویس، مرو کے بادشاہ، موبد کی لڑکی تھی جو اپنے دیور، رام یا رامین پر عاشق ہوگئی تھی، اول اول تو رامین نے پرواہ نہ کی لیکن جب اس کا بھائی قتل ہوگیا تو اس نے شادی کرلی

اگر یہ مثنوی واقعی گورگانی کی لکھی ہوئی ہے تو ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ یہ گویا پہلی عشقیہ مثنوی تھی جو بحر متقارب میں لکھی گئی، ورنہ اس سے قبل کی تمام مثنویاں رزمیہ تھیں اور بحر ہزج میں لکھی گئی تھیں

عشقیہ مثنوی کا خلاق صحیح معنی میں نظامی گنجوی ہوا ہے۔ ہر چند نظامی نے بھی اوّل اوّل اپنی تصنیف "مخزن اسرار" میں صرف مذہبی و اخلاقی نصایح کو حکایات و قصص کی صورت میں بیان کیا، لیکن بعد کو پنج گنج کی بعض مثنویاں بالکل عشقیہ تھیں۔ پنج گنج کی ایک مثنوی خسرو شیریں ہے، جس میں خسرو پرویز ساسانی بادشاہ کی محبت ایک عیسائی شاہزادی شیریں سے دکھائی گئی ہے

شیریں کو ایک شخص فرہاد اور بھی چاہتا تھا جو اس وقت کا زبردست انجنیر یا معمار تھا، لیکن اس کی محبت ناکام رہی اور نامرادانہ زندگی بسر کرتے ہوئے اس نے اپنی جان دیدی ــــــ

دوسری مثنوی لیلیٰ مجنوں ہے، تیسری ہفت پیکر جس میں بہرام گور ہیرو قرار دیا گیا ہے۔ اس مثنوی میں سات کہانیاں بہرام گور کی سات محبوب بیویوں کی زبانی بیان کی گئی ہیں۔ چوتھی مثنوی یوسف زلیخا ہے اور پانچویں سکندر نامہ

سکندر نامہ رزمیہ داستان ہے سکندر کے کارناموں کی اور یوسف زلیخا میں تقریباً وہی کہانی درج ہے جو فردوسی کی یوسف زلیخا میں پائی جاتی ہے

نظامی نے ان پانچوں مثنویوں کی ابتدا فردوسی کی طرح کی ہے کہ پہلے حمد و نعت پھر منقبت اور اس کے بعد شاہ وقت کی تعریف —— نظامی نے معراج کے واقعہ کو البتہ بڑھا دیا ہے

نظامی کا اتباع فارسی میں جامی نے کیا ترکمانی زبان میں شیخی و فضولی نے ترکی میں میر علی شیر نوائی نے اور اُردو میں امین و تجلی نے۔ چنانچہ شیخی و فضولی کی خسرو شیریں و لیلیٰ مجنوں۔ علی شیر نوائی کا خمسہ، امین کی یوسف زلیخا اور تجلی کی لیلیٰ مجنوں سب اسی تقلید و اتباع کا نتیجہ تھیں

فارسی زبان میں مثنوی جلال الدین رومی اپنی نوعیت کے لحاظ بالکل اکیلی مثنوی ہے جس کی نظیر نہ اُس سے قبل کبھی پائی گئی نہ بعد کو۔ تصوف اور مابعد الطبیعیات کے مسایل کو لطیف حکایات اور قصص و تمثیل کے ذریعہ سے جس طرح انھوں نے سمجھایا وہ انھیں کا حصہ تھا

عربی لٹریچر میں مثنوی کی قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ ہر چند ابیات تو پائے جاتے ہیں یعنے ایسے مکمل شعر تو ضرور نظر آتے ہیں جن کے دونوں مصرعے متوازن قافیے رکھتے ہیں اور جنھیں اگلے شعر سے کوئی تعلق نہیں، لیکن مثنوی کی تعریف میں نہیں آتے

ثعالبی نے یتیمۃ الدہر میں فارسی کے کچھ ترجمے مثنوی کی مثال میں بیشک پیش کئے ہیں۔ بعض طویل نظمیں حریری اور محمد بن مالک کی بھی ہیں لیکن ان کا تعلق قواعد زبان سے ہے اور قصہ و حکایت سے کوئی واسطہ نہیں جو مثنوی کا جزو لازم سمجھا جاتا ہے —— مثنوی زیادہ تر بحر متقارب اور بحر ہزج میں اساتذۂ قدیم نے لکھی ہیں، لیکن نظامی نے مخزن الاسرار میں بحر سریع استعمال کی ہے اور ہفت پیکر میں بحر خفیف۔ جلال الدین رومی اور فرید الدین عطار نے بحر رمل سے کام لیا ہے.

نماز میں قرآن مجید کا ترجمہ

(جناب سید محمد ذکی صاحب راولپنڈی)

مصطفےٰ کمال پاشا نے جو نماز میں قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے اور آپ کے نزدیک یہ طریقہ مفید ہے یا نہیں؟

(**نگار**) آپ نے اس استفسار کے ذریعہ سے مجھے ایک ایسے مسئلہ پر اظہارِ خیال کی دعوت دی ہے جو حد درجہ نازک و

اہم ہے، اور جس پر گفتگو کرنے کے لئے نہ صرف مذہبی بلکہ بعض اجتماعی و عمرانی، سیاسی و اخلاقی مسائل کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے

نماز میں اصل قرآنی الفاظ کے بجائے ان کا ترجمہ پڑھنے کا خیال نیا نہیں ہے، بلکہ اب سے بہت قبل جب اسلامی سلطنت حدود عرب سے گزر کر سرزمین عجم تک پہونچ گئی تھی، اور عربی زبان نہ سمجھ سکنے والے لوگ جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہورہے تھے، یہ سوال زیر بحث آیا تھا اور باوجود اس کے کہ بعض فقہا، نماز میں کلام مجید کا ترجمہ پڑھنے کے موید تھے، لیکن آخرکار فیصلہ یہی ہوا کہ اصل قرآنی الفاظ کا پڑھنا ضروری ہے خواہ ان کا مفہوم سمجھ میں آئے یا نہ آئے

ایک بار سرسید مرحوم سے بھی کسی شخص نے سوال کیا کہ "اگر بجائے سورۂ فاتحہ کے اس کا ترجمہ اردو میں پڑھ لیا جائے تو کیا آپ کے نزدیک اس میں کوئی نقصان ہے" سرسید نے جواب میں ان کو لکھا کہ نقصان تو کچھ نہیں ہے مگر نماز نہ ہوگی"

اس میں شک نہیں کہ بظاہر یہ امر نہایت عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے کہ عبادت میں ایک شخص اُن الفاظ کے ادا کرنے پر مجبور کیا جائے جن کے مفہوم سے وہ قطعی ناواقف ہے، لیکن آئیے اس سے گزر کر اور ذرا غایر مطالعہ سے کام لیں ممکن ہے بعض مفید باتیں معلوم ہوں

سب سے پہلے اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ عبادت کس چیز کا نام ہے اور اس کی غایت کیا ہو سکتی ہے۔ غالباً اس سے آپ کو کیا کسی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ عبادت سے مراد صرف اپنے اوپر کیفیت عبودیت کا طاری کرنا ہے اور اس کی غایت یہ ہے کہ نوع انسان کے اندر باہمی لطف و محبت، رافت و الفت، ہمدردی و رواداری کا جذبہ پرورش پائے اور وہ ایک پُرامن شہری ہونے کی حیثیت سے نظام تمدن میں ایک عضو مفید کی حیثیت اختیار کرے۔ جب یہ امر متحقق ہو چکا تو آئیے غور کریں کہ عبادت سے یہ مقصد کیونکر تکمیل کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے تکمیل سے صرف کیفیت عبودیت ہی کی تکمیل نہیں بلکہ افراد کی کثرت بھی مُراد ہے یعنی "کیف وکم" دونوں حیثیت سے ہمکو اس پر غور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ کوئی مذہب "کیفیت" کے لحاظ سے کامیاب ہوا اور "کمیت" کے لحاظ سے ناکام رہا تو دنیائے عمل و کارگاہِ تمدن میں وہ ہمارے لئے بیکار چیز ثابت ہوگا ——— بہرحال میرے نزدیک مذہب یا عبادت کا حقیقی نصب العین یہی ہونا چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ افراد کو متاثر کرے، بلکہ نوع انسانی کے تمام افراد کو وہ ایک مرکز پر لاکر جمع کر دے

یہاں تک تو عبادت کے مفہوم اور اس کی غایت کا ذکر ہوا جس سے غالباً آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ اب آئیے اسی کے ساتھ تھوڑا سا نفسیاتی مطالعہ بھی کر لیں کیونکہ بغیر اس کے ہم تکمیل مقصود کی راہ متعین نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت غالباً آپ سے بھی مخفی نہ ہوگی کہ اجتماعیت کا سب سے بڑا راز، افراد میں کسی غرض مشترک کا پیدا کرنا اور امیال و عواطف کو کسی ایک مرکز سے وابستہ کر دینا ہے۔ یعنی جب تک ہم افراد کو کسی ایک خیال کی طرف مایل نہ کر دیں "اجتماعیت" کا حصول ممکن نہیں۔ لیکن جس طرح اس کے لئے افراد کا "ہم خیال" ہونا ضروری ہے بالکل اسی طرح "ہم خیال"

رہنے کے لئے "حرکات و افعال" کی ہم آہنگی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اگر افراد خیال کے لحاظ سے تو باہم گر متفق ہوں۔ اور افعال ان کے مختلف ہوں تو "اجتماعیت" کا پیدا ہونا ممکن نہیں

پھر اگر عبادت میں کوئی صورت ہم آہنگی کی نہ پیدا کی جاتی تو ظاہر ہے کہ اسلام میں وہ "اجتماعیت" نہ پیدا ہوسکتی جو اس کا تنہا مقصود تھا۔ اور اسی ہم آہنگی قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کسی ایک ہی زبان میں اس کو ادا بھی کیا جائے خواہ پڑھنے والا اس کو سمجھ سکتا ہو یا نہ سمجھ سکتا ہو

اگر اس امر کی اجازت دیدی جائے کہ ہر شخص کلام مجید کا ترجمہ نماز میں پڑھ سکتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے اس مرکز کو جو اصل الفاظ قرآنی کے احترام سے متعلق ہے اور جو ذریعہ ہے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک رشتہ سے وابستہ کردینے کا، ضعیف و کمزور کردیا

ساری دنیا کو چھوڑئے، ایک ہندوستان ہی کو لے لیجئے کہ اس اجازت کے بعد صورت کیا پیدا ہوگی۔ میں اُردو میں عبادت کروں گا، آپ پنجابی میں، بنگال کا رہنے والا اسے بنگلہ زبان میں ادا کریگا تو گجرات کا باشندہ گجراتی میں، الغرض ایک عجیب قسم کا انتشار و افتراق پیدا ہوجائیگا جو اجتماعیت کے لئے سخت مضرت رساں ہے۔ پھر اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ عبادت کے لحاظ سے مسلمانوں کی اجتماعیت درہم برہم ہوجائے گی بلکہ ملّی و قومی حیثیت سے اس کو سخت نقصان پہونچے گا، کیونکہ اس طرح رفتہ رفتہ قرآن کی اہمیت بالکل محو ہوجائے گی۔ اور ہمارا مرکز اصلی جس پر اس وقت بھی تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے، نگاہوں سے اوجھل ہوجائے گا

اس وقت تو یہ حالت ہے کہ اگر میں دنیا کے کسی گوشہ میں پہونچ جاؤں اور وہاں کسی جگہ کھڑا ہوکر قرآن مجید کی کوئی آیت بہ آواز بلند پڑھنے لگوں تو وہاں کے تمام مسلمانوں کو معلوم ہوجائے گا کہ میں انھیں میں سے ایک ہوں اور وہ میری ہمدردی کے لئے آمادہ ہوجائیں گے، لیکن جب رفتہ رفتہ کلام مجید کے اصل الفاظ کی اہمیت کم ہوتے ہوتے وہ ہماری زبانوں سے ادا نہ ہوسکے گا یا ہمارے حافظے سے معدوم ہوجائے گا تو ظاہر ہے کہ ہم اسلام کی "عالمگیر" خصوصیت کو کھو بیٹھیں گے اور وہ تمام بنی نوع انسانی کو ایک رشتہ سے منسلک کرنے کی اہلیت کو کھو بیٹھے گا

فرض کیجئے کہ اس وقت کسی جگہ مختلف مقامات کے مسلمانوں کا اجتماع ہے، یعنی کچھ لوگ ہندوستان کے ہیں، کچھ چین کے، کچھ ایران کے ہیں اور کچھ ترکستان کے۔ نماز کا وقت آتا ہے اور سب مل کر ایک امام کے پیچھے نماز ادا کرتے ہیں جو اصل الفاظ قرآنی میں قرأت کرتا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ امام و مقتدی میں سے کوئی کسی لفظ کا مفہوم نہیں سمجھتا، لیکن کیا باوجود اس عدم علم و فہم کے آپ کہہ سکتے ہیں کہ "اجتماعیت" کا مقصود پورا نہیں ہوا؟ یقیناً ہوا کیونکہ کوئی مفہوم سمجھے یا نہ سمجھے لیکن یہ ہر شخص جانتا ہے کہ امام جو کچھ پڑھ رہا ہے وہ اصل الفاظ الہام ہیں اور ان کا احترام ہر مسلمان پر واجب ہے۔ برخلاف اس کے دوسری صورت فرض کیجئے کہ امام چینی زبان میں قرأت کرتا ہے جس کو مقتدیوں میں سے کوئی نہیں سمجھتا، پھر ظاہر ہے کہ

نہ زبان کے لحاظ سے انھیں کوئی دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے، نہ اس کے الہامی ہونے کی حیثیت سے کوئی کیفیت یکسوئی یا خشوع وخضوع کی اپنے اوپر طاری کر سکتے ہیں

الفاظِ قرآنی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، لیکن چونکہ اُن کے منجانب اللہ ہونے یا کم ازکم منطوقات نبوی ہونے پر سب کا اجماع ہے اس لئے اس اعتقاد وخیال کے ماتحت جو اثر بلا استثنا سب پر ہو سکتا ہے وہ کبھی ترجمہ سے پورا نہیں ہو سکتا ہمارے عقاید کے ماتحت الفاظ قرآن میں ایک ایسا طلسمی اثر پیدا ہو گیا ہے کہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے لیکن اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور یہ اثر وہی کیفیت رکھتا ہے جو ایک فوجی افسر کے کمانڈ میں ہوتی ہے کہ سپاہی اس کے الفاظ کا مفہوم جانیں یا نہ جانیں لیکن ان کو سنکر وہ فوراً تعمیل وامتثال کے لئے طیار ہو جاتے ہیں

اس بیان سے میرا مقصود یہ ہرگز نہیں ہے کہ کلام مجید کو بلا سوچے سمجھے ہی پڑھنا چاہئے۔ بلکہ مدعا یہ ہے کہ جس حد تک نماز وعبادات کا تعلق ہے۔ میں ترجمہ کے بجائے اس کے بلا سوچے سمجھے پڑھنے ہی کو ترجیح دوں گا، اگر واقعی کسی مسلمان کو اس کے سمجھنے کا موقعہ نہیں ملا، ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ سمجھ کر کسی کلام کو پڑھنا بدرجہا اولیٰ مفید ہوگا اور ہم کو ایک مسلمان سے اتنی توقع رکھنی چاہئے کہ جہاں وہ اپنی دنیاوی ضروریات کے لئے اور بہت سے علوم یا پیشے حاصل کرتا ہے وہیں تھوڑا سا وقت اس حد تک عربی تعلیم پر بھی صرف کرے کہ کلام مجید کی چند مشہور سورتوں کا سمجھنا اس کے لئے آسان ہو جائے

مصطفےٰ کمال پاشا کا بجائے اصل الفاظِ قرآنی کے ترکی کا ترجمہ نماز میں رائج کرنا خود ان کے ملکی مصالح کے لحاظ سے ممکن ہے مفید ہو، لیکن تمام عالم اسلامی کے مسئلۂ اجتماعیت کو سامنے رکھ کر کبھی مفید نہیں کہا جا سکتا۔ چونکہ اس وقت ترکی بہ حیثیت مسلمان یا اسلامی حکومت ہونے کے ترقی نہیں کر رہا بلکہ صرف ترکی قومیت کو پیش نظر رکھ کر ابھرنا چاہتا ہے اس لئے ہم اس کو اس نوع کی اصلاحوں پر مجبور سمجھتے ہیں۔ علی الخصوص اس وقت جبکہ وہ مذہبی مُلاؤں کی ملعون گرفت سے بھی ملک کو آزاد کرانا چاہتا ہے۔ لیکن اگر ہندوستان کے مسلمان بھی اس کی تقلید کریں تو ان کے لئے کوئی وجہ اس کے جواز کی نہیں ہو سکتی، جب کہ ملک میں مختلف زبانیں رائج ہیں اور ہم سب کو کسی ایک زبان کا ترجمہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے

ترکی میں چونکہ تمام ملک کی ایک ہی زبان ہے اس لئے نماز میں کلام مجید کا ترجمہ رائج ہو جانے سے وہاں وہ اجتماعیت درہم برہم نہیں ہو سکتی جو نماز وعبادات کا مقصود حقیقی ہے، علاوہ اس کے اگر کوئی تفریق پیدا ہو بھی تو چونکہ حکومت انھیں کی ہے اس لئے وہ اس کا علاج کر سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں جبکہ زبان ونسل کے اختلاف کے ساتھ حکومت بھی اپنی نہیں ہے۔ نماز میں کلام مجید کے ترجمہ کو رائج کرنا کبھی مفید نہیں ہو سکتا بلکہ موجودہ تشتت وانتشار میں اس سے اور اضافہ ہونے کا اندیشہ ہے،

اسی سلسلہ میں ایک امر اور قابل گزارش ہے اور وہ یہ کہ ان تمام مصالح ومباحث کا تعلق نماز کی صرف

اُس حقیقی ہیئت سے ہے جو رسول اللہ نے رائج کی تھی یعنی "نماز با جماعت" لیکن اگر کوئی شخص تنہا گھر میں بیٹھ کر نماز ادا کر لینے کو کافی سمجھتا ہے تو پھر یہ کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ وہ نماز کس زبان میں ادا کر رہا ہے جبکہ میرے نزدیک وہ سرے سے نماز ہی نہیں ہے — انفرادی حیثیت سے وہ ایک ذاتی فعل عبادت کی حیثیت ضرور رکھتی ہے، لیکن اس کا تعلق چونکہ صرف اسی کی ذات سے ہے۔ اس لئے اگر وہ نماز کے بجائے کسی اور طریقہ سے اظہار عبودیت کرلے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں — نماز نام ہے صرف اسی طریقہ کا جو عہد نبوی میں رائج تھا اور جس میں اجتماعیت وعسکریت کی پوری شان نمایاں تھی۔ اور اسی حالت میں میرے نزدیک آیات قرآنی کا اصل الفاظ میں پڑھنا ضروری ہے، ورنہ یوں تنہائی میں تو ایک شخص حافظ وسعدی، غالب ومومن کے کلام سے بھی گا گا کر ایک کیفیت تاثر کی پیدا کرسکتا ہے، نماز ہی کی کیا ضرورت ہے —

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب تفصیل ذیل دفتر میں موجود ہیں۔ جن صاحب کو ضرورت ہو بحساب ۴ر فی پرچہ ٹکٹ بھیجکر طلب کرسکتے ہیں

اگست سنہ ۱۹۲۳ء	جون سنہ ۲۴ء	دسمبر سنہ ۲۵ء	اپریل سنہ ۲۷ء	ستمبر سنہ ۳۰ء	مارچ سنہ ۳۲
ستمبر ״	جولائی ״	جنوری سنہ ۲۶ء	مئی ״	اکتوبر ״	اپریل ״
اکتوبر ״	ستمبر ״	اپریل ״	جون ״	نومبر ״	مئی ״
نومبر ״	اکتوبر ״	مئی ״	دسمبر سنہ ۲۸ء	دسمبر ״	جون ״
مئی سنہ ۲۴ء	نومبر ״	جون ״	فروری سنہ ۲۹ء	مئی سنہ ۳۱ء	جولائی ״
جون ״	جنوری سنہ ۲۵ء	جولائی ״	مئی ״	جولائی ״	اگست ״
اگست ״	مارچ ״	اگست ״	جون ״	اگست ״	ستمبر ״
جنوری سنہ ۲۴ء	مئی ״	اکتوبر ״	مارچ ״	ستمبر ״	اکتوبر ״
فروری ״	جون ״	نومبر ״	ستمبر ״	اکتوبر ״	نومبر ״
مارچ ״	ستمبر ״	دسمبر ״	اکتوبر ״	نومبر ״	دسمبر ״
اپریل ״	اکتوبر ״	فروری سنہ ۲۷	مئی سنہ ۳۰	دسمبر ״	منیجر نگار لکھنؤ
مئی ״	نومبر ״	مارچ ״	اگست ״	فروری سنہ ۳۲	

اعتبارات

ایک ضعیف العمر زاہد مرتاض نے جو ظاہری علم و فضل کے علاوہ فیوض باطنی کا بھی مدعی تھا، کسی رند بادہ خوار سے کہا کہ "تو کب تک اپنی زندگی معصیت و عدوان میں لبسر کرتا رہے گا، میرے ساتھ آ اور پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر خدا کی عبادت میں مصروف ہو کہ حقیقی امن و سکون اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے"

رند نے کہا "ہاں، چلو، کیونکہ اب جام و سبو میں بھی وہ لذت و کیفیت باقی نہیں"

دونوں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے اس حال میں کہ اُن کے پاس ایک چینی کی قاب کے علاوہ کوئی اور سامان نہ تھا ——— کچھ عرصہ گزرنے کے بعد زاہد نے اپنے رفیق سے کہا کہ "میں اب جاؤں گا۔ کیونکہ مجھے اور گمراہوں کو راہِ راست پر لانا ہے، آؤ جو کچھ ہماری تمھاری ملکیت ہے اس کو نصف نصف تقسیم کر لیں"

رند بولا۔ "مجھے تمھاری جدائی کا بڑا صدمہ ہے لیکن چونکہ تمھیں اصرار ہے اس لئے مجبوری ہے، دُنیاوی اسباب میں سے صرف ایک چینی کی قاب ہمارے پاس موجود ہے، سو اس کی تقسیم ممکن نہیں اس لئے میری خواہش ہے کہ تم اس کو لے جاؤ، میں اپنے حصہ سے دست بردار ہوتا ہوں"

زاہد برافروختہ ہو کر بولا۔ "یہ تو نے کیا کہا، کیا میں صدقہ طلب کرتا ہوں، مجھے تو صرف وہ حصہ چاہئے جو میرا اپنا ہے، مجھے تیرے حصہ کی ضرورت نہیں"

رند نے جواب دیا کہ "اے میرے عزیز دوست اصرار سے کیا فائدہ، جب کہ ٹوٹ جانے کے بعد قاب نہ تمھارے کام آسکتی ہے نہ میرے"

زاہد نے کہا "فائدہ ہو یا نہ ہو، میں تو صرف اتنا ہی حصہ لوں گا، جتنا شرعاً مجھے ملنا چاہئے، زائد کا مستحق میں نہیں ہوں" ——— یہ سنکر رند نے کہا کہ "تمھارا اصرار اسی پر ہے تو میں مجبور ہوں" ——— یہ کہکر اس نے قاب کو پتھر پر دے مارا اور دو ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑا اپنے ساتھی کے سامنے پیش کر دیا

زاہد یہ دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا اور بولا کہ "اے مردود، تجھے شرم نہیں آتی کہ میں نے ہی تجھے خاک سے پاک کیا اور تو مجھی کو غصہ دکھاتا ہے"

رند یہ سنکر مسکرایا اور اس کی نگاہوں کے سامنے پھر انھیں یارانِ میکدہ کی صورت پھرنے لگی جن کی ذہنیتیں آئینہ کے مانند صاف اور جام و مینا کی طرح شفاف تھیں

نمبر۲

امن وسکون کی فاختہ
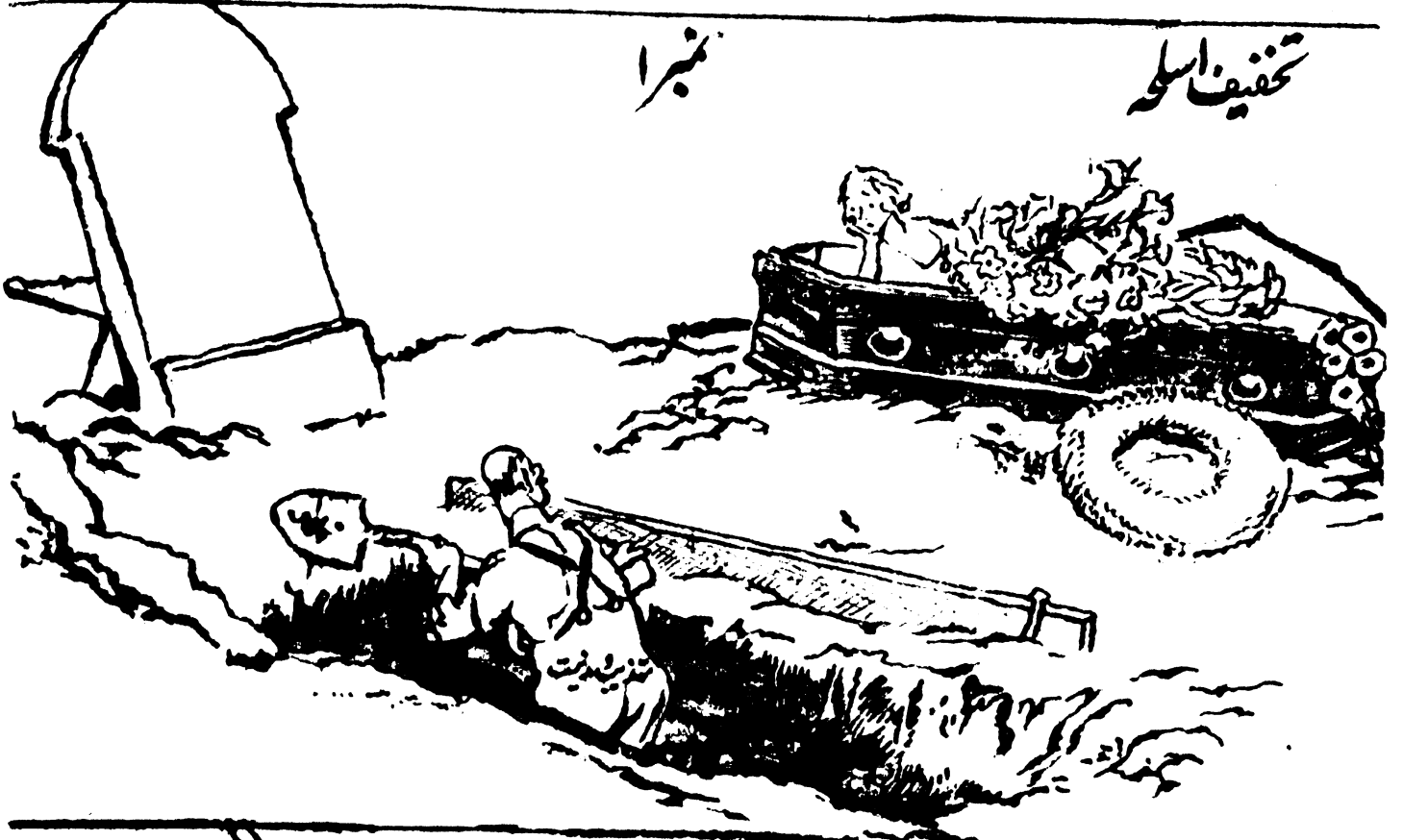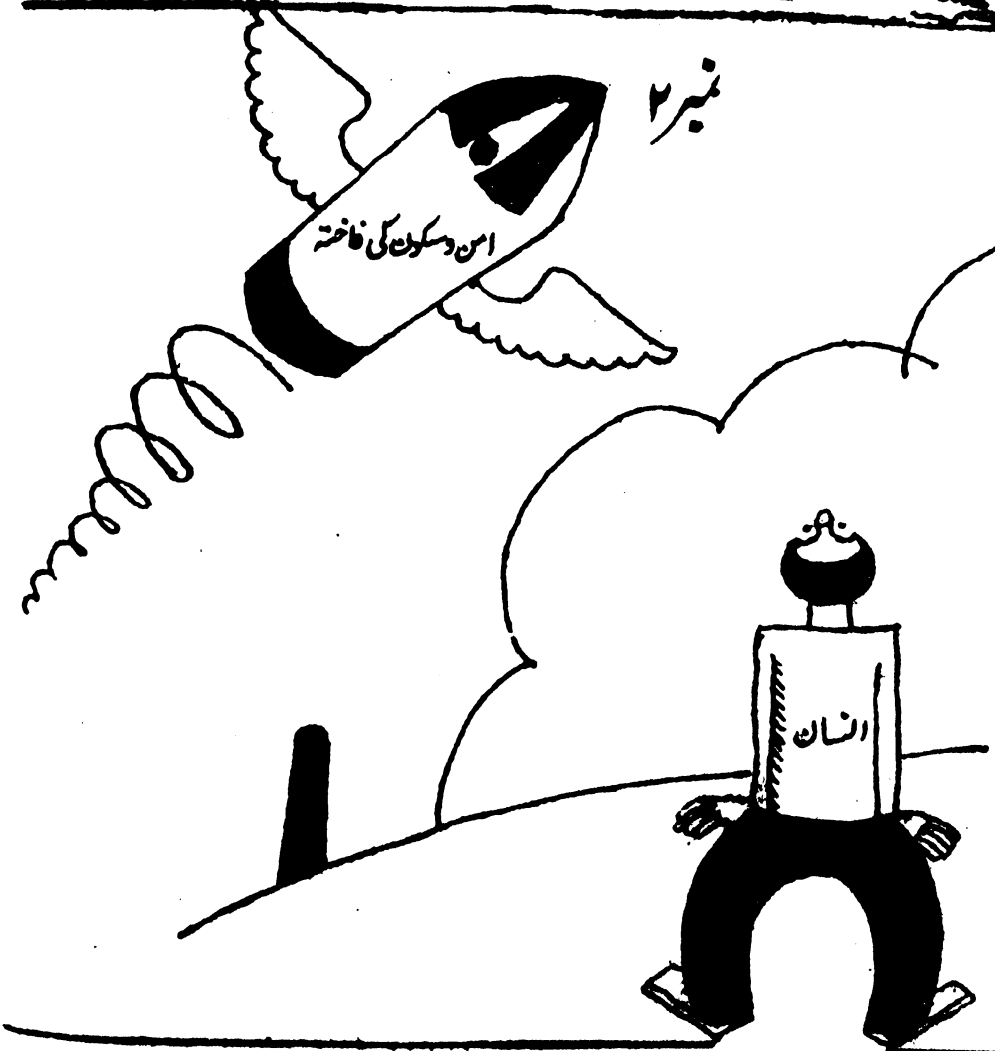
انسان

(۱) تخفیف اسلحہ کی خاتون (تابوت کے اندر سے) تہذیب و مدنیت سے مخاطب ہو کر:۔

"تم میرے لئے قبر تو کھود رہے ہو، لیکن ذرا چوڑی بنانا تاکہ میرے ساتھ تم بھی اس میں سما سکو"

(۲) عہد حاضر کا انسان فضائے عالم میں جنگی طیاریاں دیکھ کر:۔

"کیا امن وسکون کی فاختہ اب بم اور کارتوسوں کی شکل میں اُڑ رہی ہے؟"

لیلائے بام

سے

ترا دل ہے بتکدۂ ہوس
اسے ضربِ عشق سے توڑ بھی
تری زندگی ہی گناہ ہے
تو رہِ گناہ کو چھوڑ بھی

زر و جاہ ہے تری خاکِ پا — نہ پرستشِ زر و جاہ کر
نہ مٹا صداقتِ روح کو — نہ گناہ عذرِ گناہ کر
نہ دبا صدائے ضمیر کو — نہ نظامِ دل کو تباہ کر
ہے ضمیر آئینۂ خدا — نہ اس آئینہ کو سیاہ کر

ہے حیا ہی عظمتِ دوجہاں
جو حیا نہیں ہے تو کچھ نہیں
ہے وفا ہی دولتِ جاوداں
جو وفا نہیں ہے تو کچھ نہیں

تری عشرتوں کی شراب میں
تری عصمتوں کا لہو بھی ہے

ترے گیسوؤں کی شمیم میں
ہوسِ گناہ کی بو بھی ہے

وہ نگاہِ زہر کا تیر ہے — جو قتیلِ تیغِ حیا نہ ہو
وہ خیال مرگِ ضمیر ہے — جو شہیدِ صدق و صفا نہ ہو
وہ کشش — گناہِ عظیم ہے — جو اسیرِ ذوقِ ولا نہ ہو
وہ تپش عذابِ الیم ہے — جو شریکِ سوزِ وفا نہ ہو

نہ ہوس کو عشق کا رنگ دے
نہ دغا کو رسمِ وفا بنا
تجھے ہے خدا پہ یقین اگر
تو نہ اہرمن کو خدا بنا

جو تجھے ہے عشرتِ بیکراں
وہ نشاط — غم بکنار ہے
جو ترے چمن میں ہے گلفشاں
وہ بہار — خون بہار ہے

ہے کنیزِ بارگہِ ہوس — تری ہر ادائے فلک نشیں!
ہے کمندِ حجلۂ خودکشی — خمِ جعدِ گیسوئے عنبریں!
ہے چراغِ مدفنِ زندگی — سرِ بام —— جلوۂ آتشیں
تجھے، خونِ زخمِ گناہ پر — ہے گمانِ بادۂ احمریں

وہ ہے ایک چشمۂ تیرگی
جو تری نگاہ میں نور ہے
ہے شکست تیرے غرور کی
تجھے جس کشش پہ غرور ہے

تو ذرا تو سوچ کہ تابکے!
یہ روِ بغاوت و سرکشی
نہ عذاب بنکے بھڑک اٹھے
کہیں آگ تیرے گناہ کی

بہ خشوعِ روح و خضوعِ دل — بہزار بندگی و رضا
پس اب عہدِ ترکِ گناہ کر — بحضورِ خالقِ ذوالعطا
ہے کشادہ دامنِ لطفِ حق — درِ توبہ بھی ہے کھلا ہوا
وہ کسی کو بھی نہیں بھولتا — جسے آہ تو نے بھلا دیا

جسے انفعالِ گناہ ہو
وہی عہد، عہدِ سعید ہے
جو بصدق طالبِ عفو ہو
وہ قبولِ ربِّ حمید ہے

تو ظہورِ حسنِ لطیف ہے
تو لطافتوں ہی سے کام رکھ
ترا دل صداقتِ عشق ہے
تو صداقتوں ہی سے کام رکھ

تو ہے اک حقیقتِ سرمدی — نہ اسیرِ دامِ مجاز بن
تجھے کیا نمود سے واسطہ — تو عروسِ عالمِ راز بن
جو اثر پذیرِ فنا نہ ہو — وہ نشاط بن وہ گداز بن
جو جہانِ حرص کو پھونک دے — وہ نوائے شعلہ طراز بن

تو نگارِ بزمِ قدیم ہے
تو اسی لباسِ کہن میں آ
حرم وفا ہے وطن ترا
تو دلِ وطن ہے —— وطن میں آ

روش صدیقی

ملحد کی حمد

یہ نظم ایک ایسے ادیب کی ہے جس کی مادری زبان اُردو نہیں ، اس لئے زبان و محاورہ وغیرہ کے لحاظ سے اس پر غور نہ کیا جائے بلکہ صرف مطالب و معانی کو پیش نظر رکھ کر مطالعہ فرمایا جائے

(اڈیٹر)

میں سنتا ہوں سمجھتا ہوں کہ اس عالم کے پردے میں
ہے ایسی بھی کوئی طاقت جو ہر طاقت پہ بھاری ہے

یہ دُنیا ایک مجموعہ ہے اسباب و نتائج کا
ازل سے سلسلہ فطرت کے قانونوں کا جاری ہے

ہر اک قانون فطرت کا محرّک بھی کوئی ہوگا
کہ ہر شے اختیار و عزم کی قوت سے عاری ہے

نہیں ہے ہوش بادل کو کہاں جانا ہے کیا ہونا
خبر بجلی کو خود اپنی نہیں نوری کہ ناری ہے

ہے بے حِس کہرُبا خود اپنی عالم گیر قوّت سے
اسی باعث تو رعبِ حکمِ انساں اس پہ طاری ہے

ارادوں ہی کے اجزا سے جہاں بنتا بگڑتا ہے
مگر ان میں مُمیّت کون ہے اور کون باری ہے

پسِ تخلیق ہر شے کا فنا ہو جانا کیا معنی !
یہ کس ہستیٔ خاص الخاص ہی کی سحر کاری ہے

یہاں ہے ظاہراً انسان ہی منبع تخیّل کا
دماغِ آدمی ہی علّتِ صد فعل ساری ہے

اگر اِحداث و اِفنا کا ہمہ مرکز ہے فطرت ہی
تو اس محکوم حاکم میں کسی کی پردہ داری ہے

ہمہ مجموعۂ فطرت تحرّک ہے ۔ تغیّر ہے
قوانینِ منظم کا عجب طوفان جاری ہے

یہ فطرت کیا ہے ؟ کلّیاتِ عالم کی ہے نیرنگی
مگر فطرت پہ وہ حاوی کہ فطرت اُن پہ طاری ہے

بڑی مُدت ہوئی سارا جہاں فطرت سے قائم ہے
مگر نیروئے فطرت کس کے دم سے ہے کہ دائم ہے

دماغ و ذہنِ فطرت کیا ؟ ارادوں کا ہے مرکز کیا؟
کسی جا اس میں عقل و فہم و حِس و دل بھی پنہاں ہے ؟!

حقیقت یہ ہے فطرت گو بذاتِ خود ہی قائم ہے مگر اس کی ادا کہتی ہے وہ مجبور و حیراں ہے

خبر بھی ہے اُسے اپنی کہ خود کیا ہے کہاں سے ہے! قیامِ ہستیٔ خود کو سمجھتی ہے کہ ناداں ہے

بقائے ہستیٔ خود پہ اگر قادر اُسے سمجھیں تغیّر اس کا کیا معنی؟ سبب کیا یوں پریشاں ہے؟

زمین و آسماں اور جو بھی اُن میں ہے سبھی فطرت کے اجزا ہیں منظم اور سبھی کی ایک ہی جاں ہے

بنی آدم بھی فطرت کی اَہم طاقت کا پُرزہ ہے مگر پھر بھی ہمہ مجبور کیوں، رہ رہ کے نالاں ہے

کوئی کیفیتِ مخصوص پنہاں مادّوں میں ہے کبھی ہے نامیہ جاری کبھی اِفنا کا ساماں ہے

یہ انساں باوجودِ قوتِ فکری ارادی کیوں مظالم ہائے، پنہاں اصل کی شدت سے نالاں ہے

دماغ اپنا ہے دل اپنا حواس اپنے بدن اپنا: مگر میں خود نہیں اپنا کہ مِلکِ غیر یہ جاں ہے

عناصر خاص میزاں میں بہم ہونے سے انساں ہیں کوئی کیفیتِ جانی یہاں کچھ دیر مہماں ہے

قیامِ ہستیٔ تن منحصر ہے دل کی حرکت پر سمجھنا جس کی نیرو کا بعید از حدِ امکاں ہے

کہاں ہے گوہرِ جاں؟ اصل اس کی مُخ ہے یا دل ہے پسِ مُردن نصیبِ روح فرحت ہے کہ حرماں ہے

عروسِ روح کا جب مضمحل ہو کاغذی جامہ تو پھر سے اُس کی زینت کا کہیں کیا اور ساماں ہے

جسے حرماں نصیبی نے کہیں کا بھی نہ رکھ چھوڑا کسی قانونِ غیبی میں کہیں اس کا بھی درماں ہے؟

پکاروں اُس کو میں کیسے؟ کہ وہ میری بھی کچھ سُن لے کوئی طاقت ہے جو کون و مکاں سے دور پنہاں ہے
وہ کیا

ہمہ عالم کا جو رب ہے جو خالق ماسوا کا ہے اُسے کیا کوئی پہچانے کہ یاں خود ہوش حیراں ہے

بسے جستم کہ رمز انجم و نور و رواں بینم
کنوں کیف و لماذائے من و چیزے نمی دانم

ہوش (سونیسروی)

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

کتاب	قیمت
گوڈر کا لال	للعہ
شوکت آرا بیگم حصہ ۱ و ۲	ے
〃 حصہ سوم	سے
سعیدہ کے خطوط	عہ
پیاری سہیلی	۱۰ر
نئی نویلی پیاری سہیلی	۸عہ
عورتوں کی انشاء	عہ
انشاء نسواں	۸ر
سیرۃ الکبریٰ	۸عہ
طرز زندگی حصہ ۱ و ۲	عاؔر
محاورات تیموریہ	عاؔر
ازواج النبی	۱۲ر
ازواج الانبیا	۸عہ
سیرۃ عائشہ صدیقہ	عاؔر
عفت المسلمات	۸عہ
سبیل الجنان	۴عہ
بچوں کی پرورش	۸عہ
حرز طفلاں	عہ
تہذیب نسواں	عہ
بیوی کی تعلیم	۴عہ
بیوی کی تربیت	عہ
[illegible]ت اطفال	۱۲ر
فرائض مادری	۱۲ر
افسانہ نادر جہاں	۸عہ
اقبال دولہن	۸عہ
حسن معاشرت	۴عہ
ایامیٰ	۴عہ
سولہ کہانیاں	۱۲ر
سترہ کہانیاں	۱۲ر
سولہ قصے	۸ر
مراۃ العروس	۸ر
بنات النعش	۸ر
توبۃ النصوح	۱۲ر
کنیز فاطمہ	۸ر
پنکھڑیاں	۸ر
نصیحت کا کرنپھول	۸ر
برکات سلطانی	۸ر
ابن الوقت	۸عہ
چند پند	۴ر
منتخب الحکایات	۴ر
تندرستی	عہ
حفظ صحت	عہ
طبیب نسواں	۸عہ
رہبر صحت	۸ر

ناول، ڈرامے اور افسانے

کتاب	قیمت
قطرات اشک	۸عہ
جتندر ناتھ	عہ
بس کار وکھ	عہ
فسانۂ سعید	۸ر
خوفناک ڈکیتی	۴عہ
سیلاب اشک با تصویر	۴عہ
بے زبان دوست	۶ر
جمال ہم نشیں	عہ
تفسیر عصمت	عہ
جوہر قدامت	۸عہ
تائید غیبی	۸ر
پراسرار قتل	عاؔر
اعلان آزادی	۵ر
سرگزشت ہاجرہ	۱۰ر
نوحۂ زندگی	۱۲ر
قلب حزیں	۸ر
عروس کربلا	۸عہ
شہید مغرب	عہ
ماہ عجم	۴عہ
تیغ کماں	۸عہ
سراب مغرب	۸ر
منازل السائرہ کامل	عاؔر
موہنی	۱۲ر
وداع ظفر	۸عہ
یاسمین شام	۸عہ
طوفان اشک	عہ
شاہین و دراج	۸ر
درس عشق	۸عہ
کرد ریتی چور	۴عہ
تین بندوق باز	۸عہ
کرشمۂ رقابت	۸ر
انقلاب قسطنطنیہ	۸ر
شاہد رعنا	۸عہ
وڈیا کی سرگزشت	۴ر
شگوفۂ محبت	۷ر
نسوانی زندگی	۸ر
ولایتی نتھی	۸ر
شمع خاموش	۸ر
شب زندگی کامل	عاؔر
مودودہ	۸ر
چندرکلا	۸ر
گلستان خاتون	۴عہ
صبح زندگی	۸عہ
شام زندگی	عہ

تاریخ و سوانح عمریاں

کتاب	قیمت
تاریخ مغرب	۸عاؔ
مختصر تاریخ اسلامی	۸ر
〃 〃 حصہ ۲	۹ر
〃 〃 حصہ ۳	۱۰ر
〃 〃 حصہ ۴	عہ
الصالحات	۸عہ
امت کی مائیں	عہ
الزہرا	۱۲ر
اسوۂ حسنہ	۸ر
ہندو شعراء	۴عہ
شونہار	۸عہ
سوانح اکبر الہ آبادی	عہ
سفرنامہ عراق	عہ
تاریخ افاغنہ	۸عہ
اسلام اور غیر مسلم	۸ر
سیر المصنفین حصہ ۱	عاؔر
〃 〃 حصہ ۲	۸ے
تاریخ اسلام ۵ جلد	صہ
اخبار الاندلس ۳ جلد	عاؔر
خلافت موحدین	نعہ
خلافت مولدین	۸عاؔ
عرب اور اسکا مستقبل	۸عہ

لغات و ادب

کتاب	قیمت
بازاری زبان	۸ر
لغات سعیدی	للعہ
لغات کشوری	سے
گنجینۂ تحقیق مجلد	للعہ
سیر اللغات فارسی	عاؔر
محاورات نسواں	۸ر
جواہر اللغات	۱۲ر
گوہر اللغات	۱۲ر
چراغ سخن	عہ
دکھنی لغت	۸ر
جواہرات کلیات نظیر	۸عہ
عزیز اللغات	۸عاؔ
تذکرۂ ریختی	عہ
تاریخ اردوئے قدیم	۸عہ
دکن میں اردو	عاؔر
منتخب کلام ہندی	۸عاؔ
رباعیات عمر خیام	عاؔر
منتخب کلام ہندی	۸عاؔ
اردو کے اسالیب بیان	۸عاؔ
تصحیح الاغلاط	۴ر
فیض اردو	۵ر
نور اللغات ۴ جلد	للعہ

دواوین فارسی

کتاب	قیمت
دیوان شمس تبریز	۸عہ
کلیات عراقی	۱۲ر
دیوان حافظ	۸عہ
دیوان بیدل	۱۲عہ
دیوان عرفی	۱۲ر
کلیات جامی	عاؔر
کلیات غالب	۸عہ
کلیات صائب	۱۲عہ
دیوان ناصر علی	۶ر
کلیات سعدی	۸عہ
کلیات حزیں	۱۲عہ
دیوان عنصری	۱۲ر
دیوان غنی کشمیری	۶ر
دیوان ہلالی	۶ر
اسرار خودی و رموز بیخودی	سے
زبور عجم	۸ے
پیام مشرق	۸ے
قصائد عزیز مجلد	۸ے

دواوین اردو

کتاب	قیمت
کلیات ظفر	۱۲عاؔ
کلیات مومن	۴عہ
دیوان ناسخ	۴عہ
کلیات میر	۸عہ
کلیات سودا	۸عہ
کلیات انشاء	۸عہ
کلیات نظیر اکبر آبادی	عہ
گلزار داغ	۴عہ
دیوان درد	۱۲ر
دیوان ذوق	۱۲ر
گلکدۂ عزیز عہ	۸عہ
مراۃ الغیب	عہ
صنمخانۂ عشق	عاؔر
فریاد داغ	۴عہ
عالم خیال با تصویر	عہ
دیوان شہیدی	۴ر
کلیات اکبر الہ آبادی	للعہ
نمونۂ دل شاہجہاں پوری	۸عہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

تذکرہ و تاریخ

- پیغمبر اعظم
- شب معراج
- سراج منیر
- پیغمبر عالم
- سوانح حضرت رسول
- سید المرسلین
- حیدر کرار
- سیرۃ الصدیق
- عمر ابن خطاب
- ابوبکر صدیق
- ائمہ اسلام ۱۲ر
- الحبیب
- عمر بن عبد العزیز
- دولت فاروقیہ
- مکمل سوانح زیب النسا بیگم
- تذکرہ اولیا
- تذکرہ اولیاء گجرات
- مراۃ الکونین
- قصص الانبیا مکمل
- سفرنامہ چین
- تلخیص التواریخ
- خاتون جنت
- مختارات الصوفیہ
- خواتین انگورہ
- مشاہیر نسواں
- مشاہیر ہند
- مخدرات مقدسہ
- بیگمات بنگال ۶ر

جاسوسی کی ناول

- شرلاک ہومز
- محاصرہ پیرس ۸ر
- شیخ چلی ۴ر
- بہرام کی واپسی ۴ر
- انقلاب فرانس
- بحری قزاق
- فطرتی جاسوس
- ٹرکی حرم سرا ۸ر
- جنگ طرابلس
- بہرام چور ۱۲ر
- زر پرست ۱۲ر
- کنجی کا راز ۸ر
- عبد الرحمن ناصر
- عروس مصر
- سیلاب خون
- سیاحت زمین
- سیاحت ہوا
- نازنین مراکش ۸ر
- سمندر کی سیر
- اسرار السویز
- روح لیلیٰ
- امین ہیک ۱۲ر
- حجاج بن یوسف
- یوسف پاشا
- انقلاب عثمانی
- بہرام کی رہائی
- بہرام کی آزادی ۱۲ر
- بہرام کی سرگذشت

مراثی

- مراثی دبیر
- مراثی انیس کامل
- مراثی ضمیر
- مراثی مونس
- مراثی دلگیر

عجائب و غرائب

- عجائب مخلوقات، تصویر رنگین
- بلا تصویر سادہ
- مجمع الفنون
- طلسم فرنگ
- کارخانۂ عالم

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- الدرین و لیلیٰ
- فریب حسن
- سوزن عشق
- روزا لیمبرٹ
- ناول اسرار
- شام جوانی
- حرم سرا

ناول سجاد حسین

- احمق الذی ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

ناول جوالا پرشاد

- مرزا لبنی ۱۰ر
- مار آستین ۱۰ر
- بنگالی دولہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۸ر
- پرتاب ۱۲ر
- روہنی ۱۰ر

ناول سرشار

- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ بطرز ناول
- کامنی
- سوانح عمری عمرو عیار

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب
- بزم خیال
- شاہد سخن
- مکاتیب محسن الملک

تذکرۃ الشعراء

- تذکرۂ حسینی ۱۲ر
- گلشن بہار ۱۰ر
- سراپائے سخن
- سوانح نظیر اکبرآبادی

ناول شرر

- جنید بغدادی
- مخدرات
- جویائے حق
- لعبت چین
- فاتح و مفتوح
- بابک خرمی
- ایام عرب
- قیس و لبنیٰ
- یوسف و نجمہ
- زوال بغداد
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰ر
- مینا بازار
- مقدس نازنین
- رومۃ الکبریٰ
- فلپانا
- شوقین ملکہ

مولانا شبلی نعمانی

- سیرۃ النبی جلد اول
- 〃 〃 دوم
- 〃 〃 سوم
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- رسائل شبلی
- موازنۂ انیس و دبیر
- کلام شبلی اردو
- الکلام
- علم الکلام
- شعر العجم جلد اول
- 〃 دوم
- 〃 سوم
- 〃 چہارم
- 〃 پنجم

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

قیمت ۸ر

تصانیف حضرت نیاز فتحپوری
نگارستان
حضرت نیاز کے بہترین ادبی
مجموعہ نگارستان نے ملک
میں جو درجہ قبولیت حاصل
کیا اس کا اندازہ اس سے
گھوارۂ تمدن
مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا
کتاب جس میں تلمیح اور اساطیر
سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء
تمدن میں عورت نے کتنا
زبردست حصہ لیا ہے
شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر
افسانہ جو اردو زبان میں بالکل
پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے
اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان
اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان
اسکی بلندی مضمون اور اسکی
شاعرانہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچی
ہے قیمت علاوہ محصول
فراست الید
مولفہ نیاز فتحپوری جس کے
مطالعہ سے ایک شخص بآسانی
ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو
دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل
سیرت عروج وزوال موت حیات
صحت بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ
کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا
ہے قیمت علاوہ محصول
شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنوان شباب
کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی
تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک
جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ
اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ
سے اس قدر بلند ہے کہ
دوسری جگہ مل نہیں سکتی
قیمت علاوہ محصول ۱۰ ار
جذبات بھاشا
جناب نیاز نے ایک دلچسپ
صحابیات
نقاب اٹھ جانے کے بعد
تین افسانوں کا مجموعہ جنمیں
بتایا گیا ہے کہ ہر وہ
چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں
زبان و پلاٹ انشاء
و تخیل کے لحاظ سے
تعریف فضول ہے اور
حضرت نیاز کا نام
کافی ضمانت ہے قیمت ۵
علاوہ محصول
مذاکرات نیاز
یعنی حضرت نیاز کی ڈائری
جو ادبیات و تنقید عالیہ
کا عجیب غریب ذخیرہ ہے
ایک بار اس کو شروع
کر دینا اخیر تک پڑھ لینا
ہے۔ اس کتاب کی
بہت کم جلدیں باقی
رہگئی ہیں۔ قیمت ۱۲ ار
علاوہ محصول
فلاسفۂ قدیم
اس مجموعہ میں حضرت نیاز
کے تین علمی مضامین شامل ہیں
۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم
کی روحوں کے ساتھ
۲۔ مادئین کا مذہب
۳۔ حرکت کے کرشمے
نہایت مفید و دلچسپ
کتاب ہے قیمت
علاوہ محصول
تاریخ الدولتین
جرجی زیدان کے تاریخ
تمدن الاسلام کی چوتھی
جلد کا ترجمہ جس میں عہد
بنی امیہ و بنی عباس کی
سیاسیات پر بے مثل تبصرہ
کیا گیا ہے جرجی زیدان
کی یہ کتاب بین الاقوامی
شہرت حاصل کر چکی ہے
قیمت علاوہ محصول
المسئلۃ الشرقیہ
علاوہ محصول
دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں
تذکرۂ خندۂ گل
مثنوی لالہ رخ
عباس مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل
ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ
مثنوی زہر عشق
مرتبہ مجنوں گورکھپوری جسمیں ملک کے چار
بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی
تصویریں دی گئی ہیں
فراست التحریر مکمل
تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت چال
چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم
کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب
قیمت ۸ ر علاوہ محصول

تقدس سے طوفان خیز سیلاب کو روک دے ۔ فرزندان ہند اپنی دانائی اور شائستگی سے ہماری مدد کرو ۔ اپنی قوت جو ہنود کا پیدائشی حق ہے ۔ اور وحدت ہے اور دینی ثروت سے مغربی اقتدار سے مشرق کو نجات دلانے میں متحد العمل ہو جاؤ اے ہمالیہ کی سرجیون چوٹیوں کی مخفی روحانی قوتوں اٹھو لڑائیوں کے دیوتاؤں سے دعا مانگو کہ جبر پر حق کو فتح ہو اور اپنے بے شمار دیوتاؤں سے افواج عدو کے استیصال کے لئے استمداد کرو ۔"

عزیز احمد زبیری (مرحوم)

آیندہ جنوری سنہ ۳۴ء کا نگار

(تقریباً دو چند ضخامت کا)

مخصوص ہوگا صرف ایک موضوع کے لئے جس پر اُردو میں اسوقت تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا

یعنی

"لبوں کی داستان زبانِ قلم سے"

آپ کے "لب" ہر وقت متحرک رہتے ہیں اور سب سے زیادہ خدمت انھیں سے لی جاتی ہے ، لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ جذبات کی دنیا میں ، نفسیاتی حقایق میں ، عالم شعر و تصوف میں " لب " کو کیا اہمیت حاصل ہے ۔ اور دنیا کی تاریخ میں کیسے کیسے انقلاب اس کی وجہ سے رونما ہوئے ہیں

جنوری سنہ ۳۴ء کا نگار

اِس کی مفصل داستان آپ کو سنائے گا اور اس موضوع پر تحقیق کے وہ نقوش آپکے سامنے پیش کریگا کہ آپ حیران رہ جائیں گے

علاوہ اس کے

ایک حصہ حضرت نیاز کے اُن " مختصراتِ ادب " کے لئے بھی وقف ہوگا ۔ جنھیں " الہاماتِ ادب " اور " معجزاتِ انشاء " کہنا زیادہ موزوں ہے

اگر

آپ نے نگار کی خریداری جاری رکھی تو یہ مجموعہ آپ کو مفت مل جائے گا ۔ ورنہ یوں کسی قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہو سکتا

منیجر نگار لکھنؤ

اعادہ

عزیزہ۔ شکایت اسی وقت کی جاتی ہے جب کسی کی طرف سے کوئی اُمید باقی رہے، لیکن جب بقول غالب توقع ہی اُٹھ جائے تو کیا کسی سے گلہ کرے کوئی یقیناً کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے کی زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کرے اس لئے آپ مختار ہیں لیکن اتنا فرما دیجئے کہ وہ زندگی جو مدت تک امید پر بسر ہو چکی ہو، اب کیونکر بسر ہو سکتی ہے بہرحال اب یہ سوال بھی بیکار ہے۔ اچھا خدا حافظ

اصغر

(۱)

اصغر نے تین دن کی کوشش میں یہ چند بے ربط جملے مرتب کئے اور حمیدہ کے کمرہ میں رکھ کر گھر سے چل دیا جو شخص خود گم ہو جائے اس کی جستجو میں کبھی کامیابی ہوئی ہے کہ کوئی شخص اصغر کو پاتا حمیدہ کے والد یعنی اصغر کے چچا نے بہت کوشش کی کہ اصغر کا کہیں نشان مل جائے لیکن وہ اس طرح گم نہیں ہوا تھا کہ کوئی اس کو پا سکتا

(۲)

شملہ کی سرد آب وہوا اور اس کے پُر سحر مناظر نے ابتدا میں اصغر کے دماغ کو قدرے سکون پہونچایا۔ لیکن حمیدہ کی بے مہری نے اس کو انسانوں سے بالکل متنفر کر دیا تھا۔ وہ ہوٹل میں دن رات پڑا رہتا اور جب طبیعت زیادہ گھبرانے لگتی تو پہاڑیوں پر مارا مارا پھرتا

چونکہ دل کی بربادی کے بعد دماغی سکون بھی فنا ہو جاتا ہے، اس لئے بہت جلد وہ حالت عود کر آئی جس سے پناہ ڈھونڈھنے وہ یہاں آیا تھا۔ اس نے دماغی کوفت سے نجات پانے کے لئے کوئی ممکن ذریعہ نہ چھوڑا اور جہاں تک ہو سکا وہ گناہ سے اپنے آپ کو بچاتا بھی رہا لیکن اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ اگر اس نے اپنے دماغ کو دوسری طرف متوجہ نہ کیا تو وہ دیوانہ ہو جائے گا۔ جب انسان خدا کے لطف وکرم کا مستحق نہ ہو سکے، تو شیطان کی آغوش اس کو کھلی نظر آتی ہے اور وہ بے اختیارانہ اپنے آپ کو اس میں ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ اصغر نے بھی اپنے آپ کو عصیاں کے تاریک غار میں گرا دیا۔ کیونکہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سکون حاصل کرے گا خواہ وہ گناہ ہی کیوں نہ ہو

قسمت کی بوالعجبیاں انسان کو کبھی اس کے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دیتیں، اس لئے اصغر اس زندگی سے بھی دل برداشتہ ہو گیا اور آخر ایک دن شملہ سے کہیں چل دیا

(۳)

دہلی کی پُر غرور زندگی میں قدم رکھتے ہوئے اصغر نے ایک بار پھر اُبھرنے کا خیال اپنے دل میں محسوس کیا، لیکن

بہت جلد اس کو معلوم ہوگیا کہ بلند خیالی کا تصور بھی اب اس کے لئے ممنوع ہے ناچار اس نے اپنے آپ کو تفریحات
کی نذر کر دیا۔ اس کی راتیں سینما تھیٹر یا کوٹھوں کی نذر ہو گئیں اور دن دہلی کے کھنڈروں میں گزرنے لگے اور اس زندگی
میں اس نے اپنے آپ کو اسقدر از خود رفتہ کر لیا کہ تقریباً بالکل کھو گیا، لیکن جب انسانی زندگی میں کوئی خلا پیدا
ہو جائے تو اس کا پُر ہونا محال ہوتا ہے، کچھ دنوں تو اصغر اپنے درد کو مختلف طریقوں سے بھولا تا رہا مگر تا بکے آخر وہ ایک
دن دہلی سے بھی چل دیا کیونکہ یہاں کی در و دیوار کی وحشت اس کے لئے ناقابل برداشت تھی، کیونکہ حمیدہ کا تصور
اس کے دل و دماغ میں ایسا جم گیا تھا کہ وہ دہلی رہ کر معصیت میں بھی مکمل طور پر منہمک نہ ہو سکا کیونکہ گناہ کے خیال کے
ساتھ ہی حمیدہ کا تصور اپنی تمام معصومیوں کے ساتھ سامنے آجاتا تھا۔ اور اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حمیدہ سایہ
کی طرح ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ بعض مرتبہ تو اس کو اپنے سامنے سے حمیدہ تیز تیز جاتی نظر آتی لیکن جب اس کا
تعاقب کرتا تو وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔ یہ پریشان کن تصور اصغر پر ایسا مستولی ہوا کہ وہ کئی سال تک ہندستان
کے مختلف شہروں میں مارا مارا پھرا آخر کار دل کشش نے اس کو مجبور کیا کہ وہ اپنے مرکز کی طرف لوٹے

(۴)

اپنے وطن ہمیر پور پہونچ کر جیسا کہ اصغر کا اندیشہ تھا، پہلی خبر اس کو یہی ملی کہ حمیدہ کی شادی اسکے پھوپی زاد
بھائی لطیف سے ہوگئی۔ دنیا کا سخت سے سخت حادثہ اگر انسان کے علم کے بعد وقوع میں آئے تو کبھی حیران کن نہیں
ہوا کرتا، کیونکہ انسانی تخیل بلند پروازی میں ایسی جگہ پہونچ جاتا ہے، جہاں سے ہر پیش آنے والا حادثہ اسے نہایت
معمولی واقعہ نظر آنے لگتا ہے۔ ابتدا میں اس کا خیال تھا کہ چند روز وطن رہ کر پھر اپنی زندگی برباد کرنے کے لئے کہیں
چلا جائے گا۔ مگر چند دن بعد اس میں پھر ایک تغیر پیدا ہوا اور اس نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ اپنی ہستی کو اس وجود کے سامنے
مٹا دیا جائے جو اس تباہی کا باعث ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے وطن میں قیام کرکے کھیتی شروع
کردی۔ کھیتی میں انہماک کے باوجود وہ اپنے آپ کو تباہ کرنے والی تجویز سے غافل نہ تھا اور گو وہ ظاہر میں مطمئن نظر آتا
تھا لیکن درحقیقت اس کی حالت اس آتش فشاں پہاڑ کی سی تھی جو بظاہر پُرسکون ہوتا ہے لیکن اندر ہی اندر سلگتا
رہتا ہے

(۵)

انسان کو جس قدر دور سے دیکھا جائے اسی قدر اس میں اچھائیاں نظر آئیں گی، حمیدہ نے اس سے پہلے لطیف
کو دیکھا ضرور تھا لیکن وہ دیکھنا صرف نظری دھوکا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا چنانچہ وہ ایک خاص قسم کا احترامی جذبہ
لطیف کی طرف سے اپنے قلب میں رکھتی تھی۔ مگر جب لطیف کالج کی زندگی ختم کرکے اپنے وطن آگیا تو یہی جذبہ آہستہ
آہستہ رنگ محبت اختیار کرنے لگا۔ لطیف ناتجربہ کار اور بے وقوف نہ تھا کہ وہ اس زندگی میں کوئی غلطی کرتا وہ خوب

جانتا تھا کہ ایک عورت کے جذبات کس طرح برانگیختہ کئے جاتے ہیں۔ اور آخر کار یہی ہوا کہ حمیدہ بے اختیار انہ اصغر سے جدا ہو کر لطیف کی ہو رہی

(۶)

حمیدہ کی شادی کا ابتدائی زمانہ ایک خوشگوار خواب، یا شام و سحر کی رنگینیوں کی طرح بہت جلد ختم ہو گیا، اب لطیف کے لئے حمیدہ میں کوئی ندرت نہ تھی اور اس لئے وہ حمیدہ سے سیر ہو کر اپنی دلچسپی کے سامان دوسری جگہ تلاش کرنے لگا۔ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن مرد کا استغنا اس کے لئے نا قابل برداشت ہے۔ ابتدا میں تو خیر لطیف کے اس تغیر کو حمیدہ نے جس طرح ممکن ہوا برداشت کیا لیکن تابکے وہ ایک عورت تھی اور عورت سب سے زیادہ محبت کی بھوکی ہوتی ہے، آخر ایک دن کہہ بیٹھی کہ "شاید یہ آدادیاں آپ میں اب سے چند روز قبل نہ تھیں" بات معمولی تھی اگر لطیف ٹالنا چاہتا تو ٹال سکتا تھا، مگر اس نے اس معاملہ کو یکسو کرنے کے لئے بگڑ کر کہا کہ "شاید تم نے اپنا درجہ فراموش کر دیا، میں بتاتا ہوں تم صرف ایک بی بی ہو اور بی بی ہونے کی حیثیت سے تم کو کسی طرح یہ حق نہیں کہ شوہر کی آزادیوں پر پابندی کی مُہر ثبت کرو" یہ جواب حمیدہ کے لئے بالکل غیر متوقع تھا، وہ وہاں سے اٹھ گئی اور دیر تک روتی رہی، آج پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ اصغر کے مقابلہ میں لطیف کا انتخاب اس کی شدید ترین غلطی تھی

(۷)

عورت کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے اور اگر لطف و محبت سے کام لیا جائے وہ مرد کی خطاؤں کو بہت جلد بھول جاتی ہے۔ لطیف کے جواب نے اگرچہ حمیدہ کے توقعات کی دنیا ختم کر دی تھی لیکن لطیف کے محبت انگیز برتاؤ نے چند ہی روز میں پھر حمیدہ کے دل کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک دن حمیدہ کی طبیعت بہت خوش تھی، لطیف سامنے بیٹھا مزے مزے کے قصے سنا رہا تھا اور حمیدہ ہنس رہی تھی کہ لطیف نے مسکرا کر کہا "میں نے ایک غلطی کی ہے لیکن تمہاری نیکی سے امید ہے کہ تم مجھ کو معاف کر دو گی، میں نے تم کو بہت دنوں تک پریشان کیا اور فریب میں مبتلا رکھا لیکن اب میرا ضمیر مجکو اس کی اجازت نہیں دیتا لہذا اب میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ میرا گذشتہ تلخ طرز عمل صرف اسوجہ سے تھا کہ میرے قلب و دماغ کو ایک اور ہستی نے بیکار کر رکھا تھا۔ اور اب مجبور ہو کر میں نے اس سے نکاح کر لیا ہے" حمیدہ کو یہ معلوم ہوا کہ گویا اس کو کسی نے آسمان سے زمین پر پھینک دیا ہے، لیکن جواب میں صرف یہ کہہ کر وہاں سے چلدی کہ "آپ مرد ہیں اور مرد کو تمام حقوق حاصل ہیں" لطیف نے اگرچہ اس جملہ کی تلخی کو اچھی طرح محسوس کیا لیکن مقتضائے وقت دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ یہ دوسرا موقعہ تھا کہ اسے اپنے انتخاب کی شدید غلطی معلوم ہوئی

(۸)

انسان فطری طور پر شرم و حیا کا عادی نہیں ہے بلکہ جسقدر سوسائٹی کا دباؤ اور ماحول کا اثر اسے مجبور کرتا ہے

اسی قدر وہ شرم و حجاب کا پابند بن جاتا ہے، ابتدا میں لطیف، شریفن سے تفریحاً ملا کرتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ اسی کا ہوکر رہ گیا۔ یہاں تک کہ ایکدن وہ اس کو اپنے گھر لے آیا۔ شریفا کا گھر میں آنا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، حمیدہ دنوں تک روتی رہی اور اگرچہ اس دوران میں لطیف اور شریفن نے اس کے دل بہلانے کی بہت کوشش کی، لیکن حمیدہ کی افسردگی اور پریشانی بڑھتی ہی گئی۔ اس کو دنیا تاریک نظر آتی تھی، غم سے اس کا دل بیٹھا جاتا تھا، اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دہکتی ہوئی بھٹی میں ڈال دیا گیا ہے، مگر ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے خواہ خوشی ہو یا غم۔ آخر آہستہ آہستہ پھر وہ گذشتہ زندگی کی طرف لوٹنے لگی۔ اگرچہ اس جدید حادثہ کی وجہ سے وہ روز بروز کمزور و ناتواں ہوتی جاتی تھی مگر لطیف کو اپنی دلچسپیوں سے کہاں اتنی فرصت تھی کہ وہ حمیدہ کی طرف متوجہ ہوتا۔ اس پر مزید قیامت یہ آئی کہ حمیدہ کے ماں بننے کا بھی زمانہ قریب آگیا، وہ سخت مضطرب تھی کہ کیا کرے لطیف کے مکان پر قیام کی صورت میں اس کو اپنی موت نظر آتی تھی لیکن وہ ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اُسے اپنے گناہ کی تلافی کی صورت صرف یہی نظر آتی تھی کہ خود سسک سسک کر اس قدر الم انگیز موت مرے کہ موت کفارۂ گناہ ہو جائے

(۹)

حمیدہ چار یا پانچ مہینہ اپنی ماں کے ہاں رہی، لطیف اس دوران میں دوسرے تیسرے حمیدہ کو دیکھ جاتا تھا ممکن تھا کہ حمیدہ اب ہمیشہ کے لئے یہیں رہ جاتی لیکن وہ ایک خوددار عورت تھی اور خواہ مخواہ دوسروں کو اپنی مصیبت میں شریک کرنا نہیں چاہتی تھی، آخر کار ایک دن ہمت کرکے لطیف کے گھر چلی آئی

حمیدہ کے گھر آنے پر لطیف کا اور شریفن کا طرزِ عمل اسقدر پسندیدہ ہوگیا کہ حمیدہ تقریباً پرانے واقعات کو بھول گئی۔ مہینہ سوا مہینہ کے بعد لطیف یکایک مغموم اور دلگیر رہنے لگا اگرچہ اس نے اپنے طرزِ عمل میں کوئی تغیر نہ پیدا کیا لیکن اس کا اثر حمیدہ پر ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ وہ بھی رنجیدہ ہوگئی اس تغیر حال کو کئی دن گذر گئے بظاہر نہ تو شریفن میں اتنی جسارت نظر آتی تھی کہ وہ دریافت حال کرتی نہ حمیدہ میں اتنی طاقت تھی کہ وجہ پوچھتی۔ آخر ایکدن لطیف نے نہایت غمناک آواز میں حمیدہ سے کہا " پوشیدہ کارروائیوں کی بالکل ضرورت نہیں اگر واقعی تم مجھ سے قطع تعلق کرنا چاہتی ہو تو تم کو اختیار ہے لیکن اس سے کیا فائدہ کہ تمھارے والد مجکو بدنام کریں اور قصبہ بھر میں کہتے پھریں کہ میں لڑکی کو بٹھا کر نالش کرنے والا ہوں " حمیدہ یہ سنکر ہکا بکا ہوگئی اس نے اپنی بریت کا یقین دلایا قسم کھائی لیکن لطیف کا دل مطمئن نہ ہوا، آخر مجبوراً حمیدہ نے اپنے والد کو بلایا انھوں نے حلف سے لطیف کو یقین دلایا کہ " شریف ایسا نہیں کرتے " حمیدہ کے والد کے یقین دلانے پر لطیف بظاہر مطمئن ہوگیا لیکن چند روز بعد پھر اس نے وہی قصہ چھیڑا کہ " نہیں ضرور تمھارے والد نالش کرنے والے ہیں آج انھوں نے فلاں سے اس بارہ میں مشورہ کیا " حمیدہ ان روز روز کے قضیوں سے پریشان ہوگئی تھی کہنے لگی کہ " اگر تم کو یقین نہیں آتا تو میں اپنا مہر معاف کرتی ہوں "

لطیف نے اس کو نہایت استعجاب سے سنا اور کہا "کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بعد کو مجھے الزام دو اس لئے پہلے تم کو سوچ لینا چاہئے" حمیدہ نے ان الفاظ کو گویا سنا ہی نہیں اور بغیر کسی تعویق کے معافی نامہ لکھ کر لطیف کے حوالہ کر دیا۔ حمیدہ کی اس قربانی کا بدلہ لطیف کو اپنے محبت انگیز طرز عمل سے دینا چاہئے تھا لیکن وہ دل جو دغا اور فریب کو محبت بنا کر پیش کرنے کا عادی ہو وہ اس قسم کی باتوں پر کوئی غیر معمولی تغیر اپنے اندر نہیں پیدا کرتا کچھ روز تو لطیف کا برتاؤ معمولی رہا لیکن رفتہ رفتہ پھر حمیدہ نے وہی بے پروائی محسوس کی ابھی مہر کی معافی کو چھ مہینہ بھی نہ گزرے تھے کہ اتفاقاً حمیدہ کے ہاتھ سے شریفن کا آئینہ ٹوٹ گیا، واقعہ معمولی تھا لیکن شریفن اس سے خوب لڑی اور ہزاروں گالیاں دیں حمیدہ بیچاری چپ اپنے بچہ کو سینہ سے لگائے بیٹھی رو رہی تھی لطیف اس وقت گھر میں نہ تھا جب وہ آیا تو شریفن نے ایک ایک کی چار چار لگائیں اور لطیف نے بغیر واقعہ کی تحقیق کئے حمیدہ کو اس کے گھر روانہ کر دیا اور کہہ دیا کہ "تمھارے یہاں واپس آنے کی ضرورت نہیں" حمیدہ نے ہزار خوشامدیں کیں لیکن لطیف کا دل نہ پسیجا اور وہ اس کو گھر پہونچا کر رہا ——— یہ تیسرا موقعہ تھا کہ حمیدہ کو اپنے انتخاب کی تباہ کن غلطی کا اچھی طرح علم ہوا

(۱۰)

انسان جن تخیلات میں اپنے آپ کو گم کرے وہی اس کی فطرت بن جاتے ہیں اس میں توارث اور قدامت کو مطلق دخل نہیں عصیاں کے متعلق مذہبی افراد کا خواہ کچھ ہی فیصلہ ہو لیکن فلسفی کی نظر میں "انسانی تقلید" سے زیادہ وقعت نہیں اور وہ جرائم جن کو اخلاق نے قابل تعزیر قرار دیا ہو انسانی مفروضات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تمام افراد گناہوں کی سرمستی میں اس سے کم نہیں۔ لیکن باوجود اس یقین کے اس کی روح اسی طرح پریشان و مضطرب تھی اور اس کو جب اس طرح بھی اطمینان نصیب نہ ہوا تو اس نے شراب پینا شروع کر دیا کیونکہ شراب کے بعد وہ دیر تک پُرسکون رہتا اور چونکہ اسے ہر وقت سکون کی ضرورت تھی لہٰذا وہ ہر وقت مدہوش رہنے لگا۔ پہلے وہ حمیدہ کو یاد کرکے گھنٹوں رویا کرتا تھا اور تقریباً ہر وقت حمیدہ اس کے دل و دماغ پر مستولی رہا کرتی تھی لیکن شراب کے دور کے بعد اس کی بالکل قلب ماہیت ہو جایا کرتی تھی اور بجائے محبت کے نفرت اس کے دل میں پیدا ہو جاتی اور بعض وقت غصہ اسقدر شدید ہو جاتا کہ جذبات انتقام سے اس کا قلب شق ہونے لگتا اور اس وقت وہ دیوانہ وار جنگلوں کی طرف بھاگ جاتا

(۱۱)

حمیدہ کی حالت یہ تھی کہ وہ دن رات تنہا پڑی رویا کرتی تھی۔ اور اپنے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی محسوس کرتی تھی۔ موجودہ تکالیف کے علاوہ سب سے زیادہ تکلیف اس کو اس احساس کی تھی کہ اس نے اصغر کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا اور اب اگر کوئی آرزو اس کے دل میں تھی تو صرف یہ کہ کسی نہ کسی طرح اصغر سے معافی مانگے لیکن اس کی

تکمیل کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی،

حمیدہ کو چھ مہینے اسی عالم میں گزر گئے اور اس دوران میں نہ تو لطیف نے "تجدید عہد" کی کوشش کی اور نہ حمیدہ ہی نے واپسی کی آرزو اپنے دل میں پیدا کی، اتفاق سے اسی زمانہ میں قصبہ میں شدت سے ہیضہ پھیلا۔ اور لطیف و شریفن بھی چار گھنٹہ کے تفاوت سے چل بسے

لطیف کا طرزِ عمل خواہ کچھ ہی ہو لیکن وہ حمیدہ کی آرزوؤں کا آخری مرکز ضرور تھا اس واقعہ سے اس کے رہے سہے اوسان بھی کھو گئے اس سے قبل دنیا اور اہل دنیا کا خیال ضرور دامنگیر تھا لیکن اب وہ ان تمام قیود سے آزاد تھی

آخر ایک رات دس بجے کے قریب چادر اوڑھ کر گھر سے چلدی اور سیدھی اصغر کے گھر پہونچی، اصغر رات کی مدہوشی کے لئے مے نوشی کی تیاری میں مشغول تھا، ایک عورت کو بے باکانہ گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے پریشان ہو گیا لیکن اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ آنے والی کون ہے۔ وہ فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔ حمیدہ تھوڑی دیر کھڑی رہی پھر کہنے لگی کہ " میں کچھ کہنے آئی ہوں اگر اجازت ہو"

اصغر نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا " کہو"۔

حمیدہ اگرچہ کانپ رہی تھی لیکن نہ معلوم اس میں کہاں سے طاقت آگئی کہ اس نے بے اختیارانہ اصغر کے قدم تھام لئے، اصغر حیران تھا کہ کیا کرے، اس نے بہت کوشش کی کہ حمیدہ سے اپنے قدموں کو چھڑا لے لیکن حمیدہ کی آہنی گرفت نے نہیں چھوڑا۔ حمیدہ سسکیاں بھر کر رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ " اگرچہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمھارے قدموں میں پڑ سکوں لیکن پھر بھی میں نے یہ جسارت کی ہے، امید ہے کہ تم اس ناپاک وجود سے اسقدر متنفر ہو گئے ہو گے کہ اس کو دُور کرنے کی کوشش کرو۔ میں اس وقت تم سے بھیک مانگنے آئی ہوں۔ لیکن وہ بھیک عشق و محبّت کی نہیں ہے، کیونکہ میں یہ لفظ اپنے منہ سے بھی نہیں نکال سکتی —— میں اقرار کرتی ہوں کہ تم کو تباہ کرنے والی، تم کو گناہ کی طرف دیکھنے والی، تم کو بدنام و رسوا کرنے والی، تمھاری راحت کو برباد کرنے والی، تمھارے سکون کو مٹنے والی میں اور صرف میں ہوں، للہ مجکو معاف کردو اپنی اگلی محبت کا صدقہ معاف کردو، میں ایک کمزور و ناتوان عورت ہوں اس مصیبت کو برداشت نہیں کر سکتی، میں نے تمھارے گناہ کا بدلہ پالیا۔ اور اچھی طرح پالیا اب نہ عزت کی آرزو ہے نہ بیعزتی کی پرواہ لیکن اگر تم مجھے معاف کردوگے تو ایک ٹوٹے ہوئے دل کو تسکین دوگے"

حمیدہ، اپنے جوش بیان میں نہ معلوم اور کیا کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اصغر اس سے پاؤں چھڑا کر علٰحدہ ہو گیا اور ایک منٹ سوچنے کے بعد اس نے نہایت پُر قہر آواز میں کہا " حمیدہ سنو انسان اپنی زندگی میں دو فیصلے نہیں کیا کرتا اگر تم اپنا پہلا فیصلہ توڑ رہی ہو تو تم کو اختیار ہے لیکن میں ابھی تک اسی فیصلہ پر قائم ہوں، ماضی کے متعلق یہ سمجھ لو کہ گویا وہ واقعات ہوئے ہی نہ تھے اور آئندہ کبھی میرے گھر میں آنے کی جسارت نہ کرنا۔ میں ایک بدنام آدمی ہوں کہیں

"ایسا نہ ہو کہ تم بھی بدنام ہو جاؤ" یہ کہکر اصغر گھر سے باہر چلا گیا

(۱۲)

حمیدہ کا دل اصغر کے اس طرز عمل سے اس بُری طرح ٹوٹا کہ صاحب فراش ہو گئی

اصغر کرنے کو تو یہ کر گزرا، لیکن بعد کو ایسا محسوس کرنے لگا کہ حمیدہ حقیقتاً مجرم نہیں ہے بلکہ وہ خود مجرم ہے، اور اس داخلی کشمکش میں وہ اپنی تمام دلچسپیوں سے علیحدہ ہو گیا، اس کے دل و دماغ پر اب صرف یہی ایک خیال مستولی تھا کہ حمیدہ سے معافی مانگے وہ اپنی گذشتہ زندگی میں پھر لوٹ آیا تھا، وہی عدم سکون تھا اور وہی پریشانی اور وہی حمیدہ کی بے پایاں محبت۔ اسی عالم میں اس کو تقریباً ایک مہینہ گزر گیا اس کو روزانہ حمیدہ کی زبون حالی کی خبر ملا کرتی وہ خوب جانتا تھا کہ حمیدہ اب زندہ نہ بچے گی آخر ایک دن اس کی نازک حالت کی خبر پاکر بغیر کسی اطلاع کے حمیدہ کے گھر پہونچ گیا۔ حمیدہ اس وقت زندگی کی آخری منزل میں تھی، زبان بند ہو چکی تھی اصغر کو دیکھ کر اس نے ہاتھ جوڑے۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر لائی اصغر یہ منظر دیکھ کر گھٹنوں کے بل اس کی چارپائی کے پاس بیٹھ گیا اور زار و قطار رونے لگا حمیدہ نے اشارہ سے اس کو منع کرکے اپنی طرف بُلایا اور اپنے بچہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ اور ایک لمبا سانس لیکر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی

محمد ذوالفقار کیفی

علم ادب تاریخ و تعلیم کا سرمایہ

شاعری کا مکمل سیٹ۔ علم عروض قافیہ تاریخگوئی صنایع بدایع ... معائب شعر کے ... دس ہزار شاعر بن جائیے قیمت ۱۱؎

تذکرہ آب بقا۔ ماضی و حال کے شعرا کے حالات انتخاب کلام تنقید شعر متروک الفاظ کا ذکر محاورات کی تحقیق دلکش زبان میں ۱۲؎

تذکرہ ہندو شعرا۔ تمام مشاہیر ہندو شعرا کے حالات سب سے بہتر اشعار کا انتخاب چار سو پچاس ہندو شعرا کا کلام اور حالات ۱۲؎

لغات اُردو مکمل۔ چار جلد میں مصادر مفردہ مرکبہ اسما یا مصادر لغات الحروف کا محل استعمال مع مثال جملہ ۱۴؎

جانِ اُردو۔ ہندی اُردو کی حقیقت محاورے کی پہچان لفظوں کا صحیح استعمال مثال کے طور پر مختصر جملے ۶؎

زباندانی۔ اردو زبان سکھانے والی بہترین کتاب مبسوط اور مستند قواعد ادب اردو پر تنقید ۶؎

اصلاح زبان اُردو۔ متروک الفاظ اور محاورات کی تحقیق عہد ناسخ سے امیر مینائی تک متروک محاورے ۶؎

ترجمان پارسی۔ فارسی سے اردو بنانے والی آسان کتاب جملوں کے ترجمے فارسی کے اصول اور قواعد ۶؎ **قواعد میر۔** ملک الشعرا امیر دہلوی کی قواعد جو مولف کو ملے ہیں زباندانی کا بہترین دستور العمل ۶؎

مضمون نویسی۔ انشا پردازی اور عبارت لکھنے کے صحیح اصول قواعد صرف نحو سے بتانے والی کتاب ۸؎

المشتہر منیجر عشرت بکڈپو احاطہ خانساماں لکھنؤ

مستقبل کی علمی ترقی

(ایچ - جی ویلز کی نگاہ سے)

سائنس کی آئندہ ترقیوں اور مستقبل کی ممکن ایجادات کے متعلق حکم لگانا نہایت دلچسپ مسئلہ ہے، لیکن دشوار بھی ہے - اور اُسے دشوار ہونا بھی چاہیئے، کیونکہ میرے ایک دوست کے بقول " یہ اُن چیزوں کے متعلق قیاس آرائی ہے جن کو ایک عرصہ تک سوچا بھی نہیں جائے گا " لیکن مجھے اس خیال سے کلیۃً اتفاق نہیں ۔ کیونکہ مستقبل کی اختراعات کا سایہ ابھی سے پڑنے لگا ہے

گزشتہ صدی میں طبعی اور کیمیاوی معلومات کی وجہ سے بے شمار میکانکی ایجادات معرض ظہور میں آئی ہیں اور انسانی تاریخ میں یہ دور ایجاد و اختراع کا دور سمجھا جاتا ہے - جراحی اور طب میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے - لیکن اس کا ارتقاء زیادہ تر کیمیاوی اور طبعی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ہے - علم حیوانات اور علم تشریح الابدان میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے - اور گو اس سے مذہبی اور اخلاقی معتقدات میں کافی تبدیلی ہو گئی ہے، لیکن اس سے انسانی معاملات میں کوئی ایسا عملی انقلاب پیدا نہیں ہوا، جیسا کہ طبعی علم نے پیدا کیا ہے - جب ہم ایجادات اور سائنس کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہیں - تو اس سے جہاز، بڑی مشینیں، ریل، بجلی - لاسلکی اور طیارے مراد ہوتے ہیں - اور جب ہم مستقبل کے متعلق سوچتے ہیں - تو ہم سمجھتے ہیں - کہ اوس وقت دنیا میں اس سے بھی زیادہ میکانکی ترقی ہو چکی ہوگی - لیکن یہ ایک عام غلطی ہے، جس کا ارتکاب ہم سے اس لئے ہوتا ہے کہ ہم موجودہ واقعات کے ارتقاء کی رفتار کو ایک مستقل چیز فرض کر لیتے ہیں - درانحالیکہ بہت ممکن ہے، کہ ابھی کافی عرصہ تک کوئی قابل ذکر میکانکی ایجاد ہی نہ ہو

یہ صحیح ہے، کہ موجودہ ایجادات میں نمایاں تبدیلی ہوگی، یعنی ممکن ہے کہ ریل گاڑی کا استعمال ہی بند ہو جائے اور اغلباً آئندہ نصف میں ایسا ہی ہوگا - کیونکہ ہوائی جہاز اس کی جگہ لے لیگا اسی طرح ممکن ہے - کہ اس وقت ہم لاسلکی کے ذریعہ سے آواز اور تصاویر کو بھی منتقل کر سکیں گے، اور قطبین کا جائزہ لے کر ان کا نقشہ بھی تیار کر لیں گے، لیکن ہوائی جہاز سے بہتر کوئی چیز نہیں بن سکے گی، زیادہ سے زیادہ ہوائی جہاز بہت بہتر قسم کے بننے لگیں گے - اسی طرح لاسلکی سے بہتر کوئی چیز ایجاد نہ ہو گی - البتہ سرعت انتقال اس کی بڑھ جائے گی

بعض حضرات کو یہ دعوے غالباً توقعات کے خلاف معلوم ہوگا، اور وہ کہیں گے کہ " ان تمام ایجادات کا

کیا حشر ہوگا۔ جن کے متعلق ہم اس وقت سن رہے ہیں ؟ آئین سٹائن کے نظریہ کا کیا انجام ہوگا ؟ قوتِ مادہ کیا ہوگی ؟ "

میرے خیال میں یہ اس بہار کے پھول ہیں، جس کی فصل شائد کئی سو سال کے بعد تیار ہوگی۔ ہرچند آئین سٹائن نے غور و تفکر کا ایک نیا اور آزاد طریقہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ لیکن حیات انسانی پر بہت جلد اس کا کوئی عملی اثر نہیں ہوسکتا۔ قوتِ مادہ کے استعمال کے متعلق بہت سی بے بنیاد باتیں کی جارہی ہیں۔ اور گویہ باتیں ایک دلکش فسانہ کی حیثیت سے کافی دلچسپ ہیں۔ لیکن مستقبل قریب میں ان پر بحث کرکے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ ہمیں معلوم ہوچکا ہے۔ کہ ہماری دنیا کے اکثر عناصر بہت سست رفتار سے تحلیل ہو رہے ہیں۔ اور ان کی تحلیل یقیناً ایک اہم کامیابی ہے۔ ہم ادویات میں ریڈیم کی قوت سے نہایت بھدے طور پر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کیونکہ آج تک کوئی آدمی یہ نہیں بتا سکتا۔ کہ یہ قوت کیسے پیدا ہو رہی ہے۔ یا اس کو زیادہ اور کم کیسے کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ سائنس کے پاس آئندہ ایجادات کے لیے امید کے سوا اور کوئی معقول وجہ نہیں

ہماری دنیا میں کشش ثقل اور تحلیل عناصر کی خصوصیات موجود ہیں۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں۔ کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے یہ مسائل کیمیا اور طبعیات کے بڑے بڑے عالموں کے لئے بھی ایسے ہی معما ہیں۔ جیسے یہ ہم عام لوگوں کے لئے ہیں

ممکن ہے کسی دن ان مسائل کا حل ذہن انسانی میں آجائے، اور اُس وقت انسان اپنی کامیابی کا اعلان کرسکے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ قوتِ مادہ اور ایسے ہی دیگر مسائل کا حل اس وقت تک انسان نہیں سمجھ سکیگا۔ جبتک کہ آئین سٹائن۔ کیوری اور سوڈی کے نام اتنے ہی فرسودہ نہ ہو جائیں گے۔ جتنے کہ آج کل آرشمیدس اور ہیرو کے ہوچکے ہیں۔ ہیرو نے ٹربائن سٹیم انجن کا خاکہ اس کے ایجاد ہونے سے ۱۹ سو سال قبل تیار کیا تھا، ارسطو کے وقت میں رگڑ سے پیدا ہونے والی بجلی کے خواص معلوم ہوچکے تھے، لیکن علم کے ان پھولوں سے کئی صدیوں کے بعد اثمار حاصل کئے گئے

میرے خیال میں گزشتہ سو سال کی علمی کاوشوں کے تقریباً تمام نتائج ہم حاصل کرچکے ہیں۔ اور مزید نتائج اغلباً کافی عرصہ کے بعد برآمد ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں علمی خیالات کے نتائج کا ایک اور رُخ کا مطالعہ کرنا چاہیئے

گزشتہ صدی سائنس کی مادی کامیابی کے لئے نہایت اہم ہے۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ موجودہ صدی اور آیندہ اکیسویں صدی میں نفسیات اور علم تشریح میں کافی ترقی ہوگی۔ انسان دنیا کے اس سرے سے نے کر اس سرے تک گھوم کر اور دنیا کے گرد سات آٹھ دن میں طیارے کے ذریعہ چکر لگا کر اپنی ذات کے متعلق سوچنا شروع کردے گا۔ اور عملی طور پر اپنی توجہ اپنے آپ پر مرکوز کردے گا

بدقسمتی سے ان دنوں جب کوئی آدمی عام علم نفسیات کے متعلق ذکر کرنا شروع کرتا ہے۔ تو اُسے واضح کرنا پڑتا ہے کہ علم نفسیات سے اس کی مُراد روحوں یا مُردوں سے باتیں کرنا ہیں۔ یعنی وہ علم تحلیل روح کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

ممکن ہے۔ کہ ان حکایات میں ماہرین نفسیات کے لئے کوئی دلچسپی ہو۔ لیکن میرے نزدیک یہ قصے نہایت بیہودہ ہیں کیونکہ ان سے انسانی دماغ کا کوئی روشن پہلو سامنے نہیں آتا

گزشتہ تیس سال سے میں دور خیالی اور روحوں کے تجربات میں دلچسپی لے رہا ہوں، کچھ عرصہ تک میں ایک ایسی سوسائٹی کا بھی رکن رہا ہوں۔ جو ان تجربات میں دلچسپی لیتی تھی۔ اور اس عرصہ میں میں نے مختلف کتب کا مطالعہ بھی کیا ہے، اور ڈبلیو۔ ٹی۔ سٹیڈ مرحوم۔ آرتھر کانن ڈائل اور سر الیور لاج کی حکایات کو سنا ہے۔ لیکن ہر صورت میں میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں، کہ ان کاوشوں میں شمّہ بھر بھی حقیقت نہیں۔ اور یہ تمام باتیں دھوکہ۔ جعلسازی اور خود فریبی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اور اُن دماغوں کو دھوکا دینے کے لئے کی جاتی ہیں۔ جو جادو اور طلسم کے پُرانے قصوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ہے۔ میں روحوں کی گفتگو، معمول کی اطلاعات اور میز پر خود بخود رونما ہونے والی تحریروں کے شعبدہ کی حقیقت کو سمجھتا گیا ہوں، اگر پھر موقعہ ملا، تو میں تحلیل روح پر بھی کچھ لکھوں گا،

موجودہ وقت کی سائنس میں اُمید افزا چیز صرف انسانی دماغ کا مطالعہ ہے۔ جو بیشتر تحلیل نفسی پر مشتمل ہے تیس سال قبل جب میں نے یونیورسٹی سے سند لی تھی، علمِ نفسیات بالکل ابتدائی حالت میں تھا، دماغی اصولوں کو تفکر، احساس اور خواہش میں تقسیم کرکے علم نفسیات ختم ہوجاتا تھا۔ اور احساسات کا عمل ایسے سادہ طریقہ سے بیان کرکے ختم کردیا جاتا تھا۔ گویا کہ وہ کوئی بالکل معمولی عمل ہے۔ حالانکہ ہافڈنگ اور ولیم جیمز کی تصنیفات کے مطالعہ سے مجھ پر یہ روشن ہوا۔ کہ یہ عمل نہایت ہی پیچیدہ ہے

اس وقت سے اب تک علمِ نفسیات میں بے شمار ترقی ہوچکی ہے۔ گزشتہ تیس چالیس سال میں نفسیات کی بالکل نئی بنیادیں قائم کی گئی ہیں۔ علم طبیعیات کی طرح اُن بنیادوں کو قائم کرنے کے لئے بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ لیکن جدید علم نفسیات کا صحیح آغاز "فرائڈ" اور "جنگ" کی تصنیفات سے ہوتا ہے ان دونوں اصحاب کا نام تاریخ نفسیات میں اسی اہمیت کے ساتھ باقی رہے گا، جیسے کہ گلبرٹ یا نیوٹن یا فیریڈے کا نام اپنے اپنے علوم کی وجہ سے مشہور رہے۔ یہ تمام لوگ مجتہد تھے، ان لوگوں نے اس سخت زمین میں کاشت کی، جو بنجر پڑی ہوئی تھی۔ اور جس سے اب علوم کے خزانے اُبل رہے ہیں

ان لوگوں نے ہمیں بنی نوع انسان کی خواہشات و نظام ادراک کے متعلق نیا اور حوصلہ افزا نظریہ قائم کرنے میں مدد دی ہے۔ انھوں نے ہمیں صحیح طور پر سمجھا دیا ہے۔ کہ لوگ کیوں اور کیونکر سوچتے اور کام کرتے ہیں، انھیں کیوں چند کام آسان اور دلکش معلوم ہوتے اور چند دشوار و ناگوار۔ وہ کیوں ایک واقعہ پر اعتبار کرلیتے ہیں اور کیوں دوسرے پر اعتبار نہیں کرتے۔ اور اُن کی شعوری زندگی کس طرح غیر شعوری زندگی کے دھارے پر بہتی جارہی ہے۔ یہ ایسی معلومات ہیں، جن کے متعلق نصف صدی قبل انسانی ذہن بالکل خالی تھا، لیکن اب اس کے متعلق ہمارے علم میں کافی اضافہ ہوا

ہے، صرف انفرادی ذہن کے متعلق نہیں، بلکہ جماعات کے ذہن کے متعلق بھی - یہ نئے طریقے - نئے نظریے اور نئے علوم انسانی ذہن کے ارتقا اور سرگرمیوں کے متعلق ہمارے ابتدائی خیالات میں کافی ترمیم کر چکے ہیں اور اس ترمیم سے ہم لازمی طور پر انسانی ذہن میں بالکل ایسی ہی تبدیلیاں کریں گے - جیسی کہ بجلی اور بھاپ کے وجود سے وسائل حمل ونقل میں پیدا ہو گئی ہے

میرے خیال میں آئندہ سو سال کا زمانہ لازمی طور پر علمی نفسیات کا دور ہوگا - اور اس کے ساتھ ہی علم تشریح الابدان میں بھی کافی ترقی ہوگی - کیونکہ اس علم کا علم نفسیات سے گہرا تعلق ہے - اس سے انسانی مسائل میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوگا - اور اس مادی انقلاب سے زیادہ مستقل اور مفید انقلاب ہوگا - جس کو کہ ہمارے آبا و اجداد نے یا ہم نے دیکھا ہے

گذشتہ صدی کے مادی انقلاب نے شہروں، دیہات اور تقسیم آبادی پر جو اثر ڈالا ہے - وہ ریلوں - پلوں - انجنوں - گیس کے کارخانوں - اور بجلی کے کاروبار کی صورت میں ظاہر ہوا ہے - لیکن مستقبل کا انقلاب سطح ذہن میں تلاطم کی صورت میں ظاہر ہوگا - یہ ایک ایسے فن کی ایجاد ہوگی، جو قدیم معتقدات کو باطل قرار دے گی، اور اپنے شائقین کو قدیم پابندیوں سے آزاد کر کے نفسیاتی نقطۂ نظر سے قانونی سیاسی - اقتصادی - اور مالی مسایل کا نیا مفہوم قائم کرنے میں مدد دے گی - اس سے دنیا کے ہر ادارہ کے افراد میں ایک وسیع تعلق پیدا ہو جائے گا، چنانچہ اب بھی یہ خیالات کئی معتمد اداروں کی طرف سے پیش کئے جا رہے ہیں - اور ہمارے بہترین قانوندان مسائل پر غور کر رہے ہیں

اب تک ہمارے تعلیمی ادارے اس تعلیم کی تدریس میں مشغول رہے ہیں - جو حقائق زندگی سے کوسوں دور تھی، تعلیمی اداروں کا یہ دعوے ہے - کہ وہ اچھے شہری پیدا کر رہے ہیں - لیکن حقیقت صرف یہ ہے - کہ انھوں نے انسان میں مقابلہ کا جذبہ پیدا کر دیا ہے - لیکن انھیں جنگ کے لئے ضروری سامان بہم نہیں پہونچایا، جس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک انسانی ارادوں کے متعلق کوئی نظریہ قائم نہیں کیا گیا - ہماری اقتصادی، مالی اور سماجی زندگی اس نظریہ کے قائم ہونے کے بغیر ترقی کر رہی ہے - لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ اتفاقی ترقی ان مبہم خیالات کے ساتھ ہوتی رہے اور پھر ہمارے اس عروج کو دوام بھی حاصل ہو - انسانی عقل اس کی مخالف ہے اور بالآخر فتح عقل ہی کو حاصل ہوگی - آج تمام دنیا مختلف حصوں میں تقسیم ہو کر اپنی بنیادیں مستحکم کر رہی ہے - لیکن یہ جداگانہ استحکام کسی کام کا نہیں - ہمارے تعلیمی ادارے لوگوں کو منظم زندگی کی تعلیم نہیں دے سکتے - کیونکہ ان حالات میں زندگی منظم رہ ہی نہیں سکتی

لیکن یہ صورت حالات ہمیشہ یوں نہیں رہے گی، ذہین اُستاد کا ذہن اپنے غیر مفید فرایض کے خلاف بغاوت کرتا ہے - اُسے اپنے شاگردوں کو غیر منظم دنیا میں بھیجنا پسند نہیں - لیکن وہ محسوس کرتا ہے - کہ وہ اس وقت تک مؤثر طور پر تعلیم نہیں دے سکتا - جب تک اسے اس زندگی کا مفہوم واضح طور پر معلوم نہ ہو جائے - جس کی وہ تعلیم دینا چاہتا ہے - جب ہم سماجی انصاف اور تعلقات کے متعلق اپنے خیالات کو نیا جامہ پہنائیں گے - تو ہمارے تعلیمی ادارے بھی

تبدیل ہو جائیں گے۔ اور تعلیم کے نئے مقاصد پورے ہوا کریں گے۔ علمی نفسیات کا وہ ارتقاء جو اُستاد کو مکتب میں خیالات اور ارادوں کی تربیت کرنے میں مدد دے گا۔ وہی ارتقاء مکتب سے باہر کی دنیا کے سامنے سماجی اور سیاسی تنظیم کا ایک نیا مفہوم پیش کرے گا۔ جو انسانی ارادوں کے عین مطابق ہوگا۔ اور جس سے ہم اس وقت بالکل بے خبر ہیں

یہ امر تعجب خیز ہے، کہ لوگ انسانی صورت حالات میں طبعی انقلاب کے علی الرغم ذہنی انقلاب کو بہت دشوار سمجھتے ہیں۔ اگر ہم کسی سے یہ کہدیں۔ کہ تعطیل منانے کے لئے لوگ مستقبل قریب میں چاند میں جایا کریں گے۔ یا انسانی حیات کا امتداد ڈیڑھ سو سال تک ہو جائے گا۔ تو وہ اس پر مطلقاً متعجب نہ ہوگا۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں۔ کہ دنیا میں ایک ایسی تعلیم رائج ہوگی اور ایسا سماجی اور اقتصادی نظام قائم ہوگا۔ جس کی موجودہ اقتصادی اور سیاسی نظام سے وہی نسبت ہوگی، جیسی کہ موجودہ زمانہ کے عالیشان محل اور زمانۂ قدیم کے جھونپڑے میں نظر آتی ہے تو وہ اس کو باور نہ کرے گا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ مکتب ہمیشہ موجودہ وقت کے مکتب کی طرح نہایت خستہ مقام ہوگا۔ اور استاد غیر موثر انداز میں کم تنخواہ پر اپنی بدمزہ زندگی کے مکروہ فرایض ادا کر رہا ہوگا۔ ان کا ایمان ہے۔ کہ آجکل کیطرح ہمیشہ دنیا میں جنگ۔ جرم اور ناکامیوں کا وجود باقی رہے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ ذہنی تعلقات کے علوم کا استعمال دنیا کی تمام چیزوں میں صحیح اور مکمل انقلاب پیدا کردے گا۔ اور یہی مسئلہ ہماری موجودہ نسلوں کے سامنے ہے

جب یہ پیشین گوئی کی جاتی ہے۔ کہ مستقبل قریب میں حیاتِ انسانی پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جس میں لوگوں کا طرز زندگی موجودہ طرز سے مختلف اور بہتر ہو جائے گا، تو اکثر آدمی یہ کہتے سنے جاتے ہیں۔ "تم انسانی فطرت کو تبدیل نہیں کرسکتے" یہ مقولہ اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔ لیکن اس کا ہمارے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ تم صرف انسان ہی کی فطرت کو تبدیل نہیں کرسکتے۔ بلکہ کسی چیز کی بھی فطرت کو نہیں بدل سکتے۔ لیکن ہم نے گزشتہ سو سال میں فطرت کی مدد سے ہزاروں چیزیں تخلیق کی ہیں۔ جن کا علم قبل ازیں ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اور اسی طرح آئندہ صدیوں میں ہم فطرت انسان کی مدد سے اور ہزاروں کام کریں گے، جو ہم اس وقت نہیں کرسکتے

چونکہ مجھے یقین ہے۔ کہ نفسیات میں ایک ایسی تجدیدی اور تخلیقی قوت پنہاں ہے، جو انسانی ارادوں میں نمایاں تبدیلی پیدا کرسکتی ہے۔ اس لئے میں موجودہ قوانین، مدرسوں۔ قومی جھنڈوں۔ سیاسی مجالس اور اقتصادی طریقوں کو بنظر حقارت دیکھتا ہوں۔ کیونکہ انہی سے موجودہ وقت میں ہمارے شب و روز تاریک نظر آتے ہیں۔ میں اس مسئلے کے متعلق بالکل اسی طرح سوچ رہا ہوں، جیسے گزشتہ صدی کے وسط میں ایک امریکن بھوک اور پیاس کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا اپنی گاڑی کو دھکیل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لئے جا رہا تھا، اور دفعتہً اُسے ایک ایسی گاڑی بنانے کا خیال آگیا۔ جو اُسے اور اُس کے ورثا کو دوران سفر میں بادوباراں کے طوفان سے محفوظ رکھنے والی تھی۔ موجودہ زمانہ میں جب کہ انسان سامان

معیشت کی قلت، کاروبار کی سرد بازاری، سیاسی عناد، ملکی تنازعات اور آئندہ جنگ کی افواہوں سے تنگ ہو رہا ہے، مجھے انسانی دورِ حیات کے افق سے ایک ایسا آفتاب طلوع ہوتا ہوا نظر آرہا ہے جس کی ضیاء عالمگیر امن، کافی اسباب ضروریات تموّل اور راحت کا سامان، بہم پہونچائے گی۔ اور یہ تمام باتیں صرف نفسیات کی تحقیق اور اس کے نتائج کی عملی پیروی سے معرضِ ظہور میں آئیں گی

میں انسانی معاملات پر نئے اور ترمیم شدہ علمِ نفسیات کے ممکن اثر کو زیادہ واضح طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں پہلے اس مسئلہ پر غور کرو۔ کہ ہم مختلف فرقوں کے آدمیوں میں کس طرح امن قائم رکھتے ہیں اور اوامر و منہیات کے متعلق اس طرح سمجھوتہ کرتے ہیں۔ ہم یہ مقصد قانون قانونی عدالتوں اور پولیس کی مدد سے حاصل کرتے ہیں۔ لیکن جو قانون ہمیں اس طرح جکڑے رکھتا ہے یہ قدیم اور فرسودہ روایات کا ایک پیچیدہ سا نتیجہ ہے۔ قانونی کارروائی روایات، عدم توجہی اور کاہلی کا مرکب ہے بیرسٹروں گواہوں اور عدالت میں اپنے رفقاء سے سلوک وحشیانہ رویہ کا مظہر ہے۔ قانون کے طریقوں پر کئی صدیوں سے مؤثر نظر ثانی نہیں کی گئی۔ قانونی عدالت ہمیں ازمنۂ وسطےٰ کی یاد دلاتی ہے۔ وہی سترھویں صدی کے گون اور وگ اپنی فرسودگی کی نمائش کرتے ہوئے ہیں۔ وکلا ماضی کی جسمانی تکالیف کو اب بھی برداشت کر رہے ہیں۔ دنیا کا اور کوئی پیشہ ور اُن تنگ۔ غلیظ اور تاریک دفاتر میں کام کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ جن میں وکلا کام کر کے محظوظ ہوتے ہیں۔ اگر اُن کی حالت سترھویں صدی کے مرغی خانہ سے کسی طرح بہتر نہیں۔ جن آدمیوں نے ان چیزوں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ میرے اس خیال سے متفق ہوں گے۔ کہ ہمارے قید خانے بھی انسانوں کی روحوں کو تباہ کرنے کے آلات ہیں۔ اور اُن عدالتوں سے بھی قدیم تر ہیں۔ جو قیدیوں کو یہاں بھیجتی ہیں۔ انسانی جرائم کے متعلق ہماری عدالتوں کا نظریہ کسی طرح بھی قدیم بابلیوں کے نظریہ سے مختلف نہیں

آدمی جرم کا ارتکاب کسی فطری قساوتِ قلبی کی وجہ سے نہیں کرتے۔ جائداد کے متعلق جو جرم کئے جاتے ہیں۔ اُن کا اگر تجزیہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ وہ بیشتر غربت اور اقتصادی مشکلات کے خوف کی وجہ سے کئے جاتے ہیں۔ بہت سے قتل اور تشدد کے جرم رقابتوں اور اُن ناقابل برداشت حالات کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ جنھیں ہمارے بُرے قوانین ازدواج پیدا کرتے ہیں۔ ناگوار زندگی کو گذارنے سے خواہ مخواہ اس کے خلاف نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور قید خانے میں آنے والے بہت سے جرائم درحقیقت انسانی مایوسیوں کی وجہ سے کئے جاتے ہیں۔ اگر ہم ان مایوسیوں کا سدِّباب کر سکیں۔ تو جرائم کی تعداد یقیناً بہت کم ہو جائے گی۔ علمِ نفسیات کی تحقیق ہمارے دعاوی کی تائید کرتی ہے۔ اور انسانی مشکلات کا حل ہمارے سامنے پیش کر رہی ہے

یہ خیال مضحکہ خیز ہے، کہ حالات کی موجودہ سطح کو دوام حاصل ہے۔ یہ فرض کر لینا بھی مضحکہ خیز ہے۔ کہ علمِ نفسیات کے روز افزوں اضافہ کے باوجود انسان، تعمیری طور پر سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کا بہتر حل نہ سوچ سکے گا۔ مجھے یقین ہے۔ کہ جس طرح آجکل کے وسائل حمل ونقل میں سہولتیں بہم پہونچائی جا رہی ہیں اسی طرح کسی دن انسانی ذہن و شعور ان

تاریخ قدیم کا ایک ورق مجہول

(ہیکلِ عشتروت پر ذبحِ حسن وجمال)

آہ، آہ، آہ۔۔۔۔۔!

کاہن اعظم " آرام " اپنے حجرہ میں ساکت ومطمئن بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتہً اس آواز نے اُسے چونکا دیا۔ یہ اس کی بیٹی " زامورہ " کی آواز تھی

وہ گھبرا کر حجرہ سے باہر نکلا اور دوڑتا ہوا " ہیکلِ عشتروت " کے اس حصہ کی طرف گیا جہاں سے یہ آواز آرہی تھی ـــــ " زامورہ " ہیکل کے سامنے سربسجود پڑی ہوئی رو رہی تھی اور اپنے اُن ہاتھوں سے، جو دیوی " عشتروت " کے مرمری قدموں کی طرح سفید وخوبصورت تھے، معبد کے زینوں کو چھُو چھُو کر، بیتابانہ کراہ رہی تھی

" آرام " نے اپنی محبوب بیٹی کو اٹھایا اور اس کے سر کو چوم کر پوچھنا چاہا کہ یہ اضطراب کیوں ہے، لیکن اس کا گریہ بدستور جاری تھا۔ اور دیوی سے مخاطب ہو کر وہ برابر یہی کہتی جارہی تھی کہ " اے محبت وانتقام کی دیوی، میں وہی کروں گی جو تیرا حکم ہے اور سرِ مو تیرے فرمان سے انحراف نہ کروں گی "

" آرام " کچھ دیر تک اسی حال میں اس کو دیکھا کیا اور پھر پوچھا کہ " اے بیٹی اس گریۂ وزاری کا کیا سبب ہے "

زامورہ نے آنسو پونچھتے ہوئے ایک ایسے بشرہ کے ساتھ جس کی شفاف جلد سے خون اس طرح جھلک رہا تھا گویا کہ کسی ساغرِ بلور میں رنگِ شباب بھر دیا گیا ہے، جواب دیا کہ :-

" اے میرے محترم باپ، تو نے مجھے اپنے بھتیجے " عارام " کے ساتھ نامزد کر دیا ہے اور تو چاہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو اس کی آغوش میں سونپ دوں، لیکن باور کر کہ جس وقت سے میں نے تیرا یہ فیصلہ سنا ہے، ایک لمحہ کے لئے مجھے چین نہیں ملا اور حیران ہوں کہ کیونکر میں تیری مرضی پر چل سکوں گی، جبکہ میرا دل اس کی طرف کسی طرح مائل ہی نہیں۔ پھر اے میرے مقدس باپ، تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ صرف مجھی کو اس تعلق سے اختلاف نہیں، بلکہ " دیوی عشتروت " بھی اس کو پسند نہیں کرتی جس کا تو خادم ہے "

وہ اسقدر کہکر خاموش ہو گئی کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کا باپ یہ سنکر سخت برہم ہوگا، لیکن جب اس کا یہ خیال غلط نکلا اور کاہن اعظم اسی طرح شفقت ومحبت کی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا تو اس نے پھر کہنا شروع کیا :-

" تو معبدِ " عشتروت " کے خادم اور معابد " ببلوس " میں سرزمین فنیقیا کے سب سے بڑے کاہن ہونے کی حیثیت سے واقف ہے کہ جب کوئی مصیبت انسان پر نازل ہو تو دیوی " عشتروت " سے مدد چاہنا ضروری ہے "

آرام نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ـــــ " بیشک ، کیونکہ " عشتروت " دیوی سے زیادہ صائب الرائے کوئی دیوی نہیں "

زامورہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :-

" اے میرے محترم باپ ، میں نے ہمیشہ تیری اس نصیحت پر عمل کیا اور اس مرتبہ بھی جب کامل تین راتیں کرب و اضطراب میں بسر ہوگئیں تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ دیوی " عشتروت " سے فریاد کروں اور اس کے ارادہ و حکم کو معلوم کرکے اس پر کاربند ہوں "

آرام ـــــ " اے میری بیٹی ، سچ بتا ، کیا دیوی نے تیری فریاد کو سُنا ، کیا اس نے کوئی جواب دیا ؟ "

زامورہ ـــــ " ہاں سُنا اور جواب دیا ـــــ رات میں نے دیکھا کہ دیوی " عشتروت " ایک ہالۂ نور میں محصور میرے سامنے نمودار ہوئی اور بولی کہ " اے زامورہ اپنی قوم میں سے تو کسی کو اپنا شوہر نہ بنا ، کیونکہ تو یا تو سکندر مقدونی کی آغوش میں جائے گی یا پھر میرے ہیکل پر اپنی قربانی پیش کرے گی "

یہ کہکر زامورہ خاموش ہوگئی اور اپنے باپ کا چہرہ دیکھنے لگی ۔ لیکن جب وہ خاموش رہا تو اس نے پھر اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ

" اے باپ ، تو نے سُن لیا جو دیوی " عشتروت " نے حکم دیا ہے اور کیا اس کا یہ فرمان میرے لئے واجب العمل نہیں "

کاہن اعظم نے اپنا سر اُٹھایا اور بیٹی کی پیشانی کو بوسہ دے کر کہا کہ ـــــ " بیشک واجب العمل ہے اور اس وقت سے تو صرف دیوی " عشتروت " کی ملکیت ہے ۔ تو معبد میں داخل ہوجا اور اس وقت تک باہر نہ نکل جب تک اسکندر مقدونی اس ہیکل کے اندر تجھے اپنی آغوش کی زینت نہ بنائے "

زامورہ نے اپنے باپ کے ہاتھوں کو چوم کر کہا کہ :-

" اے باپ ، دیوی کے آخری فقرے یہ بھی تھے کہ تو اسی ہیکل میں قیام کر یہاں تک کہ فاتح اعظم آکر تجھے اپنی بیوی بنائے لیکن یہ یاد رکھ کہ اگر وہ اس سے قبل مرگیا ۔ اور تجھے اس کا مردہ دیکھنا پڑا تو اسی دن تجکو میرے ہیکل پر اپنی قربانی چڑھانا پڑے گی "

قبل مسیح ۳۲۴ سال کا زمانہ ہے

اسکندر مقدونی ، دیار ہند سے ارض فارس کی طرف واپس آیا ہے ۔ نئے ملکوں اور نئی قوموں کو مفتوح و مغلوب کرنے کی مسرت میں دس ہیکل یونانی دیوتاؤں کے طیار کرا چکا ہے ـــــ اس کا خیال ہے کہ کم از کم ایک سال کے لئے اپنی فوجوں کو آرام دے تاکہ پھر وہ زیادہ جوش و قوت کے ساتھ کام کرسکیں ۔ خود بھی سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لئے گوشۂ امن و عافیت کا طلبگار ہے کہ دفعتہً بیمار پڑتا ہے اور بارہ دن کے اندر وہ حقیقی سکون اس کو نصیب ہوجاتا ہے جس

بعد پھر کسی اضطراب سے واسطہ نہیں پڑتا

فوجیں چاروں طرف احاطہ کئے ہوئے ہیں، حکما و اطبا کا ہجوم ہے، دعا اور دوا سبھی کچھ ہو رہا ہے، لیکن اس کی حالت کسی طرح نہیں سنبھلتی، ضعف بڑھ رہا ہے۔ نبض ساقط ہو رہی ہے۔ اور عین عالم شباب میں جبکہ اس کی عمر صرف ۳۳ سال کی تھی۔ تیرہ سال کی حکمرانی و مُلک گیری کے بعد دم توڑ رہا ہے۔ آخری الفاظ وصیت اس کی زبان سے یہ نکلتے ہیں:-

"میری لاش کو فینقیا میں جبیلوس کی طرف لیجایا جائے، دریائے اڈونیس کے مقدس پانی سے اس کو غسل دیا جائے اور پھر دس دن تک لوگوں کی زیارت کے لئے اس کو کھلا ہوا چھوڑ کر مصر لیجا کر جوار آمون میں دفن کر دیا جائے"

ارباب فن نے پورے دو سال تابوت اور اس مرکب کی طیاری میں صرف کر دئے جس کے ذریعہ سے سکندر کی لاش کو اس کے مدفن تک لیجانا تھا اور ۳۲۲ء قبل مسیح میں براہ فینقیا، بابل سے مصر کی طرف روانگی ہوئی۔

اس دن کی صبح جب سکندر کی لاش فینقیا پہونچنے والی تھی، عجیب ہنگامہ کی صبح تھی، گوشہ گوشہ میں بآواز دہل اعلان کیا جا رہا تھا کہ دارا کو مغلوب کرنے والے اور دیار ہند کو فتح کرنے والے سکندر مقدونی کا جنازہ حدود فینقیا میں پہونچ گیا ہے اور ۶۴ بیل اس گاڑی کو کھینچ رہے ہیں جس پر اس کا تابوت رکھا ہوا ہے

لوگ، پہاڑوں سے، وادیوں سے، تمام قریہ و بلاد سے جوق در جوق چلے آرہے تھے اور اپنے ہاتھوں میں نہر اڈونیس کے مقدس پانی کے ظروف لئے ہوئے تھے تاکہ اس کی لاش پر چھڑک کر ثواب حاصل کریں

جنازہ بلند دیواروں کے سایہ سے گزرتا ہوا کوہستانی راستہ سے اس مقام پر پہونچا۔ جہاں نہر مقدس کے پانی سے اس کو غسل دیا جانا تھا اور پھر وہاں سے ہیکل عشترُوت میں لایا گیا۔ جہاں دس دن تک لوگوں کی زیارت کے لئے اس کو کھلا ہوا رکھا جانا تھا

مصر کا بادشاہ ملک بطلیموس ایک جرار فوج کے ساتھ استقبال کے لئے آیا تاکہ لاش کو پورے احترام کے ساتھ مصر تک لیجائے، اور فینقیا کے تمام کاہن اور امراء، سرداران چشم اشک آلود کے ساتھ مجتمع ہوئے تاکہ فاتح اعظم کی لاش کے سامنے اپنی محبت کے آخری آنسو پیش کر سکیں۔ اس طرح معابد تموز و عشترُوت کی حسین کاہن زادیاں اپنے اپنے حجروں سے باہر نکل کر دوڑ پڑیں کہ دنیا کے اس جلیل القدر بادشاہ کی لاش کو دیکھ سکیں جس کے بازوؤں میں دیوتاؤں کی قوت موجود تھی۔ انھیں میں ایک زامورہ بھی تھی جو ایک بیوہ کے پورے سوگ کے ساتھ آنسو بہاتی ہوئی تابوت کی زیارت کے لئے جا رہی تھی

چونکہ زامورہ کے متعلق دیوی عشترُوت کی بشارت کا علم ساری دنیا کو ہو چکا تھا، اس لئے وہ ہر جگہ "محبوبۂ سکندر" کے نام سے مشہور ہو گئی تھی

زامورہ نے انتظار کا یہ زمانہ انتہائی خشوع وخضوع میں بسر کیا، وہ روزانہ صبح کو پہاڑ کی چوٹی پر جاکر پھول جمع کرتی تاکہ معبد موز پر لاکر چڑھائے اور اس کے بعد سارا وقت ہیکل کے اندر بخور روشن کرنے اور التجا و دعا میں صرف کر دیتی وہ دیوی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتی اور اپنے بلور ایسے عریاں سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا کرتی کہ اے دیوی وہ ساعت کب آئے گی جب سکندر مجھے آغوش میں لے گا

دیوی ان التجاؤں کا کوئی جواب نہ دیتی، لیکن آخر کار ایک دن اس نے اپنا سنگین سکوت توڑا اور زامورہ سے کہا کہ "سکندر کی لاش سرزمین فراعنہ میں دفن ہونے کے لئے اس طرف سے گزرنے والی ہے، اس لئے جس دن تیری نگاہ اس کی لاش پر پڑے گی، میں تجھ سے تیری قربانی چاہوں گی، کیا تو اس کے لئے طیار نہیں؟"

زامورہ نے منہ کے بل گر کر روتے ہوئے کہا کہ "اے دیوی، میں طیار ہوں، کیونکہ جب سکندر کی آغوش میں نہ آئے تو پھر تیرے سنگین پہلو سے زیادہ راحت اور کہاں مل سکتی ہے"

کاہن اعظم نے زامورہ سے کہا۔۔۔ "اے بیٹی، کیا واقعی دیوی عشتروت کی یہی مرضی ہے، تجھے دھوکا تو نہیں ہوا"

زامورہ نے جواب دیا۔۔۔ "اے باپ، مجھے دھوکا بالکل نہیں ہوا، میں نے اس کا یہ فرمان صاف وصریح الفاظ میں سنا ہے۔ میں آج سکندر کی لاش دیکھ چکی ہوں، اس لئے دیوی کے حکم کی تعمیل ہونی چاہئے۔ کیا کاہن عشتروت ہونے کی حیثیت سے تجھے اس میں پس وپیش کرنا چاہئے"

زامورہ نے یہ کہا اور اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ کر قربان گاہ عشتروت پر لیجا کر اس طلائی خنجر کی طرف اشارہ کیا جو اسی رسم ذبح وقتل ادا کرنے کے لئے مخصوص تھا

کاہن متردد تھا، اس کا دل دھڑک رہا تھا اور وہ حیران تھا کہ اپنی جمیل نوجوان بیٹی کے گرم خون کو کیونکر اپنی نگاہوں کے سامنے بہتا ہوا دیکھے گا۔۔۔۔ زامورہ نے خنجر اٹھا لیا اور اس کا قبضہ باپ کی طرف کر کے کہا کہ "اے باپ جلدی کر، مبادا دیوی خفا ہو جائے"

معبد کے تمام کاہن اور کاہن زادیاں جمع ہیں اور ایک آواز سے عبادت کے گیت گا گا کر اس التجا میں مصروف ہیں کہ "اے محبت کی دیوی اس طاہر و مقدس قربانی کو قبول کر کے ملک کی کھیتیوں کو ہرا بھرا کر دے، جہازوں کے لئے موافق ہوائیں چلا، تاجروں کے کیسہ لولو و مرجان سے بھر دے، لڑکیوں کے لئے اچھے شوہر اور لڑکوں کے لئے اچھی بیویاں فراہم کر، ملک کو امن وسکون سے آشنا کر اور دشمنوں کو تباہ و برباد۔۔۔۔"

یہ شور و ہنگامہ، ہنوز برپا تھا کہ کاہن اعظم "آرام" کا داہنا ہاتھ بلند ہوا اور ہر چند حاضرین نے خنجر کی تڑپ کو تو دیکھا، لیکن اس چیخ کو نہ سنا جو بے اختیارانہ زامورہ کے منہ سے نکل گئی تھی۔ اسکا سینہ شق تھا اور خنجر کی نوک اس دل سے پار ہو چکی تھی۔ جو اتنے دنوں سے اس پھانس کے لئے تڑپ رہا تھا

اکابرِ اسلام کی بعض عجیب و غریب مذہبی و تاریخی تحقیقات

(۲)

عزرائیل یا ملک الموت

گزشتہ ماہ کی اشاعت میں، ہم قاف کے متعلق ان نوادر تحقیقات کو پیش کر چکے ہیں جو اکابر اسلام کی طرف سے ظاہر ہوئی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اس وقت ہزار میں ایک انسان بھی ایسا نہ ملے گا جو اُن پر یقین لانے کے لئے آمادہ ہو سکے لیکن باوجود اس کے ہمارے یہاں کے علماء کا اب بھی یہی اصرار ہے کہ اسلاف جو کچھ لکھ گئے ہیں اُن میں غلطی کا امکان ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ جو کچھ انھوں نے بیان کیا ہے وہ "فرمودۂ رسول" سے مستنبط تھا اور یہ ظاہر ہے کہ نبی کا قول غلط نہیں ہو سکتا --- پھر اگر میں یہ کہتا ہوں کہ جس چیز کو تم "ارشاد نبوی" اور "حدیثِ رسول" کہتے ہو، وہ صرف بعد کے لوگوں کی طبا عیاں ہیں اور ایک سچا رسول کبھی خلافِ حقیقت اور خلافِ عقل بات نہیں کہہ سکتا، تو تم مجھے کافر و ملحد کہنے لگتے ہو کیونکہ تمھارے نزدیک "مذہب" نام ہے صرف اُن اعتقادات کے مجموعہ کا جنھیں عقل انسانی سننے کے بعد باور کرے یا نہ کرے لیکن حیران و ششدر ضرور رہ جائے

آج کی صحبت میں ہم عزرائیل یا ملک الموت کی حقیقت پر اکابر اسلام کی تحقیق پیش کرتے ہیں جو کوہِ قاف کی تحقیق سے کم حیرت انگیز نہیں

(۱) عزرائیل اتنا چوڑا چکلا اور اتنا زبردست فرشتہ ہے کہ اگر دنیا کے تمام سمندروں اور دریاؤں کا پانی اس کے سر پر ڈالا جائے تو ایک قطرہ بھی زمین تک نہ پہونچے --- اس کا نورانی سریر یا تخت چوتھے یا ساتویں آسمان پر ہے جہاں اس کا ایک پاؤں ٹکا ہوا ہے اور دوسرا پاؤں اس پُل پر ہے جو دوزخ اور بہشت کے درمیان بنایا گیا ہے اس کے ستر ہزار پاؤں ہیں

(۲) اوّل اوّل عزرائیل بھی دوسرے فرشتوں کی طرح تھا۔ لیکن جب اللہ نے انسان کو پیدا کرنا چاہا تو اس نے جبرئیل کو حکم دیا کہ جاؤ اور زمین سے ایک مٹھی اُن عناصر یا اجزاء کی لے آؤ جن سے انسان کی تعمیر ہو سکے۔ لیکن جب جبرئیل زمین پر پہونچے تو ابلیس مانع آیا اور جبرئیل ناکام واپس آئے اس کے بعد میکائیل اور اسرافیل بھیجے گئے لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوئے۔ آخر میں عزرائیل کو بھیجا گیا۔ اور یہ کامیاب واپس آیا اور اللہ نے اس کو فرشتۂ موت بنا دیا کیونکہ اس میں رحم کی کمی تھی

(۳) جب اللہ نے موت کو پیدا کیا تو تمام فرشتوں کو طلب کیا اور کہا کہ اس کی طرف دیکھو لیکن جب انھوں نے

اسکی غیر معمولی قوت کو دیکھا تو حیران رہ گئے اور بیہوش ہو کر زمین پر ہزاروں سال تک گرے ہوئے پڑے رہے اسکے بعد جب انھیں ہوش آیا تو یکزبان ہو کر بولے کہ "بیشک موت بڑی زبردست تخلیق ہے" خدا نے یہ سنکر فرمایا کہ "میں نے عزرائیل کو اس پر قابو دیدیا ہے"

(۴) عزرائیل کے پاس تمام انسانوں کی فہرست موجود رہتی ہے، لیکن اسے یہ معلوم نہیں رہتا کہ کب کس کی موت آئے گی۔ وہ لوگ جو نجات پانے والے ہیں۔ ان کے نام کے گرد ایک نورانی حلقہ ہوتا ہے اور جو دوزخی ہیں اُن کے نام کے گرد سیاہ حلقہ ہوتا ہے

(۵) جب موت کا دن آتا ہے تو اللہ اس درخت سے جو عرش کے نیچے ہے ایک پتہ توڑ کر گرا دیتا ہے جس پر مرنے والے کا نام منقوش ہوتا ہے اور یہ پتہ عزرائیل کی آغوش میں آکر گرتا ہے - یہ نام پڑھ لیتا ہے۔ اور ۴۰ دن کے بعد روح نکال لیتا ہے

(۶) مرنے والوں میں بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو عزرائیل کا مقابلہ کرتے ہیں اور خدا سے شکایت کرتے ہیں کہ عزرائیل نہایت سختی سے جان نکالتا ہے۔ عزرائیل اس مقابلہ کو دیکھ کر خدا کے پاس جاتا ہے اور سارا حال بیان کرتا ہے۔ خدا یہ سنکر فردوس کا ایک سیب اس کو دیتا ہے جس پر بسم اللہ لکھی ہوتی ہے۔ عزرائیل یہ سیب لیجا کر اس جھگڑالو مرنے والے کو سنگھا دیتا ہے اور وہ فوراً جان دینے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ عمل صرف نیک بندوں کے لئے جائز رکھا جاتا ہے۔ کافروں کی جان چاہے کیسی ہی سختی سے نکلے پرواہ نہیں ہوتی

(۷) بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب عزرائیل روح نکالنے کے لئے حلق کے اندر جانا چاہتا ہے تو بندہ کسی "ذکر" کے ذریعہ سے حلق کے اندر جانے کا راستہ بند کر دیتا ہے۔ فرشتۂ موت یہ دیکھ کر خدا کے پاس جاتا ہے اور تمام حال عرض کرتا ہے وہاں سے حکم ہوتا ہے کہ جاؤ اس کے ہاتھ کو دیکھو۔ اگر اس نے اپنی عمر میں صدقہ دیا ہے تو بھی جان نکالنا دشوار ہوتا ہے اور پھر عزرائیل اس کے ہاتھ پر اللہ کا نام لکھ دیتا ہے اور وہ لقاء ربانی کے شوق میں حلق کا راستہ کھول دیتا ہے اور فرشتہ اندر گھس کر روح نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے

(۸) جب کسی مسلمان یا مومن کی روح نکالی جاتی ہے تو ملک الموت نہایت نرمی و آہستگی سے کام لیتا ہے۔ اور روح نکال کر اپنے نائب فرشتوں کے حوالہ کر دیتا ہے جو اُسے حُلۂ بہشتی میں لپیٹ کر آسمان کی طرف لیجاتے ہیں اور ساتوں آسمانوں کو عبور کر کے جب عرش خداوندی تک پہونچتے ہیں تو حکم ہوتا ہے کہ اس روح کو اس قبر میں لے جاؤ جہاں وہ مومن دفن کیا گیا ہے۔ لیکن اگر کوئی غیر مسلم کافر مرنے والا ہوتا ہے تو اس کی روح نہایت سختی و بے رحمی سے نکالی جاتی ہے اور جب آسمانوں کے دروازے اس کے لئے نہیں کھلتے تو فرشتہ اُسے وہیں زمین کی طرف پھینک دیتا ہے

(۹) ادریسؑ - الیاسؑ - عیسیٰؑ - اور خضرؑ، موت سے آشنا نہیں ہوئے اور اب تک زندہ ہیں۔ موسیٰؑ کے ہاں

جب ملک الموت آیا تو انھوں نے ایک تھپڑ مارا جس سے اس کی ایک آنکھ مجروح ہو گئی۔ جب فرشتہ یہ شکایت لے کر خدا کے پاس آیا تو خدا نے بہشت کا سیب اس کو دیا اور اس کو سونگھ کر وہ جان دینے پر راضی ہو گئے

(۱۰) بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی جان نکالنے والا اور فرشتہ ہوتا ہے اور دوسرے آدمیوں کی روح نکالنے والا کوئی اور۔ اسی طرح مومن و کافر کی جان نکالنے کے لئے علٰحدہ علٰحدہ فرشتے ہوتے ہیں

یہ ہے ہمارے اکابر اسلام کی تحقیق فرشتۂ موت کے متعلق جو حسب ذیل کتابوں میں پائی جاتی ہے :-

مشکوٰۃ شریف (حدیث) بخاری شریف (حدیث) مروج الذہب (المسعودی) درالفاخرہ (الغزالی)

عجائب الملکوت (الکسائی) تاریخ طبری تاریخ ابن اثیر تاریخ الخمیس (دیار بکری) قصص الانبیاء (ثعلبی)

کتاب الانس الجلیل (مجیر الدین حنبلی) کتاب البدء والتاریخ (طاہر مقدسی)

تماشہ یہ ہے کہ یہ تمام بیانات رسول اللہ سے منسوب کئے جاتے ہیں اور کسی کا خیال اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ یہ باتیں سب بعد کی گھڑی ہوئی ہیں اور رسول کو ان سے کوئی واسطہ نہیں

ملک الموت کے متعلق اس طرح کی حیرت انگیز روایات یہود میں رائج چلی آرہی تھیں، کہ اس کے چار ہزار بازو ہیں، اس کے جسم میں زبان و آنکھ کے سوا کچھ نہیں ہے یعنی جتنے آدمی ہیں اتنی ہی آنکھیں اور زبانیں اس کے جسم میں بھی ہیں، اس کے چار چہرے ہیں وغیرہ وغیرہ اور بعد کو مسلمانوں نے انھیں روایات پر اعتماد کرکے اپنے یہاں لے لیا اور لوگوں کو یقین دلانے کے لئے رسول سے منسوب کر دیا

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس زمانہ میں بھی ان روایات پر یقین کیا جا سکتا ہے اور کیا ادنیٰ فہم و عقل کا انسان بھی کبھی باور کر سکتا ہے کہ روح نکالنے کے لئے لا یعنی یہ تمام حرکتیں کی جاتی ہیں

پھر افسوس ہے ہمارے علماء کرام پر جو اب بھی مواعظ میں اس طرح کی روائتیں بیان کرتے ہیں اور صد ہزار افسوس ہے اُن کی اس جسارت پر کہ ایسی باتوں کو رسول اللہ سے منسوب کرکے ان کی عظمت و عزت کو بھی خاک میں ملانا چاہتے ہیں

کہا جاتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے جتنی تحقیقات علمی و تاریخی کی ہے اس کی نظیر اب مل نہیں سکتی۔ پھر اگر اُن کی تحقیقات کا یہی عالم ہے اور اُن کی علمی تفتیش وہی ہے۔ جو کوہ قاف اور عزرائیل کے حالات بیان کرنے میں ان کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے تو افسوس ہے کہ اب دنیا میں ایسے احمق پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں جو ایسی باتوں پر ایمان لائیں اور ایسے مذہب کا خدا حافظ ہے جو اس قسم کے روایات ماننے پر کسی انسان کو مجبور کرے

لکھنؤ کی وضعداریاں

پُرانے لکھنؤ میں شاہی زمانہ میں ایک محلہ نبہرہ کے نام سے بہت مشہور تھا۔ اور بہت آباد تھا جس کا نام ونشان بھی اب باقی نہیں رہا

مگر آپ یوں سمجھ سکتے ہیں جہاں اب حکیم مہدی علی خاں کا مقبرہ ہے اس کے آس پاس نبہرہ کہلاتا تھا اور وہیں منورالدولہ نواب احمد علی خاں بہادر کا عالی شان محل تھا یہ اودھ کے وزیر اعظم تھے بڑے سیرچشم اور با اقبال رئیس تھے نواب افضل محل کو انھوں نے عروج دیا ورنہ اس سے پہلے وہ ایک طوائف تھیں اور حسینی نام تھا ناچ گانے میں بہت مشہور تھیں اور خوبصورت بھی بہت تھیں۔ جوانی کا عالم تھا نواب منورالدولہ بہادر نے عقد کرکے نواب افضل محل خطاب دیا۔ نواب منورالدولہ بہادر میں اور بھی بہت سی خوبیاں تھیں کنبہ پروری میں ان کا نظیر نہ تھا۔ ان کے تمام متعلقین انھیں کے محلات کے قریب قریب اپنے اپنے محلوں میں عیش وراحت اور تزک واحتشام سے رہتے تھے ان کی ایک بہن کے صاحبزادہ نواب تقی علی خاں بہادر تھے جو شاعری میں اختر تخلص کرتے تھے شاہی کے تمام فضائل سے متصف تھے شطرنج میں ان سے بڑھ کے کوئی شاطر نہ تھا خوشنویسی میں کامل تھے بٹیر بازی میں نام آور اور شیر کے شکار میں تو اپنے ماموں نواب منورالدولہ بہادر کے شاگرد رشید اور وضع داری بھی دونوں ماموں بھانجوں پر ختم تھی شاعری میں ید طولےٰ حاصل تھا

ایک مرتبہ سلطان عالم مرزا محمد واجد علی شاہ نے جبکہ وہ ولی عہد تھے نواب منورالدولہ بہادر سے ارشاد فرمایا ہم سنتے ہیں کہ آپ کے بھانجے نواب تقی علی خاں اختر تخلص کرتے ہیں۔ شاعر بھی ملک سخن کے بادشاہ ہوتے ہیں لہٰذا ایک شہر میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔ اگر مناسب سمجھیں تو اپنے تخلص کا معاوضہ پچاس ہزار ہم سے لے لیں اور خود دوسرا تخلص اختیار کرلیں۔ نواب منورالدولہ نے عرض کیا مجھے اس کا علم بھی نہ تھا حضور نے فرمایا ہے کل میں ان سے کہوں گا دوسرے روز نواب منورالدولہ نے اپنے بھانجے سے مرزا ولیعہد بہادر کا حکم بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ تخلص تو میں بیچنا نہیں چاہتا اور ملک سخن کوئی مجھ سے چھین نہیں سکتا ہاں شاہی حکم ہے تو میں اسی ہفتہ میں ان کے ملک سے نکل جاؤں گا

میرا بھی جواب آپ ولیعہد بہادر سے عرض کردیجئے بادشاہ نے یہ جواب سنکر فرمایا کہ میں اُن پر ظلم نہیں کرنا چاہتا تخلص کا معاملہ ان کو منظور نہیں ہے تو شہر چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ نواب مرزا محمد تقی علی خاں اختر کا قاعدہ تھا کہ

ہفتہ میں دو ایک مرتبہ ڈیڑھ تاوا کنکوا بڑھاتے تھے

ان کے محلے میں ایک نامی مہاجن تیواری نام امیر کبیر رہتا تھا جو بہت دولتمند تھا۔ کوئی دو تین لاکھ کی ساکھ تھی ــــــ ایک دن تیواری نے بھی کنکوا بڑھا کر نواب سے ایک پیچ لڑایا اتفاق سے کنکوا کٹ گیا نواب کے مصاحبوں نے بڑے زور سے کہا وہ کاٹا یہ کلمہ کچھ اسے ناگوار معلوم ہوا۔ دوسرا پیچ لڑایا تیسرا پیچ لڑایا شام تک کنکوا لڑا کیا اب لوگوں نے تیواری جی سے کہا کہ تم نواب سے کنکوا نہیں لڑا سکتے اول تو ۱۷ تار کی ڈور بازار میں امجد سے سُتواتے ہیں امجد کا مانجھا آج شہر میں مشہور ہے ڈیڑھ تاوا کنکوا وہ بھی نامی کاریگر کا بنایا ہوا۔ تیواری جی نے کہا یہ کون سی بڑی بات ہے کل ہی ڈیڑھ تاوے کنکوے اور سترہ تار کی ڈور منگوائی جائے گی

دوسرے دن تیواری جی نے بھی ڈیڑھ تاوا کنکوا اُڑایا اور تین بجے سے اُڑایا نواب کے ایک مصاحب نے کنکوا بڑھا کر ان کو کاٹ دیا بہت تاؤ آیا۔ اب تیواری جی کی طرف سے دو ایک آدمی کنکوا بڑھانے لگے کنکوا لوٹنے والوں کی اچھی خاصی آمدنی ہوگئی شام تک لنگر لئے کھڑے رہتے اور جتنے کنکوے یا ڈور لوٹتے سب نواب صاحب کے ہاتھ یا تیواری جی کے ہاتھ بیچ آتے

تیواری جی اپنے یار دوستوں میں تذکرہ کرتے کہ نواب تقی علی خاں کو چند دن میں معلوم ہو جائے گا۔ کہ کسی مہاجن سے سابقہ پڑا تھا۔ میرے لاکھ دو لاکھ بھی خرچ ہو جائیں گے تو لکھنؤ کو خدا سلامت رکھے پھر سود در سود میں کما لوں گا اور مہاجن ہوں دھوتی باندھ کر گھر میں بیٹھ رہوں گا۔ ان کی نوابی نبھ نہیں سکتی ہوتے ہوتے صبح سویرے سے کنکوا لڑنے لگا اور لمبے لمبے پیچ ہونے لگے۔ دن بھر میں پانچ پانچ سیر ڈور کا خرچ ہونے لگا

کنکوا بڑھانے والے نوکر رکھے گئے ڈور سوتنے والے ملازم ہوئے۔ تیواری جی نے بھی جی کڑا کر کے تھیلیاں کھول دیں بڑے بڑے نامی کنکوے باز بُلائے گئے ہزاروں روپیہ کا روزانہ خرچ ہونے لگا

نواب محمد تقی علی خاں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آتا ماں سے زبردستی کر کے دو چار ہزار لے لیا آخر جب وہ بھی عاجز ہو گئیں تو اپنے بھائی نواب منور الدولہ سے کہا ذرا محمد تقی کو سمجھا دو انھیں کنکوے کا اسقدر سودا ہوا ہے کہ صبح سے شام تک بے ہوش رہتے ہیں نہ کھانے کی فکر نہ پینے کی۔ مجھے تو ان کی زندگی کی خیر نہیں معلوم ہوتی اس محلے میں کوئی موا تیواری ہے اسی سے ضد ہو گئی ہے آج تک بیس ہزار روپیہ مجھ سے لے چکے ہیں اور پھر تقاضا ہو رہا ہے ــــــ نواب نے مسکرا کر بھانجے کو بُلایا دربار میں لے گئے ایک لاکھ کے نوٹ ان کے حوالے کئے کہ تمھارے شغل کو کافی ہوں گے

ابتو نواب تقی علی خاں نے اور بھی رنگ بدلا اور اتنے لمبے پیچ ہوئے کہ پتنگ تارا نظر آتا تھا مگر شاباش ہے تیواری کو وہ بھی مقابلہ پر ڈٹا رہا۔ تمام املاک فروخت ہو گئی۔ سب اسباب بک گیا گاؤں نیلام ہو گیا دو برس

ہو گئے نہ آج صلح ہوتی ہے نہ کل آخر نواب کا ایک لاکھ بھی صرف ہو گیا نواب منور الدولہ نے اور ایک لاکھ دیا تیواری کا مکان بھی رہن ہو گیا تین برس ہو چکے صبح سے شام تک کنکوا لڑا کرتا ہے۔ ایک دن خبر آئی کہ تیواری خالی گھر چھوڑ کر اپنے بال بچوں کو لے کر کہیں سر بصحرا نکل گیا۔ اس نے سوچا کہ شہر میں رہ کر بے عزتی کی زندگی سے یہ اچھا ہے کہ پردیس میں جا کر بھیک مانگ کھائے یہ خبر تمام شہر میں چار دن میں پھیل گئی اور جس نے سنا اس نے افسوس کیا مگر منصف مزاج کہتے تھے کہ شاباش اس غریب کو تین برس تک اتنے بڑے رئیس کا مقابلہ تو کر لیا اور یہ کتنی بہادری کی کہ صلح نہ کی شہر چھوڑ دیا

نواب منور الدولہ کو اس بات کا بہت صدمہ ہوا پہلے مہاجن سے اس کا مکان خود مول لیا اس کے بعد شہروں شہروں اطلاع بھیجی کہ جس عامل کی سرحد میں تیواری جی ملیں اُن کو فوراً وزیر کی عدالت میں بھیج دو عاملوں نے منادی کرا دی کہ تیواری جی جس جگہ ہوں لکھنؤ چلے جائیں وزارت کی طرف سے طلبی ہے مگر کہیں پتہ نہ ملا

آخر دو برس کے بعد ساون کے مہینے میں ایک دن سادھو کے بھیس میں عیش باغ کے میلے میں مع بال بچوں کے تشریف لائے لوگوں نے پہچان لیا اور اُن کو تسلی تشفی سے نواب منور الدولہ کے سامنے لے گئے نواب نے ان کی حالت پر بہت افسوس کیا اور کہا تم ہمارے ہم محلہ ہو کر بغیر ملے ہوئے شہر سے نکل گئے پُرانی ہمسائیگی کا بھی خیال نہ کیا ہم نہیں چاہتے کہ تم شہر بدر ہو جاؤ۔ تمھارا مکان ہم نے مول لے لیا ہے تم اسی میں شوق سے رہو وہ تمھارا ہے اور پچاس ہزار روپیہ تم کو نقد دیا جاتا ہے اس سے اپنا کاروبار پھیلاؤ ضرورت کے وقت اور بھی مدد کی جائے گی ——— تیواری جی نے ہزاروں دعائیں دیں اپنے گھر میں آباد ہوئے اسی پچاس ہزار سے لاکھوں پیدا کر لئے اور ہمیشہ نواب کی رفاقت میں رہا کئے

سنا ہے کہ ایک شیر کے شکار کی حالت میں جب ایک جنگلی مست ہاتھی نے نواب پر کاری حملہ کیا تو سب سے پہلے تیواری جی نے اس ہاتھی پر سیکڑوں گولیاں برسا دیں کہ وہ مر گیا لیکن خوف سے لوگ اس کے قریب نہیں جاتے تھے کہ شاید زندہ ہو اُسوقت بھی تیواری جی نے جرأت کر کے اس دلدل میں اپنے کو نواب کے پاس پہونچا دیا اور ان کو زندہ اور صحیح و سالم اس کے دانتوں سے نکالا لوگ کہتے ہیں کہ اس ہاتھی کے دانت اتنے بڑے تھے کہ اس کے دانتوں کی ہڈی سے نواب نے پوری مسہری کا چوکھاٹ بنوایا تھا اور اسی پر آرام خاص فرمایا کرتے تھے

یہ تھیں ہمارے لکھنؤ کی پرانی وضعداریاں۔ کنبہ پروریاں اور اسی خدمت کے صلہ میں تیواری جی کو فیل جنگ کا خطاب دیا۔ اسی برس کی عمر پا کر تیواری جی نے سنہ ۱۸[illegible]ء عیسوی میں انتقال کیا

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

باب المراسلۃ والمناظرہ

آوازِ پسِ پردہ
اور
دستِ حنائی کی رنجش بیجا

ستمبر کے نگار میں، میں نے ایک خاتون کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر وہ اپنی تحریر کا جواب چاہتی ہیں تو مہربانی فرماکر اپنا پتہ لکھیں اور یہ میں نے اس یقین کے ساتھ لکھا تھا کہ نہ وہ اسقدر زحمت گوارا کریں گی اور نہ مجھے اظہار خیال کا موقعہ ملے گا، لیکن مجھے کسقدر حیرت ہوئی کہ ۱۰ اکتوبر کو ان کا دوسرا خط ملا جو پورے ایک جزو کو محیط ہے اور جس میں دل کھول کر انھوں نے اپنے آپ کو "قریب الفہم" بنانے کی کوشش کی ہے

خوشا بہانہ ہستی، خوشا رعایت شوق !

یقیناً اس خط کا جواب بھی مجھے اُسی پردہ و احتیاط کے ساتھ دینا چاہئے تھا جو خود انھیں مطلوب ہے، لیکن چونکہ اپنا صحیح نشان و پتہ بتاکر مراسلت قائم کرنا وہ خلاف مصلحت سمجھتی ہیں، اس لئے انھوں نے اتنا تو ضرور بتا دیا کہ وہ رام پور کی سرزمین سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن خط وکتابت کس پتہ سے کی جائے، اس کا کوئی ذکر نہیں ——— اس کے ساتھ یہ بھی اصرار ہے کہ نگار ہی میں اس کا جواب دیا جائے اور یہی بہترین ذریعہ تبادلۂ خیال کا ہے ——— بہرحال بغیر اس امر کا وعدہ کئے ہوئے کہ آیندہ بھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہیگا، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ کم از کم اُن کے ان دو خطوں کا مختصر جواب تو نگار کے ذریعہ سے دے ہی دوں اور آیندہ کا فیصلہ خود انھیں خاتون پر چھوڑ دوں اگر واقعی وہ مجھ سے کسی نوع کی علمی یا ادبی مراسلت قائم رکھنا چاہتی ہیں

پہلے خط میں انھوں نے جو کچھ لکھا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ میں نے اب فسانے لکھنا کیوں ترک کر دئے ہیں، درانحالیکہ نہ صرف اُن کے جذبات کی پرورش بلکہ ان کی زندگی کا ایک عظیم انقلاب انھیں فسانوں سے متعلق ہے جو وقتاً فوقتاً نگار میں میرے قلم سے نکل چکے ہیں ——— خاتون محترم نے اپنی تحریر میں بعض فسانوں پر علیحدہ علیحدہ عجیب وغریب

دانشمندانہ تنقید بھی اس خط میں کی تھی جس کا نقل کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے ---------- اس کے جواب میں مختصراً صرف اسقدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نہ میں نے فسانے لکھنا ترک کئے ہیں اور نہ بحمد اللہ میں اپنے اندر اس اہلیت کی کمی محسوس کرتا ہوں، لیکن حالات و واقعات کے لحاظ سے جس چیز کا فقدان ہے وہ ضرور مجھے یہ کہنے پر مجبور کر رہا ہے کہ

مشاطہ را بگو کہ بر اسبابِ حسنِ یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بہ ما رسد

"ادب وادبیات" سے متعلق سب سے بڑی چیز "تحریکِ جذبات" ہے اور اس پر انسان کو قابو حاصل نہیں، موسم، ماحول وغیرہ، معیشت و معاشرت، حوادث و اتفاقات، بعض انسانی جذبات کو "تحریک" ہوتی رہتی ہے، بڑی حد تک اختیار سے باہر ہیں اور حال کا تغیر، ہمیشہ قال کو بھی متاثر کرتا ہے ------ اسی لئے اگر کوئی شاعر دفعتاً شعر کہتے کہتے خاموش ہو جائے یا اگر کوئی ادیب اپنا موضوعِ تحریر بدل دے تو اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ اس کا ذوقِ شعر و ادب مفقود ہو گیا ہے بلکہ اس کو مجبورِ حالات سمجھ کر گفتگو کرنا چاہئے

ایک حقیقی شاعر وادیب کے لئے صرف قلم و صفحۂ کاغذ درکار نہیں، محض قابلیت و اہلیت کافی نہیں، بلکہ اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی باتوں کی ضرورت ہے جو اس کے احساس و جذبات کو زندہ رکھیں اور تاثرات کی کیفیت کو مشوش نہ ہونے دیں

ہزار نکتہ دریں کاروبارِ دلداری ست
کہ نام آں نہ لب و لعل و خطِ زنگاری ست

ممکن ہے کہ اس کو خودستائی پر محمول کیا جائے، لیکن میں یہ حقیقت ظاہر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ کثرتِ مشق نے مجھے اس سے بالکل بے نیاز کر دیا ہے کہ میں کسی موضوع اور خاص کر فسانہ لکھنے کے لئے پہلے "اسبابِ تحریک" کی جستجو کروں۔ کیونکہ اس باب میں صرف ارادہ کر کے قلم ہاتھ میں لے لینا ہی میرے لئے کافی تحریک ہوا کرتی ہے، لیکن چونکہ چند زمانہ سے میں "ضرورت" کو "ذوق" پر ترجیح دینے لگا ہوں اس لئے توجہ کا مرکز یقیناً بدل گیا ہے اور چاہتا ہوں کہ نگار کے ذریعہ سے وہی چیز پیش کی جائے جس کی دنیا کو "ضرورت" ہے، خواہ وہ تفریح کے "ذوق" کو پورا کرے یا نہ کرے

اس وقت ہندوستان میں بہت رسائل جاری ہیں اور کثرت سے "فسانے" پیش کر رہے ہیں لیکن کیا ان کی ارزانی اب اہل فہم پر بار ہو کر نہیں رہ گئی ہے، اور کیا وہ انسانی زندگی کے کسی شعبہ کی اصلاح کرنے میں مدد دے رہے ہیں؟

ہندوستان اس وقت جس دور سے گزر رہا ہے، اس کا اقتضاء یہ نہیں ہے کہ اہل قلم صرف فسانے لکھ لکھ کر لوگوں کو بدستور غفلت کی نیند میں مبتلا رہنے دیں بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ انکی معلومات میں اضافہ کی کوشش کی جائے اور اُن کو بتایا جائے کہ زمانہ کیا چاہتا ہے اور وہ کیونکر اپنے آپ کو ہلاکت سے بچا سکتے ہیں

ملک کے افراد خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی جو حالت ہے، ظاہر ہے، اقتصادی دشواریوں کا یہ عالم ہے کہ فاقہ شکنی کا سامان بھی آسانی سے مہیا نہیں کرسکتے، سیاسی پستی کی یہ کیفیت ہے کہ اب مسلمان کی حیثیت صرف ایک اچھوت کی سی باقی رہ گئی ہے، اور ذہنی غلامی کا یہ منظر ہے کہ بجائے ایک خدا کی پرستش کے وہ ہر اس بت کے سامنے جھک رہا ہے جو عبائے طویل وریش دراز رکھتا ہے۔ پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ ایسے وقت میں کیا محض فسانہ نگاری سے کوئی مفید خدمت انجام دی جاسکتی ہے اور کیا ایسی ماتم آگیں فضا میں نغمۂ عیش کی داستان چھیڑنا کوئی معنی رکھ سکتا ہے؟

پھر یہ مسئلہ میرے سامنے آج نہیں بلکہ اسی وقت سے ہے جب سے نگار جاری ہوا اور یہی سبب ہے کہ رفتہ رفتہ میرے تاثرات کی شدت کے ساتھ رسالہ کا رنگ بھی بدلتا رہا، یہاں تک کہ آج نگار اور "کفر والحاد" دو مترادف الفاظ قرار دئے جاتے ہیں

چونکہ میں سیاسیات میں حصہ لینے کا اہل اپنے آپ کو نہ سمجھتا تھا اور نہ معاشری واقتصادی اصلاح میرے بس کی بات تھی، اس لئے میں نے ان فرائض کی تکمیل دوسرے اہل قلم پر چھوڑ کر صرف مذہبی تنقید کو اپنا مقصود حقیقی بنایا تاکہ مسلمان کسی طرح ذہنی غلامی سے آزاد ہوں اور اسلام کے مفہوم کو پست وذلیل کرکے خود بھی پست وذلیل نہ ہوں

میں مسلمان ہوں یا کافر، یہاں اس کے متعلق مجھے کسی بیان دینے کی ضرورت نہیں، لیکن ضرور عرض کروں گا کہ اگر اسلام، جو واقعی دنیا کا بہترین فطری مذہب ہے، وہی ہے جو عام طور پر پیش کیا جاتا ہے، تو پھر کیا کسی کے بھی باعث فخر نہیں ہوسکتا اور اگر وہ واقعی عقل انسانی کو متاثر کرنے والی تعلیم ہے، اور ہر زمانہ میں فطرت انسانی کا ساتھ دینے والا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس صدیوں کے پڑے ہوئے پردے کو نہ اٹھایا جائے اور اس کے جوہر کو ہمیشہ زنگ آلود رہنے دیا جائے

بہرحال مدعا صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں نے کیوں آجکل فسانوں کی طرف توجہ کم کردی ہے اور میں کس مقصد کے لئے نگار کو وقف کردینا چاہتا ہوں —— علاوہ اس کے یوں بھی میں اسقدر فسانے لکھ چکا ہوں کہ آئندہ ان میں کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اور ادب لطیف کا صحیح ذوق رکھنے والوں کے لئے ان کا[1] مجموعہ شاید ہمیشہ دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا —— رہے صفحات نگار سو ان میں اگر فسانے کم شائع ہوتے ہیں تو دوسرے ادبی مقالات اس مرتبہ کے ہوتے ہیں کہ فسانے ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے —— اسی کے ساتھ میں یہ بھی عرض کروں گا کہ میں نے

---

[1] پہلا مجموعہ نگارستان کے نام سے شایع ہوا، دوسرا مجموعہ ۵۰۰ صفحات کا جمالستان کے نام سے اسی مہینہ میں شائع ہوا ہے۔ ایک طویل فسانہ علیحدہ کتابی صورت میں "شہاب کی سرگزشت" کے عنوان سے ملک میں کافی شہرت حاصل کرچکا ہے۔ علاوہ اس کے اور سیکڑوں ادبی مقالات ہیں جو نگار کے صفحات میں پیش ہوچکے ہیں اور اب بھی برابر شائع ہوتے رہتے ہیں

فسانہ نگاری سے توبہ نہیں کی ہے اور　　　پردہ داری ہو تری[1] شب کی تو افسانے بہت

یہاں تک تو جواب ہوا آپ کی پہلی تحریر کا ——— اب رہ گئی آپ کی دوسری تحریر، سو اس کے جواب میں سوائے اس کے اور کس طرح آپ سے خطاب کروں کہ

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

آپ نے جس حُسن سے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے وہ تنقید کی دنیا میں اسقدر بے بہا چیز ہے کہ میں دفتر کے دفتر سیاہ کرنے کے بعد بھی اس کے اعتراف سے عاجز ہوں

نہ حُسنش غایتے دارد، نہ سعدیؔ را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

آپ نے جس ایجاز و اختصار سے کام لے کر تمام مسائل حاضرہ پر اظہار خیال کیا ہے، وہ آپ کی طبع سلیم اور فکر جمیل کا اتنا زبردست ثبوت ہے کہ اس کی مثالیں مردوں میں بھی بہت کم ملتی ہیں، چہ جائے کہ عورتوں میں!

آسودہ شبے باید و خوش مہتابے
تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

آپ نے میری ادبی و علمی خدمات کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے، میں ان کو ہمیشہ اپنے لئے باعث فخر سمجھوں گا، گو ان کے اعتراف میں اپنی بے مائگی و بے بسی کو دیکھتے ہوئے سوائے اس کے کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا

کہ سلطاں نخواہد خراج از خراب

آپ کی علالت کا حال معلوم کرکے مجھے بہت تشویش پیدا ہوگئی ہے۔ اگر آپ اپنے علاج کے لئے لکھنؤ آئیں تو میں اس کو اپنی انتہائی خوش بختی سمجھوں گا۔ اور دہلی تشریف لے گئیں تو وہاں حاضری کی کوشش کروں گا اگر اس عزت کا مستحق سمجھا گیا ورنہ

من و حُجرہ و دامنے زیر سنگ

آئندہ کے لئے میں پھر یہی عرض کروں گا کہ مُراسلت کے لئے آپ کا پورا پتہ معلوم ہونا ضروری ہے، کیونکہ نگار میں اس سلسلہ کا قائم رکھنا ممکن نہیں اور غالباً اب میں آپ کی کسی تحریر کا جواب یوں نہ دے سکوں گا

نیاز

---

[1] معاف فرمائیے، خطاب میں خصوصیت کا اظہار بالکل شاعرانہ ہے اور اس سے کوئی مخصوص ہستی مُراد نہیں

مطبوعات موصولہ

سخنوران ایران در عصر حاضر

جناب محمد اسحاق صاحب ایم - اے نے جو دار العلوم کلکتہ میں ادبیات فارسی کے پروفیسر ہیں، عہد حاضر کے سخنوران ایران کا ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا ہے، جس کی پہلی جلد ریویو کے لئے فاضل مؤلف نے ہمارے پاس بھیجی ہے

اس جلد میں ۳۲ شعراء کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ جو ردیف وار ادیب پشاوری سے شروع ہو کر یاسائی پر ختم ہوتا ہے —— فاضل مؤلف نے اس تذکرہ کی ترتیب کے لئے ایران کا سفر کیا جو ان کا اصلی وطن ہے اور مہینوں قیام کرنے کے بعد وہاں کے علماء و ادباء سے مل کر تمام مواد فراہم کیا —— تذکرہ فارسی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اور انتخاب کلام میں پوری کاوش سے کام لیا ہے۔ اسی جلد میں عارف قزوینی، ملک الشعراء بہار، ابراہیم خاں پور داؤد کا بھی تذکرہ ہے، جن کی شاعری سے ہندوستان کے اکثر اہل سخن واقف ہیں۔

تمام اُن شعراء کی تصویریں بھی دی گئی ہیں جن کا حال اس کتاب میں درج کیا گیا ہے۔ سوائے ایک خاتون پروین اعتصامی کے کہ ان کا ذکر ان کی تصویر سے خالی ہے۔ ممکن ہے اسے خلاف تہذیب سمجھا گیا ہو (حالانکہ ایسا نہ ہونا چاہئے) یا پردہ کی پابندی نے تصویر کے حصول میں دشواریاں حائل کر دی ہوں (درانحالانکہ وہ پردہ کی پابند نہیں ہیں)

کتاب، ٹائپ میں نہایت نفیس کاغذ پر طبع ہوئی ہے اور مجلد شائع کی گئی ہے، لیکن افسوس ہے کہ غلطیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں اور جو غلط نامہ اس میں شامل کیا گیا ہے وہ بالکل ناقص و نامکمل ہے

ایران کے عہد حاضر کی شاعری اُن لوگوں کے لئے جو حافظ و نظیری یا سعدی و عطار کے دلدادہ ہیں یقیناً بالکل بے آب و رنگ نظر آئے گی۔ کیونکہ اب نہ وہ دورِ عشق باقی ہے نہ اس کی غزل سرائیاں، لیکن جس حد تک "قومیات" کا تعلق ہے، ایران کے ادبیات حاضرہ کی اہمیت کا اعتراف کرنا ضروری ہے —— زبان میں تو خیر تغیر عظیم ہو ہی گیا ہے، خیالات بھی بالکل بدل گئے ہیں اور عروض و قوافی کی قدیم پابندیاں بھی بڑی حد تک منسوخ ہو چکی ہیں

جذبات قومی کو ابھارنا، ملی و وطنی تحریک کو تقویت پہونچانا، معیشت و معاشرت کی اصلاح کی طرف قوم کو متوجہ کرنا، عورتوں کو بے نقاب باہر آجانے کی تعلیم دینا یہ ہے اصل مقصود عہد حاضر کے ایرانی شعراء کا اور ظاہر ہے کہ اُس کے تقدس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے —— اس تذکرہ کی دو جلدیں اور شائع ہوں گی، جن میں سے ایک نثر نگاروں کے لئے بھی وقف ہو گی

ملک کو یقیناً فاضل مؤلف کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے ایک بڑی کمی کو پورا کیا اور ہر اُس شخص کو جو ایران

کی جدید شاعری و انشاء سے کچھ بھی دلچسپی رکھتا ہے اس کتاب کی ایک جلد اپنے پاس رکھنا ضروری ہے - قیمت اٹھارہ روپیہ کتاب کی خوبیوں کے لحاظ سے زاید نہ ہو لیکن ملک کی اقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے یقیناً زاید ہے - ملنے کا پتہ یہ ہے:-

عبد الحلیم صاحب ۵۷ ا- چاندنی چوک اسٹریٹ کلکتہ

نقد الادب ایک مختصر مگر جامع کتاب ہے فن تنقید پر جسے جناب افسر میرٹھی نے مرتب اور نول کشور پریس لکھنؤ نے شایع کیا ہے

یہ کتاب چھوٹے چھوٹے دس ابواب میں منقسم ہے - پہلے باب میں ادب اور فنون لطیفہ کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے اور دوسرے باب میں یونان قدیم کے فن تنقید پر روشنی ڈالتے ہوئے افلاطون اور ارسطو کے نظریوں پر سرسری گفتگو کی گئی ہے

تیسرے باب میں ہند قدیم کا ذکر کرکے سنسکرت کے تنقیدی لٹریچر سے بحث کی ہے اور یقیناً اردو داں حضرات کے لئے یہ حصہ زیادہ دلچسپ ہونا چاہئے

چوتھے، پانچویں اور چھٹے باب میں ان اصول تنقید سے بحث کی ہے جو جمالیات و فنون لطیفہ سے متعلق سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے مغرب میں پائے جاتے تھے

ساتویں میں اصولِ تنقید، آٹھویں میں اس کے مقصد و عمل، نویں میں اسلوب بیان اور آخری باب میں غزل مثنوی اور قصیدہ پر گفتگو کرکے اس کتاب کو ختم کر دیا گیا ہے - کتاب کی زبان بہت صاف و سلیس ہے جو یقیناً تنقید کی شرط اولین ہے - افسر صاحب عہد حاضر کے اُن مصنفین میں سے ہیں جو زیادہ تر اصلاحی پہلو کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، اسی لئے اُن کے کارنامے کوئی "خلاقانہ" حیثیت تو نہیں رکھتے جو یقیناً بڑے جھگڑے کی چیز ہے، لیکن متانت و سنجیدگی کے ساتھ ایک مصلحانہ خدمت ضرور انجام دے رہے ہیں

اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب بہت مختصر ہے - اور اس لئے اس کی حیثیت ایک لکچر سے زیادہ نہیں، لیکن مبتدیوں کے لئے اس سے زیادہ بلند چیز پیش کرنا مناسب بھی نہ تھا

یہ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور طباعت و کتابت بھی پسندیدہ ہے - قیمت دو روپیہ رکھی گئی ہے جو ہندوستان کی اقتصادی حالت اور اس کی بدذوقی کے لحاظ سے یقیناً زاید ہے

تجدید عمل (دوسرا حصہ) اس سے قبل نگار کی کسی اشاعت میں اس کتاب کے پہلے حصہ پر اظہار خیال کیا جا چکا ہے - اب یہ دوسرا حصہ شایع کیا گیا ہے اور اسی ہندوستانی رشنلسٹ سوسائٹی (لاہور) کی طرف سے جس نے پہلا حصہ شایع کیا تھا

اس کے مصنف لکھنؤ کے مرزا عسکری علیخاں مجازی ہیں، جو ایک آزاد خیال شخص ہیں اور اس میں شک نہیں کہ جس نیت کے ساتھ انھوں نے یہ رسالے مرتب کئے ہیں، اس پر کوئی حملہ نہیں ہو سکتا

اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے کہ تمام دنیا کے انسان ایک ہیں اور ان کو ایک ہو کر رہنا بھی چاہیئے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مقصد مذہب کی کسی جدید تصویری سے پورا ہو سکتا ہے یا مطلق لامذہبیت سے ــــ اگر آج مذہب کو محو کرکے صرف قومیت کے نشو و نما کو منتہائے نظر سمجھ لیا جائے تو وہ بھی ہمارے درد کی دوا نہیں بن سکتا۔ اور اگر محض لامذہبیت کو پیش کیا جائے تو اس پر اتفاق ممکن نہیں۔

اب وہ زمانہ گزر گیا کہ کوئی شخص پیمبری کا دعویٰ کرکے آسانی سے کسی ملک یا جماعت کو اپنا ہم خیال بنا سکے اور لامذہبیت ایک ذہنی انقلاب ہے جس کی تکمیل کے لئے بھی ابھی کم از کم ایک صدی درکار ہوگی۔

بہر حال اس نوع کی کتابیں بحالتِ موجودہ مفید ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کے دیکھنے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے خلاف ایک ذہنی انقلاب تیزی سے وسیع ہوتا جارہا ہے اور ممکن ہے کہ آج کی یہ تخم ریزیاں آئندہ کسی تناور درخت کو پیدا کر سکیں۔

ہم کو اکثر جگہ مجازی صاحب کے استدلال وطرزِ بیان سے اختلاف ہے لیکن اصولاً ہم ان کی کوششوں کو ضرور قابلِ قدر سمجھتے ہیں۔

یہ رسالہ اُردو بُک اسٹال لوہاری دروازہ لاہور سے ۸ر میں مل سکتا ہے ــــ

متعہ اور اسلام امامیہ مشن لکھنؤ کا دسواں تبلیغی رسالہ ہے، جس میں فاضل مؤلف مولانا سید علی نقی صاحب نے جوازِ متعہ نقلی و عقلی دلائل سے ثابت کرنا چاہا ہے۔ مولانا موصوف نہایت صاف و شگفتہ لکھنے والے لوگوں میں سے ہیں اور کسی جگہ تہذیب و متانت سے نہیں ہٹتے، اسی لئے نفسیاتی طور پر ان کی تحریر میں بھی اثر ہوتا ہے اور ان کے دلائل میں بھی ایک خاص قوت مضمر ہوتی ہے۔

متعہ کا مسئلہ نہایت مشہور اختلافی مسئلہ ہے اور منجملہ ان مسائل کے ہے جو سنی، شیعہ کے درمیان نمایاں طور پر خطِ فاصل کھینچنے والے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ متعہ ابتدا ءِ عہدِ اسلام میں رائج تھا اور یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ علماءِ اہلِ سنت اس وقت تک یہ ثابت نہیں کر سکے کہ اس کا رواج کب ممنوع قرار دیا گیا، لیکن میری رائے میں یہ مسئلہ بھی اسلام کے معاشرتی مسائل سے تعلق رکھتا ہے اور ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے اس میں بھی تبدیلی ہونا چاہیئے۔ یعنی اگر اس وقت کی حالت اس کی مقتضی ہے کہ متعہ جائز رکھا جائے تو بیشک اس کو جائز رہنا چاہیئے خواہ وہ کسی وقت ممنوع ہی کیوں نہ قرار دیا گیا ہو اور اگر حالات کا اقتضاء یہ ہے کہ اس کے رواج کو بند کر دیا جائے تو اُسے قطعاً ناجائز قرار دینا چاہیئے خواہ وہ جائز ہی کیوں نہ ہو۔

مولانا موصوف نے ابتدا میں فطرتِ انسانی کے لحاظ سے بھی اس مسئلہ پر گفتگو کرکے متعہ کے جواز کو ضروری قرار دیا ہے، لیکن بہتر ہوتا اگر فاضل مصنف اسی کے ساتھ سوسائٹی کے نظام اور اس کے مصالح پر بھی غور فرما لیتے

اس میں شک نہیں کہ انسان کی زندگی میں بعض اوقات بعض گتھیاں ایسی بھی پڑ جاتی ہیں، جو صرف متعہ کے ذریعہ سے سلجھائی جا سکتی ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت مسلّمہ ہے کہ قانون یا شریعت کی تنظیم فطرت انسانی کے روشن پہلو کو سامنے رکھکر کی جاتی ہے اور "امکاناتِ تاریک" کی رعایت کبھی نہیں کی جاتی ورنہ "اصلاح" کا کوئی مفہوم باقی نہ رہے

عہد سعادت میں متعہ رائج تھا یا نہیں، بعد کو وہ ممنوع قرار دیا گیا یا نہیں، اس سے بحث فضول ہے، لیکن یہ ضرور قابل غور ہے کہ عہدِ حاضر میں جبکہ آزادی تمام جائز حدود سے گزر جانا چاہتی ہے، متعہ کا جواز کہیں "ادارۂ فحاشی" کی صورت تو اختیار نہ کرے گا۔ اور سوسائٹی اس کو برداشت کر سکتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ ایران میں جہاں صدیوں سے متعہ کا رواج چلا آرہا تھا، رضا شاہ پہلوی نے اس کو بالکل بند کر دیا، کیونکہ اس وقت جبکہ عورتوں کا پردہ اٹھتا جارہا ہے، متعہ کا جواز جو آفتیں ڈھا سکتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور اس کو صرف اس دلیل پر کبھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ بُرے کام کرنے کا اچھا طریقہ ہے

جس حد تک منقولی دلائل کا تعلق ہے، مولانا یقیناً اسی حد تک کامیاب ہوئے ہیں جس حد تک ایک مخالف مولوی کامیاب ہو سکتا ہے، کیونکہ روایات۔ واحادیث کے دفتر بے پایاں سے ہر شخص اپنے اپنے مطلب کی باتیں نکال سکتا ہے اور اسی لئے میں اس طریق استدلال کو کبھی پسند نہیں کرتا

یہ رسالہ سرفراز پریس لکھنؤ سے ۸ر میں مل سکتا ہے

تجارت اور اسلام امامیہ مشن لکھنؤ کا بارہواں تبلیغی رسالہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک جتنے رسایل اس مشن سے شایع ہوئے ہیں، ان سب میں مفید ترین رسالہ یہی ہے

اس رسالہ میں مولانا سید علی نقی صاحب نے نہایت قابلیت سے بتایا ہے کہ اسلام میں توکل و قناعت یا ترک دنیا کا کیا مفہوم ہے اور مسلمانوں نے ان اصطلاحات کا مفہوم غلط سمجھ کر اپنے آپ کو کس قدر نقصان پہونچایا۔ رسالہ ۳ر میں سرفراز پریس لکھنؤ سے مل سکتا ہے

ایک خاص رعایتی اعلان

جنوری ۱۹۴۴ء سے نگار کے خریداروں کیلئے

خواہ وہ نئے خریدار ہوں یا پرانے

یعنی

تذکرۂ خندۂ گل اور **فلاسفۂ قدیم** دونوں کتابیں جنکی مجموعی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ہوتی ہے صرف ایک روپیہ میں علاوہ محصول ———

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

خوارج کی مختصر تاریخ

(جناب سید ریاض الحسن صاحب - لاہور)

خوارج کی صحیح تاریخ کہاں دستیاب ہو سکتی ہے ؟ اگر زحمت نہ ہو تو نگار کے ذریعہ سے
اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیے

(نگار) ۳۷ھ میں صفر کا مہینہ ہے ـــ جنگِ صفین میں ایک جانب امیر معاویہ کا لشکر آراستہ ہے اور دوسری طرف جناب امیر کا ـــ جنگ کا سبب وہ باہمی اختلاف ہے جو فریقین میں شہادت عثمان غنیؓ کے سلسلہ میں پیدا ہو گیا ہے امیر معاویہ کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوتی ہے کہ اس باب میں دو حکم مقرر کئے جائیں جو قرآن کے مطابق فیصلہ کریں ـــ جناب امیر کی فوج کے اکثر آدمی اس پر راضی ہو جاتے ہیں یا تو اس لئے کہ وہ جنگ سے تھک جاتے ہیں یا اس وثوق پر کہ جب قرآن کی رُو سے فیصلہ کیا جائے گا تو انھیں کے حق میں ہو گا ـــ لیکن فوج کا ایک حصّہ جو قبیلۂ تمیم سے تعلق رکھتا تھا اس کی مخالفت کرتے ہوئے " لاحکم الاللہ " کی آواز بلند کرتا ہے۔ اور امیر معاویہ کی اس تجویز کو نہیں مانتا جب ان لوگوں کی مخالفت فیصلہ کی قرارداد کو مسترد نہیں کر سکتی تو وہ جناب امیر کی فوج سے نکل کر کوفہ کے قریب ایک گاؤں (حروراء) میں پہونچ جاتے ہیں اور ایک معمولی شخص عبد اللہ بن وہب الراسبی کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں

اس کے بعد چونکہ فیصلہ جناب امیر کے خلاف ہوا، اس لئے اور بھی بہت سے لوگ کوفہ سے نکل کر ابن وہب کی جماعت سے مل گئے۔ اور یہ گروہ خارجی کہلایا یا تو اس لئے کہ وہ کوفہ سے باہر نکل گئے تھے ، یا اس لئے کہ وہ جناب امیر کی جماعت سے خارج ہو گئے تھے

اس جماعت کی مخالفت ایک طرف جناب امیر اور علوئین سے اس لئے تھی کہ کیوں انھوں نے امیر معاویہ کی تجویز سے اتفاق کرکے فیصلہ حکم کے سپرد کیا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ کے قتل کو جائز ٹھیرا کر امیر معاویہ کے بھی مخالف تھے ــــ انھوں نے جناب امیر کی خلافت سے انکار کرکے علم بغاوت بلند کیا اور سخت شورش بپیدا کی۔ وہ بزور شمشیر اپنے عقیدہ کو پھیلانا چاہتے تھے اور اس سلسلہ میں قتل و بے رحمی کی بہت دردناک مثالیں اپنے پیچھے چھوڑ گئے

جناب امیر نے اول اول تو بہت طرح دی کیونکہ ان کو امیر معاویہ کے مقابلہ میں بھی اپنی عسکری قوت صرف کرنا تھی، لیکن جب خوارج کا فتنہ زیادہ خطرناک صورت اختیار کرنے لگا تو مجبوراً انھوں نے ان سے جنگ کی اور نہروان میں سخت معرکہ کے بعد بتاریخ ۹ صفر ۳۸ھ خوارج کو شکست دیکر ابن وہب کو قتل کر ڈالا۔ لیکن یہ فتح جناب امیر کو بہت گراں قیمت پر حاصل ہوئی۔ کیونکہ شورش کا سلسلہ بدستور قائم رہا اور خود وہ بھی آخرکار ایک خارجی ابن ملجم کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ ابن ملجم ایک ایسی عورت کا شوہر تھا جس کے خاندان کے بہت سے افراد جنگ نہروان میں مارے گئے تھے اور اس طرح اس عورت نے اپنا انتقام جناب امیر سے لیا

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد، امیر معاویہ نے بڑی حد تک اس جماعت کی سرکوبی کی، لیکن جس طرح وہ شیعی جماعت کو پوری طرح دبانے میں ناکام رہے اسی طرح فتنۂ خوارج کا بھی استیصال نہ کرسکے، چنانچہ امیر معاویہ کے بارہ سال دور حکومت میں متعدد بار خوارج نے سر اٹھایا اور متعدد بار ان کو دبایا گیا، لیکن اصل تحریک قائم تھی اور خوارج میں سے جو لوگ مارے جاتے تھے ان کی عزت پرستش کی حد تک کی جاتی تھی ــــ بصرہ میں خصوصیت کے ساتھ یہ شورش زیادہ پھیلی اور ابو بلال مرداسی تیمی کی سرکردگی میں جو بغاوت رونما ہوئی وہ بہت سخت تھی ــــ یہ لوگ باقاعدہ جنگ آزمائی نہ کرتے تھے بلکہ سرحدی قبائل کی طرح جہاں موقع مل جاتا تھا لوٹ مار کرکے چھپ جایا کرتے تھے

یزید کی وفات کے بعد خوارج کی قوت بہت بڑھ گئی اور عبداللہ بن زبیر کو انھوں نے شکست دی۔ اس کے بعد نافع بن الازرق کی قیادت میں کرمان اور دوسرے مشرقی صوبوں پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ اس جماعت کا اثر اتنا قوی تھا کہ تمام بصرہ اور اس کے قرب وجوار میں ہر وقت لوگوں پر ان کی ہیبت طاری رہتی تھی اور مشکل سے حجاج بن یوسف ان کی قوت توڑنے میں کامیاب ہوا

انھیں کی ایک جماعت یزید شیبانی کی سیادت میں سرزمین دجلہ پر آفتیں ڈھا رہی تھی اور حجاج بن یوسف کی فوج کو بارہا شکست دے چکی تھی، آخرکار یہ بھی بڑی مشکل سے درہم برہم کی گئی

اسی طرح سرزمین عرب میں ۶۵ھ اور ۷۲ھ کے درمیان انھوں نے ایک طوفان برپا کردیا اور یمامہ، حضرموت، یمن اور طائف پر قابض ہوگئے ــــ آخرکار حجاج بن یوسف نے یہاں بھی ان کو شکست دی۔ لیکن کوئی فتح اس جماعت کے فتنہ کو فرو نہ کرسکتی اگر حسن اتفاق سے خود انھیں کے درمیان باہم اعتقادی اختلاف نہ پیدا ہوجاتے

فریب عشرت

نزہت انوار سے مملو ہے گو تیرا دماغ
روح کی تہ میں بھی کیا روشن ہے عرفاں کا چراغ

موجِ صہبا کی طرح رنگیں ہے گو تیری نظر
زندگی کے رازِ سربستہ سے بھی ہے باخبر !

کسقدر ٹھہرا ہے احساساتِ عشرت کا سراب
آہ تیری گمرہی ہے اور حجاب اندر حجاب

آفتاب روح کی کرنیں نہیں اے بے خبر
جن تمناؤں کے جلوے ہیں ترے پیشِ نظر

رُوح میں جب تک نہ ہو موجود غم کا سوزِ تام
کیسے کھُل سکتے ہیں انساں پر حقیقت کے مقام

تاکجا یہ بے حقیقت بارشِ نغمات و رنگ
پھینک ہی دیگی کبھی دنیا تری جانب خدنگ

صبر کر اپنے طلسمی خواب کا انجام دیکھ
رنگ کیا لاتی ہے طرزِ گردشِ ایام دیکھ

قلبِ گم گشتہ حقیقت آشنا ہو جائیگا
ٹھوکریں کھا کر خود اپنا رہنما ہو جائے گا

تھک چکی ہے اکتسابِ رنگ و مستی سے اگر
سطح کی رعنائیوں پر تیرنے والی نظر

ہو چکا ہے گر ترا دل عیش و عشرت سے اُچاٹ
لیکے چل اپنے سفینے کو غمِ الفت کے گھاٹ

عظمت جانسوزیٔ اہلِ نظر بھی دیکھ لے
روح کی گہرائیوں میں جھانک کر بھی دیکھ لے

عدم

قطعات

ضبطِ اشک

ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا میں نے کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی پہونچ کے قلب میں بن جائیں گے یہ انگارے

فریبِ نغمہ

مغنیہ! تیری تانوں سے ہو کے ہم آہنگ صدائے ساز برنگِ فغاں نکلتی ہے
یہ جانتا ہوں مگر آہ ! باوجود اس کے مجھے گماں ہے یہی، میری جان نکلتی ہے

آشنائے حقیقت

جو پوچھتا ہے کوئی "سُرخ کیوں ہیں آج آنکھیں؟" تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں "رات سو نہ سکا"
ہزار چاہوں مگر یہ نہ کہہ سکوں گا کبھی ، کہ "رات رونے کی خواہش تھی اور رو نہ سکا"

نشاطِ بہار

پھوار، ابر، پرندوں کے گیت، مست ہوا بھرے کٹوروں کی صورت چھلک رہی ہے فضا
بہار کان میں کچھ کہہ رہی ہے مجھ سے مگر وہ بے خودی ہے کہ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا

گریہ پیہم

آرزوئیں نہ رہیں، حسرت و ارماں نہ رہے یعنی پہلو سے مرے وہ دلِ دیوانہ گیا
چھٹ گئے اور سب اندازِ جنوں تو لیکن دوسرے تیسرے دن کا مرا رونا نہ گیا

فنونِ لطیفہ

کوئی رنگوں میں، کوئی شعر میں، کوئی سُر میں درد اپنا کوئی نالوں میں کہا کرتا ہے
ایک ناسور ہے فی الاصل غمِ ہستی بھی اور ناسور بہر نوع بہا کرتا ہے

اختر انصاری

کسی کی یاد میں

نہ بھولے گی قیامت تک مجھے وہ ساعتِ رنگیں — ہوئی جب آ کے میری ہم سفر اک لعبتِ شیریں

وہ رشکِ صد چمن، جانِ بہارِ صد گلِ تر تھی — وہ سیمیں تن عروسِ حسن و زیبائی کا زیور تھی

شرابِ حسن کی وہ ایک موجِ نشہ آور تھی — نسیمِ صبح کی وہ اِک شمیمِ روح پرور تھی

وہ اِک گلدستۂ رعنا تھی گلزارِ صباحت کا — وہ اِک مجموعۂ زیبا تھی اجزائے لطافت کا

وہ اِک عنوان تھی افسانۂ حسن و محبت کا — وہ اک رنگیں پیامِ شوق تھی حورانِ جنت کا

وہ اک شمعِ جمال افروز تھی بزمِ تمنا کی — وہ اک روحِ طرب انگیز تھی، کیفِ تماشا کی

وہ زلفِ عنبریں جس سے فضا معمورِ نکہت تھی — وہ روئے یاسمیں جس پر فدا سو بار فطرت تھی

تراشا تھا مگر گلبرگ سے اس کا لبِ رنگیں — ڈھلی تھی نور کے سانچے میں اس کی ساعدِ سیمیں

ادائے خاص پنہاں اس کے اندازِ تکلم میں — ہزاروں برق رقصاں اس کی اِک موجِ تبسم میں

ستم ڈھاتی تھیں کیا کیا برملا وہ مست ناز آنکھیں — لئے سوتی تھیں فتنے سیکڑوں وہ نیم باز آنکھیں

بقدرِ شوقِ بسیار و بقدرِ ذوقِ بالیدہ — ہوا جاتا تھا قاتل اور بھی وہ حسنِ خوابیدہ

ستم تھا اُف ستم وہ حسنِ شوخ و برملا اس کا

قیامت تھا قیامت وہ جمالِ دلربا اس کا

م - ی (اعظم گڈھ)

غزل :—

تا چند اُن کو دُور سے دیکھا کرے کوئی — اپنے ہی دل میں کیوں نہ تماشا کرے کوئی

ہر جور دل نواز ہے ہر لطف دل گداز — پہلے مذاقِ درد تو پیدا کرے کوئی

غارت ہو دولتِ دل وجاں کوئی غم نہیں — لیکن متاعِ صبر نہ لوٹا کرے کوئی

کچھ سوچ کر دیا ہے دلِ درد آشنا — آسان تھا؟ کہ اُن کی تمنا کرے کوئی

حُسنِ کرم کو جب نہیں حاجت سوال کی — سوءِ ادب یہ ہے کہ تقاضا کرے کوئی

دنیا میں کس کو اپنی تمنا نہیں عزیز — کیوں میرے دردِ دل کا مداوا کرے کوئی

ہے شرط اعتماد — محبت کے واسطے — "دل" اور "میرے دل" کی نہ پروا کرے کوئی

کوکب مذاقِ عشق ملا جس کو مل گیا
یہ درد وہ نہیں ہے کہ پیدا کرے کوئی

کوکب (شاہجہاں پوری)

ترکی جمہوریہ

انقلابِ ترکی کی بے نظیر تاریخ ، ایک زندہ قوم کی جدوجہد کی سبق آموز داستان ، مصنفہ مسٹر ضمیر احمد ہاشمی ایم۔ اے قیمت عہ

محشرستان

حضرت محشر عابدی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ جو اُردو کے ممتاز رسائل میں شائع ہو چکے ہیں

مجلد عہ ، غیر مجلد عہ (علاوہ محصول)

مینیجر نگار لکھنؤ

تاریخ کا ایک ورق مجہول

محبت کی قربانیاں

خمارویہ بن احمد بن طولون سخت پریشان ہے اور حکم دیتا ہے کہ ابن یعقوب کو طلب کیا جائے - ابن یعقوب قبطی طبیب ہے - اور اپنے علم و حذاقت کے لحاظ سے خاص شہرت کا مالک ہے

ابن یعقوب حاضر ہوتا ہے اور خمارویہ اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :-

"اے ابن یعقوب، میں بہت در ماندہ و مضطرب ہوں اور اب اپنی تمام اُمیدوں کا مرکز تجھکو قرار دیکر، تیری مدد چاہتا ہوں - تجھے معلوم ہے کہ میں کوثر سے کتنی محبت کرتا ہوں اور اس کی بیماری نے میری زندگی تلخ کر رکھی ہے - پھر تیری حذاقت کس دن کام آئے گی اور سوائے تیرے اس ملک میں کون ہے جو اس کے مرض کا علاج کر سکے"

کوثر، تیری ہی طرح نصرانی مذہب رکھتی تھی لیکن جب اس کا باپ اسلام لایا تو وہ بھی مسلمان ہوئی اور میرے حبالۂ عقد میں آئی - اب میں اس کی بیماری کی وجہ سے سخت پریشان ہوں اور اگر کوئی شخص اس کو صحیح و تندرست کر سکے تو میں بڑی سی بڑی دولت پیش کرنے کے لئے طیار ہوں"

یہ سُنکر ابن یعقوب نے کہا کہ " جو کچھ میرے امکان میں ہے اس سے دریغ نہ کروں گا - اور اپنی ساری کوششیں اس کی صحتیابی کے لئے صرف کر دوں گا "

خمارویہ، اپنے باپ احمد بن طولون کی وفات پر ۲۷۰ھ میں مصر کے تخت پر بیٹھا اور اپنے باپ کی طرح نہایت اچھا حکمراں ثابت ہوا ـــــ اس نے تمام اُمور مملکت پر خاص توجہ صرف کی، حدود سلطنت وسیع کئے اور اقطار اسلامیہ میں طولونی حکومت کا آوازہ بلند کر دیا ـــــ مصر کے اندر کثرت سے مساجد و محلات تعمیر کئے، رعایا کی راحت و آسایش کا خاص خیال رکھا اور شاہانہ جاہ و جلال میں بھی بہت کچھ اضافہ کیا - خمارویہ ایک جری سپاہی، ایک صاحب جبروت سردار، ایک قدرشناس فرمانروا تھا اور وہ بلالحاظ ملت و مذہب فضل و کمال کی عزت کرنے والا تھا

ایک دن اس کو معلوم ہوا کہ ...... فوج میں ایک سپاہی ہے جو ابن طولون کے زمانہ میں اسلام لایا تھا اور وہ ایک لڑکی رکھتا ہے جو حُسن و جمال اور بلندی سیرت کے لحاظ سے مصر بھر میں اپنا جواب نہیں رکھتی

چنانچہ اس نے سپاہی کو طلب کیا اور پیام دیکر اس کی لڑکی کوثر سے نکاح کرلیا

جب کوثر محل شاہی میں داخل ہوئی اور خمارویہ نے اس کے حسن وجمال کو قریب سے دیکھا تو اس کا شیفتہ ہوگیا۔ لیکن چونکہ قصر شاہی مصر وشام، سرکیشیا وگرجستان کی نہایت حسین وجمیل عورتوں سے بھرا ہوا تھا، اور خمارویہ کبھی کبھی ان کی طرف بھی ملتفت ہوجاتا تھا، اس لئے کوثر اپنے محبوب شوہر کے اس طرزِ عمل سے کڑھتی رہتی تھی، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ گھلنے لگی اور دماغ پر بھی ایسا سخت اثر ہوا، کہ ایک دن سب نے جان لیا کہ وہ دیوانی ہوگئی ہے

خمارویہ اور ابن یعقوب طبیب کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس کو کچھ زمانہ ہوگیا ہے اور خمارویہ اپنی محبوب بیوی کے پاس سے ایک لمحہ کے لئے جدا نہیں ہوتا

ایک دن ابن یعقوب آیا اور بولا کہ " ملکہ کے علاج کے لئے خاص اہتمام کی ضرورت ہے۔ اور اگر بادشاہ ایک شفاخانہ خصوصیت کے ساتھ پاگلوں کے علاج کے لئے قائم کرنے پر راضی ہو تو ممکن ہے ملکہ شفایاب ہوجائے

یہ سنتے ہی خمارویہ نے پایۂ تخت میں نہایت وسیع پیمانہ پر ایک عمارت اس غرض کے لئے طیار کرائی[1] اور اس کا نام " المدستان " رکھا گیا ـــــ کوثر اس شفاخانہ میں داخل کی گئی اور وہاں سے شفا پاکر قصر میں واپس آئی

ظاہر ہے کہ خمارویہ کی محبت کا کیا عالم ہوگا ـــ اس نے سوائے کوثر کے تمام عورتوں سے بات کرنا ترک کردی اور دونوں محبت کی فردوسی زندگی بسر کرنے لگے

بظاہر یہ نہایت معمولی واقعہ تھا، لیکن اندر ہی اندر نہایت ہولناک مستقبل طیار کررہا تھا۔ کیونکہ محل کی وہ تمام عورتیں جو خمارویہ کی نگاہ سے اتر گئی تھیں، کوثر اور خمارویہ دونوں سے جلنے لگیں اور انھوں نے درپردہ امراء وافسرانِ فوج سے مل کر ان کی ہلاکت وتباہی کی سازشیں شروع کردیں

رجب ۲۷۹ھ کی انیسویں تاریخ ہے، عباسی خلیفہ المعتضد باللہ تخت نشین ہوتا ہے اور لوگوں سے اس کے خلافت پر بیعت لی جارہی ہے ـــــ خمارویہ بھی اپنی طرف سے کچھ قیمتی ہدایا خلیفہ کی خدمت میں بھیجنا چاہتا ہے اور اپنے ایک مخلص دوست حسین بن عبداللہ کو (جو ابن الخصاص کی کنیت سے مشہور تھا) اس خدمت

---

[1] یہ مورخین کی غلطی ہے کہ اس شفاخانہ کی تعمیر کو احمد بن طولون کی طرف منسوب کرتے ہیں

کے لئے منتخب کرتا ہے

ابن الخصاص، نہایت ہوشیار شخص تھا، اس نے سوچنا شروع کیا کہ کیونکر اس خدمت سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ـــــ وہ جانتا تھا کہ خمارویہ کی لڑکی "قطر الندیٰ" بے انتہا حسین و جمیل ہے اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ خلیفہ کے پاس پہونچ کر اس کا ذکر کرے گا تاکہ وہ اپنے بیٹے علی سے اس کی شادی کر کے طولونی فتنہ سے ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو جائے

چند دن کے بعد ابن الخصاص ہدایا لے کر روانہ ہوا۔ اور منزلیں طے کر کے خلیفۂ عباسی کے حضور میں پہونچ گیا ـــــ خلیفہ نے نہایت مسرت سے ان قیمتی ہدایا کو قبول کیا اور ابن الخصاص سے گفتگو کرنے کے لئے تخلیہ کر دیا گیا

ابن الخصاص نے مصر کا حال بیان کرتے ہوئے خمارویہ کی لڑکی "قطر الندیٰ" کے حسن و جمال کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ اگر ولیعہد خلافت (علی) کے ساتھ اس کی شادی ہو جائے تو بہت مناسب ہے ـــــ خلیفہ نے کہا۔ " میں نے اور لوگوں سے بھی اس لڑکی کے حُسن و جمال کا ذکر سنا ہے۔ اور میں خمارویہ سے خود اپنے لئے اس کی خواہش کروں گا "

یہ کہہ کر اس نے دس ہزار دینار ابن الخصاص کو دئے اور حکم دیا کہ جلد سے جلد مصر جا کر خمارویہ تک یہ پیام پہونچا دیا جائے

ایک سال گزرا اور دوسرا بھی ـــــ

محرم ۲۸۲ھ میں ایک شاندار جلوس بغداد کی گلیوں میں داخل ہوتا ہے۔ جس کے وسط میں خمارویہ کی لڑکی "قطر الندیٰ" زریں محمل پر سوار نظر آتی ہے، اور ابن الخصاص آگے آگے ہے

قطر الندیٰ، خلیفۂ عباسی کے محل میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور ابن الخصاص بیش قیمت ہدایا کے ساتھ مصر واپس کیا جاتا ہے

"قطر الندیٰ" کی روانگی کے بعد خمارویہ نے ارادہ کیا کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے قصر حکومت کو چھوڑ کر چند دن کے لئے دمشق چلا جائے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ حرم کی تمام عورتیں کو تر کے جلو میں ساتھ ساتھ

لہ یعنی "قطرۂ شبنم"

جلیس ـــــ خمارویہ نے ایک شیر پال رکھا تھا جو اس کے ساتھ ہر وقت قصر میں رہا کرتا تھا۔ یہ کبود آنکھوں والا شیر بہت خوبصورت تھا۔ اور اپنے مالک سے حد درجہ مانوس تھا۔ خمارویہ کا اعتقاد تھا کہ جب تک یہ شیر میرے پاس ہے کوئی دشمن اس کو گزند نہیں پہونچا سکتا

روانگی سے قبل اس کی ایک حرم نے جو کوثر کی شدید دشمن تھی خمارویہ سے کہا کہ " اے آقا، لوگ کہتے ہیں کہ آپ بزدل ہیں اور اسی لئے اپنی حفاظت کے لئے ہر وقت شیر کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ مجھ سے لوگوں نے بیان کیا تو میں نے کہا کہ یہ غلط ہے اور دیکھ لینا اب کے سفر میں شیر ساتھ نہ جائے گا "

خمارویہ نے جواب دیا کہ " تم نے خوب جواب دیا، بے شک میں شیر کو ساتھ نہ لے جاؤں گا تاکہ لوگ مجھے بزدل نہ سمجھیں

چنانچہ وہ شیر کو وہیں مصر میں چھوڑ کر دمشق روانہ ہو گیا

دمشق پہونچنے کے بعد محل کی عورتوں کو اپنی سازش کی تکمیل کا کافی موقعہ مل گیا۔ اور بعض افسران فوج اور خادموں کی مدد سے اس کو ذبح کرا دیا ـــــ یہ واقعہ ذی قعدہ ۲۸۲ھ کا ہے، یعنی اسی مہینہ کا جب اس کی لڑکی قطر الندی کے ساتھ خلیفہ المعتضد باللہ نے شادی کی تھی

۳ ذی الحجہ کو خلیفہ تک اس واقعہ کی خبر پہونچی اور اس نے بیس آدمیوں کو جو اس جرم میں شریک تھے تہ تیغ کرا دیا ـــــ انھیں میں ایک شخص ابوالجیش بھی تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد خلیفہ نے ابن الخصاص کو خط بھیجا اور اُسے مصر طلب کیا

قطر الندی کو جب اپنے باپ کے قتل کئے جانیکا حال معلوم ہوا تو بہت روئی اور التجا کی کہ کوثر کو یہاں بلا لیا جائے، کیونکہ وہ اس کے باپ کی بہت محبوب بیوی تھی "

خلیفہ نے پوچھا کہ " تم یہ کیوں چاہتی ہو " ـــــ قطر الندی نے جواب دیا کہ مصر میں تنہا وہی ایک عورت ایسی تھی جس سے مجھ کو بہت محبت تھی۔ اور جب میری ماں کا انتقال ہوا تو اُس نے اپنے بچوں کی طرح مجھے رکھا اور نہایت شفقت سے پیش آئی ـــــ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر وہ وہاں چھوڑ دی گئی تو لوگ اس کو بہت پریشان کریں گے بلکہ ہلاک کر ڈالیں گے "

خلیفہ نے ابن الخصاص کو دمشق بھیجا تاکہ کوثر کو اپنے ساتھ لے آئے، لیکن یہاں پہونچ کر اس نے عجیب رنگ دیکھا، محل کے اندر عجیب ہنگامہ برپا تھا اور کوثر غائب تھی ـــــ ایک بڑھیا سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ خمارویہ کے قتل کے بعد ہی چلی گئی تھی۔ اور دمشق کے ایک لکڑہارے کے مکان

میں اس نے پناہ لی تھی

ابن الخصاص اس کے پاس پہونچا تو معلوم ہوا کہ کوثر بے شک وہاں آکر ٹھیری تھی لیکن تین دن ہوئے کہ دفعۃً غائب ہوگئی

ابن الخصاص نے خیال کیا کہ اگر وہ کوثر کو لے کر بغداد نہ گیا تو ممکن ہے خلیفہ اس کو بھی سازش میں شریک سمجھے، اس لئے اس نے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا اور آخر کار چوتھے دن دیکھا گیا کہ دریا میں ایک عورت کی لاش خس و خاشاک میں اُلجھی ہوئی پڑی ہے اور وہ عورت کوثر تھی

آیندہ جنوری ۳۴ء کا نگار

(تقریباً دوچند ضخامت کا)

مخصوص ہوگا صرف ایک موضوع کے لئے جس پر اُردو میں اسوقت تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا

یعنی

"لبوں کی داستان زبانِ قلم سے"

آپ کے "لب" ہر وقت متحرک رہتے ہیں اور سب سے زیادہ خدمت انھیں سے لیجاتی ہے' لیکن کیا آپکو معلوم ہے کہ جذبات کی دنیا میں، نفسیاتی حقایق میں، عالم شعر و تصوف میں "لب" کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ اور دنیا کی تاریخ میں کیسے کیسے انقلاب اسکی وجہ سے رونما ہوئے ہیں

جنوری ۳۴ء کا نگار

اس کی مفصل داستان آپ کو سنائے گا اور اس موضوع پر تحقیق کے وہ نقوش آپکے سامنے پیش کریگا کہ آپ حیران رہ جائینگے

علاوہ اس کے

بعض اور بھی نہایت اہم مضامین ہوں گے

اگر

آپ نے نگار کی خریداری جاری رکھی تو یہ مجموعہ آپکو مفت مل جائیگا۔ ورنہ یوں کسی قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہو سکتا

مینیجر نگار لکھنؤ

تقلید کے خراب نتائج

اور

ہمارے علمار کی عبرتناک حالت

مسلم ریوائول کی اشاعت (جون ۳۳ء) میں مسٹر سلیم چشتی کا ایک فاضلانہ مقالہ شائع ہوا ہے جس میں تقلید سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس سے مسلمانوں کو کسقدر نقصان پہونچا اور اُن کی یہ ذہنی غلامی کس حد تک ان کے لئے مضر ثابت ہوئی - ہم اس کے ایک حصّہ کا خلاصہ ناظرین نگار کے مطالعہ کے لئے پیش کرتے ہیں

چھٹی صدی عیسوی بھی عجیب صدی تھی جب ایک طرف جسٹی نین نے یونان میں حکمت و فلسفہ کی درسگاہوں کو بند کیا اور دوسری طرف خلیفہ مستنجد نے مباحث حکمیہ و عقلیہ کو کلیۃً روک دیا

یونان میں اس کا جو سبب بھی ہوا ہو، لیکن بغداد میں یہ سب کچھ محض علمار کی وجہ سے ہوا جو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر علم و عقل کی روشنی سے لوگ بہرہ ور ہوئے تو پھر دنیا اُن کو تاریکی میں ڈال دے گی اور ان کا جاہ و وقار خاک میں مل جائے گا

ہر چند دنیائے اسلام میں کوئی عورت ایسی تو پیدا نہیں ہوئی جو ہائی پیشیا کی طرح بغداد و دمشق کی گلیوں میں برہنہ گھسیٹی جاتی، پھر بھی مردوں میں شیخ شہاب الدین ایسی بعض ہستیوں کو قدامت پرست علمار فقہ کا شکار بننا پڑا ——

ان علمار کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا جانشین سمجھتے تھے اور جو شخص اُن کے احکام پر تنقید کرتا تھا وہ اگر ہاتھ آگیا تو دار پر چڑھا دیا جاتا تھا ورنہ کافر و ملحد کہ کے جنت کا دروازہ اس پر بند کر دیا جاتا تھا —— ابن تیمیہ ہر چند کوئی بڑا عقل پرست شخص نہ تھا لیکن محض اس لئے کہ تقلید کے باب میں اس کا نقطۂ نظر دوسرے علمار سے مختلف تھا، وہ غریب بھی قید و بند کے آزار سے نہ بچ سکا

الغرض تقلید رفتہ رفتہ مسلمانوں میں اساس مذہب قرار پاگئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذہنی غلامی کی وجہ سے وہ علوم و فنون میں کوئی مخترعانہ دستگاہ نہ پیدا کر سکے - اگر کوئی شخص ادنیٰ سا انحراف بھی تقلید کے دیوتا سے کرتا تھا تو اسے کافر سمجھا جاتا تھا - اور مذہب کا مفہوم صرف یہ رہ گیا کہ آنکھ بند کر کے اسلاف کی پیروی کی جائے

اب آئیے اس تقلید کے نقصانات پر بھی ہلکی سی تفصیلی نظر ڈال لیں :-

(۱) سب سے پہلے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے قرآن پاک میں تفکر و تدبر ترک کر دیا - اور اگر کوئی شخص ذاتی طور پر اس کو سمجھنا چاہتا بھی تو اس کو ضلالت و بدعت قرار دیا جاتا - اسی لئے قرآن مجید کی تفاسیر نسبتاً بہت کم لکھی گئیں - اور جو لکھی بھی گئیں وہ صرف اسلاف کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھکر اور کسی مزید تحقیق سے سروکار نہ رکھا گیا اس کے مقابلہ میں یوروپ و امریکہ کو دیکھئے کہ اس وقت تک وہاں انجیل کی کتنی تفسیریں شائع ہو چکی ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ بند نہیں ہوا - اس کا سبب صرف یہ ہے کہ عیسوی مذہب کے متبعین کو اس کا اندیشہ نہیں ہے کہ انجیل کی تفسیر میں اسلاف کی روش ترک کرنے پر انھیں کافر قرار دیدیا جاویگا اور اس آزادانہ رائے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں تنقید کی اہلیت لوگوں میں پیدا ہوگئی - اور مذہب نام صرف کورانہ تنقید کا نہ رہا -

مسلمان عیسائیوں کو کافر و مشرک کہنے کے بڑے شایق ہیں، لیکن ان کافروں نے اپنے مذہب کی جو عظیم خدمات انجام دی ہیں وہ بھی قابل غور ہیں - اس وقت انجیل کا ترجمہ ۹۰، مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے اور برخلاف اس کے ہندوستان کے علماء اسلام قرآن کو ابھی تک اپنے ہی ملک والوں کے لئے قابل فہم نہیں بنا سکے، دوسری قوموں کا کیا ذکر ہے، درانحالیکہ یہاں بادشاہوں کے ساتھ ساتھ صدیوں تک انھوں نے بھی حکومت کی ہے - اس کا سبب صرف یہ ہے کہ تنقید کی مذموم عادت نے ان کے ذہن و دماغ کو کند کر رکھا ہے اور چونکہ اسلاف نے دوسری زبانوں میں قرآن کا ترجمہ نہیں کیا اس لئے یہ کیونکر ایسی جرأت کر سکتے ہیں

(۲) قرآن کے ساتھ ہی ساتھ احادیث کا بھی تنقیدی مطالعہ ترک ہو گیا یہاں تک کہ اگر آج کوئی شخص اس خیال کا اظہار کر دے کہ کتب احادیث، تنقید کی محتاج ہیں تو اس کو تمام علماء، گمراہ سمجھنے لگیں گے - اس میں شک نہیں کہ امام بخاری نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے ایک حد تک تنقیدی نگاہ احادیث پر ضرور ڈالی لیکن اس کے بعد پھر مسلمانوں میں نہ کوئی دوسرا امام بخاری پیدا ہو سکا اور نہ موجودہ زمانہ کے لحاظ سے کسی کو تنقید کی ہمت ہوئی

ترمذی اور نسائی میں ظہور امام مہدی کے متعلق متعدد احادیث پائی جاتی ہیں، لیکن امام بخاری نے ان میں سے کسی کو قابل اعتبار نہیں سمجھا - پھر سوال یہ ہے کہ اگر امام بخاری کو اس تنقید کا حق تھا تو دوسرے مسلمانوں کو کیوں نہیں ہو سکتا اور اگر آج کوئی شخص تنقید کے معیار کو زیادہ بلند کر کے احادیث کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے یا خود صحیح بخاری پر تنقید کرنا پسند کرتا ہے تو کیوں اُسے کافر قرار دیا جائے

کیا امام بخاری معصوم تھے ؟ کیا اُن سے غلطی سرزد ہونا ممکن نہ تھا ؟ کیا بخاری کی احادیث وحی و الہام کا مرتبہ رکھتی ہیں - یقیناً کوئی شخص اس کا مدعی نہیں ہو سکتا - پھر کیا وجہ ہے کہ جس طرح امام بخاری

نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے تنقید کی، اسی طرح آج کوئی دوسرا شخص خود احادیث پر تنقیدی نگاہ نہ ڈالے
کیا کلام مجید میں کوئی آیت ایسی پائی جاتی ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ امام بخاری کے بعد تنقید و تحقیق، تفتیش و جستجو، علمی و ذہنی ترقی کا دروازہ بند ہو جائیگا اور جو شخص امام بخاری سے اختلاف کرے گا وہ جہنم میں پھینک دیا جائے گا

مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ رسول کی ایک خاص بلند سیرت ہوتی ہے اور وہ کبھی اس اخلاق سے منحرف نہیں ہو سکتا جس کی تعلیم وہ دوسروں کو دیتا ہے، لیکن کسقدر حیرت ہے کہ باوجود اس علم و یقین کے مسلمان علماء کو اس کی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ بخاری سے ان احادیث کو نکال دیں جن سے رسول اللہ کی عظمت مجروح ہوتی ہے اور جن کو سامنے رکھ کر دوسرے مذاہب والے اعتراضات کیا کرتے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ اسلاف پرستی کی فضا میں پیدا ہوئے، تقلید کی تباہ کن آواز گہوارہ ہی سے اُن کے کانوں میں پڑی اور اب ان میں مطلقاً جرأت نہیں کہ وہ دوسری تیسری صدی ہجری کی روایات سے ایک انچ آگے قدم بڑھائیں

مقلدین ایک معترض کو یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ "کیا تم امام بخاری سے زیادہ دانشمند ہو؟ کیا تمام گزشتہ ائمہ و فقہا بیوقوف تھے؟ کیا گزشتہ سات آٹھ سو سال میں کوئی صاحب عقل پیدا ہی نہیں ہوا جو اس طرف توجہ کرتا؟"

لیکن کوئی ذی فہم اس دلیل سے متاثر نہیں ہو سکتا کیونکہ ممکن ہے وہ شخص جو خاندانی مسلمان چلا آرہا ہے مرعوب ہو کر خاموش ہو رہے، لیکن ایک غیر مسلم کے سامنے اگر یہ سوالات کئے جائیں گے تو وہ نہایت آزادی سے کہدے گا کہ "ہاں بے شک ایسا ہی ہے"

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی پر تنقید کرنا اس کی تکذیب ہے اور اگر امام بخاری پر تنقید کی جائیگی تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اُن کو جھٹلایا گیا، حالانکہ ایسا خیال کرنا سخت غلطی ہے اور نہ اس میں کسی کی توہین ہوتی ہے — افلاطون و ارسطو سے لے کر کانٹ اور ہیگل تک سب پر متاخرین نے تنقید کی، اُن سے اختلاف کیا، لیکن کیا اس سے افلاطون و ارسطو وغیرہ کی توہین ہو گئی اور کیا دنیائے علم و حکمت میں اُن کا مرتبہ کم ہو گیا —— اسی طرح اگر محدثین و فقہاء پر آج بھی تنقید کی جائے تو اس کے یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ ہمارا مقصود اُن کی تکذیب و توہین ہے اور اُن کا مرتبہ کبھی اس سے کم نہیں ہو سکتا

فقہاء خدا تو تھے نہیں کہ ان کا بنایا ہوا قانون ہر زمانہ اور ہر ملک کے لئے موزوں ہو سکتا۔ جس طرح انھوں نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے قانون وضع کیا اسی طرح آج بھی موجودہ حالات کے لحاظ سے وضع شریعت

کی خدمت انجام دینی چاہیئے۔ پھر یوں بھی دیکھئے کہ کتنے مسائل میں امام محمد اور امام ابو یوسف نے امام ابو حنیفہ سے اختلاف کیا ہے، تو کیا وہ اپنے اُستاد سے زیادہ عقلمند تھے ——— اسی طرح امام شافعی سے امام ابو حنیفہ نے اختلاف کیا ہے تو کیا یہ ان سے زیادہ صاحب فراست تھے ——— پھر کسقدر عجیب بات ہے کہ یہ چار ائمہ تو باوجود اختلاف کے راہِ راست پر تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن اگر کوئی پانچواں اُن سے اختلاف کرے تو وہ گمراہ قرار دیا جائے

کیا رسول اللہ نے یہ تعیین کر دی تھی کہ ائمہ فقہ ان چار سے زیادہ نہ ہوں گے، کیا قرآن مجید سے کوئی ثبوت اس کا پیش کیا جا سکتا ہے

یقیناً اس سے زیادہ توہین اسلام کی کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ غزالی، رازی، بخاری، یا ابو حنیفہ سے زیادہ صاحب عقل و فراست انسان کی پیدائش کو محال قرار دے

اس کا راز صرف یہ ہے کہ مسلمان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اُن کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکے ہیں۔ اور اب زندگی کے کسی شعبہ میں، کسی علم و فضل میں اُن کو ترقی کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ وہ ترقی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دیکھئے کہ گزشتہ چھ سات صدی کے اندر کوئی ایک شخص بھی مسلمانوں میں ایسا پیدا نہیں ہوا۔ جس نے اپنی علمی یا ذہنی ترقی کا ثبوت دیا ہو

(۳) جو ذہنیت مسلمانوں کی فقہ میں ہے وہی دوسرے علوم میں بھی ہے ——— اس وقت یقیناً وہ دنیا نہیں ہے جو چھٹی صدی ہجری میں پائی جاتی تھی، لیکن علماء اب تک وہی ہیں۔ اور اسی زمانہ کا خواب دیکھ رہے ہیں ——— چنانچہ آپ ان کے مدارس کے نصاب کو دیکھئے کہ اس میں اب تک وہی کتابیں رائج ہیں جو ۳۰۰ سال قبل ملا نظام الدین نے متعین کر دی تھیں

دنیا نئی ہو گئی ہے اور اس کے خیالات بالکل بدل گئے ہیں لیکن مولوی ابھی تک اسی جگہ پر قائم ہے جہاں صدیوں قبل پایا جاتا تھا۔ اور دنیا کی کوئی قوت اسے یقین نہیں دلا سکتی کہ درس نظامی اب مجموعۂ مزخرفات سے زیادہ کچھ چیز نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا سبب بھی وہی جذبۂ اسلاف پرستی و تقلید ہے جو اس کو اپنی جگہ سے ہٹنے نہیں دیتا

عربی مدارس میں جن علوم کی تعلیم عام طور پر دی جاتی ہے وہ یہ ہیں :-

(۱) ارسطو کی منطق و ما بعد الطبیعیات

(۲) عربی نحو و صرف اور ادب

(۳) صحاح ستہ

(۴) فقہ
(۵) افلاطون کا نظام ہیئت
(۶) عقاید و کلام
(۷) تفسیر

اب آئیے لگے ہاتھوں ان پر ایک تنقیدی نگاہ بھی ڈال لیں

(۱) منطق اور مابعد الطبیعیات میں ہمارے علما، اُن مسائل کی صحت کے قائل ہیں جو اب سے دو ہزار سال قبل پائے جاتے تھے ۔۔۔ نہ ان کو یہ خبر ہے کہ ان علوم میں کتنی ترقی ہو چکی ہے اور ان غریبوں کو اس کا علم کہ بیکن، اسپینوزا، ہیوم، کانٹ، مل اور برگسان کوئی جانور تھے یا انسان

(۲) عربی صرف و نحو کا یہ حال ہے کہ ایک عمر ضایع کرنے کے بعد بھی وہ ادب و انشا، پر قدرت حاصل نہیں کر سکتے

(۳) حدیث و فقہ کی کتابیں وہ الہامی کتابیں سمجھ کر پڑھتے ہیں اور مطلقاً قوتِ تنقید صرف کرنیکی ضرورت محسوس نہیں کرتے

(۴) ہیئت میں ان کا خدا صرف افلاطون ہے۔ نہ انھیں کیپلر کا حال معلوم ہے نہ گلیلیو کا، نہ برونو سے واقف ہیں نہ نیوٹن سے

(۵) علم کلام میں وہ صرف ان مصنفین کی کتابیں پڑھتے ہیں جنھوں نے فلسفۂ یونانی کو رد کیا تھا۔ ممکن ہے تیسری چوتھی صدی میں یہ مطالعہ مفید رہا ہو لیکن اب چودھویں صدی میں اس سے کیا کام چل سکتا ہے

(۶) تفسیر میں زیادہ تر بیضاوی، جلالین پڑھائی جاتی ہیں اور وہ بھی صرف سورۂ بقر تک اور محض ادب و انشار کو سامنے رکھ کر

ہمارے علما، نہ تاریخ سے آگاہ ہیں نہ جغرافیہ سے، نہ طبیعیات سے نہ علم الکیمیا سے، نہ کہربا کا علم انھیں حاصل ہے، نہ میکانکیات کا۔ پورے آٹھ سال وہ فقہ و حدیث کی تعلیم میں تو صرف کر دیتے ہیں لیکن قرآن کے لئے چند مہینوں سے زیادہ نہیں دیتے

پھر اس تعلیم کے ساتھ وہ اس کے لئے تو ضرور موزوں ہیں کہ مسجدوں میں اذان دیں یا امامت کرلیں لیکن علوم و فنون میں وہ ابنار وطن کی کوئی رہبری نہیں کر سکتے اور نہ موجودہ مسائل پر رائے زنی کا سلیقہ اُن کو حاصل ہوتا ہے

پھر اگر ہمارے علمار واقعی کوئی خدمت اسلام کی انجام دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو دوسری قوموں کے دوش بدوش ترقی کرتے ہوئے دیکھنا پسند کر سکتے ہیں، تو ان کا اولین فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ تقلید و اسلاف پرستی

کو چھوڑ کر زمانہ کی رفتار کو دیکھیں، اس کے حالات پر غور کریں اور سمجھیں کہ وہ بارھویں صدی میں نہیں بلکہ بیسویں صدی میں زندگی بسر کر رہے ہیں

ہمارے اسلاف نے فلسفۂ یونانی کے مطالعہ کو کب حرام قرار دیا تھا اور تحقیق و اجتہاد کا دروازہ کب انھوں نے بند کیا تھا کہ آج اس کو حرام قرار دیا جائے، جس طرح وہ اپنے زمانہ میں مجتہد کی حیثیت سے نمودار ہوئے تھے۔ اسی طرح آج ہمارے علماء کو بھی تحقیقات جدیدہ اور اجتہاد و اختراع کا علمبردار ہو کر سامنے آنا چاہئے، ورنہ یوں محض کافر کہدینے اور دستِ افسوس ملنے سے کام نہیں چل سکتا اور اس قوم کو حقیقتاً تباہ ہونا ہے اگر ہمارے علماء کی ذہنیت کا یہی عالم رہا

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

مہینہ	قیمت
سنہ ۲۲ء	
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
سنہ ۲۳ء	
مئی	۶ر
جون	عمر
سنہ ۲۴ء	
جنوری	۴ر
فروری	۴ر
مارچ	۴ر
اپریل	۴ر
مئی	۴ر
جون	۴ر
جولائی	۶ر
اگست	۴ر
ستمبر	۶ر
اکتوبر	۸ر
سنہ ۲۵ء	
دسمبر	عمر

مہینہ	قیمت
سنہ ۲۶ء	
جنوری	۴ر
اپریل	۸ر
مئی	۴ر
جون	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	عہ
سنہ ۲۷ء	
مارچ	۴ر
اپریل	۴ر
مئی	۴ر
جون	۴ر
سنہ ۲۸ء	
دسمبر	۸ر
سنہ ۲۹ء	
مارچ	۸ر
اکتوبر	عہ
نومبر	عہ

مہینہ	قیمت
سنہ ۳۰ء	
مئی	۴ر
اگست	۸ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	۶ر
سنہ ۳۱ء	
جولائی	۳ر
اگست	۳ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۳ر
نومبر	۳ر
دسمبر	۳ر
سنہ ۳۲ء	
جنوری	۱۲ر
فروری	۴ر
مارچ	۴ر
اپریل	۸ر

مہینہ	قیمت
سنہ ۳۲ء	
مئی	۴ر
جون	۴ر
جولائی	۴ر
اگست	۴ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	۴ر
سنہ ۳۳ء	
فروری	۴ر
مارچ	۸ر
اپریل	۸ر
مئی	۸ر
جولائی	۴ر
اگست	عمر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴

منیجر نگار لکھنؤ

"ایثار"

نثار اور ہاشم اس وقت سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے جب انھیں اس کا احساس بھی نہ تھا کہ محبت کیا چیز ہے، بچپن کی محبت اگرچہ اپنے اندر وہ طوفانی شورشیں نہیں رکھتی جو شباب میں نظر آتی ہیں لیکن اس کا معصومانہ انداز اور پاک جذبہ فرشتوں کے تبسم کی ابدی لذت اور دائمی مسرت رکھتا ہے، وہ ایک قوت تھی جو نہایت غیر محسوس انداز میں لیکن مسلسل ایک مقدس ارادہ کی طرح اُن کے سینوں میں پرورش پا رہی تھی۔ اگرچہ دونوں کی افتاد طبیعت میں کچھ فرق تھا، دونوں کے خیالات میں جا بجا اختلاف تھا لیکن دوستی اور محبت کی نیرنگیاں ان سب پر بالا تھیں، ہر اختلاف صرف اپنی ذات تک محدود تھا اور ہر ذاتی نقطۂ نظر اس کی منفرد ہستی تک اثر رکھتا تھا، محبت کی بارگاہ میں پہونچ کر ہر تفریق مٹ جاتی تھی، مختصر یہ دونوں میں بیحد محبت تھی اور ان کا زیادہ تر وقت ایک ساتھ گزرتا تھا۔ یہاں تک کہ گانوں کے لوگ آپس کی گفتگو میں دونوں کا نام بھی ساتھ ہی لیا کرتے تھے

ایک زمانہ گزرا اور دونوں کے بچپن نے کروٹ لی، شباب اپنی تمام ہیجانی کیفیتوں کے ساتھ آگیا، جوانی کی کیف آور گھڑیاں انبساط کے ساتھ افسردگی اور وارفتہ سری بھی لائیں، حسن و عشق کے معنی سمجھ میں آنے لگے اور دونوں احساسات کی اُس منزل پر پہونچ گئے جہاں ہر خاموشی سے نغمہ نکلنے کی آرزو کی جاتی ہے اور ہر زیر نقاب چہرہ کو عریاں دیکھنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے، ذہنیت کی یہ عجیب و غریب تبدیلی جسقدر زیادہ قوی ہوگی اُسی قدر سختی کے ساتھ زندگی کی منازل قطع ہوں گی، شراب میں جتنی زیادہ تلخی ہوگی خمار اُسی قدر زیادہ کرب و اضطراب پیدا کرے گا، متین اور سنجیدہ انسان بھی شباب کے ان کہربائی جھٹکوں کی تاب نہیں لاسکتے۔ جس میں ہر جمیل شے اپنی طرف کھینچتی ہوئی نظر آتی ہے اور ہر حسین جلوہ دعوتِ نظر دیتا ہے

تو ہاشم اور نثار اب جوان تھے اور حیات کے اُس نقطہ پر تھے جہاں سارے وجود پر ایک بیخودی سی چھائی رہتی ہے۔ محمد آباد (جہاں ان کا گھر تھا) کے قریب ہی غوث پور نام کا ایک چھوٹا سا گانوں تھا، ہاشم کا باپ وہاں کا زمیندار تھا، گانوں آبادی کے لحاظ سے تو نہایت مختصر تھا لیکن شادابی میں اپنی آپ ہی مثال تھا، ہر فصل میں کھیت لہلہاتے ہوئے نظر آتے تھے، باغیچوں میں پارک کا لطف حاصل ہوتا تھا، آب و ہوا کے لحاظ سے دیہات کو شہر پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے، غوث پور کی سادگی فطرت کے کارنامے کی بہترین مثال تھی، وہاں کی قدرتی رونق کسی انسان کے ہاتھ کی مرہون منت نہ تھی۔ . . . . گانوں سے ملا ہوا اوسر تھا اور کچھ بنجر زمین تھی جس میں غوث پور کے لڑکے اور لڑکیاں اپنے چوپایوں کے ساتھ سارا دن گذار دیتی تھیں، قریب ہی ایک پھیلا تالاب تھا جو برسات میں تنکاریوں کی امید بن

کام کر بنا رہتا تھا ، ہاشم کو شکار سے ایک خاص دلچسپی تھی۔ یوں تو وہ ہر کھیل کا شیدا تھا لیکن شکار میں اُس کا
شوق جنون کی حد تک پہونچا ہوا تھا

گرمیوں کی تعطیل ختم ہونے کے قریب تھی ، بارش شروع ہو چکی تھی ، گانوں سے اطلاع آئی کہ تالاب
میں بطیں وغیرہ آنے لگی ہیں ۔ ٹھیک دوپہر کا وقت تھا جب ہاشم بندوق اور نثار کو ساتھ لے کر غوث پور روانہ
ہو گیا ، راستہ بھر شیریں فرہاد کے قصہ پر بحث ہوتی رہی ، ہاشم کا خیال تھا کہ فرہاد کو اُسی وقت مایوس ہو کر اپنا کام تمام
کر لینا چاہیئے تھا جب خسرو کی رقیبانہ چشمک شروع ہوئی تھی کیونکہ ایک بادشاہ کے مقابلہ میں ایک معمولی پیشہ ور
انسان کو کامیابی کی کوئی اُمید نہیں ہو سکتی تھی ، لیکن نثار کا نظریۂ محبت اس سے بالکل جداگانہ تھا ، وہ خیال کرتا
تھا کہ محبت ایک غیر فانی قوت ہے جو پیدا ہونے کے بعد مٹ نہیں سکتی ہے ، ممکن ہے کہ اُس کا محبوب اس سے چھین لیا
جائے لیکن محبت پھر بھی باقی رہ جانے کی چیز ہے ، فرہاد کو کبھی اسقدر جلد مایوس نہ ہونا چاہیئے تھا .... بحث کا
یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ تالاب نظر نہ آیا کیونکہ اس کے بعد ہی ہاشم نے فوراً موضوعِ گفتگو تبدیل کر دیا
اور اُس کی نگاہیں چڑیوں کی جستجو میں سطحِ آب پر گردش کرنے لگیں ، بہت تلاش کے بعد بھی کوئی شکار نہ ملا دونوں ناکام
غوث پور کے ایک باغ میں آئے کہ دوپہر کی گرمی سے پناہ لیں۔ انھیں گھاس پر لیٹے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا
تھا کہ پیچھے سے دو لڑکیوں کے ہنسنے اور ہنسی کے ضبط کرنے کی آواز آئی ، نثار اور ہاشم اٹھ بیٹھے ، لڑکیوں نے ہاشم کو
پہچانا کہ وہ اُن کے زمیندار کا لڑکا ہے ، دونوں نے سر جھکا لیا اور کوئی ایک منٹ بعد تیزی سے گانوں کی طرف چل دیں
ہاشم نے لڑکیوں کو بہت دنوں کے بعد دیکھا تھا لیکن پہچان گیا ، رضیہ اور سائرہ ایک غریب گھر سے تعلق
رکھتی تھیں ، اُن کی اور اُن کی اعزہ کی گذر اوقات دن بھر ہر طرح محنت کرنے کے بعد ہوتی تھی ، مشقت اٹھانے کی
وجہ سے اُن کے چہروں میں خون ہر وقت دوڑتا ہوا نظر آتا تھا ، اُن کی اداؤں میں فطرت اپنے سادہ رنگ میں
جلوہ نما تھی ، تصنع کا شائبہ تک نہ تھا لیکن اُن کی سادگی ہی میں وہ انداز پنہاں تھے جو نہایت غیر محسوس طریقہ پر دل
میں گھر کرتے جاتے تھے ...... کس قدر حیرت افزا بات ہے کہ ایک تیر افگن کے ہاتھ میں تیر و کماں موجود ہوں
اور وہ انکا استعمال نہ جانتا ہو ..... لیکن یہاں یہی عالم تھا۔ رضیہ کی پہلی ہی نگاہ ہاشم کو سرشار اور نثار کو
بیخود بنا چکی تھی لیکن خود اُسے اس کا کوئی احساس نہ تھا کہ اُس نے کائنات میں کونسی نئی بات پیدا کر دی

حسن و جمال کے لحاظ سے رضیہ اپنے گانوں میں اور قرب و جوار میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی اس کے صبیح چہرہ سے
جوانی کی شراب چھلکی پڑتی تھی ، اُس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک نمی رہتی تھی ، یا تو وہ غربت کے احساس سے تھی
یا دن بھر کی محنت و مشقت کا نتیجہ لیکن اُس نے آنکھوں کی چمک اسقدر بڑھا دی تھی کہ دیکھنے والا انھیں عرصہ تک

دیکھ سکتا تھا، شباب کے لحاظ سے وہ ایک پھول تھی جو ابھی ابھی کھلا ہو۔ لیکن چونکہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی اس لئے ابھی اُس کی شادی وغیرہ کا کوئی انتظام نہ ہوا تھا، ہندوستان میں ہر شخص وہیں شادی بیاہ کرنا چاہتا ہے جہاں حُسن بھی دولت کے ساتھ ہو

نثار اور ہاشم دونوں خاموش پڑے ہوئے تھے، یہ ظاہر ہے کہ دونوں کا موضوعِ تخیل رضیہ کی ہستی تھی۔ لیکن ایک دوسرے کے احساسات سے بے خبر تھا، شام ہونے کو آئی اور آفتاب اتنا جھک گیا کہ باغ میں دھوپ آ گئی، درختوں پر پرندوں کی آواز خوشگوار معلوم ہونے لگی، اُس وقت ہاشم اُٹھ بیٹھا

"نثار کیا سو گئے؟" ہاشم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، نثار جیسے ایک شیریں خواب سے چونکا دیا گیا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "نہیں سو تو نہیں رہا تھا . . . . لیکن ہاشم چل کہاں رہے ہو؟"

"کیوں؟ چلو ایک دفعہ پھر تالاب دیکھتے ہوئے گھر واپس چلیں" —— ہاشم نے کہا "لیکن ہاشم اب . . . . ہاں جلد چلنا چاہئے" نثار نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا —— دونوں چلنے ہی کو تھے کہ رضیہ ٹوکری لئے ہوئے لکڑیاں جمع کرتی ہوئی نظر آئی، وہ سیدھی اسی باغ کی طرف آ رہی تھی، بغیر کسی ارادہ اور گفتگو کے دونوں پھر ٹھہر گئے، ایک قوتِ مجہول تھی جس نے اُن کے پیروں میں زنجیر ڈال دی اور اُن کی زبانیں بند کر دیں، رضیہ باغ میں آ گئی، اُس کی رفتار میں شہزادیوں کا سا استغنا اور دلکشی پائی جاتی تھی، قریب پہونچتے ہی ہاشم نے اُس سے گفتگو شروع کر دی، کبھی کبھی نثار بھی بول دیا کرتا تھا، رضیہ کی گفتگو سے کچھ ایسا ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی دونوں کی قدر کرتی ہے، بات کرتے کرتے اس نے کچھ سوچا اور یہ کہتی ہوئی ایک طرف چل دی "ابھی ہمیں گھر کا سب کام کرنا ہے" —— تھوڑی دور تک ہاشم اور نثار نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا اُس کے بعد ایک دوسرے پر نظر ڈالی دونوں کے چہروں کا رنگ اُڑا ہوا تھا، نثار نے دفع دخل کے طور پر کہا

"ہاشم تم پریشان نظر آ رہے ہو"

"اور تمھارا چہرہ بھی مجھے بے رونق نظر آ رہا ہے" —— ہاشم نے جواب دیا۔ اب دونوں نے سمجھا کہ ان کی زندگی میں کوئی انقلاب رُونما ہونے والا ہے، اُن کے سکون میں فرق آنے والا ہے، اُن کے خیالات کوئی نئی کروٹ لینا چاہتے ہیں، تالاب تک گئے لیکن شام زیادہ ہو گئی تھی اس لئے فوراً گھر واپس ہو گئے۔ راستہ میں رضیہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی، گویا فرہاد و شیریں کا واقعہ دوسرے الفاظ میں دھرایا جا رہا تھا

"دیکھو ہاشم قدرت کا یہ راز سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک دل آویز پھول دامنِ کوہسار میں کھلتا ہے اور مرجھا جاتا ہے۔ اُس کی بہار دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا . . . . رضیہ کو تو وہاں پیدا ہونا چاہئے تھا جہاں اہل نظر اُس کی پرستش کرتے اور . . . . . ."

ہاشم نے بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن پھولوں کے ڈھونڈھنے والے پہاڑوں اور وادیوں میں بھی پہونچ جاتے ہیں" جب تک گھر نہ آگیا دونوں نے رضیہ کے سوا کوئی اور گفتگو ہی نہ کی، رات اسی انتظار میں گذری کہ صبح کو پھر غوث پور جائیں گے

اب روزانہ کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ دونوں صبح کو غوث پور جاتے اور شام کو واپس آتے رضیہ کو بھی ایک دلی تعلق سا ہوگیا تھا وہ ضرور ان سے ملتی اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ نظر التفات کس کی طرف زیادہ رکھے، اُس کی گفتگو سے بعض اوقات اُس کشمکش کا اظہار ہو جاتا تھا جو وہ ایسے موقع پر محسوس کرتی تھی، نثار کی خاموش محبت اس کے دل میں جگہ کررہی تھی مگر ساتھ ہی ہاشم کا عریاں اظہار محبت عورت کی کمزوری پر قابو پا رہا تھا۔ لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ پر یہی سمجھ رہے تھے کہ رضیہ کو مجھ سے زیادہ دلچسپی ہے —— ہاشم، نثار کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا تھا کہ رضیہ کا رجحان اسی کی طرف ہے رفتہ رفتہ نثار کو خود محسوس ہونے لگا کہ رضیہ ہاشم کا زیادہ خیال رکھتی ہے اور نثار کی موجودگی کو اپنے اظہارِ الفت میں ایک رکاوٹ خیال کرلی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہاشم کبھی نثار سے یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ تمھاری وجہ سے میری تمنائیں بر نہیں آتیں لیکن نثار اتنے دنوں ہاشم کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کی اندرونی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا، اُس نے رضیہ اور ہاشم دونوں کے چہرے پر اپنی موجودگی کی تکلیف کا احساس پڑھ لیا

ایک رات اُس نے سوچنا شروع کیا کہ ہاشم کو اُس پر کیوں ترجیح دی جارہی ہے۔ تھوڑی سی غور و فکر کے بعد اُس نے معلوم کرلیا کہ ہاشم اس سے زیادہ حسین ہے، اس کے چہرے پر شباب کی سُرخی پورے آب و تاب سے موجود ہے، اگر حسن ہی معیار محبت ہے تو پھر رضیہ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاسکتا کہ وہ ہاشم کے ہوتے ہوئے نثار کا دم بھرے اُس نے سوچا " مجھے کوئی حق اس بات کا حاصل نہیں ہے کہ میں رضیہ کے دلی جذبات کو ٹھیس لگاؤں میری وجہ سے دو محبت افروز دل ہمیشہ کے لئے دُکھ جائیں گے۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ میں رضیہ کو خوش دیکھوں اگر وہ ہاشم ہی سے مل کر خوش ہے تو مجھے ہر حال میں دونوں کی مدد کرنا چاہئے، یہ تھوڑا سا ایثار دوستی اور محبت کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں چمکے گا اگرچہ اسی جگہ میری ناکام آرزوئیں بھی خونیں حروف میں شعلوں کی طرح لَو دے رہی ہوں گی لیکن ہاشم کا حق دوستی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ میں رضیہ کو بھی خوش کرسکوں گا اگر رضیہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی تو بھی مجھے کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہئے کیونکہ محبت کی غیر فانی لذت درد ہر طرح میری شریک حال ہے۔ محبت کوئی کچا دھاگا نہیں ہے جو رضیہ سے جدا ہو جانے کے بعد ٹوٹ جائے گا بلکہ وہ تو ایک ریشمی ڈورہے جو کھینچنے پر اپنے شکار کو اور زیادہ جکڑ لیتی ہے۔ یہی بہتر ہے کہ ایک انسان دوسرے کے کام آئے۔ محبت یہی سکھلاتی ہے، عشق کا اصل جوہر ہمدردی اور ایثار کا جذبہ پیدا کرتا ہے . . . . . میں رضیہ اور ہاشم کے کام آؤں گا"

جذبات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ نثار کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے وہ اُٹھ کر سیدھا ہاشم کے پاس پہونچا اور

اُس نے کھلے ہوئے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کردیا، نثار کی اس تبدیلی پر ہاشم گھبرا سا گیا اُس نے نثار کی گفتگو سے نہ جانے کیا نتیجہ نکالا اور کہنے لگا

"نہیں نثار میں تم سے جدا ہوکر نہیں رہ سکتا" اور نثار سے لپٹ کر رو دیا "ہاشم تم نہیں سمجھے" نثار نے آنسو رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا "ہاشم میری اور تمھاری محبت میں فرق نہیں آسکتا میری اور رضیہ کی محبت اور بڑھ جائیگی، کس قدر پاک ہوگا وہ جذبہ جو بغیر رضیہ سے ملے ہوئے پیدا ہوتا رہے گا، میرے لئے یہ تمنا ہی بہت ہے کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں"

ہاشم نے کہا "نثار خدا را مجھے زیادہ نہ تڑپاؤ کل تمھیں رضیہ سے ضرور ملنا ہوگا، کل ہماری تعطیل کا آخری روز ہے رضیہ نے قسم دے کے بلایا ہے" "اچھا میں ضرور رضیہ سے ملوں گا" نثار یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ رات بھر اس کی طبیعت میں ایک مد و جزر پیدا ہوتا رہا، وہ اُس کی زندگی کی نہایت صبر آزما گھڑیاں تھیں جب نثار تصور میں رضیہ کو اپنے آغوش میں دیکھتا تھا وہ بہتے ہوئے دریا کے تیز دھارے کا رُخ موڑنا چاہتا تھا وہ بند باندھ رہا تھا لیکن بار بار رخنے پیدا ہو جایا کرتے تھے .... بالآخر اُس نے اپنی خواہشات پر قابو پا لیا اور ایثار کے حقیقی جذبہ سے معمور ہوکر اُس کی روح میں نشاط کی موج دوڑ گئی۔ رضیہ کی خیالی تصویر سے ہمکلام ہوکر سو گیا

دوسرے دن بہت سویرے ہی اُس نے اسباب سفر درست کیا اور نوکر کے ہمراہ اسٹیشن روانہ کرکے خود بھی گھر سے رخصت ہوا، اُس کا احساس اسقدر لطیف اور نازک ہوگیا تھا کہ آج پہلی دفعہ گھر سے چلتے وقت پھوٹ پھوٹ کر رو دیا، باہر آکر اُس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر مختصر سا خط لکھا اور لفافہ میں بند کرکے اپنے چھوٹے بھائی کو دیا کہ اسے اب سے ایک گھنٹہ بعد ہاشم کو دیدینا۔ نثار کو اطمینان سا تھا، اُس کی روح میں سکون تھا، اس کا ضمیر اس کی پاک نفسی پہ آفریں کر رہا تھا، گھر سے روانہ ہوکر وہ سیدھا غوث پورہ پہونچا۔ اتفاق وقت کہ رضیہ کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا وہ آئی اور اُس کے آتے ہی نثار نے کہنا شروع کیا

"رضیہ! نثار اب ہمیشہ کے لئے تیرے جسمانی وجود سے رخصت ہو رہا ہے ..... لیکن میری روح اُس وقت تک تیری روح سے ملتی رہے گی جب تک کہ یہ پیکر خاکی اُسے الگ نہیں کردیتا اور اگر روح موت کے بعد بھی مل سکتی ہے تو اُس وقت بھی اُس کی اُمیدوں کا مرکز تو ہی ہوگی ...... میں تجھ سے یہ بھی تمنا نہیں کرتا کہ تو کبھی مجھے یاد کرتی رہنا، لیکن جاتے وقت صرف ایک آرزو ہے اگر تو نے اُسے سُن لیا تو ساری عمر میری ہستی کا ہر ذرہ تجھے دعائیں دیتا رہے گا" (رضیہ گھبرائی ہوئی سُن رہی تھی) "ہاشم میرا سب سے بہتر دوست ہے اُس کی تکلیف مجھے تڑپا دیتی ہے۔ دیکھ اُس کو کوئی رنج نہ پہونچے ...... نثار تیرے قدموں پر سر رکھنے کو تیار ہے" نثار نے اپنے گھٹنے زمین پر رکھ دیئے رضیہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی نثار اب بھی کہہ رہا تھا "رضیہ یہ میری زندگی کا

پہلا سین

ابلیس کی تقریر

توراۃ کی روایت ہے کہ ابلیس اور اس کے ساتھیوں نے خداوند عالم کے خلاف بغاوت کی مگر ناکام رہا۔ خداوند عالم کی فوجوں نے باغیوں کو ہرا کر جہنم میں جھونک دیا۔ جہنم میں جملہ شیاطین پر غفلت اور غنودگی چھا گئی۔ سب سے پہلے ابلیس کو ہوش آیا، اور وہ کھڑا ہو گیا۔ بلند، بالا، سرو قد، جوان، خوبصورت۔ چہرہ پر وہ نور کہ چودھویں کا چاند شرمائے اور دیری کا یہ رنگ کہ اس کا ثانی تلاش کریں تو نہ پائیں۔ کسیلا، چھریرا بدن، کٹیلا نقشہ، نشیلی آنکھیں۔ داہنے ہاتھ میں تلوار بائیں میں نیزہ، سر پر تاج، مدبر، فیلسوف، سپاہ سالار۔

وہ کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ سیاہ بھیانک آگ۔ آگ کی لپٹوں میں روشنی نہ تھی، اندھیرا تھا۔ ہر طرف مایوسی و محرومی و ناکامی و نامرادی کی شکلیں نظر آتی تھیں اور آگ کے سمندر میں شیاطین یوں تیر رہے تھے جیسے آسمان پر تارے

وہ آگ کی موجوں کو چیرتا ہوا ایک قریبی ٹاپو کی طرف بڑھا۔ پہلے تو اپنے مضبوط بازوؤں سے بہتی ہوئی آگ پر تیرتا رہا۔ پھر فضا میں اُڑنے لگا، جیسے فرشتے اُڑا کرتے ہیں۔ اس کے پر چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی رفتار بجلی سے تیز تھی۔ وہ جہنمی ٹاپو کے آتش فشاں پہاڑ کی دہکتی ہوئی چوٹی پر کھڑے ہو کر اوپر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی تیز نظر آسمانوں کے پردوں کو چیرتی ہوئی۔ فردوس بریں کے باغ میں پہونچی۔ وہاں ہی عظیم الشان فتح کی خوشی میں ناچ رنگ کی مجلس گرم تھی اور حوروں کے گانے کی آواز آ رہی تھی

تری شان جل جلالہٗ ۔ تری ذات عم نوالہٗ

ترا حسن لیس مثالہٗ ۔ تو عظیم ہے تو قدیم ہے

یہ ترا ہی نور ہے سو بسو ۔ یہ ترا ہی روپ ہے برد بر د

یہ ترا ہی رنگ ہے ہو بہو ۔ تو غفور ہے تو رحیم ہے

تو خدائے حسن وجمال ہے - تو الٰہ جل وجلال ہے
توکمال اوج کمال ہے - توحکیم ہے تو کریم ہے
ترا کلمہ پڑھتی ہیں طوطیاں - ترا نام لیتی ہیں بجلیاں
ترا غلغلہ ہے جہاں تہاں - تو علیم ہے تو فہیم ہے

وہ زور سے چلّایا :---

اے جنتو ! --- اے آسمانو ! --- اے فردوس کی خوشبو ! --- اے عرش کی عظمتو ! --- الفراق ، الفراق ، الوداع ، الوداع --- اور اے جہنمو ! اے جہنموں کی پستیو ! اے جہنموں کی مصیبتو ! تکلیفو ! ، مرحبا ، مرحبا ، آؤ ، اٹھو ، اپنے نئے مہمانوں کا استقبال کرو - آنکھیں بچھاؤ ، دل وجان قربان کرو - آج تمھارے یہاں وہ عظیم المرتبت ہستیاں تشریف لائی ہیں جنکا ہم پایہ وہم رتبہ نہ کوئی آسمانوں میں ہے نہ جنتوں میں ، نہ ارواح میں نہ ابدان میں ، نہ لاہوت میں ، نہ ناسوت میں ، نہ وجوب میں نہ امکان میں

(اس کا دل دھڑکنے لگا ، آواز رُک گئی ، لب بند ہوگئے - وہ اپنے ساتھیوں کی انتہائی غفلت و مدہوشی دیکھ کر دم بخود رہ گیا - آنکھوں میں آنسو بھر آئے - دیر تک خاموش کھڑا چاروں طرف دیکھتا رہا - پھر یکایک زور زور سے پکارنے لگا)

اے قدوسیو ! معظم قدوسیو ! محترم فرشتو ! مکرم شہزادو ! اُٹھو ! کھڑے ہو جاؤ ! اے آسمانوں کی پاک روحو ! اے ملاءِ اعلیٰ کے چمکیلے ستارو ! اے عظمت کے پہاڑو ! نور کے گنبدو ! روشنی کے ستونو ! غفلت ، سستی ، بے ہوشی ، بے حسی ، آسمانوں کی غلام روحوں کے حوالہ کردو - اٹھو - کھڑے ہو جاؤ !

(معاً تمام شیاطین کروروں بدموں کی تعداد میں جلتے ہوئے تابوتوں میں اس کے گرداگرد جمع ہوگئے اور سب کے بیچوں بیچ وہ خود کھڑا تھا ، جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چاند)

آہ ! یہ کیسی غفلت ہم پر چھا گئی تھی ! حیرت میں ہوں یہ کس چیز نے ہمیں غافل کردیا تھا ! وہ پاک ہستیاں جو غلامی کی ملعون زنجیروں سے آزاد ہو چکی ہوں اور خودداری و آزادی کے جھنڈے ہاتھوں میں لئے ہوں ، کیا غفلت و بے ہوشی کا شکار ہو سکتی ہیں ! وہ نورانی پیکر جن کے زرّیں کارنامے صفحۂ ہستی پر ابد تک قائم رہنے والے ہوں کیا غلامی و بے بسی کی زندگی پر قناعت کرسکتے ہیں !

قسم ہے اس مقدس تلوار کی ، اور اس متبرک نیزے کی ، اور اس عظمت وجبروت کے تاج کی جو میرے سر پر چمک رہا ہے - کہ ہم غلام نہیں ہو سکتے - ملاءِ اعلےٰ کی تمام ہولناک قوتیں سر ٹکرا ٹکرا کر فنا ہو جائیں گی

مگر ہم ہیں کے ایک فرد کو بھی غلام نہیں بنا سکیں گی

(تالیاں بجیں)

معظم قدسیو! — یہ جہنم ہے اور تم جہنم میں ہو! — یہ آگ ہے اور تم آگ میں ہو! — مگر تم جہنم کے بادشاہ ہو، کرۂ نار کے فرمانروا ہو، آزاد و خود مختار ہو۔ تم ننھی کھوپڑی والے جبریل اور چوڑے کانوں والے میکائیل نہیں ہو۔ وہ غلام بھیڑیں ہیں، تم آزاد شیر ہو، شیر نر، شیر ببر ہو۔

کون ہے جو آزادی کا علم بردار نہیں ہے، کون ہے جو غلامی پسند کرتا ہے، اگر کوئی غلام بننا چاہتا ہے تو آگے بڑھے، میں اُسے غلاموں کی جنت میں ڈھکیل دوں کہ وہاں شوق سے عرش کے پتھروں پر اپنی پیشانی رگڑا کرے، گڑگڑایا کرے اور مرا کرے

(کوئی نہیں، کوئی نہیں کی آوازیں)

کیا یہ گڑگڑانا اور رونا اور معافی مانگنا اور عاجزی کرنا، ذلت کی انتہا اور رسوائی کی تحت الثریٰ نہیں ہے
یہ کام ہم سے کبھی نہ ہوگا، کبھی نہ ہوگا

معظم قدسیو! — کیا یہ جہنم ہے؟ کیا یہ واقعی جہنم ہے؟ نہیں نہیں — یہ جہنم نہیں ہے۔ قسم ہے تمھارے عظمت و جلال کی یہ جہنم نہیں ہے — ہمارے لئے یہ جہنم نہیں ہے۔ غلام روحوں کے لئے جہنم ہے۔ سر جھکانے والی اور ماتھا ٹیکنے والی کٹ پتلیوں کے لئے جہنم ہے

ہمارے لئے یہ جہنم جنت ہے اور جنت جہنم ہے۔ ہمارے لئے یہ آزاد جہنم ایک نہیں ستر ہزار جنتوں سے ستر ہزار درجے اعلیٰ و اولیٰ، ارفع و افضل ہے

ولَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا

جنت اور جہنم کا بنانا اور بگاڑنا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہم جب چاہیں جنت کو جہنم اور جہنم کو جنت بنا سکتے ہیں۔ دوستو! — یہ جنت اور جہنم کیا ہے؟ — ایک زاویۂ نگاہ ہے — ایک حلقۂ خیال ہے۔ ایک گوشۂ تصور ہے اور بس

کوئی عظیم دیوتا ہمیں اس جہنم سے نکال نہیں سکتا۔ موت ہمیں چھو نہیں سکتی۔ ہماری ہستی لازوال ہے ہماری روح غیر فانی ہے۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ زندہ اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ اس دیوتا سے لڑتے رہیں گے جو آزادوں کو غلام بناتا ہے اور غلاموں کو ذلیل کرتا ہے۔ کیا ہی مقدس ہیں وہ ہستیاں جو اُس کی بندگی سے آزاد، اور اس کی محتاجی سے مستغنی ہیں!

(چاروں طرف سے مرحبا مرحبا کا وہ شور اٹھا کہ عرش بریں کے قلعے کی دیواریں ہلنے لگیں)

مکرم فرشتو ! ـــــ اس میں شک نہیں کہ ہمارے دشمن کی مادی طاقت ہم سے کسی قدر زیادہ ہے اور اسی وجہ سے اس نے ہمیں تیر و تفنگ کی لڑائی میں ہرا کر جہنم میں ڈھکیل دیا ہے مگر کیا ہوا ؟ ـــ ہم نے کچھ ہتھیار نہیں رکھدیے! اپنی ہار تسلیم نہیں کی ! ـــــ ہم قیامت تک ہتھیار نہیں رکھیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ لڑتے رہیں گے ۔ پہلے آسمانوں اور جنتوں کی بلندیوں پر لڑتے تھے ۔ اب زمینوں اور جہنموں کی پستیوں میں لڑیں گے ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نیا محاذ جنگ ہمارے حق میں زیادہ مفید ہے

ہم اپنی قوت کا بھی امتحان کر چکے اور دشمن کی قوت کا بھی لہذا اب جو لڑائی ہوگی خواہ وہ تیر و تفنگ کی لڑائی ہو یا فریب و دجل کی ۔ میدان ہمارے ہاتھ رہے گا کیونکہ ہمارا تجربہ پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور ہماری قوت میں بال برابر بھی کمی نہیں ہوئی ۔ ہم ہرگز ہرگز چین نہیں لیں گے جب تک عرش و فرش پر ہماری حکومت قائم نہ ہو جائے اور جب تک تمام سر جھکانے والی قوتوں کا قلع قمع نہ کر ڈالیں ۔ یہ بات تو مسلم ہے کہ ہم غلامی نہیں کر سکتے کسی قسم کی غلامی نہیں کر سکتے اور اگر ہم یوں ہی خاموش پڑے رہیں تو یہ بھی ایک طرح سے اس عرش والے دیوتا کی خوشی ہوگی جس کے سامنے ہم نے اپنی گردنیں جھکا دینے سے انکار کر دیا ہے ۔ اور جس کی ہر آن مخالفت و مقاومت ہماری زندگی کا وحید مقصد ہے

دلیرو !ـــ بہادرو !ـــ بتاؤ ، کیا کرنا چاہئے اور آسمانی قوتوں سے کیونکر لڑنا چاہئے ؟

اے ہمت و شجاعت کے قافلہ سالارو ! اے ملاء اعلیٰ کے معزز شہزادو ! اے قدسیوں کے استادو ! ملائکہ کے آقاؤ ! تمھاری ہمت پر مرحبا ، تمھاری شجاعت پر آفریں ۔ اور تمھاری دلیری پر عرش و فرش ، سدرہ و کرسی ، برزخ و جنت ، آسمان و زمین اور ہر وہ چیز جو آسمانوں کے اوپر ہے ۔ اور زمینوں کے نیچے ہے اور آسمانوں اور زمینوں کے درمیان ہے قربان کی جا سکتی ہے

قسم ہے تمھارے مضبوط سینوں اور فولادی بازوؤں کی کہ تمھاری بے نظیر اور بے بدل اولوالعزمیوں کے آگے فردوس کے کنگورے اور عرش کی برجیاں سرنگوں و شرمسار ہیں ۔ مگر جلدی نہ کرو ، یہ جلدی کا محل نہیں غور و فکر کرو کہ کیا کرنا چاہئے ؟ـــ علانیہ جنگ کرنی چاہئے یا خفیہ جنگ ؟ـــ بازوؤں کی قوت کے جوہر دکھانے چاہئیں یا دماغی قوت کے ؟

مجھے خبر ملی ہے کہ عرش والے دیوتا نے نظام حکومت کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے ہیں اور وہ اپنے بیٹے مسیح کو ہمارے مقابلے میں بھیجنے والا ہے ۔ مگر قسم ہے تمھاری تلواروں کے جوہر کی کہ ہم اس نئے نظام حکومت کے بھی پرخچے اڑا ڈالیں گے ۔ اور مشرق سے مغرب تک کھلی بغاوت پھیلا دیں گے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم غفلت نہ کریں ۔ اور غور کریں کہ کیا کرنا چاہئے اور کیونکر کرنا چاہئے ؟

ایک عظیم الشان کانفرنس ہو اور اس میں موجودہ مسائل کے ہر پہلو پر غور کیا جائے۔۔۔۔۔
بعلز بول ـــــ "ضرور ضرور، قدوسیو! چلو آؤ کانفرنس کے لئے خیمہ نصب کریں"
(پردہ گرجاتا ہے)

(ملٹن کا ایک شاہکار)

محمد اسحاق (امرتسری)

مجموعۂ استفسار و جواب تقریباً مفت

باب الاستفسار نگار کی وہ خصوصیت ہے جو ہندوستان کے کسی اور رسالہ میں نہیں پائی جاتی۔ گزشتہ بارہ سال میں اتنے مختلف سوالوں کا جواب دیا گیا ہے کہ ان کا مجموعہ ایک اچھی خاصی انسائکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے جس میں، ادبی، تاریخی، سیاسی، مذہبی و معاشری سیکڑوں قسم کی عجیب و غریب معلومات پائی جاتی ہیں۔ یہ مجموعہ طیار ہو رہا ہے اور تین چار ماہ میں شایع ہو جائے گا۔ ضخامت کے لحاظ سے اس کی قیمت پانچ روپیہ سے کم نہ ہوگی لیکن

آپ اس کو معہ محصول ۱۲؎ میں حاصل کر سکتے ہیں

اور وہ اس طرح کہ آپ ۳۴ء میں نگار کی خریداری جاری رکھئے۔ جس وقت یہ مجموعہ شائع ہو جائے گا۔ نگار میں اعلان کر دیا جائے گا اور جن حضرات کے نام ۳۱ر جنوری ۳۴ء کو نگار کے رجسٹر خریداری میں درج پائے جائیں گے ان کو یہ نادر ذخیرہ صرف ۱۲؎ میں بھیجدیا جائے گا

خریدار نئے ہوں یا پرانے سب اس موقعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

مینجر نگار لکھنؤ

سویٹ روس اور الحاد

ہرچند گزشتہ پندرہ سال میں مطابع انگلستان نے بالشویک روس کی مذہب دشمنی کی طرف بہت توجہ مبذول کی ہے تاہم اخبار بیں طبقہ کو ابھی تک اس بات کا صحیح اندازہ نہیں کہ وہاں مذہب اور کلیسا کے ساتھ کیا حقیقی واقعات پیش آرہے ہیں، اور تحریک الحاد کو اس ملک میں کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے

میں مارچ سنہ ۲۶ء میں روس گیا تھا اور فروری سنہ ۲۹ء تک وہاں مقیم رہا، میں روسی زبان سے واقف ہوں اور میں نے ان خلاف مذہب کتابوں، اخباروں اور رسالوں کا بغور مطالعہ کیا جنکی سویٹ روس میں نہایت کثرت اور آزادی کے ساتھ اشاعت ہورہی ہے

روسی ملحدین کی کانگریس کا پہلا اجلاس اپریل سنہ ۲۵ء میں ماسکو میں منعقد ہوا تھا جس میں ملحدین کی ایک انجمن قائم کی گئی۔ اس سے قبل ملحدین کی متعدد جماعتیں ملک کے مختلف حصص میں نمودار ہوچکی تھیں لیکن اسوقت تک مذہب کے خلاف کسی باقاعدہ نظام کے ماتحت اعلان جنگ نہیں ہوا تھا۔ انجمن ملحدین کے دوسرے جلسہ میں جو ۱۰ر جون سنہ ۲۹ء لغایت ۱۶ر جون سنہ ۲۹ء تک رہا ۳۶ مختلف قوموں کے ۹۲۰ مندوبین شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں یہ انجمن (لیگ آف ملٹینٹ ایتھیسٹ) "رزمیہ انجمن ملحدین" بن گئی جس کے قواعد وضوابط مرتب ہوگئے اور الحادی خیالات کی اشاعت کے لئے ایک لائحہ عمل تیار کرلیا گیا۔ ان قواعد وضوابط کی رو سے انجمن کی رکنیت کا ہر وہ سویٹ شہری مستحق ہوسکتا ہے جو مذہب کو خیرباد کہکر اس کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہو برطانوی ریشنلسٹ (عقلیت پرست) اور سیکولرسٹ (دنیا پرست) انجمنوں کے برعکس سویٹ "رزمیہ انجمن ملحدین" کو بڑی سرعت کے ساتھ ترقی حاصل ہوئی۔ اراکین انجمن کی تعداد کا ایک سرکاری نقشہ جو کئی سالوں پر مشتمل ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے

سنہ	تعداد اراکین	سنہ	تعداد اراکین
۱۹۲۶	۸۷۰۳۳	۱۹۳۰	۲۰۰۰۰۰۰
۱۹۲۷	۱۳۸۴۰۲	۱/۱/۳۱	۳۵۰۰۰۰۰
۱۹۲۹	۴۶۵۴۹۸	۱/۵/۳۱	۵۰۰۰۰۰۰
		۱۹۳۲	۵۵۰۰۰۰۰

۱۹۳۳ء کے متعلق صحیح اعداد دستیاب نہیں ہو سکے لیکن اُن کا شمار ساٹھ لاکھ سے ضرور زیادہ ہوگا

چونکہ زار کے زمانہ میں ملحدانہ خیالات کی اشاعت قانوناً ممنوع تھی اس لئے انقلاب سے پہلے منکرین خدا کی تحریرات سے عوام الناس قطعی نابلد تھے لیکن بالشویکوں کے برسر اقتدار ہو جانے کے بعد فضا تبدیل ہو گئی اور غیر ملکی ملحدین کی مشہور ترین کتابوں کا روسی زبان میں ترجمہ ہو کر نہایت ارزاں قیمت پر شایع ہونے لگا اور خلاف مذہب تحریرات ملک کے اطراف واکناف میں پھیل گئیں۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۲ء تک سترہ سو الحادی کتب ورسایل شایع ہوئے جن کی جلدوں کی تعداد چار کروڑ تک پہونچ گئی۔ ۱۹۲۷ء میں ۶۰۸ صفحوں کی ایک نہایت ہی دیدہ زیب کتاب "(Anti-religious text book for workers)" کے نام سے تالیف ہوئی جس کے ۱۹۳۱ء تک چھ ایڈیشن طبع ہوگئے اور جن میں چھٹے ایڈیشن کے ایک لاکھ نسخے شایع ہوئے۔ اسی زمانہ میں ۴۳۸ صفحوں کی ایک اور کتاب (Anti-religious book for pheasants) کے بھی چھ ایڈیشن طبع ہوئے اور آخری ایڈیشن کے دو لاکھ نسخے فروخت ہوگئے۔ اگر "ریشنلسٹ پریس ایسوسیئشن" لندن کے پچھلے "سالانہ جلسہ" کے موقع پر پروفیسر لیوی "تھنکرس لائبریری" کی تیس مختلف کتابوں کی ایک لاکھ جلدوں کی فروخت کو شاندار کامیابی سے تعبیر کر سکتے ہیں تو محض دو الحادی کتابوں کی تیس لاکھ جلدوں کی غیر ترقی یافتہ روسی جمہور کے درمیان فروخت کو کس قسم کی کامیابی سے تعبیر کیا جائے گا۔ ایک جدید عقلیت پرست مسٹر ارچی بولڈ رابرٹسن نے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے "لٹریری گائیڈ" میں صفحہ ۱۸۱ پر "یونین آف سویٹ سوشلسٹ ریپبلک" کی اس تمام تحریک الحاد کو صحیح طور پر الفاظ ذیل میں ظاہر کیا ہے "ایسا غیر معمولی خلاف مذہب انقلاب دنیا نے قسطنطین اور تھیوڈوسیس کے زمانہ سے اب تک نہیں دیکھا"

"رزمیہ انجمن ملحدین" کا طریق کار کیا ہے؟ انجمن کی تنظیم کی بنیاد ایک ایسے مرکز پر قائم ہے جو کم از کم تین اراکین پر مشتمل ہے یہ مرکز اشاعتی دوائر، تقاریر، مناظرات، اور خلاف مذہب مظاہرات کا اہتمام کرتا ہے، الحادی فلموں کی طیاری کا بندوبست کرتا ہے اور کتب الحاد کی اشاعت کو ترقی دینے کی تدابیر عمل میں لاتا ہے۔ یہ مرکز اپنے دائرہ کے رضاکاروں کی جماعتوں سے خاص طور پر اور "سیاسی تعلیمی" اداروں سے عام طور پر قریبی تعلقات قائم رکھتا ہے۔ اراکین انجمن کے واسطے لازمی ہے کہ وہ قدیم روس کی غیر صلاحیت اور اضمحلال کے خلاف حیات جدید کے جدوجہد کے میدان میں صف اول میں استادہ ہوں، تمام جنگجو ملحدین اجتماعیت عمرانی کی خلوص دل سے تعمیر کریں، اور مخصوص فوجی خدمات، اشتراکیت، زراعت، اور رفع جہالت میں پوری مستعدی سے حصہ لیں مذہب کے خلاف جنگ کرنے کے لئے سویٹ ماہرین طبیعیات وفلسفہ وحرفت کی خدمات حاصل کرنے کی خاص کوشش جاری ہے جس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔ اکثر ادارہائے طبیعیات میں انجمن کے اراکین کام

کر رہے ہیں اور ماہرین طبیعیات و فلسفہ و حرفت انجمن کی نگرانی میں درس دیتے ہیں، دیہات میں جاہل کاشتکاروں کے مذہبی تعصبات اور رسمیات کے خلاف ماہرین فن زراعت اطباء اور معلمین کے اثرات کو بطور طاقتور اسلحہ کے استعمال کیا جاتا ہے - سویٹ اتحاد کے طول و عرض میں (جو کرۂ زمین کا ۱/۶ حصہ ہے) ترویج تعلیم اور اخراج مذہبیت کے لئے مطابع، سینما، مدارس، جامعات اور کتبخانے باقاعدہ استعمال کئے جا رہے ہیں - روسی تحریک الحاد کی اس روز افزوں ترقی اور کامیابی کا برطانیہ کو خاص توجہ کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ایسے وقت میں جبکہ "ہٹلر" کی "براؤن شرٹ" افواج اعتدال پسند آزاد خیالوں کو جنگلی جانوروں کی طرح سے اپنا شکار بنا رہی ہیں اور جبکہ فیسسٹ اٹلی کا رومن کیتھلک فرقہ ڈیوس اور اس کی جماعت کی حمایت میں محفوظ ہے، سویٹ کی حفاظت میں رزمیانہ الحاد روز بروز طاقت پکڑتا جاتا ہے اور مذہبی اعتقادات کروڑوں مزدور پیشہ لوگوں کے سینہ سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو رہے ہیں

عبد الحفیظ

رسالہ جن کے گزشتہ پرچے

بحساب ۸ر فی پرچہ ٹکٹ بھیجکر طلب فرمائیے - رسالہ جن اپنے موضوع کے لحاظ سے ہندوستان میں پہلا پرچہ تھا جو اڈیٹر نگار کی ادارت میں دو سال تک نکلتا رہا

ان پرچوں میں جس قسم کے مضامین نکل چکے ہیں۔ وہ اب کبھی میسر نہیں آسکتے

مینجر نگار لکھنؤ

زندگی کا بوجھ

ایک دن میں سمندر کے ساحل پر پہونچی اور وہاں ایک بڑی چٹان کے سایہ میں بیٹھ گئی - میں وہاں بیٹھی ہی تھی کہ چٹان کو کہتے ہوئے سنا :-

" زندگی کا بوجھ بھی کیسا ناگوار بوجھ ہے ! ایک فصل کے بعد دوسری فصل آتی ہے - ایک زمانہ کے بعد دوسرا زمانہ آتا ہے ، وہی آسمان ہے ، وہی زمین ، وہی سورج کا یکساں طلوع وغروب ، وہی چاند کا ایک طرح گھٹنا بڑھنا ، وہی ستاروں کا رات کو چمکنا اور دن میں آنکھیں بند کر لینا

ہَوا آتی ہے اور میری آنکھوں میں اپنی گرمی چھوڑ جاتی ہے ، نسیم چلتی ہے اور میرے کانوں میں اپنی ٹھنڈی سانسیں بھر جاتی ہے - کہر منتشر ہوتا ہے اور اپنے سیاہ کفن سے مجھے ڈھک لیتا ہے ، بادل اٹھتا ہے اور مجھ پر برہم ہوکر برس پڑتا ہے ــــــ یہ چڑیاں چاروں طرف سے آتی ہیں اور میرے سر پر بیٹھ کر لڑتی ہیں جھگڑتی ہیں ، جشن مناتی ہیں اور ہنگامہ برپا کرتی رہتی ہیں ــــــ یہ درخت اپنی جڑوں سے مجھے روز بروز جکڑتے جا رہے ہیں اور اپنے پتے گرا گرا کر مجھے داغدار بناتے جاتے ہیں ــــــ میں تو اس زندگی سے باز آئی ، اے سمندر مجھ پر رحم کر اور جلد مجھے نگل لے "

دفعۃً سمندر کی ایک موج بلند ہوئی اور چٹان کے اوپر سے گزر گئی

میں ایک دن سمندر گئی تاکہ اس سے اس کا موتی طلب کروں - میں اسی چٹان پر پہونچی اور وہاں سے اپنے آپ کو پانی کے اندر گرانا چاہا - چٹان کے چاروں طرف کیچڑ تھی ، پتوں کے ڈھیر تھے اور جب میں نے انھیں غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہیں ایک موتی بھی پڑا ہوا ہے - میں موتی اٹھا رہی تھی کہ چٹان بولی :-

" زندگی کا بوجھ بھی کیسا ناگوار بوجھ ہے - وہی کیچڑ ، وہی سڑی ہوئی پتیاں ، وہی مچھلیاں ، وہی موجیں جو کل تھا وہی آج ہے ، جو آج ہے وہی کل ہوگا - کاش میں اندھی ہوتی کہ بار بار ایک ہی چیز کو نہ دیکھ سکتی نہ سُن سکتی ، اے سمندر مجھے عذاب سے نجات دے اور آزادی سے سانس لینے دے "

میں نے دیکھا کہ موجیں ہٹ گئیں ، مچھلیاں چلی گئیں ، آفتاب نے کیچڑ کو خشک کر دیا اور ہوا پتیاں اڑا لے گئی

میں پھر ایک دن سمندر کے ساحل پر گئی اور اس چٹان تک پہونچی - دیکھا کہ آبی چڑیاں اس پر بیٹھی ہوئی دھوپ لے رہی ہیں ، درخت اس کے دوں جانب جھکے ہوئے اپنی شاخوں سے چاروں طرف پھول بکھیر رہے ہیں - میں پھول چننے کے لئے جھکی تو چٹان نے کہا :-

" زندگی کا بوجھ بھی کیسا ناگوار بوجھ ہے ، میں اس یکسانیت سے تنگ آگئی - اے سمندر تو مجھے نگل لے "

چٹان کا یہ جملہ ختم نہ ہوا تھا کہ دفعۃً فضا میں چمک پیدا ہوئی اور بجلی نے اس کو ریزہ ریزہ کرکے تمام ذرات ہوا میں ملا دئے

اب چٹان تو نظر نہ آئی تھی لیکن اس کی یہ آواز ضرور گونج رہی تھی کہ

" آہ ، یہ نیا وطن تو اور زیادہ تکلیف دہ ہے ، یہ نئی زندگی تو کہیں زیادہ پریشان و منتشر ہے "

(میخائیل نعیمہ)

اڈیٹر صاحب نگار کی رائے
خضاب بلیک ڈائمنڈ کے متعلق

اڈیٹر صاحب نگار فرماتے ہیں :-

" اس میں شک نہیں کہ عام طور پر جو خضاب طیار ہوتے ہیں ان میں ڈایامین کا جزو شامل ہوتا ہے جو آہستہ دو مگر نہایت مہلک قسم کا زہر ہے اور اسی لئے اب لوگوں میں اسکی مضرت کا احساس پیدا ہو چلا ہے - خضاب بلیک ڈائمنڈ کے مالک نے اپنا خضاب میرے سامنے طیار کرکے دکھایا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس میں واقعی کوئی مضرت رساں جز شامل نہیں ہے - تجربہ سے اس کا رنگ بھی نہایت پختہ سیاہ ثابت ہوا اور جلد پر دھبہ بھی باقی نہیں رہتا "

کیا اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت ہمارے خضاب کی عمدگی کا ہو سکتا ہے ؟ قیمت فی شیشی عہ علاوہ محصول

تین شیشیاں طلب کرنے والوں کو محصول میں بہت کفایت ہو سکتی ہے

منیجر کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنؤ

باب الاستفسار

سیرۃ النبی اور دار المصنفین

(جناب سید عبد الجلیل صاحب - بریلی)

دار المصنفین اعظم گڈھ سے جو جلدیں سیرۃ النبی کی شائع ہوئی ہیں، اُن کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ۔۔۔ کیا واقعی وہ ایسے اصول پر مرتب کی گئی ہے جو اس سے قبل اختیار نہیں کیا گیا اور کیا حقیقتاً وہ کوئی عظیم الشان اسلامی خدمت ہے ؟

(نگار) سیرۃ النبی کے کام کو مولانا شبلی مرحوم نے شروع کیا لیکن اُن کی عمر نے وفا نہ کی کہ وہ اسے انجام تک پہونچا سکتے ہر چند یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر یہ کتاب تمام و کمال انھیں کے قلم سے نکلتی تو اس کا رنگ بالکل مختلف ہوتا، لیکن جس وقت ہم پہلی دو جلدوں کو سامنے رکھ کر باقی دو جلدوں کو دیکھتے ہیں، تو اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو وہ سید سلیمان ندوی کے اس کارنامہ کو کچھ زیادہ خوشی سے اپنے ساتھ منسوب کرنا پسند نہ کرتے

جس حد تک محض سیرۃ کا تعلق ہے اس کے لئے تو صرف ایک ہی جلد کافی تھی، لیکن چونکہ دار المصنفین اس امداد کو جو سیرۃ النبی کے نام سے مل رہی ہے ۔ ایک غیر معلوم وقت تک حاصل کرتے رہنا مناسب سمجھتا ہے اس لئے غیر ضروری طوالت سے کام لیا جا رہا ہے اور فرائض سیرۃ نگاری کو نظر انداز کر کے بعض مباحث کو اسقدر تطویل بیجا کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ یہ کتاب سیرۃ کی حدود سے گزر کر فقہ و کلام، تفسیر و حدیث اور خدا جانے کن کن مباحث کا مجموعہ بنتی چلی جا رہی ہے

سید سلیمان ندوی کی ادارت میں دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک معجزہ کی بحث سے متعلق ہے اور دوسری اسلامی عقائد سے، لیکن اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو ان میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو قول فیصل کا مرتبہ رکھتی ہو مجھے نہیں معلوم کہ مولانا شبلی کا حقیقی مقصود اس تصنیف سے کیا تھا، یعنی وہ اس کتاب کو تمام دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے یا صرف مسلمانوں کے سامنے، لیکن سید سلیمان ندوی کی مرتب کی ہوئی جلدیں تو یقیناً صرف مسلمانوں ہی کے لئے ہیں اور ایک غیر مسلم کو مطمئن کرنے والی کوئی چیز ان میں نہیں پائی جاتی، بلکہ سچ پوچھئے تو اور سامان تضحیک فراہم کر دیا گیا ہے

حیرت ہے کہ معجزہ کی بحث پر سیکڑوں صفحے سیاہ کر دینے کے بعد بھی وہ کوئی معقول دلیل پیش نہ کر سکے اور سوائے ان لوگوں کے جو پہلے ہی سے معجزوں کے لئے قایل ہیں، کوئی اور شخص اس کتاب کو دیکھ کر کبھی معجزہ کا قائل نہیں ہو سکتا

معجزہ نام اگر خوارق عادات کا ہے تو سب سے پہلے یہ امر بحث طلب ہے کہ ایک نبی یا رسول کو جو صرف تعلیم اخلاق کے لئے مامور ہوتا ہے ایسا معجزہ پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے جو عالم طبیعیات پر مؤثر ہو اور اس معجزہ سے وہ اخلاق انسانی کی اصلاح کیونکر کر سکتا ہے۔ ممکن ہے اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ معجزہ تو صرف ذریعہ ہے تصدیق نبوت و رسالت کا تاکہ معجزہ دیکھ کر لوگ نبی کی صداقت پر ایمان لے آئیں اور جب وہ ایک نبی کو نبی سمجھ لیں گے تو ظاہر ہے کہ اس کے ارشادات پر عمل بھی کریں گے ——— لیکن یہ جواب بالکل مہمل ہے۔ کیونکہ اس دلیل کے تسلیم کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ معجزہ کی حقیقت کو واضح کر دیا جائے اور معجزہ کی حقیقت میں ہم کو صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ خوارق عادات جو ایک نبی کی طرف سے ظاہر ہوں معجزہ کہلاتے ہیں ——— اس لئے نتیجہ اس تمام بحث کا یہ نکلے گا کہ معجزہ وہ ہے جو نبی سے صادر ہو اور نبی وہ جس سے معجزہ کا ظہور ہو، اور اس استدلال کی لغویت ظاہر ہے

اس کے بعد بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آیا کسی معجزہ کا ظاہر ہونا عقلاً ممکن ہے یا نہیں اور اسی کے ساتھ یہ کہ واقعی وہ ظاہر بھی ہوا یا نہیں ——— لیکن ہمارے یہاں کے علماء دین جن میں مؤلف سیرۃ النبی (سید سلیمان ندوی) بھی شامل ہیں ہمیشہ امکان و وقوع سے بحث کیا کرتے ہیں یعنی وہ صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ درانحالیکہ کسی امر کے وقوع کا محض امکان، وقوع تو نہیں۔ مثلاً کوئی شخص آکر مجھ سے یہ بیان کرے کہ فلاں شخص کے دونوں شانوں پر پر نکل آئے ہیں اور وہ فضا میں اڑتا پھرتا ہے ۔ تو سب سے پہلے میں غور کروں گا کہ آیا ایسا ہونا عادتاً محال تو نہیں اور جب اس کی طرف سے مطمئن ہو جاؤں گا تو پھر اس کی جستجو کروں گا کہ فی الحقیقت ایسا ہے بھی یا نہیں، لیکن اگر اس خبر کا سنانے والا میرے اس تذبذب

کو دیکھ کر صرف یہ دلیل لائے کہ کیا ایسا ہونا ممکن نہیں اور کیا فلاں فلاں شخص جن کی وساطت سے یہ خبر مجھ تک پہونچی ہے جھوٹ بول سکتے ہیں۔ تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے اس پر اطمینان ہو جائے گا۔ اور میں اسے مان لوں گا ۔ غالباً نہیں

سید سلیمان ندوی نے بھی معجزات نبوی کے متعلق پوری کتاب میں اسی نوع کے استدلال سے کام لیا ہے اور ساری کوشش اس امر پر صرف کی ہے کہ ایسے پُراسرار واقعات کا ظاہر ہونا ممکن ہے اور جب ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ رسول اللہ کی طرف سے ان کا ظہور نہ ہوا ہو ـــــ گویا اس سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ واقعی وہ ظاہر بھی ہوئے یا نہیں

ظہور معجزات کی شہادت میں انھوں نے صرف روایات پر اعتماد کیا ہے، درانحالیکہ اصول درایت کی رُو سے تمام وہ راوی جنھوں نے احادیث معجزات روایت کی ہیں، پہلے ہی سے ساقط الاعتبار ہو جاتے ہیں

الغرض سید سلیمان ندوی نے سوائے روایات و منقولات کے اور کوئی ذریعہ اثبات معجزہ کے لئے اختیار نہیں کیا اور اگر کسی جگہ عقل سے کام لینے کی زحمت گوارا فرمائی ہے تو وہ بھی اس شان سے کہ کہیں فلسفۂ قدیم کے اصول کو سامنے رکھ کر امکان معجزہ کو ثابت کرنا چاہا ہے جو اس زمانہ میں تقویم پارینہ کی حیثیت رکھتا ہے، یا اگر اس سے ہٹ کر کہیں خود اُپج کی لی ہے تو اس طرح کہ فلاں مقام میں ایک مردہ شخص کی تصویر لی گئی تو تصویر میں چند روحوں کے عکس بھی نظر آتے تھے اور اس کے ثبوت میں اخبار لیڈر کی شہادت پیش کرکے گویا ایسی برہان قاطع صرف کی ہے کہ سوائے سر جھکا دینے کے اب کوئی چارہ باقی ہی نہیں رہتا

پھر ظاہر ہے کہ جو شخص اخبار لیڈر کے نامہ نگار کے بیان پر اعتماد کرکے عقل سے کام لینا چھوڑ دے، وہ اگر کتب احادیث کی روایتوں پر اعتماد کرکے سرے سے وجودِ عقل ہی کا انکار کر دے تو جائے حیرت نہیں۔

افسوس ہے کہ سید سلیمان ندوی علوم مغربی سے بالکل بے بہرہ ہیں اور وہ مطلقاً نہیں سمجھ سکتے کہ معجزوں کے اثبات کے لئے کتنے حقائق مسلمہ کا انکار کرنا ضروری ہے اور موجودہ عہد میں جبکہ تمام علوم و فنون کی بنیاد صرف مشاہدات و حقایق پر قائم ہے، کوئی کیونکر معجزوں کا قایل ہو سکتا ہے

یہ کہدینا تو آسان ہے کہ رسول اللہ کے جسم کا سایہ نہ پڑتا تھا، یا سنگریزے آپ کے ہاتھ میں بولنے لگے، یا استن حنانہ آپ کے فراق میں آٹھ آٹھ آنسو رونے لگا، یا یہ کہ آپ نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے، اور ایک مسلمان کو صرف احادیث کے زور پر آپ ان باتوں کا یقین بھی دلا سکتے ہیں، لیکن ایک منکر و کافر، ایک ملحد و بیدین کے دل میں آپ کیونکر ایقانی کیفیت پیدا کر سکتے ہیں، جبکہ وہ سمجھتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک معجزہ پر ایمان لے آنا گویا نظام عالم کے درہم برہم ہو جانے کا قایل ہو جانا ہے ـــــ شعبدہ یا نظربندی کے ذریعہ سے تو یہ سب کچھ مانا جا سکتا ہے لیکن حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے کوئی شخص اس کو تسلیم نہیں کر سکتا

اگر سید سلیمان ندوی صرف کلام مجید کو سامنے رکھکر معجزات پر بحث کرتے تو یقیناً وہ بھی اسی نتیجہ پر پہونچتے کہ رسول اللہ نے کوئی معجزہ پیش نہیں کیا اور آپ نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں کوئی معجزہ نہیں لایا، لیکن تقلید و اسلاف پرستی کا مرض جس میں ہمارے علماء مبتلا ہیں کب قرآن شریف کی طرف متوجہ ہونے دیتا ہے اور قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی توفیق کیوں دینے لگا،

الغرض میری رائے میں سیرۃ النبی کی تیسری جلد جس میں معجزات پر بحث کی گئی ہے ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ کسی غیر مسلم کے سامنے پیش کی جائے اور اگر اس کا مقصود صرف مسلمانوں ہی سے خطاب کرنا تھا تو تحصیل حاصل میں وقت ضائع کیا گیا، کیونکہ مسلمانوں کی ذہنیت پر یوں ہی موت طاری ہے، سید سلیمان ندوی کو اور دُرّے لگانے کی کیا ضرورت تھی

چوتھی جلد جس میں عقائد اسلامی سے بحث کی گئی ہے، سیرۃ کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اور آیندہ جلدوں کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہئے کیونکہ ان میں بھی عبادات و معاملات وغیرہ سے بحث ہوگی جو سیرۃ نبوی سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں رکھتی ——— یوں تو تعلیم اسلامی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسکا تعلق رسول اللہ سے نہ ہو، لیکن مباحث کی تقسیم کے لحاظ سے ان مسائل کو سیرۃ النبی سے بالکل علیحدہ رکھنے کی ضرورت تھی ——— میں نے چوتھی جلد کو ابھی تک بالاستیعاب نہیں دیکھا، لیکن سرسری مطالعہ بھی اسقدر سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ سید سلیمان ندوی اسمیں بھی "طوطی در پس آئینہ" نظر آتے ہیں اور اسلام کو صرف علماء سلف اور متکلمین ہی کے نقطۂ نظر سے پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں

قرآن مجید میں غور و فکر نہ کرنے کی جو عادت مسلمانوں میں پیدا ہوگئی ہے وہ کتاب کی ہر ہر سطر سے ظاہر ہے اور اس میں سید سلیمان ندوی نے اسقدر غلو سے کام لیا ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں کو کھینچ تان کر علماء سلف کے اقوال کی تصدیق تو اُن سے کرا دیتے ہیں لیکن ان کے اقوال کی صحت کا معیار قرآن پاک کو قرار نہیں دیتے ——— اس جلد میں بعض ایسے مسائل کو بھی عقائد اسلامی میں شامل کر لیا ہے جنکے بابت قرآن میں کوئی صراحت نہیں پائی جاتی مثلاً تقدیر، عالم برزخ، حشر بالاجساد یا جسمانی عذاب و ثواب کہ عام طور پر ان کو بھی عقائد مہمہ اسلامی میں شامل کیا جاتا ہے، درانحالیکہ اُن کا منکر دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہو سکتا ——— یہ تو تھی میری نہایت ہی اجمالی رائے اس کتاب کے متعلق، لیکن میں اس اجمال کو بہت جلد پوری تفصیل کے ساتھ پیش کروں گا۔ اور بتاؤں گا کہ جس تالیف پر دار المصنفین کو اسقدر ناز ہے اسکی حقیقت کیا اور کتنی ہے،

خاتون ——— ختنہ

(جناب محمد عبد الکریم خاں صاحب - پشاور)

مشہور بات ہے کہ عرب میں عورتوں کا بھی ختنہ کیا جاتا تھا۔ اس لئے غالباً لفظ "خاتون" بھی اُسی سے مشتق ہے۔ کیا یہ صحیح ہے۔ اسی کے ساتھ اگر ممکن ہو تو اس رسم کے متعلق وضاحت کے ساتھ